TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224139
UNIVERSAL
LIBRARY

Osmania University Library

Call No. Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

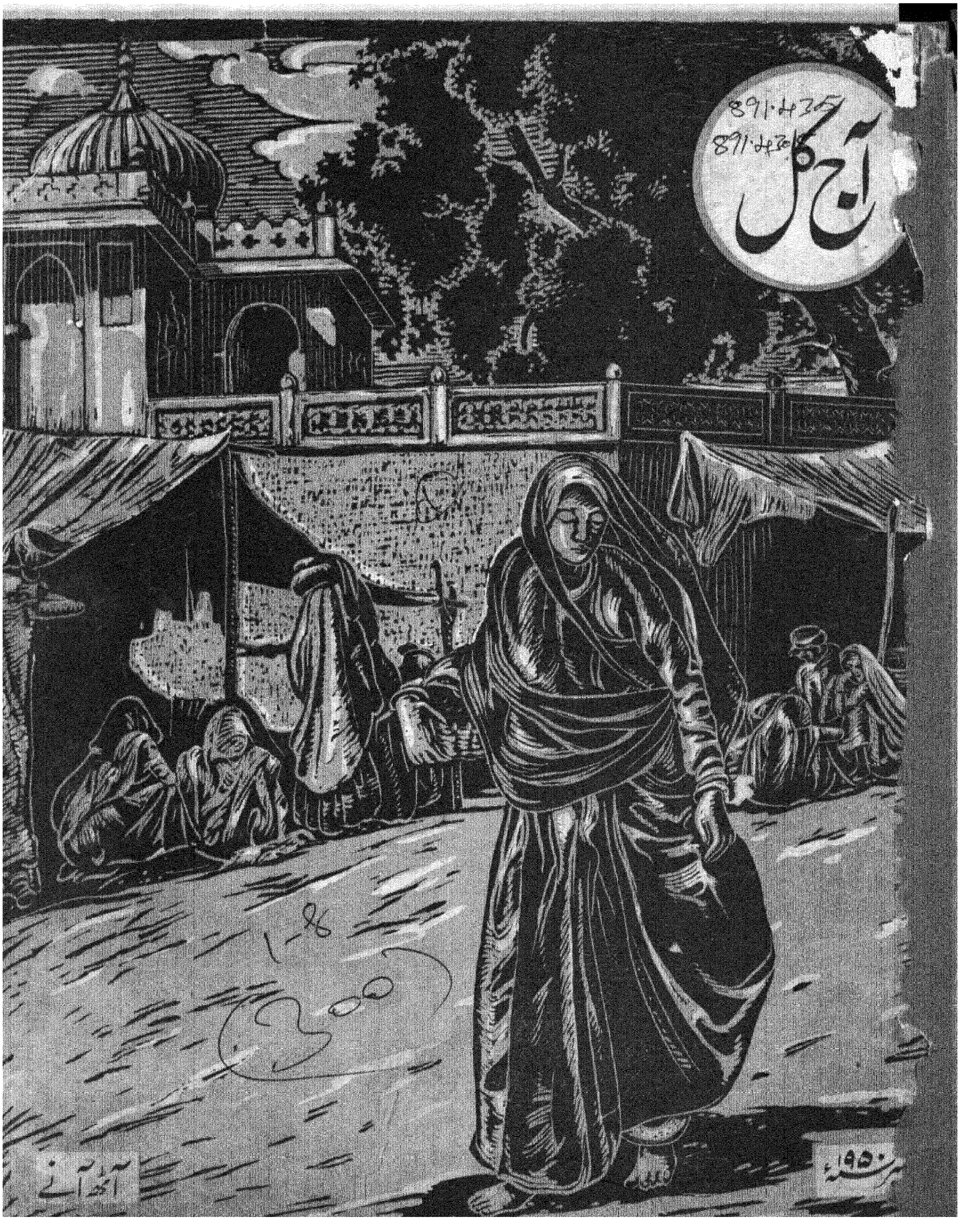
آجکل
۱۹۵۰ء
آٹھ آنے

اس چائے کے آگے ...

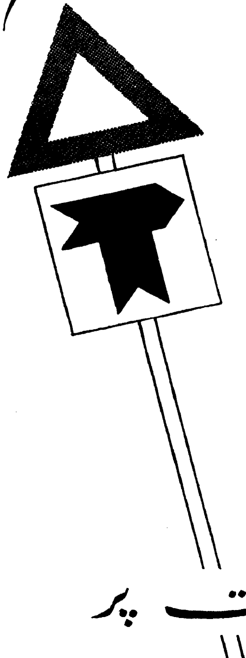

آپ اپنے دن کا کام ختم کر رہے ہیں - کچھ آدھے گھنٹے کے بعد آپ گھر کی طرف تیزی سے جا رہے ہوں گے، چائے پینے کی تڑپ میں۔ وہاں آپ کے لئے سموسے اور چٹنی رکھے ہوئے ہیں، اور ڈی لکس بسکٹوں کی بھری ہوئی پلیٹ — اور مکھن ان پر لگا ہوا - جی! ہاں .....

چائے پینے کے وقت پر

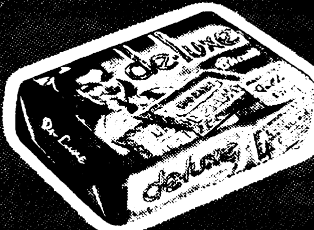

ڈالمیا ڈی لکس

عمدہ بسکٹ

پٹیالہ بسکٹ مینوفیکچررز لمیٹڈ — راجپورا، پٹیالہ

891.4305

ہندوستانی آب وہوا کے لئے خاص کر کے بنایا گیا

نیا
ہمالیہ بُکے
سنو

ہر ایک موسم میں آپ کی جلد کی بہتر حفاظت کرتا ہے
ملائمیت اور تازگی بخشتا ہے
اس کی خوشبو سحر آمیز ہے

اِداسیملٹ کا ایک اور عمدہ پراڈکٹ

LET THE ROSE BLOOM
عورت کا حسن اس کا سب بڑا کمال ہے۔ اسے مرجھانے سے بچایئے۔ چہرہ کو کیل اور چھایوں
اور جسم کو خارش سے بدنما نہ بنلیجے۔ صافی کے استعمال سے خون کو صاف رکھیے شفاف
خون کو رخساروں پر جھلکنے دیجئے۔ اور وقت کی جھریوں کو چند سال اور روک رکھیے
صافی
نہ صرف خون کو صاف کرکے چہرہ کو داغوں سے پاک اور سرخ و
سفید بناتی ہے۔ بلکہ معدہ کو قوت دے کر شفاف خون پیدا کرتی ہے
اعضا میں چستی اور بدن میں رعنائی پیدا کرتی ہے۔
قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ
ہمدرد دواخانہ۔ وقف۔ دہلی
ہر جگہ بکتی ہے
Hamdard

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر: —— جوشؔ ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز: —— عرشؔ ملسیانی

جگن ناتھ آزادؔ

جلد ۹ —— نمبر ۵

سالانہ چندہ —— چھ روپے

فی پرچہ —— آٹھ آنے

دسمبر ۱۹۵۰ء

ترتیب

دانۂ سپند	سیّد آصف علی	۴
المپس کے دیوتا	قاضی عبد الغفّار	۵
ہندوستانی فوج کے لئے افسروں کا انتخاب	دجنرل، کے ایم کیری آپا	۸
تاج محل	سروش عسکری طباطبائی	۱۲
چلے شیر مارنے کو	ابو الفضل صدّیقی	۱۴
خندۂ شبنم	سیّد حُرمت الاکرام	۱۹
روس کا عظیم مُصنف، چیخوف	سوہن لال سیٹھی	۲۰
ترقّی پسند شادی	اختر تاباں	۲۲
نیشنل ایمپلائمنٹ سروس	——	۲۷
جھوٹے وعدے	سہیل عظیم آبادی	۳۳
مالابار یا ملیبار	مائل ملیح آبادی	۳۶
ذکر و فکر	ابر احسنی گنوری، عبد المجید حیرت، نجم آفندی، الم مظفر نگری، اسلم اثر قراولی	۳۹
پنجابی کہاوتیں	رتن لال کھنّہ	۴۰
آج کا روس	محمّد امین	۴۶
غزل	اختر سعید	۴۹
سال نامہ ۱۹۵۰	(مختلف آراء کے اقتباسات)	۵۰
زمین، زراعت اور تہذیب	——	۵۱
نئی کتابیں اور رسالے	ادارہ	۵۳
رفتارِ زمانہ	ادارہ	۵۵

بچّوں کا آج کل

سردی اور بچّہ	محمّد شفیع الدین نیّر	۶۱
دادا بھائی نوروجی	وی رام چندرا ریڈی	۶۲
قہقہے	محمّد عبّاس ہاروں بھوپال	۶۴
بھونچال	ڈی، جے گپت	۶۵
نفرت پر محبّت کی فتح	اندر کمار	۶۷

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس عـ ۲۰۱۱ دہلی

سیّد آصف علی

دانۂ سپند

یہ نظم ہز ایکسیلینسی سیّد آصف علی گورنر اڑیسہ کی تصنیفِ لطیف ہے۔ ادارہ اس عطیّے کے لئے موصوف کا شکر گزار ہے

(۱)

جگر میں میرے آگ تھی بہارِ بیقرار کی
مری نگہ میں تنگ تھی زمین مرغزار کی
شراب اُبل رہی تھی دل کے شیشہ سے شرار کی
ازل کے خوابِ حُسن کی نمود کے خمار کی
رہی دل میں تاب جب ابد کے انتظار کی
میں بزمِ آتشیں میں گرچہ دانۂ سپند تھا
جہانِ آرزو میں شعلہ سے بھی سربلند تھا

(۲)

فلک کے لاکھ دَور تھے خزاں کا ایک سرورق
مدام روز و شب وہی وہی الم وہی قلق
وہی ہمیشہ بے بسی، وہی سکوت کا سبق
رگِ نمودِ برق کی تھی میرے سینہ میں رمق
مرے گلِ سپید کی نظر میں تھا گلِ شفق
میں بزمِ آتشیں میں گرچہ دانۂ سپند تھا
جہانِ آرزو میں شعلہ سے بھی سربلند تھا

(۳)

جگر کے گوشہ گوشہ میں صدائیں بے قرار تھیں
رگوں کے ریشہ ریشہ میں اُمیدیں بے شمار تھیں
نگاہیں شوقِ دید سے حریفِ روزگار تھیں
مدام ابرِ شوق سے اُمنگیں مشکبار تھیں
نگاہیں اوجِ عرش پر فتیلۂ شرار تھیں
میں بزمِ آتشیں میں گرچہ دانۂ سپند تھا
جہانِ آرزو میں شعلہ سے بھی سربلند تھا

(۴)

جو دانۂ سپند محوِ حیا میں تنگ تھا
جو شعلۂ فراق عرضِ آرزو کا ننگ تھا
وہ شوقِ بے قرار صبر سے جو مثلِ سنگ تھا
وہ غنچۂ بہار ضبط سے جو ننگِ رنگ تھا
وہ ایک جستِ آخری میں بر ہدف خدنگ تھا
میں بزمِ آتشیں میں گرچہ دانۂ سپند تھا
جہانِ آرزو میں شعلہ سے بھی سربلند تھا

(مرقومہ ۹ فروری [illegible]ء قلعۂ احمد نگر)

قاضی عبدالغفار

ابلیس کے دیوتا

لازوال مگر بے روزگار دیوتا جب "ابلیس" کی چوٹیوں پر ل بیٹھتے ہیں تو وہ اپنے گذرے ہوئے زمانے کو کس قدر یاد کرتے ہیں! اب انھیں کام تو کچھ باقی نہیں رہا اور فرصت ہی فرصت ہے اس لئے وہ گذرے ہوئے زمانوں کی باتوں سے دل بہلاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ گذری ہوئی صدیوں میں کیا شان تھی اور کیا دبدبہ تھا ان کا۔ بھوکے ان سے روٹی مانگنے آتے تھے۔ دولت مند اور بھی زیادہ دولت مانگتے تھے۔ بادشاہ فتح مانگتے تھے۔ حسین عورتیں اپنے حسن کی عمر بڑھوانے آتی تھیں —— اور آج؟ آج کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ دنیا والوں کی قدیم تاریخوں میں کہیں کہیں ان کے نام لکھے ہوئے ہیں یا کوئی شاعر یا ادیب ان کو یاد کر لیتا ہے۔ اب نہ ان کی چوکھٹ پر کوئی پیشانی جھکتی ہے۔ نہ ان کے عتاب سے کوئی ڈرتا ہے۔ اور نہ ان کے الطاف و کرم کا کوئی امیدوار ہے۔ "ابلیس" کی چوٹیاں سونی پڑی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ یہ بیچارے دیوتا لافانی ہیں —— مر بھی نہیں سکتے۔

تھکا ہوا اور بوڑھا دیوتا "زی اس" اپنے ساتھیوں کے گھیرے میں خاموش اور سر جھکائے بیٹھا ہے۔ امرت اور موہن بھوگ کے خالی پیالے اس کے سامنے رکھے ہیں۔ ایک طرف ایک پرانا بربط پڑا ہوا ہے جس کے تار ٹوٹے ہوئے ہیں اور نغمے گم ہیں۔

"لعنت ہو ان انسانوں پر"۔ وہ کہتا ہے۔ (لیکن اس کی آواز میں اب وہ کڑک نہیں ہے) "ہم نے ان کو نعمتیں عطا کیں۔ ان کے سجدوں اور ان کی دعاؤں کو قبول کیا۔ ہم نے انھیں اتنی بڑی دنیا دی کہ وہ اس میں بسیں۔ لیکن ان ناشکروں نے سب سے پہلے ہم ہی کو نظر انداز کیا۔ انھوں نے ہمارے بجائے اپنے دماغوں کی تاریک پرچھائیوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ پرچھائیاں بغض اور حسد کی۔ حرص اور ہوس کی۔ اب بتاؤ اے ساتھیو، ہم اس "ابلیس" کی بلندی پر بیٹھے ہوئے کیا کریں؟"

بھوری آنکھوں والی دیوی "ایتھینا" جو کچھ اونگھ سی رہی تھی آخری سوال پر جاگ پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوفناک بجلی چمکی۔ اس نے اپنے سینے کو تانا جس پر اس کے پستان فولاد کی طرح سخت تھے۔ اس لئے اس نے کبھی کسی بچے کو دودھ نہیں پلایا تھا۔ اس نے کہا "بابو "زی اس" اور سدا زندہ رہنے والے دیوتاؤ اس انسان کی قسمت میرے حوالے کر دو۔ مجھے اس سے ناشکر گذاری کا انتقام لینے دو۔ میرے حسن سے زیادہ اسے کوئی چیز دھوکہ نہیں دے سکتی۔ میں پھر اسے ایک دفعہ "ابلیس" کی گھاٹیوں میں لاؤں گی۔ پہلے میں اس کے غرور ہی سے اسے برباد کروں گی۔ یہاں تک کہ وہ خود دیوتا ہونے کا دعویٰ کرے اور اپنی ہر بستی کو وہ "ابلیس" بنا لینا چاہے۔ پھر وہ ایک دفعہ اپنے اس غرور کی بلندی سے گرے۔ تب میں اسے اپنے آغوش میں لے لوں گی۔ میں اس کے گندے دل کو دھو ڈالوں گی تاکہ وہ حق سے محبت اور باطل سے نفرت کرنا سیکھے۔ پھر جو تھوڑا بہت علم اس کے حصے کا ہے وہ میں اسے دوں گی۔ اس کا دل ایک چھوٹا سا اور کمزور صدف ہے۔ دیوتاؤں کے سمندر اس میں نہیں سما سکتے۔ ان سمندروں کا ایک پیالہ بھر پانی بھی اس کے دماغ میں نشہ کی ترنگ پیدا کر دیتا ہے یعنی وہ ایک چلو کو بھی سمندر سمجھنے لگتا ہے۔ پھر وہ اس چلو میں اپنی انانیت کا غرور ملا کر جھاگ پیدا کرتا ہے۔ وہ جھاگ جب پیالے میں نہیں سماتے تو ابل پڑتے ہیں۔ وہ اس کی کم ظرفی کا اعلان کرتے ہیں مگر اسے خبر نہیں ہوتی۔ بابو! میں اس کے پیالے کو تو بڑا نہیں کر سکتی، لیکن اس میں بقدر ظرف ایک بے قرار طلب کی موجیں پیدا کر سکتی ہوں۔ ان موجوں میں ایمان کے موتی پیدا ہوں گے۔ وہ ایمان جو ہم جنسوں کے گناہوں کو بھی برداشت کر لیتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور دیوتاؤں کا گروہ سب ایک ساتھ بولنے

لگا۔ ہر دیوتا چاہتا تھا کہ پہلے وہ بولے۔ لیکن سنہری "زہرہ" "اتھینا" کے قدموں پر گر گئی۔ اُس نے کہا، دیوی! میں تجھے انسانوں کی بستی میں جانے نہ دوں گی۔ اس بستی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ تیرے خوبصورت بال جل جائیں گے۔ تیری پلکیں جھلس جائیں گی۔ تیری آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ انسان اس قابل نہیں ہا کہ تو اس کے لئے "المپس" کا لافانی سکون چھوڑے۔ اس کی ہر عورت اب "المپس" کی دیویوں کا نام حقارت سے لیتی ہے۔ "المپس" کے بوڑھے دیوتاؤں کی آبرو کو تو وہاں جا کر برباد نہ کر۔

"زی اس" جوان سب باتوں کو سن رہا تھا۔ خاموش تھا۔ اس نے "ایتھینا" کا سر اپنے کاندھے پر جھکا لیا، پھر وہ سوچتا رہا اور کچھ دیر بعد اس نے کہا:۔

"بیٹی! صرف یہی کافی نہیں کہ تیری آنکھوں کی روشنی انسانوں کے دلوں میں حق و باطل کا احساس پیدا کر دے۔ اور وہ اپنی ہی بے قرار تمنا کی آگ میں جلنے لگیں۔ ہاں تو محبت کا تخم بکھیرے گی۔ اور مادر گیتی کا رحم اُس تخم سے بھر جائے گا خشک جنگل ہرے اور سوکھے پتے تر و تازہ ہو جائیں گے۔ سوکھے دریاؤں میں پانی آ جائے گا۔ اور تپتے ہوئے ریگستانوں میں ٹھنڈے پانی کے دریا بہنے لگیں گے زندگی انگڑائی لے گی —— پر یہ سب بھی کافی نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ انسانوں نے دیوتاؤں کا جلال اور قہر تو چرا لیا لیکن وہ ان کا گیان بگیہ نہ پا سکے! وہ سمجھے کہ عقل اور دانائی کا ایک "المپس" بنا کر وہ خود دیوتا بن بیٹھیں گے۔ اس میں کچھ لابد نہ تھا۔ پر وہ خسارے کو نفع سمجھے۔ وہ جوان کی فطرت میں حسن اعلیٰ سے ایک لگاؤ تھا اُس کے بندھن انھوں نے علم اور سائنس کی قینچیوں سے کاٹ ڈالے۔ اب وہ تیرے حسن کو بھی نہیں پہچان سکتے۔ اُن کے پاس وہ نظر ہی نہیں، وہ عرفان ہی نہیں!" "بابو نے سچ کہا"۔ سب دیوتا چلا اُٹھے۔ لیکن "اتھینا" نہ مانی۔ وہ ایک دن دیوتاؤں کی آنکھ بچا کر انسانوں کی بستی میں پہنچ گئی۔ وہ ایک ہوا کے جھونکے کی طرح مغرب کی وادیوں میں سرایت کر گئی۔ اس نے مغرب کے سمندر کی موجوں کو اُچھالا۔ وہ جگمگاتے ہوئے شبستانوں پر سنسنائی۔ وہ انسانی سماج کی رنگین تیتریوں سے کھیلی۔ اس نے تلاشِ عیش کی قوسِ قزح میں کتنے ہی نئے نئے رنگ سمو دیئے۔ وہ ان کی موسیقی کی راگنیوں میں سما گئی۔ وہ ان کی شراب کے پیالوں میں چھلکی —— اس طرح کئی صدیاں گذر گئیں۔ اور "المپس" کے دیوتاؤں نے انتظار کرتے کرتے تھک کر کہا۔ "اب وہ نہ آئے گی"۔

"اتھینا" اپنا کام کرتی رہی۔ اکثر وہاں ہاری اور کہیں کہیں جیتی بھی — صدیاں گذرتی جا رہی تھیں۔ اور وہ چاہتی تھی کہ جلد اپنے کام سے فارغ ہو کر "المپس" واپس جائے۔ لیکن ابھی تو اسے ایک بہت بڑی شکست کھانی تھی۔ انسانوں کی رنگین محفلوں سے مایوس ہو کر وہ ایک دن مندروں۔ مسجدوں کلیساؤں کی دنیا میں پہنچ گئی۔ اس نے سوچا کہ انسانوں کے یہ قبیلے تو عرفان سے اتنی دور نہ ہوں گے جتنے کہ باقی انسان۔ اس نے صورتیں معصوم دیکھیں۔ نظریں شرمیلی دیکھیں۔ باتیں میٹھی سُنیں۔ عبا کے دامن اور جنیو کے ڈورے اور ماتھے کی بندی میں اس نے اپنے احساس کی ایک ہلکی سی پرچھائیں دیکھی۔ بس اس نے کہا، میں اپنی منزل پر آ گئی۔ یہی وہ انسان ہیں جنہیں میں پھر دیوتاؤں کے چرنوں میں واپس لے جا سکتی ہوں۔

مگر ایک رات کی خاموشی میں جب وہ مسجد کے تاریک حجرے میں داخل ہوئی تو وہاں اس نے مولانا کی عبا کے دامن پر حرص و ہوس کی پریوں کو ناچتے دیکھا پھر جب دوسری رات کو وہ مندر کے استھان پر گئی تو وہاں اس نے پنڈت جی کے جنیو میں پھانسی کے پھندے دیکھے، وہ جنیو ایک سانپ کی طرح پنڈت جی کے گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ پھر وہ گھبرا کر کلیسا کی طرف بھاگی۔ اُس نے سوچا کہ یہاں تو ضرور مجھے مسیح کی روح ملے گی۔ لیکن وہاں بھی لمبی عباؤں کے دامن شرابور تھے! —— اب وہ کیا کرے؟ —— اتنے میں مسیح کے پجاری نے اسے پکارا ادھر آ میری بیٹی۔ میں تجھے نجات کا راستہ بتاؤں۔ ساتھ ہی مندر سے پنڈت جی کی آواز آئی۔ اُدھر کہاں جاتی ہے، دھرم اور مکتی کی کنجیاں تو میرے جنیو میں بندھی ہوئی ہیں۔ مولانا بھی کہیں ایک گوشے میں کھڑے تھے۔ انھوں نے اپنی سُرخ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔ "ایمان بالغیب"۔ مجھ سے لے میرے پاس یہ جنس سستی ہے۔

کئی صدیاں اور گذر گئیں۔ اور "المپس" کے دیوتا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو گئے۔ آخر "اپالو" نے کہا میں جاتا ہوں۔ دیکھوں تو وہ کہاں رہ گئی —— "اپالو" آیا اور عرصہ تک ڈھونڈتا پھرا۔ پوچھتا پھرا۔ لیکن دیوی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ایک دن وہ کلوزیم کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کے سایہ میں سستا رہا تھا کہ یکایک بادل کا ایک ٹکڑا اس کے قریب آ کر ایک پرچھائیں کی صورت اختیار کرنے لگا۔ "اپالو" نے لیٹے ہی لیٹے اس پرچھائیں سے سوال کیا "اے بھائی تم کون ہو؟"

پرچھائیں نے کہا۔ میں انسانوں کی دنیا کا رکھوالا ہوں۔ جو انھیں اس طرح زندہ رہنا سکھاتا ہے کہ ان کے مزے میں ناجیز نہ ہو۔ لوگ مجھے "اہرمن" کہتے ہیں۔ حالانکہ میں یزداں سے زیادہ طاقتور ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں قوت حیات ہوں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں انسانوں کو دائمی زندگی کے تصور سے دور رکھوں اور میں اپنا کام بہت کامیابی کے ساتھ انجام دیتا ہوں۔ کیا تم "ابلیس" سے اُتر کر آئے ہو؟ — وہ ٹھٹھرے ہوئے۔ سوکھے ہوئے، تھکے ہوئے بوڑھے دیوتاؤں کی اجڑی ہوئی بستی! کیوں تکلیف فرمائی تم نے؟

اپالو نے کہا "میں اپنی بہن "ایتھنیا" کو تلاش کرنے آیا ہوں جو یہاں انسانوں کو "ابلیس" کا بلاوا دینے آئی تھی مگر واپس نہیں گئی۔ نہ جانے کہاں ہے وہ؟" اہرمن مسکرایا۔ "بڑے میاں" اس نے کہا۔ "تم نے ناحق اس بوڑھاپے میں اتنا لمبا سفر کیا۔ وہ تو اب تمھارے ساتھ واپس نہ جائے گی۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمھیں دکھادوں کہ وہ کہاں ہے"!

اب اہرمن آگے آگے اور "اپالو" پیچھے پیچھے بجلی کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے بازاروں میں ایک محل سرا کے اندر داخل ہوئے۔ جہاں ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے تھے ان کے سامنے ایک اونچے چبوترے پر کوئی برہنہ عورت رقص کر رہی تھی۔ ایک اندازِ بے خودی کے ساتھ ایوان کے ہر گوشے سے بار بار واہ واہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ناچنے والی اپنے ناچ میں مست ہے، مگر دیکھنے والے اس کی جوانی میں ڈوبے ہوئے تھے! — وہ "ایتھنیا" تھی! مگر اب وہ "ابلیس" کا راستہ بھول گئی تھی۔

اہرمن نے کہا۔ اب آیئے بھائی صاحب آپ کو ایک اور جگہ لے چلوں۔ یہ ایک مکان تھا جس کے دروازے پر سرخ قندیل ٹنگی ہوئی تھی۔ یہاں جنسی خواہشوں اور مہر یں جسموں کا سودا ہو رہا تھا۔ اہرمن نے اشارہ کیا، وہ دیکھو، وہ تمہاری دیوی بیٹھی ہے۔ پھر اس نے کہا۔ آؤ ایک جگہ اور لے چلوں۔ یہ ایک افلاس زدہ مزدور کا گھر تھا۔ جس کی بیوی آدھی درجن بھوکے بچوں کی بھوک کو تھپڑوں اور گالیوں سے تسکین دے رہی تھی۔ اس کا شوہر ابھی شراب خانے سے واپس نہ آیا تھا۔ سشاہرت دہی تھی۔ البتہ مزدور کی بیوی کی چھاتیاں اب اس کے گھٹنوں تک لٹک رہی تھیں۔

گھبرا کر اپالو نے کہا۔ اہرمن مجھے جانے دو۔ "ابلیس" پر میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ اہرمن نے قہقہہ مارا۔ جاؤ میرے بھائی جاؤ! دو چار صدیوں تک پھر اپنے خاموش کوہستانوں میں سوتے رہو۔ اس وقت تک ادھر آنے کی زحمت نہ کرنا جب تک میں یہاں موجود ہوں۔ "میں" تہذیب اور تمدن کا دیوتا! جاؤ بھائی، تمھیں تمہارے تھکے ہارے دیوتاؤں کے سپرد کیا۔ — یہ کہتے کہتے اہرمن غبار بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

"اپالو" گھبرا کر مڑا اور تیز تیز چلنے لگا۔ پھر وہ یکایک ٹھٹکا — میں کہاں ہوں؟ میں کدھر جا رہا ہوں؟ وہ اپنا سر کھجانے لگا۔ پھر اس نے سوچا "ابلیس" کا راستہ کدھر ہے؟ میں جس راہ سے آیا تھا وہ راہ کہاں ہے؟ — بیچارہ "اپالو" عرصہ تک کھڑا سر کھجاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ "ابلیس" کا راستہ بھول گیا تھا۔

مضمون نگار حضرات سے

مضامین اور نظمیں بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس لئے غیر طلبیدہ مضامین اور نظمیں قبول نہیں کی جائیں گی۔ اور صرف واپسی کے لئے ٹکٹ آنے کی صورت میں ہی واپس کی جائیں گی۔

(ادارہ)

پاکستان میں "آجکل" کے ایجنٹ

ا۔ میسرز نیو نیوز ٹریک اسٹال الفنسٹن سٹریٹ کراچی۔

۲۔ میسرز پاک پبلسٹی سروس بیرون موری گیٹ لاہور۔

(جنرل) کے۔ ایم۔ کیری آپا

ہندوستانی فوج کے لئے افسروں کا انتخاب

کسی فوج کی توپی کا دار و مدار دراصل اس کے افسروں کی خوبی پر ہوتا ہے۔ اچھے افسر چاہیے ان کے پاس جیسا بھی سامان ہو ایک اچھی فوج بنا سکتے ہیں۔ لیکن خراب افسر چاہیے ان کے پاس اعلےٰ درجے کا سامان اور سپاہی کیوں نہ ہوں بہترین دستہ تباہ کر دینگے۔

ہندوستان کو ایک اول درجے کی فوج درکار ہے۔ اس واسطے نہیں کہ جو دوسروں کا ہے اسے وہ ہتیا لے بلکہ جو ہمارا ہے اسے ہمیشہ صحیح سالم اور محفوظ رکھنے کے لئے۔ ہندوستان کی کسی پر چڑھائی اور حملہ کرنے کی کوئی اسکیم نہیں ہے۔

اس بارے میں ہماری حکومت کی پالیسی کا ہمارے وزیر اعظم بار بار اعلان کر چکے ہیں۔ ہندوستان میں فوج رکھنے کا اصل مقصد ملک کا بیرونی حملے سے بچاؤ کرنا اور کسی ناگہانی ضرورت کے موقعے پر حکومت کے غیر فوجی افسروں کو امن و امان قائم رکھنے کے لئے مدد دینا ہے۔ اس فرض کے ادا کرنے کے لئے ایک واقعی اول درجے کی فوج ہونا لازمی ہے جو جدید ترین طریقہ جنگ کے مطابق تربیت یافتہ اور سامانوں سے لیس ہو۔

ایک اچھی فوج بننے کے لئے یہ خوبیاں ضروری ہیں۔ ۱۔ انتہائی بلند قسم کا اقتصادی استحکام۔ ۲۔ ایسے باشندے جن کی اخلاقی حالت بلند ہو۔ ۳۔ اچھے قوی سپاہی۔ ۴۔ ایسی صنعت و حرفت جو عمدہ منصوبے کے مطابق قائم کی گئی ہو اور قابلیت سے چلائی جا رہی ہو تاکہ جہاں تک جنگی سامان کا تعلق ہے فوج کو خود کفیل بنا دیا جائے۔ ۵۔ ان سب سے اہم چیز اچھے افسر ہیں جو امن کے زمانے میں سپاہیوں کو تربیت دیں اور جنگ میں ان کی قیادت کریں۔

ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ میں اس مضمون میں آخری مد پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں یعنی افسر۔ لیکن یہ تبصرہ شروع کرنے سے پہلے میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ سپہ گری کے نقطۂ نظر سے ہمارے ملک کے باشندوں کو دو حصوں۔ جنگجو اور غیر جنگجو — میں تقسیم کرنے والا پرانا زمانہ اب نہیں رہا۔ میں نے یہ ہمیشہ کہا ہے اور میں برابر کہتا رہوں گا کہ ہر ہندوستانی چاہیے وہ پورب کا ہو یا دکھن کا یا پچھم کا یا اُتر یا وسطی علاقے کا ایک اچھا سپاہی بن سکتا ہے بشرطیکہ اس میں بعض وہ لازمی خوبیاں موجود ہوں جن کا سپاہیوں میں ہونا ضروری ہے اور اس کی کمان کے لئے اچھے افسر ہوں اور وہ جنگی سامان سے اچھی طرح لیس ہو۔

اس وقت ہماری فوج میں جو سپاہی کام کر رہے ہیں وہ جہاں تک میرا تعلق ہے بہت عمدہ ہیں۔ ان کی دو نمایاں خلقی خوبیاں ہیں جو اتنی بڑی حد تک اکثر دوسری فوجوں کے سپاہیوں میں نہیں پائی جاتیں جتنی ان میں پائی جاتی ہیں۔ وہ خوبیاں یہ ہیں — ایک تو یہ سپاہی میدان جنگ کے جانباز لڑنے والے ہوتے ہیں دوسرے یہ ہمیشہ بھلمانسی سے پیش آتے ہیں۔ خوبیوں کی یہ پونجی ہوتے ہوئے ہندوستان کے لئے یہ ممکن ہونا چاہئے کہ جب اس کی اقتصادی۔ زراعتی اور حرفتی پیداوار کی منصوبہ بندی مکمل ہو کر وہ خود کفیل ہو جائے تو اس کے پاس ایک ایسی فوج ہو جو دنیا میں بہترین کہی جا سکتی ہو۔ جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو سب سے اہم جز درکار ہے وہ افسر ہے۔

ان نوجوانوں کی عام خوبی قطعی طور پر قابل اطمینان نہیں پائی گئی جنھوں نے حال کے برسوں میں اپنے کو فوج میں کمیشن حاصل کرنے کے لئے پیش کیا ہے۔ ان درخواستوں میں جو ہمیں اپنے

تربیتی اداروں کی جگہوں کے لئے موصول ہوتی ہیں "کمیت" تو ہے لیکن "عام خوبی" سب امیدواروں میں نہیں پائی گئی۔ پرانے زمانہ میں سپہ گری روپیہ کمانے والا پیشہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ "رومان" اور "جانبازی" کا ایک ایسا پیشہ تھا جس میں رہا نہ امن میں خدمت گزاری کی شادمانی حاصل ہوتی تھی اور لڑائی کے میدان میں جنگ آزمائی کی ناموری۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جیسا کہ دنیا کی دوسری متعدد فوجوں میں ہوا ہے اس اونچے معیار کو جو فوج کے کمیشن والے عہدوں کے امیدواروں کے لئے ضروری درکار ہوتا تھا افسروں کی زبردست مانگ کی وجہ سے نیچا کرنا پڑا۔ اور پھر بعد میں مالی وجوہ کی بنا پر افسروں کی تنخواہ گھٹانا پڑی۔ کارگزاری کے اعلیٰ معیار والے افسروں کا کوئی دستہ نہ ہونے اور تنخواہ کے گھٹ جانے کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ ہونہار نوجوانوں کے واسطے فوج میں ملازمت کے لئے کوئی دلکشی باقی نہیں رہی۔

اس جنگ کے بعد سے سپہ گری نوجوانوں کے لئے "رومان" اور "جانبازی" کے اس جذبے کے ساتھ جو پرانے زمانہ میں ہوا کرتا تھا اب کوئی دلکشی نہیں رکھتی۔ اقتصادی پستی کی وجہ سے والدین نے قدرتی طور پر یہ چاہا کہ ان کے لڑکے نفع بخش ذریعہ معاش تلاش کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت فوج کے کمیشن والے عہدوں کے لئے اتنی تعداد میں موزوں امیدوار نہیں مل رہے ہیں جتنے درکار ہیں۔ یہ بات ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔ اگر لوگ ویسی فوج چاہتے ہیں جیسی فوج کے لئے وہ بظاہر بہت آرزومند ہیں تو اس صورت حال کو درست کرنے کے لئے جلد سے جلد کچھ نہ کچھ کرنا نہایت ضروری ہے۔ آج کل کی جنگیں بہت زیادہ مشینی اور بہت پیچیدہ طور پر فنی بن گئی ہیں۔ پرانے زمانے میں شاید افسروں کے لئے ذہانت سے زیادہ جسمانی قوت درکار ہوتی تھی لیکن اس وقت یہ دونوں چیزیں مساوی طور پر اہم ہیں۔

حقیقی ضرورتیں

کس قسم کے نوجوان اچھے افسر بن سکتے ہیں؟

یہ وہ بعض ضروری خوبیاں ہیں جو افسر بننے والوں کے لئے درکار ہیں۔ ۱۔ جسمانی موزونیت۔ ۲۔ دماغی پھرتی ۳۔ اخلاقی درستی۔ ۴۔ پیش قدمی۔ ۵۔ احساس ذمہ داری۔ ۶۔ متفقہ کوشش کا شعور اور اعلیٰ پیمانے کی وفاداری۔ ۷۔ اپنے فرض کے ادا کرنے میں بے غرضی۔ ۸۔ انضباط کا احساس۔ ان دوسرے ملکوں کے نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد کو دیکھنے کے بعد جہاں جہاں میں جا چکا ہوں میری یہ رائے ہے کہ ہندوستان کے نوجوانوں میں ان خوبیوں میں سے اکثر مخفی طور پر موجود ہیں لیکن انہیں ان نوجوانوں کے والدین اور استاد ٹھیک طرح سے تکمیل کو نہیں پہنچاتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی طرف تعلیم کے ذمہ دار عہدہ داروں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اس اثنا میں جب تک کہ ملک میں تعلیم کے نظام کی ایسی تشکیل نہ ہو جائے کہ نہ صرف فوج بلکہ ملک کے مختلف محکموں کی ملازمتوں کے لئے موزوں قسم کے نوجوان کافی تعداد میں دستیاب ہو سکیں فوجی محکمے کو ان نوجوانوں کی اہلیت معلوم کرنے کے لئے جو فوج میں کمیشن پانے کے لئے درخواست دیتے ہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ فی الحال یہ کام "سروسیز سلیکشن بورڈ" یونین پبلک سروس کمیشن کی مدد سے انجام دے رہے ہیں۔ اور یہ اپنا کام اس طریقے سے کر رہے ہیں جس طریقے سے یونیورسٹیاں طالب علموں کو ڈگریاں دینے کے لئے ان کا امتحان لیتی ہیں۔ ان بورڈوں نے تحقیقات اور تجربے کے ذریعے جانچ کرنے کے ایسے طریقے معلوم کر لئے ہیں جن سے یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ آیا یہ امیدوار اس بات کے اہل ہیں یا نہیں کہ انہیں افسر بنانے کی ٹریننگ دی جائے۔ جانچ کے ان طریقوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان نوجوانوں میں یہ ضروری خوبیاں موجود ہیں اور پورا اطمینان کرنے کے بعد کمیشن محض ان نوجوانوں کو دئے جاتے ہیں جن کے ہاتھوں میں ان سپاہیوں کی زندگیاں بلاخوف وخطر دی جا سکتی ہیں جن کی وہ ملک کے بچاؤ کے لئے کمان کرتے ہیں۔

میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں کہتا کہ جانچ کے یہ طریقے سو فیصدی بالکل صحیح ہیں دنیا میں کوئی چیز بھی بے عیب نہیں ہے۔ فوجی محکمے کے ذمہ دار افسر جانچ کے ان طریقوں میں اصلاح کرنے والی تعمیری اور کارآمد تجویزوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے برابر مستعد ہیں۔ محض یہ بات کہ کوئی امیدوار کسی امیر آدمی کا لڑکا ہے یا کسی ایسے آدمی کا لڑکا ہے

جو حکومت میں کسی اعلےٰ عہدے پر ہے یا وہ کسی "مشہور" "فوجی" خاندان کا ہے یا اس کی بہت اعلےٰ تعلیمی قابلیت ہے اسے فوج میں کسی کمیشن والے عہدے کا اہل نہیں بنا دیتی - مہربانی کرکے یہ بات یاد رکھئے کہ کوئی ایسا نوجوان جس میں مذکورہ بالا قابلیتیں ہوں ایک اچھا پروفیسر - انجنیر - کلکٹر یا کمشنر بن سکتا ہے یا کسی دوسرے پیشے میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن اسے اس طرح سپاہیوں کی کمان کرنے کا فرض سونپا نہیں جا سکتا -

جب تک کہ کسی نوجوان میں وہ لازمی خوبیاں نہ ہوں جو افسر بننے کے لئے ضروری ہیں، اسے فوج میں افسر کے عہدے پر لے کر ان سپاہیوں کی جانیں جو اس کی کمان میں ہوں گے اس کے ہاتھ میں دے دینا ایک بہت بڑا گناہ ہوگا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ناقابلیت اور افسر کے عہدہ کے لئے اپنی ناموزونیت کی بنا پر جنگ میں ان سپاہیوں کو توپ کے شکار کے طور پر استعمال کر ڈالے - غیر فوجی اور شہری زندگی میں اگر کسی سے فیصلہ کرنے میں کوئی غلطی ہو جائے یا کوئی ناقابلیت کا عمل سرزد ہو جائے تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کسی کو تکلیف پہنچ جائے گی یا کسی کا کچھ مالی نقصان ہو جائے گا - لیکن کسی فوجی افسر کی ایسی غلطی کے نتائج مختلف ہوتے ہیں - ہو سکتا ہے کہ اس سے قیمتی جانوں کا نقصان ہو جائے یا لڑائی اور جنگ میں شکست ہو جائے یا کسی ملک کی سلامتی کو نقصان پہنچ جائے - اس بنا پر یہ بورڈ بہترین امیدواروں کو چنتے ہیں -

میں چند لفظوں میں فوج کے افسر کی تنخواہ اور الاؤنس کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں - جب تک کہ کسی افسر کے شوق خرچیلے نہ ہوں یا اس کی شادی جلدی نہ ہو گئی ہو یا اس کے بہت زیادہ بچے نہ ہوں یا وہ رئیسوں کی سی زندگی نہ بسر کرتا ہو میرے خیال میں اسے جو تنخواہ اور الاؤنس ملتا ہے وہ اس بات کے لئے بہت کافی ہے کہ وہ ایک افسر کی حیثیت سے آرام اور شان سے زندگی بسر کرے - میں جانتا ہوں کہ آجکل فوج کی زندگی کہیں بھی ویسی خرچیلی نہیں ہے جیسی بٹوارے سے پہلے ہوا کرتی تھی - جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ فوج کی ملازمت کو کبھی بھی روپیہ پیدا کرنے والا پیشہ نہیں سمجھا گیا - لہذا میں خیال کرتا ہوں کہ جو کوئی شخص روپیہ کمانے کی غرض سے فوج میں ملازمت کرتا ہے وہ ایک غلط انتخاب کر رہا ہے اور میں اسے یہ مشورہ دوں گا کہ وہ کوئی اور پیشہ اختیار کرے -

زمانۂ امن میں سپہ گری کی شادمانی اور لڑائی کے میدان میں اپنے ملک کی خاطر جنگ آزمائی کرنے میں ناموری فوجی زندگی کی مخصوص خصوصیات ہیں - کسی نوجوان کے لئے فوجی زندگی اعلےٰ درجے کے پیشوں میں سے ایک ہے - وہ زمانہ امن میں فوجوں کو اچھے سپاہی بننے کی تربیت دیتا ہے اور میدان جنگ میں ان کی قیادت کرتا ہے - کسی افسر کو اپنی ملازمت کے دوران میں اپنے کو بہت دلچسپی اور خوشی کے ساتھ مشغول رکھنے کے غیر محدود مواقع حاصل رہتے ہیں - اپنے ان سپاہیوں کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ جن کی وہ کمان کرتا ہے اسے انواع اقسام کی گاڑیوں اور جدید سامان جنگ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں اسے مشینی معلومات حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہیں - اسے مشینوں کی بابت ایسی معلومات حاصل کرنے کا کسی اور شعبہ میں سوائے کسی مخصوص فنی شعبہ کے ایسا موقع نہیں مل سکتا تھا -

کمیشن یافتہ ہونے کی بدولت اسے کسی اور ملازمت کے مقابلے میں کہیں زیادہ سماجی روابط کے مواقع حاصل رہتے ہیں جو خود اس کے اور ملک کے لئے دلچسپ اور گرانقدر ہوتے ہیں - ڈیوٹی پر نہ ہونے کی حالت میں اسے تفریح کے موقعے ملتے ہیں - وہ اپنے سپاہیوں اور دوسرے لوگوں سے کھیل کھیلتا ہے - وہ جنگلوں میں جا کر شکار کھیل سکتا ہے یا کیمرا لے کر اس سے فوٹو اتار سکتا ہے - اگر وہ سمجھدار ہے اور فضولیات پر روپیہ ضائع نہیں کرتا تو وہ اپنے لئے گھوڑا خرید سکتا ہے اور گھوڑے والی ورزشوں میں حصہ لے سکتا ہے جیسے شکار یا پولو جو علاوہ اعلےٰ درجے کے کھیل ہونے کے تربیت کے نقطۂ نظر سے بھی بہت عمدہ ہیں - اسے مختلف فوجی تربیتیں حاصل کرنے یا سمندر پار کے متعدد سفارت خانوں میں بحیثیت ملٹری اتاچی کے جانے کے سلسلے میں بدیسی ملکوں میں جانے کے بھی مواقع ہیں -

اور کسی پیشے یا شعبہ زندگی میں کسی نوجوان کو ملک کے دوسرے مختلف حصوں کے اتنے متعدد افسروں سے اتنے قریبی روابط حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا - فوج کی ملازمت ایک سچے ہندوستانی کی حیثیت

سے ہمیشہ ملک کی خدمت کرنے کے لازمی جذبے کو پیدا کرتی ہے۔ اور حقیقتاً یہ جذبہ ہمارے ملک کی خوشحالی اور امن و امان کے لئے نہایت ضروری ہے۔

سماجی خدمت

ایک افسر کی حیثیت سے اسے اپنے دیش بھائیوں کی بہت کافی سماجی خدمت انجام دینے کا بھی موقع حاصل رہتا ہے۔ یہ بات یاد رکھئے کہ ایک افسر کی حیثیت سے اس کا اولین فرض ملک کے باشندوں کی خدمت کرنا ہے اور بحیثیت ایک شہری کے اس کے حقوق اور فرائض کا سوال بعد میں آتا ہے۔ لہذا اس کے دوہرے فرائض ہیں ایک تو اپنے ملک کے لئے اور دوسرے ملک کے باشندوں کے لئے۔ میں نے بتایا ہے کہ سماجی خدمت کے سلسلے میں وہ اپنے عہدے کے اعتبار سے متعدد طریقوں سے مدد دے سکتا ہے۔ زبردست مدد یا معمولی مدد۔

آخر میں ایک بات یہ یاد رکھئے کہ وہ جب ریٹائر ہوتا ہے تو اسے معقول پنشن دی جاتی ہے اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ فوج کا ایک ممبر رہتا ہے اور اسے فوج کی متعدد مراعات حاصل رہتی ہیں۔ حالانکہ اس کا نام برسرکار ملازموں کی فہرست میں نہیں ہوتا۔ میں بہت امید افزا صورت حال پیش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں اور نہ افسر ہونے سے جو بہتریاں حاصل ہوتی ہیں ان کے بارے میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لے رہا ہوں میں ہندوستان کے نوجوانوں کے سامنے فوج کے بارے میں بحیثیت ایک دلکش ذریعہ معاش کے (مالی اعتبار سے نہیں بلکہ پیشے کے اعتبار سے) صرف بعض اصلی حقائق پیش کر رہا ہوں۔

اب مجھے امید ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے اور اس بات کی کوشش کریں گے کہ ملک کے بہترین نوجوان فوج میں افسر بن کر جائیں۔ یاد رکھئے کہ ہوسکتا ہے کہ جو کسی کے والدین یا استادوں کے لئے "بہترین" ہو ان وجوہ کی بنا پر جو میں پہلے ہی بیان کرچکا ہوں فوج کے لئے "بہترین" نہ ہو۔

ہم سب کو متحد ہوکر اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ ہماری ایک ایسی فوج ہو جو دنیا میں بہترین ہو۔ یہ فوج دنیا میں صرف اس طرح بہترین ہوسکتی ہے کہ اس کے ان "عناصر" میں جن کا میں ذکر کرچکا ہوں اس کی کمان کرنے کے لئے — زمانہ امن اور زمانہ جنگ دونوں میں — بہترین نوجوان ہوں۔ اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہمارے اس وسیع ملک میں ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ درجے کے نوجوان ہوں۔

(جنرل کیری آپا اور اسٹیٹسمین دہلی کے شکریے کے ساتھ)

(مترجم حیدر حسن موسوی)

زندگی اور ادب کی جدید اور جدید تر قدروں کا محافظ
فکر و تنقید تعمیر و تخلیق اور توازن و ترقی
ماہنامہ
ایشیا مصوّر
کے ترکیبی عناصر ہیں
اور اسی لئے ——— ایشیا ہماری نہیں عوام کی ملک ہے
ایشیا کو اردو اور ہندی کے بڑے سے بڑے اور نئے سے نئے ادیب و شاعر کی حمایت و تعاون حاصل ہے۔ ایشیا کا مفکرانہ ادب پرانے اور تازہ دم تقلیدی ادب سے آگے ایک نیا قدم ہے — وہ جماعتی پروپیگنڈہ سے بلند ہوکر معاشی و سماجی، قومی اور بین الاقوامی مسائل کا علمی و عملی حل پیش کرتا ہے۔ مشرقی و ہندی تہذیب کی حفاظت ہی نہیں موجودہ سائنسی عہد کی تمام تر تہذیبی خصوصیتوں کی تخلیق اور فروغ ایشیا کا مقصد ہے — ایشیا مغربی و مشرقی ادب کی نئی لہروں کے جزر و مد کا ایک پیمانہ ہے اور ادب کے ساتھ علم کی معلومات و ترقی کا بھی دل سے حامی ہے۔ ان باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ظاہری صورت میں بھی ناقابل مقابلہ ہے سائز ۲۰×۳۰/۸ اور حجم ۹۶ صفحات مشہور اور نامشہور فنکاروں، دانشوروں اور فلمی ستاروں کی دلکش تصاویر پورے وقار اور اہمیت کے ساتھ ایشیا میں شائع ہوتی ہیں — رسالوں کے جمالیاتی معیار کو ترقی دینا بھی اس کا اولین فرض ہے اور وہ خود اس کوشش کا خوبصورت نمونہ ہے۔
قیمت سالانہ:- پاکستان اور ہندوستان سے آٹھ روپے فی پرچہ بارہ آنہ۔ نمونہ کے لئے (ایجنٹ حضرات کے علاوہ) بارہ آنہ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔
ملنے کا پتہ:- ادبی مرکز ہند پبلشرز کورٹ لے آئل کرائسٹ چرچ روڈ بائیکلہ بمبئی ۸

سروش عسکری طباطبائی

تاج محل

جاں گسل ہجر کا دلدوز فسانا کہئے   چاہنے والی نگاہوں کا تقاضا کہئے
شوق و حسرت کی بسائی ہوئی دنیا کہئے   مرمریں خوابِ محبت انہیں کیا کیا کہئے
حسن کے ذہن کی رعنائی تخیل ہے تو
سنگ میں عشقِ فسوں ساز کی تکمیل ہے تو

سیمِ سیال کا ٹھہرا ہوا چشمہ ہے کوئی   رنگ اور نور میں قدرت کا صحیفہ ہے کوئی
قطرۂ اشک کہ ٹوٹا ہوا تارا ہے کوئی   باغِ فردوس کا کھویا ہوا جلوہ ہے کوئی
سنگ میں عشوۂ حور کہاں سے آئی
تابشِ برقِ سرِ طور کہاں سے آئی

واہ ری قدرت و صنّاعیِ دستِ فنکار   منتشر کر دیئے آثار شکن وقت کے وار
نقش کر دی دلِ مرمر پہ صبا کی رفتار   سنگ میں ڈھال دیا چاندنی راتوں کا نکھار
ہر ادا حسن کی پائندہ و محکم کر دی
عشق کے خواب کی تعبیر مجسّم کر دی

آج مرنے کو ہیں مشتاقِ زمانہ تنہا   شرط یہ ہے کہ بنے خاک پہ ایسا ہی مزار
واہ کیا بات ہے اے تاج حسینوں کے مزار   حسن خود ہے تری سنگینیِ صنعت پہ نثار
کر دیا موت کی تلخی کو گوارا تو نے
صفحۂ دہر پہ کیا نقش ابھارا تو نے

فوقیت لے گئی اقوام پہ کوشش تیری   ہند بھولیگا نہ تا حشر نوازش تیری
اہلِ فن کرتے ہیں خاموش پرستش تیری   اللہ اللہ ہمہ گیری و کاوش تیری
پیکرِ سنگ میں بجلی کی تڑپ بھر دی ہے
چاندنی ساغرِ بلّور میں حل کر دی ہے

لی کرن چاند سے، ضو مہر سے، تاروں سے چمک   موج دریا سے، سکوں بحر سے، موتی سے ڈلک
لاج شبنم سے، ہنسی پھول سے، غنچے سے چٹک   دلکشی ناز سے، رم حسن سے، چاہت سے للک
پھر وفاؤں کے لہو میں انہیں تخمیر کیا!
سچ بتا تاج محل کیا یونہی تعمیر کیا ؟

تاج، یا حسن کی معصوم تمنا ہے کوئی   یا کسی شوخ کا اندازِ حیا ہے کوئی
سازِ مہتاب و کواکب کی صدا ہے کوئی   عشوۂ ناہید کا، زہرہ کی ادا ہے کوئی
خاک پر ڈال دیا ناز سے ڈیرا جس نے
لے لیا گھاٹ پہ جمنا کے بسیرا جس نے

اے نئے روپ میں ڈھالے ہوئے قصرِ لبِ جُو   تیری رفعت میں ملا فطرتِ انساں کو نمو
روح سے سجدہ طلب ہیں ترے طاق و ابرو   نام لینا ترا زیبا ہے ہمیں بعدِ وضو
تو محبت کی طہارت کا نمائندہ ہے
حسن کی پاکی و عظمت کا نمائندہ ہے

یہ ترے قوس و خد و خال ترے نقش و نگار   یہ ترے کنگرہ و کرسی و عرش و مینار
یہ عبارات و اشارات و خطوط و ادوار   فن کے آیات ہیں صنعت کے اچھوتے شہکار
تیرے آئینے میں وہ تابش و گیرائی ہے
ملکۂ حسن کی تصویر اتر آئی ہے

یوں رواں ہے رگِ مرمر میں محبت کا لہو   جس طرح پھول کے ریشوں میں رواں ہو خوشبو
طرفہ مجموعۂ حسنِ حرم و دیر ہے تو   نورِ عرفاں سے چھلکتے ہیں ترے جام و سبو
تو نے یکرنگیِ صنعت کو ضیا بخشی ہے
وحدتِ مذہب و ملت کو بقا بخشی ہے

چاندنی رات میں اللہ رے تیرا جوبن — گھونگھٹ اُلٹے ہوئے بیٹھی ہے کوئی شوخ دُلہن
اپسرا چاند کا یا دیکھ رہی ہے درپن — یا محبت کی ستائی کوئی الھڑ جوگن

باؤلے من کے تقاضوں سے جو گھبرائی ہے
تٹ پہ جمنا کے نہانے کو نکل آئی ہے

سوزِ اُلفت سے دمکتا ہوا یہ ٹیڑ جبیں — نورِ عفت سے چمکتی ہوئی یہ لوحِ جبیں
کھڑکی شال سے چھنتا ہوا جسمِ سیمیں — یہ متانت، یہ تامل، یہ وقار و تمکیں

حورِ فردوس کی ملفوف خیالات میں ہے
روحِ ممتاز کی مصروف مناجات میں ہے

یا نہانخانۂ تخلیق میں پاکر اکمال — چھُٹ پڑی ہاتھ سے صنّاع کے کوئی تمثال
یا، یہ ہنگامِ تماشائے گزرگاہِ جمال — رہ گیا جم کے کسی شوخ فرشتے کا خیال

یا، شعاعوں نے بہم عرض نیاز کش کے لئے
بارگہ ایک بنالی ہے پرستش کے لئے

یہ چمکتی ہوئی شاخوں پہ چھلکتے ہوئے جام — آسمانوں سے برستا ہوا آبِ گلفام
بند کلیوں کو یہ نوخیز ستاروں کے پیام — اور آغوش میں جمنا کی ترا ماہِ تمام

کفِ ساقی پہ چھلکتا ہوا مینا ہے کوئی
رودِ تسنیم میں پھولوں کا سفینا ہے کوئی

سرو و شمشاد تلے مست ہوائیں رقصاں — لڑکھڑاتی ہوئی کُنجوں میں کنواری کلیاں
یہ نئی رُت، یہ جواں رات، یہ دوشیزہ سماں — اور تلاطم میں ترا عکس سرِ آبِ رواں

چشمِ آفاق بصد شوق تماشائی ہے
جَل پری سینۂ قلزم پہ اُبھر آئی ہے

ہائے یہ حسن، یہ شوخی، یہ تبسم، یہ بہار — یہ نیا پن، یہ نزاکت، یہ نفاست، یہ نکھار
یہ سجاوٹ، یہ لگاوٹ، یہ تناسب، یہ بہار — یہ اُمڈتی ہوئی مستی، یہ برستا ہوا پیار

عالمِ قدس سے لیلائے عدن رُوٹھ گئی
چاند سے یا کوئی آوارہ کرن رُوٹھ گئی

اللہ اللہ یہ خاموش ترنم تیرا — چاند تاروں سے پُر اسرار تکلم تیرا
تُند و گستاخ ہواؤں پہ تحکم تیرا — شوخ کرنوں سے یہ محجوب تبسم تیرا

صدرِ خوبانِ جہاں ہے وہ حسینہ ہے تو
خاتمِ دہر پہ ہیرے کا نگینہ ہے تو

نہیں گوکل کا دلاویز فسانا ہے کوئی — بندرابن کا جنوں خیز ترانا ہے کوئی
کاشی و برج کا دیکھا ہوا سپنا ہے کوئی — مُرلی والے کا الاپا ہوا نغما ہے کوئی

نغمہ کیا پریم کی بنسی کا بجیّا تو ہے
گو یہاں چاند ستارے ہیں کنھیّا تو ہے

کہکشاں کی یہ پھبن، چاند کا یہ حسن کمال — یہ ہواؤں کے مدھر گیت، یہ انداز خیال
یہ برستا ہوا مخمور فضاؤں سے گلال — اور شفق میں یہ ترے پیکرِ سیمیں کا جمال

رادھا شرماتی ہوئی رنگ کی بوچھار میں ہے!
سیتا اٹھلاتی ہوئی آگ کے گلزار میں ہے!

ایک اُبھری ہوئی موجِ مئے مہتاب شکن — ایک چھلکا ہوا پیمانۂ خورشید فگن
سینۂ ارض سے اُمڈی ہوئی اک جوئے لبن — فرش پر ایک حسین پرتوِ انوارِ عدن

ٹھاٹھ لیتا ہوا سیماب کا دریا ہے کوئی
آتشِ طور کا مچلا ہوا شعلہ ہے کوئی

سنگ اور خشت میں اے مرثیۂ حسن و ادا — اے شعاعوں کے قفس یا دلِ آئینہ نما
اجنبی حسن کے مرکز، حرمِ صدق و صفا — تجھکو اپنی ہی امانت کی قسم یہ تو بتا

تیری تعمیر کے مقصد کا سرانجام تو ہے
تیرے پہلو میں حسیں رُوح کو آرام تو ہے

تنگدل کتنے ہیں سرمائے کی لعنت ہے تو — نازشِ ملک ہے، سرمایۂ ملّت ہے تو
جس نے گھر پائے غریبوں کے وہ دولت ہے تو — زندگی فن کو عطا کی ہے وہ نعمت ہے تو

تجھ سا اس دہر میں تابندہ گہر کیا ہوگا
تجھ سے بڑھ کر کوئی محنت کا ثمر کیا ہوگا

اک نیا معبدِ تسلیم و عقیدت ہے تو — ایک تازہ حرمِ کفرِ محبت ہے تو
طینتِ خاک کا اعلانِ بغاوت ہے تو — یعنی آدم کی سجائی ہوئی جنت ہے تو

تا ابد حسنِ دل افروزِ تو تابندہ باد!
جذبۂ عشق و جنوں زندہ و پابندہ باد!

ابوالفضل صدّیقی

چلے شیر مارنے کو

کچھ تو سولپشت سے پیشۂ آبا کی سپاہ گرانہ روایات کی توریث، اور کچھ اپنی کتابی معلومات! اور اس پر نطق کی خداداد صلاحیتیں، اور چاندماری کی بچپن سے لے کر اب تک کی مشق، خدا کے فضل سے دُور سے دیکھنے والے اور صرف سُننے والے دوستوں کو ہم پورے پورے شیر افگن نظر آتے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں جس زمانے کا یہ ذکر ہے ہم کچھ ایسے ہی ویسے سڑ پیڑ قسم کے شکاری واقع ہوئے تھے۔ انھیں دنوں میں ہم اپنے ادبی دوست ذوقی کے یہاں مہمان ہوئے۔ یہ حضرت عمر میں ہم سے کافی بڑے اور اچھے خاصے شکاری تھے۔ انھوں نے ہماری گفتگو سن کر اور پھر شاید ہمارے اسلحہ دیکھ کر ہماری فن کاری کے متعلق کچھ بہت بلند رائے قائم کرلی، اور جب انھوں نے ہماری ادبی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ہماری شکاری قابلیتوں پر بھی اظہارِ اہمیت شروع کیا تو ہم دل ہی دل میں خوش ہو کر چپ ہو گئے۔ اگرچہ اس زمانے میں ہمارا چاقو قاز، مرغابی، ہرن، تیتر کے خون سے آگے آلودہ نہ ہونے پایا تھا، اور شیر کے شکار پر گھنٹوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر فنّی تقریر کرنے والے شکاری نے اگر شیر کہیں دیکھا تھا تو بس وہیں پاؤں تلے، اپنے ڈرائنگ روم کے قالین پر! ——— اور ذوقی جن پر ادبی رسالوں میں ہمارے شکاری افسانے پڑھ کر پہلے ہی سے رعب جما ہوا تھا، اس ملاقات میں شیر کے شکار کی سائنٹیفک باتیں سُن کر ہمیں پورا پورا

نوجوان دمثلِ پیراں پختہ کار

قسم کا استاد شکاری مان گئے۔ جوں جوں تبادلۂ خیال ہوتا گیا، ہماری فنی معلومات اور تجربے کی حدود مضبوط تر ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ہمارے متواضع میزبان کو ہماری خاطر سے ایک شکار پارٹی ترتیب دینے کا خیال پیدا ہوا، اور جب ہم نے اپنی بے مائگی پر نظر کرتے ہوئے انھیں اس سے روکا تو انھوں نے اسے مشرقی تکلف پر محمول کیا، اور پھر جب ایک اسپورٹس مین کا جذبہ بیدار ہو جائے تو کہیں رکا کرتا ہے۔ میں مصلحتاً روکتا ہی رہا۔ مگر وہ گفتگو کے نازیانوں سے ایسے بیتاب ہو گئے تھے کہ جتنا میں نے روکا اتنا ہی اُن کا شوق تیز تر ہوا، اور انھوں نے اپنی تمام پارٹی کو مطلع اور مدعو کر دیا، اور چوبیس گھنٹے کے اندر ایک پروگرام مرتب کر کے سب کے پاس منظوری اور ترمیم و تنسیخ کو بھیج دیا۔ مقامی ساتھیوں سے ہر چیز بالمشافہ طے ہوئی اور ہفتے بھر کے اندر ہی اندر مکمل پروگرام مرتب ہو کر سامنے آگیا۔

اور اب یوں سمجھئے کہ جوں جوں وقت قریب آتا گیا مہمان کے دل کی دھڑکنیں اتنی رفتار سے تیز ہوتی گئیں جس رفتار سے میزبان کی آتشِ شوق۔ یا اللہ کیسے چھٹکارا ملے! ورنہ کیا ہوگا؟ کچھ سمجھ کام نہیں کرتی تھی۔ معینہ تاریخ قریب آتی جا رہی تھی۔ "بگ ناچ" والے موہنہ زور اور چرب قلم بے عمل شکاری کے دل کی دھڑکنیں اختلاج بن رہی تھیں۔ مدتوں کی قلم اور زبان کی جمی جمائی آج سب اکھڑ رہی تھی۔ دیکھئے بہت باتیں مارا کرتے تھے۔ ایکی مرتبہ کیا گزرتی ہے۔

اور جب پروگرام مرتب ہونے کے بعد ایک روز چاندماری کے تختہ پر مشق کرتے ہوئے میں نے "دوتین گل مارے" تو میری قادر اندازی کی دھاک ساری پارٹی پر بیٹھ گئی اور سب سمجھ گئے کہ جیسا بولتا ہے اور لکھتا ہے اس سے بہتر مارتا ہے۔ مگر ہماری پارٹی کی آتشِ شوق وعدۂ وصل کی نزدیکی کے ساتھ جس رفتار سے تیز ہوتی جا رہی تھی اُسی رفتار سے ہمیں جاڑا چڑھ رہا تھا، اور روز افزوں طیاریاں اور سرگرمیاں دیکھ دیکھ کر ہماری حرارتِ غریزی گھٹ رہی تھی، اور کبھی تو ہمارے دل میں خیال آتا کہ چپکے سے میدان چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائیں، مگر اس کے لئے بہانہ اور جواز نہ تھا، اور آپ جانیں بخار اور دردِ گردہ کا دورہ، وہ بھلا ایسے وقت میں کیوں آتا، سر بھی نہ دُکھا، اور مرزا غالب کی طرح مرنے کی آرزو میں مرتے

بھی رہے اور موت نہ آنا تھی نہ آئی اور روانگی کا وقت آگیا۔ مرتا کیا نہ کرتا؟ اب تمام دن دل خوش کن (اگرچہ دل جس سفر سے کا خوش ہوتا ہو وہ جانے) اسکیموں میں گذرتا اور ہم رات کو بستر پر پہنچکر اس ناگزیر وقت سے مقابلے کے لئے خود کو طیّار کرتے۔ یہاں تک روانگی سے ایک شب پیشتر ہم نے اپنی تمام تر ذہنی قوتوں کے ساتھ ساتھ اعصابی قوتوں کو بھی مجتمع کیا اور بستر پر لیٹے لیٹے ہی نہایت بہادری کے ساتھ اپنی صیّادانہ صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔ آخر اس میں کمال بھی کونسا ہے۔ یہ سب جو بڑے بڑے تیس مارخاں شکاری جمع ہوئے ہیں کل میری چاندماری دیکھکر میرا لوہا مان گئے۔ ان کے پاس تو جرمن اور امریکن رائفلیں ہیں، اور میرے پاس سب انگلش۔ ایک سے ایک بڑھکر، اور اپنے رائفلوں پر ایک سے ایک بڑھکر میرا ہاتھ چڑھا ہوا ہے۔ اب تینوں کی چاندماری میں ہیں اپنا ۳۰ اسپرنگ فیلڈ، ۳۳۳ جیفرے اور ۵۰۰ کارڈائٹ ایک ایک رائفل ہر روز بدل کر لے گیا اور تینوں دن کی چاندماری کا میدان میرے ہاتھ رہا۔ سب نے دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔ اور جب میں چاندماری پر دو دو تین تین سو گز سے اپنی کامیاب گولی چپکا لیتا ہوں، اور پھر ہر بڑے شکاری کی کتاب پڑھ چکا ہوں، اور پڑھتے پڑھتے دل ہی دل میں اس پر تنقید بھی کرچکا ہوں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ میں شیر نہ مارلوں۔

بھلا شیر کے شکار میں کمال بھی کونسا ہے۔ سب انتظام پہلے سے کرلیا جاتا ہے، اور بھلا میں تو ہرن، نیلا، مرغابی، اور چپے کا شکار کھیل چکا ہوں۔ ہرن تو چار سو گز سے ادھر مار کھاتا ہی نہیں، اور مرغابی اور چپے کی پرواز بس جیسے گولی اُڑتی ہے، اور بھلا شیر کے شکار میں فنی کمال کونسا ہے۔ پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اور پھر شیر کی شاہانہ لہراتی چال، یہ بھی نہیں کہ ہرن چنچل کی طرح جست نہیں لگاتا آئے۔ بھئی سو گز کے رینج میں تو، کہو تو آنکھوں پر پٹی باندھ کر نہیں صاحب پیچھے کو نال کرکے گولی چپکا دوں" اور میرے سامنے مستند کتابوں کے صفحے کے صفحے اُلٹتے چلے جارہے تھے اور درجنوں بورڈ چاندماری کے میدان میں چھلنی کی طرح سامنے آگئے۔ میری فنی معلومات اور میری چاندماری کی پریکٹس جس نے سینکڑوں بورڈ چھلنی کردئے۔ کیا وہ ایک گولی، بس ایک گولی، دس فیٹ کے شیر کے Top shoulder پر نہیں لگا سکتا۔ ابھی میں Top shoulder پر نہیں، نواب قطب الدین کی طرح گردن پر جاؤں گا۔ یا برینڈر کی طرح کھوپڑی پر ماروں گا تو کیا سو گز کے اندر اندر میرا ہاتھ خالی جانے کا بھی امکان ہوسکتا ہے؟ کیا ڈھائی تین سو گز پر چاندماری کے "گل" سے بھی ساٹھ ستّر گز کے اندر شیر مارنا مشکل ہے؟ غرض انھیں پرانے مجرّب علمی و فنی نسخوں کی الٹ پلٹ میں ہم نے آنکھیں بند کئے ہی کئے بستر پر کروٹیں بدل کر آدھی رات گذاری۔ یہاں تک کہ آخرکار ہم شیر کے شکاری چھوڑ پورے شیر بن کر نہایت بہادری کے ساتھ سوگئے۔ شیر کے شکار کو گیدڑ چھوڑ اپنی چاندماری کے تختہ کا درجہ دے کر۔

ہمیں اپنی جائے قیام سے تیس چالیس میل ریل میں اور پھر دس بارہ میل بیل گاڑی میں چل کر اپنی شکارگاہ میں پہنچنا تھا۔ جو میرے اور ذوقی کے مشترک دوست مینا صاحب کے علاقہ محروسہ میں واقع تھی۔ اور اسی وجہ سے شکار کیمپ کے جملہ اخراجات اور انتظامات انھیں کے سپرد تھے۔

تمام راستے میں اپنی شکاری ہمہ دانی کا رعب اپنی رائفل کی بجائے اپنی چاندماری کی سند میں پیش کرکرکے ساری پارٹی کی نس نس پر سوار کرتا چلا گیا۔ مگر جب شکارگاہ میں پہنچکر مینا سے ملاقات ہوئی تو میں بھی اُن کے حسنِ انتظام اور جدّتِ طبع پر بے طرح مرعوب ہوکر رہ گیا، اور ساری پارٹی اور خود ذوقی جو بیسیوں مرتبہ والیانِ ملک کے یہاں اعلیٰ انگریزی عہدہ داروں کے ساتھ مہمان ہوکر شکار کھیل چکے تھے۔ انگشت بدنداں رہ گئے۔ مینا پُرگو اور خوش گو شاعر ہیں، اور جس طرح شعر کی ترتیب میں وہ انتہائی جدّتِ طبع سے کام لیتے ہیں اسی طرح شکار پارٹی اور شکار کی ترتیب میں اُنھوں نے ندرتِ فکر و حسنِ انتظام کا ثبوت دیا تھا۔ یعنی جس وقت سے انھیں اُن کے یہاں شکار کھیلنے کے ارادے کی ذوقی نے اطلاع دی تھی، اسی وقت سے اُنھوں نے ایک مخصوص اُو محدود قطعۂ صحرا میں دو شیروں کو مقیّد کررکھا تھا، اور وہ اس طرح کہ ٹائیگر اور ٹائیگریس کی خوابگاہ میں بلاناغہ دو دو بکرے چھوڑ کر انھیں فکرِ معاش سے بالکل بے نیاز کردیا تھا۔ یہاں تک کہ قطعۂ صحرا میں جگہ جگہ چھوٹے بڑے گڑھوں میں پانی بھروا کر شیر اور شیرنی دونوں کو اس

ندی تک پانی پینے کے لئے جانے سے روک دیا تھا، جو اس مخصوص جنگل کے ٹکڑے سے میل ڈیڑھ میل پر بنی تھی اور جگہ جگہ جنگل کے چاروں حدود پر دیدبان بٹھا دئے تھے اور سیتم بالائے ستم یہ تھا کہ یہ سب شاہی انتظامات کرکے اپنے بھیل اور پاسی شکاری قلیوں کے ذریعہ سے نہایت خاموشی کے ساتھ سلطان و ملکۂ صحرا کی تمام ترنقل و حرکت کی رپورٹیں صبح شام منگا لیا کرتے تھے۔ غرض ہماری شکارگاہ میں جو ہمارے کیمپ سے دو تین میل کے فاصلے پر تھی۔ ہمارا شکار فکرِ معاش کے استغنا کی رسیوں اور محفوظ ہونے کے جہلِ مرکب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا آزاد قیدی تھا اور قفس کو آشیاں سمجھ رہا تھا۔

جو شام ہمارے شکار کے لئے منتخب ہوئی تھی اُس سے ایک یا دو روز پیشتر سے شیروں کی مقررہ خوراک دو بکرے یومیہ انھیں نہیں پہنچائے گئے تھے۔ ہمارے مچان ایک ہی قطار میں ایسے مقام پر باندھے گئے تھے جو اس جنگل کے ٹکڑے میں بلند اور موٹے درختوں کے درمیان گھاس کا ایک گول چکر سا تھا جس کے چاروں طرف درخت کھڑے تھے۔ اور اس مُدوّر درختوں کے سلسلے کے نصف دائرے میں ہمارے مچان تھے اور بقیہ نصف دائرہ سامنے بادشاہ اور ملکہ کی تشریف آوری کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ غرض یہ تھا اسٹیج۔ جہاں ہمیں اور شیر کو شیر کے شکار کا ڈرامہ کھیلنا تھا۔ بالعموم شیر کے شکار کا جو طریقہ ہے اُس سے قدرے مختلف طریقہ پر ہمارے دوست مینا صاحب کے انتظام کے مطابق ہمارا شکار ترتیب دیا گیا تھا۔ یعنی اوپر مچان باندھ کر اور اس کے نیچے بھینسا باندھ کر "کل" kill ہونے پر اور دوسرے روز اپنا پس خوردہ کھانے کے لئے آنے پر شیروں کو مارا جاتا۔ ان کو بکروں پر ایسا لگا لیا گیا تھا کہ نیچے بکرے باندھ کر پہلے ہی روز مچانوں پر جا بیٹھنے کی اسکیم تھی۔ چنانچہ شام ہوتے ہوتے ہم اپنے آشیانوں پر پہنچ گئے۔ مارچ کا مہینہ تھا، جب صحرا بھی گلستاں ہو جاتے ہیں۔ موسم خوشگوار تھا، شام بہاریں خنکیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور ہم نہایت آہستہ آہستہ کریپ سول شو پہنے شکاری قلیوں کی رہنمائی میں اپنا راستہ طے کر رہے تھے۔ ذوقی میرے پارٹنر تھے۔ وہ اودھ فارسیٹ اور خیال کی ترائی تک کھیلے ہوئے اور جِم کاربٹ، برینڈر، نائٹ اینگل، قطب الدین اور کون کون سب کو پڑھے ہوئے اور سب سے کچھ مواد لے کر لکھے ہوئے

اور چاندماری اور ادبی دنیا دونوں میدانوں کا یکساں مردِ میدان آج سچ مچ شکار کے میدان میں تھا۔ سرمئی شام کے خاموش دامن کی آڑ آڑ ہم دونوں بسیرا کرتی ہوئی چڑیوں کے چہچہوں میں اپنے آشیانوں پر پہنچ گئے۔ اور تمام جنگل شفق کی سرخ تابناکی سے جگمگا اٹھا۔ ہم درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ اور سینکڑوں مرتبہ کا پڑھا ہوا مچان آج آنکھوں کے سامنے اوپر لٹک رہا تھا۔ اوہ! مچان!! پہلی مرتبہ مچان دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی، بالکل ویسی ہی مایوسی جیسی انگلستان کی ایک دیہاتی لڑکی کو ہوئی تھی اور وہ شاہ انگلستان کو دیکھ کر یک دم متعجب ہو کر چلا پڑی تھی۔

The king is but a man

"مچان! ارے صاحب مچان!! یعنی ہزار ہا مرتبہ پڑھ کر اور لکھ کر پھینک دیا یعنی ایسے ہی موقع پر تو کہا ہے کہ پوری زلیخا پڑھ گئے اور یہی نہیں معلوم کہ زلیخا مرد تھی کہ عورت تھا! مچان نہ تو مسہری ہوتا ہے اور نہ سوفا، نہ کوچ اور نہ آرام کرسی۔ اماں مچان تو کھٹولا ہوتا ہے، اور وہ بھی کچھ اُڑن کھٹولا قسم کا کھٹولا، جو اُڑتے اُڑتے بہتا کرکسی سال سمل کے درخت کی اونچی ٹہنیوں میں اُلجھ کر رہ گیا ہو، اور نیچے سے دیکھ کر ہم غور کر رہے تھے کہ بھلا ہم قدرے بھاری بھرکم قسم کے دو مردِ نشین نفروں کی سمائی اس میں کیسے ہوگی کہ اپنے شکاری قلی کے اشارے پر رسّی میں بندھے ہوئے ڈنڈوں کی لٹکتی سیڑھی پر نٹ کا سا کرتب دکھاتے اوپر چڑھے۔ غیر مثنی بے تکی اس سیڑھی کی ساخت اور لٹکائی تھی اتنی دقّت اس پر چڑھنے میں نہیں ہوئی۔ مگر جب مچان پر پہنچے تو ہمارا خیال صحیح نکلا، مچان تو ہمارے کمر کولہوں کیلئے ہی کافی نہیں تھا۔ اور ابھی ذوقی نیچے سے ڈاروِن کی تھیوری پر اُترتے ہوئے اوپر چڑھ رہے تھے۔ مگر جگہ تو دل میں ہونی چاہیئے، اور ذوقی جیسے پیارے کے لئے ادھر ہم نے غور کیا کہ ہم مرد ہو کر ان عورتوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ جو میلوں کو جاتے ہوئے ایک ایک یکہ اور بہلی میں پوری دو دو درجن مع آدھی آدھی درجن جملہ سائز کے بچوں کے بخوبی سوار ہو جاتی ہیں، ادھر یہ خیال پیدا ہوا ادھر اعصاب پر سکونت سوار ہوئی، کچھ جوں جوں ذوقی اوپر چڑھتے گئے انھیں دیکھ کر گھٹنے پیٹ کر پہنچ گئے، اور گنجائش دوستاں در مچان کرتے ہم دونوں ٹھنس گئے۔ اب موقع واردات سامنے تھا اور آنے والی گھڑی بالکل قریب۔ کیونکہ ہمارے مچان کے نیچے شاہی

دسترخوان لگا ہوا تھا۔ دونوں بکرے چلا چلا کر دو دن کے بھوکے بادشاہ اور ملکہ کو دعوتِ طعام دے رہے تھے اور لطف یہ تھا کہ نشانا نتو قدم کے اعداد و شمار کے مطابق ہیں یہ بھی پہلے سے اندازہ کرا دیا گیا تھا، کہ حضور ملکِ معظم اور ملکۂ معظمہ کس پوائنٹ سے درشن دیں گے۔ اب میں نے اپنا جائزہ لینا شروع کیا تو بفضلہ خود کو نہایت صحیح پایا، اور اس وقت تمام مستند شکاریوں کی کتابوں کا آموختہ یاد کر کے اور پھر اپنی چاند ماری کے بورڈوں کی چھلنیاں آنکھوں میں گھما کر میں نے دل میں خیال کیا کہ بھلا جہاں پہ بکرا کھڑا ہے وہاں پر میری گولی سے شیر بچ کر کیسے جا سکتا ہے۔ اگر وہاں پر چاند ماری کا تختہ لگا دیا جائے تو نہ معلوم کتنی میگزینیں ایک سوراخ پر خالی کر سکتا ہوں، اور مزہ تو جب ہے کہ درشن دیتے ہی نذر کروں، بکرا جوں کا توں بندھا رہے اور میں شیر گرا دوں۔"

بکروں کو ممیاتے پندرہ بیس منٹ ہو گئے۔ ہر سیکنڈ پر شیر کی آمد کا انتظار تھا کہ سعاً ہمیں یہ خیال آیا کہ برینڈر نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چور اور شیر کی تعمیر ایک ہی مٹی سے کی ہے۔ اس کے مارنے کے لئے نہایت خاموشی کے ساتھ ساکن و جامد ہو کر بیٹھنا چاہیئے، اس کی قوتِ سامعہ اور جبلّت غیر معمولی ذکی الحس ہوتی ہے۔ یہ ہلکی سے ہلکی آواز کافی دور سے، اتنی ہلکی آواز کہ جس کو ہم اپنے پندار میں آواز کا درجہ بھی نہیں دیتے اور اتنی دور سے کہ جہاں تک ہماری ہر بندوق کی ضرب بھی نہیں پہنچ سکتی، سنکر اپنے شکار کا اندازہ کر لیتا ہے، اور پھر اتنے دبے پاؤں اپنے شکار پر جاتا ہے کہ اُسے مطلق احساس نہیں ہوتا اور چور کی طرح موقع پر پہنچ کر ہاتھ صاف کر دیتا ہے۔ اسی طرح خطرہ پر اس کی غیر معمولی تیز سامعہ اس کو فوراً خبر دیدیتی ہے اور پہلی مرتبہ احساس ہونے پر شکارگاہ چھوڑ کر سرک جاتا ہے، اور یہ خیال کرتے ہوئے ہم نے اپنے تمام وجود کا جائزہ لیا، آیا ہم اس ماہر شکاری کی لکھی ہوئی ہدایات پر پورے اُتر رہے ہیں یا نہیں۔ تو ہم نے احساس کیا کہ ہمارے حلق میں ایک ہلکی سی لکیر محسوس ہو رہی ہے۔ ہم نے آہستہ سے حلق کو حرکت دیکر اور تھوک نگل کر اُسے صاف کرنا چاہا۔ مگر اس عمل سے اُسے مٹانے کی کوشش کرنے میں وہ تو اور اُگہری ہو گئی، اور چُبھن میں تبدیل ہو گئی۔ بکرے اپنی فطری عادت کے مطابق زور زور سے چلّا رہے تھے اور چلّاتے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی، اور ہمارے دوسرے ساتھیوں کے مچانوں کے نیچے بھی اُن کے بکرے ممیا رہے تھے۔

مگر شکاری قلیوں کے قول کے مطابق بہترین چانس ہمارے مچان پر ہے۔ اور اب عنقریب شیر نمودار ہونا ہی چاہتا ہے۔ لہٰذا خاموشی اور سکوت۔ مگر ٹیٹوئے کو حرکت دیکر اس حلق کی چبھن، بلکہ اب تو خراش! خیر جو کچھ بھی ہے اُسے تو صاف کرنا ہی ہے۔ مگر وہ تو کمبخت اور بھی زیادہ گندہ ہو گیا۔ اور ہم نے ایک لمبی سانس لی، اور ذوقی نے نہایت آہستہ سے گردن موڑی۔ جیسے اُن کی آنکھوں میں جنرل نائٹ اینگیل اور جم کاربٹ والے تیور ناچ رہے تھے۔ نظروں ہی نظروں میں ایک فنکارانہ جواب اپنے ہمعصر فنکار سے طلب کیا۔ مگر آپ جانئے حلق کی لکیر احلق کی لکیر چبھن اور چبھن اچھی خاصی خراش بن گئی۔ اور خراش وقت کی نزاکت کا اندازہ کیوں کرتی۔ زبان کی حرکت، ہونٹوں کی حرکت، حلق کے بار بار اُتارنے چڑھانے کی حرکت کوئی بھی سودمند ثابت نہ ہوئی اور ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، مدتوں سے نزلہ تو ہوا نہ تھا، مگر اس وقت نہ معلوم کیوں، غالباً صاف کرنے کی کوشش میں بلغم میں تبدیل ہو گئی۔ یہ بڑا غلیظا حلق میں اٹک گیا سانس لینی دوبھر ہو گئی اور شیر کے شکار کی قانونی کتابیں پڑھا ہوا ماہر شکاری منھار کر حلق صاف کرنے کی خلاف قانون حرکت پر مجبور تھا۔
"اوں ہوں، اوں ہوں، اَق تھو"

اور ذوقی نے نہایت قہر آلود نگاہوں سے گھورا، مگر ہم نے اپنے پلکوں کو سرنگوں کر کے اظہارِ ندامت اور طلبِ عفو کیا۔ ہم اپنی اس "اوں ہوں اوں ہوں اَق تھو" کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے کہ اس کے متعلق کتابوں میں کیا آیا ہے۔ مگر صاحب مجبور تھے کیا کرتے۔ آپ سمجھئے جب ایک شخص کا حلق ہی رُک جائے، سانس بند ہونے لگے، تو مرتا کیا نہ کرتا۔ بیچارے کو سبھی کچھ کرنا پڑے گا۔ خیر گذشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط۔ اب کی مرتبہ میں پتھر کا بت بن کر شیر کے شکار کے تمام دکمال آداب پوری طرح برتنے کے لئے طیار ہو کر بیٹھا۔ بمشکل دو منٹ گزرے ہوں گے کہ میری گردن پر پیچھے کو کچھ جیسے رد آہٹ کا احساس پیدا ہوا اور میں نے خیال کیا کہ شاید کوئی کیڑا درخت سے گر کر میری گردن پر رینگ رہا ہے۔ مگر جب ذرا احساس ہوا تو دوسرے ہی منٹ وہ ہلکی کھجلی میں تبدیل ہو گیا: "ہوں کھجلی ہو رہی ہے؟" میں نے دل میں کہا، "ہونے دو ہرگز کھجاؤں گا تو نہیں"، اگرچہ میں نہایت سختی کے ساتھ چپ چاپ بے حس و حرکت بیٹھنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ مگر اس کے

باوجود جتنی ضبط کرنے کی کوشش کی کم بخت اور بڑھتی گئی، اور جب ضبط کی حد سے باہر ہوگیا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر اور انگلیاں پیچھے لے جاکر کھجانا نامناسب نہ سمجھا بلکہ کچھ کاندھا اُچکایا، کچھ گردن جھکائی اور کاندھے اور گردن کی رگڑ سے مطلب برآری کرنی چاہی۔ مگر افسوس کہ ہماری اس "بندر رویت" پر ذوقی صاحب بھی ادھر متوجہ ہوگئے اور کاندھا بھی کھجلی کی جگہ تک پہنچ نہ سکا۔ ہم سب کچھ جاننے کے باوجود بھی انجان تھے۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہ ذوقی صاحب ہمارے متعلق اتنی ہی پست رائے قائم کر رہے ہوں گے جتنی کہ بلندی پر ہم اُن کے ساتھ براجمان تھے۔ مگر صاحب کھجلی کا تو یہ مشہور طریقہ ہے کہ جتنا بھول جانے کی کوشش کرو اتنی ہی اور تیز ہوتی ہے۔ اور آخر تابکے۔ ایک دو چار منٹ بعد ہمیں ہاتھ پیچھے لے جاکر مقابلہ کرنا ہی پڑا۔ اس حرکت پر ہمارے شائستہ اور شاعر قسم کے شکاری ساتھی نے سخت نا ملائم اور غیر شاعرانہ نگاہوں سے دیکھکر آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم سے گویا کہا "نہایت ناشائستہ آدمی ہو جی"! خیر اب پتھر میں حرکت ہوگی مجھ میں حرکت نہ ہوگی۔ دیکھوں رونگٹا تو ہلے صبح تک"! مگر اب بھلا میں اسے کیا کروں کہ مچان پر چڑھتے وقت یا سکڑ کر بیٹھتے وقت میری ویسکوٹ کا بکسوا بل کھاکر کھڑا ہوگیا تھا اور میری پشت میں چبھ رہا تھا۔ خیر کچھ ہوجائے، چاہے یہ گوشت میں گھس ہی کیوں نہ جائے اب کی حرکت نکروں گا۔ اور میں تقریباً تین چار منٹ جی کڑا کئے بیٹھا رہا۔ بس جیسے تین چار صدیاں میری پیٹھ پر گذر گئیں عجیب سوزش تھی۔ پہلے تو صرف روپیہ برابر جگہ پر ہی محدود رہی۔ پھر چند باریک لال چیونٹیاں پیٹھ پر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر رینگتی معلوم ہوئیں خیر صاحب چیونٹیوں تک بھی بس تھا، اب تو پیٹھ پر جگہ جگہ کنکھجورے رینگ رہے تھے۔" اونہ خواہ کچھ ہوجائے" اور ہم نہایت استقامت کے ساتھ صبر کی سِل سینہ کے عوض پشت پر رکھے بیٹھے رہے۔ خیر صاحب اس وقت تک تو ہم دانتوں میں ہونٹ بھینچے بیٹھے رہے۔ جبتک کہ چیونٹیوں نے کنکھجوروں کا روپ دھارا۔ مگر جب کنکھجورے بجائے ہزار پایہ کے چوپایہ کا چولا بدل گئے اور ہماری پیٹھ "از کمر تا گردن" گھوڑ دوڑ کا میدان بن گئی تو اس ڈربی ریس کی تاب نہ لاسکے۔ بس ہماری پیٹھ میدانِ حشر بنی ہوئی تھی اور بلا مبالغہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے بکسوئے کی جگہ پر بھرپور شیر کا پنجہ گڑا ہوا ہے۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے۔ ایسی حالت میں اگر ہم نے اپنا ہاتھ پیچھے لے جاکر بکسوا درست کیا تو کیا قصور کیا، اور اگر ایسی صورت پیش آئی تو برینڈر، کاربیٹ، نائٹ انگیل، قطب الدین اور پرنس رنجیت سنگھ اور ہمارے پارٹنر میاں ذوقی صاحب بھی کیا کرتے۔ لیکن ہندی مقولہ "کمٹور کاٹی اور سمرو بگی" کا مصداق ہم نے بکسوا درست کرنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ تو شکاری لباس میں کسے ہوئے، کچھ مچان پر تنگی، ہاتھ بھی بکسوئے تک پہنچ نہ سکا، اور اس حرکت میں مچان آہستہ آہستہ سے چرچرایا۔ ذوقی صاحب نے پھر ہماری جانب دیکھا۔ انداز اور تیوروں میں میزبان اور مہمان والا حفظ مراتب بالکل غائب، اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "میاں کہیں کھلے بندھے ہو کہ نہیں۔ اور پھر اسپورٹس مین کی مخصوص نا اُمیدی اور بیگانگی آنکھوں میں ناچ گئی، اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا کہ اب خواہ کسی دوسرے "کل" پر تو چلے جائیں ہمارے "کل" پر آتے نہیں شیر، اور کچھ مکدر ہو کر منھ پھیر لیا۔ ہماری خفت کا کیا ٹھکانا تھا۔ تاہم پھر افسانۂ صبر و رضا کی تکمیل کرنے بیٹھ گیا اور تقریباً پندرہ منٹ مراقبہ میں بیٹھے گذر رہے، اور ذوقی حبس دم لگائے شیر کے منتظر تھے اور ہم اپنی مصیبت میں گرفتار۔ بتائیے اس کا کیا علاج تھا کہ باوجود کیمپ سے لیمنڈ پی کر چلنے کے بھی محض بائیں جانب شاخ پر لٹکتے ہوئے کورے گھڑے کو دیکھکر ہی ہماری پیاس مچل رہی تھی، اور ہم ضبط کئے ہوئے تھے۔ آن کی آن میں پیاس کے مارے تالو چٹخ اُٹھا اور پھاگن چیت کی پیاس آندھی کی طرح چڑھی ہے۔ بے چین ہوگئے ہم آورد تین منٹ ضبط کی۔ مگر یہ کچھ ساون بھادوں کی پیاس تو ہے نہیں جو لگ کے مرجاتی ہے۔ یہ تو پیتے ہی بن پڑیگا۔ "ہم نے دل میں کہا" اور پھر ضبط کی کوئی حد بھی ہو — رونگٹے رونگٹے سے شرارے چھوٹنے لگے "آخر یہ گھڑا پانی بھر کاہے کے لئے لٹکایا گیا ہے" میں نے دل میں سوال کیا "پانی پینے ہی کے لئے تو ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ جب میں اتنا پیاسا ہوں پانی نہ پیوں"!

اور پیاس کی شدت سے بیتاب ہو کر اور ذوقی صاحب کی جانب سے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر کلھڑ میں پانی اُنڈیلا۔ نہایت احتیاط کے ساتھ یہ خیال رکھتے ہوئے کہ گھڑے اور کلھڑ کے تصادم سے کوئی ادنیٰ سی بھی آواز نہ ہونے پائے۔ خیر صاحب! میں نے نہایت ہوشیاری سے بغیر

پانی کے گرنے یا گھڑے اور کلھڑ کے ٹکراؤ کی آواز کیے ہوئے پانی انڈیلنا شروع کیا۔ مگر آپ مانیئے بڑے اور چھوٹے ظرف کا کیا ساتھ۔ گھڑا بھرا ہوا تھا اور کلھڑ خالی، پانی بہت سا آپڑا اور چھوٹا سا پیالہ چھلک پڑا۔ نیچے سال کے خشک پتّوں کا فرش جو ذرا سی ہوا چلنے پر ہی نقارے کی طرح بج اٹھتے ہیں چھلک کر بلندی سے جو پانی گرا تو ٹپ ٹپ ٹپا ٹپ۔ ٹپ ٹپ ٹپا ٹپ جنگل کی خاموش اور پُرسکون فضا میں ہنرا، دن بے وقت کی شہنائیاں بج اٹھیں، اور ذوقی نے مجھے ایسے زہریلے تیوروں سے دیکھا کہ جیسے مجھے مچان سے نیچے دھکا دینے والے ہیں۔ مگر ذوقی کے تیوروں کی پرواکون کرتا۔ ہم تو گھڑے کی خیر مانگ رہے تھے جو کلھڑ چھلکنے کی وجہ سے سنبھالنے کی کوشش ناکام میں بدلگام ہو کر ہمارے ہاتھ کی گرفت سے آزاد ہو گیا تھا اور نہایت دور سے جھولا جھول رہا تھا اور بار بار شاخ سے ٹکرا جاتا تھا۔ ہم نے آنے والے خطرے کے احساس سے جلدی سے وہ رتی پکڑ کر گھڑے کی حرکت پر قابو حاصل کرنا چاہا جس میں وہ جھول رہا تھا۔ رتی پکڑ کر کلھڑ والے ہاتھ سے گھڑے کو اک ذرا بیلنس کرنا چاہا تو پھر اک کلھڑ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا جیسے رائفل کا فیر ہوا اور کلھڑ سنبھلنے کی تدبیر میں تدبیر الٹی، تقدیر الٹی سب کچھ الٹ گیا۔ گھڑے کی رسی بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اور جھولتے ہوئے گھڑے پر ایک مزید تازیانہ سا لگا اور جمناسٹک کے ٹکتے ہوئے کھلاڑی کی طرح گھڑے نے ایک مزید جھٹکے کے ساتھ گلو خلاصی حاصل کی اور اس جست کے ردِ عمل میں شاخ سے ٹکرا کر درجۂ شہادت پا گیا۔ اڑا ڈا ڈا ڈوں۔ شاخ در شاخ ٹھیکرے ٹکراتے نیچے گرے۔ جیسے بادشاہ سلامت کو ایک سو ایک توپوں کی سلامی دی گئی۔ آواز اور اس کی صدائے بازگشت کی صدائے بازگشت سے دو تین منٹ تک جنگل گونجتا رہا۔ جھاڑیوں میں سے مور بول پڑے، اردگرد کے درختوں سے چڑیاں چرچرا کر اڑ گئیں۔ ذوقی صاحب نے پیک نگل کر لَاحَولْ پڑھی۔ سیدھے ہاتھ والے مچان سے مینا صاحب نے خیریت دریافت کی۔ بائیں جانب سے استاد رضا خاں للکارے "کیا غدر مچایا ہے"۔ دور سے سردار ہرنام سنگھ کی کرخت آواز سنائی دی۔ "شکار رہے کہ گڈی بازار" غرض چڑی مار کا ٹولہ، بھانت بھانت کا بولا۔ ہم سب کی سُن رہے تھے۔ اور محسوس کر رہے تھے کہ نہ حلق میں بلغم ہے، نہ گردن پر کھجلی، نہ پشت پر بکسوا چبھ رہا ہے اور نہ پیٹ میں پیاس ہے۔ کچھ بھی نہ تھا مگر ہماری پیشانی پر ندامت کے قطرے ضرور تھے اور شیر کے شکار کے ڈرامہ میں ایکٹ شروع ہونے سے پہلے ہی ڈراپ سین ہو چکا تھا۔ رسی کے ٹکڑے میں بندھا ہوا گھڑے کے منھ کا ٹھیکرا اب بھی مزہ لے لے کر آہستہ آہستہ جھول رہا تھا اور درخت کے پتّوں پر سے پانی کے قطرے آہستہ آہستہ سال کے پتوں پر طبلہ، نقارہ، ڈھول وغیرہ پیٹ رہے تھے، اور ہمارا بہرہ حافظ صاحب کے اُس مصرعہ کو یوں پڑھ رہا تھا ؏

آں گھڑا بشکست و آں کلھڑ نماند

سیّد حرمت الاکرام

خندۂ شبنم

وقت کی گود سے خورشیدِ سحر کے مانند
زیست اُٹھی ہے نیا جذبۂ تعمیر لئے

خلدِ آدم کو بنانے کے لئے خلدِ بریں
ابن آدم کے ہر اک خواب کی تعبیر لئے

بجلیاں لرزہ براندام ہیں طوفاں خاموش
کون رکھے قدم انسان کی تخیل کیساتھ

پستیاں مائلِ پرواز ہیں سوئے افلاک
"زندگی کیا ہے" اس اجمال کی تفصیل کیساتھ

آج شرمندہ ہے جاگے ہوئے انسان کا ضمیر
اپنے ماضی کی سسکتی ہوئی بے نوری پر

طعنہ زن آج ہے خود داریٔ آدم کا سکوت
اپنے "مختار" کی بخشی ہوئی مجبوری پر

آج صدیوں کے ستائے ہوئے دل اور دماغ
نازفرما ہیں نئے دَور کی زینت بنکر

اور سرمایہ کی آنکھوں میں اتر آیا ہے
آج مفلس کا لہو اشکِ ندامت بنکر

اب نقط ان ہی کا چہرہ نہ منوّر ہوگا
اب ضیا بار شبِ غم بھی نظر آئے گی

کچھ گلوں کے ہی لئے وقف نہیں خندہ لبی
مسکراتی ہوئی شبنم بھی نظر آئے گی

سوہن لال سیٹھی

روس کا عظیم مصنّف چیخوف

روس کے عظیم مصنف چیخوف کو روسی ادب میں وہی درجہ حاصل ہے جو موپساں کو فرانسیسی ادب میں - روس میں چیخوف کا نام مختصر افسانے سے منسوب ہے اور اسے افسانہ نویسی میں ایک نئی طرز کا خالق تسلیم کیا جاتا ہے - انیسویں صدی کی دوسری ششماہی روس کی تاریخ میں روسی عوام کی ہمہ گیر پژمردگی اور سست روی کے لئے مشہور ہے - چیخوف نے اپنے افسانوں میں اسی دور کی ترجمانی کی - اس نے اپنی عظیم قوت مشاہدہ سے محنت کش اور متوسط طبقہ کی بے اطمینانی اور مایوسی اور خوشحال طبقہ کے تنزل کا جائزہ لیا اور ایک فنکار کی حیثیت سے اپنے مشاہدوں کو زینت قرطاس کیا -

ایک تجربہ کار، ہنرمند اور قابل ڈاکٹر کی حیثیت سے چیخوف نے روسی سماج کی بیماریوں کی تشخیص کی - گورکی اور ٹالسٹائی اس کے ہمعصر تھے اور وہ اس کی انتہائی سادگی، بے پایاں خلوص اور وسیع النظری کے قائل تھے - ایک موقعہ پر ٹالسٹائی نے کہا تھا کہ "چیخوف منفرد شخصیت اور خیالات کا مالک ہے اور اس کا کسی دوسرے مصنف سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کا ادب موپساں سے ملتا جلتا ہے"

چیخوف ۱۸۶۰ء میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا - اس کے باپ نے سخت محنت کر کے اپنے بچوں کو تعلیم دلائی - چیخوف کے والدین کو زندگی کی جدوجہد میں عظیم مشکلات سے دوچار ہونا پڑا - اس نے اپنی سوانح عمری میں ایک جگہ لکھا ہے - روزمرہ کی پریشانیوں کا بار میرے کندھوں پر تھا - افلاس کے ساتھ جدوجہد میں میرا جی اُکتا گیا اور میں نے رسالہ "نووورمیا" کے ایڈیٹر سوورن کو لکھا کہ اس دنیا میں زندگی کی جدوجہد سے زیادہ تھکا دینے والی کوئی اور چیز نہیں - یہ جدوجہد تمام خوشیاں نچوڑ لیتی ہے"۔

اگرچہ چیخوف نے افلاس کے مصائب کو شدت سے محسوس کیا تاہم اس میں انہیں برداشت کرنے کی ہمت تھی - وہ اپنے باپ کی دوکان میں دل لگا کر کام کرتا یہاں اسے مختلف الطبائع انسانوں سے واسطہ پڑا اور اس نے اپنے ذہن میں اپنی زبردست قوت مشاہدہ سے ان کے عادات و خصائل - ان کی کمزوریوں اور ان کے دماغی اور جسمانی رجحانات کا ذخیرہ جمع کر لیا - سیکنڈری اسکول میں تعلیم پانے کے بعد وہ طب کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہوا وہ کہا کرتا تھا کہ "میری بیگم تو دوائی ہے لیکن میری محبوبہ لٹریچر - اس کے باوجود اس نے دونوں پہلوؤں میں اپنے فن کے کمالات دکھائے - دراصل ڈاکٹروں کے پیشے نے اس کی ادبی تخلیقات میں اس کی مدد کی اور اس نے اپنے مریضوں کو تجزیاتی نقطہ نگاہ سے پرکھنے میں مہارت حاصل کر لی - اس کی قوت مشاہدہ کی روز بروز پرورش ہوتی رہی حتّٰی کہ اس نے زندگی کا ایک نیا اور جداگانہ نظریہ قائم کر لیا -

چیخوف ابھی طالب علم ہی تھا کہ اس نے اپنے خاندان کی مالی امداد کے لئے لکھنا شروع کر دیا - شروع میں ایک فرضی نام سے بہت سے رسالوں میں مزاحیہ کہانیاں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں - اگرچہ اس کی کہانیاں پڑھنے والوں میں اس کے مدّاح بھی تھے تاہم بہت سے ادیب اس کے ادب پر کڑی تنقید کرتے تھے - چیخوف غیر معمولی طور پر حسّاس تھا اس لئے اس تنقید کا اس پر گہرا اثر ہوا چنانچہ اس نے اپنے ایک ڈرامے میں جس کا ایک کردار ایک مصنف تھا اس امر کی وضاحت کی کہ مصنفین کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے - پچیس برس کی عمر میں چیخوف نے "زندگی بڑی عجیب ہے" کے عنوان سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جو پند و نصائح سے پُر ہے - اس کا

خیال تھا کہ ان پر عمل کرنے سے انسان اپنی زندگی کی تاریکیوں میں اجالا پیدا کر سکتا ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ کڑی سے کڑی آزمائش کے وقت بھی ہمت و استقلال کی باگ ڈور ہاتھوں سے نہیں چھوڑنی چاہیئے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ ہمارے گناہوں کے باوجود دنیا دلچسپ ہے ہماری مایوسیوں اور مصیبتوں کے باوجود دنیا عجیب ہے۔ جب چیخوف پر مایوسی اور ناامیدی کے جذبات طاری ہو جاتے تھے تو ان پند و نصائح سے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

چیخوف کی پہلی کتاب سنہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ تھی۔ اگرچہ ان کہانیوں میں ظاہرا طور پر مذاق اور قہقہے ہیں لیکن یہ قہقہے سماج کی دکھتی رگوں سے گندہ خون نکالنے کے لئے فصد کھولنے کا کام دیتے ہیں اور ان کی گہرائیوں میں غمگینیاں اور مایوسیاں پنہاں ہیں۔ سنہ ۱۸۹۰ء کے بعد چیخوف کے افسانوں کا رنگ روپ بدل گیا وہ زیادہ سنجیدہ اور پختہ بنتے گئے اور ان میں مزاحیہ پہلو رفتہ رفتہ ختم ہوتا گیا۔ چیخوف کے بہترین افسانوں میں "شرط" "معلم ادب" "کسان" "وارڈ نمبر ۶" "دبچھنکا" اور "اسٹیپ کے میدان" قابل ذکر ہیں اس کی طویل کہانی "زندگی" میں اس کا فن انتہائی عروج پر ہے۔

چیخوف کی کہانیوں کے ہیرو عام انسان ہیں جو بسا اوقات انتہائی مایوس اور آزردہ خاطر نظر آتے ہیں۔ وہ نیک امیدوں اور ارادوں کے مالک ہیں۔ آدرش وادی ہیں اور ایک خوشحال اور روشن زندگی کے خواب بنتے ہیں لیکن اپنی امیدوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی کوشش نہیں کرتے اُن کی زندگی پُر جوش نہیں۔ وہ مصمم ارادے کے مالک نہیں۔ عملی زندگی میں قریب قریب تمام بُری طرح ناکام رہتے ہیں۔ انہیں چیخوف کی ہمدردی حاصل ہے کیونکہ اس کے نظریے کے مطابق وہ حالات کا شکار ہیں اور ان کی ناکامی میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں۔ ان میں سے اکثر جن کے ذہنی رجحان کی چیخوف نے صحیح ترجمانی کی ہے اپنے غموں کو شراب ناب میں بہا دینا چاہتے ہیں اور جب وہ بالکل مایوس ہو جاتے ہیں تو خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو زمانے کو صلواتیں سناتے ہیں کیوں کہ وہ زمانے کو ہی اپنی مصیبتوں کے لئے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس قسم کے مایوس انسان چیخوف کی کہانیوں کے کردار ہیں اور انہی کی بدولت چیخوف اپنے دور کا کامیاب ترین اور ہر دلعزیز مصنف ہے۔

چیخوف کے ڈرامے اپنے پس منظر اور مزاج اور سنجیدگی کے لحاظ سے اس کے افسانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ شروع شروع میں اس کے ڈرامے جنہیں سٹیج بھی کیا گیا چنداں کامیاب نہ ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں جب اس کا ڈرامہ "سمندری پرندہ" اسٹیج کیا گیا تو اسے عظیم کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے ڈرامے "چیری کا باغ" کے متعلق ایک برطانوی تنقید نگار نے کہا ہے کہ یہ چیخوف کا بہترین ڈرامہ ہے اور جس روز اسے اسٹیج کیا گیا وہ چیخوف کی زندگی کا کامیاب ترین روز تھا۔

اگرچہ چیخوف اپنے دور کی سماجی حالت سے مطمئن نہیں تھا تاہم وہ کوئی انقلاب پسند نہیں تھا وہ ایک فن کار تھا جس کے قلم نے کمینگی، کم ظرفی، خود پرستی، تنگ نظری اور تحمق کے خلاف جہاد کیا اور اپنی تصانیف میں ان برائیوں کا مضحکہ اڑایا۔

اپنی زندگی کے آخری ایام چیخوف کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے کریمیا کے جنوبی ساحل اور جرمنی کے دوسرے صحت افزا مقامات پر بسر کرنا پڑے۔ اس وقت اس کی صحت گر چکی تھی ۲ جولائی سنہ ۱۹۰۴ء کو جنوبی جرمنی کے صحت افزا مقام بیڈن ویلر پر اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

گورکی کہا کرتا تھا: "چیخوف کی یاد ہماری زندگی میں ایک نئی روح پھونک دیتی ہے اور زندگی کا ایک صاف اور یقینی مقصد ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔"

آج کل کی توسیع اشاعت ہر بہی خواہ اُردو کا فرض ہے

اختر تاباں

ترقّی پسند شادی

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب میں سینہ اُبھار کر چلا کرتا تھا۔ میری شادی کے تذکرے گھر گھر تھے۔ جس طرف دیکھئے میرا ہی ذکر تھا اور جس گھر میں گھس جائیے میرا ہی فوٹو لٹکا ہوا تھا۔ شادی ایک بہت ہی نازک مسئلہ ہے جس سے ہر نوجوان کو دلی محبت ہوتی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس معاملے میں کافی غور و خوض کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر شادی میں ذرا بھی کسی قسم کی رکاوٹ یا مشکل پیش آئے تو میری رائے میں ہر نوجوان مرد اور عورت کو کم از کم اس معاملے میں ضرور جواں مردی اور جواں عورتی سے کام لینا چاہیئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں جس قدر دلیری سے میں نے کام لیا تھا اس کی مثال انڈومان نکوبار میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ اور یہ ثابت قدمی میرے لئے ضروری بھی تھی کیونکہ شادی میری ہو رہی تھی۔ میرے والد صاحب کی نہیں۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر گھر والوں نے شادی کے سلسلے میں ذرا بھی چون و چرا کی تو میں سیدھا یو، این، او پہنچوں گا۔ کیونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس سے بین الاقوامی امن کو خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ والد صاحب نے بھی چراغ کی لو میں بال سیاہ نہیں کئے تھے۔ وہ بات کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے مجھکو فریڈم آف اسپیچ، پریس اینڈ تھاٹ کے ساتھ ساتھ فریڈم آف چوائس بھی دے دی تھی۔ اور نہ صرف یہ کیا تھا بلکہ جتنی ہنر مند لڑکیاں نظر میں تھیں ان سب کے پیغام اور تصاویر کسی نہ کسی طرح حاصل کر لی تھیں۔ پیغاموں کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ والد صاحب کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ کتنے ہیں اور کہاں کہاں سے آئے ہیں۔ پیغاموں میں تصاویر کے علاوہ گورنروں اور وزیروں کی سفارشیں بھی شامل تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ ان تمام تصاویر کو ایک مرتبہ تو ضرور دیکھ لوں۔ چنانچہ ایک دن موقع ڈھونڈھ کر والد صاحب کی الماری سے نکال لیں اور سیدھا پہنچا دریا کے کنارے۔ کیونکہ وہاں دھوبیوں کے سوا اور کسی کے آنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ دل تشکر کے جذبات سے لبریز تھا، اس لئے سب سے پہلے دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کی۔ اس کے بعد ایک سلسلے سے تصویریں دیکھنا شروع کیں۔

یہ عجیب بات تھی کہ تصاویر جغرافیے سے بہت متاثر تھیں یعنی ایک صاحبہ کی تصویر مدراس سے آئی تھی ——— بھونرے کا سا رنگ، ہونٹ موٹے موٹے۔ ناک پھولی ہوئی جامن کی طرح اور شقہ ——— ؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گلے کی ناپ سے بنوائی گئی ہے۔

ایک تصویر پر نظر پڑی جو جودھ پور سے آئی تھی ——— چہرہ مرجھایا ہوا، ہونٹ لٹکے ہوئے، پریشان حال، تصویر کیا تھی، پیاس کا مجسمہ تھی جس کے ہر نقطے سے "واٹر پلیز" کی صدا نکل رہی تھی ——— پہاڑ والی تصویر کا تذکرہ خطرے سے خالی نہیں۔ نہ معلوم کس کس سے دشمنی مول لینا پڑے۔

ایک صاحبہ کا پیغام دلی سے آیا تھا۔ اس کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ اگر وہ تصویر کہیں شاعروں کے سامنے پیش کر دی جاتی تو وہ اسی روز سے معشوق کو سرو کے بجائے قطب مینار سے تشبیہہ دینا شروع کر دیتے اور ہجر کی پہاڑ سی راتیں قطب کی لاٹ کی طرح طویل ہونے لگتیں۔

یوں تو خیر ہر تصویر کو آب و ہوا سے گہرا تعلق تھا لیکن سب سے عمدہ تصویر جو مجھے معلوم ہوئی وہ سرحد سے آئی تھی۔ فونٹین پن میں تو اتنی طاقت نہیں کہ اس کا صحیح نقشہ کھینچ کر سادہ کاغذ خراب کرے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اگر مجھ سے بڑا ریاضی داں مر بھی جاتا تو شاید اس کی باہوں اور میری رانوں میں کوئی فرق نہ نکل پاتا یعنی اقلیدس کی رو سے (اس کی باہیں) — (میری ران) = صفر پس یہی ثابت کرنا تھا۔

میں تقریباً ہر تصویر کو بغور دیکھتا گیا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی شادی کے قابل نہیں تھی۔ وہ بات ہی دوسری ہے کہ شکلیں کیلئے سبھی موزوں تھیں۔ میں عجیب شش و پنج میں پڑ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ ان تمام لڑکیوں میں مجھے کوئی بھی پسند نہیں تھی۔ اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری فریڈم آف چوائس انہیں تصویروں تک محدود ہے۔ والد صاحب نے تمام پیغام بڑی محنت سے جمع کئے تھے جس طرح سے عام طور پر لوگ ٹکٹ، سکے، تصویریں اور ہویاں جمع کرتے ہیں وہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ میں ان تمام امیدوارئوں کو ناامید کر دوں جن کی درخواستیں ہندوستان کے تقریباً ہر کونے سے آئی تھیں۔ ایک مرتبہ ارادہ ہوا کہ اسی دریا میں کود پڑوں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ ابھی کھانا تو کھایا ہی نہیں پس اس ارادے کو ترک کر دیا۔

بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر سوچا، پھر سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن واہ رے دماغ، خوب ساتھ دیا ہے۔ فوراً خیال آیا کہ میرے اتنے دوست ہیں، اگر وہ اس آڑے وقت میں کام نہ آئیں گے تو پھر آخر وہ ہیں کس مصرف کے۔ انہیں کے ذریعے سے بھوک ہڑتال کروا دوں۔ پھر دماغ اس سے بھی زیادہ بلندی پر پرواز کرنے لگا۔ یعنی جب میں اس اسکیم کے دور رس نتائج پر پہنچا تو مجھے اس ارادے کو بھی ترک کرنا پڑا ——— ظاہر ہے کہ بھوک ہڑتال کے بعد لاٹھی چارج ضروری تھا۔ نتیجہ ——— ؟ دو چار زخمی ——— چار چھ گرفتار ——— جیل ——— مقدمہ ——— جیل ——— اور ہم پھر کنوارے کے کنوارے ——— یعنی ع

پھر آ گئے وہیں پہ جہاں سے چلے تھے ہم

میں اسی فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس وقت بڑی پُرفریب چال کی ضرورت تھی رہ رہ کر غصہ آتا تھا کہ انگریزوں نے دو سو سال تک حکومت کی۔ اُن کی ہر اچھی بُری عادت کی تقلید کی۔ ان کے جاری کئے ہوئے ٹکٹ اور لفافے کارڈ سے کام چلاتے رہے لیکن افسوس اُن کی ایک خصوصیت اب تک اپنے اندر نہ پیدا کر سکے ——— عیاری اور چالبازی ——— کاش میں اس ہنر سے واقف ہوتا تو آج کیوں اس قدر پریشانی ہوتی۔

پھر نہ معلوم کس طرح طبیعت نے پلٹا کھایا اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ پژمردگی کے آثار دور ہونا شروع ہو گئے۔ چہرے پر رونق آ گئی۔ فوراً سائیکل سنبھالی اور ایک سمت روانہ ہو گیا۔ میں اب گھر جانے کے عوض ایک نہایت ہی خوش فضا بلکہ خوش مکان سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ دائیں طرف دیکھئے تو کوٹھی۔ بائیں طرف دیکھئے تو کوٹھی۔ سامنے تو خیر کوٹھیاں تھیں ہی لیکن جب میں نے پیچھے کی کوٹھیوں کا جائزہ لینے کے لئے اپنی گردن موڑی تو ایک بڑے سے نالے نے مجھے اپنی آغوشِ محبت میں لے لیا لیکن شرمندگی نہیں اُٹھانا پڑی کیونکہ سڑک پر کوئی بھی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی سڑک پر جس کے کنارے بڑے بڑے مالدار لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں، صرف موٹروں ہی کی گذر ہو سکتی ہے اور وہ بھی ایسی کہ آگے سے آئیں اور دَن سے گذر گئیں ——— پیچھے سے آئیں اور سرچ کا شوٹ گرد آلود کرتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں اہل کار ہینڈل سے کشتی لڑیں گے یا کسی غریب کو نالے سے اپنی سائیکل نکالتے ہوئے دیکھیں گے۔

تھوڑی دُور چلنے کے بعد ایک کوٹھی پر جا کر رُک گیا میں مکان میں اندر جانے کے عوض اُس کی پشت پر جا نکلا، جہاں نوکروں کے مکانات تھے، کیونکہ وہاں خفیہ پولس کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے۔ ایک رازدار نوکرانی کے ذریعے انجم کو بلوایا۔ انجم وہ ہستی ہے جس کا تعارف خود بخود ہو جائے گا۔ وہ میرے دل کی کنٹرولر تھی۔ میں اسی کی وجہ سے زندہ تھا۔ اُسی کی وجہ سے میری سانس چلتی تھی حتّٰی کہ میری شریانوں میں خون کی روانی بھی اسی کے دم سے تھی۔ سگرٹ پیتا تو اسی کے لئے۔ پان کھاتا تو اسی کے واسطے اور کپڑے میں بلیچ کر جائے آور نمک پارے اُڑاتا تو اسی کی خاطر۔ غرض کہ میری ہر حرکت اس کے وجود سے اس طرح وابستہ تھی جس طرح اسٹینوگرافر سے ٹائپسٹ یا ٹیلیگراف آفس سے ٹیلی گرام یا آل انڈیا ریڈیو سے ہمارا ریڈیو۔

انجم آ گئی۔ اس کی آمد نے مجھ پر معجون کا سا اثر کیا۔ میں نے ایک طرح کا سکون محسوس کیا اور اپنے آپ کو ایسی فضا میں تصور کرنے لگا جہاں ہر فکر و پریشانی سے نجات تھی۔ جہاں صرف میں تھا ——— میری انجم ——— اور میری سائیکل۔

انجم نے میری آمد کی وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا "انجم! اب تک

میں نے تم سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی ۔ ایک شیو نگ سٹ کے سوا لیکن آج میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں ۔ تم کو میری مدد کرنا ہوگی ۔ امید ہے کہ تم دھوکا نہ دوگی ۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں نہ صرف ہم دونوں کی زندگیوں کا سوال ہے بلکہ جواب بھی اسی میں موجود ہے "۔

انجم میری علمی لیاقت اور تقریری قابلیت کی پہلے ہی سے قائل تھی اور انھیں خوبیوں کی وجہ سے اُس کو مجھ سے عشق ہوگیا تھا ۔ وہ بھلا اس لسانی کی کب تاب لاسکتی تھی ۔ اپنی قومی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے فوراً آنکھوں میں آنسو بھر سے اور بولی " للہ کر اس ورڈس نہ حل کرائیے صاف صاف بتا ئیے کہ معاملہ کیا ہے " ؟

میں نے کہا " اچھا اگر تم میری گفتگو کی تاب لاسکتی ہو تو سنو ، مجھے اس وقت تمہاری تصویر کی ضرورت ہے ، اِسی وقت "!

انجم نے اطمینان کی سانس لی ۔ جیسے اس وقت وہ کسی بڑی فرمائش کی توقع رکھتی تھی ۔ وہ شاید سمجھی تھی کہ میں کسی ڈرامے کے سلسلے میں اس کی ساری مانگنے آیا ہوں جس کو جدا کرنا وہ دوسری عورتوں کی طرح کسی حالت میں گوارا نہیں کرسکتی تھی ۔ پھر بھی اُس نے حیرت کے ساتھ پوچھا " آخر آپ اس کا کیجئے گا کیا ؟ "

اور جب میں نے اُس کو یقین دلا دیا کہ اس کی تصویر اپنی تصویر کے ہمراہ اسسٹریٹڈ ویکلی میں نہیں بھیجوں گا تو اُس نے ایک بہت ہی عمدہ تصویر لاکر میرے حوالے کردی ۔ بھلا اس کے پاس تصویروں کی کیا کمی تھی ۔ کوئی فوٹوگرافر ایسا نہ تھا جسے انجم کی تصویر اتارنے کا فخر حاصل نہ ہو ، یا یوں سمجھئے کہ انجم کے بیگ سے اٹھکھیلیاں کھیلنے کا موقع نہ ملا ہو ، اور یہ واقعہ ہے کہ فوٹوگرافروں کے علاوہ میرا اور کوئی دوسرا رقیب تھا بھی نہیں ۔ تصویر دیکھکر میری خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ میں نے چاہا کہ تصویر کو گلے سے لگالوں لیکن انجم نے سیز فائر کا حکم دے دیا ۔

میں نے گھر جانے کیلئے سائیکل سنبھالی اور انجم کی طرف مسکرا کر دیکھا ـــــ انجم نے بھی مسکرا کر دیکھا ـــــ میں دوبارہ مسکرایا ـــــ انجم بھی دوبارہ مسکرادی ـــــ اور جب میں سہ بارہ مسکرایا تو سچ مچ انجم بھی سہ بارہ مسکرادی ۔

گرمیوں کی دوپہر تھی اور میں انجم کے گھر سے روانہ ہوکر اپنے گھر جا رہا تھا ۔ خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ مسرت کی لہر چہرے پر اتنی درخشاں تھی کہ ہر راہ گیر مجھے مسکراتا دیکھکر پاگل سمجھتا تھا ۔ سائیکل ہوا سے گفتگو کر رہی تھی ۔ میں سینۂ بازار کو چیرتا ہوا گھر کی طرف اُڑا جا رہا تھا ۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ قبلہ والد صاحب گھر کی سمت خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں ۔ کیا بتاؤں سائیکل تلے سے زمین نکل گئی ۔ فوراً سائیکل موڑلی اور دوسرے راستے سے گھر پہنچا ۔ پسینے میں شرابور ۔ ایک ایک جوڑ درد کر رہا تھا ۔ لیکن ہوش کس کو تھا ۔ سب سے پہلے انجم کی تصویر ان تصاویر میں شامل کرکے والد صاحب کی الماری میں رکھی تب کہیں جاکر کپڑے تبدیل کئے ۔ پانسہ پھینک دیا تھا ۔ نتیجے کا انتظار تھا ۔

دوپہر کا کھانا میز پر لگا دیا گیا ۔ والد صاحب ، والدہ صاحبہ ، بھائی جان اور بھابی جان صرف یہ چار اشخاص موجود تھے ۔ میری شرکت نے ان حضرات کو اکابر غم کی حیثیت دے دی ۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔ نہ معلوم کیوں ؟ اس وقت کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی کہ کہیں بھابی جان اس نازک موقعے پر جبکہ آنتیں قُلْ هُوَاللّٰهُ پڑھ رہی ہیں شادی کا تذکرہ نہ چھیڑ بیٹھیں ۔ کچھ اُن کی شوخ طبیعت کی وجہ سے ڈر تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ اُن کی رشتے کی ایک بہن تھیں ـــــ حسین ـــــ جوان ـــــ اور ـــــ تندرست یعنی موٹی ـــــ نسیمہ اُن کا نام تھا جس کے لئے وہ ایک فلم ایکٹریس کی مرہونِ منت تھیں ۔ بھابی جان اُن کو بطور راشی کیس مجھے دینا چاہتی تھیں ۔ مگر میں اُن سے بہت گھبراتا تھا ۔ اور نہ صرف اُن سے بلکہ اُن کے تصور سے بھی ، کیونکہ اُن کا تصور بھی اتنا ہی قوی ہیکل تھا جتنی کہ وہ ۔ مجھے اُن کا فٹ بال جیسا گول اور سخت جسم قطعی ناپسند تھا ۔ بھابی جان سے بذاتِ خود کسی معاملے میں اختلاف نہ تھا اور نہ ہی کسی شریف آدمی کو اپنی بھابی سے ہونا چاہئے ۔ میں نے کئی مرتبہ صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کر بھی دیا ۔ لیکن توبہ کیجئے ۔ بھابی جان پکی چار سو بیس تھیں ۔ وہ سمجھتی تھیں کہ نسیمہ کا بار بار تذکرہ میرے دل کو موم کردے گا ۔ شاید وہ نہیں جانتی تھیں کہ کسی چیز کی زیادتی بھی بُری ہوتی ہے اور جبر سے ہمیشہ نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے ، محبت کا نہیں ۔

ایک دن میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بھابی جان ! میں نسیمہ سے ہرگز

شادی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کو بہت زیادہ فکر ہے تو آپ خود کر لیجئے۔ یا بھائی جان کے لئے انتظام کرا دیجئے۔ لیکن وہ تو کسی نے کہا ہے کہ عورت کی ایک ہنسی دُنیا کی بڑی سے بڑی اٹل بات کو بھی ٹال سکتی ہے تو پھر بھلا مجھ حقیر کی کیا حیثیت تھی۔

کھانا سب نے ماتمی طریقے پر کھایا یعنی خاموشی، سلیقے اور سنجیدگی کے ساتھ۔ بھابی جان نے دو ایک دفعہ اشارتاً کچھ کہنا بھی چاہا لیکن والد صاحب کی ایک "ہوں" نے سب کو خاموش کر دیا۔ اس کے علاوہ بھائی جان نے بھی اپنا حق سمجھتے ہوئے بھابی جان کو بہت تیز نظروں سے گھورا۔ اس لئے کہ ہم لوگوں کی موجودگی میں وہ اس سے زیادہ جرأت دکھا بھی نہیں سکتے تھے۔ کھانے کے بعد بھابی جان نے والدہ صاحبہ کو پھانسنا چاہا لیکن اُنھوں نے میرے حوالے سے والد صاحب کا نام لیتے ہوئے کہا۔ "میں اُن سے گفتگو کروں گی تب کوئی رائے دے سکتی ہوں۔"

دوسرے دن ناشتے کے بعد "جو کو رمیز کانفرنس" ہوئی۔ والد صاحب صدر تھے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے ایک تحریک پیش کی جس کے ذریعے وہ ویٹو کے اختیارات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ تحریک کثرت آراء سے نامنظور ہو گئی۔ صرف والدہ صاحبہ نے اس تحریک کے حق میں ووٹ دیا۔ والد صاحب نے واک آؤٹ کی دھمکی دی۔ مگر صاحب یہاں کوئی ڈرنے والے تھے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک واپس لے لی گئی۔

بھائی جان نے مختلف پیغامات پڑھ پڑھ کر سنائے۔ جن میں سے اکثر اس وجہ سے رد کر دیئے گئے کہ اُن کی عبارت ٹکسالی اردو میں نہ تھی۔ کچھ اس وجہ سے رد کئے گئے کہ اُن کے نام عجیب عجیب سے تھے۔ جب نجمہ کا نمبر آیا تو میں نے اُٹھ کر کہا "جناب صدر! ذرا ملاحظہ تو فرمائیے کیسا عجیب سا نام ہے ـــــ بالکل فلمی سا ہے ـــــ میرے خیال میں نہ صرف یہ پیغام رد کر دینا چاہیئے بلکہ ساتھ ساتھ نجمہ دیوی کو رائے بھی دینا چاہیئے کہ وہ اپنا نام فوراً تبدیل کر دیں۔"

یہ تحریک منظور ہو گئی۔ بھابی جان نے موافقت میں رائے دی تھی اور وہ کیوں نہ دیتیں۔ وہ تو چاہتی تھیں کہ تمام پیغامات نامنظور ہو جائیں۔ تاکہ اُن کو اپنا اڑنگا لگانے کا موقع ملے۔ گیتی آرا کا جب نام پیش ہوا تو میں بولا۔ "معزز صدر! یہ نام آری اور کلہاڑی سے مشابہ ہے۔ آری کا شوہر آرا ہوتا ہے۔ دوسرے آرا چلانا خطرناک قسم کا محاورہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نام اشتراکی قسم کا واقع ہوا ہے۔ گیتی۔ آرا۔ کلہاڑی۔ پھاوڑا، ہتھوڑا، یہ سب مزدوروں کی نشانیاں ہیں جن کی مدد سے وہ حکومتوں کے تختے، ٹھونکتے پیٹتے اور اُلٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ ذرا آپ خود سوچیئے کہ کسی مسلمان کے گھر میں کسی اشتراکی کا (کہ جس کا ماخذ شرک ہے) کیا کام؟"

اس کے بعد متعدد نام پیش ہوئے اور رد ہوئے۔ اس میں میری اور بھابی جان کی کوششیں شامل تھیں۔ لیکن اب مقابلہ دو بڑی طاقتوں کا تھا بھابی جان اپنی قوم کی کھاگ یعنی کٹنی تھیں اور میں اپنے فرقے کا کھاگ یعنی سیاست داں۔ کانفرنس کافی دیر سے ہو رہی تھی۔ کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ بھوک کی وجہ سے عمدہ عمدہ نکات دماغ سے غائب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بحث کو ملتوی کرنے کا ذریعہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے میں باورچی خانے سے ہماری "بڑی بی" تیزی کے ساتھ نکلیں اور آکر صدر صاحب کی خدمت میں ایک تحریک پیش کی۔

"اس ایوان کی رائے میں یہ جلسہ بسلسلۂ خورو نوش ایک گھنٹہ آٹھ منٹ کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے۔"

یہ تحریک منظور ہو گئی۔ کانفرنس کا پہلا اجلاس ملتوی ہو گیا، اور سب لوگ اپنی اپنی بغلوں میں فائلوں کا انبار دبائے پارلیمنٹ ہاؤس سے نکل کر ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں گھس گئے۔

کھانا کھا کر سب لوگ اپنی اپنی رپورٹ تیار کرنے لگے۔ دوپہر میں پھر اجلاس ہوا۔ واقعات کو طول دینا بیکار ہے۔ کیونکہ ایسے اہم ترین معاملات کا اظہار عوام کے مفاد کے خلاف ہے۔ کانفرنس ہوئی اور کامیاب ہوئی۔ بھابی جان نے شکست کھائی اور منہ کی کھائی۔ بس یوں سمجھئے کہ اگر وہ بھائی جان کے حلقۂ نکاح میں نہ ہوتیں تو کب کی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہوتیں۔ کانفرنس ہمیشہ کے لئے ملتوی کر دی گئی۔

میں نے سائیکل سنبھالی اور سیدھا انجم کے گھر پہنچا، تاکہ اُسے خوشخبری سناؤں۔ اب مجھے انجم سے چھپ کر ملنے کی ضرورت نہ تھی۔ انجم کے باپ مجھے بے حد سعادت مند سمجھتے تھے۔ میرا ان کے یہاں آنا جانا اکثر ہوتا تھا۔ البتہ جب انجم سے ملنا ہوتا تھا تو نوکروں کے گھر موجود تھے۔ ایک مرتبہ

فرمانے لگے " ارے بھائی تم جیسا سعادت مند لڑکا تو میری نظر سے آج تک گذرا ہی نہیں "

لیکن میں نے نہایت انکسار سے اُن کی بات رد کرتے ہوئے کہا " نہیں صاحب یہ بات نہیں ہے ۔ دراصل یہ آپ کی آنکھوں کی کمزوری ہے کہ مجھ سے اچھا لڑکا نہ دیکھ سکے "

" ہاں خوب یاد دلایا ۔ مجھے اپنی آنکھ ٹیسٹ کرا کے چشمہ خریدنا ہے "

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ نہ صرف مجھے سلیم الطبع سمجھتے تھے بلکہ اپنا ہمدرد بھی تصور کرتے تھے ۔

سائیکل کے پہیے انجم کے گھر پہ جا کر خود بخود بغیر کسی بریک کی مدد کے رک گئے ۔ میں بے دھڑک دیوان خانے کے اندر گھس گیا ۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ اپنی لڑکی کا ٹیوشن کر رہے ہوں گے ۔ دیکھا کہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں ۔ فوراً ایک زوردار سلام جھاڑا ۔ ایک دم گویا اُچک ہی تو پڑے " اخاہ تاباں صاحب ! کہئے اس وقت کیسے آنا ہوا ۔ "

میں نے کانفرنس کی پوری روداد سنا دی ۔ وہ بہت خوش ہوئے ۔ اور مجھے خوش کرنے کے خیال سے بھائی جان کی غیر سماجی حرکتوں کی سخت ترین مذمت کی ۔ اس کے بعد بولے " اب جبکہ تمہارے والد نے رضامندی ظاہر کر دی ہے ۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ بات ایک انٹر والدین کانفرنس کر کے سجتہ کر لی جائے "

میں نے بھی یقین دلایا کہ کانفرنس سے پیشتر ہی ہم لوگ ایک گُڈ وِل مشن بھیجیں گے ۔ تاکہ ہونے والی کانفرنس پر اچھا اثر پڑے ۔ اور انجم کو مجھ سے منسوب کرنے کے سلسلے میں جو دشواریاں پیش آئیں اُسے بغیر کسی ڈیڈ لاک کے طے کر لیا جائے ۔

اور جب اس بات کی اطلاع انجم کو ملی تو جیسے وہ پاگل سی ہو گئی اُس کی مسرت کا حال نہ پوچھئے ۔ عالم انبساط میں ثمشاد بیگم کے یکے بعد دیگرے سب ہی گانے گا ڈالے ۔ اُس کی سریلی آواز صحیح معنوں میں اُس کے جذبات کی آئینہ دار تھی ۔

دھرتی کو آکاش پکارے
آجا آجا پریم دوارے

ڈ بید خوش تھی جیسے کسی بیوہ کو اپنے نکاح ثانی پر یا کسی ماں کو اپنے بیٹے کی ختنہ پر ۔ یا پھر جیسے کسی دادی کو اپنے پوتے کی پیدائش پر خدا خدا کر کے شادی کا زمانہ آ گیا ۔ سارے براتی موٹروں جیپ کاروں ، سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر لد کر ایک جلوس کی شکل میں روانہ ہوئے ۔ سب سے پیچھے سائیکل ، اُس کے آگے موٹر سائیکل ، پھر جیپ اور پھر موٹر کار ۔ سب سے پہلی کار میں باڈی گارڈ تھے ۔ اس کے پیچھے نوشہ آنکھوں میں شوہرانہ چمک لئے ہوئے بیٹھا تھا ، جیسے ساری مارشل ایڈ اسی کے حصے میں آئی ہو ۔ اور ان سب کے آگے آگے پریس کے نمائندے اور فوٹوگرافرس ، پٹرول بچانے کی خاطر موٹروں کو ریل گاڑی کے ڈبوں کی طرح موٹے موٹے رسّوں کی مدد سے باندھ دیا گیا تھا ۔ باجے گاجے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا ۔ البتہ موٹروں کے ہارن کچھ اس ترتیب سے بجائے جا رہے تھے کہ شہنائی کا لطف دے رہے تھے ۔

" ان " لوگوں نے روشنی کا معقول انتظام کیا تھا ۔ ہر طرف مشعل اور فانوس کے بجائے سرچ لائٹ اور ٹارچ روشن تھیں ۔ دفعہ ۱۴۴ پہلے ہی پولس نے نافذ کر دی تھی ۔ نکاح نہایت سادہ طریقے پر ہوا میں نے چند ہزار سکہ رائج الوقت کے عوض تین بار قبول کیا " کہہ کر انجم کا بھاؤ تاؤ کر لیا ۔ نکاح کے بعد حاضرین پر چھواروں کے بجائے کیک پیسٹری کی بوچھاڑ کی گئی ۔ چھوارے تو وہ بانٹے جس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چھوارہ ہو چکا ہو ۔ دوسری طرف ایک غیر مسلح گارڈ نے گیارہ چھتوں کی سلامی دی ۔ اور بینڈ نے مبارک سلامت کا نعرہ بلند کر کے شہر بھر میں زلزلے کا سا احساس پیدا کر دیا ۔ نہ یہ سول میرج تھی اور نہ شرعی نکاح ۔ یہ بیچاری تو ایک سیدھی سادی " ترقی پسند شادی " تھی ۔

نیشنل ایمپلائمنٹ سروس

سنہ ۱۹۱۹ء میں انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے چارٹر پر ہندوستان نے سب سے پہلے دستخط کئے تھے جس میں یہ اصول تسلیم کیا گیا تھا کہ جملہ ممبر ریاستوں میں شہریوں کو ملازمت دلانے کے لئے گورنمنٹ کے ماتحت کوئی ادارہ ہونا چاہیئے۔ لیکن صحیح معنوں میں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا کام سنہ ۱۹۴۵ء میں ہوا جب کہ حکومت ہند نے سابقہ فوجی ملازمین کو کام دلانے کی غرض سے ملک بھر میں ایمپلائمنٹ ایکسچینج قائم کئے۔ یہ ادارے ملازمت کے متلاشیوں کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔

یہ ادارہ ڈائرکٹر جنرل آف ری سیٹلمنٹ اینڈ ایمپلائمنٹ کے ماتحت کام کر رہا ہے جو کہ اس کی نگرانی اور نظم و نسق کے ذمہ دار ہیں۔ نظم و نسق کی سہولت کے پیشِ نظر ملک کو دس علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ایک علاقہ ریجنل ڈائرکٹر کے تحت ہوتا ہے۔ ہر ایک علاقے میں ایک ریجنل ایمپلائمنٹ ایکسچینج چند سب ریجنل ایمپلائمنٹ ایکسچینجز اور ڈسٹرکٹ ایمپلائمنٹ آفس ہوتے ہیں۔ اس وقت ملک بھر میں ۸ ریجنل ایمپلائمنٹ ایکسچینجز، ۸۴ سب ریجنل ایمپلائمنٹ ایکسچینجز اور ۵۵ ڈسٹرکٹ ایمپلائمنٹ آفس موجود ہیں۔ جو اپنے ملحقہ علاقوں میں شہریوں کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ ہر ایک ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے لئے الگ الگ حلقہ مقرر ہے۔ بالفرض محال اگر کسی دوسرے حلقے سے ملازمت کے متلاشی پوچھ تاچھ کریں تو انہیں اپنے متعلقہ حلقے کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

امیدواروں کا انتخاب

جب کسی ادارے سے کسی آسامی کے لئے امیدوار بھیجنے کی مانگ آتی ہے تو تمام امیدواروں کو جو اس ٹریڈ کے لئے رجسٹر کئے گئے ہوں زیر غور رکھا جاتا ہے چونکہ محدود تعداد میں امیدواروں کو بھیجنا ہوتا ہے اس لئے ادارہ ایمپلائمنٹ انڈکس کارڈوں کی دیکھ بھال کرتا ہے تاکہ مستحق امیدواروں کا انتخاب کیا جا سکے۔

اس کے بعد ان امیدواروں کو ادارے میں حاضر ہونے کے لئے اطلاع دی جاتی ہے۔ بعد میں انہیں ملازمت کی شرائط وغیرہ بتا کر متعلقہ دفتر میں بھیج دیا جاتا ہے۔ نیز ان امیدواروں کی ایک فہرست متعلقہ ادارے کو بھیج دی جاتی ہے۔

ٹریننگ سکیم

تقریباً ۱۵۰ ٹیکنیکل اور ووکیشنل ٹریننگ سنٹر ملک بھر میں کھولے گئے ہیں۔ جہاں ۵۰ مختلف پیشوں کی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ گذشتہ سال تک صرف سابق فوجیوں اور شرنارتھیوں ہی کو ان سنٹروں میں ٹریننگ کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ رعائتیں ہر ضرورت مند کے لئے مہیا کی گئی ہیں۔

دہلی میں بھی ریجنل ایمپلائمنٹ ایکسچینج اپنے حلقے کے لوگوں کی گرمجوشی سے خدمت سر انجام دے رہا ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ یہ ادارہ کتنا مفید کام کر رہا ہے۔

	اوسط ششماہی	اعداد برائے ستمبر سنہ ۱۹۵۰ء
ان امیدواروں کی تعداد جو رجسٹر کئے گئے	۴۴۹۸	۴۲۶۸
ان امیدواروں کی تعداد جن کو ملازمت مل گئی	۵۱۲	۵۰۵
ان اسامیوں کی تعداد جو رجسٹر کی گئیں	۸۰۳	۶۹۹
ان اسامیوں کی تعداد جو پر کی گئیں	۵۱۴	۵۰۵
ان اسامیوں کی تعداد جو منسوخ کی گئیں	۲۴۲	۲۸۹
ان اسامیوں کی تعداد جو ابھی خالی ہیں	۸۸۱	۸۲۶
ان مالکان کی تعداد جو ایکسچینج کی خدمت حاصل کر رہے ہیں	۲۳۶	۲۲۶

ذیل میں ڈاکٹر این. داس. پی. ایچ. ڈی. آئی. سی. ایس ڈائرکٹر جنرل ری سیٹلمنٹ اینڈ ایمپلائمنٹ کی ریڈیو تقریر کے اقتباسات ناظرین کی معلومات میں اضافے کے پیشِ نظر درج کئے جاتے ہیں۔ یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو

دہلی سے بذریعہ ریڈیو مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۰ء کو براڈکاسٹ کی گئی تھی۔

مجوزہ اقتصادی اسکیم میں ایمپلائمنٹ سروس کا حصّہ

.... پانچ سال کی مدت گزری جب کہ ہندوستان میں نیشنل ایمپلائمنٹ سروس قائم کی گئی۔ اس مدت میں اس ادارے کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ ہندوستان میں یہ نئی قسم کا تجربہ تھا۔ لوگوں کو اس کی اہمیت ذہن نشین کرانی تھی یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ لوگوں کو ملازمت دلانے کے سلسلے میں تسلی بخش کام ہوا ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار سے آپ پر بخوبی روشن ہو جائے گا کہ نیشنل ایمپلائمنٹ سروس نے کتنا مفید کام اب تک کیا ہے۔

(۱) ان اداروں یا مالکان فرم وغیرہ کی تعداد جو ایمپلائمنٹ ایکسچینجز کی خدمت حاصل کر رہے ہیں، جولائی ۱۹۵۰ء میں ۹۱۹،۲ تک پہنچ گئی جب کہ جولائی ۱۹۴۷ء میں یہ تعداد صرف ۵۰۱،۳ تھی (۲) ان لوگوں کی تعداد جنھوں نے اپنا نام بطور امیدوار رجسٹر کرایا جولائی ۱۹۵۰ء میں ۱۷،۰۱،۲۱ تھی جب کہ تین سال پہلے ان کی تعداد ۷۵۶،۱۵ تھی۔ (۳) ان لوگوں کی تعداد جن کو ملازمت دلائی گئی۔ جولائی ۱۹۵۰ء میں ۲۹۲ ۹۳ تھی جب کہ جولائی ۱۹۴۷ء میں یہ تعداد محض ۶۸۳ ۱۶ تھی۔ (۴) اس کے علاوہ تین ہزار سے زیادہ لوگوں کو مختلف پیشوں میں ٹریننگ دی گئی۔ مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ایمپلائمنٹ سروس کی کارگذاری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ دراصل پبلک ایمپلائمنٹ سروس محض صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں مثلاً امریکہ، فرانس، جرمنی وغیرہ ہی میں ملازمتوں کا انتظام کرنے کا کام نہیں کرتی بلکہ کم ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اہم خدمت کر سکتی ہے۔

ملازمت دلانے کے یہ ادارے ملک میں بے روزگاری یا روزگار کے متعلق مکمل اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ ان اداروں کے تحت ٹریننگ سکیمیں بہت بنائی گئی ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ابھی ہم نے اس مسئلے کے حل کا آغاز ہی کیا ہے اور بہت کچھ کرنا باقی رہتا ہے۔ ہمیں ہندوستان میں بے روزگاری اور کاریگروں کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ ان دونوں کا مقابلہ کرنے کے لئے موثر پروگرام بنانا ضروری ہے جسے آبادی کا جائزہ کہا جاتا ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایمپلائمنٹ سروس ہی اہم خدمت ادا کر سکتی ہے۔ مسٹر وینڈل ولکی نے کہا تھا۔ کہ "بے روزگاری" ایک قسم کی غلامی ہے۔ نیز یہ انسان کی قدر و قیمت کو کم کرتی ہے۔ اگر ہم اس نئی غلامی سے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو "مین پاور پلاننگ" ہماری مجوزہ اقتصادی اسکیم کا اہم جزو ہونا چاہیئے۔

آجکل دہلی

کھیتی باڑی میں جٹ جائیے

یہ ہمارا ذاتی اور قومی فرض ہے
خوراک کی کمی کو پورا کیجیے
اناج بکثرت پیدا کیجیے
اور ہر دانہ جو بچ سکتا ہے بچائیے
A.C.135

سہیل عظیم آبادی

جھوٹے وعدے

وعدوں کا جھوٹ ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ مختلف لوگوں نے مختلف حالات میں مختلف قسم کے جھوٹے وعدے کئے ہیں۔ اگر ان جھوٹے وعدوں کی تحقیق کی جائے۔ تو اس کی بے شمار قسمیں نکل آئیں۔ اور تو اور اردو ادب کا تعلق بھی جھوٹے وعدوں سے کچھ کم نہیں۔ اگر اردو شاعری کو لیجئے تو معشوق کے جھوٹے وعدے تو شاعروں کا خاص موضوع رہے ہیں۔ اور شاعروں نے مختلف پہلوؤں سے ان وعدوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جو کبھی پورے نہیں ہوئے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غریب شاعروں کو تو جھوٹے وعدوں پر اعتبار کر کے سدا انتظار کرنا پڑا ہے۔

افسانہ نگاروں کے لئے یہ وعدے کبھی بھی مصیبت نہیں بنے ہیں۔ اور خاص کر زمانہ حال کے افسانہ نگار تو جیسے دو اور دو چار کا حساب جانتے ہیں۔ ان لغویتوں میں پڑتے ہی نہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انہیں بھی ان وعدوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر افسانہ نگاروں کے جھوٹے وعدے تو اب اردو ادب میں ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ آئندہ کا مورخ اور نقاد اس خاص موضوع سے بھی بحث کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ افسانہ نگاروں کے جھوٹے وعدوں کا شکار بے چارے ایڈیٹر صاحبان کو ہونا پڑتا ہے۔

اتفاق سے افسانہ نگار اور ایڈیٹر دونوں ہوں۔ ایسی حالت میں مجھے اندازہ ہے کہ یہ جھوٹے وعدے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور یہ وعدے کتنی دلچسپ چیز ہیں۔ میں نے خود سینکڑوں جھوٹے وعدے کئے ہیں اور سینکڑوں جھوٹے وعدوں کا شکار رہا ہوں۔ البتہ اتنا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان سارے وعدوں کی بنیاد صرف محبت ہے۔ خلوص ہے اور سچائی۔ خواہ وہ وعدے میں نے کسی ایڈیٹر سے کئے ہوں۔ یا کسی دوسرے افسانہ نگار نے مجھ سے۔

اگر ان تمام وعدوں کی تفصیل لکھوں۔ تو یقین جانئے کہ داستان امیر حمزہ ایسی ایک ضخیم داستان بن جائے۔ اس لئے اس کا موقع ہی نہیں البتہ اس سلسلے میں چند دلچسپ واقعات آپ کو سناؤں۔ تا کہ عام پڑھنے والے تو لطف اندوز ہوں۔ اور نئے افسانہ نگار پچھلوں کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔

میرا حلقۂ احباب خاص طور پر بہت پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً سارے افسانہ نگار اور رسالوں کے ایڈیٹر میرے دوستوں میں ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں۔ کہ بہت سے دوستوں سے میرا تجربہ زیادہ ہے۔

میں افسانے لکھنے کے بعد ایک دن بھی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ ختم ہوا اور کسی رسالے کو بھیج دیا۔ اور اس طرح کہ بیسیوں وعدوں کے بعد۔ ایسا تو شاید کبھی نہیں ہوا کہ کسی کی فرمائش آئی۔ اور افسانہ لکھ کر بھیج دیا ہو۔ بلکہ ہوا ایسا کہ کسی دوست کا خط آیا۔ اور میں نے وعدہ کر دیا۔ لیکن موڈ غائب۔ نہایت ایمانداری اور خوش دلی کے ساتھ افسانہ لکھ کر بھیج دینا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ اور وعدوں پر ٹالتا جاتا ہوں۔ پہلے خط میں وعدہ کر دیا۔ تو دوسرا خط یاد دہانی کا آیا۔ پھر معذرت کر لی اور وعدہ کر دیا کہ جلد ہی بھیجتا ہوں۔ اس مدت میں کچھ اور فرمائشیں آ گئیں۔ اور ساتھ ساتھ کچھ اور وعدے بھی ہو گئے۔ اور یاد دہانیوں فرمائشوں اور وعدوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیجئے دوسرا وعدہ بھی پورا نہ ہوا۔ تو یاد دہانی کے بعد تقاضے شروع ہوئے۔ اور لکھ دیا کہ بس آپ کے لئے افسانہ شروع کر دیا ہے۔ اسی ہفتہ میں آپ کو افسانہ مل جائیگا حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ افسانے کا الف بھی شروع نہیں ہوتا۔

اور وقت ضروری کاموں یا گپ میں ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہمارا ایڈیٹر دوست افسانے کے انتظار میں چشم براہ رہتا ہے۔

کسی وقت یکایک وعدہ یاد آیا۔ اور افسانہ لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کاغذ قلم دوات لے کر بیٹھا بھی لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اور کام نکل آئے بیچارے صاحب افسانہ ختم۔ سوچا پھر لکھ لوں گا۔ اس وقت تو یہی ضروری کام ہے۔ اسے ختم کر لیا جائے۔ دو چار چھ دن اور گزر گئے اور کسی ایڈیٹر دوست کا شکایت نامہ پہنچ گیا "ارے بھئی جلد افسانہ بھیجو۔ کیوں پریشان کرتے ہو تمہارے انتظار میں رسالہ رکا پڑا ہے" اور اس شکایت کو پڑھ کر ہوئی وحشت۔ اور ارادہ کر لیا۔ خواہ کچھ ہو۔ لیکن آج وقت نکال کر افسانہ لکھ لینا اور بھیج دینا ہے لیکن شام تک کچھ بھی نہیں۔ البتہ رات کو لکھنے بیٹھا ضرور مگر نیند آ گئی۔ اور دوسرے دن لکھ بھیجا کر "بھئی شرمندہ ہوں۔ افسانہ آدھے سے زیادہ لکھ چکا ہوں بس دو دن میں ختم کر کے بھیجتا ہوں۔

اسی طرح ہر شکایت نامے کا جواب محبت نامے کی شکل میں بھیجا جاتا رہا۔ اور احباب مطمئن رہے کہ بس افسانہ آ ہی رہا ہے حالانکہ حالت یہ کہ افسانہ ایک چوتھائی بھی نہیں۔ اور وعدے بیسوں

آخر دوستوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ اور شکایتوں میں تیزی آنے لگی۔ اور وعدے کے نباہ کے لئے ادھر سے بہانے تراشے جانے لگے "بھئی کیا کہوں عجیب پریشانیوں میں گھر گیا ہوں۔ افسانہ تین چوتھائی لکھ چکا ہوں۔ مکمل کر کے بھیجنے کا موقع نہیں ملتا" اس میں سچ اتنا کہ پریشانیاں ہیں۔ اور آپ جانئے پریشانیاں کس کے ساتھ نہیں ہوتیں۔ لیکن یہ کہ افسانہ تین چوتھائی لکھا جا چکا ہے۔ سراسر جھوٹ۔

اب کچھ پریشانیوں کا حال بھی سُن لیجئے۔ سب سے پہلی پریشانی مکان کی۔ مکان کسی طرح نہیں ملتا۔ اور جس طرح زندگی گزارنی پڑتی ہے اُس پر خود اپنی حالت پر رحم آنے لگتا ہے۔ بس ایک کمرہ۔ مشترک خاندان۔ ایک کمرہ جو مشکل سے پندرہ فٹ لمبا اور بارہ فٹ چوڑا ہو گا۔ اسی میں سارا اسامان۔ سونے کی مسہریاں کپڑوں کے بکس اور دوسری ضروری چیزیں۔ بیوی اور بچے۔ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں بیٹھ کر کچھ لکھا جائے

اگر ہمت کر کے بیٹھ گئے تو بچوں کے سوالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کیا مجال۔ جو ختم ہو جائے۔ یہ سوالات اکثر چھوٹے بچے کی چاکلٹ اور لیمن چوس کی فرمائش سے شروع ہوتے ہیں۔ اور بڑے بچے کے کپڑوں اور فٹ بال پر آکر ختم ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ کس کی فرمائش کب اور کس وقت تک پوری ہوگی۔

بچوں کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ تو بڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور یہ گفتگو آٹا چاول سے لے کر بچوں کی معمولی معمولی ضرورت تک کو گھیر لیتی ہے۔ پھر بھی پوری بات ختم نہیں ہوتی۔ باتوں کو جتنی جلدی ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ اسی قدر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور دوستوں کی فرمائش اور افسانے کی جذبات دھواں بن کر دماغ سے نکل جاتی ہیں۔؟

اسی الجھن میں دفتر واپس آنا ہوتا ہے۔ راستے بھر سوچتا آتا ہوں۔ کہ بس آج بیٹھ کر افسانہ ختم کرنا ہے لیکن کیا مجال کہ وہاں بھی افسانہ ختم ہو جائے۔ سب سے پہلے تو دفتر کے روزانہ کام۔ اس سے کسی حالت میں بھی بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ دُنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے۔ اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ بلکہ اگر دنیا میں کوئی نیا واقعہ ہوا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ کام بڑھ گیا۔ اب لکھئے اس پر مضمون۔ اور اس مسئلے پر مطالعہ شروع کیجئے۔

مضمون لکھنے کا مسئلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ دنیا کا کوئی کام کیجئے یا نہ کیجئے۔ لیکن اخبار کے لئے لکھنا ضروری۔ پھر اس پر یہ غضب کہ بے تکلف ملنے والے۔ شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر حملہ کر دیا۔ اور اس موضوع پر اخبار کے لئے مضمون لکھا جا رہا ہے۔ کہ ایک صاحب آ دھمکے۔

"السلام علیکم۔ آپ تو بہت مصروف نظر آ رہے ہیں"

"وعلیکم السلام۔ مصروفیت تو رہتی ہی ہے" میں نے اخلاقاً مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور وہ صاحب ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھنے لگے۔ اور میں کام کرتا رہا۔ پھر وہ اچانک بولے۔

"بھئی اب چلا۔ آپ کے پاس ٹائم ٹیبل تو ہو گا۔ کلکتہ جانے والی گاڑیوں کا وقت دیکھنا تھا سوچا چلوں آپ کے پاس"

"عزت افزائی۔ اخبار کے ایڈیٹر کے علاوہ آپ نے ریلوے انکوائری کا افسر بھی سمجھ لیا" دل میں سوچا۔ اور دل چاہا کہ ڈانٹ بتاؤں بد تہذیب

احمق۔ لیکن ہائے رے اخلاق۔ اور اسے کیسے چھوڑ دوں اب ہم بہاریوں کے پاس "اخلاق" کے علاوہ اور رہ بھی کیا گیا ہے۔ مسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں بھائی ٹائم ٹیبل تو نہیں۔"

میں سمجھا کہ بات ختم ہوئی اور اب رخصت ہوں گے۔ لیکن تھم بھلی ــــ بولے۔

"آپ لوگوں کو دفتر میں ایک ٹائم ٹیبل تو رکھنا ہی چاہئے۔"

"جی ہاں رکھنے کی تو بہت سی چیزیں ہیں۔ لیکن مہیا نہیں ہو سکتے کو تو جی چاہتا ہے کہ موٹر بھی رکھوں اور ہوائی جہاز بھی۔ مگر کم بخت ریلوے ٹائم ٹیبل بھی میسر نہیں۔"

"اچھا کسی اور جگہ دیکھ لوں گا۔ خدا حافظ۔"

سمجھا بلا ٹلی۔ اور سوچا اخبار کا مضمون ختم کر کے افسانہ لکھنا شروع کر دوں گا۔ اپنی طویل خاموشی کا شدید احساس پیدا ہوتا جا رہا تھا ایک دوست نے لکھا تھا۔ یورپ میں لوگ اخبار نویسی سے ادب کی طرف جا رہے ہیں۔ اور تم ہو کہ ادب سے اخبار نویسی کی طرف جا رہے ہو۔ بات درست تھی۔ اور سوچا تھا کہ اخبار نویسی کے ساتھ ساتھ ادبی مصروفیتوں کو جاری رکھوں گا۔ لیکن یہ آسان کام نہیں۔

ہاں تو مضمون لکھتا رہا۔ یکایک آواز آئی۔

"آداب عرض ہے۔"

سر اٹھا کر دیکھا۔

"آداب عرض۔"

"میں حاضر ہوا تھا کہ آپ سے کچھ عرض کروں۔"

"آپ کو فرصت تو ہے؟"

"فرصت کہاں نصیب! لیکن فرمائیے۔ اسی طرح سارے کام ہوتے ہیں۔ اور ہوتے رہیں گے۔"

"جی عرض یہ ہے کہ میں اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کرانا چاہتا ہوں۔"

"مبارک ارادہ ہے۔"

"لیکن۔ آپ کو ذرا تکلیف کرنی ہوگی۔"

"فرمائیے۔"

"ذرا ایک نظر پورے مجموعے کو دیکھ لیجئے۔ اور چند لفظوں میں مختصر سا تعارف" بھی لکھ دیجئے۔"

"بھائی اتنی فرصت کہاں ہے آج کل۔"

"آپ کی مصروفیتوں کو تو جانتا ہوں۔ لیکن ہم لوگوں کا دل بڑھانا بھی تو آپ ہی کا کام ہے۔"

"بالکل درست مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ اگر یہ کام کر سکتا لیکن فرصت نہیں ملتی۔ آپ پروفیسر اختر اورینوی سے ملیں ــــ میں بھی ان سے کہہ دوں گا۔"

"اختر صاحب کے پاس دو بار گیا لیکن ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"پھر جائیے۔ وہ کہیں چلے تو نہیں گئے۔"

"جی۔ مگر میری اپنی خواہش تھی کہ آپ ہی تعارف لکھتے۔ اختر صاحب سے دیباچہ لکھوا لوں گا۔"

اور میں دل ہی دل میں کڑھ گیا۔ دونوں کو احمق بنانا چاہتے ہیں۔ زندہ باد۔ لیکن پھر ہم لوگ تو اخلاق بہتنے پر کچھ مجبور سے بھی ہیں۔ بولا۔

"برادرم۔ اب دیباچہ اور تعارف پرانی چیزیں بن گئیں۔ آپ بغیر دیباچے اور تعارف کے اپنا مجموعہ شائع کر دیں۔"

"جی۔ آپ فرماتے تو ہیں درست۔ لیکن مجھے کون جانتا ہے . . . ."

"خیر دیکھا جائے گا۔ فرصت ملے گی تو ضرور لکھ دوں گا ــــ" ایک عدد اور وعدہ!

اور وہ صاحب خوش خوش روانہ ہوئے کہ تعارف لکھا جائے گا۔ اور میں خوش کہ وعدے پر کام نکل گیا۔ لیکن پھر روزانہ کی قلم گھس گھس جاری۔

وقت اسی طرح کٹتا جاتا ہے۔ اور ایک بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا۔ پریشانی تو اس وقت ہوتی ہے جب کسی پرانے بزرگ دوست سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ اور بڑی محبت کے ساتھ ملنے اور خاطر مدارت کرنے کے بعد جھوٹے وعدوں کی شکایت کرتے ہیں۔ بالکل یہی حادثہ پچھلے دنوں دہلی میں میرے ساتھ پیش آیا۔ جب بھی عرش ملسیانی نے دو سال کے وعدے یاد دلائے۔ اور مجھے پھر ایک بار وعدہ کرنا پڑا۔ آج یہ مضمون اسی وعدے کی تکمیل ہے۔

مائل ملیح آبادی

مالا بار یا ملیبار

ہندوستان کے دکھن میں مغربی گھاٹ کا علاقہ مالا بار یا ملیبار کہلاتا ہے۔ اس علاقے کے پچھم میں سمندر ہے اور پورب میں مغربی گھاٹ کا پہاڑی سلسلہ ہے۔ کنٹری اور تامل زبان میں اس کے نام کہالہ اور ملیالم ملتے ہیں جن کے معنی ہیں "پہاڑی سلسلہ"۔

دراوڈین زبان میں اس کا نام "ملئی" تھا۔ سنسکرت میں "ملیا" بولا جاتا ہے۔ چولا خاندان کے راجہ کیسری ورمن نے جو چھٹی صدی ہجری میں گذرا ہے۔ اپنے ایک کتبہ میں اس علاقے کا نام "ملئی ناڈو" تحریر کیا ہے جس کے معنی ہیں "پہاڑی ملک"۔

وہ سیاح جو عرب اور ایران سے اس علاقے میں آئے انھوں نے "ملئی" پر "بار" بڑھا کہ اس ملک کا نام ملیبار یا مالا بار کر دیا۔ جیسا کہ انھوں نے دوسرے مقامات پر بھی کیا تھا جیسے کہ زنجبار۔ امیر خسرو نے ۱۳۲۷ء میں اس علاقے کا ذکر ملیبار کے نام سے کیا ہے۔

ملیبار بہت زرخیز اور سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ یہاں بہت ہی قیمتی نباتات پیدا ہوتے ہیں۔ کالی مرچ۔ الائچی، جوز، جاوتری، لونگ، پان، دارچینی، ناریل، ڈلی، قہوہ، نیل، اسنکونا یہاں کی مخصوص پیداوار ہیں۔ کالی مرچ اور پان کے درخت خود رو ہوتے ہیں اور ان کی بے انتہا کثرت ہے۔ بانس اور ساگوان بھی یہاں بکثرت ہوتا ہے۔ اس علاقے کا اُتری حصہ بتیلا ہے، قدیم زمانے میں اس حصے کا نام پُوبی تھا۔ جس کے معنی ہیں "ریت"۔ بیچ کا علاقہ کدم کہلاتا تھا جس کے معنی ہیں "جھیلوں کا دیس" اور ان دونوں سے پورب کی زمین کرکا کہلاتی تھی۔ جس سے معنی ہیں "پہاڑیوں کا ملک"۔

۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں اس علاقے کی آبادی اٹھائیس لاکھ بچپن ہزار پانچ سو بچپن تھی۔

ملیبار میں مسیح سے پہلے ہی سے عربوں کی تجارت شروع ہو گئی تھی توریت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سُلیمان کے زمانے میں اس ملک سے ساگوان، مور، بندر، سونا، چاندی، ہاتھی دانت اور صندل عرب جایا کرتا تھا۔ ملیبار کی تجارت عرب سے نکل کر یورپ تک پہنچتی تھی پہلے عربی تاجر خلیج فارس کی راہ سے عرب کے دکھنی ساحل پر مال لے جاتے تھے۔ پھر وہاں سے عربوں کے کاروان یمن اور حجاز سے گذر کر شام میں تدمور اور مصر میں اسکندریہ تک لے جاتے تھے۔ یورپ کے تاجر ان مقامات سے یورپ کے دوسرے حصوں تک پہنچاتے تھے لیکن جب قیصر اگسٹس نے تیس سال قبل مسیح مصر کو فتح کر لیا تو بحر احمر پر رومیوں کا قبضہ ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد قیصر کلادیوس کے زمانے میں رومیوں کا ایک جہاز طوفان میں پھنس کر ساحل ملیبار پر آ لگا اور اس طرح رومیوں کو ملیبار تک پہنچنے کا بحری راستہ معلوم ہو گیا۔ اب وہ براہ راست اس علاقے سے تجارت کرنے لگے۔ بہت سے رُومی پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں ملیبار کے بندرگاہوں میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ مقامی راجاؤں کی فوج میں بھی بھرتی ہوتے تھے۔ تامل کے ادب قدیم میں ان نو واردوں کو "یون" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چیرا راجاؤں کی محافظ فوج میں ان کا نام "زبردست یُون" اور "گونگے ملیچھ" رکھا گیا تھا۔

مالا بار اور رُوم کی تجارت عام طور پر مرچ، موتی اور پنا کی تھی۔ ۲۱۵ء میں شہر اسکندریہ تباہ ہو گیا اور رومیوں کی تجارت کا سلسلہ رفتہ رفتہ ملیبار سے ختم ہو گیا اور یہ تجارت پہلے کی طرح پھر عربوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

ملیبار میں مسلمانوں کا آنا۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے ۸۶ھ یا ۹۶ھ یعنی ۷۰۵ء یا ۷۱۵ء میں سب سے پہلے مُسلمان عربوں نے ملیبار میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کے ہندو راجہ نے کونکلور میں انہیں بود و باش کی اجازت دی اور باغ دُ

زمینیں بھی دیں نیز ایک مسجد تعمیر کرنے میں بھی امداد دی۔ ان مسلمان عربوں نے ملیبار کے دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا اور ہر جگہ مسجد بناتے رہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس ملک کا مفصل حال لکھا ہے ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ملیبار وہ ملک ہے جہاں کالی مرچ پیدا ہوتی ہے۔ اس کی لمبائی دو مہینے کا راستہ ہے جو دریا کے کنارے کنارے سنداپور سے کولم تک چلا گیا ہے۔ سڑک پر دو رویہ سایہ دار درخت ہیں' ہر آدھے میل پر ایک مکان ہے جس میں ہر مسافر چاہے ہندو ہو یا مسلمان آرام کرتا ہے۔ اور ہر ہر گھر کے پاس ایک کنواں ہے جس پر ایک ہندو پانی پلانے والا موجود رہتا ہے۔

اس نے ایک شہر ابی سرور کا ذکر کیا ہے۔ اور اسے ملیبار کا سب سے پہلا شہر قرار دیا ہے جہاں ناریل کے درختوں کی افراط ہے۔

دوسرا شہر فاکنور بتایا ہے۔ جہاں گنا پیدا ہوتا ہے۔ اس شہر میں بھی مسلمان آباد ہیں۔ اُن کی ایک جامع مسجد بھی ہے۔ راجہ کی طرف سے شہر کا قاضی ایک شخص حسین سلاو ہے۔ راجہ کا نام باسدیو ہے۔ اُس کے پاس تیس جنگی جہاز ہیں جن کا افسر ایک مسلمان ہے۔

یہاں سے تین دن کے فاصلے پر منجلور (منگلور) کا ذکر کیا ہے۔ اسے بڑا شہر بتایا ہے۔ جہاں فارس (ایران) اور یمن کے سوداگر کثرت سے آتے ہیں۔

دو دن کے سفر کے فاصلے پر ایک اور شہر ہیلی کا ذکر کیا ہے۔ اس شہر کی عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ یہاں چین کے بڑے بڑے جہاز ٹھہرتے ہیں۔

ہیلی کے بعد جرہ فتن شہر کا ذکر کیا ہے۔ یہاں کے راجہ کا نام کویل بتایا ہے۔ اس کے پاس بہت جہاز ہیں۔ جو عمان' فارس اور یمن جاتے ہیں جب کوئی مسافر مر جاتا ہے تو اُس کا سامان کسی مسلمان کے پاس امانت رکھ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اصل وارث آکر اپنا مال لے لیتا ہے۔

جرہ فتن کے بعد فتن کا ذکر کیا ہے۔ یہ دریا کے کنارے بڑا شہر ہے اس میں باغات بکثرت ہیں۔ ناریل' سیاہ مرچ' ڈلی اور پان بکثرت ہوتے ہیں کیلے اتنے اچھے اور سستے ہیں جیسے کہیں نہیں دیکھے۔ یہاں ایک بہت بڑا کنواں اور مسجد ہے۔ مسجد کی سیڑھیاں کنوئیں کے اندر تک بنی ہوئی ہیں۔ کنوئیں کی لمبائی پانچ سو قدم اور چوڑائی تین سو قدم لکھی ہے سرخ رنگ کے ترشے ہوئے پتھر سے بنا ہے۔ کناروں پر اٹھائیس بڑے بڑے گنبد بنے ہیں۔ یہ مسجد اور کنواں راجہ کویل کے دادا نے بنوایا تھا۔

اسی طرح ابن بطوطہ نے فندرینا کالی کوٹ' کجی کری' کولم' شالیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور راجاؤں کا مسلمانوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

امیر تیمور کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سنہ ۱۴۰۵ء کے بعد سلطان شاہ رخ کے نام سے خراسان کا حاکم ہوا اور بڑے جاہ و جلال سے حکومت شروع کی۔ سلطان شاہ رخ کے سفیر جو بنگالہ سے براہ سمندر ایران جا رہے تھے طوفان میں پھنس کر کالی کٹ میں لنگر انداز ہوئے۔ سفیر اور شیخ الاسلام نے کالی کٹ کے راجہ سامری سے ملاقات کی۔ راجہ سامری نے بھی سلطان شاہ رخ سے تعلقات قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی اور خواجہ مسعود کو جو ایک بڑے عالم و فاضل تھے تحفے تحائف دے کر اُن کے ساتھ کر دیا اور شاہ رخ سے خواہش کی کہ اگر حکم ہو تو کالی کٹ کے مسلمانوں کے جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں سلطان کا نام شامل کر دیا جائے۔

خواجہ مسعود نے ہرات میں شاہ رخ سے ملاقات کی۔ اس کے جواب میں سلطان نے خواجہ کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی کو کالی کٹ میں سفیر مقرر کر کے سنہ ۱۴۴۲ء میں روانہ کیا۔ شاہ رخ نے سامری کے لئے ایک عربی گھوڑا' پوستین کا زر دوزی جبہ' کلاہ نوروزی اور بہت سے قیمتی تحفے بھیجے۔ عبدالرزاق پانچ مہینے کالی کٹ رہا۔ وہاں سے بیجانگر کے راجہ دیو رائے نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ عبدالرزاق بیجانگر جا کر دیو رائے سے ملا۔ راجہ نے دو سفیر ساتھ کر کے سلطان سے تعلقات قائم کرنے کے لئے عبدالرزاق کے ساتھ روانہ کئے۔ سلطان نے بیجانگر میں بھی اپنا سفیر مقرر کیا۔

عبدالرزاق پانچ مہینے کالی کٹ میں رہا اس نے اپنی تاریخ مطلع السعدین میں یہاں کے حالات لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"کالی کٹ ایک آباد و معمور بندرگاہ ہے۔ اس میں حبشہ' زنجبار' زیرباد' مکہ اور بلاد حجاز کے بے شمار تاجر مقیم ہیں۔ دنیا کے ہر ملک کی نفیس اشیا اس جگہ فروخت ہوتی ہیں مسلمانوں نے راجہ کی اجازت

سے دو جامع مسجد بھی بنائی ہیں۔ جہاں پابندی کے ساتھ اذان اور نماز ہوتی ہے۔ راجہ نے مسلمانوں کے لئے ایک قاضی بھی مقرر کردیا ہے۔ یہاں کے مسلمان زیادہ تر شافعی مذہب کے پیرو ہیں۔ شہر میں ہر طرح کا امن وامان ہے۔ تاجر جہازوں سے لاکر اپنا مال واسباب بازاروں میں ڈال دیتے ہیں۔ جس کی حفاظت حکومت کرتی ہے اور اس میں رتی برابر کمی نہیں ہوتی۔ جب تمام سامان بک جاتا ہے تو منافع کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ لے لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور محصول نہیں لیا جاتا۔ اگر کوئی سوداگر مرجاتا ہے یا کسی کی کشتی طوفان میں تباہ ہوکر بندرگاہ پر آلگتی ہے تو اس کے مال کی پوری پوری حفاظت کی جاتی ہے اور جب اس کا وارث آتا ہے تو تمام اسباب اس کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ کالی کٹ سے جو جہاز عرب اور عدن وغیرہ کو روانہ ہوتے ہیں۔ ان میں عموماً کالی مرچ بھری ہوتی ہیں۔ کالی کٹ والے دریائی سفر میں بڑے مشتاق اور تیز رو چالاک ہوتے ہیں۔ اس لئے انھیں "چینی بچہ" کا لقب دیا گیا ہے۔"

ملیبار ہندوستان کا وہ پہلا علاقہ ہے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان ایران، عرب اور یورپ کے ممالک میں اپنی بیش بہا دولت اور پیداوار کے لئے مشہور ہوا اور ہر قوم نے اس ملک سے تجارت اور اچھے تعلقات کی ضرورت محسوس کی۔ ہندوستان نے بھی باہر کی قوموں، مذہبوں اور فرقوں کے ساتھ پوری رواداری کا برتاؤ کیا اور یہی چیز آج سے پہلے ہندوستان کی عظمت کی سب سے بڑی نشانی تھی۔ ہم اس عظمت کو نئے سرے سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ ہمیں حاصل ہوکر رہے گی۔

ذکر و فکر

ابر احسنی گنوری

نہ ملی کی موت نے بھی عشق کی مشکل تو کیا ہوگا
وہ آکر ہوگئے خود بیچ میں حائل تو کیا ہوگا

نہ آئی راس، سعیٔ ضبطِ دردِ دل تو کیا ہوگا
نکل آیا کوئی آنسو سرِ محفل تو کیا ہوگا

نہ خوش ہو تم محبت کو غمِ ہستی میں الجھا کر
محبت نے جو کر لی یہ بھی طے منزل تو کیا ہوگا

تلاطم سے گزر کرنا خدا خوش ہے، بہت خوش ہے
ڈبو دے اتصالِ کشتی و ساحل تو کیا ہوگا

کیا ہے حوصلہ ہوش و خرد نے عرضِ مطلب کا
لٹا یہ قافلہ جا کر سرِ منزل تو کیا ہوگا

یہ منزل کے چراغوں کی چمک، یہ آبلہ پائی
کہیں پرسش کو خود ہی آگئی منزل تو کیا ہوگا

طبیعت کو بدقت جبر کے سانچے میں ڈھالا ہے
اب اس نے ابرؔ سمجھا رحم کے قابل تو کیا ہوگا

عبدالمجید حیرت

از بس کہ ابھی گردشِ تقدیر وہی ہے
ہر گام پہ ناکامیٔ تدبیر وہی ہے

کیوں خانۂ صیاد میں لگتی نہیں پھر آگ
جب آہِ شرربار کی تاثیر وہی ہے

اتنے ہی پہ بس خوش ہیں کہ زنداں تو نہیں ہے
حالانکہ وہی طوق ہے زنجیر وہی ہے

جتنا کوئی بے لوث ہو جتنا کوئی بے لاگ
معلوم ہوا لائقِ تعزیر وہی ہے

جو دل میں اتر جائے، جو آنکھوں میں سما جائے
اپنا تو ہے یہ قول کہ تصویر وہی ہے

تسلیم، کہ تیرے لئے بدلی نہیں دنیا
تو بھی تو مگر اے دلِ دلگیر وہی ہے

دارو ئے شفا خاک کی چٹکی بھی اگر ہو
آجائے اگر ہاتھ تو اکسیر وہی ہے

بیمار کی حالت میں ابھی کچھ بھی نہیں فرق
تکلیف و تعب تا دمِ تحریر وہی ہے

بھولے ہوئے بیٹھے ہیں جسے حضرتِ حیرتؔ
سچ یہ ہے کہ اصلاح کی تدبیر وہی ہے

انجم اعظمی

آشاؤں کا ایسا سپنا جیون کو کیا دے گا

سوچ رہا ہے من ہی من میں پریت نگر کا مالی
اب کے ایسا موسم آئے جھومے ڈالی ڈالی
آئے کوئی آئے لیکن دیکھ ہو اس کی نرالی
ہونٹوں پہ مسکان لئے ہو رخساروں پہ لالی

آشاؤں کا ایسا سپنا جیون کو کیا دے گا

من کو راہ نہ دکھلائے جو غم کو اور بڑھائے
ایسی باتیں یاد دلائے آنکھ مری بھر آئے
کیسے کیا ہو میں نہ سمجھوں جی اپنا گھبرائے

آشاؤں کا ایسا سپنا جیون کو کیا دے گا

ہاتھ بڑھا کر میں اپنانا چاہوں ایسی چیزیں
ہاتھ نہ آئیں لیکن میری سکھ کی گھڑیاں بیتیں

آشاؤں کا ایسا سپنا جیون کو کیا دے گا

الم مظفر نگری

ذوقِ خودی نواز اگر شاملِ بیخودی نہیں
سجدۂ بے ریا میں بھی لذتِ بندگی نہیں

جس کی نگاہ آفتاب ذرّے میں دیکھتی نہیں
اس کا شعورِ آگہی حاصلِ آگہی نہیں

لطفِ نگاہِ ناز کا عیشِ دوام ہی سہی
لذتِ سوزِ عشق بھی لذتِ عارضی نہیں

کوئی بتائے کیوں مجھے جلووں کی ان کے ہے تلاش
اپنے مذاقِ دید سے جب مجھے آگہی نہیں

گرمِ سفر رہو الم وقت نہیں قیام کا
سایۂ زلفِ حسن ہے شام ابھی ہوئی نہیں

اسلم اثر قراولی

زمانہ بیت گیا ترکِ عشق کو لیکن
کسی کی یاد ابھی دل کو گدگداتی ہے

حسین راتوں کی پرچھائیاں لئے دل پر
طرب نواز بہاروں کو ساتھ لاتی ہے

ترے جمال کی تابانیوں میں گم ہو کر
میں اپنے درد کی تسکین کر نہیں سکتا

غمِ حیات کی تاریک رہگذار وں سے
تری نظر کے سہارے گذر نہیں سکتا

ترے بغیر میں افسردہ ہو تو سکتا ہوں
مگر میں ترکِ محبت سے مر نہیں سکتا

مجھے یقیں ہے مگر دل کے بیکراں ہونٹ سے
کبھی تو ظلمتِ شب سے گذر ہی جائیں گے

مرے بلند عزائم ربابِ ہستی پر
بصد غرور محبت کے گیت گائیں گے

زمانہ چاہیئے لیکن ابھی فراغت کو
ضیائیں راہ نہیں عوت نظر کے لئے

یہ زندگی کا کڑا دور ہے مری محبوب
میں جانتا ہوں کہ مضطر ہے تو اداکے لئے

ترے لئے میں ارادے بدل نہیں سکتا
کہ زندگی ہے مری خدمتِ بشر کے لئے

رتن لال کھنہ

پنجابی کہاوتیں

کسی قوم یا طبقہ کی کہاوتوں کی اہمیت مسلمہ ہے ۔ ارسطو نے یونانی لوک کہاوتیں اکٹھا کیں ۔ کہاوتیں لوگوں کی روحانی زندگی کا آئینہ ہیں ۔ ان کی مدد سے ہم متعلقہ لوگوں کے اطوار خصائل ۔ اخلاقیات اور فلسفے کی منہ بولتی تصویر کھینچ سکتے ہیں ۔ لوک نفسیات کے ادراک کے لئے کہاوتوں کا مطالعہ بڑا اہم ہے ۔ گیٹے کا قول ہے کہ لوگ اپنے اخلاق کا بہترین انکشاف ان چیزوں سے کرتے ہیں جن پر وہ ہنستے ہیں ۔ کہاوتوں سے لوگوں کے مزاح اور ظرافت کا خوب پتہ چلتا ہے ۔

پنجابیوں کی زندگی میں کہاوتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں ۔ پنجابی لوگ کہاوتوں کو بڑے ذوق شوق سے برتتے ہیں ۔ اور گوناگوں موقعوں پر استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً بیان میں دلکشی پیدا کرنا ۔ بات کو چٹ پٹا بنانا ۔ گفتگو میں چٹخارہ پیدا کرنا ۔ دلیل کو پُر زور بنانا ۔ دوسروں کی قوت ارادہ پر اثر ڈالنا ۔ ظرافت کی پھلجڑیاں اور طنز کے تیر چلانا ۔ شہر اور دیہات ہر جگہ کہاوتیں مقبول عام ہیں ۔

ان کہاوتوں کے موضوعات متنوع ہیں ۔ کاشتکاری ساہوکارہ پر طنز، جاٹوں کی سادہ لوحی پر طنز، موسم اچھی نمائش، حکمت عملی، اخلاقیات، فلسفہ، نفسیات، عورت، عشق و شادی، مزاح و ظرافت، مذہب اور روحانیت، معاشرتی رسم و راہ، خانگی زندگی کے مختلف پہلو خورد و نوش وغیرہ وغیرہ ۔ گویا انسانی خیالات اور جذبات کا سارا حال کہاوتوں سے مظہر ہے ۔ اس مقالے کے آخر میں ۱۲۵ کہاوتیں مختلف موضوعات کے لحاظ سے اکٹھا کر دی گئی ہیں ۔ ان کے مطالعے سے لوک خیالات اور جذبات کی گوناگونی عمق اور کیفیت کا خوب پتہ چل سکتا ہے ۔ کہاوت مختصر اور جامع مقولہ ہے ۔ اس کا منبع عام لوگ ہیں ۔ اس لئے کہاوت کو آوازۂ خلق کہا جاتا ہے ۔ اختصار اس کا لازمی خاصہ ہے بلکہ بنیادی عنصر، جتنی زیادہ مختصر ہوگی اتنی ہی زیادہ مقبول عام ہوگی ۔ عربی کا مقولہ خیر الکلام ما قل و دل کہاوت پر راست آتا ہے ۔ ایک اچھی کہاوت میں دو خوبیاں ضروری ہیں ۔ ایجاز لفظ اور اعجاز معنی ۔ لوک گیتوں کی طرح کہاوتوں کی زبان عام فہم ہوتی ہے ۔ اور اسٹائل میں بناوٹ کا شائبہ نہیں ہوتا ۔

پنجابی کہاوتوں میں مجاز، تمثیل، استعارہ اور کنایہ بکثرت پائے جاتے ہیں ۔ زبان سادہ اور سیدھی سادی ہے ۔ تصنع نام کو نہیں یہ کہاوتیں پُر مغز اور پُر معنی ہیں ۔ ما قل و دل ہیں ۔ اختصار، رنگینی، عقل سلیم کہاوتوں کے تمام ضروری عناصر ان کہاوتوں میں پائے جاتے ہیں ۔ کئی تو لفظی ایجاز اور کئی معنوی اعجاز اور کچھ لفظی اور معنوی اعجاز کے گوہر ہیں ۔

ع جوہر شناس ہے تو انہیں موتیوں میں تول ۔ ٹکسالی پنجابی زبان کے یہ نہایت مستند نمونے ہیں ۔

ماہرین لوک ودیا ۔ لسانیات ۔ ادب کے مورخین کے لئے ان کا ملاحظہ اور مطالعہ پُر ثمر ہوگا ۔ معاشرتی زندگی کے مورخین ۔ فلسفہ اور نفسیات کے ماہرین بھی ان کے مطالعے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ اور پنجابیوں کی مسلمہ قدروں کا جائزہ لے سکتے ہیں ۔ اس ضمن میں وان ڈوی والڈری کا یہ مقولہ کہ لوگ اپنی قدروں کا مجسمہ ہوتے ہیں ۔ یاد رکھنے کے قابل ہے ۔

پنجابی کہاوت	اردو ترجمہ
کاشتکاری کے متعلق کہاوتیں	
(۱) دب کے واہ، رج کے کھا	خوب ہل چلاؤ اور سیر ہو کر کھاؤ
(۲) واہی بادشاہی نہ ہتیو تے گل وچ پھاہی	کھیتی باڑی بادشاہی ہے اگر فصل نہ ہو تو پھانسی کی رسی ہے ۔
(۳) ماڑا ڈنگر سبے روگ	کمزور بیل کو تمام بیماریاں
(۴) دالیں راجہ ملیں کھیتی	کھیت کے لئے کھاد راجہ کے لئے فوج
(۵) جمین نوں واہ تے کھنڈ کھیر کھا	زمین کو جوتو اور کھانڈ کھیر کھاؤ
(۶) لگی اوڑ تے کھیتی چوڑ	جب خشک سالی آتی ہے تو کھیتی برباد ہو جاتی ہے
(۷) جس دے گھر لویرا اوسب تھوں چنگیرا	جس کے گھر دودھ وہ راجہ کا پوت
(۸) پکی کھیتی لائے لادے ۔ جٹ کرے بادشاہی دے دعوے	جب جاٹ کھیتی کاٹے راجہ کے مارے جانٹے
(۹) اتم کھیتی مدھم بپار ۔ نکھد چاکری بھکھ نداں	اتم کھیتی، مدھم بیوپار، چاکر ناچار، منگتا خوار
ساہوکاروں کی حرص پر	
(۱۰) شاہ دے قابو آئے گھروں گھاٹوں جائے	ساہوکار کے باٹ کا، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا
(۱۱) بیکھا نہ کر شاہاں دے نال متاں کچھ دینا آوے	ساہوکار سے معاملہ کرے، اپنی گانٹھ سے دے ۔
(۱۲) پہلے شاہ پچھے بادشاہ	پہلے شاہ پیچھے بادشاہ
جاٹوں پر طنزیہ کہاوتیں	
(۱۳) جٹ دا ہاسا تے غریب دا بھنے پاسا	جاٹ کی ہنسی غریب کی گردن پھنسی
(۱۴) جٹ دے جو پکے سٹے سکی ماں نوں مارے دھکے	جب جاٹ کے بھٹے پکے سگی ماں کو بھی دے دھکے
(۱۵) جٹ توں نفع مول نہ بھال جٹ گنوائے مرشد نال	جاٹ سے مانگ نہ مال، وہ دے مرشد کو بھی ٹال
(۱۶) ہوچھے جٹ کٹوری لبھی پانی پی پی آپھریا	ادچھا جاٹ کٹوری پائی پانی پی پی مرجائے ۔
موسموں کے متعلق کہاوتیں	
(۱۷) گھاہ پھلے تاں مینھ بھلے	جب گھاس پھولے، مینہ بھولے
(۱۸) جے مینھ نہ پوے لوہڑی ہاڑی ہووے گی تھوڑی	جب بولے نہ لوہڑی ہاڑی ہووے تھوڑی
(۱۹) ساون ماہ دی رُت نہ چھاں بھاوے نہ دھپ	ساون بھلائے نہ چھاؤں بھوپ نہ سوکھی دھوپ
اوچھی نمائش کے متعلق کہاوتیں	
(۲۰) ماں مرگئی ننگی دھی دا ناں بچکی	ماں مرگئی ننگی بیٹی کا نام چنگی
(۲۱) اِک ڈھکدی ناہیں میں دو پرنیساں	ایک جورو کا کال اور دوسری کا خیال
(۲۲) چبڑی دا چہرہ تے ناں نور بی بی	مُنہ لنگور بی بی نام نوری بی
(۲۳) ککھاں دی جُھگی داند خاں دا پرنالہ	پھُوس کا مالا ہاتھی دانت کا پرنالہ

پنجابی کہاوت

(۲۴) اکھیاں نال پھل نہ ڈِٹھا تے ناں گُل بی بی

(۲۵) پلے نہ کوڈی ناں لکھ پتی

(۲۶) ناں وڈا دیہہ سونجا

(۲۷) آندراں بھکیاں تے مُچھاں نے چَول

حکمت عملی

(۲۸) جدا کھائیے اُودا گیت گائیے

(۲۹) جتھے ہووے پیار او تھے نہ کریئے وپار

(۳۰) گولا ہو کے کمادیئے ۔میاں ہو کے کھاویئے

(۳۱) نادوہ بیگانی گاں مارے لت تے بھنے باں

(۳۲) دریا وچ رہنا تے مگرمچھ نال ویر

اخلاقیات

(۳۳) بھلے دا بھلا

(۳۴) سخی دا بیڑا پار

(۳۵) کر بھلا - ہو بھلا انت بھلے دا بھلا

(۳۶) بھیڑے کماں دا بھیڑا پھل

(۳۷) جیسی کرنی تیسی بھرنی

(۳۸) آپ بھلا جگ بھلا

لوک فلسفہ

(۳۹) جان نال جہان ہے

(۴۰) گھر دی کھٹی باہر دی ساری ناوں چنگی ہے

(۴۱) کمینے دی یاری ڈھوہیں دا ڈنگ

(۴۲) بہوت بھلا نہ بولڑا ۔ بہوت بھلی نہ چُپ
بہوت بھلا نہ مینگھلا - بہوت بھلی نہ دُھپ

(۴۳) جہدے ہتھ ڈوئی بھک مرے سوئی

(۴۴) سچ نوں کوئی آنچ نہیں

(۴۵) چِنتا چِکھا برابر

لوک نفسیات

(۴۶) سپ دا کھادا رسے تے ڈردا

اردو ترجمہ

پھول بن کانٹے بنتی اور نام گل بی بی

پاس نہیں کوڑی نام لاکھ پتی

نام بڑا درشن تھوڑے (اونچی دکان' پھیکا پکوان)

پیٹ میں ہلچل - مونچھوں پر چاول

جس کا کھائے' اسی کا گائے

جہاں پیار - وہاں کیسا بیوپار

چاکر روپ کماؤ مالک بن کر کھاؤ

ڈوہے جو بیگانہ گائے مگر لاتیں کھائے

ندی میں رہنا مگرمچھ کو اُلہنا)

بھلے کا بھلا

سخی کا بیڑا پار

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا - (اُونچا کام اچھے والم)

بُرے کاموں کا بُرا پھل

جیسی کرنی ویسی بھرنی

آپ بھلے جگ بھلا

جان ہے تو جہان ہے پیارے

گھر کی آدھی باہر کی ساری

کمینے کی یاری بچھو کا ڈنگ

چُپ، بدلی اور مخول

بے موقعے ہو تو جھول

جس کے ہاتھ ڈوئی بھوکا مرے دوئی

سانچ کو آنچ نہیں

چنتا اور چتا برابر

سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے ۔

پنجابی کہاوتیں

(۴۷) بلی نوں چھیچھڑیاں دے سپنے
(۴۸) گدڑ دا کھ نہ اپڑے تھو کوڑی
(۴۹) کمہاری اپنا بھانڈا سلاوندی اے

عورتوں کے متعلق

(۵۰) پادے ہر کوئی ٹھنکا دے کوئی
(۵۱) چور اچکا چودھری تے گنڈی رن پردھان
(۵۲) کوہ نہ چلی بابا تہائی

پریم اور شادی کے متعلق

(۵۳) پرناں خوشی نال ناں تاں مرنا
(۵۴) پڑھی ہوئی بھی ان پڑھ نوں دینی گتو کھوتے نوں اکٹھا کرنا دے
(۵۵) بوہے آئی جنج و نوں کڑی دے کن
(۵۶) اک وچھوڑا یار دا دوجی کالی رات
(۵۷) نچن لگی تے گھنگھٹ کیا

ظرافت

(۵۸) ہاتھی دے دند دکھن دے ہور تے کھان دے ہور
(۵۹) اٹھ نہ سکے آپ پھٹے منہ گوڈیاں دا
(۶۰) کڑی کچھڑ تے شہر ڈھنڈورہ
(۶۱) گھر نہیں دانے - اماں پیہن گئی
(۶۲) پٹیا پہاڑ نکھو ٹیا چوہا
(۶۳) منہ سوئی تے پیٹ کھوئی
(۶۴) سروں گنجی کنگھیاں دا جوڑا
(۶۵) چور نالوں پنڈ کاہلی
(۶۶) نہ منہ نہ متھا تے جن پہاڑوں لتھا
(۶۷) ذات دی کوڑ کرلی شہتیریاں نال جپھیاں
(۶۸) ہتھ نہ پلے تے کھیسا ہلے
(۶۹) کھنڈوں خالی رب دے سوالی

مذہب و روحانیت

(۷۰) سماں بھیڑا پرکھے چار - دھرم، دھیرج، متر، نار

اردو ترجمہ

بلی کو چھیچھڑوں کے خواب
انگور کھٹے ہیں
کمہاری اپنے ہی برتن پیاری

چھاگل سب کو بھاتی، پر کوئی کوئی ٹھنکاتی
گنڈے نر شریمان، گنڈی ناری پردھان
کوس بھی نہ چلی داسی پھر بھی بابا پیاسی

شادی جی سے کرنا، نہیں تو مرنا
پڑھی ان پڑھ کے گھر جائے - گائے گدھے کو اٹھائے
دروازے پر برات دیکھو تو دلھن کا کان چھیدو
ایک تو برہا گھیری دوجے رین اندھیری
ناچنے نکلی تو خطاب کیسی

ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور
اٹھ نہ سکے آپ پھٹے منہ گھٹنوں کا -
لڑکی بغل میں ڈھنڈورہ شہر میں
گھر دانے نہیں - اماں پیسنے گئی -
کھودا پہاڑ نکلا چوہا (کوہ کندن کاہ برآوردن)
منہ سوئی اور پیٹ کنواں
سر سے گنجی اور کنگھیوں کا جوڑا
چور سے گٹھڑی زیادہ عجل (شتاب)
نہ منہ نہ ماتھا اور پہاڑ سے جن اترا
ذات کی چھپکلی اور شہتیروں سے ہم آغوشی
نہ کچھ ہاتھ سے نہ ٹٹوا ہیں اور جیب ہلے
جیب خالی - رب کا سوالی

بڑا وقت پرکھے چار - دھرم، دھیرج، متر، نار

(۷۱) نرت دان مہاں کلیاں

(۷۲) رب مہربان تے سبو مہربان

(۷۳) بندہ جوڑے پلی پلی رب روڑا دے کپا

عقل کی اہمیت

(۷۴) عقل باجوں کھوں خالی

(۷۵) انجان ددیا پراناں دا کھاڈ

شیخی یا خالی خول دھمکی

(۷۶) جیہڑے گجدے ہین اد وسدے نہیں

(۷۷) سکھنا تے ہولا بھانڈا بہت کھڑکدا ہے

بگلا بھگتوں پر طنزیہ کہاوتیں

(۷۸) دسن نوں چنگا عملاں دا خراب

(۷۹) چٹی قبر تے مردہ بے ایمان

(۸۰) دسن دا بگلا تے مچھیاں دا ٹرکاؤ

(۸۱) داڑی شیخاں دی کم شیطاناں دے

(۸۲) گھر چوہڑیاں دا نام دھرم سالہ

(۸۳) شکل موماں دی اندر کافراں دا

(۸۴) کچھ تلے قران نظر ڈھگے تے

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس

(۸۵) جہدی لاٹھی اس دی بھینس

(۸۶) جہدی تیغ اس دی دیگ

معاشرتی رسم راہ کے متعلق

(۸۷) اڈ کھائے سو ہڈ کھائے ونڈ کھائے سو کھنڈ کھائے

(۸۸) سوہرے گھر جنوا ترا کتے دی مانند

(۸۹) دو ہتھڑ تاڑی وجدی اے

(۹۰) کولیاں دی دلالی تے مُنہ کالا

(۹۱) سانجھی چنگا نہیں او ۔ چوری چپی کھادے کھو

خانگی زندگی سے متعلق

(۹۲) کھٹو آوے ڈردا تے نکھٹو آوے لڑدا ۔

(۹۳) ٹبر بھک مرے تے بنیرا سیلاں کرے ۔

نرت دان مہاں کلیان

رب مہربان تو سب مہربان

بندہ جوڑے پلی پلی رب گرائے پل

بغیر عقل کنواں خالی

عقل نادان خطرۂ جان

جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں

جو ظرف ہو خالی وہ صدا دیتا ہے

صورت مہتاب، اعمال خراب

مقبرہ جنت نشان مردہ بے ایمان

دیکھنے کو بگلا مگر مچھلیاں ہڑپ کر جاتا ہے ۔

داڑھی رحمان کی کام شیطانوں کا

گھر بھنگی کا کالا نام دھرم سالہ

شکل مومنوں کی ۔ دل کافروں کا

بغل میں قرآن نظر بیل پہ (رام رام جپنا پرایا مال اپنا)

جس کی لاٹھی اس کی بھینس

جس کی تیغ اس کی دیگ

اکیلا کھائے تو ہڈی کھائے بانٹ کر کھائے تو کھانڈ کھائے

گھر داماد سگ بنیاد

دو ہاتھ سے تالی بجتی ہے

کوئلوں کی دلالی میں مُنہ کالا

اس ساجی پر دائے جو چوری چوری کھائے

کماؤ لڑکا ڈرتا، نکما لڑکا بھڑتا ۔

گھر میں اُڑتی دُھول دُولھا میاں باغوں باغوں پھول

	پنجابی کہاوت	اردو ترجمہ
(۹۴)	گھر دی آدھی باہر دی ساری نالوں چنگی اے	گھر کی آدھی باہر کی ساری
(۹۵)	جو سکھ چوبارے نہ بلخ نہ بخارے	جیسے گھر پیارا وہ کیا کرے بلخ بخارا
(۹۶)	میاں بیوی راضی تے کی کرے گا قاضی	میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی

خورد و نوش کے متعلق

(۹۷)	جو کرے گھیو نہ کرے ماں نہ کرے پیو	جو کرے گھی وہ نہ ماں کرے نہ پی
(۹۸)	رکھے دی ڈھڈ تے اُجاڑے دی ڈھڈ	پیٹ ہی رکھے پیٹ ہی چکھے
(۹۹)	کھان پین نوں چنگے بھلے تے کم کرن نوں ڈورے	کام چور نوالے حاضر

متفرق کہاوتیں

(۱۰۰)	باندر کی جانے ادرک دا سواد	بندر کیا جانے ادرک کا مزہ
(۱۰۱)	عراقی نوں سینت ۔ گدھے نوں سوٹا	عراقی گھوڑے کو اشارہ، گدھے کو سونٹا
(۱۰۲)	چھوٹا پانی دیکھ کے وڈا ٹپ نہ مار	پانی کم پاؤ تو لانبی چھلانگ نہ لگاؤ
(۱۰۳)	کتا راج بہا لیا چکی چٹن جائے	کتا تخت پر بیٹھے پھر بھی چکی چاٹے
(۱۰۴)	گاؤں بھونوائے جوں بھانوے گلے ہون	ضرورت جو بھنوا لیتی ہے، چاہے وہ گیلے ہی ہوں۔
(۱۰۵)	ڈونگی واہی گجھ چلائے درتھا نہ جائے	چرخہ کاتے اور ہل چلائے، محنت اکارت نہ جائے
(۱۰۶)	چدر ویکھ کے پاؤں پسارو	چادر کے مطابق پاؤں پھیلاؤ
(۱۰۷)	نامی شاہ کھٹ کھائے نامی چور ماریا جائے ۔	نامی ساہو کما کھائے نامی چور پکڑا جائے
(۱۰۸)	جہی روح تہہ فرشتہ	جیسی روح ویسا فرشتہ
(۱۰۹)	سچ مرچاں جھوٹ گڑ	سچ مرچیں جھوٹ گڑ
(۱۱۰)	چٹی کتی جلیبیاں دی راکھی !	سفید کتیا جلیبیوں کی رکھوالی !
(۱۱۱)	دیکھی ٹھوک وجا دنیا مطلب دی	ٹھوک وجا کر دیکھی دنیا مطلب کی
(۱۱۲)	نانی خصم کیتا ۔ دوہتے نوں چٹی پئی	نانی نے شادی کی دوہتا کو جرمانہ پڑا
(۱۱۳)	ست سو چوہے کھا کے بلی حج نوں چلی	سات سو چوہے کھا کے بلی حج کرنے چلی
(۱۱۴)	سر قائم جنگ دائم	سر قائم جنگ دائم
(۱۱۵)	خربوزہ خربوزے تھوں رنگ پکڑ دا اے	خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے
(۱۱۶)	سانچ نوں کوئی آنچ نہیں	سانچ کو آنچ نہیں ۔

آج کل میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

محمد امین

آج کا روس

روس کا نظام حکومت دنیا کے تمام ملکوں سے مختلف اور نرالا ہے۔ یورپ اور ایشیا کے وسیع رقبے روس میں شامل ہیں۔ یہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ صنعت، زراعت اور تعلیم کے سلسلے میں پچھلے تیس سالوں میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے —— اس ترقی کے لئے اس کے قدرتی ذرائع اور اُن کا صحیح استعمال بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

روس کی ترقی اور کامیابی کا راز اس کے پنج سالہ منصوبوں میں مضمر ہے۔ ۱۹۲۸ء سے چار پنج سالہ پروگرام کے ذریعے اُس نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ پہلے اس کی معاشی زندگی کا دار و مدار کاشتکاری پر تھا لیکن اب روس کا شمار دنیا کے سب سے بڑے صنعتی ملکوں میں ہوتا ہے۔ سوائے امریکہ کے کوئی بھی اس کا ہم مقابل اور ہم پلہ نہیں۔ ۱۹۴۶ء سے اس کا چوتھا پنج سالہ پروگرام شروع ہوا ہے، اور اُمید ہے کہ آئندہ پندرہ سال کے اندر اندر وہ دنیا کا سب سے بڑا صنعتی، معاشی اور سیاسی ملک بن جائیگا۔

آج روس میں ہزاروں کارخانے ہیں۔ ہزاروں لوہے اور کوئلے کی نئی نئی کانیں ہیں۔ لاکھوں میل لمبی ریل ہے بیسیوں کروڑوں ایکڑ زمین پر آب پاشی کا انتظام ہے بجلی کی طاقت حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے پاور ہاؤس ہیں، اور سمندر کے ساحل پر پچاسوں جدید اور عمدہ قسم کی بندرگاہیں ہیں۔

یہ زبردست کامیابی یوں ہی نہیں ہوئی ہے اور نہ کسی سرمایہ دار کی ذاتی کوشش سے بلکہ یہ سب کچھ ایک خاص منصوبہ بندی کے مطابق ریاست کے ہر ہر فرد کی پیہم کوشش کا نتیجہ ہے۔ سائنس، معدنیات، صنعت و حرفت، زراعت، تعلیم ہر پہلو سے ہر کہیں۔ مکانات الغرض ہر چیز کو ترقی دینے کے لئے حکومت اسکیمیں بناتی ہے۔ ہر کام کے لئے الگ الگ کمیسار (وزارتیں) ہیں۔ ہر شعبہ اپنا اپنا پنج سالہ پروگرام بناتا ہے، اور اس کے بعد سارے پروگراموں کو اکٹھا کر کے مرکزی حکومت تمام ملک کے لئے ایک مکمل منصوبہ تیار کرتی ہے اور ہر ری پبلک کیلئے الگ الگ کوٹا مقرر کرتی ہے۔ اس کے بعد سارا ملک ایک سرے سے دوسرے سرے تک کم سے کم وقت میں منصوبہ پورا کرنے کی کوشش میں منہمک ہو جاتا ہے۔

روس ایک بہت وسیع ملک ہے۔ اس کا رقبہ ۸۰ لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ ہے۔ یوں سمجھئے کہ امریکہ، کینیڈا، الاسکا، میکسیکو کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی سلطنت خشکی کے حصے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک یورپ اور ایشیا میں ایک مسلسل قطعۂ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔

یورپ اور ایشیا کے بہت سے ملکوں کی سرحد روس سے ملتی ہے۔ اور جنوب میں اس کی سرحد ۲۵ ہزار میل تک مسلسل پھیلی ہوئی ہے۔ اسکی آبادی ۲۰ کروڑ ہے، جو امریکہ، کینیڈا، الاسکا، اور میکسیکو کی مجموعی آبادی سے تقریباً دو کروڑ زیادہ ہے۔ کاشت کا رقبہ ۹ لاکھ مربع میل ہے۔ اس کے مقابلے میں امریکہ میں صرف ۵ لاکھ مربع میل زمین کاشت کے قابل ہے۔ روسی ترکستان میں ۳۵ لاکھ مربع میل ریگستان ہے جو بہت جلد کاشت کے قابل ہو جائے گا خصوصاً جبکہ مصنوعی بارش اور سمندر کے کھاری پانی کو آب پاشی کے قابل بنانے کا طریقہ معلوم کیا جا چکا ہے۔

امریکہ کی طرح یہاں بھی معدنیات کی فراوانی ہے بعض معدنیات میں وہ امریکہ سے پیچھے ہے لیکن زیادہ تر معدنیات ایسی ہیں جن میں اس کا شمار دنیا میں اوّل درجے پر ہے۔

لوہے اور کوئلے کی یہاں بھی بہت افراط ہے ۱۹۲۸ء تک زیادہ تر کوئلہ اور لوہا اس کے یورپین علاقے سے نکلتا تھا۔ لیکن جوں جوں

اس کے پنج سالہ منصوبے کامیاب ہوتے گئے اسی لحاظ سے اُس نے نئے نئے علاقوں میں لوہا اور کوئلہ ڈھونڈھ نکالا۔

بحیرۂ اسود کے قریب صرف ڈونز بیسن میں پہلے کوئلہ نکالا جاتا تھا لیکن دورانِ جنگ میں جب اس علاقے کے تمام کارخانے یورال پہاڑ کے پیچھے منتقل کئے گئے تو معلوم ہوا کہ سائبیریا کی سرزمین قدرتی خزانوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس وقت ڈونز بیسن کے علاوہ مغربی سائبیریا میں کزنسک بیسن، قازقستان میں کراگنندہ جو پہلے الیپ کے ریگستانی علاقے میں پوشیدہ تھا۔ کاکیشیا مشرق بعید اور الٹائی پہاڑیوں کے دامن میں لامحدود قدرتی وسائل ہیں۔ یورال کے علاقے میں بھی کوئلہ کا ذخیرہ موجود ہے اور مشرق میں دریائے آمور کی وادی میں بھی کوئلے کے امکانات ہیں۔ قیاس ہے کہ روس میں امریکہ کے مقابلے میں کوئلے کا ذخیرہ زمین کے اندر کئی گنا زیادہ ہے اور خرچ کی موجودہ رفتار کے حساب سے ہزاروں برس کے لئے کافی ہے۔ اور یہ سارا کا سارا کوئلہ لوہے کو گلانے کے لئے بہترین ثابت ہوا ہے۔

پہلے لوہے اور فولاد کی صنعتیں زیادہ تر ڈونز بیسن اور ماسکو کے علاقے میں تھیں لیکن جیسے جیسے لوہے کی نئی نئی کانیں معلوم ہوتی گئیں اسی لحاظ سے صنعت کا مرکز بھی منتقل ہوتا گیا۔ سائبیریا کے دو قصبوں — نووی برسک اور وار کوٹسک میں زمین کے اندر سے معدنیات نکالنے کے آلے بنائے جاتے ہیں۔ اسٹالے نسک میں انجن، یورال کے علاقے میں چلیابنسک میں ٹریکٹر، مشین ٹولز اور بجلی کے بڑے بڑے اوزار سورڈ ودلسک میں، ڈیزل انجن ادمسک میں کاشتکاری کی مشین۔ تاشقند میں آٹا پیسنے والی مشین سیمی پلاٹنسک میں جو کہ قازقستان کے سٹیپ میں ہے۔ ماسکو، لینن گریڈ اور خارکو میں بجلی کی مشین تیار ہوتی ہے۔ یوکرین، یورال اور سائبیریا کا وسطی اور مغربی حصہ لوہے کی صنعت کا مرکز ہے۔

قازقستان، یورال اور وسطی ایشیا کے علاقے میں حکومت کی توجہ زیادہ ہے۔ یورال کے علاقے میں بہترین لوہا پایا جاتا ہے۔ اور اس سے ایک ہزار میل مشرق میں مغربی سائبیریا کے کزنسک بیسن میں بہترین کوئلہ دونوں علاقوں کے درمیان گورنمنٹ نے آمدورفت کا ایسا انتظام کیا ہے کہ ایک سمت سے کوئلہ جاتا ہے تو دوسری سمت سے لوہا آتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ کزنسک اور میگ نی ٹوگورسک جو جنوبی یورال میں ہے۔ دونوں جگہوں میں لوہے اور فولاد کی صنعت نے تیزی سے ترقی کی ہے۔ خوش قسمتی سے اب یورال کے علاقہ میں بھی عمدہ قسم کا کوئلہ مل گیا ہے۔ لہٰذا اب کوئلہ سائبیریا سے لانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ بلکہ وہ اپنے اوپر آپ بھروسہ کرے گا۔ دریائے آمور کی وادی میں بھی لوہا اور کوئلہ ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں بھی لوہے اور فولاد کی صنعت کو ترقی دی جا رہی ہے۔ تاکہ بحرالکاہل کے ساحل پر ٹھیک جاپان کے مدمقابل جہاز بنانے کی صنعت تیزی سے ترقی کر سکے۔

پٹرول کی پیداوار کے لئے شروع شروع میں باکو کا علاقہ مشہور تھا۔ لیکن ۱۹۲۵ء کے بعد خاص طور سے نئے ذخیرے اور تیل کے چشمے معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پچھلی جنگ عظیم چھڑنے سے چند سال پیشتر سوویٹ حکومت نے کئی ہزار سائنس والوں کو اسی کام کے لئے متعین کیا تھا۔ ان دنوں وہاں چار ہزار سے زیادہ لوگ زمین کے اندر مختلف قسم کی معلومات معدنیات تیل کے چشمے، یورینیم وغیرہ معلوم کرنے کے لئے دن رات کام کر رہے ہیں۔ تیل کے چشمے کا بہت بڑا ذخیرہ کاکیشیا میں گرازنی کے پاس معلوم ہوا ہے۔ علاوہ اس کے جنوبی یورال کے علاقے میں بھی ایک بہت بڑا خطہ اس سے بھرا پڑا ہے۔

علاوہ تیل کوئلہ اور لوہے کی صنعت کے روس میں بجلی کی طاقت نے بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے۔ ماسکو لینن گریڈ اور ڈونز کے اضلاع میں بجلی کی طاقت کروڑوں کیلوٹ حاصل کی جاتی ہے۔ اور مختلف صنعتوں میں استعمال ہوتی ہے لیکن حکومت نے زیادہ توجہ اور مستعدی سے ہر خطہ میں الگ الگ بجلی پیدا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ دریائے نیپر، دالگا، نیپی سی کی وادیوں میں اور کاکیشیا اور انگارا کے علاقوں میں بھی بجلی حاصل کرنے کی بڑی بڑی اسکیمیں کام کر رہی ہیں۔ سائبیریا اور وسطی ایشیا میں بھی بجلی پیدا کرنے کے ذرائع لامحدود ہیں۔ سائبیریا کے پوشیدہ قدرتی خزانے کا راز معلوم کرنے کے لئے جوں جوں روسی حکومت دلچسپی لے رہی ہے ویسے ہی دن بدن نئی نئی بیش بہا دھاتیں دولت صنعت و حرفت کے لئے خام پیداوار کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ دورانِ جنگ اور جنگ کے

بعد کے زمانے میں اس علاقے نے تیزی سے ترقی کی ہے چنانچہ اب وہاں ہر قسم کی صنعت و حرفت، لوہے اور فولاد، بجلی اور ٹریکٹر، انجن اور زراعت کی مشین، کھاد اور کیمیکل ہر ایک کی بہتات ہے۔ اسی لئے سائبیریا موجودہ روس کے صنعتی ڈھانچے کا دل کہا جاتا ہے۔

جدید کوشش کی بنا پر ماہرین طبقات الارض کا اندازہ ہے کہ روس کی سرزمین خصوصاً سائبیریا اور وسطی ایشیا کے خطوں میں ان گنت معدنیات کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ نہ صرف کوئلہ، لوہا اور تیل کا بے شمار ذخیرہ موجود ہے بلکہ سونا، چاندی، پلیٹنم، ریڈیم، یورینیم، جواہرات، پوٹاش اور نمک، مینگنیز، جست، سیسہ، تانبہ اور پارہ کافی مقدار میں موجود ہے۔ اور اب ان میں سے تقریباً سبھی دھاتیں زمین سے نکالی بھی جانے لگی ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ روس جوں جوں اپنی منصوبہ بندی کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوتا جائے گا ویسے ہی اس کی طاقت صنعتی، اقتصادی اور سیاسی بڑھتی جائے گی۔ اور بس پندرہ سال کے اندر اندر وہ ہر لحاظ سے نہ صرف ایک زبردست ملک ہو جائے گا بلکہ ہر چیز کی پیداوار میں وہ دنیا کے تمام ملکوں سے آگے بڑھ جائے گا۔

قدرتی نباتات زیادہ تر جنگلات کی شکل میں موجود ہیں۔ ویسے یہاں گھاس کا بھی ایک بہت بڑا میدان ہے جسے اسٹیپ کہتے ہیں۔ روس میں شمالی علاقہ جو ٹنڈرا یعنی شمال کے سرد خطہ کے فوراً بعد ہے، جنگل کی دولت سے لدا پڑا ہے۔ یہاں نہ صرف ہزاروں قسم کی قیمتی لکڑیاں پائی جاتی ہیں بلکہ ان جنگلوں میں سمور والے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا شکار پہلے تو بے ڈھنگے طور سے ہوا کرتا تھا لیکن اب باقاعدہ اور تنظیم کے ماتحت ہوتا ہے۔ جو جانوروں کی تعداد اور ان کی نسلوں کا خاص خیال رکھتی ہیں

جنگل کی لکڑیاں بڑے بڑے کارخانوں میں استعمال ہوتی ہیں، اور انھیں کمپل کر نہ صرف کاغذ بنایا جاتا ہے، بلکہ مصنوعی ریشم کے لئے ایک مسالہ بھی۔ جنگلی حصہ کے جنوبی حصہ میں اس سرے سے اُس سرے تک لکڑی کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ جو ضروریات کے مطابق مختلف کاموں کیلئے لکڑیاں فرنیچر مہیا کرتے رہتے ہیں۔

جنگل کے بعد اسٹیپ کا علاقہ ہے۔ جہاں کی مٹی سیاہ ہوتی ہے اور آب و ہوا کچھ کم سرد ہے۔ بارش تھوڑی ہوتی ہے۔ لیکن جو کچھ ہوتی ہے وہ پھوار کی شکل میں۔ لہٰذا پانی رس رس کر زمین کے اندر جذب ہوتا رہتا ہے۔ قدرتی ماحول گھاس کی پیداوار کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس بڑے میدان میں ہزاروں لاکھوں مویشی پالے جاتے ہیں۔ جن سے دودھ، دہی، مکھن، پنیر اور کریم وغیرہ بڑے پیمانہ پر حاصل کی جاتی ہیں۔ اس میدان کے بہت سے حصوں سے گھاس صاف کر دی گئی ہے اور زرخیز زمین میں گیہوں کی کاشت بہت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔

روس نہ صرف معدنیات اور قدرتی نباتات کے لحاظ سے خود کفیل ہے، بلکہ مختلف فصلوں کی پیداوار میں بھی وہ کسی ملک سے پیچھے نہیں ہے۔ روس کی سطح اور زمین کی ساخت کا نقشہ آپ اٹھا کر دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ اس سرے سے اُس سرے تک وہاں میدان ہی میدان ہے۔ روس چالیس ڈگری شمالی عرض البلد سے ۷۵ ڈگری شمالی عرض البلد تک پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کی چوڑائی ۵ ہزار میل ہے۔ چنانچہ یہاں طرح طرح کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ گو سرد علاقوں کا خطہ زیادہ ہے۔ پچھلی جنگ عظیم سے پہلے کھیتی کا کل رقبہ ۹ لاکھ مربع میل تھا۔ لیکن اب اس میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ سائبیریا، روسی ترکستان اور دوسرے وسطی ایشیا کی ریپبلک میں پنج سالہ منصوبہ بندی کے پروگرام کے مطابق خاص توجہ کی گئی ہے، اور نہ صرف یہ کہ ان علاقوں میں مختلف قسم کی فصلیں پیدا کی جاتی ہیں بلکہ روسی حکومت نے ان کی آب پاشی کا بھی انتظام کیا ہے اور گیہوں، کپاس، اور جئی کی ایسی قسمیں معلوم کی ہیں جو سرد اور خشک دونوں علاقوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں علاقوں میں مصنوعی کھاد کی صنعتیں بھی موجود ہیں اور تجربے کے لئے نئی تجربہ گاہ۔

روس میں زراعت کی بنیاد جدید سائنس پر مبنی ہے اس کا سارا نظام آپس کے میل اور اتفاق پر منحصر ہے۔ دراصل کلکٹو فارمنگ اس کی جڑ ہے جو امریکہ کی طرح یہاں بھی ہر ہر فصل کی پیداوار کے لئے مخصوص علاقہ ہے۔ یہاں یوکرین میں گیہوں، رائی اور جو کی پیداوار کثرت سے ہوتی ہے۔ چاول جنوب کے گرم خطوں میں آب پاشی کی مدد سے ہوتا ہے۔ آلو، چقندر دریائے وا لگا کی وادی میں کثرت سے بوتا ہے۔ اور سائبیریا کے خطوں میں بھی اب کثرت سے پیدا ہونے لگا ہے۔

کپاس کے لئے کا گیشیا کا علاقہ روسی ترکستان کا علاقہ اور وسطی ایشیا کے دوسرے علاقے بہت مشہور ہیں۔ یہاں کی کپاس بہت عمدہ اور اچھی ہوتی ہے اور اس علاقہ میں سوتی اونی اور ریشمی کپڑوں کے بڑے بڑے کارخانے بھی ہیں جنوب کے خشک اور پہاڑی علاقوں میں بکریاں اور بھیڑیں لاتعداد پائی جاتی ہیں۔ جن کا اون نکال کر کارخانوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ سائبیریا اور یورپین روس کے شمالی سرد علاقوں میں روسی حکومت نے کم وقت میں پکنے والی جو گیہوں اور رجئی کی فصل کی کاشت جدید پیمانہ پر شروع کی ہے۔ اور ۹۵ فی صدی اس میں کامیاب ہے۔ ان علاقوں میں روسی حکومت کا نعرہ ہے کہ قدرتی غیر موافق ماحول پر انسان کو فوقیت حاصل کرنی ہے۔

کاشتکاری کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر ہر خطہ میں اپنی اپنی ایک تجربہ گاہ ہے۔ جہاں بیج، بہتر فصل اور ان کی مختلف قسموں پر دن رات تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ کئی سال کے تجربے کے بعد روسی حکومت نے گیہوں، جو، آلو، چقندر، کپاس کی ایسی قسمیں معلوم کرلی ہیں جو بیماری کے حملوں سے بالکل محفوظ رہتی ہیں اور فی ایکڑ پیداوار غیر معمولی طور سے زیادہ ہوتی ہے۔ سال بسال اسی بیج کا استعمال بڑھتا جاتا ہے اور اس طرح ہر فصل کی پیداوار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

روس صنعت، زراعت، تعلیم ہر میدان میں بڑے پیمانے پر تجربہ کر رہا ہے۔ اس تجربے میں آسے ممکن ہے کہیں کہیں پر ناکامی ہوتی ہو۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے اور اس لئے وہ تیزی سے ہر چیز میں ترقی کر رہا ہے۔ صنعت و حرفت کا کوئی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لوہے اور فولاد کی صنعت کے ساتھ ساتھ موٹر، انجن، ریل، جہاز، کاشت کاری کی مشین، ٹریکٹر، ریڈیو سٹ، اور جتنی بھی صنعتوں کا تعلق ہے سب ہی اس علاقے میں ابھر رہی ہیں۔ اور تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ زراعت کے معاملہ میں روسی حکومت اس بات کی قائل ہے کہ ایک انچ بھی زمین بے کار نہیں چھوڑنی چاہئے۔ چنانچہ وہ دن رات بنجر اور بے کار زمین میں فصلوں کی کاشت بڑھاتی جاتی ہے اور اس کی کامیابی کیلئے بھی وہ چیزیں جو درکار ہیں وہ مہیا کرتی ہے جیسے ٹریکٹر، مصنوعی کھاد، مشین، آب پاشی، نئے اور بہترین بیج۔

اختر سعید

غزل

رہِ حیات میں جب تیری رہگزر آئی — زمین تھی مگر اک آسماں نظر آئی
قدم اُٹھے جو کبھی منزلِ حیات کی سمت — اجل کے سائے میں بھی زندگی نظر آئی
اب آگئے قافلۂ زیست کون روکے گا — فنا کی راہ سے بھی زندگی گذر آئی
غمِ حیات نے پہلو ہزار ہا بدلے — تمہاری یاد جو آتی تھی عمر بھر آئی
مجھے اصولِ محبت سے ضد نہیں لیکن — تمہارا نام سُنا اور آنکھ بھر آئی
مری نگاہ سے چُھپنا تو خیر ممکن ہے — مگر وہ شکل جو دل میں مرے اُتر آئی
کسی نے چپکے سے دل کا مزاج پوچھ لیا — بہت دنوں میں طبیعت جو راہ پر آئی
ترا جمال کہ خوابیدہ روح جاگ اُٹھی — ترا شباب کہ آنکھوں میں نیند بھر آئی
یہ پچھلی رات ستارے نظر چرانے لگے — حکایتِ دلِ ناداں نہ ختم پر آئی

نہ لُٹتا راہ میں پھولوں کا کارواں اختر
خزاں بہار کے دامن میں جلوہ گر آئی

صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ روسی حکومت تعلیم سے بھی غافل نہیں ہے۔ تعلیم اور سائنس کے مختلف شعبوں میں نئے نئے تجربے کے لئے بہترین انتظام ہے۔ روس کا ہر فرد اپنے رجحانات اور دلچسپی کے بل بوتہ پر زیادہ سے زیادہ اور اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کرتا ہے اور اس کے بعد وہ روس کی بڑی تجربہ گاہ میں خود بھی محو ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ملک اور قوم کو آگے بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔

سیر و تفریح اور سنیما کا بھی بہت اچھا بندوبست ہے۔ ہر شہر اور ہر قصبہ میں سنیما اور ریڈیو کا استعمال بہت عام ہے لیکن یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ان چیزوں کا جتنا اچھا استعمال روس میں ہوتا ہے کسی ملک میں بھی نہیں ہوتا

سال نامہ ۱۹۵۰

مختلف آراء کے اقتباسات

★ 'آج کل' بہت دنوں سے دیکھتا ہوں۔ رسالے کا معیار بلند ہے اور اُسے قائم رکھنے بلکہ ترقی دینے کی فکر ہر قدم پر نمایاں۔ ماہانہ رسالے کے علاوہ آپ کے ادارے نے سال نامے شائع کرنے کا دستور بھی جاری رکھا ہے اور ان سال ناموں میں بہت مفید مقالے، نہایت اچھی نظمیں، بڑی خوب صورت تصویریں ہمیشہ دیکھی گئی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ ملک کے کسی اور با تصویر رسالے میں اتنی خوبیاں جمع نہیں جتنی 'آج کل' میں

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

★ رسالہ "ادبی" ہو اور پھر شریفوں کے ہاتھ میں جانے کے قابل رہ جائے ایسے رسالے اب دو ہی چار باقی رہ گئے ہیں اور ان گنے چنے رسالوں میں ایک ممتاز مقام 'آج کل' کو حاصل ہے جس کا بہترین نمونہ اگست نمبر یا سال نامہ ۱۹۵۰ ہے۔ فائز دہلوی پر پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی کا مضمون ایک تحقیقی مقالے کی شان رکھتا ہے۔ اور اسی کے ٹکّر کا مضمون خواجہ احمد فاروقی کے قلم سے "ذکرِ میر، خود نوشت کی حیثیت سے" پر ہے۔ تصویریں ان سارے عیبوں سے پاک ہیں جن کے لئے تصویریں بدنام ہو چکی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی

★ سال نامہ حُسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دولت سے مالامال ہے۔ مولینا مسعود حسن رضوی کا ادبی مضمون 'فائز دہلوی' کے عنوان پر بڑا قیمتی ہے اور اردو ادب میں تاریخی حیثیت کا مضمون ہے۔ 'گل کدہ' کے عنوان پر ہندوستانی زبانوں کا ادب جو اردو نثر اور نظم دونوں میں شائع کیا گیا ہے بہت سی محنت اور تلاش کا نتیجہ ہے۔ قیمتی باتوں کے لحاظ سے اسے بھی گنج شائگاں کہنا چاہیئے۔

حضرت جوش ملسیانی

★ اس مرتبہ 'آج کل' کا سال نامہ ۱۹۵۰ کی خاص یادگار۔ تمام صوری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ۔ تصویریں بولتی ہوئی۔ مضامین بلند پایہ۔ اگر لکھنے کی طاقت ہوتی تو بہت کچھ لکھتا۔ اس وقت اتنا ہی لکھ سکتا ہوں کہ آپ کی کوششیں بار آور اور قابلِ داد ہیں۔

حضرت آرزو لکھنوی

★ میں نے 'آج کل' کے سال نامے کو بڑے شوق سے پڑھا۔ ادارے کے حُسنِ انتخاب اور حُسنِ ترتیب کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر زور کا مضمون 'اُردو کے علمی و ادبی مسائل' قامت میں ضرور کم ہے لیکن قیمت میں کم نہیں۔ ڈاکٹر مسعود کا مضمون بہت دلچسپ ہے۔

خواجہ احمد فاروقی

★ 'آج کل' کا سال نامہ ۱۹۵۰ جو حال ہی میں شائع ہوا ہے ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ تمام مضامین نظم و نثر معیاری ہیں۔ دلچسپی اور افادیت دونوں کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔

تلوک چند محروم

★ اُردو رسائل کی برادری میں 'آج کل' کی آن بان نظر انداز نہیں کی جا سکتی اس کی صورت و سیرت پر ہر ادبی دیدہ ور کی نگاہِ تحسین پڑتی ہے۔ اس کا سال نامہ اس مرتبہ بھی بقامت کہتر ہونے کے باوجود بہ قیمت بہتر ہے

اختر علی تلہری

★ ۱۹۵۰ء کا سال نامہ ہر پہلو سے اردو ادب میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے ادب سے ہندی، بنگالی، پنجابی، تامل، مرہٹی، ملیالم اور دوسری زبانوں کے ادبی نمونے ایک مضمون میں پیش کئے گئے ہیں۔ سال نامہ کی ترتیب کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ تحسین اور دوسروں کے لئے قابلِ تقلید ہے

'ہماری زبان' علی گڑھ

★ یہ خاص نمبر اپنے دل کش مضامین نظم و نثر، اپنی دیدہ زیب تصاویر، اپنے رنگین سرورق اور اپنے اہتمام کتابت و طباعت کے لحاظ سے نہایت قابل قدر چیز ہے۔

رہنمائے تعلیم دہلی

زمین، زراعت اور تہذیب

موجودہ زمانے کے انسان کو بعض اوقات یہ یقین دلا کر فریب میں مبتلا کر لیا جاتا ہے کہ اگر وہ زمین سے برآمد ہونے والی دھاتوں اور دیگر معدنی اشیاء کو مشینوں میں تبدیل کر سکے تو وہ اپنی خوراک کے فکر سے آزاد ہو سکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ہم مشینیں نہیں کھا سکتے ہیں بلکہ ہم وہ خوراک کھاتے ہیں جو ان مشینوں کے ذریعے سے حاصل ہو سکتی ہے اور خوراک تو صرف زرخیز زمین ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم کے لوگ بجا طور پر زمین کو "دھرتی ماتا" کہتے تھے۔ پس یہ لازم ہے کہ نوع انسان کی بقا کی خاطر زمین کی قوتِ بالیدگی کا تحفظ کیا جائے۔ کیونکہ خوراک جائے پناہ ہے اور زندگی کی دیگر ضروریات ہمیں اس سے حاصل ہوتی ہیں۔ اگر ہم زمین کی قوتِ بالیدگی اور زرخیزی کا تحفظ کرتے رہیں تو ہم اور ہماری اولاد ہی نہیں بلکہ ہماری آئندہ نسلیں سلامت اور خوش حال رہیں گی۔ خوراک پیدا کرنا تمام بنی نوع انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے اس لئے اس وقت ہم صرف اس ایک مسئلہ یعنی خوراک حاصل کرنے کے لئے زمین کو استعمال میں لانے کے معاملہ پر ہی غور و خوض کریں گے۔ اگر ہم یکے بعد دیگرے فصلیں کاشت کرتے جائیں اور زمین کی قوت بالیدگی کو پھر سے بھرپور کرنے کی طرف کوئی دھیان دئے بغیر فصلوں کا پھل حاصل کرتے رہیں تو نتیجہ کیا ہوگا۔ قدرت ہماری مدد نہیں کرے گی۔ زمین کی زرخیزی ختم ہو جانے کے باعث اس سے کچھ بھی پیدا نہ ہو سکے گا۔

ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ زمین میں فصلیں پیدا کرنے کے ساتھ ہی اس کی زرخیزی کو برقرار رکھیں اور یہ مقصد زمین کی ہیئت ترکیبی اور قوتِ بالیدگی کو بڑی احتیاط سے قائم رکھنے اور آبی ذرائع کا تحفظ کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مدعا یہ کہ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن کے ذریعے سے زمین کی زرخیزی اور پیداواری طاقت کو اعلیٰ درجہ پر قائم و برقرار رکھا جا سکے۔ بھارت میں زرعی زمینوں کے ایک تہائی حصّہ کو کسی نہ کسی طرح سے نقصان پہنچتا رہتا ہے اور ہر سال کئی لاکھ ایکڑ زمین بنجر ہو جانے کی وجہ سے بڑا بھاری قومی نقصان ہو جاتا ہے۔ گنگا کی وادی میں ہر سال اندازاً ایک فیصدی زمین کی زرخیزی گھٹ جاتی ہے اور اس میں سے پانچ فیصدی زمین ہر سال بنجر بن جاتی ہے۔

زمین کا کٹاؤ

ہوا اور پانی دو ایسے سرگرم عناصر ہیں جو زمین کی زرخیزی کو برباد کرتے ہیں۔ ویسے تو یہ دونوں ہمیشہ ہی سرگرمِ عمل رہتے ہیں لیکن ڈھلان اور ویران زمینوں پر ان کا اثر اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سال کے تین مہینوں میں تیز و تند چلتی ہوائیں زمین کے ہلکے زرخیز ذرّوں اور ریت کو اپنے ہمراہ اڑا کر لے جاتی ہیں اور ان کو سینکڑوں میل دور جا پھینکتی ہیں۔ ریت پتھر کے ریزوں سے بنتی ہے۔ اسے سیلکا کہتے ہیں۔ اور جس زمین میں ریت بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی پیداوار گھٹ جاتی ہے۔ اور آخر کار کھیتوں کو بنجر بنا دیتی ہے۔

جب بارش برستی ہے۔ تو بارش کی بوچھاڑ سے زمین کے سطحی ہلکے زرخیز ذرّے اکھڑ جاتے ہیں۔ پہلے تو پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے لیکن جب ایک بار زمین سیراب ہو جاتی ہے۔ تو پھر بارش کا پانی بہنے لگتا ہے اور وہ اپنے ہمراہ زمین کے زرخیز ذرّے بہا کر دریاؤں میں لے جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ کھیتوں کی ساری سطحی زرخیز مٹی بہہ جاتی ہے۔ اس طرح پہلے زمین کی ایک تہ کٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ زیادہ شدید نقصان پہنچتا ہے۔

زمین کے کٹاؤ کا انسداد

اس نقصان کا انسداد کرنے کے لئے زمین کو ڈھانپنا چاہیئے یعنی بنجر اور نیم بنجر زمینوں میں مقررہ فاصلوں پر حفاظتی قطعات" ریت اور مٹی کے ذرّوں کا زرخیز زمینوں میں بہاؤ روک دیتے ہیں۔ خالی زمینوں اور پندرہ فیصدی سے زیادہ کی ڈھلان زمینوں پر درختوں، جھاڑیوں اور گھاس کے ذریعے سے زمین کا بچاؤ کرنا چاہیئے۔ درخت چھتریوں کا کام دیتے ہیں اور بارش کی بوچھاڑ کی شدّت کو کم کر دیتے ہیں۔ اگر سڑکوں کے کنارے کھیتوں کی مینڈوں پر اور پہاڑی علاقوں کی بلندیوں پر جنگل اُگائے جائیں۔ تو اس سے پانی کے بہاؤ کی طاقت گھٹ جائے گی اور بارش کا پانی پھر سے زمین میں واپس چلا جائے گا۔ اس طرح طغیانیوں کو بھی روکا جا سکے گا۔ جو اکثر اس ملک میں ہر سال بھاری تباہی و بربادی کا موجب ہوتی ہیں۔

زرعی زمینوں میں قدرت کی ان طاقتوں کا مقابلہ ایسے سادہ طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ جن پر ہر ایک کاشتکار انفرادی طور پر عمل کر سکتا ہے فصل کاٹتے وقت کھیتوں میں چار سے چھ انچ تک لمبے پودوں کے ڈنٹھل کھڑے چھوڑے جا سکتے ہیں۔ جب تک نئی فصل نہیں بوئی جائے گی۔ یہ ڈنٹھل پودوں کے پتے اور ٹھنٹھ زمین کی زرخیز سطح کو جکڑے رکھیں گے۔ اور اُسے پانی اور ہوا کے زور سے کٹنے اور بہنے سے بچائیں گے۔ ہل چلانے کے وقت پودوں کے ڈنٹھل ہل کے ساتھ ہی زمین میں دل دیے جائیں۔ اس سے زمین کے کٹاؤ کے تحفظ کے علاوہ زمین زیادہ نرم ہو جائے گی اور زمین کے زیادہ مسام دار ہو جانے کے باعث اس کی پانی جذب کرنے کی اہلیت بڑھ جائے گی۔

ڈھلان جگہوں پر کھیتوں میں نیچے سے اوپر کی جانب ہل چلانے کی بجائے ڈھلان کی چوڑائی کی جانب متوازی ہل چلانے سے نہ صرف بیلوں اور اوزاروں پر دباؤ گھٹ جائے گا بلکہ اس سے زمین کے پانی یا ہوا کے ساتھ بہہ جانے میں بھی کمی واقع ہوگی۔ ڈھلان زمین پر چوڑائی کی جانب چلائے ہوئے ہل سے جو نالیاں بنیں گی وہ سب کی سب چھوٹے چھوٹے بند سے بنتی جائیں گی اور زمین کی زرخیز سطح کاٹ کر بہہ جانے سے روکنے کا موجب بنے گی۔

کئی پشتوں سے بھارت میں کیاریاں بنا کر فصلیں کاشت کرنے کا رواج چلا آتا ہے لیکن نہ تو کیاریوں کی چوڑائی سائنسی طور پر مقرر کی جاتی ہے، اور نہ ہی ان کیاریوں میں بوئی جانیوالی فصلوں کا انتخاب موزوں طور پر کیا جاتا ہے۔ عام طور پر پھل دار خوردنی سبزیاں اور غیر پھل دار فصلوں کی کیاریاں یکے بعد دیگرے بوئی جانی چاہئیں یا ہلکی فصلوں اور گھنی بوئی جانے والی فصلوں کی کیاریاں ایک دوسری کے بعد ساتھ ساتھ بوئی جائیں۔ اس طرح کیاریوں میں فصلیں کاشت کرنے سے زمین کی عمدہ اور زرخیز مٹی پانی یا ہوا کے ساتھ بہہ کر نہیں چلی جاتی۔

زمانۂ قدیم ہی سے بھارت کے کسان کھیتوں کے گرد مینڈیں باندھنے کا فائدہ جانتے ہیں۔ نیچی اونچی زمینوں کے گرد بند لگانے یا مینڈ بنانے سے پانی یکساں طور پر پھیل جاتا ہے جس سے ان بندوں پر پانی کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ جن مقامات پر زمین کی ڈھلان زیادہ ہے اور جہاں کاشتکاری لازماً کرنی پڑتی ہے وہاں پہاڑی کی ڈھلان کو کاٹ کر نیچے اوپر سیڑھیوں کی مانند کھیتوں کے تختے بنائے جاتے ہیں اور اس طرح چھوٹے چھوٹے ہموار کھیت کاشت کیلئے تیار کئے جاتے ہیں۔

جب تک کوئی بڑی فصل کاشت نہ کی جائے تب تک سبز کھاد کی فصلیں بونے سے بھی زمین کو کٹاؤ سے بچایا جاتا ہے۔ اس طریق عمل سے نہ صرف زمین کے کٹاؤ کا انسداد ہوتا ہے بلکہ زمین میں رطوبت قائم رہتی ہے۔ پودوں کی غذا زمین میں موجود رہتی ہے۔ اور بعض اوقات مویشیوں کیلئے کافی مقدار میں چارہ بھی میسر ہو جاتا ہے کیمیائی کھاد سے سب سے زیادہ فائدہ اسے پھل دار اناج کیلئے استعمال کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے فصلوں کی پیداوار بڑھتی ہے۔ زمین کی قوت بالیدگی کا تحفظ ہو جانے کی وجہ سے بعد میں بوئی جانے والی دوسری فصل کو بہت فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ زمین میں کچھ کیمیائی مادہ اور پودوں کی غذا زیادہ مقدار میں موجود رہتی ہے۔

نمدار اور دلدلی زمین سے پانی کا نکاس کر دینے سے بہت سی زرخیز زمینوں کو جو ویسے تو بیکار پڑی رہتی ہیں پھر سے زیر کاشت لایا جا سکتا ہے۔ نمدار اور دلدلی زمین سے کھلی نالی کھود کر پانی نکال دینے سے اُسے پیداواری رقبہ بنایا جا سکتا ہے۔ صرف مصمم ارادہ اور کھدائی کرنے سے کام بن جاتا ہے۔

پیداوار میں کافی سے زیادہ اضافہ اُجاڑ کنوؤں اور تالابوں کی مرمت سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

آبپاشی کے جس قدر ذرائع میسر آ سکتے ہیں ان تمام کو استعمال میں لانا فوری اور بہت مؤثر طریقہ ہے۔ صرف پانی کو استعمال کرنے کے عمدہ اور مستحکم طریقے اختیار کرنے سے ہی پیداوار کی مقدار کو بہت زیادہ بڑھایا جا سکتا ہے۔

نئی کتابیں اور رسالے

نوائے حیات

یحییٰ اعظمی صاحب نے اپنی نظموں کا یہ مجموعہ اضافہ و ترمیم کے بعد دوبارہ شائع کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مصنف کے باب میں لکھا ہے "اُن کی طبیعت شاعرانہ واقع ہوئی ہے۔ اس لئے جو کچھ کہتے ہیں مؤثر اور دل نشین ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا کلام عام طور پر مقبول ہوگا"۔ مقدمہ سیّد سلیمان ندوی نے لکھا ہے یحییٰ صاحب پُرانے کہنے والوں میں سے ہیں اور آپ کا کلام ہر دَور میں مقبول رہا ہے۔ علّامہ شبلی اور اُن کے خوش گو شاگرد مولانا اقبال احمد سہیل سے آپ بہت متأثر ہیں۔ ان کے کلام میں قوّت ہے۔ مذہب اور سیاست ان کے خاص موضوعات ہیں۔ محمّد علی، ڈاکٹر انصاری، اقبال اور فانی کے درد انگیز اور مؤثّر مرثیے یادِ رفتگاں کے عنوان کے تحت پڑھنے کے قابل ہیں۔ 'دورِ وحشت' کے تحت دس نظمیں ۱۹۴۷ء اور اُس کے بعد کی انسانی بربریت کا نوحہ ہیں۔ نظموں میں زورِ بیان بھی ہے اور شدّت خلوص بھی۔ کچھ فارسی نظمیں بھی کتاب کے آخر میں شامل ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ یحییٰ صاحب کا یہ مجموعۂ نظم حسبِ سابق اہلِ ذوق سے داد حاصل کرے گا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

آج ماتم کدہ ہے بزمِ جہانِ فانی	رہرو عالمِ باقی ہوئی جانِ فانی
نہیں اُٹھتے ہمیشہ دہر میں شبلیؔ نعمانی	کہیں صدیوں میں ہوتا ہے فیضِ خاص ربّانی
نگاہِ شوق اگر خود جا کے حسن آرا نہ ہو جائے	ڈابھرے اس رُخ رنگیں کا اک اک نقشِ زیبائی
مجھی پر خاص کیوں یہ مہربانی ہوتی جاتی ہے	تغافل اور یہ پیہم تغافل اے معاذ اللہ

ناشر دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد سے
تقطیع ۲۷×۱۸ ضخامت ۲۰۴ صفحے۔ کاغذ اچھا۔ کتابت و طباعت معقول۔

پھراج

ناشر ودیا مندر لمیٹڈ نئی دہلی۔ قیمت تین روپے چار آنے۔ کتاب مجلّد ہے اور جلد پوشش کی حامل۔

ہرشن چندر کیلا کے ہندی افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے کیلا صاحب انگریزی کے مشہور جرنلسٹ ہیں لیکن ہندی میں بھی اکثر لکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں سترہ کہانیاں ہیں جن میں سے اکثر سنگم' ہندوستان اور نو بھارت میں چھپ چکی ہیں۔ پیش لفظ ہندی کے مشہور افسانہ نگار جنیندر کمار نے لکھا ہے۔ کیلا واردات زندگی کو افسانوں کا روپ دیتے ہیں۔ وہ میدانی کھیلوں کے ایک اچھے مبصّر ہیں اور اسی وجہ سے جنیندر کمار کے قول کے مطابق ان کے اندازِ بیان میں کشادگی ہے۔ کیلا ایک خود دار ادیب ہیں چنانچہ کتاب کا انتساب ان لوگوں کے نام ہے جنہوں نے ان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔ ان کہانیوں میں سے دیوی بچے" اور پکھراج خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سُرخ آنچل

مرتبہ پرکاش پنڈت، ناشر مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی قیمت تین روپے بارہ آنے۔

یہ کتاب اُردو کی تیرہ ممتاز افسانہ نگار خواتین کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے اُردو ادب کی دُنیا میں خواتین کو اہل قلم کی حیثیت سے داخل ہوئے بہت مدّت نہیں گذری لیکن اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے ادب میں جس طرح اپنی عظمت کا سکّہ منوا لیا ہے وہ ایک معجزہ نظر آتا ہے۔ اور افسانوی دنیا میں تو بعض خواتین نے وہ نام پیدا کیا ہے کہ اگر دو چار منتخب افسانہ نگاروں کا ذکر کرنا چاہیں تو انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پرکاش پنڈت کی یہ کتاب جو دو گونہ ذوق انتخاب کی مظہر ہے۔ ایک افسانہ نگار خواتین کا انتخاب، دوسرا ان کے شہ پاروں کا انتخاب — ہماری افسانہ نگار خواتین کی اسی عظمت کا ایک اعتراف ہے۔

افشاں

ملنے کا پتہ احمد انوار صدیقی ۹۲۲ سینٹرا سٹریٹ مہو۔ وسط ہند قیمت عہ ضخامت ۴۶ صفحے کتاب مجلد ہے اور جلد پوش کی حامل

مدھیہ بھارت کے ایک خوش فکر شاعر احمد وقار واثقی کی رباعیوں کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ وقار صاحب اچھی رباعیاں کہتے ہیں۔ کہیں کہیں دلکش طنز کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے

اک دستِ ستم خیز طلب ہے دُنیا	ہنگامۂ خوں ریز طلب ہے دُنیا

یہ امنِ مسلسل کی نہیں ہے قائل ہر عہد میں چنگیز طلب ہے دُنیا
بدلی نہیں حالت وہ ہماری اب تک ہر قلب میں ہے طاری ساری اب تک
وہ رسم جسے شرک کہا جاتا ہے توحید کے عنواں سے ہے جاری اب تک

زندگی کے سائے پرل بک اور اگنیز یوسلونے کی کہانیوں کا مجموعہ جنھیں جناب ہلال احمد نے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ صاف شستہ اور رواں زبان میں ہے قیمت دو روپے پبلشرز لاجپت رائے اینڈ سنسز اُردو بازار دہلی۔

تحریک پختونستان حضرت خان غازی کی تصنیف ہے جس میں آپ نے تحریک پختونستان کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ قیمت درج نہیں ملنے کا پتہ۔ خان غازی کابلی سکریٹری پختون جرگہ ہند کوچہ رحمان لال گلی متصل گھنٹہ گھر چاندنی چوک۔ دہلی۔

امن کیونکر ہوگا مرتبہ جناب واحد نیلوری۔ یہ کتاب "امن کیونکر ہوگا" کے مسئلے پر اردو کے بعض مشہور شعراء اور ادبا کے مقالات پر مشتمل ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ: سید عبد الواحد واحد نیلوری۔ یونانی دواخانہ جھوٹا بازار۔ نیلور۔

رسالے

شاعر مشاعرہ نمبر شاعر اردو کا ایک ممتاز جریدہ ہے جو ہر ماہ آگرے سے جناب اعجاز صدیقی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ حال ہی میں اس کا مشاعرہ نمبر شائع ہوا۔ جس میں ایک مصرع پر ہندو پاکستان کے ایک سو ستائیس شعراء کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ مقالات میں سید احتشام حسین کا مقالہ "مشاعرے اور ان کی افادیت" اپنی افادیت کے اعتبار سے ایک گراں بہا حیثیت رکھتا ہے۔ اس مشاعرہ نمبر میں تعجب خیز بات یہ نہیں کہ حضرت اعجاز نے اردو کے تمام بڑے شعراء کو کیونکر ایک ہی محفل میں جمع کر لیا ہے بلکہ یہ ہے کہ اس بزم میں بعض ایسے غیر معروف اور گمنام شعرا بھی موجود ہیں جن کی غزلیں ادبی اعتبار سے ایک بہت اونچا مقام رکھتی ہیں۔ اعجاز صاحب اس کامیاب تلاش و جستجو کے لیے مستحق مبارکباد ہیں۔ شعراء کی تصاویر نے اس مجموعے کی ادبی اور وقتی اہمیت میں ٹھوس اضافہ کر دیا ہے۔ تعداد صفحات ۱۶۲۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (سالانہ قیمت ساڑھے پانچ روپے) ناشر مکتبہ قصر الادب۔ آگرہ۔

قوّتِ انسانی کے بینک

ہر ایک کام کے لئے موزوں آدمی کا تعینات کرنا ملازم رکھنے والوں کے لئے روزمرہ کا معمہ ہے

لیکن کیا کوئی

کارخانہ دار۔ سوداگر۔ دفتر کا منیجر اور تاجر ایسے محکمہ کو خوش آمدید کہنے سے گریز کرے گا۔ جو کہ کام کرنے والوں کو اُن کی لیاقت، فہم اور تجربہ کی بنا پر چھان بین کر کے ملازم رکھنے والوں کے پاس خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لئے بھیجتا ہے

نوکری دلاؤ دفتر (ایمپلائمنٹ ایکسچینج)

ہندوستان کی قوّت انسانی کے بینک ہیں۔ یہ ہر قسم کے ملازم رکھنے والوں اور ملازمت کے متلاشی لوگوں کی مُفت و غیر جانبدار خدمت سرانجام دیتے ہیں

جاری کردہ۔۔
ریجنل ڈائرکٹریٹ آف ری سٹلمنٹ اینڈ ایمپلائمنٹ دہلی اجمیر راجستھان

رفتارِ زمانہ

پیسیفک کانفرنس

لکھنؤ میں پیسیفک کانفرنس کے گیارھویں اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو نے زوردار الفاظ میں اپیل کی کہ ہمیں بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے جنگ کو ہر قیمت پر روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آپ نے کہا کہ جب لوگ تیسری بڑی جنگ کی باتیں کرتے ہیں تو انہیں شاید یہ خیال نہیں رہتا کہ پچھلی دو بڑی جنگوں سے ہمیں نہ صرف عظیم نقصانات ہی برداشت کرنے پڑے بلکہ ہمارے لئے نئی الجھنیں بھی پیدا ہو گئیں اس لئے ہمیں کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے جس سے تیسری جنگ کے امکان کو تقویت حاصل ہو۔ پچھلے تین ماہ سے کوریا میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ امن پسند اشخاص کی یہ دلی خواہش ہے کہ یہ جنگ کم سے کم علاقے تک ہی محدود رہے اور اسے جلد از جلد ختم کر دیا جائے لیکن کچھ فوجی طاقتیں کوریا میں مزید آگے بڑھ کر یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اس طرح کئی بنیادی مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ شاید وہ تاریخ سے یہ سبق حاصل نہیں کرتیں کہ اگر وہ بہت آگے بڑھیں گی تو ٹھوکر کھائیں گی اور اس سے انہیں کئی دوسری الجھنوں میں پھنس جانا پڑے گا۔

آئندہ انتخابات

بھارت کے الیکشن کمشنر شری سکمار سین نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا ہے کہ ملک میں انتخابات کرانے کے لئے تمام طیاریاں اپریل ۱۹۵۱ء کے وسط تک مکمل ہو جائیں گی۔ آپ نے بتایا کہ رائے دہندگان کی ابتدائی فہرستیں نومبر تک بن جائیں گی لیکن انتخابی حلقوں کے مطابق آخری فہرستیں اگلے سال ماہ فروری میں مکمل ہوں گی۔ شری سین کے اندازے کے مطابق ملک میں رائے دہندگان کی تعداد ۱۸ کروڑ ہوگی آپ نے یہ بھی بتایا کہ لگ بھگ دو ہزار رائے دہندگان کے لئے ایک بیلٹ بکس ہوگا اور آئندہ انتخابات میں کل ۴۷۵ اہم نشستوں کے لئے امیدوار کھڑے ہونگے۔

بھارت پاکستان خیرسگالی کانفرنس

اتر پردیش کے پردھان منتری پنڈت گووند بلبھ پنت نے لکھنؤ میں بھارت پاکستان خیرسگالی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہر دو ممالک کی ترقی کے لئے بھارت اور پاکستان میں باہمی دوستی کا ہونا نہایت ضروری ہے اور صرف اسی طریقے سے دونوں دیشوں کی جنتا کی اقتصادی مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں۔ پنت جی نے مزید کہا کہ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہ مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے راستے ہی پر چلے گا۔ اور امن پسندی اور شانتی کے مارگ کی پیروی کرتے ہوئے وہ اپنی دوستی کا ہاتھ ہمیشہ بڑھائے رکھے گا۔

ہند پاکستان خیرسگالی کنونیشن کے جنرل سیکرٹری شیخ مستفر اللہ نے لکھنؤ سے ایک نشری تقریر کے دوران میں بھارت کے آئین کو اقلیتوں کے حقوق کا چارٹر قرار دیا اور کہا کہ اب بھارت میں اقلیتوں کی پوزیشن کسی دوسرے سے کمتر نہیں۔ نہرو لیاقت پیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ اس سمجھوتے نے نہ صرف اقلیتوں میں اعتماد کی روح پھونک دی ہے بلکہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کو یہ سوچنے کا موقعہ دیا ہے کہ نازک ترین معاملات بھی باہمی گفت و شنید سے کس خوش اسلوبی سے طے کئے جاتے ہیں۔ بھارت کی اقلیتوں کو اپنے فرائض کا احساس کراتے ہوئے آپ نے کہا کہ وہ بھارت ہی کو اپنا ملک سمجھیں اور باہر کے ملکوں پر آس لگانے کے فرسودہ خیال کو ترک کر دیں۔ اسی میں ان کی بہتری اور آئندہ ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔

کشمیر اور مسلمان

مدراس کے مشہور مسلمان لیڈر سر محمد عثمان نے کشمیر کے مسئلے پر ایک بیان دیتے ہوئے

کہا کہ بھارت سرکار کی کشمیر کے متعلق پالیسی سے ہندوستان کا ایک ایک مسلمان پوری طرح متفق ہے اور اس کی یہ خواہش ہے کہ کشمیر بھارت کا ہی ایک جزو بنا رہے۔ آپ نے مزید اعلان کیا کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو پورے شہری حقوق حاصل ہیں اور انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔

افغانستان اور پاکستان

بھارت میں افغانستان کے سفیر سردار نجیب اللہ خاں نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران میں کراچی کی اس اطلاع کو بے بنیاد قرار دیا کہ افغان لشکر نے پاکستانی سرحد پر حملہ کیا ہے۔ آپ نے کہا کہ دراصل جھگڑا پختونستان اور پاکستان کا ہے۔ قبائلی علاقے کے لوگ پاکستان کے ماتحت رہنا گوارا نہیں کرتے۔ اس لئے آئے دن پاکستان اور آزاد پٹھانستان کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ حکومت افغانستان کی خواہش ہے کہ اس جھگڑے کا فیصلہ پُرامن طریقے سے ہو جائے لیکن وہ بالواسطہ طور پر اس جھگڑے میں دخل دینا پسند نہیں کر سکتی۔

حفاظتی کونسل اور کشمیر

ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ عوام کے دلوں میں سیکیورٹی کونسل کی قدر اسی صورت میں بڑھ سکتی ہے جب کہ وہ کوریا کی طرح کشمیر کے مسئلے کو بھی حل کرنے کے لئے تیزی سے قدم اٹھائے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ سیکیورٹی کونسل اس امر کا واضح اعلان کرے کہ کشمیر میں حملہ آور کون ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ جب سر اوون ڈکسن نے صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستانی افواج نے کشمیر میں داخل ہو کر بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ حملہ آور ہے تو مجلس تحفظ کے لئے پاکستان کو حملہ آور قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہئے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ اگر کشمیر کے معاملے کا جلد فیصلہ نہ کیا گیا تو حفاظتی کونسل پر عوام کا اعتماد کم ہو جائے گا۔

کوریا

چین کی کمیونسٹ حکومت نے یہ اعلان کیا ہے کہ امریکہ کے کوریا پر حملے کے بعد ایک ایسی تشویشناک صورت حالات پیدا ہو گئی ہے جس کے متعلق چین کی حکومت چپ نہیں رہ سکتی۔ چین کے عوام فطرتاً امن پسند ہیں لیکن امن کی حفاظت کے لئے حملہ آور دشمن کا مقابلہ کرنے سے نہ وہ کبھی پہلے ڈرے ہیں اور نہ اب ڈریں گے۔

متحدہ اقوام کی اسمبلی میں بین الاقوامی قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے بھارت کے نمائندے مسٹر بی۔ این راؤ نے ان وجوہ پر روشنی ڈالی جن کی وجہ سے بھارت غیر جانبداری کی پالیسی پر قائم رہنا چاہتا ہے۔ آپ نے کہا کہ سیکیورٹی کونسل میں جو بھی ریزولیوشن اب تک پاس ہوئے ہیں ان کا ماحصل یہ تھا کہ کوریا میں آزاد و غیر جانبدارانہ انتخابات کرا کر متحدہ کوریا کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس کی اقتصادی ترقی کے لئے کوشش کی جائے۔ اگر اس اصول کو سامنے رکھ کر سب کمیٹی قائم کی جاتی تو قیام امن کے لئے مفید ہو سکتی تھی۔ شری راؤ نے مزید کہا کہ بھارت مشرق بعید میں اپنی امن کی پالیسی پر کاربند رہنا چاہتا ہے۔ آپ نے کہا کہ متحدہ اقوام کی اسمبلی کو ایسے ذرائع عمل میں لانے چاہئیں جس سے جنگ کی میعاد لمبی اور اس کا حلقہ وسیع نہ ہو۔ بھارت قرارداد کی دیگر باتوں سے متفق الرائے ہے لیکن قرارداد کی چوتھی دفعہ ایسی ہے جس نے متحدہ اقوام کی افواج کو شمالی کوریا میں دخل دینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمارا اس دفعہ پر اختلاف رائے ہے۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ کوریا کے متعلق بھارت کی کوئی فیصلہ کن پالیسی نہیں شری راؤ نے کہا کہ ہم نے اپنی پالیسی بالکل صاف کر دی ہے اور میں اسے پھر دوہراتا ہوں کہ (۱) آزادانہ انتخابات کے ذریعے ایک آزاد اور متحدہ کوریا کا قیام اور (۲) ملک کی بربادی کو دور کرنا اور بے گھروں کی آبادکاری۔ ایسا اعلان کرنے کے بعد متحدہ اقوام کی افواج کے آگے بڑھنے سے پہلے ہم شمالی کوریا کی فوجوں کو ایک مقررہ تاریخ تک جنگ بند کرنے کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ شمالی کوریا کی افواج ہماری بات نہ مانیں تو اس کے بعد ہی ہمیں اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

تپ دق کا انسداد

بھارت میں تپ دق جیسے نامراد مرض کی روک تھام کے لئے حکومت نے ۲ اکتوبر سے ایک نئی مہم شروع کی ہے جس کا ایک خاص مقصد یہ ہے

کہ جنتا کو اس مرض کو دور کرنے کے طریقوں سے روشناس کرایا جائے۔ اس مہم کو ۲ اکتوبر سے کیوں شروع کیا جا رہا ہے اس کے متعلق ایک ریڈیو براڈکاسٹ میں بھارت کی وزیرِ صحت راج کماری امرت کور نے کہا کہ ۲ اکتوبر راشٹر پتا گاندھی جی کا جنم دن ہے اور باپو کی یہ دلی خواہش تھی کہ دیش سے بیماری اور دکھ کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ اس لئے ان کی پوتر یاد منانے کا اس سے بہتر طریقہ دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا کہ آج کے دن ہر ہندوستانی نسلِ انسانی کے اس خوفناک دشمن کے خلاف اعلانِ جنگ کا حلف اٹھائے۔

دس ہزار من چاول کی پیشکش

بھارت اور پاکستان کے مابین اقلیتوں کے تحفظ کے پیکٹ کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ دونوں دیشوں کے باہمی تعلقات آہستہ آہستہ خوشگوار ہوتے جا رہے ہیں اور انہوں نے ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک ہونا بھی شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ آسام میں جو بھیانک بھونچال آیا اس پر وزیرِ اعظم پاکستان نے ایک تار کے ذریعے نہ صرف آسام کے لوگوں کے ساتھ زبانی ہمدردی کا اظہار کیا بلکہ تکلیف زدہ علاقوں کے لئے دس ہزار من چاول کی پیشکش بھی کی۔ بھارت کے پردھان منتری نے اس تار کے جواب میں وزیرِ اعظم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی پیشکش کو قبول کر لیا ہے۔

نئی سیمنٹ فیکٹری

صوبہ اڑیسہ کے ایک شہر راج گنگپور میں بھارت سرکار کے وزیرِ صنعت شری ہرے کرشن مہتاب نے اڑھائی کروڑ روپے کے سرمایے سے قائم شدہ ایک سیمنٹ فیکٹری کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ سرکار کسی بھی شخص یا جماعت سے جو ملک میں صنعتی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کرے پورا تعاون کرنے کے لئے تیار رہے۔ یہ سیمنٹ فیکٹری ڈیڑھ لاکھ ٹن سیمنٹ ہر سال تیار کرے گی۔

چور بازاری

بھارت سرکار نے ناجائز منافع خوری اور بلیک مارکیٹ کے انسداد کے لئے جو آرڈیننس جاری کیا تھا صوبائی حکومتوں نے اس پر پوری طرح عمل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے چنانچہ مدراس اور بہار کے وزرائے اعظم نے بیوپاریوں کو سخت الفاظ میں تنبیہ کی ہے کہ وہ بلیک مارکیٹ سے باز آجائیں ورنہ اُن کے ساتھ سخت سلوک کیا جائے گا۔ بہار سرکار نے تو اس امر کے احکام بھی جاری کر دیے ہیں کہ جو بیوپاری ناجائز منافع کماتے کا جتن کرے اسے فوراً نظر بند کر دیا جائے۔

شرنارتھیوں کی آبادکاری

پچھلے دنوں بھارت سرکار کے ایک پریس نوٹ میں دیہاتی شرنارتھیوں کی آبادکاری کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ ۳۰ لاکھ دیہاتی شرنارتھیوں میں سے ۹۷ فیصدی کو زمینیں الاٹ کی جا چکی ہیں۔ مکانات یا تو الاٹ کر دئے گئے ہیں یا اُن کی تعمیر کے لئے قرضہ دیا گیا ہے

اب ایک نئے پریس نوٹ میں شہری شرنارتھیوں کی آبادی کا مسئلہ زیرِ بحث لا کر بتایا گیا ہے کہ اس باب میں حکومت کیا کیا کر رہی ہے۔ شہری شرنارتھیوں کی آبادی ۲۵ لاکھ تسلیم کی گئی ہے اس تعداد میں سے ۲۱ لاکھ ۶۵ ہزار اشخاص کو اس وقت یا تو مکان مہیا کئے جا چکے ہیں یا ان کے لئے مکان زیرِ تعمیر ہیں۔

باقی جن لوگوں کے لئے مکان مہیا کئے جانے ہیں۔ ان کی تعداد تین لاکھ ۳۵ ہزار رہ جاتی ہے۔ یقین کیا جاتا ہے۔ کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے نئے مکان خود بنا کر یا موجودہ مکانوں میں اپنا انتظام خود کر لیا ہے۔ ایسے لوگوں کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہیں ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ ان میں سے بہت بڑی تعداد کو جن کے پاس اس وقت کوئی مکان نہیں ہے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء کے آخر تک مکان مہیا کر دئے جائیں گے۔

دکانوں کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے۔ کہ بیوپاریوں اور تاجروں کو اٹھائیس ہزار نکاسی اور کاروباری احاطے الاٹ کر کے مدد دی گئی۔ اس کے علاوہ پچیس ہزار نئی دوکانیں تعمیر کی گئی ہیں۔ دہلی میں نکاسی جائدادوں کے کسٹوڈین کے سامنے چالیس ہزار مقدمات پیش ہوئے۔ ان میں سے اس وقت صرف تین ہزار زیرِ غور پڑے ہیں۔ اور ان کا جلد از جلد فیصلہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

بیواؤں، بوڑھوں اور محتاجوں کی امداد کا جو طریقہ ہماری سرکار نے اختیار کیا ہے اُس کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ شہری غیر منقولہ نکاسی جائدادوں کا جو کرایہ

وصول ہوا ہے۔ اس سے حکومت نے بیواؤں، بوڑھوں اور محتاجوں کو گزارہ الاؤنس دینا منظور کیا ہے۔ پہلے پہل اس گزارہ الاؤنس کی زیادہ سے زیادہ شرح ۲۵۰ روپے ماہوار مقرر کی گئی تھی۔ لیکن کرایہ کے طور پر جو رقم وصول ہوئی وہ چونکہ بہت کم رہی اس لئے گزارہ الاؤنس کے لئے دی جانے والی رقم ناکافی ثابت ہوئی۔ اور حکومت کو مجبوراً زیادہ سے زیادہ الاؤنس کی شرح کم کر کے پچاس روپے ماہوار کرنی پڑی۔ امید کی جاتی ہے۔ کہ شرنارتھی اور ان کی سبھا سوسائٹیاں کرایہ وصول کرنے کے کام میں حکومت کی مدد کریں گے۔ اس وقت تک ۶۴۳۴۳ بے گھر اشخاص کو اس سکیم کے ماتحت کل ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ ماہوار گزارہ الاؤنس تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۴۵۴۱ بوڑھے اور محتاج اشخاص اور لاوارث عورتوں اور بچوں کے ۱۳۸ آشرموں میں رہائش، خوراک، تعلیم اور تربیت مفت دی جاتی ہے۔

چونکہ ابھی تک عام شرنارتھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہوئے اس لئے ان کو حکومت کی طرف سے جو قرضہ جات دئے گئے تھے اُن کی شرائط کو بھی نرم کر دیا گیا ہے چنانچہ شہری قرضوں کی سکیم کے ماتحت جس پر ریاستی حکومتوں کے زیر انتظام عمل کیا جا رہا ہے۔ کل سات کروڑ ۴۱ لاکھ روپے کی رقم ایک لاکھ بیس ہزار شرنارتھی کنبوں کو قرضہ کے طور پر تقسیم کی گئی ہے۔ ان قرضوں سے سات لاکھ بیس ہزار بے گھر لوگوں کو از سر نو آباد ہونے میں مدد ملی ہے۔ اس سکیم کے ماتحت زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار روپیہ قرضہ دیا جا سکتا ہے بہت سے درخواست کنندوں کو پانچ پانچ ہزار روپیہ قرضہ ملا ہے۔ قرضہ دینے سے قبل ہر ایک کنبہ کی اور امیدوار جو پیشہ یا کاروبار اختیار کرنا چاہتا ہے اس کی ضروریات پر غور کیا جاتا ہے۔

پچھلے دنوں شرنارتھیوں اور ریاستی حکومتوں کی درخواست پر ان قرضوں کی واپسی کی شرائط نرم کر دی گئی ہیں۔ دراصل شرط یہ تھی کہ قرضہ کے ایک سال بعد شرنارتھیوں کو قرضہ واپس ادا کرنا ہوگا بعد میں واپسی ادائیگی کی میعاد دو برس کر دی گئی۔ پچھلے دنوں یہ ہدایات جاری کی گئی ہیں۔ کہ قرضوں کی واپسی ادائیگی اجرا کی تاریخ سے تین برس کے بعد شروع ہوگی۔

اب باقی رہ جاتا ہے نوجوان شرنارتھیوں کو بارزگار بنانے کا سوال اس ضمن میں بھی حکومت اپنے فرض سے غافل نہیں چنانچہ نوجوان شرنارتھیوں کو روزگار حاصل کرنے کے قابل بنانے کے لئے ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تربیت دی جا رہی ہے۔ اس وقت تک ۲۵ ہزار سے زائد اشخاص تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ اور یقین کیا جاتا ہے کہ ان میں سے اکثر کو روزگار مل چکا ہے۔ اکثر ریاستوں میں اس وقت بہت سے تربیتی مرکز جاری ہیں۔ اور قریباً پندرہ ہزار اشخاص ان میں تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

پرائمری درجہ تک تعلیم کا تمام خرچ حکومت برداشت کرتی ہے سیکنڈری اور ہائی کلاسوں میں بھی قبل ازیں طلبا کو فیسیں ادا کرنے اور کتابیں خریدنے کے لئے قرضے دئے جا رہے تھے۔ یہ محسوس کیا گیا۔ کہ طلبا کو فیس کی معافی دی جائے۔ کیونکہ طلبا کے لئے قرضے واپس ادا کرنا مشکل ہوگا۔ اب ایک نئی سکیم کا اعلان کیا گیا ہے جس کی رو سے طلبا کو سیکنڈری اور ہائی سکولوں اور کالجوں میں فیسوں کی معافی دی جائے گی۔

سال ۵۰-۱۹۴۹ء کے خاتمہ تک طلبا کو ۷۴ لاکھ روپیہ کی رقم قرضوں کے طور پر تقسیم کی گئی تھی۔ سال رواں میں "بے گھر لوگوں کی تعلیم" کی مد میں ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔

شہری شرنارتھیوں کی آبادکاری کے متعلق بھارت سرکار کی ان تمام اسکیموں کو دیکھنے کے بعد یہ صاف طور پر عیاں ہو جاتا ہے کہ سرکار نے اس مسئلے پر بہت حد تک قابو پا لیا ہے اور جو تھوڑا بہت کام باقی رہ بھی گیا ہے اسے بہت جلد پورا کر لیا جائے گا۔

حال کے سیلاب اور ملکی پیداوار

پچھلے دنوں بھارت کے طول و عرض میں جو سیلاب آئے اور ان سیلابوں سے فصلوں کو جو نقصان پہنچا۔ اُن کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کے دل میں اس امر کے شکوک پیدا ہو گئے تھے کہ کہیں ۱۹۵۲ء تک خوراک کے سلسلے میں خود کفیل بننے کی اسکیم کو ضعف نہ پہنچ جائے لیکن وزارت خوراک کے ایک ترجمان نے ایک سوال کے جواب میں ان تمام شکوک کو رفع کر دیا اور ایک بار پھر بھارت سرکار کے اس عزم مصمم کو دہرایا کہ دیش کو ہر حالت میں ۱۹۵۲ء تک خوراک کے متعلق خود مکتفی بنا دیا جائے گا۔

زکام کو روکئے

اس سے آگے خطرہ ہے!

● بار بار زکام کا لگنا چھینکیں آنا یوں ہی تکلیف دہ ہے لیکن زکام کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دینا بے حد خطرناک نتائج پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس لئے زکام کا خطرہ محسوس ہوتے ہی اسے روکئے۔

سعالین

کی ایک ٹکیہ منہ میں رکھ کر آہستہ آہستہ چوسئے۔ یہ نہ صرف زکام کو تسکین دے گی حلق کی خرابیوں کو دور کرے گی طبیعت کو سکون بخشے گی۔ بلکہ سانس کی نالیوں کو صاف کر کے نظام میں توازن پیدا کرے گی اور سانس کو خوشگوار بنائے گی

قیمت فی شیشی صرف بارہ آنے

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

Hamdard

پھول جیسے بچوں

کی پرورش نونہال پر ہونی چاہیئے

قیمت فی شیشی بارہ آنے

نونہال

ننھے بچوں کو مضبوط بنانیوالا

انکا دل پسند ٹانک

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

Hamdard

چندو کی دلیری

دی ٹاٹا آئل ملز کمپنی لمیٹڈ

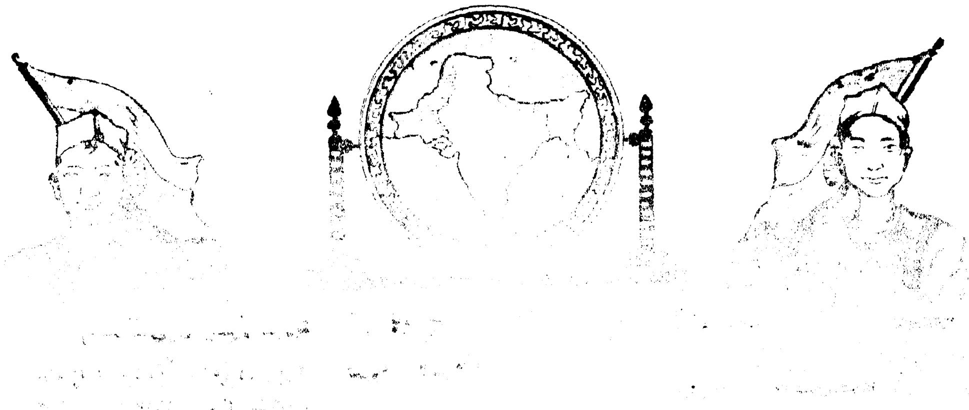

محمد شفیع الدین نیرؔ

اک بار موسم سردی کا آیا — سردی کی شدت ساتھ اپنے لایا
ایک ایک کپڑا بھاری جو پہنا — موہن یہ اپنی اماں سے بولا
اماں جو رہتا گرمی کا موسم — دن رات رہتے ہلکے سدا ہم
کپڑے نہ ہوتے اُونی ہمارے — بکسوں میں رہتے یہ بند سارے
بُنیان اُونی، اُونی لبادہ — فرغل نہ بھاتا ہم کو زیادہ
سر پر نہ ہوتا رُومال اُونی — اوڑھے نہ رہتے ہم شال اُونی
ہر دم گلے میں رہتا نہ مفلر — لادے نہ پھرتے ہر وقت چسٹر
ہلکی سی ہوتی پوشاک ساری — ہوتے بدن پر کپڑے نہ بھاری
سردی نہ لگتی سی سی نہ کرتے — ٹھنڈی ہوا کے دُکھ سے نہ ڈرتے
کانپا نہ کرتے تھر تھر تھرا تھر — سردی سے ہوتی حالت نہ ابتر

سردی کا موسم جلدی یہ جائے
پھر گرم موسم دل کو بھائے

وی رام چندر ریڈی

دادا بھائی نوروجی

ہندوستان میں ایسے بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے اپنی قابلیت نیک نامی اور دیس سیوا سے کافی نام حاصل کیا ہے - اور سچ تو یہ ہے کہ انھی کی وجہ سے آج ہمیں سوراج نصیب ہوا ہے -

انھی میں سے دادا بھائی نوروجی ہیں جنھوں نے اپنے دیس کا درجہ دنیا کی نظروں میں اونچا کرنے کے لئے مشکل سے مشکل کام کیا اور بھارت کی آزادی کے لئے ہر تکلیف سہی - وہ ہندوستان پر ہندوستانیوں ہی کی حکومت چاہتے تھے اور اس کے لئے ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے رہنے والوں میں ایکا اور اتفاق ہو اور وہ سچے دل سے مل کر آزادی کی لڑائی لڑیں -

دادا بھائی نوروجی نے ۴ ستمبر ۱۸۲۵ء کو بمبئی کے ایک پارسی گھرانے میں جنم لیا - ابھی چار سال کے نہیں ہوئے تھے کہ ان کے پتا چل بسے اور ان کو پالنے کی پوری ذمہ داری ان کی ماں پر آن پڑی - ان کی ماتا جی بڑی دیالو اور سمجھدار استری تھیں - انھوں نے نوروجی کی نگرانی اور تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی - وہ چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر اپنے دیس کے لوگوں کی کچھ سیوا کرے -

بچپن ہی سے نوروجی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا - وہ دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں اپنا سبق بہت جلد یاد کر لیتے تھے - حساب میں تو وہ ایسے تیز تھے کہ اکثر سوالات کاغذ پر لکھے بنا ہی زبانی حل کر کے بتا دیتے تھے - جب اسکول میں کوئی بڑا آدمی آتا تو وہ نوروجی کی لیاقت پر بڑا ہی خوش ہوتا - اور استادوں کو مبارکباد دیتا -

پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ کھیلوں کے بھی بڑے شوقین تھے - وہ کئی کھیل بہت اچھی طرح کھیل لیتے تھے - کرکٹ ان کا سب سے پسندیدہ کھیل تھا - دوپہر کی کڑی دھوپ میں بھی جبکہ مدرسہ کو آدھ گھنٹے کی چھٹی ہوتی ہے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے تھے - ان کا رنگ بالکل انگریزوں کا سا تھا - اسکول کے ڈراموں میں جب وہ سپاہی یا راج کمار کا بھیس بدل کر آتے تھے تو بڑے بھلے معلوم ہوتے تھے -

پڑھائی اور کھیلوں میں اوّل رہنے کی وجہ سے لڑکے ان کو اپنا لیڈر سمجھتے -

مدرسے میں وہ ہر ایک سے بڑی اچھی طرح پیش آتے تھے - ان کی ماتا جی نے انھیں بچپن ہی سے ہر ایک سے نرمی

سے بات کرنے کی عادت ڈالی تھی۔ اگر کبھی کوئی انگریز لڑکا اُنہیں بُرا بھلا کہتا تو وہ جواب میں بالکل خاموش رہتے یا کہتے کہ "بھئی! تمہاری گالیوں سے تو خود تمہارا اپنا منہ ہی خراب ہوتا ہے"۔

اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ الفنسٹن کالج بمبئی میں شریک ہوئے۔ یہاں انہیں اپنی قابلیت کی وجہ سے کئی وظیفے اور انعام ملے وہ کالج کے سب سے اچھے ودیارتھی مانے جاتے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں انہوں نے بی۔ اے پاس کیا اور کالج میں اوّل رہے۔ اس سے اس زمانے کے بمبئی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے نوروجی کی ماتا کو کہلا بھیجا کہ اگر نوروجی بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان جانا چاہیں تو وہ اس کے آدھے اخراجات اپنی جیب سے دینے کو طیّار ہیں۔ لیکن نوروجی کے خاندان والوں نے یہ سمجھ کر کہ نوروجی انگلستان جاکر عیسائی بن جائیں گے۔ اس کی مخالفت کی اس طرح نوروجی اس سنہری موقعے سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔

کالج سے نکلنے کے بعد وہ اپنے ہی کالج میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

کالج میں لڑکوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے جنتا کی بھلائی کے لئے بھی بہت سے کام کئے۔ غریبوں کے لئے مدرسے کھولے۔ لڑکیوں کے لئے ایک مدرسہ بنوایا جو بمبئی میں اپنی قسم کا پہلا مدرسہ تھا۔ ایسے کلب کھولے جہاں مرد اور عورتیں سب مل کر ہندوستان کی بھلائی کے بارے میں سوچتے تھے انہوں نے انگریزی کی اچھی اچھی کتابوں کو ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لئے ایک سوسائٹی بھی قائم کی۔

۱۸۵۱ء میں انہوں نے گجراتی میں ایک اخبار "راست گفتار" جاری کیا جو پڑھے لکھے لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔

تجارت کے سلسلے میں نوروجی ۱۸۵۵ء میں پہلی بار انگلستان گئے۔ اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر انہوں نے انگریزوں کے سامنے ہندوستان کے حالات اور شکایات پیش کئے۔ لندن میں چند سال رہنے کے بعد ان کی دوکان کو بڑا بھاری نقصان ہوا۔ اس لئے ۱۸۶۹ء میں وہ اپنا کاروبار ختم کر کے ہندوستان واپس آگئے۔

ہندوستانی جانتے تھے کہ نوروجی نے لندن میں ان کے لئے بہت کچھ کیا ہے اس لئے ان کا سواگت کرنے کے لئے ایک بڑا جلسہ کیا جس میں ان کی سیوا میں تحفے کے طور پر بہت سا روپیہ بھی پیش کیا گیا جسے انہوں نے جنتا کے کاموں میں لگا دیا۔ اس کے بعد ہی ۱۸۷۳ء میں ہندوستانیوں کی تکلیفوں کو انگریزوں کی حکومت کے سامنے رکھنے کے لئے پھر انگلستان گئے۔ انہوں نے انگریزوں سے کہا کہ ہندوستانیوں کی حالت بہت گری ہوئی ہے اور وہ اتنے غریب ہیں کہ ان کی آمدنی سالانہ ۲۰ روپے بھی نہیں ہے اس لئے محصول کا بوجھ اُٹھانا بہت مشکل ہے۔ پبلک سے جو روپیہ وصول کیا جاتا ہے وہ سب کا سب دیش سے باہر بھیج دیا جاتا ہے جس سے دیس کی دولت میں کمی ہو رہی ہے یہی نہیں بلکہ انہوں نے ہندوستان کی غریبی سے متعلق ایک کتاب بھی لکھی۔

انگلستان کی واپسی کے بعد وہ بروده کے دیوان بنائے گئے اس وقت برودہ کی حالت بہت خراب تھی مگر نوروجی نے اپنی کوشش سے دو سال میں سب ٹھیک کر دیا اور بمبئی واپس آئے ۱۸۸۰ء میں وہ بمبئی کارپوریشن کے صدر بنے۔ اس کے علاوہ قانون بنانے والی سبھا کے بھی ممبر بنے۔

۱۸۸۵ء میں بھارت کو سوراج دلانے کے لئے ہندوستانیوں نے "انڈین نیشنل کانگریس" نام سے ایک سبھا بنائی۔ جواب

تک قائم ہے اس سبھا کے قائم کرنے میں دادا بھائی نے بھی بڑا کام کیا۔

ہندوستانیوں کی مصیبتیں ختم کرنے اور انگریزوں کو ہندوستان کے صحیح حالات بتلانے کے لئے نوروجی انگریزوں کی پارلیمنٹ کے ممبر بننا چاہتے تھے۔ اس لئے سنہ ۱۸۸۶ء میں پھر انگلستان گئے مگر ناکام آئے۔

سنہ ۱۸۹۲ء میں وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے اور پارلیمنٹ کے ممبر چنے گئے۔ اس طرح یہ پہلے ہندوستانی تھے جنھیں یہ عزت ملی پھر جب وہ ہندوستان آئے تو جنتا نے کانگرس کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دی۔ نوروجی سے جنتا کو اتنا پریم تھا کہ وہ اس کے بعد بھی دو بار کانگرس کے صدر چنے گئے۔

صحت کی خرابی کی وجہ سے نوروجی کو سنہ ۱۹۰۷ء میں پھر انگلستان جانا پڑا۔ انگلستان جا کر ان کی صحت سدھر گئی۔ اور وہ جلد ہی ہندوستان واپس آ گئے کیونکہ وطن سے دور ان کا دل بے چین رہتا تھا

سنہ ۱۹۱۷ء میں نوروجی پھر بڑے سخت بیمار پڑے۔ لیکن اس بیماری کی حالت میں بھی وہ لوگوں کو دیس کے متعلق مفید مشورے دیا کرتے تھے۔ آخر کار وہ ۳۰ جون سنہ ۱۹۱۷ء کو چل بسے۔

دادا بھائی نوروجی ہندوستان کے ایک بہت بڑے آدمی تھے جنھوں نے اپنے جیون کی آخری گھڑی تک کو دیس کی سیوا میں لگا دیا۔

قہقہے

باپ ۔ اپنے استاد کا کہنا مانا کرو۔ وہ بڑے لائق آدمی ہیں۔

بیٹا ۔ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔

باپ ۔ کیا بک رہے ہو۔

بیٹا ۔ سچ کہتا ہوں ابّا جان۔ ہر بات لڑکوں سے پوچھتے ہیں۔ وہ شہر کہاں ہے۔ اس دریا کا کیا نام ہے، فلاں لفظ کے کیا معنی ہیں۔ انہیں تو کچھ بھی نہیں آتا۔

وکیل ۔ دیکھو بھائی تمہارا دعویٰ جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔

غریب ۔ جناب اگر دعویٰ سچا ہوتا تو آپ کو وکیل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

جج ۔ چور سے۔ تمہارا کوئی اور بھی ساتھی تھا یا تم نے اکیلے نقب زنی کی۔

ملزم ۔ جی نہیں میں اکیلا ہی تھا ایسے کاموں میں کوئی دیانت دار آدمی نہیں ملتا۔

پہلا آدمی ۔ ہسپتال جانے کا سب سے آسان راستہ کون سا ہے؟

دوسرا آدمی ۔ سامنے آنے والی گاڑی کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔

محمد عباس ہارون بھوپال

ڈی ۔ جے گپت

بھونچال

دھرتی کے ڈھنگ بڑے نرالے ہیں۔ اس کے پل بھر کے کانپنے سے لاکھوں انسان بے گھر ہو جاتے ہیں۔ دریا نہریں راستہ بھول جاتے ہیں۔ ریل کی پٹڑیاں زمین کے اندر دھنس جاتی ہیں نئے چشمے نمودار ہو جاتے ہیں اور انسان ڈر کر حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح کا تباہ کن بھونچال حال ہی میں آسام میں آیا ہے ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء سے آج تک سارے صوبے میں خاص طور پر ضلع ڈبرو گڑھ کے آس پاس کے دیہات میں بھونچال کے جھٹکے برابر محسوس ہو رہے ہیں خوش قسمتی سے جانی نقصان کی نسبت مالی نقصان ہی زیادہ ہوا ہے۔

دنیا کے آغاز ہی سے زلزلے آتے رہے ہیں۔ اور نسل انسانی کو کافی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ بھونچال کے آنے کے متعلق ماہرین کی جانچ کے مطابق زمین کی تہ کے نیچے بہت بھاری ٹھوس چٹانیں ہیں۔ اوپر کی تہ پتلی ہے اور اس کے نیچے گرم چٹانیں ہیں لیکن ان گرم چٹانوں کے اوپر کی تہ سبھی جگہ ایک سی مضبوط نہیں ہے بعض جگہ یہ کمزور بھی ہے اور اس میں دراڑیں بھی ہیں۔ جب یہ پتلی تہ کمزور ہو جاتی ہے تو دباؤ کم ہونے پر اندر کے گرم لاوے میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ پگھلے ہوئے لاوے کی ہل چل سے اوپر کی چٹان کانپنے لگتی ہے جس سے روئے زمین پر بھونچال کے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں کبھی کبھی یہ پگھلا ہوا لاوا جوالا مکھی کی طرح پگھل کر باہر نکل آتا ہے۔

اپنی خاص نوعیت کی وجہ سے بھونچال چار طرح کے مانے گئے ہیں (۱) راک فال۔ (۲) وال کینک۔ (۳) ٹیک ٹانک اور (۴) باطقی بنزم

راک فال بھونچال اسے کہتے ہیں جس میں صرف چٹانیں اپنی جگہ کو چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ معمولی قسم کا زلزلہ ہے۔ یہ زلزلہ جوالا مکھی کے آس پاس ہی ہوتا ہے۔ زیادہ تر ٹیک ٹانیکل بھونچال ہی آتے ہیں۔ اس کی وجہ زمین کی تہ میں چٹانوں کا ٹوٹنا ہے۔ ایسے زلزلے جوالا مکھی سے دور بھی آتے ہیں۔ باطقی بنزم بھونچال زمین کے اندر زیادہ گہرائی میں پیدا شدہ ہل چل سے آتا ہے۔

بھونچال کے شروع میں گھڑگھڑ کی سی آواز آنے لگتی ہے۔ ایک دو منٹوں میں یہ گھڑگھڑاہٹ دور ہٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور پھر بند ہو جاتی ہے۔ ہر ایک گھڑگھڑاہٹ چند سیکنڈ ہی رہتی ہے۔ بھونچال اپنی تیزی کے مطابق پانچ سیکنڈ سے لے کر پانچ منٹ تک کی مختصر سے مدت میں ختم ہو جاتا ہے۔

جب کسی جگہ بھونچال آنے والا ہو تو زمین کی تہ میں اسی طرح کی لہریں پیدا ہوتی ہیں جیسی کہ تالاب میں پتھر پھینکنے سے۔ یہ لہریں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ پہلی دو تو زمین کے اندر ہی شروع ہوتی ہیں اور تیسری زمین کی سطح پر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

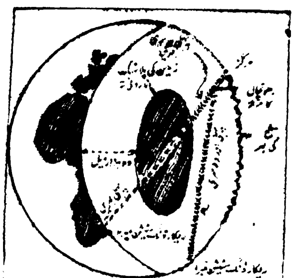

دوسری طرح کی لہر پہلی طرح کی لہر سے ذرا آہستہ چلتی ہے زمین کی تہ سے ان لہروں کی ہل چل جس آلے کے ذریعے معلوم کی جاتی ہے اُسے سسموگراف کہتے ہیں۔ بھونچال کا یہ آلہ کس طرح کام کرتا ہے یہ تصویر نمبر ۲ میں دکھایا گیا ہے۔

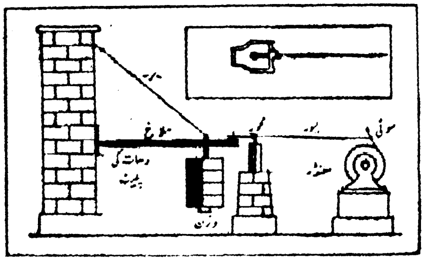

جب ایک دیوار بھونچال سے ہلتی ہے تو اُس کی رفتار ایک خاص سُوئی کے ذریعے سے آلے میں ظاہر ہوتی ہے۔ آلے کا لیور ایک خاص سوئی کے ذریعے سے بھونچال کی اطلاع دیتا ہے۔ یہ سوئی چکر کاٹتی ہوئی سلنڈر سے لگے ہوئے ایک خاص قسم کے کاغذ سموکڈ پیپر پر ٹیڑھی لکیریں بنانا شروع کرتی ہے۔ بھونچال نہ آنے کی صورت میں لکیریں سیدھی بنتی ہیں۔ اس طرح اس آلے سے بھونچال کی تصویر خود بخود بن جاتی ہے۔

یکم نومبر ۱۷۵۵ء کو لزبن میں زلزلہ آیا تین زبردست جھٹکوں کے بعد لزبن کے نچلے حصے کے سارے گھر مٹی کا ڈھیر بن گئے۔ اس بھونچال کا اثر تمام پرتگال، سپین، جنوبی فرانس اور شمالی امریکہ تک ہزاروں میل تک پڑا جس کا اثر یہ ہوا کہ سمندر اپنی جگہ سے بہت پیچھے ہٹ گیا۔ ملک کے اندرونی حصوں میں دریاؤں، تالابوں اور جھیلوں وغیرہ میں بھی عجیب و غریب ہل چل مچی رہی۔ اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ یہاں تک کہ سویڈن اور ناروے میں بھی ۱۷۰۰ میل کے فاصلے پر جھیلوں، تالابوں اور دریاؤں میں تھرتھراہٹ پیدا ہوگئی۔

ٹھیک ۴۰ سال پہلے آسام میں اس طرح کا زلزلہ آیا تھا۔ اس میں ۱۷۵۰۰۰ مربع میل کے رقبے میں لگ بھگ آدھے یورپ کے برابر حصے پر اس کا اثر پڑا تھا۔ ۱۶۰۰۰ مربع میل کے رقبے میں برطانیہ کے دُگنے کے برابر کے ایک ضلع میں جان و مال کا بہت زیادہ نقصان ہوا تھا۔

ذیل کے اعداد و شمار سے ان بھونچالوں سے نقصانات کا اندازہ ہوگا۔ ۱۷۵۵ء میں لزبن کے زلزلے سے پچاس ہزار انسان، سن ۱۹۲۰ء میں چین میں ایک لاکھ آدمی، ۱۷۰۳ء میں جاپان میں دو لاکھ انسان۔ ۱۷۳۱ء میں بھارت میں تین لاکھ انسان بھونچالوں سے مارے گئے۔ ممکن ہے ان اعداد و شمار میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ۱۹۲۳ء کے زلزلے میں جاپان میں ۹۹۳۳۱ لوگ مرے ۱۰۳۷۳۳ زخمی ہوئے اور ۴۳۴۷۶ انسان گم ہو گئے۔

اس وقت آسام کے جس بھونچال کا ذکر ہو رہا ہے وہ ٹیک ٹانیکل زلزلہ ہے۔ آسام کے شمال میں پہاڑوں کی ایک قطار ہے۔ یہ پہاڑ بڑھتے جا رہے ہیں۔ جب یہ پہاڑ بڑھتے ہیں تو آس پاس کی چٹانوں پر بہت دباؤ ڈالتے ہیں۔ آسام میں بار بار بھونچال آنے کی یہی بڑی وجہ ہے۔ اور اس کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس کے جھٹکے مہینوں اور سالوں تک آتے رہتے ہیں۔ ۱۸۹۷ء کے آسام کے بھونچال کے جھٹکے دو سال تک محسوس ہوتے رہے تھے اور ان جھٹکوں کی کل تعداد ۵۶۳۲ تھی۔

آسام میں اس بھونچال کی سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ زمین کے بڑے بڑے حصے اپنی جگہ سے ہل گئے۔ دریاؤں کے بہاؤ میں رکاوٹ پڑنے سے سیلاب آ گئے اور بھونچال سے زیادہ ان سیلابوں سے جانی نقصان ہوا۔

آجکل

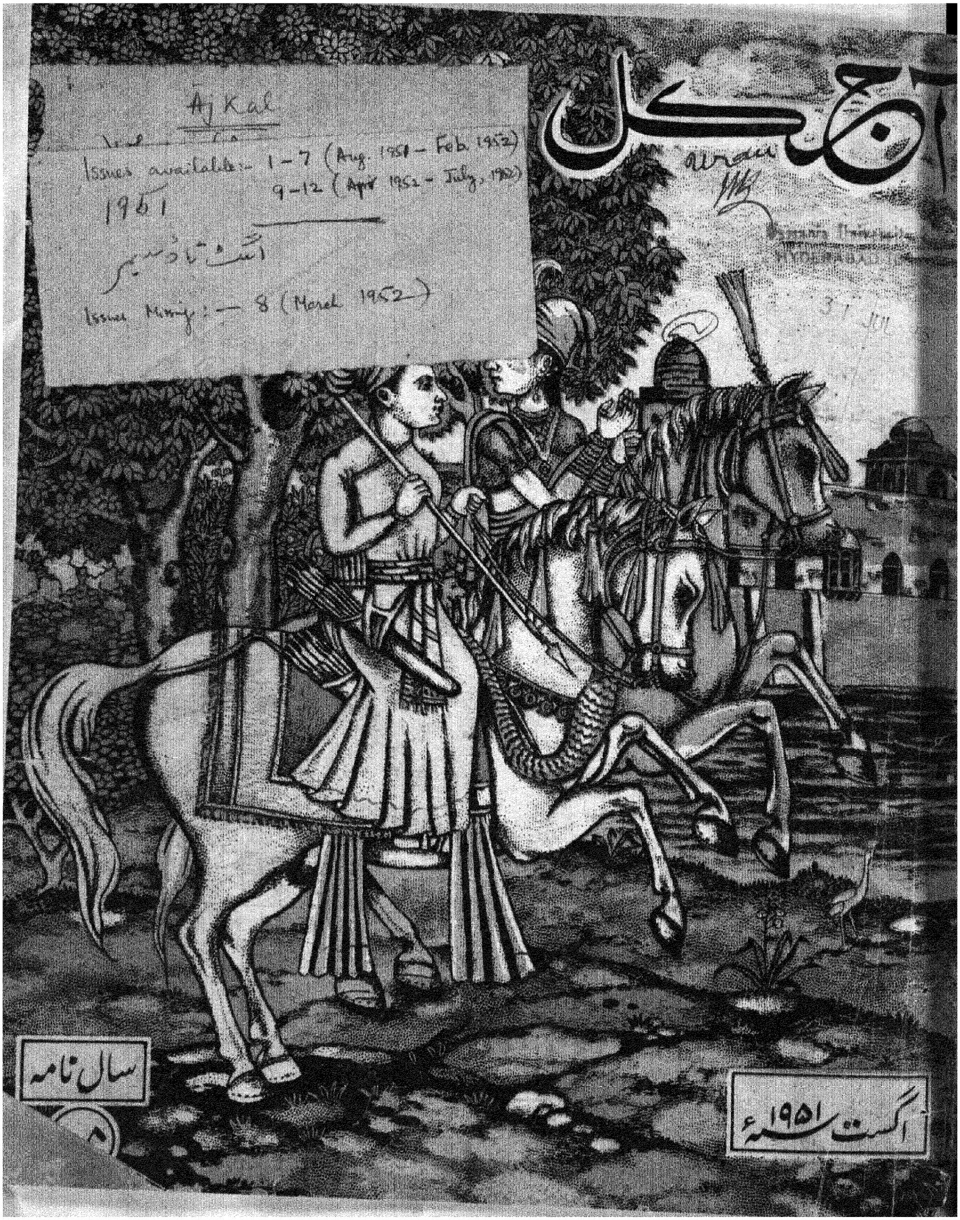

Aj Kal

Issues available: 1-7 (Aug. 1951 - Feb. 1952)
9-12 (Apr 1952 - July, 1952)
1951

اگست تا دسمبر

Issues Missing: — 8 (March 1952)

سالنامہ

اگست ۱۹۵۱ء

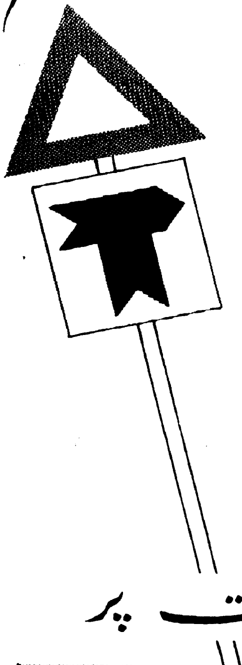

اس چائے کے آگے...

آپ اپنے دن کا کام ختم کر رہے ہیں - کچھ آدھے
گھنٹے کے بعد آپ گھر کی طرف تیزی سے جا رہے
ہوں گے ، چائے پینے کی تڑپ ہیں -
وہاں آپ کے لئے سموسے اور چٹنی رکھے ہوئے
ہیں ، اور ڈی لکس بسکٹوں کی بھری ہوئی پلیٹ — اور
مکھن ان پر لگا ہوا - جی ! ہاں .....

چائے پینے کے وقت پر

ڈالمیا ڈی لکس

عمدہ بسکٹ

پٹیالہ بسکٹ مینوفیکچررز لمیٹڈ — راجپورا ، پٹیالہ

ناشتہ ہو یا دعوت

ہر موقعہ پر پھلوں کے یہ لذیذ مُربّے اور آچار آپ کے کھانے کو لذیذ تر اور پُر لطف بنائیں گے۔ اب یہ سائنٹیفک طریقے پر بغیر ہاتھ لگائے مشین سے ڈبّوں میں بند کئے جاتے ہیں۔ اس لئے عرصہ دراز تک تر و تازہ رہتے ہیں۔

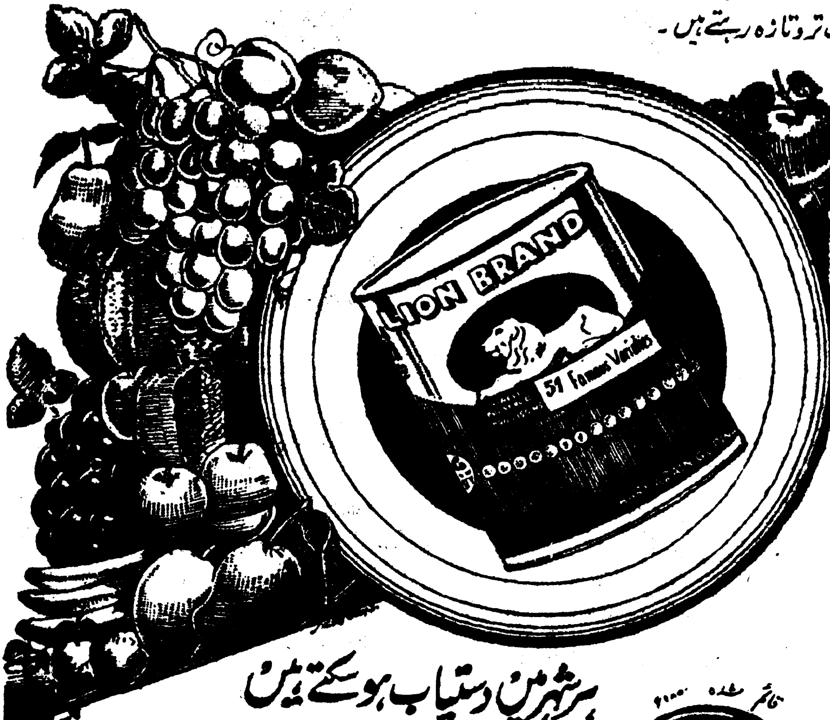

ہر شہر میں دستیاب ہو سکتے ہیں

ہمیشہ شیر مارکہ لیبل دیکھ کر خریدیئے۔ جو بہترین کوالٹی کا ضامن ہے

قائم شدہ ۱۹۰۰ء

HG
THE HALL MARK OF QUALITY

ہرنارائن گوپی ناتھ کھاری باؤلی دہلی و کناٹ پلیس نئی دہلی

"میں اپنی
جلد کی خوبصورتی کیلئے
لکس
ٹائلیٹ صابن
کی ممنون ہوں"
سُمتی گپتے
کہتی ہے
LUX
LUX TOILET SOAP
یہ سفید اور خالص صابن، جس کی خوشبو دلکش ہے، آپ کی جِلد کو بھی دلکش بنادے گا!
فِلمی ستاروں کا حُسن بخش صابن

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر :- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۰ ———— نمبر ۱

سالانہ چندہ ———— چھ روپے

غیر ممالک سے ———— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ ———— آٹھ آنے

اگست سنہ ۱۹۵۱ء

ترتیب

مناجات	جوش ملیح آبادی		۴
نواب صدر یار جنگ	مالک رام	(تصاویر ۹، ۱۰)	۸
غزل	جوش ملسیانی		۱۹
تبی بخش	علی عباس حسینی		۲۰
فصلِ گل	فضا ابن فیضی اعظمی		۲۳
قدیم ہندوستانی مصوّری - احتشام حسین			۲۴
ملک الشعرا بہار خراسانی - حامد حسن قادری			۲۹
شادی آباد مانڈو	عرش ملسیانی	(تصاویر ۳۳ تا ۳۶)	۳۲
ذکر و فکر	ظفر جمیلی کاکوی - مہندر سنگھ کوثر - عشرت رحمانی برج لال جگی رعنا - جون اصغر عصری امروہی - طالب چکوالی - وتستہ پرشاد فدا - شفیق صدیقی جونپوری خزاں ہوشیارپوری - اقبال سکندر شاہین - تنہا جعفری		۴۱
بشنو اور بشنو کے بیٹے	کرتار سنگھ دُگّل		۴۳
بادۂ کہن	فراق گورکھپوری		۴۶
مولانا شبلی کی مقالہ نگاری - اظہر علی فاروقی			۴۷
ذوقِ تعمیر	ادیب مالیگانوی		۵۱
غزل	حبیب احمد صدیقی		۵۱
تلاشِ سحر	شمیم کرہانی		۵۲
غالب و مفتی میر محمد عباس - مختار الدین احمد آرزو			۵۳
نئی کتابیں اور رسالے - ع - م		(تصاویر ۵۹، ۶۰)	۵۸
رفتارِ زمانہ	ادارہ		۶۳
بچوں کا آج کل			
برسات ہے برسات	حامد اللہ افسر		۶۹
پیٹھو فرید	راشد حسن قادری		۷۰
زمین میں گڑی تہذیب	اظہر علی فاروقی		۷۲
چوہے سے چند سوال - جے موہن لال			۷۴
میری دلہن	فرحت فاطمہ		۷۵
قہقہے	جگت سنگھ		۷۶

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جوش ملیح آبادی

مُناجات

یہ پچھلا پہر، یہ طلسمی سماں
اگر کے دُھوئیں میں یہ رقصاں شمیم
یہ شیشوں سے چھنتی بہ صد دل بری
سیاہی کے اندر جھلکتے نجوم
سمٹتی سی ظلمت، اُبھکتی سی ضَو
سکوں میں روانی، صبا میں اُمنگ
فضا نیند میں کسمساتی ہوئی
ذہانت، طہارت، بشاشت، اُمنگ
سموئی فضائیں، نہ ظلمت، نہ نور
مگر ایک آواز ــــ آوازِ دور
یہ آواز ــــ قرنوں پہ چھاتی ہوئی
کلیجے سے دل کو لگائے ہوئے
گھُڑکتی، تھپکتی، لپٹتی ہوئی
روایت[لہ] کی شمعیں جلائے ہوئے
مچلتی ہدایت کے ہیجان میں
اِس آواز میں سوز ہے ساز ہے
مجھے صبح آواز یوں دے گا کون؟
وہی سوز ہے، اور وہی ساز ہے
خدا را خموش اے زمین و زمن
وہ آبا کہ تھے مردمانِ کرام

یہ بجلی کی ضَو، یہ اگر کا دُھواں
مہکتی فضائیں چٹکتی نسیم
سیہ تاب ضَو، اگر کی روشنی
جہالت کی چادر میں جیسے عُلوم
ملاحت کے اندر صباحت کی رَو
سیاہی کی چادر میں گدلا سا رنگ
صبا فرش پر رَس مساتی ہوئی
تقدّس، تبسّم، ترنّم، ترنگ
نہ آوازِ مردم، نہ بانگِ طیور
مرے کان میں آ رہی ہے ضرور
بُجھی مشعلوں کو جلاتی ہوئی
دماغوں سے دامن بچائے ہوئے
زمانے کے اوراق اُلٹتی ہوئی
دِرایت کی مشعل بُجھائے ہوئے
چلی آ رہی ہے مرے کان میں
میں سمجھا کہ یہ کس کی آواز ہے
نہ سمجھوں اگر میں تو سمجھے گا کون؟
یہ میرے بزرگوں کی آواز ہے
کہ آبائے بندہ ہیں گرمِ سخن
ذُوالاِکرام و ذوالقدر و ذُوالاحتشام

وہ احباب پرور وہ اعدا نواز
بہ اَوجِ سخا ابرِ گنجینہ بار
وہ شائستہ مردانِ جُود و کرم
وہ مسند نشینانِ اوجِ وقار
وہ اربابِ فہمیدۂ جشن و حرب
بہ جلوت امیر و بہ خلوت فقیر
بہ گلخن جلال و بہ گلشن جمال
بہ کوئے یلاں رستمِ بے اماں
وہ آبا رہیں اِس وقت گرمِ خروش
دو عالم ہیں اک صنعتِ بے عدیل
نہیں اِس میں جائے چناں و چنیں
اگر صاحبِ فہم ہے، غور کر
مجازات پیما! حقیقت بھی دیکھ
حداثت کے ناظر قدامت بھی دیکھ
عقیدت کے ایواں میں گردن جھکا
جو شاعر ہے تو دیکھ آیات کو
یہ جتنے بھی تابندہ آیات ہیں
اور اُن کو جو میرِ نشانات ہیں
یہ سب ایک ہی اصل کے ہیں جہات
حجابات، آیات، اسمار، صفات
جو شاعر ہے تو دیکھ آیات کو
یہ تابندہ شبنم، یہ رقصندہ آب

تواضع شعارانِ گردن فراز
بہ موجِ سخن شاعرانِ کبار
وہ ذی جاہ اربابِ سیف و قلم
بہ جنگاہ نخوت، بہ بزمِ انکسار
وہ اصحابِ سنجیدۂ حرف و ضرب
بہ میداں خروش و بہ ایواں صریر
بہ گردابِ خنجر، بہ کشتیِ ہلال
بہ روئے ضعیفاں خسِ ناتواں
کہ اے بستۂ زلفِ الحاد جوش!
یہ صنعت ہے صانع کی محکم دلیل
کہ اک نقش ہے آسمان و زمیں
کہ ہر نقش حجت ہے نقاش پر
گرفتارِ معلول! علت بھی دیکھ
حدوث و قدم کی قرابت بھی دیکھ
خدائے دو عالم پر ایمان لا
اِن آیاتِ آئینۂ ذات کو
بہ رُوئے مریضاں حجابات ہیں
حجابات چھٹتے ہیں۔ آیات ہیں
حجابات، آیات، اسمار، صفات
حکیموں کے نزدیک ہیں عینِ ذات
اِن آیاتِ آئینۂ ذات کو
یہ گل ریزِ گلشن، یہ غلِ عروسِ سحاب

لہ اس نوعیت کا ایطاء میرے نزدیک مُباح ہے۔

یہ پہنائیِ چرخِ نیلوفری
یہ شاخوں پہ چڑیوں کی چہکاریاں
یہ پتّوں پہ بوندوں کی شیریں کھنک
یہ گوہر فشاں آبشاروں کے ساز
یہ اعلان و اظہار و کشف و ظہور
یہ ذرّات و انجم، یہ شمس و قمر
یہ راتوں سے دن اور دنوں سے یہ رات
خمِ قوسِ دھنک، کاریِ کہکشاں
یہ جوئے خراماں، یہ بوئے ختن
افق پر یہ رنگیں شفق کا ظہور
یہ سیلِ حقیقت کی زلفِ دراز
یہ ذرّوں کی مٹھی میں سو آفتاب
یہ بوندوں میں غلطیدہ برق و چراغ
خیابان و بستان و کوہ و کمر
جو شاعر ہے تو دیکھ اِن آیات کو
محلِّ رکوع و مقامِ سجود
دلائل میں پنہاں ہیں سو عیب جوش
حکیمانہ اجداد کو دوں جواب
بتاؤں وہ کم بیں ہیں، ہیں کور بیں؟
کجا بے ادب، اور کجا راہِ راست
تو پھر اے خدائے زمین و زمن
اگر تُو حقیقت میں موجود ہے
"بناہے بلندی و پستی توئی"؟
تو یا رب! بہ پاسِ بزرگانِ دیں
بہ رقصِ نسیم و بہ رنگِ چمن
بہ نفحاتِ انفاسِ خوبانِ شہر
بہ ابروئے غلماں، بہ رخسارِ حور
بہ نورِ نعیم و بہ نارِ جحیم
بہ طغیانِ جنگ و بہ الوانِ تک

یہ پیوستہ خشکی، یہ جولاں تری
یہ فرشِ سماعت پہ گل باریاں
یہ آڑی پھواریں، یہ بانکی دھنک
یہ آبِ رواں کا نغمۂ دل نواز
یہ دُرّاج و طاؤس و مرغ و طیور
یہ دُرہائے تاباں، یہ گلہائے تر
یہ نہروں کی لہروں میں جوئے حیات
قضا و قدر کی یہ انگڑائیاں
گل و سنبل و نرگس و نسترن
نگارِ ازل کے تبسّم کا نور
یہ نہرِ مشیّت کی اک موجِ ناز
یہ موجوں کے عقدوں میں روحِ سحاب
یہ بیجوں میں آسودہ وابستہ باغ
یہ لؤلؤ و مرجان و لعل و گہر
اِن آیاتِ مجموعۂ ذات کو
دلائل سے بالا ہے بامِ وجود
کہ ایماں ہے، ایمان بالغیب جوش
اِس اخلاق کی لاؤں کس طرح تاب
کسی کی ہو، میری یہ ہمت نہیں
"خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"
تری سمت پھرتا ہے روئے سخن
مجاز و حقیقت کا مقصود ہے
"ہمہ نیست اند آنچہ ہستی توئی"؟
یہ نخلِ ہدایت، یہ حبلِ متیں
بہ روئے نگارانِ گل پیرہن
بہ نعلِ نگارینِ ترکانِ دہر
بہ آبِ طہور و بہ تابِ شعور
بہ اربابِ خلعت، بہ اہلِ گلیم
بہ آدائے تمکیں، بہ سیمائے گل

بہ نطقِ سلیس و بہ طبعِ سلیم
بہ پیکر تراشندگانِ وثن
بہ دینِ اباحانِ کیف و شباب
بہ تسبیح و تہلیلِ کرّوبیاں
بہ حق یاریِ اولیائے کرام
بہ سوزِ گدایاں، بہ سازِ شہاں
بہ عجز آشنا راہبانِ کہن
بہ شب ہائے تاریکِ اختر شمار
بہ رخسارِ یوسف، بہ نطقِ کلیم
بہ ایمائے حوّائے جادو کلام
بہ عصیانِ پیغمبرِ اوّلیں
بہ فرمانِ حفظِ خیال و نگاہ
بہ معتوبِ خیر و بہ محبوبِ زشت
بہ سوگِ جواں مرگیِ ابنِ پیر
بہ سوزِ طویلِ دلِ بیوگاں
بہ فریادِ عشّاقِ محرومِ دید
بہ اسبابِ درد و غم اندیشگی
بہ عشرت خروشیِ ابنِ امیر
بہ فریادِ شام و بہ آہِ سحر
بہ جانِ حدوث و بہ شانِ قدم
بہ زلفِ سیاہِ بتانِ حسیں
بہ ترتیبِ مجروحِ امّ الکتاب
بہ مکر و دغائے ظلوم و جہول
بہ رفتارِ صد لشکرِ اشقیا
بہ دلِ خستگانِ فشارِ حیات
بہ پاسِ شہیدانِ بدر و حنین
خدایا! بہ آہِ جگر خستگاں:
نہ دولت، نہ قدرت، نہ تاجِ شہی
نہ بندے کو ذی قدر و ذی جاہ کر

بہ ضربِ صحابہ، بہ حرفِ حکیم
بہ بالا بلندانِ طرفِ چمن
بہ چینِ بساطِ نگاراں بخواب
بہ آہنگِ نیکوئے رامش گراں
بہ طرّاریِ حوریانِ خیام
بہ عشقِ برہمن، بہ حسنِ بتاں
بہ کبرِ ازل بستۂ اہرمن
بہ صبحِ خوش الوانِ شب زندہ دار
بہ عزمِ خلیل و بہ "خلقِ عظیم"
بہ اغوائے آدم علیہ السّلام
بہ فتحِ مبین "عدوے مبیں"
بہ میلانِ عدوان و ذنب و گناہ
بہ اندوہِ کعبہ، بہ جشنِ کنشت
بہ جور و جفاہائے عمرِ کبیر
بہ اوقاتِ سوزیِ محنت کشاں
بہ آہِ یتیمانِ مقتولِ عید
بہ جبرِ وجوہِ گدا پیشگی
بہ عصمت فروشیِ دختِ فقیر
بہ بربادیِ فرصتِ مختصر
بہ گورِ نگارینہ، بہ شمعِ حرم
بہ موئے سفیدِ بزرگانِ دیں
بہ "تاراجیِ کشورِ بوتراب"
بہ سوگِ بتولؑ و بہ مرگِ رسولؐ
ز راہِ سقیفہ سوئے کربلا
بہ لب تشنگانِ کنارِ فرات
بہ مرگِ مسیحؑ و بہ خونِ حسینؑ
الٰہی! بہ سوزِ دلِ شاعراں
فقط روشنی، روشنی، روشنی
بس اک ذاتِ مطلق سے آگاہ کر

نہ اورنگ و افسر، نہ چتر و عصا
مجھے علم کی بھوک ہے داورا

"بہ شب با نشستہ درین دیر، گم"
"بہ تحریر گرفت آستینم کہ قم"

"درین ورطہ کشتی فرو شد ہزار"
"کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار"

الٰہی! مری عقلِ اسرار باز
زمانے سے ہے درپئے کشفِ راز

مری فکر کب سے ہے سرگرمِ کار
لیے اپنی جھولی میں لیل و نہار

نظر میں شریعت کو رکھے ہوئے
طریقت کے اسرار چکھے ہوئے

بساطِ فلک کو سنوارے ہوئے
بساطِ زمیں کو ابھارے ہوئے

رواں و دواں، سینہ تانے ہوئے
بلندی و پستی کو چھانے ہوئے

خرافات کی دھار موڑے ہوئے
ہزاروں طلسموں کو توڑے ہوئے

حکایاتِ پیشیں کو جانچے ہوئے
اساطیر کا خون جانچے ہوئے

حقائق کے موتی نکالے ہوئے
ہزاروں سمندر کھنگالے ہوئے

ہزاروں پہاڑوں پہ کوندے ہوئے
کروروں ستاروں کو روندے ہوئے

بقا و فنا کو جھنجھوڑے ہوئے
مہ و سال کا رس نچوڑے ہوئے

جہالت کی آنکھیں نکالے ہوئے
مظاہر کو جیبوں میں ڈالے ہوئے

غوامض کے عقدوں کو کھولے ہوئے
ہر ذرّہ پر دو عالم کو تولے ہوئے

مگر اے خداوند و ربِّ جلیل
ملی مجھ کو اب تک نہ ایسی دلیل

کہ ہو جس سے آئینہ رازِ صفات
کہ ثابت ہو جس سے تری پاک ذات

ملے بلکہ مجھ کو، خطا ہو معاف
ہزاروں براہین تیرے خلاف

جو پرکھا تو "رزاق" و "ربِّ جمیل"
یہ سب نام ہی نام ہیں بے دلیل

وہ رحمت، وہ لیلائے کرسی نشیں
پتا اُس کا دُنیا میں چلتا نہیں

ربابِ الوہیتِ حق فروش
یہ گردوں خروشاں، یہ گیتی خموش

فسردہ، تپیدہ، برشتہ، غمیں
کوئی "تیرے بندوں" سے بڑھ کر نہیں

کوئی خاک پر، شہ نشیں پر کوئی
کوئی آسماں پر، زمیں پر کوئی

جو گیتی پہ ہے وہ بھی زار و نزار
جو گردوں پہ ہے وہ بھی غم کا شکار

نہ اونچوں کو راحت، نہ نیچوں کو چین
یہاں بھی ہے ماتم، وہاں بھی ہے بین

محرّم کی تمہید ہے صبحِ عید
بہ ہر لحظہ صد کربلا و یزید

ہر اک پھول گنجینۂ صد شرار
ہر اک برگ صد خنجرِ آب دار

جو دل ہے وہ سینے کا ناسور ہے
جو زندہ ہے، مرنے پہ مامور ہے

سزائیں پر افشاں، جفائیں محیط
بلائیں مسلّط، وبائیں محیط

ہنگِ عفونت بہ دریائے مشک
بہ موجِ تبسّم ہزاراں سرشک

ہر اک جشن کو بزمِ غم کی تلاش
دف و نے میں غلطاں دلوں کی خراش

بہ ہر خندہ طوفانِ آہ و فغاں
بہ ہر جام غلطیدہ خونِ مغاں

لڑکپن کا دُنبالہ ریش و بروت
جوانی کے پیچھے بڑھاپے کا بھوت

بڑھاپے کی خاطر کو دیوِ اجل
اجل سرد، بے باک، سفاک، اٹل

اور اِس پر بھی سنتا ہوں میں یہ پکار
کہ تو ہے خداوندِ رحمت شعار

یہ کہتے ہیں دانا و عادل ہے تو
حکیم و فرح بخش و باذل ہے تو

رحیم و رفیق و رؤف و لبیب
بہ رحمت قریب و بہ دعوت مجیب

اگر میں غلط کار ہوں اور قبیح
اگر ہیں یہ رحمت کے دعوے صحیح

تو ہٹتا نہیں کیوں، مرے دل کا بار
عطا مجھ کو ہوتا نہیں کیوں قرار

فقیروں سے نظریں ملاتا نہیں
خدا ہے تو پھر کیوں خود آتا نہیں

اگر باپ ہے تو مرے ذوالجلال
تو بیٹے کے دل کو نہ کر پائمال

جو ہو ذہنِ فرزند کند و علیل
تو فرضِ پدر کیا ہے ربِّ جلیل

نہ ہرگز غذا و دوا دے اُسے؟
خطائے مرض کی سزا دے اُسے؟

اگر عقل بندے کی ہے مضمحل
تو میری طرف سے نہ کر سخت دل

مجھے اے نگہدارِ چاک و رفو
تری جستجو ہے، تری آرزو

جہاں، دینِ اجداد ہے خیمہ زن
مری فکر کا وہ نہیں اب وطن

مری عقل کب تک رہے ناصبور
یہ مولد سے محروم، مسکن سے دور

تری مرحمت کی ہے اُمیدوار
الٰہی یہ عقلِ غریب الدیار

دکھا راہِ تمکیں خدایا مجھے
نہ ٹھکرا، نہ ٹھکرا، نہ ٹھکرا مجھے

صبوری کا اب دل کو یارا نہیں
مرا اور کوئی سہارا نہیں

نبوّت کی شمعیں ہیں یا رب خموش
رسالت کی محراب ہے بے خروش

وہ فکر و نظر کے اشارے نہیں
تجلّی کے اب وہ منارے نہیں

رہے شہر کے عالمانِ کرام
انہیں دُور سے، دُور ہی سے سلام

نہ باتوں میں نرمی، نہ لہجے میں پیار
نہ خلقِ محمّد کے آئینہ دار

نہ حسنِ ہدایت، نہ حسنِ کلام
نہ دل میں تحمّل، نہ منہ میں لگام

بہ مکتب جہول و بہ مسجد ظلوم
بہ محراب صرصر، بہ منبر سموم

بہ تحریر و تقریر ضربِ شدید
نہ علمِ قدیم و نہ تعلیمِ جدید

فقط حج و صوم و صلوٰۃ و اذاں
اذان و جدال و جدال و اذاں

جدال و اذاں سے نحیف و نزار
اگر تو ہے در اصل مطلق حکیم
دماغ آبرو پائے، یوں دل میں آ
جہالت کی تاریکیوں سے نکل
اُبل، گونجتا، گُن گُناتا اُبل
تعقّل کی رخشندگی میں اُبل
خرد ریشۂ عقل پیوند اُبل
بہت ہو چکا طورِ منقول پر
بلوریں رہا مدّتوں عرش پر
نہ تُل زیرِ ظلمت کے گلدان میں
دکھا دے گا یہ وزن افلاک کا
پھڑا ڈال ماتھے سے نجم و قمر
اگر تو ہے کندن تو ڈوب اور چھل
کہ تا نعرہ زن ہو سکوں بر ملا
نہ جاؤ اُدھر، کفر ہے جُوئے زہر
پھر آدم کے بچّوں کو نیک جا کروں
عداوت مٹا کر محبت بڑھاؤں
تمام آدمی شکر و شیر ہوں
اگر یہ حقیقت ہے پروردگار
تو اے جانِ حق میری نیت کو دیکھ
مرے اشتیاقِ تجسّس کو دیکھ
مرے ذوقِ کشفِ حقیقت کو دیکھ
تجھے سب سے بہتر یہ معلوم ہے
اگر مجھ میں ذوقِ تعبّد نہیں
میں آئینہ اندیش و انوار میں
مرے سینۂ پاک میں مشتعل
مجھے علم دے تا کہ گم ہو ملال
مرے سر پہ افسوں کی صورت نہ چھا
صحیفے بغل میں دبا کر نہ آ

ترے در پہ آیا ہوں پروردگار
تو پھر اے خدائے سمیع و علیم
حکیموں کے مانند محفل میں آ
اگر چشمۂ علم ہے تو اُبل
تفکّر کے دریا بہا تا اُبل
دلائل کی تابندگی میں اُبل
ریاضی صداقت کے مانند اُبل
نمایاں ہو اب طورِ معقول پر
اب آ، ٹھوس بن کر ذرا فرش پر
اب آ سُرخ کرنوں کی میزان میں
قدم رکھ، یہ کانٹا ہے ادراک کا
رصدگاہِ دانش میں ہو جلوہ گر
فراست کی بھٹّی سے تپ کر نکل
کہ جھک جاؤ اے منکرانِ خدا
ٹھہر جاؤ اے تیرہ بختانِ دہر
تعصّب کو دُنیا سے چلتا کروں
محبت، اُخوّت، شرافت سکھاؤں
کنشت و کلیسا بغل گیر ہوں
کہ نیّت پر اعمال کا ہے مدار
مرے ولولوں کی طہارت کو دیکھ
تجسّس، تامّل، تفکّر کو دیکھ
مری کاوشوں کی صداقت کو دیکھ
کہ فاروی بہ ایں فسق معصوم ہے
تجسّس ہے بوالہوسی تو نہیں
حقیقت ہے یا رب تعلّی نہیں
دھڑکتا ہے مولیٰ رسالت کا دل
مگر ہاں بطرزِ دگر کردگار
خطرناک وادی سے ہرگز نہ آ
تفلسف کی شمعیں منجب کرتے آ

روائت سے دل کی نہ تسخیر کر
روایت کا سکّہ بستارہ نہ ٹانک
عقیدت سے پہچان سکتا نہیں
عقیدت، فریبِ خیال و حواس
گدازِ دل و جوشِ رقّت فریب
تعبّد، تملّق، تاسّف غلط
جنون، جذب، وجدان، ذوقِ یقین
ازل کا تبسّم، ابد کا جمال
ادا سنجیِ حُسنِ ذات و صفات
حریمِ خدائی میں ہوں پاکباز
نہ مجھ سے طلب کر سجود و رکوع
نہ وا کر درِ ناز و بابِ جمال
نہ لیلیٰ کے مانند محمل میں آ
جسے عشق کہتے ہیں تلبیس ہے
یہ وہ لفظ ہے بے وقار و لعین
رسالت نے اس کو کیا ناپسند
ترا عشق اور ولولوں کا ابھار
ترے وصل کا شوق ربِّ غفور
بھگوتی ہے اشکوں سے جو آستیں
یہ جذبہ تو جھکا ہے بازِ خدا
جبھی تو نہ روتا نہ مرتا ہوں میں
اگر تو ہے دراصل ربِّ غیور
جز یہ ہے تو راہِ متانت سے آ
جو تو ورا او را! وہم انساں نہیں
یقیں ہے تو گم کیوں ہی گرداب میں
یقیں بن کے جیب تک نہ آئے گا تو

درائت کے منبر سے تقریر کر
درایت کے سنگین غرفے سے جھانک
روایات سے مان سکتا نہیں
روایت، فروغِ ظنون و قیاس
بصیرت، عقیدت، مودّت فریب
تضرّع، تورّع، تقشّف غلط
سراسر فسوں کاریِ اہرمن
فریبِ روایات، وہم و خیال
ہمہ ذوقِ جنسی ہمہ حسیات
کہاں میں، کہاں ننگِ راز و نیاز
فرازِ خرد سے ہو یا ربّ طلوع
نہ دمکا ستارے، نہ چمکا ہلال
نہ عشق و جوانی کی منزل میں آ
یہ مردانِ اوباش کی ریس ہے
جو قرآں میں اک بار آیا نہیں
مشیّت نے اس کو کیا ناپسند
یہ محاشئ ذہن ہے کردگار
ادب کے منافی، شرافت سے دُور
وہ خواہش کی خشکی ہے عفّت نہیں
ہوس کاریوں کے تپاخن کا
ادب سے یہ درخواست کرتا ہوں میں
تو، خوش وضع و سنجیدہ ہوگا ضرور
مرے رُو بہ رُو بابِ حکمت سے آ
تو اے تہمتِ وہم بن جا یقیں
جھلک قصرِ دانش کی محراب میں
تو اے وہمِ دیرینۂ اہل ہو

رہِ کفر کی خاک چھانے گا جوشؔ
نہ مانا ہے تجھ کو، نہ مانے گا جوشؔ

نوّاب صدر یار جنگ بہادر

مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم

نواب صدر یار جنگ مرحوم سے میری ملاقات محض حُسنِ اتفاق کا نتیجہ تھی۔ وہ بالعموم علی گڑھ یا حبیب گنج میں رہا کرتے تھے۔ میں دہلی سے آگے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ اُن کا حلقۂ احباب مجھ ہیچ میرز ہیچ مداں سے بہت بلند تھا۔ اور عمر کا جو فرق تھا وہ ظاہر ہی ہے۔ پس عام حالات میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے مل سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ملے۔

ہوا یہ کہ ۱۹۳۶ء میں مجھے غالب کی کتاب "سبد چین" دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جس میں مشکل سے چھ سات سو شعر ہوں گے، غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایّام یعنی ۱۸۶۷ء میں شائع کیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے بعد نہ یہ الگ ہی کہیں سے چھپا، نہ کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا۔ اس لئے مدّت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غالب کی بعض اپنی تحریروں اور یادگارِ غالب" میں اس کا ذکر موجود ہے، اور یہیں سے مجھے اس کا پتہ چلا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر بعض احباب کی خدمت میں لکھا کہ اگر آپ کے پاس یہ کتاب ہو تو چند دن کے لئے مُستعار عنایت فرمائیے۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ نہ یہ ہمارے یہاں ہے نہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں لکھ کے پوچھو۔ ممکن ہے اُن کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے اُن کی خدمت میں لکھا۔ بارے اب کے تیر نشانے پر بیٹھا۔ اُن کا جواب یہ مژدہ لایا کہ "سبد چین" کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے یہ تھی تقریبِ تعارف۔

یہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ میں ان ایّام میں اپنے کام کے سلسلے میں شملے میں مقیم تھا۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے۔ میں اس کی نقل لے کر اسے بحفاظت واپس کر دوں گا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ آپ کہاں اتنی زحمت کریں گے۔ میں یہیں سے اُسے نقل کروا کے چند دن میں بھجوا دوں گا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انھوں نے یہ نقل مجھے بھیج دی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، میں نے اس کی تلاش میں پانچ چھ مہینے صرف کئے تھے اور تقریباً مایوس ہو چلا تھا۔ اگرچہ یہ چیز میرے خیال سے بہت کم حجم کی نکلی۔ تاہم کچھ بھی ہو غالب کا کلام تھا اور اتنا نایاب کہ بڑے بڑے صاحبِ ذوق حضرات کے کتب خانے اس سے خالی تھے۔ اور وہ خود اس سے ناواقف تھے۔ اس لئے میں جتنا فخر بھی کرتا کم تھا۔

اُنھوں نے جو نقل مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں۔ اب میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ آیا اصلی کتاب ہی اتنی غلط چھپی ہے یا نوّاب صاحب کے کاتب نے روایتی اصلاحیں دے دی ہیں۔ ان میں سے کتنی غلطیاں تو ایسی تھیں کہ میں نے خود ہی اٹکل سے اُنھیں درست کر لیا۔ پھر بھی کچھ ایسی رہ گئیں کہ اُن کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ ایک آدھ جگہ لفظ ہی لکھنے سے رہ گئے تھے۔ میں نے جب اس کا اظہار اُن سے کیا تو جواب ملا کہ اگرچہ کاتب بہت محتاط آدمی ہے لیکن امکان ہے کہ اس سے غلطیاں ہو گئی ہوں۔ اس پر میں نے دل میں طے کیا کہ جب دہلی جانا ہوا تو ایک دن کے لئے علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ اور اصلی نسخے سے اس کا مقابلہ کر کے درستی کر لوں گا۔ نوّاب صاحب مرحوم نے بھی مجھے دعوت دی کہ جب پہاڑ سے اتریں تو یہاں آئیے اور کتب خانہ دیکھ جائیے۔ یہ تو عین میری خواہش تھی۔ میں نے شکریہ ادا

[...]رتے ہوئے آنے کا وعدہ کر لیا۔

اس کے تھوڑے دن بعد میں دہلی آیا۔ یہاں ایک دن، اب یاد نہیں [...]ہا، میں کونسی کتاب دیکھ رہا تھا کہ اس میں حکیم مومن خاں کے فارسی دیوان کا [...]کر پڑھا۔ میں نے پھر اُن کی خدمت میں لکھا کہ کیا آپ کے وہاں حبیب گنج [...]یں مومن کا فارسی دیوان ہے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ ہاں، دیوان کا [...]یک نسخہ موجود ہے۔ لیکن اب میں اسے آپ کو بھیجوں گا نہیں۔ اپنا وعدہ [...]را کیجے۔ یہاں آیئے اور جو چاہیئے لے جایئے۔ میں خود کتنے دن سے وہاں [...]جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ لیکن مکروہات اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسی [...]یص بیص میں دو تین مہینے نکل گئے۔ آخر ایک سہ پہر کو میں نے اُو بدا کے [...]بستر باندھا اور بغیر اطلاع دیے علی گڑھ پہنچ گیا۔ گاڑی وہاں مغرب کے [...]بعد پہنچی تھی اور اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جب میں علی گڑھ [...]کے اسٹیشن پر اترا ہوں تو بوندیاں بھی پڑ رہی تھیں۔ اب میں نے خیال کیا کہ یوں [...]بے اطلاع آنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوئے تو پھر۔ لیکن یہ خیال [...]ایک لمحے سے زیادہ میرے دماغ میں رہا نہیں۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ دل نے [...]کہا اگر نہ ہوئے تو کونسی قیامت آجائے گی، رات کی گاڑی سے واپس چلے [...]جانا۔ بہرحال میں نے سواری لی اور چند منٹ میں میرس روڈ پر ان کی کوٹھی [...]حبیب منزل میں جا پہنچا۔ وہ خود اس وقت موجود نہیں تھے۔ ملازم مجھے اندر جناب عبدالوحید خاں صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے آداب عرض کیا اور اپنا تعارف کرا کے خاموش ایک طرف بیٹھ گیا۔

نام آگیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں جناب عبدالوحید خاں صاحب کا تعارف کر دوں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم نے اپنی عمر میں تین نکاح کئے۔ پہلی بیوی ان کے چچا حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب کی صاحبزادی تھیں۔ نواب صاحب مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے، خان بہادر مولوی محمد عبیدالرحمٰن خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ انھیں بیگم کی اولاد ہیں۔ دوسری شادی بھی اپنے خاندان ہی میں ہوئی۔ یہ بیگم جناب محمد عابد خاں شیروانی رئیس بھیکم پور کی ہمشیرہ تھیں۔ نواب صاحب کا تیسرا نکاح جناب مولانا عبدالغنی خاں صاحب ساکن قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کی دختر نیک اختر جناب زینب بیگم صاحبہ سے ہوا۔ مولانا عبدالغنی خاں مرحوم، نواب صاحب کے استاد بھی تھے۔ انھوں نے فقہ اور حدیث اور تفسیر کی متعدد کتابیں ان سے پڑھی تھیں۔ یہی مولانا عبدالغنی خاں صاحب، جناب عبدالوحید خاں صاحب کے والد بزرگوار تھے اور جناب زینب بیگم صاحبہ ان کی سگی ہمشیرہ ہیں۔ بیگم صاحبہ بفضلہ حیات ہیں۔ نفیس دلہن کے نام سے کبھی کبھی مضمون بھی لکھا کرتی ہیں۔

ایک اور بات یاد آگئی۔ غالب نے ایک غزل میں اپنے تمام مشہور فارسی گو معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ قطعہ یہ ہے ؎

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود ۔۔۔ باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ ۔۔۔ حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں، گرچہ نیرزد بہ شمار ۔۔۔ ہست در بزم سخن ہم نفس و ہم دم شاں

یہاں دوسرے شعر میں علوی سے مراد مولوی عبداللہ خاں علوی ہیں۔ یہ علوی، ہمارے مولانا عبدالغنی خاں صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔ ۱۸۶۶ء میں اپنے وطن ہی میں تپ محرقہ سے وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ صہبائی انھیں کے شاگرد تھے۔

افسانہ از افسانہ می خیزد۔ غالب کے نانا مرزا غلام حسین خاں آگرہ کے رؤسا میں سے تھے۔ غالب نے اپنی والدہ جناب عزت النسا بیگم صاحبہ کا نام صرف ایک فارسی خط میں دیا ہے۔ جو انھوں نے آگرے ہی کے ایک صاحب خداداد خاں اور اُن کے بڑے صاحبزادے ولی داد خاں کے نام لکھا ہے۔ اس خاندان کے غالب کی ننھیال سے لین دین کے تعلقات تھے اور اسی سلسلے میں غالب نے یہ خط بھی لکھا ہے۔ اصلی خط کتب خانۂ حبیب گنج میں موجود ہے۔ تو خیر، ان ولی داد خاں کے ایک اور صاحبزادے کریم داد خاں بھی تھے۔ ان کریم داد خاں کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ان سب کے نام لکھنا تو غیر ضروری ہے۔ البتہ ان میں سے ایک صاحبزادی کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ یہ مولانا عبدالغنی خاں سے منسوب تھیں، اور جناب عبدالوحید خاں صاحب انھیں بسم اللہ بیگم کے صاحبزادے ہیں۔ گویا یہ غالب کے مکتوب الیہ جناب خداداد خاں کی پوتی کے بیٹے ہوئے۔ غالب کے جس خط کا اوپر ذکر ہوا وہ انھیں نے نواب صاحب مغفور کو دیا تھا۔ جو ان کے خاندانی کاغذات میں محفوظ تھا۔

یہ جملہ معترضہ، بحر طویل میں چلا گیا۔ بہرحال جناب نواب صاحب

نو بجے کے قریب مکان پر تشریف لائے۔ جونہی پہنچے، اُنھیں میرے آنے کی اطلاع ملی۔ فوراً اس کمرے میں آئے جہاں ہم لوگ تھے۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے دوزانو بیٹھا تھا۔ دروازہ کھُلنے پر نظر اُٹھا کے جو دیکھتا ہوں تو وہ سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ میں نے اُنھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن میں نے قیافے سے فوراً پہچان لیا۔ پہلے حلیہ سنیئے۔

بہت لانبا قد، سوا چھ فٹ کے لگ بھگ۔ کسرتی جسم۔ سرخ و سپید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک۔ خضاب لگی ہوئی بھرواں ڈاڑھی۔ خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے، کیونکہ جڑوں سے سپیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے، اور اُن کے پان کے شوق کے غماز تھے۔ جسم پر بند گلے کا شیروانی نما گرم کوٹ اور نیچے غالباً اسی کپڑے کا پاجامہ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی، اور اس کے اوپر منڈاسے کی شکل میں سپید شال اوڑھے تھے، ایسے خوبصورت اور جامہ زیب آدمی میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔

بہت تپاک سے ملے اور اُٹھا کے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ برآمدے میں سے گذرتے ہوئے فرمایا، آپ نے خط کیوں نہ لکھا؟ اسٹیشن سے یہاں پہنچنے میں تکلیف ہوئی ہوگی آپ کو؟ مکان تو آسانی سے مل گیا تھا؟ آپ نے لکھا ہوتا تو میں کسی کو اسٹیشن پر بھیج دیتا۔ غرض اسی طرح تابڑ توڑ انھوں نے تین چار سوال کر دئے، لیکن لہجے میں کسی طرح کی عجلت اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ بلکہ آواز بہت نیچی تھی، اور ایک ایک لفظ انھوں نے علیحدہ علیحدہ کہا، کمرے میں پہنچے تو چھوٹتے ہی فرمایا، میں تو آپ کو زیادہ عمر کا خیال کرتا تھا، آپ تو ماشاء اللہ بالکل جوان ہیں۔ میں نے عرض کیا، قبلہ، جوانی کی بھی ایک ہی کہی، ساری عمر جس ماحول میں بسر ہوئی ہے وہاں یہ معلوم نہیں ہوا کہ جوانی کس چیز کا نام ہے "غم عشق تو خیر نہیں" غم روزگار" نے ہمیشہ پریشان رکھا، اس لئے دل جوانی ہی میں بوڑھا ہو گیا ہے۔ کہنے لگے، میں تو آپ کے فارسی کے ذوق پر بہت حیران ہوا۔ ابھی "نسیمِ یقین" کی فرمائش سے جو تعجب ہوا تھا وہی ختم نہیں ہو پایا تھا کہ آپ نے مومن کے فارسی دیوان سے متعلق پوچھ بھیجا، پھر میری فارسی تعلیم کا حال پوچھا۔

فرمایا، میں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے پاس گیا تھا، ایک مدت سے یہ معمول ہے کہ جب یہاں علی گڑھ میں ہوں تو اگر وہ یہاں موجود ہوں تو شام کا وقت اُن کے ساتھ گزارتا ہوں، اور واپسی بالعموم عشا کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ آج معمول سے ذرا دیر ہو گئی۔ پھر اُن کی تعریف اور علم و فضل سے متعلق چند کلمات کہے۔ اس کے بعد موضوع سخن بدل گیا، فارسی اور اردو علم و ادب پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح رات گئے تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ اُن کے آرام میں مخل ہو رہا ہوں، لیکن وہ اتنی محبت اور دلجمعی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اگر وہ اس میری بے وقت کی ہرزہ سرائی سے بے آرام کبھی ہوئے تو انھوں نے قطعی کسی طرح اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آخر آدھی رات کے قریب میں نے باتوں باتوں میں اشارہ کیا تو نہایت لطف سے فرمایا، ارے، آپ کی دلچسپ باتوں میں مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سفر سے آئے ہیں۔ تھکے ماندے ہوں گے، اچھا اب آپ آرام کیجیے۔ کل صبح انشاء اللہ حبیب گنج چلیں گے۔ میں نے عرض کیا، یہ دو تین گھنٹے کا گاڑی کا سفر ہی کونسا ایسا سفر تھا کہ میں تھک جاتا۔ آپ کی تکلیف کا خیال ہو رہا ہے۔ بہرحال ہم نے ایک دوسرے سے شب بخیر کہا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس دوران میں باہر بارش زیادہ سنجیدگی سے ہونے لگی تھی، اور ساتھ ہی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ بدقسمتی سے میرے کمرے کے ایک روشندان میں کچھ خرابی تھی، یہ پوری طرح بند نہیں ہوتا تھا اور ہوا سے اس کا پٹ کھٹکھٹاتا تھا، رات بھر اس بے ہنگم آواز کے باعث میں ٹھیک طرح سو نہیں سکا۔ خیر صبح کو اٹھا، حمام میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ نہایا دھویا، ناشتے کے بعد ہم نواب صاحب کی موٹر پر حبیب گنج کے لئے روانہ ہوئے۔ اگرچہ بارش ختم ہو چکی تھی۔ لیکن ہوا میں خاصی نمی تھی۔ اور سردی بھی خوب چمک گئی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ ہم تین آدمی تھے۔ نواب صاحب اور اُن کے مصاحب مُلّا احمد اور میں۔ نواب صاحب اور میں پچھلی طرف بیٹھے اور مُلّا احمد صاحب، ڈرائیور کے برابر میں آگے بیٹھ گئے۔ سڑک بہت خراب تھی، اس کا اکثر حصہ پہلے ہی سے شکستہ تھا۔ رہی سہی کسر رات کی بارش نے پوری کر دی۔ گڑھوں میں پانی بھر گیا تھا، اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں کیچڑ ہو رہا تھا۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم افتاں خیزاں حبیب گنج پہنچے۔ علی گڑھ

سے ہم ناشتہ کرکے چلے تھے اور دوپہر کے کھانے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس لئے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ پہنچتے ہی نواب صاحب نے کتب خانہ کھولنے کا حکم دیا مہتمم صاحب آگئے۔ ملازموں نے کرسیوں کو جھاڑا پونچھا اور ہم داخل ہوئے۔

اللہ اللہ، اب میں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ ہر طرف ہزاروں بیش قیمت کتابیں قرینے سے الماریوں میں چُنی رکھی تھیں۔ غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر پچھلے شاعر کے ہاں کوئی ایسا مضمون بندھ گیا ہے جو میرے یہاں بھی پایا جاتا ہے تو اس سے یہ خیال نہ کرو کہ مجھے اس سے توارد ہوگیا ہے بلکہ یقین جانو کہ اس نے نہاں خانۂ ازل سے میرے مضمون کی چوری کرلی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اس وقت ہوتا ہے، جب میں کسی جگہ کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے، جیسے غلطی سے میرے حصے کی چیز یہاں آگئی ہے۔ اور یہاں تو ایک دو نہیں ہزاروں کتابیں میرے اردگرد پڑی تھیں ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

نواب صاحب کا عجیب عالم تھا، وہ ایک کتاب منگواتے۔ مجھے دکھاتے اور پھر اس کی خصوصیات گنوانا شروع کرتے۔ یہ ملک الشعراء طالب آملی کا دیوان ہے۔ اس میں بہت سا کلام خود طالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس طرف میری توجہ علامہ شبلی مرحوم نے دلائی تھی۔ میں نے جب یہ دیوان خریدا ہے تو محض قدامت اور کتابت کی خوبی کے باعث۔ لیکن اُنھوں نے اسے دیکھ کر لکھا کہ اس میں بہت سی تحریریں خود طالب کے ہاتھ کی ہیں۔ دیکھئے یہ سرخ روشنائی کی تحریر طالب کی ہے۔

یہ مثنوی کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ جہاں تک معلوم ہوسکا اس سے قدیم تر نسخہ جرمنی کے شہر میونچ (صحیح تلفظ میونخ ہے) کے کتاب خانے میں ہے۔ جو اس سے صرف چھ برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ پورا نسخہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے کتاب خانے میں رہا ہے۔ یہ رہیں اُن کی مہریں۔ صاف پڑھا جاتا ہے "محمد اورنگ زیب بادشاہ"۔

یہ شیخ سعدی کی بوستاں ہے۔ اس پر اودھ کے تین بادشاہوں کی مہریں ہیں۔ نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ۔

چند دن پہلے ایک تازہ فتوح آئی تھی۔ مُلّا سعد الدین تفتازانی کی مطول۔ مہتمم سے کہہ کے اُسے منگوایا۔ اس کے شروع میں پانچ چھ سطریں اس شان سے لکھی تھیں کہ آدھی عبارت بہت قدیم اور مغشوش تھی اور آدھی تازہ (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حصّہ خود نواب صاحب نے پورا کیا تھا) پاس ہی میز پر مکبّر شیشہ پڑا تھا۔ اٹھایا اور اُسے میرے ہاتھ میں دے کے فرمانے لگے۔ دیکھئے تو یہ عبارت پڑھ سکتے ہیں۔ میں رُک رُک کے پڑھنے لگا۔ آخر میں "نور الدین بن اکبر شاہ غازی" کے الفاظ تھے۔ گویا یہ خود جہانگیر کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ اور اسی لئے انھوں نے مجھے اس کے پڑھنے کے لئے کہا تھا۔ بابر بادشاہ کے بیٹے کامراں کا دیوان اس سے تھوڑے دن پہلے شائع ہوا تھا، اس کے ساتھ بعض ایسے صفحوں کے عکس دیئے گئے ہیں جن پر مغل بادشاہوں کی تحریریں یا دستخط ہیں۔ میں اسے دیکھ چکا تھا۔ مطول کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ جہانگیر کا سوادِ خط بالکل وہی ہے جو کامراں کے دیوان میں ہے۔ یہ سنکر بہت مسرور ہوئے، اور کہا تو آپ نے کامراں کا دیوان دیکھا ہے۔ پھر اسے بھی منگوایا اور ہم دونوں کو دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

غرض ہم دیر تک اس جنت نگاہ کے نظارے میں مشغول رہے۔ وہ کتاب نکلواتے اُسے دکھاتے اور اُس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے اس کی کسی طرح کی اہمیت واضح ہوتی تھی تو خوشی کا اظہار فرماتے۔ وہ مجھے کتابیں اس طرح دکھا رہے تھے جیسے میں کوئی بہت بڑا مبتصر یا صاحبِ علم و فن ہوں۔ وہ ہر طرف سے بے پروا ہوکر یوں کتاب پر کتاب نکلوا رہے تھے، گویا آج پہلی مرتبہ انھیں کوئی کتابوں کا قدردان ملا ہو، اور میں اپنی بے مائگی اور اُن کی ذرّہ نوازی پر عرق عرق ہوا جارہا تھا۔ حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کا شعر ہے ؎

یاراں زہر بانی دانند، ہر چہ دانند
ما خوب می شناسیم اے دردؔ آنچہ مائیم

عربی کے مشہور شاعر متنبّی نے ایک شعر میں اپنی دو دلچسپ چیزوں کا ذکر یوں کیا ہے ؎

وخیرُ مقامٍ فی الدنیٰ سرجُ سابحٍ
وخیرُ جلیسٍ فی الزّمانِ کتاب

یعنی دنیا میں بہترین نشست برق رفتار گھوڑے کی زین ہے اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے۔

یہی دوسرا مصرع کتب خانے کا طغرا ہے۔ ربڑ کی ایک تکونی مہر میں یہ کندہ تھا اور جو کتاب یہاں داخل ہوتی اس پر یہ مہر لگائی جاتی تھی۔

آخر ہم اندر سے نکل کر باہر کے برآمدے میں آکے بیٹھ گئے۔ یہاں دیوار پر مختلف تصویریں، نقشے، مرقعے وغیرہ لٹک رہے تھے۔ ہندوستان کا ایک پرانا اور دلکش قلمی نقشہ تھا جس میں ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی زرعی پیداوار اور حیوانات بھی تصاویر میں دکھائے گئے تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم کو آخری زمانے میں مصوری کا بھی شوق ہوا تھا۔ یہاں اُن کی دستکاری کے بھی چند نمونے دیکھے۔ تصویریں فنی پہلو سے تو واجبی ہی سی تھیں۔ البتہ تبرک ضرور تھیں۔ شروع میں غالب کے جس خط کا ذکر کر آیا ہوں وہ بھی موجود تھا۔ اس خط کے آخر میں تاریخ تحریر ۱۸۰۲ء لکھی ہے، جو بداہتہً غلط ہے۔ دیر تک اس پر بحث ہوا کی کہ ٹھیک تاریخ کیا ہے۔ بہرحال کچھ فیصلہ نہ ہو سکا، اور ہو بھی کیسے سکتا تھا محض قیاس آرائی ہی تو تھی۔ ثبوت کیسے مہیا کیا جا سکتا تھا۔ "ذکرِ غالب" کے ساتھ میں نے غالب کی جس تصویر کا عکس دیا ہے وہ میں نے یہیں سے لی تھی۔

اتنے میں ظہر کا وقت ہو چلا تھا۔ فرمایا، اگر کھانے کے بعد مطالعہ کے لئے کوئی کتاب لینا چاہیں تو نکلوا لیجئے۔ میں نے گذارش کی کہ "سبدِ چین" کا مطبوعہ نسخہ دلوا دیجئے تاکہ جو نقل آپ نے بھجوائی ہے اس سے مقابلہ کر سکوں۔ نیز مومن کا فارسی دیوان۔ کتابیں آئیں اور ہم باہر چلے آئے۔ میں اپنے کمرے کی طرف گیا اور وہ مسجد کی طرف۔

"سبدِ چین" کی پہلی ۱۸۶۷ء والی اشاعت میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں، اور اس کے آخر میں غلط نامہ لگوایا گیا تھا۔ سوءِ اتفاق سے حبیب گنج والے نسخے سے یہ غلط نامہ غائب تھا۔ اس لئے میں پوری تصحیح نہ کر سکا۔ آخر میں نے یہ کام ہارڈنگ لائبریری (دہلی) کے نسخے کو دیکھ کر کیا تھا، اس کے باوجود میرے شائع کردہ ایڈیشن میں بعض غلطیاں رہ گئیں، جن کا مجھے افسوس ہے۔

تھوڑی دیر بعد ملّا احمد مجھے کھانے کے لئے بلانے آئے۔ دسترخوان کاڑھی کا ایک نیچا سا تخت تھا۔ اس پر سپید چاندنی۔ تخت کے چاروں طرف گدّے تھے۔ ہم لوگ ان پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب مغفور، دسترخوان کے ایک سرے پر تھے۔ اُن کے سیدھے ہاتھ پر اُن کے خلف اکبر خان بہادر محمد عبید الرحمٰن خاں صاحب تھے۔ اور اُن کے بعد ملّا احمد۔ میں نواب صاحب کے بائیں طرف تھا۔ میرے برابر میں ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ بس ہمیں پانچ کھانے پر تھے۔

کھانے میں قورمہ پلاؤ تھا۔ مرغ کا سالن تھا، شامی کباب تھے۔ ترکاری تھی۔ ملازم نے نواب صاحب کے سامنے ایک رکابی میں کوئی خاص چیز لاکے رکھی۔ یاد نہیں رہا کہ کیا تھا۔ انھوں نے اس میں سے ایک اور رکابی میں تھوڑا سا نکال کے مجھے عنایت فرمایا۔ کھانے کے دوران میں بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد کچھ مٹھائی آئی۔ جناب خان بہادر نے یہ کہہ کے مجھے پیش کی کہ شوق فرمائیے۔ بازار سے نہیں آئی، بلکہ خانہ ساز ہے۔

کھانے کے بعد نواب صاحب آرام کے لئے اندر تشریف لے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور مومن کا دیوان دیکھتا رہا۔

چار بجے کے لگ بھگ میں پھر بڑے کمرے کی طرف گیا۔ نواب صاحب تلاوت سے فارغ ہو کر عصر کی نماز کے لئے جا رہے تھے۔ مسجد بڑے پھاٹک کے باہر ہے، جہاں جماعت ہوتی تھی۔ اُن کی واپسی پر رات کے کھانے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ درمیان میں ایک مرتبہ وہ مغرب کی نماز کے لئے اُٹھے۔ لیکن نماز کے بعد سیدھے وہیں واپس آئے۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام اور انگریز ریذیڈنٹ سے اپنی چپقلش کے حالات سناتے رہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاؔد مرحوم کی وضعداری کا ایک قصّہ قابلِ ذکر ہے۔ فرمایا مجھے پان کی عادت ہے، لیکن تمباکو نہیں کھاتا۔ میں جب پہلی مرتبہ مہاراجہ بہادر کے ہاں گیا تو وہ خاصدان میں پان رکھ کے لائے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پان لے لیا۔ واپس جا کے اب دوسری مرتبہ وہ زردہ لے کے آگئے۔ میں نے پھر شکریہ ادا کیا، اور عذر کیا کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ میں حیدرآباد میں بارہ برس رہا اور مہاراجہ بہادر سے اکثر ملاقات بھی ہوتی تھی۔ جب بھی اُن کے ہاں جاتا

وہ پہلے پان کی گلوری لاتے جو میں لے لیتا۔ پھر تمباکو لاتے۔ میں شکریہ کے ساتھ عذر کر دیتا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ لیکن کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ اُنھوں نے مجھے تمباکو پیش نہ کیا ہو۔

اس پہلی ملاقات کے موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں مندرجہ ذیل عبارت رقم فرمائی۔

براہِ دوستیہا ہر کہ بے منّت قدم ساید
بہر گامیکہ بردارد، از و پائے زمن چینے

کتبہ حبیب الرحمٰن

بفرمائش مالک رام صاحب بوقت ورود ِ ایشاں در حبیب گنج
۲۷۔ شوال المکرم ۱۳۵۶ھ مطابق ۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۷ء

اگلے دن میں واپس دہلی چلا آیا۔ چلتے وقت آپ نے اپنی تصنیفات کا مجموعہ میرے ساتھ گاڑی میں رکھوا دیا۔ یہاں آنے کے تھوڑے دن بعد میں نے پہلے "سبد چین" اور پھر ذکرِ غالب شائع کیں۔ دونوں کے نسخے میں نے اُن کی خدمت میں بھیجے، حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے بہت تعریف کی۔

(۲)

اتفاق سے میں ۱۹۳۹ء میں ملک سے باہر چلا گیا۔ جنگ کا سارا زمانہ باہر ہی رہا، اور ۱۹۴۶ء کے اواخر میں واپس وطن آیا۔ اس تمام دوران میں خط و کتابت کا سلسلہ ہمارے درمیان جاری رہا۔ میں جب لوٹ کے آنے والا تھا تو اُنھوں نے لکھا کہ واپس آؤ تو حبیب گنج ضرور آنا۔ چنانچہ میں تعمیلِ حکم میں فروری ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ گیا۔ میں نے جانے سے ایک دن پہلے تار سے اُنھیں اپنے آنے کی اطلاع دی۔ میں صبح کی گاڑی سے گیا تھا۔ کوٹھی پر پہنچا تو نواب کے بھتیجے جناب عبد الوحید خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے مجھے پہچانا نہیں جو اتنے دن کے وقفے کے بعد کچھ ایسا غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ بہر حال ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب قبلہ حبیب گنج میں ہیں۔ میں فوراً دادوں جانے والی لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ اب رستے کا حال کیا بیان کروں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پچھلے دس برس میں سڑک کی مرمت تک نہیں ہوئی۔ بلکہ اب اسے سڑک کہنا ہی غلط تھا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ دونوں طرف کھیت تھے اور اُن کے بیچ میں ایک خاصی چوڑی روش تھی جس پر بہت باریک مٹی کی چھ انچ موٹی تہ جما دی گئی تھی۔ موٹر کے پیچھے پیچھے گرد و غبار کا ایک طوفان چھایا ہوا تھا، اور اگر بد قسمتی سے کہیں سامنے سے بھی کوئی لاری یا موٹر آ نکلتی تو پھر خود ہی تصوّر کر لیجیے کہ مسافروں پر کیا گزرتی ہوگی۔ سفر کا آخری ڈیڑھ دو میل کا ٹکڑا اِکّے یا تانگے پر طے کرنا تھا۔ یہاں میں اڈے پر اُترا اور ایک تانگے پر بستر رکھ کر آگے روانہ ہوا۔ لیکن یہ راستہ بھی اتنا خراب تھا کہ ہچکولوں کے مارے میری طبیعت خراب ہونے لگی، لاچار دو تین فرلانگ کے بعد میں اُتر کھڑا ہوا۔ باقی مسافت میں نے پیدل پوری کی، اور سامان تانگے پر آیا۔

میں ڈھائی تین بجے کے قریب حبیب گنج پہنچا۔ نوّاب صاحب حرم باہر کے مغربی برآمدے میں فرش پر بیٹھے حسبِ معمول تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ میں مُلّا احمد صاحب کو آداب عرض کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ جب تلاوت سے فارغ ہوئے تو میں نے جُھک کے سلام عرض کیا۔ چونکہ اب اونچا سننے لگے تھے اس لئے سنا نہیں۔ مُلّا احمد صاحب نے کہا کہ ذرا اونچا کہئے۔ چنانچہ میں نے منہ کان کے قریب لے جا کے خاصی اونچی آواز سے دوبارہ کہا آداب عرض کرتا ہوں۔ چند لمحے تک غور سے دیکھا، میں نے بھی نام نہیں بتایا اور چپ چاپ اُن کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ یک لخت پہچان کے سروقد کھڑے ہوگئے اور لپٹا لیا۔ اللہ اکبر اس معانقے کی گرم جوشی سے اب تک لذّت اندوز ہو رہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ میرا تار انھیں موصول نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ چونکہ تار میں نے حبیب گنج کے پتے سے بھیجا تھا۔ وہاں سے جناب عبد الوحید خاں صاحب نے آگے دستی روانہ کر دیا۔ چنانچہ میرے پہنچنے کے آدھ پون گھنٹہ بعد ایک شخص ڈاک لے کے آیا، اسی میں تار بھی تھا۔

نواب صاحب نے ملازم کو حکم دیا، وہ پانی کا لوٹا، صابون تولیا وغیرہ لے آیا۔ میں نے ہاتھ منھ دھویا۔ اتنی دیر وہ میرے پاس کھڑے رہے۔ پھر چائے آئی سب نے پی۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد، عصر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے فرمایا، مغرب کے بعد آپ کی پچھلے سات برس کی رام کہانی سنوں گا، کہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا بسر و چشم، شام کے کھانے کے بعد ہم لوگ بڑے کمرے میں آگئے۔ نواب صاحب اور مُلّا احمد اور میں۔ اگرچہ میں نے

اس چھ سات برس میں شرق اوسط وادنیٰ کے تمام اسلامی ممالک کی سیر کی تھی لیکن زیادہ قیام مصر میں رہا تھا۔ کہنے لگے، دیکھئے صاحب، اردو میں گفتگو نہیں ہوگی۔ آپ اتنے دن مصر میں رہے ہیں یقیناً عربی بہت اچھی بولتے ہوں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بات کی وضاحت کردوں۔ یوں کہنے کو تمام عربی ممالک کی زبان عربی ہے۔ لیکن جب باہر سے کوئی ایسا شخص یہاں آئے جس نے ساری عمر عربی پڑھی ہو اور اپنے آپ کو عربی کا عالم سمجھتا ہو تو اگر وہ یہاں عام لوگوں سے بات چیت کرے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ وہ اُن کی سمجھنے اور انھیں اپنی سمجھانے میں بہت دقّت محسوس کرے گا۔ بات یہ ہے کہ عام بول چال کی بولی، کتابی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اس عوامی زبان (دارجہ) کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی گرامر الگ ہے۔ اس کی لغات الگ ہے۔ اس کا لب ولہجہ الگ ہے۔ غیر ملکی عالموں کو تو چھوڑیئے کہ ان غریبوں نے سوائے کتابیں پڑھنے کے کسی کو بولتے کم سُنا ہوگا۔ خود عربی ممالک کا یہ حال ہے کہ ایک مصری، ایک عراقی کی بات سمجھنے میں مشکل محسوس کرتا ہے، حالانکہ دونوں عربی بولتے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آگیا میرے ایک مصری دوست ہیں، وہ کسی زمانے میں مارسیلز (فرانس) میں مصری قنصل تھے۔ مراکش کا علاقہ، فرانسیسی سلطنت کا حصّہ ہے۔ ایک دن کچھ مراکشی باشندے کسی کام سے اُن کے دفتر میں آئے۔ اب خیال رہے کہ مصر اور مراکش دونوں ملکوں کی زبان عربی ہے۔ فرمانے لگے قسم لے لو، جو میں اُن کی گفتگو کا ایک لفظ سمجھا ہوں، آخر ایک ترجمان بُلانا پڑا، جو طرفین کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا، اور اس طرح معاملہ طے ہوا۔ پھر ہر ایک جگہ کی بولی میں دخیل الفاظ ہیں۔ یعنی دوسری زبانوں کے لفظ، عربی میں ایسے شامل ہوگئے ہیں کہ لوگ انھیں بے تکلف بولتے ہیں، اور قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ نہ ہی اُنھیں یہ معلوم ہے کہ یہ عربی کا نہیں بلکہ کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ مراکش اور تونس میں فرانسیسی اور ہسپانوی کے لفظ راہ پاگئے ہیں۔ مصر میں فرانسیسی اور اطالوی۔ اسی طرح عراق میں فارسی اور ترکی۔ اور یہی حال دوسری جگہوں کا ہے۔ اگر اس بیرونی آلائش سے کچھ محفوظ رہی ہے تو حجاز کی زبان،

لیکن یہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ پھر یہ خرابی عوام ہی تک محدود نہیں بلکہ تعلیم یافتہ اور عالم لوگ بھی جب آپس میں بات چیت کریں گے تو اسی دارجہ زبان میں۔ یوں لکھنے کو ٹھیک لکھیں گے، کیونکہ کتابی زبان نہیں بدلی۔ لیکن بولیں گے یہی عام بولی۔

اسی صورتِ حال کو مدّنظر رکھ کے میں نے عرض کیا کہ مجھے عربی میں بات چیت کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ لیکن بے اختیارانہ میری زبان پر دارجہ کلمات آجائیں گے، جو اوّل تو آپ سمجھیں گے نہیں اور اگر سمجھ بھی گئے تو عربی کا ہے کو یہ اچھا خاصا مذاق بن جائے گا۔ فرمانے لگے، پروا نہ کیجئے۔ چنانچہ ہم پہلے پندرہ بیس منٹ تک عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے کوشش کی کہ حتی الوسع میری زبان نحوی اور صحیح ہو۔ لیکن پھر بھی مشق نہ ہونے کے سبب کہیں کہیں دارجہ لفظ آگئے۔ موضوع سخن اسلامی ممالک کے حالات تھا۔ وہاں کے لوگوں کے دینی اور معاشری مسائل سے متعلق پوچھتے رہے۔ جب میں نے بتایا کہ عوام بہت غریب ہیں اور دولت کی تقسیم بہت غلط طریقے پر ہوئی ہے۔ ملک کا تمام سرمایہ چند خاندانوں میں جمع ہو کے رہ گیا ہے۔ زکواۃ کی جمع یتقسیم کا، حکومت کی طرف سے کوئی انتظام نہیں۔ مغربی سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی بلکہ خلافِ اسلام تمدن ومعاشرت ہر جگہ عام ہے، تو بہت افسوس کرتے رہے۔

اس کے بعد اردو زبان وادب کا سلسلہ چلا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو خطوط قید خانے میں اُن کے نام لکھے تھے اُن کا مجموعہ "غبارِ خاطر" کے نام سے چند ماہ پیشتر شائع ہوا تھا۔ میرے پہنچنے سے تھوڑے دن پہلے ایک اور مختصر کتاب اُن کے ایک عزیز نے مرتب کرکے "کاروانِ خیال" کے عنوان سے چھاپی تھی۔ اس میں مولانا آزاد کے علاوہ اُن کے اپنے خطوط بھی ہیں۔ "غبارِ خاطر" کا ایک بہت خوبصورت ایڈیشن لاہور سے نکلا تھا۔ اس کے آخر میں ایک خط بھی زیادہ ہے جس میں اسلامی موسیقی سے متعلق بحث ہے۔ "کاروانِ خیال" کے ساتھ اس خاص ایڈیشن کا ایک نسخہ میز پر پڑا تھا۔ دونوں کتابوں کو اُٹھایا اور اُن پر دستخط کرکے مجھے عنایت فرمائیں۔ پھر مولانا آزاد کی تحریر وتقریر اور حافظے اور ہمہ گیر شخصیت کی تعریف کرتے رہے۔ مجھے خیال ہوا کہ اُن کی زندگی کے کچھ حالات پوچھوں۔ چنانچہ میں نے اُن کے خاندان، تعلیم اور حیدرآباد کی ملازمت سے متعلق کتنے سوال

گئے۔ جواب دیتے نہیں۔ پھر فرمایا، میرے ایک عزیز نے پچھلے دنوں علی گڑھ کے رسالے معلّٰمعتت میں میرے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں ہیں۔ بہر حال اس پر ایک نظر ڈال کے آپ کو بھیج دوں گا۔ چنانچہ حسب وعدہ یہ پرچہ انھوں نے مجھے بھیجا تھا۔ اس میں بعض اصلاحیں ان کے اپنے قلم سے ہیں بعض کسی اور کے۔

اگلی صبح ہم ناشتے کے بعد کتب خانے میں پہنچے۔ میرے پاس دیوانِ غالب کا ایک نسخہ ہے جس کا پہلا اور آخری ورق غائب ہیں۔ اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کہاں سے اور کب شائع ہوا۔ قرائن سے البتہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ یہ میرزا کی زندگی میں چھپا ہے۔ اس کے آخر میں تیر رخشاں کی لکھی ہوئی تقریظ سے میں نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ یہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا۔ چنانچہ میں نے اسی طرح "ذکرِ غالب" کے پہلے ایڈیشن میں لکھ دیا۔ بعد میں اپنی غلطی پر متنبّہ ہوا۔ اب یہ بات تو صاف ہو گئی کہ ۱۸۵۵ء میں اردو دیوان کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایک نئی اُلجھن پیدا ہوئی کہ آخر میرے پاس جو نسخہ ہے یہ کہاں اور کس سال میں چھپا۔ میں احتیاطاً اسے اپنے ساتھ لیتا گیا تھا کہ اگر کتب خانہ حبیب گنج میں بھی اسی ایڈیشن کا کوئی اور نسخہ ہو تو مقابلے سے یہ معمّہ حل ہو جائے۔ خوش قسمتی سے یہاں ایک مکمل نسخہ موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مطبع احمدی شاہدرہ دہلی والا ۱۸۶۱ء کا نسخہ ہے۔ اس میں بہت غلطیاں رہ گئی تھیں۔ بعض شعر چھپنے سے رہ گئے بعض دوبارہ چھپ گئے۔ کتابت کی غلطیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اسی لئے مرزا نے فوراً مطبع نظامی کانپور میں نیا ایڈیشن چھاپنے کی اجازت دے دی تھی۔

ہمیں کتب خانے میں آ کے بیٹھے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ فرمایا، لیجئے آپ سے متعلق ایک شعر ہو گیا ہے ؎

اے مالکِ ملکِ وفا سیاراں

دل رام تو شد فدائے صد جاں

میں اُٹھ کے آداب بجا لایا اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے عرض کیا کہ اپنی کوئی تصویر ہو تو مرحمت فرمائیے، دیر تک تصویروں کے ذخیرے میں سے تلاش کرتے رہے۔ سب پُرانی چیزیں تھیں، اور ان میں سے بھی کوئی اکیلی تصویر نہ نکلی۔ چونکہ میرا شام کو واپسی کا ارادہ تھا۔ فرمانے لگے چلئے میں آپ کے ساتھ علی گڑھ تک چلتا ہوں، وہیں اکٹھے تصویر اُتروائیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں اتنی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے زحمت کچھ بھی نہیں۔ میں کل تو جانے ہی والا تھا، آج چلا جاؤں گا۔ یوں علی گڑھ تک اور ساتھ بھی رہے گا۔ غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ مجھے کل کسی کام سے الہ آباد جانا ہے۔ لیکن ہمیں حبیب گنج سے روانہ ہوتے ہوتے دیر ہو گئی۔ جاڑوں کے دن، پانچ بجے ہی خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب ہم علی گڑھ پہنچے تو روشنی اتنی کم ہو چکی تھی کہ تصویر اُتروانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں، پھر کسی وقت اُتروا کر بھیج دوں گا۔ اگرچہ یہ افسوس ضرور ہے کہ آپ اس میں نہیں ہوں گے۔

راستے میں گرد و غبار کے طوفان کو دیکھ کے میں نے عرض کیا کہ آج دل بادل کو دیکھ کے فردوسی کے شعر کی حقیقت واضح ہو گئی ؎

ز بس گردِ میداں کہ بر شد بہ دشت

زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

بہت مسرور ہوئے۔ پھر خود حافظے پر زور دے کر شاہنامے کے اسی مقام کے آٹھ دس شعر سنائے۔ میں ان کی یادداشت پر دنگ رہ گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے پیٹے میں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ شاہنامہ اُنھوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہو گا۔ کوئی ایک آدھ شعر کسی جگہ سے حسبِ موقع پڑھ دینا کوئی کمال نہیں۔ یہ ہر کوئی کر سکتا ہے لیکن یوں اچانک ایک شعر سن کر آگے پیچھے کے شعر سنا دینا معمولی بات نہیں۔

مرحوم کی ایک عادت تھی کہ اگر وہ کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے تو عموماً خاموش رہتے یا کوئی اور ذکر شروع کر دیتے۔ اس سفر میں بھی ایک اسی طرح کا تجربہ ہوا۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی مدظلہٗ نے مولانا شبلی کی سوانح عمری "حیاتِ شبلی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی، اس کا پورا مسودہ نواب صاحب مرحوم نے دیکھا تھا، اور انھوں نے اس پر جا بجا اضافے کئے جو کتاب کے ساتھ چھپ گئے ہیں۔ اسی زمانے میں یاروں کو مشغلہ ہاتھ آیا، اور انھوں نے مختلف رسالوں میں شبلی اور عطیہ بیگم کے موضوع پر مضمونوں کا ایک تار باندھ دیا۔ بلکہ یاد پڑتا ہے کہ غالباً حیدرآباد ریڈیو سے ایک تقریر بھی اس موضوع

پرنشر ہوئی تھی جس وقت وہ شاہنامے کے شعر مجھے سنا رہے تھے میرا ذہن "شعر العجم" کی طرف منتقل ہوگیا۔ جس کے پہلے حصے میں مولانا شبلی نے کوئی سو صفحے میں شاہنامے پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ شعر العجم اور شبلی سے مجھے شبلی اور عطیہ بیگم کا "قصہ" یاد آگیا۔ اب مجھے شرارت اور تحقیق کی سوجھی۔ جن اصحاب نے "حیاتِ شبلی" پڑھی ہے، انھیں معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان مدظلہٗ نے اس سے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا، حالانکہ یہ ایسی بات نہیں جسے یوں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہے تو اس کا برملا اعتراف کر لینا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اس سے مولانا شبلی کی عظمت اور وقار میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی، اور اگر یہ غلط ہے تو پھر اس کی مدلل تردید کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر آج یہ مسئلہ صاف نہ ہوا تو پھر قیامت تک نہیں ہوگا۔ اس وقت مولانا شبلی کے تلامذہ اور احباب اور تربیت یافتہ ہمارے درمیان موجود ہیں، جو اس موضوع پر ذمہ دارانہ اور واقعت کارانہ انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے تو بہرحال انہیں کے خوشہ چین ہوں گے۔

ان ہی رعایتوں کے خیال سے میں نے اُن سے سوال کیا کہ کیا آپ نے حیاتِ شبلی میں کوئی فروگذاشت محسوس نہیں کی۔ پوچھا، کیوں آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔ میں نے کہا یہی عطیہ بیگم والے قصے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ ہاں ہوں کر کے رہ گئے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے متعلق گفتگو کرنے پر تیار نہیں۔ اِدھر میں "محض خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جرأتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے پھر کہا۔ مکاتیبِ شبلی میں آپ نے مولانا کے خط مہدی افادی کے نام تو ضرور پڑھے ہوں گے، جواب اثبات میں دیا پھر پوچھا کہ کیا آپ نے مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ بھی دیکھا ہے فرمایا ہاں، ایک زمانہ ہوا دیکھا تھا۔ میں نے کہا آپ نے کتاب خطوطِ شبلی بھی ضرور دیکھی ہوگی (جس میں شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے عطیہ بیگم اور اُن کی بہن کے نام لکھے تھے) فرمایا، ہاں یہ بھی بہت مدت ہوئی دیکھے تھے۔ اب میں نے اتنی تمہیدوں کے بعد سوال کیا کہ مہدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلی کا مجھ سے پردہ نہیں تھا۔ آخر یہ کس بات کی "پردہ داری"

تھی۔ کہنے لگے، مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہوگیا ہے کہ اب ٹھیک طور پر کچھ یاد نہیں۔ میں نے کہا، اچھا یہی سہی۔ لیکن آپ اصحاب کی یہ کامل خموشی بھی تو شک پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے لگے فائدہ۔ میں نے جواب دیا، فائدہ یہ کہ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ کل کے مؤرخ کے لئے روشنی مہیا ہو جائے گی، اور اس کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں نے گستاخانہ جسارت سے کام لیتے ہوئے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ میں نے کہا قرآن کہتا ہے "لا تکتموا الشہادۃ"۔ کسی سلسلے میں اگر تمھیں کچھ بات معلوم ہو تو اس کے اظہار سے دریغ نہ کرو اور اُسے مت چھپاؤ، اور آپ حضرات ہیں کہ سب کچھ جانتے ہوئے خاموش ہیں۔ اور پوچھنے پر بھی نہیں بتاتے۔ لیکن صاحب یہ وار بھی خالی گیا۔ وہ ہنس کے ٹال گئے۔ اتنے میں ہم علی گڑھ پہنچ گئے۔

میں شام کی گاڑی سے واپس دہلی چلا آیا۔ اس موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں تحریر فرمایا تھا۔

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما
ذکرِ تو بود زمزمۂ شادیٔ ما

بفرمائش مالک رام صاحب بوقتِ ورود مکرر بمقام حبیب گنج

فی البداہہ

اے مالکِ ملکِ وفائے یاراں
دل رامِ تو شد فدائت صد جاں

حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ
حبیب گنج، ۲۷۔ فروری ۱۹۴۷ء

یہ میری اُن سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے جلد بعد ہی میں دوبارہ ملک سے باہر چلا گیا۔ پہلے خط و کتابت برابر جاری رہی۔ لیکن پھر بہت بے قاعدگی پیدا ہوگئی۔ بلکہ آخری سال میں تو بالکل بند ہو گئی تھی۔ لکھا کہ اب کچھ لکھتا ہوں تو انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی بارِ خاطر ہونا پسند نہ کیا۔ جناب عبدالوحید خاں صاحب سے ان کی خبر برابر ملتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن اُن کا خط ملا کہ وہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء کو جمعہ کے دن صبح کے سات بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے، انا للہ

وانا الیہ راجعون۔

(۴)

موت بنی آدم کی میراث ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ وہ طبعی عمر گزار کر وہاں گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ وفات کے وقت عمر ۸۴ برس تھی۔ یعنی کتابِ مقدس کی حد سے بھی ۱۴ برس زیادہ۔ تو اس پہلو سے کوئی افسوس نہیں۔ یہ مرحلہ ٹالے ٹل نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور پیش آتا۔ وہ رئیس بن رئیس تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی عمر رئیسوں کی لغویات میں ضائع نہیں کی۔ علم کو اس طرح حاصل کیا جس طرح اس کا حق ہے۔ پھر ملک کا علم و عمل کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہوگا جو اُن کی مادی یا معنوی امداد سے شاد کام اور فیض یاب نہ ہوا ہو۔ یہ بھی قابلِ فخر بات ہے۔ لیکن افسوس ہے تو اس بات کا کہ اب ان سا انسان نہیں ملنے کا جس دور کی وہ پیداوار تھے وہ دَور ہی ختم ہوگیا۔ اب اُن کے سے انسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ایک آدھ اِدھر اُدھر صورت جو اس دَور کی یادگار باقی ہے، وہ بھی جھلملاتی شمع ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گُل، اس کے بعد گھُپ اندھیرا۔

زمانے نے اپنا ورق اُلٹ دیا ہے۔ آج محبّت اور خلوص، دوستی اور وفا۔ اخلاق اور قدردانی، علم اور فن، دین اور دنیا، غرض ہر چیز کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ مرحوم اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ جسے ہم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو وضعداری سے بہتر لفظ نہ ملے۔ وضعداری، ایک قانون، ایک ضابطے کا نام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس طرح کسی شخص سے آج ملے ہیں، اسی طرح آج سے پچاس برس بعد بھی ملیں گے۔ زندگی کا جو اصول آپنے بنا لیا ہے اب کوئی طاقت آپ کو اس سے اِدھر اُدھر نہیں کرسکتی۔ آپ کی دوستی بھی کسی اصول پر مبنی ہوگی، اور مخالفت بھی۔ یہ نہیں کہ جدھر کی ہوا ہوئی اُسی طرف پھر گئے۔ اسے ہم "وفاداری بشرطِ استواری" سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ مرحوم اسی اصول کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اب یہ تصویر پھر نظر نہیں آئے گی۔ میر کا ایک شعر یاد آگیا۔ اسی پر ختم کرتا ہوں۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیئے گا
جب کہتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

جوش ملسیانی

غزل

آگ ہے آگ تری تیغِ ادا کا پانی — ایسے پانی کو میں ہرگز نہ کہوں گا پانی
نہ رہے آنکھ میں بھی دل سے نکل کر آنسو — جا بہ جا اُن کے لئے پھرتا ہے دانہ پانی
کر دیا سب کو ترے تیرِ نظر نے سیراب — جس کے سینے پہ لگا اس نے نہ مانگا پانی
حال پوچھو نہ مرے گریۂ غم کا مجھ سے — اس کے کہنے سے بھی ہوتا ہے کلیجہ پانی
ترکِ مے خانہ گوارا نہ کروں گا ہرگز — راس ہے میری طبیعت کو یہاں کا پانی
سوزِ غم ہی سے مری آنکھ میں آنسو آئے — سوچتا ہوں کہ اسے آگ کہوں یا پانی
مے کی چھینٹوں سے تو ٹوٹے گی نہ بے ہوشیِ شیخ — خلد سے لاؤ کسی حُور کے رخ کا پانی
تابشِ حُسن سے پُر آب ہے عالم سارا — نور برسا ترے جلووں سے کہ برسا پانی
تیرے ہی جلوے سے ہے باغِ تمنا کی بہار — یہی تنویر ہے آئینۂ دل کا پانی
ڈوب جاتے ہیں امیدوں کے سفینے اس میں — میں نہ مانوں گا کہ آنسو ہے ذرا سا پانی
خلشِ غم سے کئے جاؤں کہاں تک نالے — میری قسمت میں تو ہر وقت ہے ایذا پانی
ضبطِ گریہ سے بڑھی اور مصیبت اے جوشؔ — دل یہ کہتا ہے کہ اب سر سے ہے اونچا پانی

علی عباس حسینی

نبی بخش

نبی بخش ابا میاں کے خاص ملازم تھے۔ اور ہم آٹھ بھائی بہنوں کے معلم اتالیق۔ نگراں۔ ناصح، واعظ، آیا، نرس، آتوجی۔ گورنس، مردانے زنانے ہر قسم کے بزرگ، ان کا چار فٹ تین انچ کا قد، ان کا سوکھا جسم، ان کا دھوئیں میں پکایا ہوا کالا رنگ۔ ان کی چھدری ڈاڑھی۔ اُن کا گھٹا ہوا سر، اُن کا غصّے میں لمبی لمبی سانسیں لینا، اور ان کا بات بات پر چڑچڑانا، ہم میں سے ہر ایک کو انھیں چھیڑنے پر اُکساتا تھا۔ دل میں گدگدی سی پیدا ہوتی کہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو کہ نبی بخش کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگے۔ چنانچہ شرطیں لگتیں؛ سازشیں ہوتیں۔ دیکھیں آج اُنھیں چھیڑنے کی کون جرأت کرتا ہے۔ کون خود سے ان کے غصّے کا نشانہ بنتا ہے۔ کس میں اتنی ہمت ہے کہ وہ نبی بخش کی جھڑکیوں کا ہدف آپ ہی آپ بن بیٹھتا ہے۔

لیکن یہ سب ہانڈیاں نبی بخش کے پیٹھ پیچھے ہی پکتیں۔ جہاں ان کی آنکھوں سے آنکھیں لڑیں اور معلوم ہوا جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہم میں سے وہ بھائی بہن بھی جو خاصے سیانے ہو چکے تھے سہم کر خاموش ہو جاتے، سُکڑ کر بیٹھ جاتے۔ پھیلی ہوئی ٹانگیں سمیٹ لیتے۔ اچکن کے اُلٹے پلٹے دامنوں کو برابر کر لیتے۔ سر ڈھلے ہوئے دوپٹوں کو ٹھیک سے اوڑھ لیتے۔ لٹکے ہوئے ازار بندوں کو کمر میں ٹھونس لیتے۔ اور بہتی ہوئی ناکوں کو بجائے سُڑکنے کے جلدی سے چھنک کر ہاتھ دامن میں پونچھ لیتے۔

اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو اُن کی آنکھیں۔ وہ چیاں سی، چھوٹی چھوٹی زرد زرد تھیں۔ بالکل جیسے عقیق۔ ہنستے وقت ان میں کس طرح کی چمک پیدا ہوتی تھی یا ان کا کیسا رنگ ہو جاتا تھا۔ ہم نے کبھی دیکھنے کی ہمت نہ کی۔ بھائی جان، جو ہم میں سب سے بڑے تھے اور نبی بخش کے سب سے پیارے، کہتے تھے نبی بخش کی آنکھیں ایسے موقعوں پر اس لئے نہیں دکھائی دیتی تھیں کہ وہ انھیں خُرخُر کرتی بلّی کی طرح بند کر لیتے تھے۔ ایسے میں بھی پلکوں کے جوف سے اُن کے دیدے ہماری شرارتوں کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ جہاں کسی بچّے نے نامناسب طور پر ہاتھ پاؤں ہلایا، پلکوں کا پٹ کھُلا اور نبی بخش کی آنکھیں جم کر پتھر بن گئیں۔ بالکل اسی تقطیع جیسا جو اُمّی بڑی احتیاط سے وظیفے والی کتابوں کے جُزدان میں رکھتی تھیں اور ہمارے گلوں میں اس وقت ڈالتی تھیں جب ہم میں سے کسی کا پیٹ چلنے لگتا تھا۔ یشب کا یہ تعویذ ہمارے لئے بڑی ڈراونی چیز تھا۔ اس کے گلے میں پڑنے کے معنی تھے تین دن تک کھانا بند ہوتا۔ نبی بخش کے زرد زرد دیدوں کا بھی کچھ ایسا ہی اثر ہوتا تھا۔ بس جہاں وہ جم کر ایک جگہ تھمے اور ہمیں یقین ہوا نہ اب وہ ہلیں گے، اور نہ ہمیں کھانا ملے گا۔ اسی لئے اُن کی ان آنکھوں سے ہماری روح سلب ہوتی تھی۔ وہ خاموشی میں بھی چیخ چیخ کر کہتی: "اچھا، تو تم نے پھر شرارت کی؟ تم دنیا اوپر ہاتھ پاؤں نکال رہے ہو! تم نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا ہے۔ اچھا ٹھہرو! ہم تمھیں سزا دیا ہی چاہتے ہیں! آج جو اچھی چیز ہم نے پکائی ہے، اس سے تم بالکل محروم!"——

اور آپ جانتے ہی ہیں پیٹ کی مار، سب سے بڑی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے طُرّم خاں کو سیدھا بنا دیتی ہے۔ ہم بچّوں کی کیا بساط تھی کہ اس کا مقابلہ کرتے۔ ہم کو تو محض دھمکی ہی چت پٹ کر دیتی۔

اگر کسی بچّے نے نبی بخش کی آنکھوں کا نادری حکم نہ سنا اور گردن جھکا کر بے پروائی کا ثبوت دیا تو نبی بخش جھپٹ کر اس کا شانہ ہلاتے: "بڑے چالاک بنتے ہو، اچھا چلو ابھی ابّا میاں سے تمہاری شکایت کرتا ہوں"——

بس ہماری ساری خودداری خاک میں مل جاتی۔ ہم بلبلا اُٹھتے۔ بسورنے لگتے۔ نبی بخش کی خوشامد کرنے لگتے: "اب نہیں، میرے اچھے نبّو چچا، اب نہیں، کہہ کہا کر گڑگڑانے لگتے——

اس لئے کہ ابّا میاں ہم لوگوں کے "ہوا" تھے۔ اس لئے نہیں کہ ابّا میاں ہمیں مارتے پیٹتے تھے۔ انھوں نے ہم میں سے کسی کو کبھی پھول کی چھڑی بھی نہیں چھوائی۔ بس ان کی سب سے بڑی سزا یہ تھی کہ وہ کہہ دیتے "جاؤ، میں آج سے تمہارا باپ نہیں!" —— اور یہ چنگیزی فیصلہ سنتے ہی مجرم کی جان پر بن آتی۔ آٹھ بھائی بہنوں کے گھر میں ہر ایک کو یہی دعویٰ تھا کہ ابّا میاں خاص ہمارے باپ ہیں اور ہم کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ کوئی کہتی آج ابّا میاں نے صبح کی نماز ختم کرتے ہی ہمیں الگ بلایا، اور ہم پر دیر تک لمبی لمبی دعائیں دم کیں۔" کوئی بول اٹھتا "کل ہمیں پاس بٹھا کر کھٹیاں کھلائیں اور کہا دیکھو کسی اور سے نہ بتانا۔" تیسرا رپورٹ سناتا "آج ابّا میاں نے ہمیں گود میں لے کر ہمارے گال پر پیار کا طمانچہ مارا۔ پھر کہا تو میرا بڑا اچھا بیٹا ہے"! چوتھی دعویٰ کرتی "واہ وہ مجھے سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ آج ہی تو مجھ سے چپکے سے کہا ہے "میں تیرے لئے بازار سے کھلونے لا دوں گا" ——

بس لاڈ پیار کے اس مقابلے میں سب سے پیچھے رہ جانا "پھسڈی نکل جانا" اور ابّا میاں کی مخصوص ولدیت سے الگ ہو جانا ہمارے لئے سب سے بڑی سزا تھی۔

یہی وجہ تھی کہ نبی بخش سے ہمارا دم ہی نکلتا تھا۔ بلکہ ہم ایک دوسرے کو ڈرانے دھمکانے کے لئے اکثر پکار رکھتے "دیکھو نبی بخش چچا ننھے نہیں مانتے۔ دیکھو ننّو چچا منّی ہمارا گیند نہیں دیتی!" —— اتنا کہہ دینا ہمیں شرارتوں سے باز رکھنے کے لئے کافی ہوتا۔ چھینی ہوئی چیز جلدی سے پھینک دی جاتی، مارنے، مارنے کو اٹھے ہوئے ہاتھ رک جاتے۔ بوٹی اتارتے ہوئے دانت بھینچنے کی جگہ کھل جاتے۔ چوٹیاں کھینچتا ہوا چھوٹا بھائی انھیں سانپ سمجھ کر جلدی سے چھوڑ دیتا۔ اور ہاتھ میں اٹھی ہوئی جوتیاں چپکے سے پاؤں میں پہن لی جاتیں۔

ابّا میاں کو نبی بخش اپنے کام کی وجہ سے پیارے تھے۔ اس بھرے گھر کے وہی داروغہ تھے۔ وہی میر مطبخ۔ وہی خانساماں، وہی سودا سلف لانے والے ملازم —— ابھی باورچی خانے میں آگ روشن کر کے ہانڈیاں چڑھا رہے ہیں۔ ابھی بازار سے دوڑ کر ترکاریاں، گوشت لا رہے ہیں۔ ابھی کمرے کی کرسیاں میزیں جھاڑ رہے ہیں، ابھی بچوں کو الگ الگ دودھ، چاء، ناشتہ دے رہے ہیں، اور ابھی ابّا جان کے لئے گرم گرم روٹیاں اُتار رہے ہیں۔ آدمی نہیں مشین تھے۔ لیکن مشین ہی کی طرح اُن کی زبان بھی چلتی رہتی تھی۔ کیا مجال کہ ایک منٹ کے لئے خاموش ہو جائیں۔

ہونہہ! خوب نبی بخش کو پا لیا ہے۔ ہر سٹے پکارا جا رہا ہے! ایک جان پر کتنے کام ہیں۔ کسی کو نہیں دکھائی دیتا۔ پسواؤں؟ اپنی پیٹھ پر لاد کر گھر لے آؤں۔ چولھا جلاؤں، مسالہ پیسوں، برتن مانجھوں دھوؤں، کھانا پکاؤں، ہر ایک کو کھانا دوں، پھر لونڈے لونڈیاں ہیں کہ بوٹی بوٹی کے لئے لڑتے ہیں۔ "ہمیں سالن کم دیا، ننھے کو زیادہ دیا۔ ہمیں آج چار ہی بوٹیاں" اچھے میاں کو یہی رونا ہے کہ ہر جمعہ کو ترکاری کیوں پکاتے ہو۔ ارے میاں جمعہ کو گوشت نہیں ملتا۔ سارے قصائی اس دن نماز پڑھتے ہیں۔ کہاں سے ہر روز قورمہ کباب لاؤں۔ اغّن ہیں کہ اسی پر منہ پھلائے ہیں کہ ننھے کو پھولدار پلیٹ میں چاول دیا، ہمیں سادی پلیٹ میں۔ لیجئے وہ چھمی بی بی شان والی آئیں۔ وہ چولھے کے پاس بیٹھ کر پیڑھی پر نہ کھائیں گی۔ انھیں میز کرسی چاہیئے۔ ارے بی بی سسرال جانا تو وہاں میاں سے کہہ کے ڈائننگ روم بنوا لینا، خانساماں بیرا رکھنا، سپید اچکن پہنے، پگڑی باندھے، پیٹی کسے۔ کندھے پر تولیہ ڈالے کھانا کھلائے گا۔ یہاں تو بس ایک نبی بخش ہے، وہ کیا کیا کرے۔ بالشت بھر کے ہیں مگر سب نبی بخش کی جان کی آفت ہیں۔ پھر ایک ہو دو ہو تو نام کرتے نہ تھکئے۔ یہاں تو ماشاءاللہ درجنوں ہیں۔ اپنے ہی کیا کم ہیں کہ بھانجے بھی ہیں بھتیجے بھی ہیں۔ نہ میاں کو خیال نہ بی بی کو خیال —— !

آفت کی ماری امّی ادھر سے آ جاتیں۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے جب وہ بیاہ کے آئی تھیں تو نبی بخش سے اُن کا کانا پردہ تھا۔ مگر اب وہ بھی نہ رہ گیا تھا۔ نبی بخش سوتک میں گرم پانی لئے گھسے آتے۔ آخر وہ چھپ کے کہاں جاتیں۔ اب تو جیسے وہ امّی کی سہیلیوں میں داخل تھے۔ ہمارے گھر میں کوئی ماما دائی نہ تھی۔ ایک تو زمانہ ایسا لگا تھا کہ ماما رکھنا ہاتھی پالنا تھا۔ ان کی لمبی لمبی تنخواہیں، اُن کا کھانا، ان کا پان تمباکو، سال میں اُن کے دو دو جوڑے، پھر ان کی چوریاں، ان کی بے ایمانیاں۔ چاہے امّی یہ سب برداشت بھی کر لیتیں، مگر نبی بخش کیسے برداشت کرتے۔ وہ اس سے دوسرے ہی دن سے جھگڑنا شروع کر دیتے۔ خود نہ پان کھاتے نہ سگریٹ پیتے، نہ بازار سے چیزوں کے لانے میں کوئی پیسہ دبا لیتے۔

: بنئے سے کمیشن لیتے : بزاز سے بس جہاں کسی ماما دائی نے ایک پیسے کی بے ایمانی کی اور انھوں نے گھر سر پر اٹھا لیا۔ تم اس گھر میں لوٹنے آئی ہو۔ آٹھ پیسے کا انڈا میں محلے سے لاتا ہوں تمھیں دس پیسے کو کیسے ملا؟ تم بھی جتنا کھا سکتی ہو کھا لو۔ میں تمھیں کوئی ٹکڑا گھر نہ لے جانے دوں گا — نبی بخش کے ہوتے تم میاں بیوی کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتیں۔ تمھیں چوری بے ایمانی کرنا ہے تو دوسرا گھر دیکھو۔ بی بی ان کا حساب کر دیجئے۔ میرے گھر میں ان کا گزر نہیں۔ امی سمجھاتیں تمہارا ہی کام بڑھ گیا ہے۔ یہ تمھیں کہتے ہو تم سے اکیلے اب کام نہیں سنبھلتا ہے۔ نکال دوں تو تمھیں چیخو گے۔ کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں —— !

مگر نبی بخش کسی طرح نہ مانتے۔ میں اس طرح گھر لٹتے نہیں دیکھ سکتا۔ ابھی میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ یہ کیا مدد دیتی ہے مجھے؟ صبح کو نو بجے بی صاحبہ پانچ پھٹر کاتی تشریف لائیں، اس وقت تک میں چائے ناشتہ کرا کے میاں کا کھانا قریب تیار کر چکتا ہوں۔ بس یہ کھڑی ہو کر مکھی جھل دیتی ہیں، پانی پلا دیتی ہیں، تو اب کیا بڑی بٹیا اتنا بھی نہیں کر سکتیں؟ میاں کو ان کی صورت دیکھنے کا شوق نہیں، مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ بس ان کو رخصت کیجئے ...... ! پھر امی کو الگ لے جا کر کہتے "بی بی آپ کے گھر میں سارے بکس کھلے پڑے رہتے ہیں۔ روپے پیسے میاں کی جیبوں میں آپ کے بٹوے میں، پلنگ پر پڑے رہتے ہیں، آپ کو کیا معلوم مجھے یہ عورت ہاتھ چالاک معلوم ہوتی ہے، اس کا رہنا کسی طرح ٹھیک نہیں — ! نبی بخش کی خواہش پوری کی گئی۔ ماما کو جواب دیدیا گیا۔ دوسرے ہی دن سے نبی بخش کا چرخہ پھر چلا "میں اکیلا کتنا کام کروں ...۔ صاحبزادے، صاحبزادیاں ہاتھ بٹانے کا نام نہیں لیتے۔ ذرا سے کام کو کہو تو منھ پھلا دیتے ہیں ...... ہیں تو ماشاء اللہ سے اتنے ڈھیر سے ...... لشکر کے لشکر۔ ! ......

امی نے سن لیا، بس قیامت آگئی "میں کہتی ہوں نبی بخش تم اب سچ مچ سٹھیا گئے ہو۔ تم اپنی جھک جھک میں یہ بھول جاتے ہو کہ تم میرے بچوں کو اب کوسنے لگے۔ اگر ان میں سے ایک کو بھی چھینک آئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا ...... وہ بولے، ارے آپ تو خواہ مخواہ ہی خفا ہو رہی ہیں بی بی! میں نے کیا کہا ......؟

امی دھاڑیں "اے ہے تم نے ابھی کہا "لشکر کے لشکر ہیں" اب اس سے برا کیا کہتے۔ کیا تم انھیں ماں بہن کی گالیاں دیتے ......؟

غرض بات بڑھی۔ نبی بخش نے پتیلیاں اتار کر دھڑا دھڑ زمین پر رکھدیں۔ "تو لیجئے بی بی، اپنا گھر سنبھالئے۔ میں نے بیس برس اپنے کو بیچ کر اچھا صلہ پایا ... ! میاں آئیں گے تو میں اپنا حساب کر لوں گا۔ ! —"

اور وہ پاؤں پٹکتے باہر چلے گئے۔

یہاں گھر کے گھر پر سناٹا چھا گیا۔ ابا میاں سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ امی نے جا کر پتیلیاں چولھے پر پھر سے چڑھا دیں۔ باجی بھی باورچی خانے میں جا کر ہاتھ بٹانے لگیں۔ ہم لوگ سب کھیل چھوڑ کر اپنے اپنے پلنگ پر آکر بیٹھ گئے۔ آج کھانے کی طرف سے سب مایوس تھے۔ نبی بخش نہیں اب ٹھیک طور سے کھانا کیا خاک ملے گا۔ امی کچا پکا اتار لیں گی، اور جو کچھ جیسے دیدیں گی چپکے کھا لینا پڑے گا۔ نبی بخش کی طرح وہ ہر ایک کو چھپا چھپا کر خاص خاص چیزیں دینے سے رہیں۔ اگر ذرا سا بھی ان کے سامنے کوئی منمنایا تو وہ دو ہاتھ جھاڑ دیں گی۔ نبی بخش کا تو زیادہ تو بس اتنا تھا کہ ابا میاں سے کہہ دیں گے۔ مگر وہ کہتے کم تھے، دھمکاتے زیادہ۔ یہاں تو داد نہ فریاد، بس تڑاق سے طمانچہ۔

ابھی ہم لوگ چپ بیٹھے یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ابا میاں آگئے۔ گھر کا گھر پہلے ہی سے خاموش پا کر اور باورچی خانے کی طرف سے بڑبڑاہٹ کی آواز نہ سن کر وہ صحن میں ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے، اور انھیں نے باورچی خانے پر نظر ڈالی۔ دہاں امی منہ تمتمائے اور باجی ہاتھ میں مرچوں کے بھر جانے سے سی سی کرتی دکھائی دیں۔

انھوں نے پوچھا: "ایں نبی بخش کہاں ہیں؟"

امی بولیں "جی، آج وہ نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ انھوں نے میرے بچوں کو دو بھر بنا رکھا ہے۔ ہر وقت کہتے ہیں، بھیڑ کی بھیڑ ہیں۔ خود جو اُن کے آگے پیچھے کوئی نہیں تو وہ چاہتے ہیں کہ سب انھیں کی طرح کوکھ جلی ہو جائیں! ......

ابا میاں نے بات کاٹ کر کہا "تو وہ گئے کہاں۔؟"

امی نے کہا، میں کیا جانوں کہاں گئے۔ پتیلیاں زمین پر پٹکیں اور باہر چلے گئے۔ وہ اس گھر کے نوکر تھوڑے ہیں، ہم سب اُن کے نوکر ہیں۔

ان کا دیا کھاتے ہیں۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

ابا میاں نے "ہوں" کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں نبی بخش آئے۔ آنکھیں سوجی ہوئیں، چہرہ تمتمایا ہوا، سیدھے اپنی کوٹھری میں چلے گئے۔ نہ جانے کیا کھودتے نکالتے رہے۔ ہر مرتبہ جب بکس میں کوئی چیز رکھتے تو ڈھکنا اتنے زور سے بند کرتے معلوم ہوتا جیسے کسی کو ایک پٹڑ مارا۔ کھونٹیوں، الگنیوں پر سے تہمد، جانگیائیں، قمیصیں سمیٹ کر بستر میں باندھیں۔ شیروانی اور بوٹ پہنا اور ابا میاں کے پاس پہنچے۔

میاں میرا حساب کر دیجئے۔

ہم سب لوگ کواڑ کے پیچھے سے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ ابا میاں کتاب پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے نظر اٹھا کر دیکھا ہی نہیں۔ نبی بخش پر غصّے کی جگہ ابا میاں کا ڈر غالب آنے لگا۔

انھوں نے پھر ہمت کر کے کہا، میاں میرا حساب کر دیجئے۔

ابا میاں نے آنکھیں اٹھائیں۔ سر سے پاؤں تک دیکھا۔ عجیب طرح مسکرا کر کہا۔

کچھ دیوانے ہوئے ہو ـ ـ ـ ؟

نبی بخش رونے لگے۔ ابا میاں نے کہا "بیٹھو"۔ وہ اکڑوں زمین پر بیٹھ گئے۔

ابا میاں نے ہمارے کواڑ کی طرف دیکھا، کہا، "جاؤ اپنی امّی کو بلا لاؤ"۔

امی آئیں، غصّے سے کانپتی ہوئی۔ مگر نبی بخش کو یوں روتا ہوا دیکھ کر ان کے بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ابا میاں نے کہا: "میاں نبی بخش تم جانتے ہو اس گھر میں کتنا سخت پردہ ہے۔ میں نے تم کو نوکر نہیں عزیز سمجھا، جو اس طرح بیگم کا سامنا کروا دیا تمھیں شرم نہیں آتی کہ تم ہمیں چھوڑ کر چلا جانا چاہتے ہو۔" نبی بخش اور زور سے رونے لگے۔ ابا میاں نے باجی سے کہا: "لے جاؤ انھیں باورچی خانے میں"۔

انھوں نے اٹھنے میں دیر کی، ابا میاں نے ڈانٹا "جاؤ جی کام کرو!" —

نبی بخش لپکے اتر آئے۔ اور آتے ہی انھوں نے چولھے پر چڑھی ہانڈیوں کو جلدی جلدی دیکھا، کچھ بھونا، بگھارا، پھر ڈانٹ کر بولے۔ یہاں کھانا تیار ہے اور کسی سے آیا نہیں جاتا۔ بس سب کے لئے دسترخوان لگے گا۔ ہونہہ! چلو اچھے، چلو منّی، چلو جی قیصری۔ ہم نے ایک دوسرے کو کہنیاں ماریں، اور باورچی خانے میں گھس، پیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

فضا ابن فیضی اعظمی

فصلِ گل

فصلِ گل آیۂ تنزیلِ کرم ہے ساقی!
یہی شادابیٔ فطرت کا بھرم ہے ساقی!
کشتِ مستی اسی برسات سے نم ہے ساقی!

کھلتے پتّے ہیں کہ دوشیزۂ غنچہ کی نقاب
شاخِ گل ہے کہ کسی مطربۂ نو کا رباب
کروٹیں لیتا ہے سینے میں امنگوں کا شباب

ذرّے ذرّے میں رواں ہے رگِ مینا کا لہو
کر کے میخانے میں فیضِ نمِ صہبا سے وضو
بنشیں با ادب و قرأتِ مینا بشنو

لبِ مینا سے اذانِ طرب نوش سنوں
اور بے سجدہ کئے مسجدِ ساقی سے اٹھوں
پڑھ لوں سبزے کے مصلّے پہ دو رکعت تو چلوں

یہ خرابات کی شب، جشنِ خرابات کے دن
رحمتِ ابر و گل و نغمہ و آیات کے دن
یہ خوش آہنگیٔ فصلِ طرب اوقات کے دن

قدحِ بادہ بدست، ابرِ بہاراں بردوش
لبِ رنگیں کو بناتے ہوئے پیمانۂ نوش
میرے پہلو میں ہے اک دلبرِ میخانہ فروش

مطلعِ جام سے ہے صبحِ جوانی کی نمود
سطحِ اعصاب پہ ہے نشّہ کی کرنوں کا درود
نہ پگھل جائے کہیں اس سے مرا سنگِ وجود

ہیں غلط شوشے غمِ زیست کے میرے نزدیک
لا صراحی کہ نئے زمزمے میرے نزدیک
"فصلِ گل" حاصلِ کونین ہے، میرے نزدیک

سید احتشام حسین

قدیم ہندوستانی مصوّری

گو ہندوستانی مصوّری کے متعلق ابھی کچھ ہی دنوں سے غور کیا جا رہا ہے لیکن اس کی ابتداء بہت قدیم ہے ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم علماء نے اس فن کی فلسفیانہ اور عملی حیثیت کے متعلق کوئی مبسوط یا اہم مقالہ موجودہ دَور کی رہنمائی کے لئے نہیں چھوڑا ۔ جس ملک کی تہذیب کم سے کم پانچ ہزار سال پُرانی ہو، جس نے تہذیبی ارتقاء کے تقریباً سبھی دَور دیکھے ہوں، جو معاشی انقلاب کی کئی منزلوں سے گذرا ہو ۔ جس نے ساڑھے چار ہزار سال قبل موہنجداڑو اور ہڑپّا کی تہذیب کو جنم دیا ہو اور ڈھائی ہزار سال پہلے رگ وید کی تصنیف کی ہو ۔ اس کی مصوّری کی تاریخ بھی یقیناً قدیم ہوگی ۔ جو ذہن ہمالیہ کی عظمت، سندھ، گنگا اور جمنا کی روانی، مناظرِ فطرت کے حسن کے گیت گا سکتے تھے، وہ تصویر کَشی سے عاجز نہ رہے ہوں گے لیکن زمانے کے دستبرد سے ابتدائی نقوش باقی نہیں رہ گئے ہیں ۔ قدیم ترین نمونے اجنتا اور باغ کے غاروں میں دستیاب ہوتے ہیں لیکن دل کہتا ہے جس کی انتہا اجنتا کی مصوّری ہو اس کی ابتداء بہت پہلے ہو چکی ہوگی ۔ علماء نے قبل مسیح کی تصانیف مثلاً دِنے پِٹَک، مہا بھارت اور رامائن وغیرہ میں مصوّری کے حوالے تلاش کئے ہیں ۔ بعض گپھاؤں اور غاروں میں جو جداری نقوش ملتے ہیں ان کی تاریخ بھی قطعی طور پر متعیّن نہیں کی جا سکی ہے اس لئے ہندوستان کی قدیم مصوّری کی کہانی اجنتا ہی سے شروع کی جاتی ہے لیکن اس یقین کے ساتھ کہ یہ مصوّری سیکڑوں سال کے ارتقاء کا نتیجہ ہے ۔

مسلمانوں کے ہندوستان آنے سے قبل یہاں کے فنونِ لطیفہ کا ارتقاء مخصوص قسم کی مذہبی فضا میں ہوا تھا ۔ مختلف تاریخی حالات کے تحت ہندی ذہن نے یونانی اور وسط ایشیائی اثرات قبول کئے تھے بُدھ اور جین مت کی پیدائش نے زبردست تخلیقی لہروں کو جنم دیا تھا اور گو ہندوستان کی قدیم تہذیبی تاریخ کے بہاؤ میں اس سے کوئی زبردست خلل واقع نہیں ہوا تاہم اس کے دیرپا اور دور رس اثرات زبان، ادب اور فنونِ لطیفہ کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ بدھ مت کی ابتدائی سادگی میں پیکر تراشی، مجسمہ سازی یا مصوّری کی کوئی جگہ نہ تھی لیکن چند سو سال گزر جانے کے بعد گوتم بدھ کے متعلق بودھوں کے ایک گروہ میں وہ جذبات پیدا ہوئے، جنھیں پرستش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اسی جذبہ نے ہندوستان کے فنِ تعمیر، نقاشی، بت تراشی اور مصوّری کو اس منزل پر پہنچا دیا جس کی تفسیر مندروں، مٹھوں، استوپاؤں، مجسموں، نقاشیوں اور تصویروں کی شکل میں ملک کے گوشے گوشے میں بکھری ہوئی ہے ۔ اجنتا کے غار اس کی سب سے نمایاں اور شاندار مثال پیش کرتے ہیں ۔

اجنتا کی مصوّری کا ٹھیک زمانہ کون سا ہے ۔ اس کے مصوّر کون تھے، ان کی تعداد کتنی تھی، انھوں نے اس فن کو کہاں سے حاصل کیا تھا ۔ یہ ساری باتیں بحث طلب ہیں ۔ اس میں تو کسی قسم کا شک نہیں کہ یہ کئی صدیوں کی غیر معمولی ریاضت اور روحانی یکسوئی کا نتیجہ ہیں اور بہت سے مصوّروں کے موقلم نے یہ زندۂ جاوید نقش اُبھارے ہیں لیکن ان کا ٹھیک زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا ۔ پہلی صدی عیسوی سے لے کر ساتویں آٹھویں صدی عیسوی تک ان اندھیرے غاروں میں ہزارہا مصوّر اور مجسمہ ساز پہاڑ کاٹتے، مجسّمے تراشتے اور دیواروں اور چھتوں کو تصویروں سے مزیّن کرتے رہے ۔ بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مصوّر اور سنگتراش بدھ بھکشو تھے جنھوں نے اپنی غیر معمولی عقیدت کے اظہار کے طور پر تاریکی میں یہ چراغ جلائے ہیں ۔ لیکن بھکشوؤں کا اعلیٰ ترین فن کار ہونا یا فن کاروں کا عبادت گزار بھکشو ہونا غور طلب مسئلہ ہے ۔ جو بھی ان تصویروں کا خالق رہا ہو اس کا گوتم بدھ کی زندگی اور عام مسائلِ حیات سے زبردست (واقفیت رکھنا ضروری) ہے ۔ کئی سو سال تک مصوّروں کی کئی پشتیں نہ جانے کن لوگوں کی نگرانی میں، کن کی سرپرستی میں ہنگامۂ ہستی سے دور، انقلاباتِ زمانہ سے

---

[1] گذشتہ مضمون "یورپی مصوّری" (آج کل اپریل ۱۹۵۱ء) کی طرح یہ بھی محض تعارفی حیثیت رکھتا ہے ۔ احتشام

بے خبر اپنے کام میں لگی رہیں اور ہمیشہ کے لئے جنوبی ہند میں گوتم بدھ کی تعلیم و تلقین کو پتھروں اور دیواروں میں زندہ بنا گئیں۔ ان کا مفصل "تذکرہ گرفتھ"، ہرنگھم اور غلام یزدانی کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے[۱۵]۔ لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان نقوش میں زندگی اپنی ساری کشمکش اور ہلچل کے ساتھ قید ہوگئی ہے، رزم و بزم، محبت اور نفرت، شاہی شان و شکوہ فقیرانہ بے نیازی، رقص و رنگ، موسیقی اور تصویر کشی، بازار کی چہل پہل اور مذہبی مقامات کا تقدس، ہنگامہ اور سکون اس دنیا کی رونق اور آنے والی زندگی کے لئے مہیا ہے۔ سبھی کچھ ان تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور جوان سب ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصوّر زندگی کی وسعت اور حقیقت کو پا لینے کے آرزو مند تھے۔ اور یہ سب کچھ گوتم بدھ کی زندگی اور تعلیمات سے متعلق ہے۔ انہیں تصویروں میں بدھ اپنی ساری عظمت اور جلال کے ساتھ آتے ہیں، اُن کے الفاظ صرف انسانوں ہی پر نہیں جانوروں پر بھی سحر کرتے ہیں۔ ان کی تلقین بادشاہوں کو فقیر اور فقیروں کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔ اُن کی نگاہ زندگی کے محور بدل دیتی ہے۔ جاتکا کے سارے قصّے اپنی فطری اور مافوق الفطر عظمت کے ساتھ ان دلآویز خطوط میں زندہ ہوگئے ہیں۔

حیرت کے ختم ہونے کے بعد یہ سوالات پھر پیدا ہوتے ہیں کہ یہ مصوّر کون تھے، ان پر منگولی، یونانی اور دراوڑی خیالات اور فن مصوّری کا اثر کتنا تھا، ان مصوّروں کی ٹیکنیک کیا تھی، اندھیرے غاروں میں کام کرنے کے ذرائع کیا تھے۔ اُن کے رنگ انہیں پہاڑوں سے نکلنے والے پتھروں سے بنائے جاتے تھے یا کسی اور چیز سے؟ ان میں اکثر سوالوں کے جواب دئے گئے ہیں پھر بھی ان پُراسرار نقوش کا پورا معمّہ حل نہیں ہوتا کیونکہ یہ ایک یا چند تصویروں کے خطوط، رنگ، موضوع اور اظہار کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ کئی سو سال کی تہذیبی، مذہبی اور سیاسی ارتقاء کا مطالعہ ہے۔ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بکھرے ہوئے سنگتراشی اور مصوّری کے نمونوں کے مطالعہ سے اس تہذیبی دور کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے جو ہندو حکومتوں کی مرکزیت اور وسعت ختم ہونے کے بعد وقوع پذیر ہوا اور تاریخ نے جس پر زیادہ نگاہ نہیں ڈالی ہے۔

اجنتا کا فن بعض نیپالی کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ گوالیار کے مندروں کی دیواروں پر بھی ملتا ہے جن کا زمانہ گیارھویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اتفاق سے کوئی قدیم تاریخ ایسی محفوظ نہیں ہے جس میں ہندوستانی فن مصوّری اور بت تراشی کا تفصیلی تذکرہ پایا جاتا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی کتاب جس میں ایک باب اس کے لئے وقف کیا گیا ہے تبتی مصنف تارا ناتھ کی "ہندوستانی بدھ مت کی تاریخ" ہے جو سنہ ۱۶۰۸ء میں مرتب ہوئی۔ گو اس میں بہت مواد نہیں ملتا تاہم اس سے پتہ چلتا ہے کہ سبھی اچھے مصوّر حقیقت کے قریب رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ تارا ناتھ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ بہت قدیم زمانے سے مصوّری کا سلسلہ ہندوستان میں جاری تھا، تیسری صدی عیسوی میں اس پر کچھ زوال آیا لیکن پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں مگدھ میں اس کا احیاء ہوا۔ مشرق (جس سے غالباً راجپوتانہ مراد ہے) میں بھی اس کی ترقی ہوئی بنگال اور بعد میں کشمیر، نیپال اور برما میں بھی مصوّری کا ارتقاء ہوتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر اجنتا کے بعد ہندوستانی مصوّری کی تاریخ میں ایک خلا سا ملتا ہے کیونکہ اس کے نمونے مفقود ہیں۔

ہندوستانی مصوّری کے ارتقاء کا دوسرا دور سولھویں صدی عیسوی میں مغلوں کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ بعض مبصّروں کا خیال ہے کہ پہلے اور دوسرے عہد میں تقریباً نو سو سال کا وقفہ ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ہاں ایک دور کے عروج اور دوسرے دور میں البتہ یہ مفصل نظر آتا ہے ورنہ درمیانی عہد میں "جین" اور "گجرات" اسکول کے نمونے ملتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تاڑ کے پتوں اور کپڑوں پر ہیں۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد سے یہاں کے تہذیبی ارتقاء میں جو نئی خصوصیتیں پیدا ہوئیں اور جن کا اظہار موسیقی، تعمیر، مصوّری، زبان اور ادب میں ہوا اس کی کہانی بہت طویل اور دلکش ہے اور اس کا بار بار دہرایا جانا ایک حدیث محبت سے کم نہیں تاہم یہاں اُن کے ذکر کا موقع نہیں ہے جو مسلمان ہندوستان میں آئے وہ

---

[۱۵] جب راقم الحروف نے خود اپنی آنکھوں سے اجنتا کو دیکھا تو اس کے علم میں کم اور حیرت میں زبردست اضافہ ہوا۔

مختلف ملکوں سے تعلق رکھتے تھے اُن کی مختلف قومیں تھیں، مختلف تہذیبی مدارج تھے - اسلام لانے کے باوجود اُن میں بعض قومی خصوصیتیں باقی تھیں اس لئے افغانوں، منگولوں، ترکوں، ایرانیوں اور عربوں میں مصوّری کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے - چنانچہ منگولی فن مصوّری نے اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا تھا اور مسلمانوں کے ہندوستان آنے سے قبل بھی ہندوستانی مصوّری کو متاثر کیا تھا - تیمور کے زمانے سے ایرانی مصوّری میں بھی نئی خصوصیتیں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں اور انہیں اثرات کے تحت سولھویں صدی میں بہزاد نے ایران کے فن مصوّری کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا - اس کے تصویر چے دنیا کے خزانۂ مصوّری میں افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں - بابر کے ساتھ جو مصوّر ہندوستان آئے وہ عام طور سے بہزاد ہی کے مقلدی تھے - بہزاد کے قلم میں جو نزاکت، تازگی اور رعنائی تھی - وہ اجنتا کی مصوّری سے مختلف ہونے کے باوجود دونوں کو قریب لانے میں معین ہوئی - ایرانی قلم میں ایک طرح کی زبردست انفرادیت تھی - چنگیز اور تیمور کی روایات کے ساتھ ساتھ انہوں نے بزم آرائی اور شبیہہ کشی میں خصوصیت سے لطافت پیدا کی تھی - جب ہمایوں کو ایک سال کے قریب ایران میں جلا وطنی کی زندگی بسر کرنا پڑی تو اس نے وہاں مصوّری کا بھی مطالعہ کیا اور جب ہندوستان واپس آیا تو اس کے ساتھ ایران کا مشہور مصوّر عبد الصمد بھی تھا - وہ خطاط بھی تھا اور مصوّر بھی - دوسرا مصوّر سید علی تھا جس کے قلم سے مزیّن کی ہوئی کتابیں اب تک متعدد لائبریریوں میں موجود ہیں - یہ دونوں مصوّر ہمایوں کے بعد تک زندہ رہے اور اکبر کے عہد میں انہیں غیر معمولی عزّت نصیب ہوئی - داستان امیر حمزہ جس سے اکبر کو بڑی دلچسپی تھی - انہیں دونوں مصوّروں کی نگرانی میں مصوّر کی گئی - اس میں بہت سی تصویریں خود انہیں کی بنائی ہوئی ہیں - داستان کا یہ مصوّر نسخہ غالباً ۱۵۷۵ء میں مکمل ہوا جس میں کم و بیش چودہ سو تصویریں تھیں اور جس کی تکمیل کے لئے پچاس مصوّروں نے کام کیا تھا - اس میں مختلف انداز کی تصویریں ہیں اور مبصّروں کا خیال ہے کہ ایران کے صفوی بادشاہوں کے زمانہ میں مصوّری کا فن جس نزاکتِ خیال پر زور دیتا تھا اُس کے مقابلہ میں اس نسخہ کی تصویروں میں اصلیت اور زور زیادہ نمایاں ہے - رنگوں کی شوخی بھی ایرانی انداز سے مختلف ہے -

عہدِ اکبری میں ہندوستانی اور ایرانی انداز میں کافی اختلاط ہو چکا تھا - تہذیب کے دوسرے شعبوں کی طرح مصوّری بھی ترقی کر رہی تھی - ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں جن چار اہم ایرانی مصوروں کا ذکر کیا ہے - غالباً انہیں نے ہندوستان کے بہت سے نو عمر اور نئے مصوّروں کو ایرانی قلم کی تعلیم دی اور اس طرح ہند و مسلم مصوّری وجود میں آگئی - فرخ قلماق عبد الصمد شیرازی، سید علی تبریزی اور مسکین کی سرکردگی میں بہت سے مصوّر تیار ہوئے، ہندوستان کے یہ وہی مصوّر ہوں گے جو پہلے سے ہندوستانی طرزِ مصوّری سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہوں گے جبھی تو اُن کی رسائی اکبر کے دربار تک ہوئی ہوگی - آئینِ اکبری میں دسونت، بساون، کیشو لال، مکند، مادھو، جگن ناتھ، مہیش، کھیم کرن، تارا، سانولہ، ہربنس اور رام کے نام ملتے ہیں - تیمور نامہ کا جو قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں ہے اس میں بہت سی تصویروں پر دوسرے مصوّروں کے نام بھی ملتے ہیں - ان میں سے بعض گوالیار کے ہیں - بعض گجرات کے اور بعض کشمیر کے - اس طرح وہ نئی مصوّری وجود میں آئی جو وسطی ایشیا، ایران اور ہندوستان کے اختلاط کا نتیجہ کہی جا سکتی ہے - یہاں ٹھہر کر ایک بات پر اور غور کر لینا چاہیئے - اسلام نے ایک خاص شکل میں تصویر کشی کی ممانعت کی تھی، بعض زمانوں میں اس کی پابندی بھی کی گئی لیکن اکبری عہد میں ابو الفضل کے زرخیز ذہن نے اس ممانعت کی تاویل کر کے اس کے لئے جواز کے دروازے کھول دئے - ابو الفضل نے کہا کہ تصویر بنانا خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز اور بے چارگی کا اعلان ہے، کیونکہ انسان تصویر تو بنا لیتا ہے لیکن جان پیدا کرنا صرف خدا کے اختیار میں ہے - بہر حال اس تاویل کا اثر ہے یا عام تہذیبی ارتقار کا نتیجہ اس زمانے میں مصوّری نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لیں - یہ بات بھی غور طلب ہے کہ عیسائی، بدھ، جین، ہندو مصوری میں جتنی مذہبیت پائی جاتی ہے مسلمان مصوّروں کا فن اس سے خالی ہے - اس کا سبب بھی یہی ہو سکتا ہے -

اکبر کے زمانے کی مصوّری بھی اس کے عام قومی اور سیاسی رجحان کا عکس پیش کرتی ہے - گو موضوعات میں وسعت اور تنوّع نہیں ہے لیکن توانائی اور حسن ہے - اس زمانے کی زیادہ تر مصوّری تاریخوں اور قصوں کی کتابوں میں ملتی ہے لیکن ایرانی مصوّروں کی طرح شبیہیں بنانے کا رواج

بھی تھا اور چھوٹی چھوٹی شبیہوں اور تصویر چوں کی شکل میں اکبر اور اس کے امرار کی بہت سی تصویریں پائی جاتی ہیں ۔

ہندوستانی اور ایرانی یا وسط ایشیائی اثرات کا اختلاط تو ایک عام بات تھی، جس کی طرف ہر مبصر نے اشارہ کیا ہے لیکن اکبر کے عہد میں جو یوروپی اثرات پڑ رہے تھے انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ہندوستانی مصوّروں کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی تصویریں یورپ کے مشہور مصوّروں کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ اسی بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ کی تصویریں یسوعی پادریوں کے ساتھ ہندوستان پہنچنے لگی تھیں اور اکبر کو جو دلچسپی ان پادریوں سے تھی اس کو دیکھتے ہوئے اکبر کا یورپ کی مصوّری سے متاثر ہونا اور اپنے مصوّروں کو اس کی خوبیوں کی جانب متوجہ کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں معلوم ہوتی ۔ یہ اثر جہانگیر کے زمانے میں زیادہ بڑھا لیکن اس کی ابتداء اکبر ہی کے عہد میں ہو چکی تھی ۔ اس دور کے عیسائی سیاحوں نے بار بار لکھا ہے کہ اکبر اور جہانگیر دونوں کے محل عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والی تصویروں سے بھرے ہوئے تھے ۔ مصوّری کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ مغل عہد کی بعض تصویروں میں جو پس منظر پیش کیا گیا ہے اس میں یوروپی اثر بہت واضح ہے کیونکہ یہ پس منظر اور تناظر نہ تو ایرانی مصوّری میں ملتا ہے اور نہ ہندوستانی مصوّری میں ۔

جہاں تک مصوّری کا تعلق ہے جہانگیر اکبر سے بھی زیادہ اس فن کا عاشق اور مبصّر تھا ۔ اس کے لئے یہ بات عام طور سے معلوم ہے اور وہ اپنی تزک میں فخریہ اسے لکھتا بھی ہے کہ اگر کسی تصویر کو دو مصوّروں نے مل کر بنایا ہو تو وہ آسانی سے اُن کے خطوط الگ الگ بتا سکتا ہے ۔ مصوّری سے اس کی گہری وابستگی اور واقفیت کا علم یوروپین سیّاحوں کی کتابوں اور سفرناموں سے بھی ہوتا ہے ۔ یہی نہیں کہ اس کے عہد میں مصوّری اپنے نقطۂ کمال پر پہنچ گئی بلکہ یوروپین مصوّروں کے اعلیٰ کارناموں کی نقلیں بھی اس کے درباری مصوّروں نے کیں ۔ جہانگیر کو اپنے مصوّروں پر ناز تھا اور اس نے انگریزی سفیر سر طامس رو کے سامنے اصل یوروپین اور اپنے مصوّروں کی نقلیں رکھ کر کہا کہ وہ اصل اور نقل میں تمیز کرے جس پر طامس رو نے اپنی شکست کا اعتراف کیا ۔ جہانگیر نے اپنے عہد میں فرخ بیگ، آقا رضا، محمد نادر، بشن داس وغیرہ کی اسی طرح سرپرستی اور عزت کی جس طرح ہمایوں اور اکبر نے اپنے دور کے مصوّروں کی کی تھی ۔ جہانگیر حُسن پرست تھا، مناظر فطرت اور حُسن انسانی دونوں میں اس کے لئے کشش تھی چنانچہ اس کے بعض مصوّروں نے چڑیوں اور پھولوں کی عکس کشی میں کمال حاصل کیا تھا ۔ درباری شکوہ اور سیر و شکار بھی اس کے مصوّروں کے خاص موضوعات تھے ۔ چنانچہ پھولوں اور طائروں کے لئے منصور اور درباری مناظر کے لئے منوہر کے نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ اکبر نے جہانگیر کے لئے ایک مضبوط سلطنت اور ایک اعلیٰ تہذیبی سرمایہ چھوڑا تھا ۔ اس سے جہانگیر کے دور میں فائدہ اٹھایا گیا یہی نہیں بلکہ مصوّری کی روح بھی بدل گئی ۔ عہد اکبری کی حرکت اور زندگی میں سکون اور لطافت کی آمیزش ہو گئی تھی ۔

مصوّری کی یہ ترقی شاہجہاں کے زمانے میں بھی جاری رہی گو اس کا اصل ذوق فنِ تعمیر میں نمایاں ہوا ۔ جہانگیری عہد کے بعض مصوّروں نے اپنے اعلیٰ ترین نمونے شاہجہاں کے عہد میں پیش کئے ۔ گوردھن، محمد نادر، ہونہار، وچیتر، چترمن، رائے انوپ، میر ہاشم اور فقیر اللہ وغیرہ کی بنائی ہوئی تصویریں یوروپی کتب خانوں اور مبصّروں کے پاس ہیں اور ایشیائی مصوّری کے اعلیٰ نمونوں میں شمار کی جاتی ہیں ۔ دوسرے فنون کی طرح مصوّری بھی دربار سے وابستہ تھی اس لئے اس کے موضوعات بھی اسی زندگی سے تعلق رکھتے تھے ۔ داراب نامہ، تیمور نامہ، داستان امیر حمزہ، رزم نامہ (مہابھارت) میں جنگ فتح اور درباروں کے مناظر ہیں ۔ بعد میں شکار، بزم طرب، رقص و سرود، خوبصورت چہرے زیادہ نظر آتے ہیں ۔ اورنگ زیب کے زمانے میں مصوّری کا زوال ہو گیا تھا لیکن خود اورنگ زیب کی بڑھاپے کی تصویریں ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے مصوّری کو ممنوع قرار نہیں دیا تھا آخری مغل بادشاہوں کی تصویریں بھی ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس نے مصوّری کو ممنوع قرار نہیں دیا تھا لیکن فنی حیثیت سے ان میں کوئی خصوصیت نہیں ہے محض قیام طرز اور روایت کی پیروی ملتی ہے

چودھویں صدی عیسوی میں دکن دلّی سے آزاد ہو گیا تھا، وہاں بھی تعمیر، ادب اور مصوّری میں نئی راہیں نکلیں لیکن شبیہہ سازی کے سوا

اور دوسرے پہلوؤں میں کوئی نمایاں ترقی نہیں معلوم ہوتی۔ جب دکنی سلطنتیں سترھویں صدی عیسوی میں دہلی کے ماتحت آگئیں تو وہاں کی رہی سہی انفرادیت بھی ختم ہوگئی لیکن اس دوران میں بعض دوسرے علاقوں میں مصوّری کے نئے مکاتب نے جنم لیا۔

مغلوں کے زوال کے زمانے میں مصوّر اور فن کار دوسری ریاستوں میں پہنچ گئے اور وہاں مقامی اثرات کے ساتھ مغل قلم کی آمیزش ہوکر نئی شکلیں وجود میں آئیں۔ اس حیثیت سے راجپوت کانگڑہ، سکھ لکھنؤ وغیرہ کے قلم وجود میں آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے لیکن ڈاکٹر کمارسوامی نے مغل اور راجپوت مصوّری کے فرق پر بہت زور دیا ہے اور دوسرے مبصّروں اور ناقدوں نے بھی ہر جگہ تھوڑے فرق کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے اُن کا تذکرہ ضروری ہو جاتا ہے۔ مقامی خصوصیات، مذہبی اختلافات اور رسم و رواج کی وجہ سے موضوعات میں فرق ہوگیا ہے۔ کمارسوامی نے مغل اور راجپوت مصوّری میں جو خاص فرق بتائے ہیں وہ زیادہ تر انہیں باتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے خاص طور سے اس بات پر زور دیا ہے کہ مغل فن درباری اور شاہانہ تھا اور راجپوت فن عوامی۔ لیکن یہ بہت بحث طلب بات ہے۔ اسی طرح انہوں نے کہا ہے کہ مغل مصوّری غیر مذہبی تھی اور راجپوت مصوّری کا موضوع مذہب تھا اس لئے راجپوت مصوّری کی جڑیں عام ہندوستانی زندگی میں زیادہ گہری جاتی تھیں۔ کرشن جی کی زندگی کے مختلف پہلو ان مصوّروں کا خاص موضوع رہے ہیں۔ طرزِ معاشرت اور رسم و رواج کے فرق کی وجہ سے دونوں میں زیادہ اختلاف نظر آتے ہیں ورنہ فنی حیثیت سے کچھ ایسا فرق نہیں ہے۔ راگنیوں اور نائکاؤں کی تصویریں مغل خواتین کے اندازِ نشست سے ملتی جلتی ہیں۔ بہرحال موہومؔ راگوں اور رسوں کی تصویریں زیادہ تخیل آفریں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بات مغل مصوّری سے زیادہ اجنتا کی روایتوں سے متعلق معلوم ہوتی ہے

دونوں اسکولوں میں جو مماثلت ہے وہ تاریخی اسباب کا نتیجہ ہے کیونکہ مصوّری نے اکثر انہیں راجپوت درباروں میں ترقی کی جن سے مغلوں کا گہرا تعلق تھا۔ جے پور اور چھپا، دتیا اور دوسری ریاستوں میں کچھ نمونے محفوظ ہیں

اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں پہاڑی اسکول نے ترقی کی جسے کانگڑہ اسکول بھی کہا جاتا ہے۔ جموں سے گڑھوال تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ جموں، بسوہلی، چمبا، کولو اور ٹہری گڑھوال ہر جگہ مصوّروں کی سرپرستی ہوئی اور مصوّروں نے راجپوت، مغل اور یورپی طرز کے اثرات قبول کرکے مقامی رنگ کی آمیزش سے اپنے قلم کو دوسرے قلموں سے الگ کرلیا۔ اودھ میں علم و فن کی سرپرستی اٹھارویں صدی کے وسط سے شروع ہوگئی تھی۔ یہاں بھی مصوّروں نے نواب وزیروں اور امیروں کی سرپرستی سے فیض اٹھایا لیکن یہاں کی مصوّری میں زندگی کی وہ لہر پیدا نہ ہوسکی جو ایک تخلیقی فن کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کے سیاسی اور سماجی اسباب میں جن سے بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ اس مختصر خاکے میں محض چند تاریخی واقعات کی کڑیاں جوڑ دی گئی ہیں۔ تفصیلی مطالعہ کرنے والوں کو آنند کمارسوامی، پرسی براؤن، اسمتھ، ہر نگھم، آرنلڈ، ھیول، گرنیتھ، این سی مہتہ وغیرہ کی کتابیں دیکھنا چاہیئے۔

اس مختصر خاکہ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی قدیم مصوّری میں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں طرح کی تصویروں کے اعلیٰ نمونے وجود میں آئے۔ یہاں بھی مذہبی دیواری نقوش سے اسی طرح مذہبی تبلیغ کا کام لیا گیا جس طرح یورپ میں۔ ہندوستان کے مصوّروں نے مختلف زمانوں میں مختلف اثرات قبول کئے لیکن ان کے فن کی اصل بنیاد ہندوستانی ہی رہی۔ ایک بات جو سب سے زیادہ غور طلب ہے وہ یہ کہ یہاں اعلیٰ پیمانے کی تصویریں بنائی گئیں لیکن اعلیٰ پائے کے مصوّروں کے نام بہت کم ملتے ہیں یعنی تصویروں میں انفرادیت بہت ہے لیکن مصوّروں میں اتنی نمایاں انفرادیت نہیں پائی جاتی۔ یہ باتیں دورِ جدید میں البتہ نظر آتی ہیں کیونکہ تخیل آزاد ہے اور موضوعات وسیع اور متنوع۔

حامد حسن قادری

ملک الشعراء بہار خراسانی

بہار آں شہِ شاعرانِ سخنداں	بہارِ گہر ریز و یکتائے دوراں
۱۹۵۱ء	۱۳۵۸ فصلی
از وقدر بزمِ کمالِ خراساں	وحیدِ زماں بود و ہم فخرِ ایراں
۱۳۷۰ھ	۱۳۳۰ شمسی ایرانی

(حامد حسن قادری)

ملک الشعراء مرزا محمد تقی بہار خراسانی کا ابھی چند روز ہوئے طہران میں انتقال ہوا ہے۔ اخبار میں پڑھا تھا کہ ملک الشعراء کی وفات سے پانچ روز قبل خواجہ عبدالحمید صاحب مقیم طہران ان کی خدمت میں عیادت کے لئے گئے اور مزاج پرسی کے بعد درخواست کی کہ ۲۱ اپریل کو ڈاکٹر اقبال کی برسی منائی جائے گی، اس لئے کچھ پیغام دیجئے۔ ملک الشعراء نے مسکرا کر فرمایا "اب کیسا پیغام؟ میں خود عنقریب اقبال کے پاس جا رہا ہوں"۔ چنانچہ ٹھیک ڈاکٹر اقبال کی وفات کے دن ۲۱ اپریل کو شب میں ملک الشعراء نے رحلت فرمائی۔ یہ توارد خوب رہا۔ ملک الشعراء ڈاکٹر اقبال کے بڑے مداح تھے۔

ملک الشعراء بہار خراسانی ایران کے زندہ و موجود شاعروں میں غالباً سب سے بزرگ اور قدیم تھے، اور سب سے زیادہ مشہور و مقبول۔ ۱۸۸۶ء (۱۳۰۴ھ) میں مشہد میں پیدا ہوئے، وہیں اپنے والد مرزا محمد کاظم ملک الشعراء صبوری کی خدمت میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۲ء میں والد کے انتقال کے بعد ادیب نیشاپوری وغیرہ فضلا و شعراء سے فیضِ تلمذ پایا۔ تعلیم کے بعد آصف الدولہ غلام رضا خاں گورنر خراسان کے دربار میں باریابی حاصل کی۔ آصف الدولہ غلام رضا خاں گورنر خراسان کے دربار میں باریابی حاصل کی۔ آصف الدولہ کی سفارش پر مظفر الدین شاہ قاچار نے ملک الشعراء کا خطاب دیا اور سالانہ وظیفہ مقرر کر کے مزید عزت افزائی کی۔

۱۹۰۶ء میں جب ایران میں سیاسی انقلاب اور تحریکِ مشروطیت شروع ہوئی تو ملک الشعراء بہار بھی آغاز ہی سے اس میں شریک ہو گئے۔ اور سالہا سال سرگرم رہ کر عملی حصّہ لیتے رہے۔ نہایت پُر جوش مضامین اور شور انگیز نظمیں لکھتے تھے جو حبل المتین کلکتہ اور خراسان کے اخبارات میں کبھی اُن کے کبھی فرضی نام سے شائع ہوتی تھیں۔ نظموں کی اشاعت نے بہار کو ملک بھر میں مقبول اور ہر دل عزیز بنا دیا۔ ۱۹۱۱ء میں انھوں نے مشہد سے ایک روزنامہ "نوبہار" جاری کیا۔ اس کے علاوہ دوسرے اخبارات "دانش کدہ" اور "ایران" کی ادارت بھی کرتے رہے۔

ان سیاسی مشاغل کے سبب سے ان کو بہت سی جانی و مالی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دو بار جلا وطن کئے گئے۔ دو مرتبہ اخبار بند کیا گیا۔ ۱۹۱۶ء میں دوسرے قوم پرستوں کے ساتھ وطن سے باہر ہجرت کرنی پڑی لیکن نہایت استقلال کے ساتھ تمام مصائب برداشت کرتے رہے۔ ہجرت سے واپسی پر پھر اخبار "نوبہار" کو طہران سے جاری کیا۔ آخر "فتح ملی" اور استقلال ایران کے بعد آپ کو مجلسِ شورائے ملی کا رکن انتخاب کیا گیا۔

ملک الشعراء بہار کی یادگار چند تصانیف بھی ہیں۔ جن میں "تاریخ سیستان" اور ایک ناول "نیرنگِ سیاہ یا کنیزانِ سفید" کو زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

بہار، پور داؤد کے ہم عمر اور اشرف رشتی، عارف قزوینی وغیرہ مشاہیرِ سخن کے ہم عصر تھے۔ ان سب کے ساتھ قومی و سیاسی نظمیں لکھیں۔ قافیوں اور بندوں کی ترتیب و ترکیب میں جدید ندرتوں کا بھی ساتھ دیا۔

لیکن قدیم اصولِ شاعری کے پابند رہے۔ غزل میں قدیم طرزِ تخیل اور اسلوبِ بیان قائم رکھا۔ مختصر نمونۂ کلام پیش کرتا ہوں۔

ایک نظم کا عنوان ہے ــــــ "افکارِ اخلاقی و فلسفی"۔ جدید طرز کے آٹھ دس بند ہیں۔ خوب نظم ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہار متشکک اور قنوطی (Pessimist) تھے۔ پہلا بند ہے۔

ازبرایں گرۂ پستِ حقیر   زیر ایں قبۂ مینائے بلند
نیست خورسند کس از خرد و کبیر   من چرا بیہدہ باشم خورسند

فرماتے ہیں کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے کوئی فرد صغیر و کبیر خرم و قانع نہیں ہے۔ پھر مجھے خرسند رہنے کا کیا حق ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں۔

شدہ ام در ہمہ اشیا باریک   رفتہ تا سرحدِ اسرارِ وجود
چیست ہستی؟ اُفقے بس تاریک   واندراں نقطۂ شکے مشہود

میں نے تمام اشیا کو باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اسرارِ ہستی کی سرحد تک چلا گیا۔ لیکن ہستی کیا ہے؟ بس ایک اُفقِ تاریک جس میں ایک نقطۂ شک نظر آ رہا ہے، تمام کائنات ایک نقطۂ شک سے زیادہ نہیں۔ وجودِ عالم نقطۂ وہم و گمان ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

بجز آں نقطۂ نورانیِ شک   نیست در آں اُفقِ تیرہ فروغ
عشق بستم بحقائق یک یک   راست گویم، ہمہ وہم ست و دروغ

اس اُفقِ تاریک میں اگر کوئی روشنی ہے تو بس اسی "نقطہ" سے ہے جو بیک وقت مشکوک بھی ہے اور نورانی بھی۔ وجود ہے بھی اور نہیں بھی۔ نظر آ رہا ہے مگر نظر کا دھوکا ہے۔ "اعیانِ ثابتہ" ہیں، مگر رائحۂ وجود" سے خالی۔

اس کے بعد طبیعت و تقدیر کی ستم ظریفی بیان کرتے ہیں۔

خلق را کردہ طبیعت ز ازل   بدو قانونِ پلید ارزانی
ستمِ تاثیرِ وراثت اول   رمزِ تاثیرِ تعلّم ثانی

طبیعت نے ازل سے انسان کو دو پلید قانون کا پابند کر دیا ہے۔ ایک تاثیرِ وراثت، دوسرا تاثیرِ تعلّم۔ انسان پر آبا و اجداد کا موروثی اثر بھی ہوتا ہے اور تاثیرِ صحبت بھی لازم ہے۔ پھر اپنی مثال پیش کرتے ہیں۔

روحِ من گر ز نیاگانِ من ست   العجب پس منِ بدبخت کہ ام
دگر ایں روح و خرد زانِ من ست   بستۂ بندِ وراثت ز چہ ام

میری روح اگر میرے بزرگوں سے آئی ہے تو حیران ہوں کہ پھر میں کون ہوں؟ اور اگر یہ روح و عقل میری اپنی ہے تو وراثت کا کیوں پابند ہوں۔ چنانچہ مختلف موروثی اثرات بیان کرتے ہیں۔

یک نیا عابد و عارف مشرب   یک نیا لشکری و دیوانی
پدرم شاعر و من زیں سہ نسب   شاعر و لشکری و روحانی

میرے ایک بزرگ عابد و عارف تھے، ایک لشکری تھے۔ میرے باپ شاعر تھے۔ لہٰذا میں ان سہ گانہ نسب کی بنا پر شاعر بھی ہوں، لشکری بھی، اس کے بعد اثرِ تربیت کو بیان کرتے ہیں۔

جدِ من تاجر و زیں روئے پدر   در من آہنگِ تجارت فرمود
اثرِ تربیتش گشت ہدر   لیک در روحِ من آسیب افزود

من نہ زاہد نہ محاسب نہ ظریف   من نہ تاجر نہ سپاہی نہ ندیم
بہمہ باب حریف و نہ حریف   بہمہ کار علیم و نہ علیم

فرماتے ہیں کہ میرے دادا تاجر تھے۔ اس لئے میرے باپ نے مجھے بھی تاجر بنانے کا ارادہ کیا۔ ان کا اثرِ تربیت تو رائگاں ہوا۔ لیکن میری روح اس آفت میں مبتلا ہو گئی کہ میں اب نہ زاہد ہوں نہ محاسب نہ ظریف نہ تاجر، نہ سپاہی نہ ندیم۔ یہ کیفیت ہے کہ سب کاموں کا اہل ہوں اور کسی کام کا نہیں۔ تمام اشغال سے واقف ہوں اور کسی میں ماہر نہیں۔

آخری بند میں اپنا سوز و درد بیان کرتے ہیں۔

سخت چوں سنگ سپہرِ غماز   ہر دمے بر جگرم افگند خدنگ
گوئی از بہرِ نشاں تیرانداز   ہدفے سرخ نشاند بسنگ

سپہرِ غماز ہر وقت جگر پر پتھر سے زیادہ سخت تیر چلا رہا ہے گویا میرا جگر بھی مشقِ تیراندازی کا سرخ ہدف ہے۔

ملک الشعراء بہار کے تغزل کا انداز یہ ہے۔ چند غزلوں کے اشعار درج کرتا ہوں۔

شمیمِ مے شعلہ افروز دو گز ہیچ   شب تا سحر گریۂ جانسوز دو گز ہیچ
روزے کہ دلے را بنگاہے بنوازند   از عمر حساب ست ہماں روز دو گز ہیچ

خواہد بدلِ عمر بہار از ہمہ گیتی   دیدارِ رخِ یار دل افروز دگر ہیچ

تا بکنج لبت آں خاک سیہ رنگ افتاد   نا فہ را عقدہ گرہ از خونِ بدل تنگ افتاد
سیب از آسیب چہ دانست کہ ہم رنگ تو شد   گشت نا رنج زغم زرد کہ نا رنگ افتاد
در رہِ بت چشم من از ہفتہ بہفتاد کشید   در پئے کار من انجام بفرسنگ افتاد
دانم اندر دلِ سخت تو نکرد ست اثر   نالۂ من کہ از و خون بدلِ سنگ افتاد

ان اشعار میں وہی قدیم تشبیہ، تجنیس اور رعایت لفظی ہے۔

ایک زمانے میں ایرانی شعرا میں "پردے" پر مباحثہ جاری رہا تھا۔ پردے کی موافقت و مخالفت میں مشاہیرِ سخن نے نظمیں لکھیں۔ ملک الشعراء بہار غزل کے دو شعروں میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔

اگر تو رخ بکشائی ستم نخواہد شد   ز حسن و خوبی تو ہیچ کم نخواہد شد
تو پاک باش و بروں آئے بے حجاب مترس   کسے بعیدِ غزالِ حرم نخواہد شد

ایک غزل بہار نے بڑی دلچسپ لکھی ہے۔ یعنی جدید سیاسی اصطلاحات والفاظ کو تغزل میں صرف کیا ہے۔

دل فریباں کہ بہ کابینۂ[1] جاں جا دارند   مستبدانہ[2] چرا قصدِ دلِ ما دارند
دلبراں خود سر و ہر جائی و ادنیٰ صفت اند   ورنہ در خانۂ غیر از چہ سبب جا دارند
گاہ لطف است و خوشی گاہ عتاب ست و عتاب   تا چہ از ایں ہمہ پلتیک[3] تقاضا دارند
صفِ مژگانِ ترا دست سیاسی ست دراز   با نفوذے کہ بہ معمورۂ دلہا دارند
بہ کمیسونِ[4] عرائض چہ کنم شکوہ ز تو   کہ ہمہ حالِ منِ بیدلِ شیدا دارند
ما بتوضیح دو چشمانِ تو قانع نشدیم   زانکہ با خارجیانِ[5] الفت و نجوا دارند
در پناہِ سرِ زلفِ تو بہار ستانے ست   کہ در و ہیئتِ دل مجلسِ شورا[6] دارند
دلِ غارت شدہ در محضرِ عدلیۂ[7] عشق   متظلم شدہ و چشمانِ تو حاشا دارند

سخنِ تازہ عجب نیست ز طبعِ تو بہار
کہ ہمہ مشرقیاں منطقِ گویا دارند

---

(۱) کابینہ۔ کیبنٹ (۲) مستبدانہ: ظلم و زبردستی کے طور پر
(۳) پلتیک، پالٹیکس، سیاسی چالیں (۴) کمیسون۔ کمیشن
(۵) خارجیان، مخالفانِ حضرت علی (۶) مجلسِ شوریٰ۔ پارلیمنٹ
(۷) محضرِ عدلیہ۔ عدالتِ جج۔

نیشنل ایمپلائمنٹ سروس

تمام شہری مرد ہوں یا عورت
مناسب ذریعۂ معاش کا حق رکھتے ہیں

نیشنل ایمپلائمنٹ سروس زیادہ سے زیادہ افراد کو روزگار دلانے کی مسلسل کوشش میں مصروف ہے تاکہ ہر شخص کو مناسب ذریعۂ معاش کا حق جس کی کُھلی ضمانت ہمارے دستور (کانسٹی ٹیوشن) میں دی گئی ہے۔ حاصل ہو سکے۔

جاری کردہ:-
ڈائرکٹریٹ جنرل آف ری سیٹلمنٹ اینڈ ایمپلائمنٹ
منسٹری آف لیبر گورنمنٹ آف انڈیا

عرش ملسیانی

شادی آباد مانڈو

دریائے نربدا کے کنارے[1] وندھیاچل کی پہاڑیوں میں قلعۂ مانڈو اور اُس کی عمارتیں روپ متی اور باز بہادر کے قصۂ حسن وعشق کو اب بھی زبانِ حال سے بیان کر رہی ہیں۔ یہ قلعہ قرونِ وسطیٰ کے فنِ تعمیر کا ایک نادر شاہکار ہے۔

مانڈو کا پُرانا نام منڈپ دُرگا ہے۔ آج کل اُسے مانڈو گڑھ بھی کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ سلطنتِ مالوہ کا دار الخلافہ تھا۔ تاریخ فرشتہ میں مرقوم ہے کہ پانچویں صدی مسیحی میں اسے دیو بیس نامی ایک راجپوت نے تعمیر کیا تھا لیکن تاریخ سے اس کی کوئی معتبر شہادت نہیں ملتی۔

مانڈو وسطِ ہند میں دھار سے ۲۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ قلعہ اپنے زمانے میں ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ تھا۔ قلعے کی فصیل کم وبیش چالیس میل لمبی ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں پرمار راجپوتوں کے زمانے میں شہر مانڈو کی آبادی سات لاکھ کے قریب تھی۔ مانڈو کا رقبہ پندرہ مربع میل کے قریب ہے، اور یہ پہاڑ کی ہموار سطح پر واقع ہے۔ چشموں اور جھیلوں کی فراوانی نے اس خطے کو ایک خاص خوبصورتی عطا کی ہے۔ برسات میں تو اس خطے کی دلآویزی ناقابلِ بیان ہوتی ہے۔ پرمار راجپوت نویں سے تیرھویں صدی عیسوی تک حکمران رہے۔ انھیں فنِ تعمیر کا بڑا شوق تھا۔ دھار کے راجہ بھوج نے گیارھویں صدی عیسوی میں مانڈو میں ایک سنسکرت کالج بنایا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں جینیوں کے سوتیامبر فرقے کے لئے یہ خاص مقامِ زیارت تھا۔ چودھویں صدی عیسوی میں علاؤالدین خلجی کے حکم سے عین الملک نے اس قلعے کو فتح کیا۔ بہت سی اچھی عمارتوں کو گرادیا گیا اور خزانہ خالی کر دیا گیا۔ پرمار خاندان میں ۲۴ تاجدار ہوئے ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ واک پتی ۸۷۵ء سے ۹۱۴ء تک
۵۔ وَیرسنہا ۹۱۴ء سے ۹۴۱ء تک
۷۔ مُنجبا ۹۷۳ء سے ۹۹۵ء تک
۹۔ بھوج اول ۱۰۱۰ء سے ۱۰۵۵ء تک
۲۳۔ بھوج دوم ۱۲۸۰ء سے ۱۳۱۰ء تک
۲۴۔ جاواسنہا ۱۳۱۰ء

دلاور خاں غوری شاہِ دہلی کے ماتحت مالوے کا گورنر تھا۔ ۱۴۰۱ء میں اُس نے خود مختار ہونے کا اعلان کر دیا، اور خود شاہِ مالوہ بن گیا۔ شاہانِ غوری نے مانڈو کو اس کی فطری دلآویزیوں کی وجہ سے شادی آباد کا نام دیا۔ اس خاندان کے صرف تین بادشاہ ہوئے ہیں۔

دلاور خاں ۱۴۰۱ عیسوی
ہوشنگ شاہ ۱۴۰۵ عیسوی
غزنی خاں ۱۴۳۵ عیسوی

غوریوں کے بعد یہاں خلجیوں کی عملداری رہی، ان کی تفصیل یہ ہے۔

محمود اوّل ۱۴۳۵ء۔ غیاث الدین ۱۴۶۹ء
ناصر الدین ۱۵۰۱ء محمود دوم ۱۵۱۱ء

۱۵۳۱ء میں بہادر شاہ والیٔ گجرات نے اس قلعے کو فتح کرکے اپنی سلطنت

---

[1] اس مضمون کی تدوین میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ اور اس کے بعض حصّے انھیں سے ماخوذ ہیں۔ (۱) دھار اینڈ مانڈو از میجر لارڈ (۲) مانڈو دی سٹی آف جوائے از جی یزدانی ایم۔ اے۔ (۳) پیت کی ماری روپ متی۔ از مبارز الدین رفعت ایم۔ اے۔ مضمون سے متعلق تصاویر ۳۳ تا ۴۳ صفحوں پر ملاحظہ فرمائیے۔ سرورق کی تصویر میں باز بہادر، اور روپ متی مصروفِ سیر ہیں۔

میں شامل کرلیا۔ لیکن صرف تین سال بعد ہمایوں نے بہادر شاہ کو اس قلعے سے بھگا دیا۔ سنہ ۱۵۴۲ء میں شیر شاہ مالوے کو اپنے اختیار میں لایا، اور دس ہزار گھوڑ سوار اور سات ہزار پیدل سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج مانڈو میں چھوڑ دی۔ خاندانِ سوری کے ختم ہوتے ہی مالوے کے گورنر شجاعت خاں نے مطلق العنانی کا اعلان کیا۔ اُس کا بیٹا باز بہادر مالوے کا آخری آزاد اور خود مختار تاجدار تھا۔ سنہ ۱۵۶۱ء میں ادہم خاں کوکہ نے اس قلعے کو اکبر کے حکم سے فتح کیا۔ باز بہادر قلعہ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جہانگیر نے توزکِ جہانگیری میں لکھا ہے کہ اکبر نے اس قلعہ کی فصیل اور بہت سی فوجی اہمیت کی عمارتوں کو مسمار کر دیا تھا۔ تاکہ یہ مستحکم قلعہ کبھی اس کے دشمنوں کے کام نہ آسکے۔ جہانگیر نے البتہ ان عمارتوں کی مرمت وغیرہ پر زرِ کثیر صرف کیا۔ سنہ ۱۶۱۶ء میں جہانگیر ماہ مارچ سے ماہ ستمبر تک اس قلعے میں مقیم رہا۔ سر طامس رو سفیر جیمز اول شاہ انگلستان بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس زمانے میں شیر اور شیر ببر یہاں کے جنگلوں میں بہت پائے جاتے تھے۔ سر طامس رو نے جہانگیر کے شوقِ شکار کی دلچسپ تفاصیل لکھی ہیں۔

عمارتوں میں سے ہنڈولہ محل، چمپا باؤلی، دلاور خاں کی مسجد، جہاز محل، روپ متی اور باز بہادر کے محل، ساگر تال، جامع مسجد، ہوشنگ شاہ کا مقبرہ قابلِ ذکر ہیں۔

دروازوں میں سے عالمگیر دروازہ بھنگی دروازہ اور گڑھی دروازہ مشہور ہیں۔

ہنڈولہ محل۔ یہ عمارت اپنی سادہ وجاہت کی بنا پر مشہور ہے چھت کے نیچے وسیع ہال آکسفورڈ کے ڈائننگ ہال کی یاد دلاتا ہے۔ یہ غالباً دربار ہال ہے کسی زمانے میں ایک طرف کو گیلری تھی، جہاں سے بادشاہوں کی بیویاں اور محلوں کی دوسری عورتیں شاہی دربار کو ملاحظہ کر سکتی تھیں۔

چمپا باؤلی۔ سطحِ زمین کے نیچے پانی کا یہ چشمہ یا کنواں گرمیوں میں نہایت لطف دیتا تھا۔ اس کے گرداگرد تہ خانے اور حماموں کے نشان اس کی پرانی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ غالباً یہ باولی محلوں کی آرام گاہوں میں سے تھی۔

جہاز محل۔ اسی نام کی جھیلوں کے درمیان یہ محل تعمیر ہوا ہے اور ان جھیلوں کے نام کی وجہ سے ہی اس کا نام جہاز محل مشہور ہو گیا۔

روپ متی اور باز بہادر کے محل۔ ہوشنگ شاہ کے مقبرے کے قریب ایک نہایت پُر فضا سڑک گزرتی ہے، اس کے عین سرے پر ایک پہاڑی کے کنارے روپ متی کا محل ہے۔ اسی محل کی چھتریوں سے روپ متی دریائے نربدا کے دل فریب مناظر دیکھا کرتی تھی۔ اس سے ذرا نشیب میں ریوا کنڈ کے پاس باز بہادر کا محل ہے۔ ان محلوں پر کوئی ایسا کتبہ کندہ نہیں جن سے اُن کے متعلق کوئی تفصیل معلوم ہو سکے۔ باز بہادر کے محل پر صرف یہ تحریر کندہ ہے کہ یہ محل سنہ ۹۱۴ ہجری یا ۱۵۰۸ عیسوی میں تعمیر ہوا۔ یہ ناصر الدین کا عہد تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ باز بہادر بھی یہیں رہتا رہا ہو۔

جامع مسجد۔ یہ بہت وسیع اور عظیم الشان عمارت ہے۔ ہوشنگ شاہ نے اسے شروع کیا اور محمود خلجی نے مکمل کیا۔ یہ سنہ ۸۵۸ ہجری یا ۱۴۵۴ء میں مکمل ہوئی۔

ہوشنگ شاہ کا مقبرہ۔ اس کی پشت پر ہوشنگ شاہ کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرے کا قبہ سفید سنگِ مرمر کا ہے۔ یہ ۹۔ رجب سنہ ۱۰۷۰ ہجری مطابق ۱۲ دسمبر سنہ ۱۶۵۹ء کو تعمیر ہوا۔

سات سو سال تک مالوے کے ہندو مسلم بادشاہوں نے مانڈو کی عظمت اور وقار کو زندہ رکھا۔ یادگارِ زمانہ عمارتیں تعمیر کیں۔ دبدبے اور جلال سے حکومت کا سکہ بٹھایا۔ ادب اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی۔ لیکن ان کھنڈروں کو دیکھ کر اب اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

دیدم چغد نشستہ در صبح پگاہ — برکنگرۂ مقبرۂ شروان شاہ
فریاد کناں زروئے حیرت می گفت — کو آں ہمہ حشمت و کجا آں ہمہ جاہ

ان کے علاوہ یہاں کی کچھ اور عمارتیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔

رام پول۔ یا رام دروازہ

تاراپور دروازہ۔ دلاور خاں لودھی نے اسے سنہ ۱۴۰۵ء عیسوی میں تعمیر کیا۔

سون گڑھ دروازہ۔ یہ وہ مشہور دروازہ ہے جس سے بہادر شاہ شاہِ گجرات، اور ہمایوں بالترتیب فاتح کی حیثیت سے قلعے میں داخل ہوئے تھے۔ انیسویں صدی میں دھار کی رانی مینا بائی نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا تھا جس سے اب وہ جدید فنِ تعمیر کا نمونہ نظر آتا ہے۔

نیل کنٹھ کا مندر۔ یہ ایک اسلامی عمارت تھی۔ لیکن ایک مندر

کی صورت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ یہ دل کش عمارت سنہ ۱۵۰۸ عیسوی میں اکبر کے زمانے میں تعمیر ہوئی۔ یہ شعر اس پر کندہ ہے ؎

توان کردن تمامی عمر را مصروف آب و گل
کہ شاید یک دمے صاحب دلے این جا کند منزل

مانڈو کی تاریخی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے آخری خود مختار تاجدار باز بہادر اور رُوپ متی کے قصۂ عشق نے اس سرزمین کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ باز بہادر کا باپ شجاعت خاں خاندانِ سُور کے زمانے میں مالوے کا گورنر تھا۔ وہ ایک عاقل و دانا حکمراں تھا، اُس نے اپنی شجاعت سے طاقت بڑھائی۔ شجاول پور شہر بسایا اور آخر خاندانِ سُور کا اقتدار ختم ہوتے ہی خود مختار بن گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت کے لئے جھگڑا ہوا۔ باز بہادر نے اپنے دونوں بھائیوں دولت خاں اور مصطفٰے خاں کا خاتمہ کر کے عنانِ حکومت خود سنبھالی۔

یہ رنگین مزاج بادشاہ فنِ موسیقی اور شاعری میں بڑا ماہر تھا، ایسا مغنّی کہ ڈھونڈھے سے اس کی نظیر نہیں ملتی تھی۔ اس کے گرد گویّے، سازندے اور رقّاص چاروں طرف سے جمع ہو گئے تھے۔ اس کا دربار نغمہ و سرود سے کبھی خالی نہ رہا۔

ایک دن باز بہادر شکار کے شوق میں وادیٔ ریوا کی طرف گیا، اُدھر ایک راجپوت سردار کی بیٹی، روپ متی جو حسن و جمال میں اپنی نظیر آپ تھی، اپنی سہیلیوں کے ساتھ جنگل میں ایک چشمے کے نزدیک سیر و تفریح میں مصروف تھی، باز بہادر شکار کی تلاش میں اچانک اُدھر آ نکلا، اور بمصداق ع

شکار کرنے گئے تھے شکار ہو کے چلے

وہ اس پری جمال حسینہ کے تیرِ حُسن کا شکار ہو گیا۔ لڑکی نے دیکھا تو مبہوت ہو گئی۔ بادشاہ کے ساتھیوں نے کہا کہ حکم ہو تو ابھی لے اُڑیں۔ لیکن باز بہادر نے حُسن پر اس قسم کی جفا اور زبردستی کو مناسب نہ سمجھا۔ والہانہ انداز سے اس کی صورت کو دیکھا کیا۔ زیبا قامت، رعنا جوانی اور شباب کی حدوں کو چھوتی ہوئی دوشیزگی، ایک دوسرے کو بہ نظرِ اشتیاق دیکھتے رہے۔ دلوں میں محبت نے اپنا مقام بنا لیا۔ دنیاوی قیود راستے میں حائل تھے۔

روپ متی نے اپنی عزّت و ناموس کا خیال کیا اور باز بہادر کے بڑھتے ہوئے اشتیاق کو امتحان کی کسوٹی پر پرکھنے کی ٹھان لی، اُس نے کہا میں اس وقت تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ ریوا دیوی کا پانی تمہارے شاہی شہر کے گنبدوں اور میناروں کی بلندی پر شہر کے آگے نہ پہنچے گے۔

باز بہادر خاموشی اور استعجاب کے عالم میں روپ متی کی طرف تکتا رہا اور اُس کے بعد دفعتہً غائب ہو گیا۔ غالباً اس نے اس آزمائش میں پورا اُترنے کا عزمِ مصمم کر لیا۔ اُدھر روپ متی کی جان پر آ بنی۔ کنیزوں اور سہیلیوں سے سارا قصّہ ٹھکرائن کو اور اُس سے ٹھاکر کو معلوم ہو گیا۔ راجپوت عزّت و ناموس پر جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ اولاد اگر حفظِ ناموس کی راہ میں حائل ہو تو اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔ روپ متی نے تو خاندان کی عزت کو بٹّہ لگایا تھا۔ قدامت پرستی کے اس دور میں موت کی سزا ہی روپ متی کے لئے کم سے کم سزا ہو سکتی تھی۔ بے رحم باپ دل کے درد کو کب جان سکتا تھا۔ لڑکی کو زہر دینے کا حکم صادر ہو گیا۔ رنواس میں ماتم ہوا۔ رونا پیٹنا، چیخ پُکار اور آہ و زاری چاروں طرف یہی شور تھا۔ برہمن کے کہنے پر ایک رات کے لئے زہر کا پیالہ پلانا ملتوی ہو گیا۔ کیونکہ بسنت دیوی کے تیوہار کو قتل کے ہولناک حادثات سے آلودہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رات کو روپ متی نے خواب دیکھا۔ ریوا دیوی نے اُسے مخاطب ہو کر کہا کہ "میں شہر مانڈو میں ایک پیڑ کے تلے ایک چشمے میں پھوٹوں گی۔ یہ چشمہ میرے نام سے شہرت پائے گا۔ اور مجھ سے مل کر پھر ایک ہو جائے گا۔"

اسی شب کو باز بہادر نے رُوپ متی کو خواب میں دیکھا۔ صبح ہوتے تک وہ ٹھاکر کے قلعے پر حملہ آور ہو چکا تھا، ٹھاکر کو شکست ہوئی۔ محبت کامیاب ہوئی۔ باز بہادر اور روپ متی مانڈو کے لئے روانہ ہوئے۔ جب یہ قلعے میں داخل ہوئے تو باد پا گھوڑوں کو چھوڑ کر سونے چاندی کی عماریوں سے لدے ہوئے ہاتھیوں پر سوار ہو گئے۔

سیّد مبارز الدین رفعت کی تصنیف منیف "پیت کی ماری روپ متی" میں اس کا احوال یوں درج ہے۔

"یہی وہ مقام ہے جہاں ہوشنگ شاہ یا محمود خلجی کے سینکڑوں ہاتھی گجرات یا چتوڑ کے مالِ غنیمت سے لدے پھندے آتے تھے۔ یا شاہوں کے قصر یا مقبرے یا پردہ نشین شہزادیوں کے حمام یا خدائے واحد کی مساجد کے لئے سنگِ رخام لے کر اوپر چڑھتے تھے۔ اس دروازے سے جس کی سہ منزلہ کمانیں اب تک بھی دہلی کی طرف نہایت سنجیدگی سے

نگراں ہیں۔ گزرکر ہاتھی دروازے اور ہنڈولہ محل کی دیواروں کے آگے سے ہوتے ہوئے ہاتھی اپنے شاہی سواروں کو لے کر گزرے اور زنانہ حصّہ کے پاس آکر جھک گئے۔ تاکہ سوار اُتر جائیں۔ روپ متی کو اتار کر حجلۂ عروسی میں لایا گیا، اور عروسی کے لئے طیار کیا جانے لگا۔

یہ دن باز بہادر کے دل کی تنہا ملکہ روپ متی کے لئے بڑے سہانے اور کیف آور تھے۔ جب محبت کی ایک پوری رات گزارنے کے بعد باز بہادر روپ متی سے جدا ہوتا تو وہ کنیزوں کو بُلاکر ترکی حماموں میں یا پھر جہاز محل کی کھلی فضا میں اشنان کرتی اور پھر طویل دن چھپا باؤلی کے ٹھنڈے پانی کے کنارے بسر کرتی۔

وہ ایک دوسرے کو عشق و محبت کے گانے سناتے جو خود ان ہی کے تصنیف کردہ ہوتے۔ یا پھر مغنیّوں اور رقّاصاؤں کو طلب کرکے رقص و سرود کی محفلیں برپا کرتے اور ان سے رقص و محبت اور جنگ و جدل کے گیت سنتے!!

ریوا دیوی کا وہ چشمہ جس کے متعلق روپ متی نے خواب دیکھا تھا، ایک سایہ دار وادی میں تمرس کے درخت کے نیچے مِل گیا۔ یہ چشمہ آج تک ریوا کنڈ کے نام سے مشہور ہے۔ روپ متی کے لئے باز بہادر نے یہاں ایک محل تعمیر کروا دیا۔ اس محل کی چھتریاں ابھی باقی ہیں۔ ان چھتریوں سے روپ متی نربدا ندی کا نظارہ کرتی اور اپنے ذوقِ پرستش کو پورا کرتی۔

آخر ۱۵۶۲ء میں ادھم خاں کوکہ نے سارنگ پور کے مقام پر باز بہادر کو شکست دی اور قلعۂ مانڈو پر قابض ہو گیا۔ باز بہادر شکست کھاکر بھاگ نکلا۔ اُس کے بعد اس کی زندگی کے حالات کم و بیش تاریکی میں ہیں۔ ادھم خاں نے روپ متی سے اظہار عشق کیا۔ وہ اس کے حسن کی تاب نہ لاسکا۔ اور دیوانہ وار تڑپنے لگا۔ روپ متی نے جب صورتِ فرار نہ دیکھی تو ادھم خاں سے ملاقات کا ایک وقت مقرر کیا۔ اس سے قبل اُس نے زہر کھاکر جان دے دی، اور ادھم خاں سے اپنی محبت کے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیا۔

مانڈو کے کھنڈر آج بھی اس کے گواہ ہیں۔ شاہانِ مالوہ کی سطوتِ شاہانہ کے ساتھ ساتھ عشق و محبت کی داستان بھی ان کھنڈروں پر لکھی ہے۔ زندۂ جاوید عشق کی یہ کارگاہ اہلِ دل کے لئے سجدوں کا مقام بنی رہے گی۔ آج بھی اس کی فضاؤں میں روپ متی کے گیت اور باز بہادر کی موسیقی گونج رہی ہے۔ ذیل میں روپ متی کے چند مقبول گیتوں کا ملخص دیا جاتا ہے۔ یہ گیت آج بھی مالوے کے مردوزن کی زبان پر ہیں۔ ان کے کچھ اقتباس سنئیے۔

اور دھن جورت ہے، ری میرے
تو دھن پیارے کی پریت پُونجی
آلے کا جتن کر راکھو من میں!
تو پر تیتا تارو دیکھتا ہوں
تریا کا نہ لاگے ور شٹ
اپنے کر راکھوں گی کنجی
دن دن بڑھے سوا اوُ
دُر ہی گھٹیں اکو گنجی
باز بہادر کی سینہہ اوپر
نچھاچر کروں گی جی اور دھن

پریتم!

لوگوں کو اپنے خزانوں پر فخر کرنے دے۔ میرا خزانہ بے لوث محبت کا لطف ہے۔ جو ہر طرح حفاظت سے میرے دل کے صندوق میں دوسری عورتوں کی تاک جھانک سے محفوظ رکھا ہے، اور کنجی میرے ہاتھ میں ہے۔ ہر روز اس میں تھوڑا سا اضافہ ہوتا جاتا ہے، اور گھٹتا ایک ذرّہ بھی نہیں۔ زندگی اسی طرح بسر ہوگی۔ باز بہادر کا آغوش یا زندانِ گور۔ سکھی!

دوسروں کو اپنے دھن دولت پر ناز کرنے دے۔ میرا خزانہ تو خالص محبّت کا خزانہ ہے۔ میرا دل ایک قابلِ اعتماد تالہ رکھتا ہے محبوب اس میں بے کھٹکے آئے۔ کنجی چونکہ میرے پاس ہے۔ دوسری عورتیں بھی اس کے اندر جھانک نہیں سکتیں۔ محبّت روز بروز بڑھتی ہے، گھٹتی نہیں۔ نیک و بد کچھ بھی ہو، یہ جان باز بہادر کی محبّت میں جائے گی۔

پیتم تم پردیس سدھارے لے گئے مورا چین
تمرے کارن رام دُہائی تڑپت ہوں دن رین

پاتی اس کو لکھت ہیں جو ہو وے کچھ دُور
نینن میں تو ناچتی پاتی کون ضرور

ایک برِ اعظم کی وسعت اور ایک سمندر کا پھیلاؤ
ہم دونوں میں حائل ہونے کے باوجود ہماری روحیں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں۔

یہ نصیحت اور یہ بچن
میری دکھیا آنکھوں کو چین سُکھ نہیں پہنچاتے
اے عاقلو بتاؤ تو
کیوں دریا بہانے کے باوجود یہ پیاسی رہتی ہیں۔

شیر کی گپھا میں گھس جاؤ
بے پناہ سیلاب میں کُود پڑو۔
کنکھجورے کو کان میں ڈال لو۔
سانپ کے بل میں ہاتھ ڈال دو
اس اعتماد کے ساتھ کہ کچھ نہ ہوگا
زہر کا پیالہ چڑھا جاؤ۔
دوزخ کی آگ میں کُود پڑو
بس اپنے خیال اور اپنی دھن میں لگے رہو
اگر تم تجربے کے تلخ مدرسے میں اپنی تربیت چاہتے ہو
بس کچھ کرو، لیکن میری ایک بات یاد رکھو
بے وقوف کو اپنا دوست نہ بناؤ

شیرنی کا ایک ہی بچّہ
سچے کا ایک ہی بچن
کیلے کی ایک ہی پَھل
میرے من کا ایک ہی مالک

محبّت کی آگ میں جل گیا میرا پوست و گوشت
اور رگیں بین کے کھنچے ہوئے تاروں کی طرح ٹوٹ گئیں۔
لیکن کبھی اب بھی اپنے آقا کے نام پر
میرا ہر تن مُو بجتا ہے

دانا دامِ محبت سے اپنے آپ کو بچائے رکھتے ہیں
لیکن ایک بار اُس کے پھندے میں پھنس جانے کے بعد
پیچھے ہٹنے کی کوئی راہ نہیں
وہ آگے ہی بڑھے جاتے ہیں
جھنڈا اونچا رکھے ہوئے
اس عزم کے ساتھ
یا جیتیں گے یا لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔

اُردو کے نامور ادیب انیس رضوی امروہوی نے
دُنیا کے چند بہترین افسانے
دو مجموعوں میں یکجا کر دئیے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے
رزم و وطن کے افسانے شجاعت و بہادری اور وطن پرستی کے روح پرور مناظر۔ پھر حسن و عشق کی چاشنی۔ مجلّد، رنگین گردپوش۔ ۳۲۰ صفحے۔ قیمت ڈھائی روپے
منتخب رُوسی افسانے ترگنیف، چیخوف، گورکی، انڈریف وغیرہ، رُوسی معجز نگاروں کے شاہکار افسانے۔ مجلّد، رنگین گردپوش۔ ۳۵۲ صفحے قیمت صرف تین روپے۔
مکتبۂ رضویہ، خاص روڈ، رام پور (یو۔پی)

ذکر و فکر

ظفر جمیلی کاکوی

محبت جنبشِ نبضِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
جنوں کی کار فرمائی مسلّم ہوتی جاتی ہے

ظفر وہ شدّتِ احساس اب کم ہوتی جاتی ہے
طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ غم ہوتی جاتی ہے

نگاہِ ناز کا پندار جوں جوں بڑھتا جاتا ہے
مزاجِ عشق کی شوریدگی کم ہوتی جاتی ہے

کسی کا عشق رسوا اور رسوا ہوتا جاتا ہے
کسی کی زلف برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

تمنّا گل بدامن کیوں نہ ہو گلزارِ ہستی میں
کہ خونِ دل سے چشمِ شوق پُرنم ہوتی جاتی ہے

سندر سنگھ کوثر

ہر گرہ ہستی کی سلجھائی گئی
داستاں یہ روز دہرائی گئی

اور بھی تڑپے اسیرانِ بہار
جب قفس میں شاخِ گل لائی گئی

منہ لگاتے ہی نہیں دیر و حرم
اب کہاں میری جبیں سائی گئی

صبح نے تاروں کو رخصت کر دیا
رات کی وہ بزم آرائی گئی

گرم تھی کیا محفلِ رقص و سرود
جب غزل کوثر تری گائی گئی

عشرت رحمانی

ساقی تری نظر کے اشارے نہیں رہے
اب عذرِ میکشی کے سہارے نہیں رہے

طرزِ خرام ساقیٔ مہوش کو کیا کریں
زاہد بجا حواس ہمارے نہیں رہے

اللہ کیا ہوئی وہ دلآویزیٔ بہار
بدلی ہے اک نظر کہ نظارے نہیں رہے

تم سے کہا تھا جی نہ سکیں گے بچھڑ کے ہم
جینا پڑا، تو شرم کے مارے نہیں رہے

وہ مسکراہٹیں ہیں نہ وہ زلف و رخ کی شام
وہ چاندنی، وہ رات وہ تارے نہیں رہے

موجوں کو اہلِ عزم نے برباد کر دیا!
طوفاں کے ساتھ ساتھ کنارے نہیں رہے

نظریں جو پھیرتے ہو تو اتنا بھی سوچ لو
تم کیا کرو گے ہم جو تمہارے نہیں رہے

برج لال جگی رعنا

مجھ کو لا دو مرے سنہرے خواب
میں نہیں چاہتا کوئی تعبیر

اس لئے کر رہا ہوں میں فریاد
سو نہ جائے کہیں جہاں کا ضمیر

ذہن میں اس طرح ہے ان کا خیال
جیسے ظلمت میں روشنی کی لکیر

زندگی اس طرح ہے ناہموار
جیسے اک بندی کی ہو تحریر

رات کی خیر مانگنے والے
دیکھ اُفق پر وہ سُرخ سُرخ لکیر

کون رعنا؟ وہی جوانِ خموش
شاعرِ خوش خیال و پاک ضمیر

جون اصغر عصری امروہی

کیا مری رگ رگ سے اک طوفاں اٹھا سکتے ہو تم
کیا مرے ہر سانس کو شعلہ بنا سکتے ہو تم

دفترِ ماضی میں ہے محفوظ اپنی داستاں
کچھ ورق کیا مانگ کر ماضی سے لا سکتے ہو تم

شوخیٔ آغاز سے لرزاں ہے قلبِ کائنات
کیا رُخِ انجام سے پردہ اٹھا سکتے ہو تم

گلبنِ تازہ تو خود ہے نازپروردِ بہار
خشک شاخوں سے بھی کیا کچھ گل کھلا سکتے ہو تم

آج جس سر میں سمایا ہے جنونِ کائنات
اب بھی کیا ہنس کر قسم اس سر کی کھا سکتے ہو تم

کیا مری تاریک محفل میں چراغاں کے لئے
وادیٔ ایمن سے برقِ طُور لا سکتے ہو تم

کیا مرے افکار کی شوخی بڑھانے کے لئے
رنگِ رُخ کو سُرخیٔ مضموں بنا سکتے ہو تم

میری نزہت گاہِ شعر و شاعری میں آج رات
کیا بساطِ کہکشاں لا کر بچھا سکتے ہو تم

فکرِ وحشت کوش کی پابستگی کے واسطے
کیا یہ زنجیرِ شعاعِ مہر لا سکتے ہو تم

میں کہ ہوں دشمن زنِ آدابِ تہذیبِ رسوم
کیا کھلے بندوں مری محفل میں آ سکتے ہو تم

طالب چکوالی

نہ جینے کی کوئی صورت، نہ کچھ امکان باقی ہے
مصیبت ہے کہ جینے کا ابھی ارمان باقی ہے

سکونِ دامنِ ساحل کو خواب آور فضا دھوکا
ابھی موجوں کے دل میں حشر کا طوفان باقی ہے

ابھی حسنِ ازل کی جلوہ سامانی کے چرچے ہیں
ابھی بے کیفیوں میں لطف کا سامان باقی ہے

ابھی شاداب ہیں ذہن و تصوّر تیرے جلووں سے
ابھی چشمِ تماشا پر ترا احسان باقی ہے

یہ عہدِ ارتقا ہے یا وہی آغاز کا عالم
ابھی انسان فانی ہے، ابھی شیطان باقی ہے

فرشتوں کی حکومت خوابِ قبل از وقت ہے طالب
ابھی انسان کا شیطان پر ایمان باقی ہے

ونستہ پرشاد فدا

تماشا دوستوں کی دشمنی کا جب سے دیکھا ہے
کسی صورت طبیعت سے پریشانی نہیں جاتی

تھپیڑے برق و بارانِ حوادث کے یہ سہنا ہے
جہانِ رنگ و بو کی جلوہ سامانی نہیں جاتی

بہت کرتا ہے کوشش آدمی انسان بننے کی
مگر اس پر بھی اس کی خوئے حیوانی نہیں جاتی

نہیں پہچانتے احباب گر ہم کو، تو کیا پروا
ہماری شکل اب ہم سے بھی پہچانی نہیں جاتی

فدا کیا روح پرور ہفت روزہ خوان نعمت ہے
کبھی مہمان کی نو دن کی مہمانی نہیں جاتی

شفیق صدیقی

شبِ غم میں بھی جلووں کی فراوانی نہیں جاتی
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں تابانی نہیں جاتی

نہیں معلوم یہ شہرِ خموشاں کیسی بستی ہے
زمیں آباد ہو جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

یہی کہہ کہہ کے اک بیمارِ غم روتا ہے راتوں کو
کہ جب سے تم گئے ہو گھر کی ویرانی نہیں جاتی

جنابِ شیخ پر کیا کر دیا ساقی کی نظروں نے
کہ مے خانے سے اب یہ شکلِ نورانی نہیں جاتی

ہر اک دکھ درد والا اک نہ اک دن چین پاتا ہے
نہیں جاتی تو اک میری پریشانی نہیں جاتی

وہ میری خیریت پوچھیں تو اے پیغام بر کہنا
کہ دل سے کاوشِ غم ہائے پنہانی نہیں جاتی

وطن سے دور ہو کر اے شفیق اکثر ملی راحت
سنا تھا نکہتِ گل کی پریشانی نہیں جاتی

خزاں ہوشیارپوری

خموشی میں بھی ہوتا ہے کبھی تقریر کا عالم
زبانِ بے زبانی کو زباں کہنا ہی پڑتا ہے

تسلسل زندگی کا کاٹنے سے بھی نہیں کٹتا
ہمیں عمرِ رواں کو جاوداں کہنا ہی پڑتا ہے

ہر اک ذرہ ہے اس کی خاک کا خورشید سے بڑھ کر
وطن کی سرزمیں کو آسماں کہنا ہی پڑتا ہے

محبت اس قدر مجبور کر دیتی ہے طالب کو
کسی نامہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

تمناؤں کی مایوسی نے یہ بھی دن دکھائے ہیں
کہ اب اُجڑے چمن کو گلستاں کہنا ہی پڑتا ہے

بہت دشوار ہے ثابت قدم رہنا زمانے میں
بشر کی زندگی کو امتحاں کہنا ہی پڑتا ہے

نہ صرصر ہی کا اندیشہ نہ بجلی کا خطر باقی
مجھے کنجِ قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

اقبال سکندر شاہین

صبح کو روز شبنمی قطرے — اُس کے انجام پر ہیں صاف گواہ
باغباں ہے چمن میں گلچیں بھی! — حال بلبل بھی ہے اگرچہ تباہ
برق و باراں کے روز جھگڑے ہیں — جانتا ہے کہ ہے اُسی پہ نگاہ
مسکرا کر بتا رہا ہے پھول — کیسے ہونا ہے زندگی سے نباہ
اک تبسم ہی بس تمام حیات — سو زبانوں پہ بھی نہ آہ نہ واہ

شہاب جعفری

یہ مری زیست کے تعبیر بدلتے ہوئے خواب — سوچتا ہوں کہ محبت کا یہ عنوان بھی ہیں
کیسے ویران خلاؤں کو کریں گے آباد — سوچتا ہوں کہ یہ بے جان بھی ویران بھی ہیں
یاد ہے جیسے ہی اک رات نے دامن جھٹکا — ایک تارے نے سسکتے ہوئے دم توڑا تھا
ابھی خوابوں ہی سے بہلی تھی محبت میری — ہائے تم نے بھی کہاں ساتھ مرا چھوڑا تھا
ایک ہی خواب جسے خوابِ محبت کہہ لیں — زندگی پر مری چھایا ہے حقیقت بن کر
ایک عنوان سے اب کتنے ہی افسانے بنے — زندگی تلخ ہے اک رازِ محبت بن کر
لیکن امیدِ وفا کی نہیں ہوتی تسکین — جانتا ہوں کہ یہ تعبیرِ محبت بھی نہیں
زندگی اتنے فریبوں سے عبارت ہے مگر — تم سے بے مہریِ الفت کی شکایت بھی نہیں

شمعِ دل راہِ محبت میں جلاتا ہوں میں
تم سے امیدِ وفا اب بھی لگاتا ہوں میں

کرتار سنگھ دُگل

بِشو اور بِشو کے بیٹے

بِشو اب بوڑھا ہو گیا تھا۔ سفُوڑی پر دھاگے سے بندھی ہوئی اُس کی ڈاڑھی سپید ہو گئی تھی۔ ڈھلتی پڑتی ہوئی آنکھوں پر بھویں دودھیا ہو گئی تھیں۔ پیپل کی چھاؤں میں چبوترے پر بیٹھا ہوا دن بھر اب وہ تاش نہیں کھیلا کرتا تھا۔ اور اب اُسے کسی نے کنویں کے قریب والے میدان میں کبھی کسی سے لڑتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ بِشو اب اپنے چھوٹے کے چھیجے کے قریب بھی نہ بیٹھتا۔ کہیں لین دین کے معاملے میں اُس کی کسی کے ساتھ نوک جھونک نہ ہو جائے۔

شام کو گوردوارے میں بِشو "رہراس صاحب" کا پاٹھ سننے کے لئے جاتا سویرے سب سے پہلے سر جھکانے کے لئے وہ پہنچا ہوا ہوتا۔ دن بھر اپنے پوتے کو اُٹھائے ہوئے کھلاتا رہتا۔ جب اس کی بیوی یا اُس کی بہو کنویں پر پانی بھرنے کے لئے آتی تو وہ کنویں میں سے پانی کی بالٹیاں نکال کر اُن کے ملٹوے بھرتا رہتا۔ اگر اُن کے ساتھ پڑوسی کی کوئی عورت ہوتی تو وہ اُس کا ہاتھ بھی بٹا دیتا۔ گلی میں کوئی پتھر کوئی ٹھیکرہ پڑا ہوتا تو اُسے اُٹھا کر ایک طرف کر دیتا۔ تکیئے کے چبوترے پر چڑیوں کے لئے دانے بکھیرتا رہتا۔ کھدر کے صاف ستھرے کپڑے پہنتا۔ آجکل اُس کا جوتا بھی بہت صاف ہوتا۔

لیکن بِشو کے شباب کی کچھ اور ہی کہانیاں مشہور تھیں۔ اُس نے کئی بار نقب لگائی۔ اَن گنت چوریوں کے جرم میں وہ پکڑا گیا۔ اپنے بچوں کی ماں کو وہ کہیں سے نکال لایا تھا۔ بہت فساد ہوئے جھگڑے ہوئے۔ گاؤں کے ہر شخص کے ساتھ اُس کی تُو تُو مَیں مَیں رہتی۔ جس طرح اُس نے گاؤں کے چودھری کی بہو کی بالیاں لوٹی تھیں وہ واقعہ آج تک کسی کو بھولا نہیں تھا۔ آدھی رات کو بھرے پُرے دالان میں سوئی ہوئی لڑکی کے کانوں میں پڑی ہوئی بالیوں کے گرد اُس نے ربڑ کی ڈور باندھی اور خود بیری پر چڑھ گیا۔ اوپر پہنچتے ہی اُس نے ڈور کھینچی۔ لڑکی بلبلا اُٹھی۔ لیکن کانوں کو نوچتی ہوئی بالیاں کھنچیں اور بیری پر جا پہنچیں۔ گھر والے سونٹے اُٹھائے، چھوئیاں اُٹھائے چور کو ڈھونڈنے دوڑ پڑے۔ آہستگی کے ساتھ بِشو بیری پر سے اُترا اور گاؤں کے لوگوں میں شامل ہو گیا۔ اگر وہ سنار کے ہاں بالیاں بیچتا ہوا نہ پکڑا جاتا تو کسے اس کی اس حرکت کا پتہ چلنا تھا۔ اور پھر جب بِشو کا جوان بیٹا مرا، اتنی کڑیل موت پر گھر والوں کے اوسان بگڑے ہوئے تھے۔ اُدھر لوگ اس کا جنازہ لیکر نکلے اِدھر اس نے سنسان گھر کا سب کچھ لُوٹ لیا۔

اُوپر تلے کئی چوریوں کے جرم میں پکڑے جانے کے سبب خاص طور پر چودھری کی بہو کے کانوں کا جو اُس نے ستیا ناس کیا تھا، گاؤں والوں نے بِشو کا نام دس نمبر میں لکھوا دیا۔

۔۔۔۔۔۔۔ اور لوگ اُسے بِشو دس نمبریا کہنے لگے۔

دس نمبر میں اُس کا نام ہونے کی وجہ سے علاقے میں جہاں کہیں بھی چوری ہوتی بِشو کی کمبختی آ جاتی۔ ہر شام کو اُسے نمبردار کے گھر حاضری دینے کے لئے جانا پڑتا۔ گاؤں میں کوئی سپاہی آتا تو اسے اردلی میں رہنا پڑتا۔ پاؤں دباتا۔ مالش کرتا۔ اُن کے گھوڑوں کے لئے چارہ کاٹ کے لاتا۔ ساتھ ہی اُن کی ٹھوکریں کھاتا۔ گالیاں سنتا۔ کئی چوریوں کا بِشو کو قطعاً پتہ نہ ہوتا، مار کھا کر جھوٹ مُوٹ ہاں کر دیتا۔ اور چھ چھ مہینے سال سال کی قید کاٹ آتا۔

اور یوں ذلیل و خوار ہوتا ہوا بِشو بوڑھا ہو گیا۔ اُس کے بچے جوان ہو گئے۔ اُس کے ایک بیٹے نے دس جماعتیں پاس کر لیں۔

اُس کی دو بیٹیوں کا قد پیڑ اتنا اونچا ہو گیا۔ اس کا ایک اور بیٹا شادی کے قابل تھا، اُس سے دو اور چھوٹے تھے۔

بشو دس نمبریا تھا۔ اس لئے اس کے بیٹے کو کوئی ملازمت نہیں دیتا تھا۔ بشو دس نمبریا تھا اس لئے اس کی بیٹیوں کا کوئی رشتہ نہیں لیتا تھا۔ اُس کے بیٹوں کو بیویاں نہیں ملتی تھیں۔ اور بیاہے جانے والے بیٹے گاؤں پر بار تھے۔ بیاہی جانے والی بیٹیاں سارے گاؤں کی تشویش تھیں۔ سوچ سوچ کے آخر گاؤں کے معززین نے بشو کا نام دس نمبر میں سے کٹوا دیا۔ اونچے اونچے قد کے بچوں اور سپید دودھیا ڈاڑھی کے ہوتے لوگ سوچتے اب بشو کیا کر سکتا تھا۔ ڈاکے کیا ڈال سکتا تھا۔

نام کٹنے کی دیر تھی کہ بشو کا بیٹا "مور گاہ" تیل کے کارخانے میں بھرتی ہو گیا۔ پہلے اُس کی ایک بیٹی کا رشتہ آیا۔ پھر دوسری بھی بیاہی گئی۔ کارخانے میں بشو کے بیٹے کا کام تھا، موم کی بتیاں گن گن کے ڈبوں میں ڈالے جائے۔ ڈبے بند کرنے والے اور تھے۔ بشو کا بیٹا اپنے کام میں اتنا ہوشیار ہو گیا تھا کہ کچھ دنوں کے بعد ہی اُس کے ہاتھ میں اتنی ہی موم بتیاں آتیں جتنی کہ ڈبے میں پڑ سکتیں۔ گنتی کی اُسے ضرورت ہی نہ پڑتی۔ آنکھ کے جھپکانے میں وہ ڈبے بھر بھر کے اپنے سامنے پھینکے جاتا۔ جو کام لوگ سارے دن میں کرتے، بشو کا بیٹا اُسے ایک گھنٹے میں نبٹا کر فارغ ہو جاتا۔ پھر وہ اپنے حصے کے ڈبوں میں موم بتیاں بھی بھرتا۔ ڈبے بند بھی کرتا۔ اور اُن پر مار کے بھی چپکاتا۔

افسر بشو کے بیٹے کی پھُرتی پر حیران تھے اور اُسے ترقی پر ترقی ملنی شروع ہوئی۔ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ بڑا مستری بن گیا۔ پورے دو سو روپے اُس کی تنخواہ تھی۔ ساتھ ہی اور کئی سہولتیں بھی اُسے حاصل تھیں۔

بشو بڑے مستری کا باپ تھا، اُس نے اُجلے کپڑے پہننا شروع کر دئے۔ بشو کا ایک اور بیٹا چھابڑی لگاتا تھا۔ وہ بھی دال روٹی کما لاتا۔ بشو کی آمدنی گاؤں کے کئی لوگوں سے زیادہ تھی۔

اُس کے مستری بیٹے کے لئے رشتے آنے شروع ہو گئے، اور پھر اُس نے ایک اچھے گھر کا رشتہ منظور کر لیا۔

بشو کا اصلی نام بشن سنگھ تھا۔

پھر بشو کی بہو آ گئی۔ میکے کی طرف سے جس کے گاؤں کے کئی معزز گھرانے رشتہ دار تھے گاؤں کے پنچوں اور چودھریوں کے گھروں کی بہو بیٹیاں بشو کی بہو کے ساتھ اُٹھتی بیٹھتیں ہنستی کھیلتیں کہیں کسی گھر میں شادی غمی ہوتی بشو وہاں شریک ہوتا۔ کبھی جھگڑوں کو وہ بیچ میں پڑ کے نبٹا دیتا۔ گوردوارے کا چبوترہ جب نیا بنا بشو نے اپنے نام کی وہاں سنگ مرمر کی سِل لگوائی۔ اُس پر لکھا تھا۔

"سردار بشن سنگھ نے پچاس روپے اپنے پتا چودھری
بھگوان سنگھ کے نام پر بھینٹ کئے"

لوگوں کو اب یاد بھی نہیں رہا تھا کہ بشو کا باپ بھگوانا گلیوں میں سڑ سڑ کے مرا، اُس کے جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے، اور اُس کا جنازہ اُٹھانے کے لئے کوئی ہاں نہیں پھٹکا تھا۔

پھر بشو کے گھر پوتا ہوا۔ ڈھول اور شہنائیاں بجیں مٹھائیاں بانٹی گئیں ہر شخص بشو کو مبارکباد دینے آیا۔ بشو نے جی بھر کے اپنے ارمان نکالے۔

گاؤں کا سب سے بڑا چودھری اپنی بہو کے نوچے ہوئے کان بھول کر بشو کی صلاح لینے کے لئے کبھی کبھار آتا۔ بشو کے بیٹے کے رسوخ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لوگ مٹی کے تیل کے کارخانے سے سستا تیل نکلوا لیتے۔ بہت سوں کے بیٹوں کو بشو کے بیٹے نے کارخانے میں ملازم کروا دیا۔ اور لوگ اُس کے احسان کا ذکر کرتے رہتے۔ بشو کے بیٹے کی سائیکل گاؤں بھر میں سب سے بڑھیا تھی۔ دیوالی کے روز اُن کے گھر میں سب سے زیادہ موم بتیاں روشن کی جاتیں تھیں۔

بشو کی بہو آئے دن ریشمی کپڑے پہنتی۔ پاؤڈر لگاتی۔ سُرخیاں لگاتی۔ گہنوں سے سدا لدی رہتی۔ پڑوسنیں حیران ہوتیں کہ چوتھے دن وہ ایک نیا گہنا بنوائی تھی۔ بشو خوش تھا، بہت خوش تھا۔ وہ سوچتا کہ تائب ہو کر اپنی باقی عمر وہ شرافت سے گزار کر اپنے گناہ بخشوا لے گا۔ تھوڑا بہت اُس نے پاٹھ بھی حفظ کرنا شروع کر دیا۔ کنگالوں اور غریبوں کو وہ کبھی گھر سے خالی ہاتھ نہ لوٹاتا۔ اپنی بیوی کو ہمیشہ نیک بخت کہہ کر پکارتا۔

بشو نے ایک بھینس رکھی۔ ایک گائے رکھی۔ ذیلدار کا جس گھوڑی کے لئے سودا نہ ہوا اُس نے خرید لی۔ تنگدست، محنت کش اُس کے گھر سے لسّی لینے آتے۔ اڑوس پڑوس میں اس کی بیوی دہی اور مکھن بیچ بیچ کر ساکھیں بناتی رہتی۔

کچے کوٹھے گرا کر بشو نے انھیں پکا کر دیا۔ اوپر چوبارہ بنایا جس میں اُس کا مورگاہ کا مستری بیٹا اور اس کی بہو رہتے تھے۔ ساتھ والا کوٹھا خرید کر اس نے اپنے دالان کو فراخ کر لیا۔

بشو کے نئے گھر کے کئی دروازے ہو گئے تھے۔ ہر روز رات کو سونے سے پہلے وہ ایک ایک کھڑکی اور ایک ایک دروازے کو اچھی طرح سے بند کرتا۔ اوپر کے چوبارے کے دروازے جب اُس کا بیٹا اور بہو کھلے چھوڑ کے سو جاتے تو اُن پر خفا ہوتا۔ بشو کو فکر رہتی کہ اُن کا گھر دائیں سے سُونا تھا۔ بائیں سے بھی گلی ویران تھی۔

کئی بار رات کو سوتے میں وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا۔ پتہ نہیں وہ کیسے کیسے بُرے خواب دیکھتا رہتا تھا۔ ایک بار اُس کی بھینس دیوار میں اپنے سینگ مار رہی تھی، بشو کو یوں معلوم ہوا جیسے اُس کے گھر میں کوئی نقب لگا رہا ہو، اور اُس نے سارے کنبے کو بیدار کر دیا۔

سردیوں کی ایک رات کو بشو دیر کرکے جب باہر سے آیا تو اُس نے حسبِ معمول ہر کھڑکی کو دیکھا۔ ہر دروازے کی کُنڈی کو ہاتھ سے کھینچ کر اپنا اطمینان کیا۔ ہر کونے میں جھانکا۔ اور اس طرح تُوڑی والے کمرے میں داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک چور وہاں چھپا بیٹھا ہے۔ بشو کو دیکھتے ہی وہ اس کے قدموں پر گر پڑا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اُسی کی پگڑی اُتار کر اُس کی مشکیں کس دیں اور اُسے کمرے میں محبوس کر دیا۔

بشو اب سوچ رہا تھا کہ وہ گھر والوں کو اُٹھا کر انھیں بتائے کہ نہ بتائے۔ نمبردار کو اطلاع دے کہ نہ دے۔ اُسے اپنی اذیتیں یاد آتیں۔ پولیس والوں نے کئی دفعہ اُسے یونہی پگڑی سے باندھا تھا۔ پولیس والے کتنا پیٹتے تھے۔ چھت سے ٹانگ ٹانگ کر، زمین پر لٹا لٹا کر اور پھر وہ جو کئی دفعہ اُسے تین تین دن سونے نہیں دیتے تھے۔ مرچوں کی دھونی نتھنوں میں چڑھاتے۔ اور یوں سوچتا ہوا بشو سو گیا۔

اگلے روز وہ صبح سویرے اُٹھا، گھر کے باقی لوگ ابھی تک سوئے پڑے تھے۔ تُوڑی والے کمرے میں جا کر اُس نے چور کی مشکیں کھول دیں۔ گُڑ کی پانچ بھیلیاں اپنی جیب میں سے نکال کر اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اُسے باہر دھکیل دیا۔

پھر حسبِ معمول بشو کنوئیں پر جا کے نہایا۔ حسبِ معمول اُس نے گوردوارے میں سر جھکایا۔ حسبِ معمول گھوڑی لے کر لوگوں کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینے کے لئے کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ کوئی بارہ بجے کے قریب بشو حسبِ معمول کھانا کھانے کے لئے گھر لوٹا۔ کیا دیکھتا ہے کہ پولیس اُس کے دالان میں بیٹھی ہے، اور اُس کے گھر کا سارا سامان اُنھوں نے باہر نکال کر رکھ دیا ہے۔ اور سب سے اندر والی کوٹھڑی میں رکھے ہوئے کنستر سکّے سے بھری ہوئی بالٹیاں۔ گریس کے ٹین۔ موم بتیوں سے منہ تک بھری ہوئی بوریاں۔ ٹرنک، صندوق، ڈول۔ دیگچیاں اور ناندیں۔ مورگاہ کے کاغذوں کے رموں کے ریم، مورگاہ کے دفتر کی پنسلیں، قلم، نبیں، سیاہیوں کی بوتلیں، مورگاہ کے کارخانے کے پیچ۔ ڈبریاں، رینچ، پلاس، ہتھوڑیاں، مورگاہ کے رنگ، وارنش اور قلعی کا سامان۔

بشو ہکّا بکّا رہ گیا۔ مورگاہ میں کام کرنے والا اُس کا مستری بیٹا، آج صبح جاتے ہی پکڑا گیا۔ کسی نے مخبری کر دی۔ اور پولیس کی ڈانٹ ڈپٹ پر اُس نے سب کچھ کہہ دیا۔

وکیلوں کے کہنے سننے پر بشو نے اپنے بیٹے کے مقدمے کی پوری پوری پیروی کی۔ گھر میں جو کچھ بھی تھا بک گیا۔ بھینس بک گئی۔ گائے بک گئی۔ گھوڑی بک گئی۔ مکان بک گیا۔ رکھا جوڑا سب پیسہ پانی کی طرح بہہ گیا، اور آخر میں بشو کے بیٹے کو تین سال قید کی سزا ہوئی۔

جس دن اُس کا خاوند پکڑا گیا بشو کی بہو اپنے میکے چلی گئی۔ گاؤں کے لوگوں کو کیا منہ دکھاتی۔ بشو کے بیٹے کو سزا ہوئے ابھی دو دن ہوئے تھے کہ وہ کسی کے ساتھ نکل گئی۔ سارے کا سارا اپنا زیور اُس کے پاس تھا۔ جو گوکھڑو، جھمکے اور بالیاں بشو کی بیوی اُس کے ساتھ بیاہ کر لائی تھی وہ بھی بہو رانی سمیٹ کر ساتھ لیتی گئی۔

مقدمے کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا بشو کبھی گوردوارے جاتا کبھی نہ جاتا۔ آہستہ آہستہ اُس کا گوردوارے جانا بھی چھوٹ گیا۔ مقدمے کی مصیبتوں کا مارا بشو ہر گھڑی سہما سہما سا رہتا۔ بات بات پر بگڑنے کو اُس کا جی چاہتا۔ کبھی اپنے آپ پر جبر کر لیتا اور کبھی نہ کر سکتا۔ بھک منگے اور فقیر اُسے ایک آنکھ نہ بھاتے۔ کئی بار وہ دروازے پر کسی کو کھڑا ہوا دیکھ کر اُسے مارنے کے لئے دوڑتا۔ پیپل کی چھاؤں میں اُس کا بیٹھنا بند ہو گیا۔ اُس نے تکیے کی طرف جانا بھی چھوڑ دیا۔ بہو گئی تو اپنے ساتھ لوٹا

بھی لے گئی۔ بشو کو پتہ نہیں لگتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کیا کرے۔ دن بھر تنہا، دن بھر بیکار، دن بھر خالی۔

پھر ضرورتوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا، مانگوں اور مطالبوں نے مجبور کرنا شروع کیا، مفلسی قدم قدم پر آ کے آفت بپا کرتی۔ کبھی گھر میں کچھ پکتا، کبھی نہ پکتا۔ بچے آپس میں لڑتے۔ بیوی لپک لپک کر آن کو کاٹ کھانے کے لئے دوڑتی اور اس طرح دن گزرتے رہے، گزرتے رہے، اور پھر گزرنے مشکل ہو گئے۔ بشو بوڑھا ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں ہلاتا بھی تو کیا کر لیتا۔ اب اُس کا دوسرا بیٹا بھی جوان تھا اور تیسرا ابھی ہٹا کٹا تھا۔

بشو سوچتا رہتا، سوچتا رہتا۔ اپنے شہتیر کے سے جوان بیٹوں کا وہ کیا کرے۔ اپنے نحیف اعضا کا وہ کیا کرے؟

اور پھر ایک روز صبح سویرے ہی گاؤں بھر میں شور مچ گیا۔ بشو اور بشو کا بیٹا ایک گھر میں نقب لگاتے ہوئے موقع پر پکڑے گئے۔ دونوں کو ڈھائی ڈھائی سال کی قید کی سزا ہوئی۔ بشو کا نام پھر دس نمبر میں لکھا گیا۔ اور اُس کے سب بیٹے نو نمبر میں گنے جانے لگے۔

فراق گورکھپوری

بادۂ کہن

(۱)

ہر اشارے میں نہ جانے کتنی گھاتیں پائیاں
نرگسِ غمّاز ہم نے تیری باتیں پائیاں
دیکھنے والوں نے تجھ میں دیکھیاں صد شانِ حُسن
سوچنے والوں نے کیا کیا تجھ میں باتیں پائیاں
بے خبر ہرگز مزاجوں سے نہیں دَورِ فلک
جو ہمیں سے کٹ سکیں ہم نے وہ راتیں پائیاں
اب تو کُھل جا ہم جہاں دیدوں سے تو اے زندگی
تیری باتیں پائیاں سب تیری گھاتیں پائیاں
کیا ہیں بس ہنسنے ہنسانے ہی کو ایامِ نشاط؟
رونے دھونے کے لئے کیا غم کی راتیں پائیاں؟
چار دن کی زندگی کو جاودانی کر گئے
مرنے والوں نے ترے کیا کیا حیاتیں پائیاں
غیب کی آنکھوں سے بھی رہتی ہیں جو اوجھل سدا
حُسن کی دزدیدہ نظروں نے وہ گھاتیں پائیاں
جو نہ تھیں شائستۂ غم اپنی نظروں میں فراق
شادکامانِ زمانہ نے وہ راتیں پائیاں

(۳)

گیسوئے نمناک پھر راتیں تری یاد آئیاں
نرگسِ چالاک پھر باتیں تری یاد آئیاں
جیسے کچھ بُھولے ہوئے سے ہوں ترے قول و قرار
آج دل کو بے کہی باتیں تری یاد آئیاں
مجھ کو تنہا جیتے جیتے اک زمانہ ہو گیا
بعد مُدّت کے ملاقاتیں تری یاد آئیاں
پھر دو پہر رات کی پرچھائیاں بڑھنے لگیں
وہ کُھلے بالوں ملاقاتیں تری یاد آئیاں
اور سنّاٹا شبِ تاریکِ غم کا بڑھ گیا
جب سکوتِ ہجر میں باتیں تری یاد آئیاں
آج کچھ کھویا ہوا سا تھا میں اے چشمِ سیاہ
دیر تک راتیں تری باتیں تری یاد آئیاں
کیف سے خالی گھٹائیں دیکھ کر پردیس میں
شہرِ گورکھپور برساتیں تری یاد آئیاں
قولِ مرگِ ناگہاں اس کی نظر سے ہے فراق
سب کہاں گنتی کی کچھ گھاتیں تری یاد آئیاں

اظہر علی فاروقی

مولانا شبلی کی مقالہ نگاری

شبلی نے مذہب کی گود میں آنکھ کھولی۔ اور اپنے گرد و پیش اسی کے چرچے سنے۔ چنانچہ انھوں نے درس نظامیہ کی تکمیل کی اور محض ۱۹ سال کی عمر میں حج بھی کر آئے جس کا رسمی تقاضا تو یہ تھا کہ عربی درس و تدریس اور دینی تبلیغ کو اپنا مشرب بلکہ پیشہ بناتے۔ مگر اس کے خلاف انھوں نے وکالت کو اس پر ترجیح دی۔ اور جب یہ پیشہ اُن سے نہ نبھ سکا تو بھی گرد و پیش کے علمائ کی رسمی معاشرت سے جداگانہ سرکاری ملازمت سے سلسلہ جوڑا اور عدالت دیوانی میں امین ہو گئے۔ مگر وہاں سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ اس تلوّن اور تغیّر پسندی سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا رجحان اپنے لئے کسی ایسے ماحول کا جویا تھا جو ان کی فطرت سے سازگار ہو۔ شبلی کا یہ اضطرار اور تلوّن دراصل ایک ایسے پس منظر سے وابستہ ہے جس کا تعلق بہت کچھ ان سیاسی اور معاشرتی تحریکات سے تھا، جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہمارے ملک میں بڑی تیزی سے اپنا کام کر رہی تھیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ماحول کی مادّی بنیادوں پر ہی ادیب اپنے شعور کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ جس طرح انسان کو ماحول بدلنے پر قدرت حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ ماحول میں انسان کا ذہنی شعور اور وقت کے تقاضوں میں ہم آہنگی نہ ہو۔ چنانچہ شبلی کا ماحول سمجھنے کے لئے ہمیں اگلی تاریخ کے چند ورق الٹنا ہوں گے۔ شبلی نے وہ زمانہ پایا جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو چکا تھا اور اس کے مابعد اثرات سے ایک نئے طبقاتی ڈھانچے کی تشکیل ہو رہی تھی۔ بدیشی راج آکاش بیل کے مانند سارے ملک پر چھا چکا تھا۔ سامنتی تمدّن نے حرفتی تمدن کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے۔ مشینوں کی بدولت ہلوں اور کرگھوں پر فالج گر چکا تھا، اس حرفتی تمدن اور برٹش سامراج کے اثرات پوری طرح اُبھر رہے تھے جس کی گونج سر سید احمد خاں کی انگریز پرستی میں سنائی دے رہی تھی۔

جس نے علی گڑھ تحریک کے روپ میں جنم لیا، اور جو دراصل سامنتی نظام کی شکست کا پورا پورا اعتراف تھا، یہ تحریک اس تباہی اور بربادی کا ردِّ عمل تھی جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اور اس کے بعد مسلمانوں پر نازل ہوئی تھی۔ سر سیّد کے سیاسی شعور نے شکست خوردہ نیم جان اور سسکتے ہوئے مسلمانوں کے لئے اسی میں مفر سمجھا کہ وہ برٹش سامراج کی وفاداری کا دم بھریں اور ان کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ برٹش سامراج کے ذہن نشین کرا دیں کہ وہ مسلمانوں پر ظلم کرنے کے عوض اُن کی دوستی پر بھروسا کرے۔ اس طرح فریقین میں سمجھوتا کرا دینے کی یہ کوشش پریشان حال اور برباد شدہ مسلمانوں کے لئے ایک مژدۂ جاں بخش ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس تحریک کا تعلق عوام یا جنتا سے بالکل نہیں تھا اور اس کا جادو محض سرمایہ داروں اور متوسط طبقے کے ایک مخصوص گروہ ہی پر چل سکا۔ شبلی کے سیاسی اور ذہنی شعور نے اسی ماحول میں نشو و نما پائی۔ وہ نہ تو علمائے دیوبند کی سرگرمیوں سے اثر پذیر ہوئے اور نہ "اودھ پنچ" کے طنزی مضامین اُن پر اثر انداز ہو سکے۔ بلکہ وہ علی گڑھ تحریک کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسری کی حیثیت سے علی گڑھ کے مستقل قیام نے اُن کے اس ذہنی نشو و نما میں اور بھی شگفتگی پیدا کر دی۔ سر سیّد اور ڈاکٹر آرنالڈ کی صحبتوں سے اُن کی تغیر پسند ذہنیت کو تقویت ضرور پہنچی۔ مگر اتنی نہیں کہ وہ انہیں روایات شکنی پر آمادہ کر دیتی اور قدامت پرستی سے باز رکھتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا شبلی کا رجحان اسلامیاتی سوانح نگاری کی طرف مبذول ہوا۔ المامون اور النعمان منصۂ شہود پر آئیں اور بے حد مقبول ہوئیں۔ سچ پوچھئے تو یہ کام انسانی فطرت کا ایک ایسا مظاہرہ ہے جو اُسے تہذیب کی غارتگری کے بعد مرثیہ خوانی پر مجبور کرتا ہے اور اس کیا

مردہ پرستی کا جذبہ اُبھارتا ہے۔ مگر شبلی کو قعرِ مذلت میں گرے ہوئے انسانوں کو جگانے کے لئے ماضی پرستی سے بہتر کوئی دوسرا حربہ ہاتھ نہ آیا اور اس طرح اُن کا یہ خطیبانہ جذبہ اُن مقالات کی صورت میں نمودار ہوا جو جلد اوّل میں مذہبی مقالات کے نام سے جمع کئے گئے ہیں۔ یہ مضامین کیا بلحاظ موضوع اور کیا بلحاظ اسلوب سب کے سب غیر دلچسپ اور روکھے پھیکے ہیں، اور اسلوب بھی کچھ بے جان سا ہے۔ چند مذہبی مسائل کو منطقی اور قدیم فلسفے کی روشنی میں دکھانے کی کوشش محض کی گئی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں۔ قضا و قدر اور قرآن مجید۔ خلافت وغیرہ۔ اسی جلد میں ایک مقالہ الجزیہ البتہ تحقیقی اور معلوماتی نقطۂ خیال سے قابل قدر ہے۔ شبلی نے اس کی اصلیت، ماخذ۔ نوعیت۔ نفاذ۔ اس کی ارتقائی کیفیتوں اور تبدیل شدہ حالتوں پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسری اور چوتھی جلد کے مقالات جنھیں ادبی اور تنقیدی مقالات کا نام دیا گیا ہے، زیادہ تر ترجمہ اور ماخوذ ہیں۔ اور اردو زبان سے غیر متعلق یہ مقالات الندوہ (لکھنؤ) علی گڑھ کالج منتھلی میگزین میں شائع شدہ ہیں۔ مگر علی گڑھ تحریک کا منشا یہاں بھی کارفرما ہے۔ جو تہذیب، معاشرت اور ادب غرضیکہ ہر محاذ پر مذکورہ نفسیات کی روشنی میں کام کر رہی تھی انگریز پرستی کا جذبہ اس طرح تراوش کرتا ہے۔

"ہم نہایت فیاض دلی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں
کہ یورپ کو آج کل ہمارے علوم و فنون کے ساتھ جو اعتنا
ہے اور جس طرح وہ ہمارے قدیم خزانوں کے بیش بہا
نوادر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کر رہا ہے ہم خود نہیں کرتے
بلکہ نہیں کر سکتے ......" (جلد ۴ صفحہ ۱)

مجموعی حیثیت سے اُن کا مقصد صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کے پارینہ کارناموں یا اُن کے علمی اور ادبی شہ پاروں کو روشنی میں لایا جائے، اور اُن لوگوں تک پہنچایا جائے جو عربی اور انگریزی زبان سے نابلد ہونے کے باعث اِن سے بے خبر ہیں۔ ادبی مضامین میں عربی زبان، شعر العرب، نظم القرآن اور جمہرۃ البلاغۃ اسی نوعیت کے مضامین ہیں۔ یہ مقالات معلومات کے لحاظ سے تشنہ اور نامکمل سے ہیں۔ مثال کے طور پر عربی زبان کے ابتدائی جملے لیجئے:

"دُنیا میں یوں تو سیکڑوں ہزاروں زبانیں مروّج اور مستعمل
ہیں، لیکن سب کی اصل الاصول صرف تین زبانیں ہیں...
(جلد ۲ صفحہ ۱)

ان تین زبانوں میں سے مولانا شبلی نے محض ایک زبان — سامی کا ذکر کیا اور باقی زبانوں یعنی حامی، آریائی وغیرہ کے نام تک نہیں لئے۔

عربی اور سُریانی زبان کا فرق بتاتے ہوئے صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں: "جن الفاظ عربی میں ث ہے ...... وہ سُریانی میں ت سے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ثلیج تلج، ثلاثہ تلاتہ وغیرہ" آگے چل کر اسی کو اس طرح لکھ جاتے ہیں...... اور سریانی میں ت سے لکھے جاتے ہیں"۔ اگرچہ یہ غلطی کتابت اور تصحیح کی بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ مگر وہ عوام اور اکثر نوجوان طلبا، جو مولانا شبلی کو تحقیقات اور تنقیدات کا پیغمبر سمجھے بیٹھے ہیں، یقیناً غلط فہمی کا شکار بن جائیں گے۔

اس جلد کے آخری پانچ مقالات سر سید مرحوم اور اردو لٹریچر۔ املا اور صحت الفاظ اردو ہندی بھاشا زبان اور مسلمان، تحفۃ الہند ہماری اپنی زبانوں کے متعلق ہیں۔ اردو املا اور صحت الفاظ ایک کامیاب اور مفید مقالہ ہے جس پر آجکل بھی بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ مگر یہاں بھی مولانا نے کچھ زیادہ کاوش اور تحقیق سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ وہ خود ایسا ہی تسامح برت جاتے ہیں جس سے انھیں نفرت ہے۔ ہماری زبان کی گرامر کا ایک کھلا ہوا اصول ہے کہ جن اسما کے آخر میں الف ہو حروف مغیرہ کے اثر سے وہ الف یے سے بدل جاتا ہے۔ اس کلیے سے مستثنیات کی فہرست ذرا طویل ہے۔ چنانچہ اس میں عربی اور ہندوستانی الفاظ مثلاً ہوا، دِدا۔ راجا۔ بدھیا۔ انگیا وغیرہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مگر املا اس استثنا میں نہیں آتا۔ اور عام طور پر حروف مغیرہ سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور ہم اس طرح بولتے ہیں۔ اِملے کی غلطیاں نہ کہ اِملا کی غلطیاں (جلد ۲ صفحہ ۲۷)

مذہبی نقطۂ نظر سے پیغمبرِ اسلام محمد پر "ص" اور دوسرے انبیائے کرام کے ناموں کے ساتھ "ع" یا آئمہ کے ناموں پر "رض" لگاتے ہیں۔ مگر عام ناموں کے ساتھ جب یہی نام اُن کے جُز بن جاتے ہیں تو اِن اجزا سے وہ شخصیتیں مراد نہیں ہوتیں بلکہ وہ انسان مراد ہوتا ہے جس کا یہ نام رکھ دیا گیا ہے جس کے کچھ معنی مراد نہیں لئے جاتے اور نہ لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً عبد العلی سے یہ کبھی نہیں سمجھا جاتا کہ جس شخص کا یہ نام ہے وہ علیؑ کا غلام ہے۔ اسی طرح حسین علی

محمد علی ۔ رحمت علی ۔ محمد ابراہیم وغیرہ ۔ ایسی حالت میں اُن کے ساتھ فقہی نقطۂ نظر سے کوئی علامت نہیں لگانا چاہیئے ۔ مگر تعجب ہے کہ مولانا شبلی فقیہہ اور محدثؒ ہونے کے باوجود اپنے نام کے جُزو محمد پر ہر جگہ م لگاتے ہیں، اور اس کو اس طرح لکھتے ہیں، محمدؐ شبلی،

اردو ہندی، بھاشا اور مسلمان اور تحفتہ الہند دراصل اس فرقہ پرست ذہنیت کا نتیجہ ہیں جو اُس وقت چند ہندؤں اور مسلمانوں کے ذریعے سے ملک میں پیدا ہو رہی تھی، اور جس کی لپیٹ سے ادب بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ بنکم چندر کے ناولوں میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مظالم کی بھی فہرستیں نظروں سے گزرتی ہیں۔ اردو میں مولانا شرر اپنے ناولوں میں ان کا جواب دیتے ہیں۔ مرہٹی زبان میں آپٹے ہی آدرش اپنے سامنے رکھ کر لکھنے بیٹھتا ہے۔ مولانا شبلی نے بھی اپنے ان مضامین میں اُن غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا اپنا فرض سمجھا اور درست سمجھا، جو زبان اور ادب کے بارے میں ایک کو دوسرے سے ہو گئی تھیں۔ بھاشا اور مسلمان کا شانِ نزول انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

"ناظرین کو یاد ہوگا کہ ایک سربرآوردہ ہندو ایڈیٹر نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں دعویٰ کیا تھا کہ مسلمانوں نے تعصب کی وجہ سے ہندی علم ادب پر کبھی توجہ نہیں کی۔۔ ۔۔۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ترجمے اور اشاعت کے علاوہ مسلمانوں نے خود بھاشا زبان میں کیا کیا تصنیفات کیں ۔۔۔۔۔۔ (جلد ۲ صفحہ ۷۹)

یہاں بھی مولانا شبلی نے بہت سطحی تحقیق سے کام لیا ہے، مثلاً وہ ملک محمد جائسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

۔۔۔"ہندوؤں میں سب سے بڑا شاعر آخر زمانے کا کالیداس گزرا ہے جس نے رامائن کا ترجمہ بھاکا میں کیا ہے نکتہ شناسوں کا بیان ہے کہ قدرت زبان کے لحاظ سے پدماوت کسی طرح رامائن سے کم نہیں ۔۔۔" (جلد ۲ صفحہ ۸۱)

آج کل ہندوؤں کو جانے دیجیئے مسلمان طلبا بھی جانتے ہیں کہ والمیک کی سنسکرت رامائن کے آدھار پر تلسی داس نے رامائن لکھی۔ کالیداس سے اس کا کیا تعلق ہے۔ وہ تو سنسکرت کا زبردست شاعر تھا۔ اس کے علاوہ کالیداس تقریباً ۱۰۰ سال قبل مسیح ہوا ہے۔ اور رامائن (رام چرتر مانس) اس کے سینکڑوں سال بعد لکھی گئی ہے۔

آگے چل کر اسی کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں "۔۔۔ اور بھی دو مثنویاں لکھیں جو اُن کے خاندان میں موجود ہیں" جب شبلی کالیداس اور تلسی داس میں امتیاز نہ فرما سکے تو اس کی اُمید کرنا محض وہم ہوگا کہ مولانا کم از کم اُن کے نام تو تحریر فرما دیتے۔ شاید اُن کی مراد (۱) اکھراوٹ اور (۲) آخری کلام سے ہوگی جو اب دستیاب ہیں اور پنڈت رام چندر شکل نے ملک محمد جائسی پر بڑی تحقیق کے بعد ایک مبسوط کتاب ہندی میں لکھی ہے۔ البتہ ان کے علاوہ دو اور مثنویاں ——— پوستین نامہ اور نیناوٹ ہیں جو دستیاب نہیں ہیں۔

تعجب تو یہ ہے کہ مولانا شبلی کے ہاتھ جو کتاب آگئی وہ محض اسی پر اکتفا کر بیٹھے۔ اس مقالے میں اُنھوں نے اپنی ساری چھان بین مولوی غلام علی آزاد کے ایک تذکرے سرو آزاد تک محدود کر دی اور کہیں ذرا بھی جنبش نہیں کی۔ ورنہ وہ مسلمان شاعر ہرگز نہ چھوٹ جاتے جو کافی شہرت کے مالک ہیں مثال کے طور پر ان کو یوں لیجیئے۔ رسکھان قطبن۔ رسلین۔ شیخ (ایک شاعرہ) واحد۔ دین درویش۔ بُلّے شاہ۔ عادل وغیرہ وغیرہ۔ مگر شبلی نے ان میں سے پہلے چار شاعروں کا نام بھی نہیں لیا۔ جن کے بغیر یہ مقالہ بالکل نامکمل رہ گیا ہے۔

تحفتہ الہند، اس مقالے کی تخلیق بھی اسی قسم کے جذبے کی رہین منت ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اور یہ اُسی جوابی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ ایک کتاب فنِ بلاغت پر ہے جو شہنشاہ عالمگیر کے عہدِ حکومت میں مرزا خاں بن فخر الدین نے تالیف کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا شبلی کا اتنا منشا تو ضرور پورا ہو گیا کہ مسلمانوں نے ہندی اور بھاشا کے علوم و فنون کو اپنایا۔ اس زبان سے دلچسپی دکھائی۔ مگر علمی حیثیت سے ایسے مضامین کو کوئی اہمیت نہیں۔ اور قاری کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ جہل مرکب کا شکار ہو جاتا ہے۔ زبان سے ناواقفیت کے سبب سے انھوں نے مصطلحات کا تلفظ کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔

سائڈرک (सामुद्रिक) کے بجائے سامدک (علم قیافہ)

وِینگ (व्यंग) کے بجائے ے ینگ (طنز یلیح)
اُپما (उपमा) .. اُپمان (تشبیہہ)
استعارے کی ہندی رُوپک (रूपक) کے بجائے پُست اُپمان
وِتی ریک (व्यतिरेक) کے بجائے وترکتا
نگر جا دُھن (नगरजाध्वनि) کے بجائے نگرجا دھوسان

یا

وِینجنا (व्यंजना ध्वनि) کے بجائے ,,

اس کے علاوہ بہت سے صنائع بدائع جو بہت ضروری اور مشہور ہیں۔ اُن کا مطلقاً ذکر نہیں ہے۔ مثلاً انوپراس (अनुप्रास) یمک (यमक) شلیش (श्लेष) اُت پریکھیا (उत्प्रेक्षा) وغیرہ۔

ممکن ہے اُس وقت لوگ ایسا خیال کرتے ہوں، اور یوں تو آج بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس وقت تو خود ہندوؤں نے چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع کئے ہیں۔ جن میں محض مسلمان شاعروں کے کادیہ کا انتخاب ہے۔ شری دیوگی ہری نے سجن سنگرہ کے نام سے گیتا پریس گورکھپور سے کئی مجموعے نکلوائے ہیں۔

تیسری جلد کے وہ مقالات جنھیں تعلیمی کہا جاتا ہے۔ تعلیم قدیم و جدید کے علاوہ سب کے سب نہایت سطحی ہیں اور وقتی افادیت کے حامل۔ مثلاً ندوہ اور نصاب تعلیم۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم۔ درس نظامیہ۔ قدیم تعلیم وغیرہ۔

چوتھی جلد کے وہ مقالات جن کا شمار تنقیدی مقالات میں کیا جاتا ہے، زیادہ تر ترجمہ ہیں۔ ان میں سے عمر خیام کا جبر و مقابلہ ہمایوں نامۂ گلبدن بیگم۔ مآثر رحیمی۔ تزک جہانگیری کسی حیثیت سے تنقید کی حدوں میں آجاتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ترجمہ اور ماخوذ ہیں۔

دراصل یہ مقالات اس فارغ البالی کے رہین منت ہیں جو انھیں علی گڑھ سے چلے آنے کے بعد قیام حیدرآباد دکن میں میسر ہوئی جب وہ محکمۂ تعلیمات کے ناظم تھے۔ ان کو پڑھنے کے بعد اُن کے مطالعے کی وسعت کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایسے ریویو ہیں جو انھوں نے ہر کتاب پڑھنے کے بعد الندوہ کے خالی صفحات پُر کرنے کے لئے لکھ دیئے۔ یا کسی دوسرے مصنف کے لکھے ہوئے مضامین کا ترجمہ کر دیا۔

اسلوب نگارش کے بارے میں سب سے پہلے جو چیز نمایاں اور قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہے مولانا کا ذاتی تشخص، جو قاری کی ذہنیت پر بُری طرح چھا جانا چاہتا ہے۔ یہاں شبلی کی شخصیت حالی سے بالکل جداگانہ ہے۔ حالی کو پڑھتے چلے جائیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت معمولی انسان اپنے قاری سے دوستانہ باتیں اور اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر شبلی کو پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ قاری کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہی ہے۔ باوجودیکہ مولانا شبلی انگریزی نہیں جانتے تھے۔ جس کا اعتراف وہ اس طرح کرتے ہیں: "ترجمے کی خوبی پر میں کچھ رائے نہیں دے سکتا کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا۔" (جلد ۴ صفحہ ۱۱) پھر بھی الندوہ کے پڑھنے والوں کے لئے مولانا نے اپنے مقالات میں بکثرت انگریزی الفاظ بھر دئے ہیں۔ جن میں سے بعض بعض تو محض اس لئے استعمال کئے گئے ہیں کہ وہ انگریزی ہیں یا یہ کہ مولانا انگریزی جانتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کہیں کہیں ان الفاظ کا استعمال بے محل کر بیٹھتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ "ڈِس کوریز" کا بے محل استعمال ملاحظہ فرمائیے۔

"مسلمانوں نے خود کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ علم جبر و مقابلہ کے موجد ہیں۔ لیکن اس فن میں ان کی اس قدر انکشافات (ڈسکوریز) ہیں۔ (جلد ۴ صفحہ ۱۶)"

یہاں پر ان کی مراد یقیناً تحقیقات سے ہے۔ جس کو ریسرچ کہہ سکتے ہیں۔ نہ ڈسکوریز (Rhetoric) کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔ "ریطوریقا وہی لفظ ہے جس کو انگریزی میں ریٹارک کہتے ہیں۔ اردو میں اس لفظ کا ترجمہ خطابت یا فنِ تقریر ہو سکتا ہے۔" (جلد ۴ صفحہ ۴) حالانکہ ریٹورک کے لئے فنِ بلاغت یا علمِ معانی و بیان موزوں لفظ ہے۔ فن تقریر کے لئے انگریزی میں "اُورے ٹری" کا لفظ مستعمل ہے۔

اسی طرح ان دو اقتباسات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے...... "فرنچ میں اس کتاب کا جو ترجمہ ہے اُس کے دیباچے میں تفصیلی ریویو لکھا ہے۔" اپنی لاعلمی کے ساتھ ساتھ قاری پر چھا جانے کی کوشش اس جملے سے صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ "لیکن ہمارے ملک میں فرنچ کتنے آدمی جانتے ہیں۔" (جلد ۴ صفحہ ۱۸) دوسرا موقع ملاحظہ فرمائیے۔

رالرحیم خان خاناں کے ترکی کلام کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں۔۔۔
ترکی کلام جو مصنف نے نقل کیا ہے چونکہ ہم اس کو نہیں سمجھتے اور نہ ناظرین میں
ئ ترکی داں ہے، اس لئے ہم نے قلم انداز کر دیا۔۔۔۔"

بائیوگرافی۔ پوزیشن۔ لیکچر۔ ڈسکوریز۔ تھیوری۔ آرٹیکل، لائف وغیرہ
یسے لفظ ہیں جو محض اس لئے استعمال کئے گئے ہیں کہ وہ انگریزی ہیں یہی
حال عربی الفاظ اور فقرات کا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر نذیر احمد کے مثل تو نہیں،
پھر بھی کہیں کہیں ان کا پرچھاواں پڑ جاتا ہے۔ خدا نے سچ فرمایا اور سچ فرمایا،
انا کُلِّ شئ خلقنٰہ تقدیر (جلد ۲ صفحہ ۲۰) جیسے جملے اور ترکیبیں قابلِ
غور ہیں۔

حالی کے مانند شبلی بھی اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی عبارت
منطقی حدود سے باہر نہ ہونے پائے۔ ان کے مذہبی مقالات اور ریویو
خصوصاً جرجی زیدان کی تصنیف تمدنِ اسلام کا ریویو، جزیہ، اسلامی
مدارس ایسے مقالات ہیں جن کو پڑھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا
ہے کہ طرزِ ادا میں عالمانہ اور منطقیانہ استدلال پایا جاتا ہے۔

مولانا شبلی کے وہ مضامین جو رسائلِ شبلی میں جمع کئے گئے ہیں ان سے
اسلامیاتی تاریخ کی معلومات میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر تحقیقات یہاں
بھی سطحی سی ہے۔

شبلی کے اسلوبِ نگارش میں حالی کی بہ نسبت کچھ ہلکی سی دلآویزی ضرور
ہے۔ اور یہ محض اس لئے کہ وہ حالی کے مانند بالکل سنجیدہ اور روکھے پھیکے
آدمی نہیں تھے۔ ورنہ ان کے مقالات کا اکثر حصہ نہایت خشک اور
غیر دلچسپ ہے۔ طرزِ ادا میں کوئی ایسی جدت یا دل فریبی نہیں پائی جاتی
جو قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کر سکے۔ چند مقالات کے علاوہ معلوماتی
اور تحقیقی نقطۂ نظر سے سطحی سے ہیں۔ اگر شبلی سے محض یہ مقالات ہی منسوب
ہوتے تو شاید شبلی حالی کے سامنے بہت ہی کم مقبول ہوتے اور ان مقالات
کو کوئی نہ پڑھتا۔

ادیب مالیگانوی

ذوقِ تعمیر

ہوش اڑتے ہیں یہ رنگِ بزم دوراں دیکھ کر　　آدمی کو آدمیت سے گریزاں دیکھ کر
اہلِ گلشن کا تڑپنا کس سے دیکھا جائیگا　　موسمِ گل میں بھرے گلشن کو ویراں دیکھ کر
سینۂ احساس پر ہر سانس ہے تیغِ رواں　　خونِ انساں کو برنگِ آبِ ارزاں دیکھ کر
مسکنِ افلاس پر بھی ایک عبرت کی نگاہ　　اونچے اونچے جگمگاتے قصر و ایواں دیکھ کر
مسکراتی ہے محبت، رقص کرتا ہے جنوں　　پرزے پرزے اہلِ دانش کا گریباں دیکھ کر
کوششِ تعمیر کو کچھ اور بڑھنے دو ادیب
بندگانِ حرص کو تخریب ساماں دیکھ کر

حبیب احمد صدیقی

غزل

مری نظر کو تلاشِ بہار ہے شاید　　فریبِ زیست ابھی کامگار ہے شاید
چرا رہے ہیں وہ نظریں خجل ہوئیں دل میں　　مری نظر سے وفا آشکار ہے شاید
گمانِ دل شکنی اور چشمِ خنداں پر　　سرشتِ عشق ہی بے اعتبار ہے شاید
مآلِ عشق سے آگاہ کرنے والے۔ آہ　　سمجھ رہے ہیں مجھے اختیار ہے شاید
غمِ حیات کی تلخی میں لذتیں ہیں ابھی　　کسی کی یاد ابھی غمگسار ہے شاید
دیا تھا جس نے ادھورا سا اک پیام کبھی　　اسی نظر کا مجھے انتظار ہے شاید
رگِ حیات میں اک موجِ برق دوڑ گئی　　تری نظر میں فسونِ بہار ہے شاید
نہ اب نگاہِ کرم ہے نہ عشوۂ رنگیں　　مری وفا پہ اسے اعتبار ہے شاید
وفا کے بدلے وفا کی جسے توقع ہے　　وہ اک مرا دلِ امیدوار ہے شاید

شمیم کرہانی

تلاشِ سحر

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے موضوع پر شمیم کرہانی صاحب ایک طویل مثنوی لکھ رہے ہیں۔ یہ مثنوی اردو ادب میں ایک اچھا اور صحیح اضافہ ہوگی۔ ہندوستان کے ایک بہت بڑے رہنما نے اس تصنیف کی تکمیل کے لئے شمیم کو اپنی شفقت و اعانت سے نوازا ہے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ یہ مثنوی جلد تکمیل پائے اور تشنہ کامانِ ادب کی پیاس بجھائے۔ ذیل کے اشعار کو اس مثنوی کا حرفِ آغاز کہنا چاہیئے۔

(عرش ملسیانی)

بیادِ "وفا کشتگانِ" وطن — بیادِ شہیدانِ خونیں کفن
بیادِ "جفا دیدگانِ" فرنگ — بیادِ فدایانِ ناموس و ننگ
بیادِ اسیرانِ جور و محن — بیادِ قتیلانِ دار و رسن
بیادِ دلیرانِ دمسازِ ہند — بیادِ جوانانِ جاں بازِ ہند
بیادِ فقیہانِ دیر و حرم — جو دیتے تھے فتوائے طبل و علم
بیادِ جوانانِ روشن دماغ — جو تھے انقلابوں کے چشم و چراغ
بیادِ ضعیفانِ بے دست و لنگ — جوانوں کو دیتے تھے جو اذنِ جنگ
بیادِ دلِ مادرانِ وطن — جو بیٹوں کے سر باندھتی تھیں کفن
بیادِ بزرگانِ سینہ خراش — جو ہنس کر اٹھاتے تھے بیٹوں کی لاش
بیادِ نگارانِ گل پیرہن — جنہیں طوقِ زنجیر کی تھی لگن
بیادِ حسینانِ آفت نصیب — گوارا تھا جن کو فراقِ حبیب
بیادِ عروسانِ سیمیں نقاب — کٹے سوگواری میں جن کے شباب
بیادِ یتیمانِ معصوم خو — وطن کی امانت ہے جن کا لہو

بیادِ دلِ مضطرِ ساربان — رواں جس کی حرکت سے تھا کارواں
بیادِ نہالانِ باغِ جنوں — کہ جن کے نشیمن رہے شعلہ گوں
بیادِ ادیبانِ نذرِ عتاب — جو لکھتے تھے افسانۂ انقلاب
بیادِ کلیمانِ جادو بیان — جو کہتے تھے اشعارِ آتش فشاں
بیادِ لبِ مطربانِ وطن — نوا جن کی بنتی تھی شعلہ فگن
بیادِ رفیقانِ آتش دماغ — جلاتے تھے جو آندھیوں میں چراغ
بیادِ محبانِ سینہ فگار — لہو جن کا تھا رونقِ کارزار
بیادِ دلیران و اہلِ ثبات — کہ جو موت میں ڈھونڈتے تھے حیات
بیادِ شجاعان و مردانِ صف — جو خود مقتلوں میں گئے سر بکف
بیادِ غلامانِ آزادہ رو — لہو جن کا بنتا تھا مشعل کی لو
بیادِ عوام و جہادِ عوام — "تلاشِ سحر" تھی جنہیں صبح و شام
بیادِ جہاداتِ اہلِ نظر — بیادِ تمنائے صبحِ بشر
سپردِ قلم کر رہا ہوں شمیم — اک افسانۂ کارزارِ عظیم

مختارالدین احمد

غالب اور مفتی میر محمد عباس

غالب کے خطوں میں سیّد العلما، آقا سیّد حسین م ۱۲۷۳ھ اور مجتہد العصر سید محمد کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ان کے علاوہ جس شیعی عالم سے ان کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے وہ مفتی میر محمد عباس شوستری (۱۲۲۴ - ۱۳۰۶) ہیں۔ جو تیرھویں صدی ہجری کے علماء میں بہت امتیاز رکھتے تھے۔ اور عربی و فارسی کے زبردست ادیب و شاعر تھے۔

مرزا کے ان کے ساتھ تعلقات کب شروع ہوئے صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ خط و کتابت کی ابتدا ۷۹-۱۲۷۸ھ میں ہوئی۔

"قاطع برہان" ۱۸۶۲ء۔ ۱۲۷۸ھ میں شائع ہوئی۔ ماہ مئی میں اس کا چھاپا ختم ہوا[۵]۔ ۱۶ مئی ۱۸۶۲ء کو ایک مطبوعہ نسخہ اور ۲۰ مئی تک ۵۰ مطبوعہ نسخے نول کشور پریس سے غالب کے پاس آ چکے تھے۔ مرزا چاہتے ہوں گے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم نوا بنائیں۔ اس لئے اس کے شائع ہوتے ہی کچھ نسخے اپنے احباب اور معاصرین کو بھیجنے شروع کئے، اور اس غرض کے لئے انھوں نے پچاس نسخے پچاس روپوں میں نول کشور سے خریدے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نول کشور نے صرف یہی کرم کیا کہ مرزا کی کتاب چھاپ دی۔ ورنہ معاوضہ تو کجا ایک نسخہ بھی تحفتہً نہ دیا۔ ایک نسخہ جو ۱۶ مئی کو یا اس سے پہلے غالب کے پاس بطور نمونہ آیا تھا وہ بھی قیمتاً۔ مجروح کو لکھتے ہیں۔

> قاطع برہان کا چھاپا ختم ہوا۔ ایک جلد بطریق نمونہ آ گئی۔ میں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپے بھیجوں تو وہ جلدیں منگاؤں۔ دیکھئے زر نقد کب میسر آئے اور مادرعا کب ہاتھ آئے۔"

۲۴ مئی کو قادر بلگرامی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> "ہاں صاحب، جناب منشی صاحب سے یہ کہدینا کہ پچاس میں سے ۳۰ جلدیں میں نے پائیں، اب قیمت کا روپیہ بھیج کر ۲۰ اور منگوا لیتا ہوں۔"

مرزا قاطع کے شائع ہوتے ہی ایک نسخہ مفتی میر محمد عباس کو بھیجنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے اس کا بھی انتظار نہ کیا کہ جب ان کے پاس مطلوبہ نسخے آ جائیں تب بھیجیں، سیّد غلام حسنین قدر بلگرامی کو جنھیں کچھ عرصہ پہلے مرزا، نول کشور پریس میں ملازم رکھوا چکے تھے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> "منشی (نول کشور) صاحب سے میرا سلام کہہ کر اُن کے حکم سے ایک نسخہ "قاطع برہان" کا مطبع میں سے لو اور مکان[۱] معلوم کر کے جناب مفتی میر عباس صاحب کے پاس جاؤ اور میرا سلام کہو اور

لہ ۵ مئی ۱۸۶۳ء سے پہلے کتاب چھپ گئی تھی لیکن اجزا کی شیرازہ بندی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ ۵ مئی سے ۱۶ مئی ۔۱۰، ۱۱ دن کی مدت ہی میں اجزا کی شیرازہ بندی ہوئی ہو گی تو ایک مکمل نسخہ غالب کے پاس پہنچا ہو گا۔ اردوئے معلیٰ صفحہ ۸۰۔

لہ غالب از غلام رسول مہر طبع سوم صفحہ ۲۵۴ ؁ اردوئے معلیٰ کراچی ۱۹۴۱ء صفحہ ۸۰ ؁ مفتی صاحب کا قیام حسبِ روایت صاحبِ "تجلیات" امجد علی شاہ کے عہد تک درۂ سلطان واقع مقبرہ نواب سعادت علی خاں میں تھا۔ ۱۲۶۳ھ یعنی امجد علی شاہ کے جلوس کے بعد مدرسہ، مقبرہ سے امام باڑہ آصف الدولہ میں منتقل ہو گیا۔ مفتی صاحب مختلف مکانات میں قیام پذیر رہے لیکن ہر پھر کر محلہ فرنگی محل قریب مکان مجتہد العصر و سیّد العلماء املاک مرزا کاظم میں رہے۔ آخر میں ایک مکان خرید لیا تھا اس میں قیام پذیر رہے ۱۲۶۵ھ میں امام باڑہ آغا باقر سوداگر کے پاس شاہی مسافر خانہ تھا۔ اس کے قریب ایک مکان لیکر رہے یقین ہے کہ غالب کے بھیجے ہوئے جب قدر بلگرامی مفتی صاحب سے ملنے آئے ہوں گے تو فرنگی محل ہی میں کہیں ملے ہوں گے۔

کتاب دواور عرض کرو کہ جو خونِ جگر میں نے اس تالیف میں کھایا
ہے یقین ہے کہ اس کی داد تمہارے سوا[1] اور سے نہ پاؤں گا"

قدر بلگرامی جب قاطع کا ایک نسخہ لے کر مفتی صاحب کے پاس پہنچے تو وہ وہاں موجود نہ تھے۔ غالباً نواب باقر علی خاں کے یہاں کانپور گئے ہوئے تھے۔ جہاں وہ کثرت سے جایا کرتے تھے۔ اور بقول صاحبِ "تجلیات" لکھنؤ سے کانپور کا سفر بمنزلہ حضر کے ہوگیا تھا۔ قدر نے یہ تحفہ کسی اور کے ہاتھ میں دینا مناسب نہ سمجھا اور صورتِ حال مرزا کو لکھ بھیجی۔ مرزا انھیں جواب میں لکھتے ہیں: "سیّد صاحب! آپ نے خوب کیا کہ مفتی صاحب کا ہدیہ غیر کو نہ دیا، اپنے پاس امانت رکھئے۔ جب مفتی صاحب آئیں اُن کو پہنچا دیجئے"

(اردوئے معلیٰ ۴۰۹)

یہ خط غالباً جون ۱۸۶۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ جولائی تک بھی مفتی صاحب لکھنؤ واپس نہ آئے اور کانپور ہی میں مقیم رہے تو ناچار مرزا نے اوائل اگست ۱۸۶۲ء میں خود ایک نسخہ پارسل کر کے اُن کی خدمت میں روانہ کیا۔

ان کے معاصرین ان کی تحریروں کو کس قدر محفوظ رکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ "قاطع برہان" جس کاغذ میں لپیٹ کر بھیجی گئی وہ کاغذ یا جس چٹ پر مرزا نے اپنا پتہ لکھا تھا وہ ابھی حال تک محفوظ تھا۔ لفافے پر یہ عبارت مرزا نے لکھی تھی۔

در کانپور بہ مکان نواب باقر علی خاں صاحب موصول، و بہ خدمت
خدام مخدومی جناب مفتی میر عباس صاحب زاد مجدہ مقبول و در بارۂ
بخشیدن اطلاع رسیدن ارمغان عنایت مبذول باد

مرسلہ، چہارم اگست ۱۸۶۲ء اشامپ پیڈ | اسد اللہ غالب |

لہ مرزا مجتہد العصر کو بھی قاطع بھیجنے اور اُن کی رائے سننے کے لئے اس قدر بیتاب تھے کہ ابھی قاطع کی اُنھوں نے شکل بھی نہیں دیکھی صرف اُنھیں چھپنے کی اطلاع ملی ہے لیکن قدر کو تاکید کرتے ہیں کہ ایک نسخہ مجتہد العصر کو جا کر دے دیں۔ لکھتے ہیں:-

"قاطع کے اجزا کی جلدیں بندھ گئیں یا نہیں؟ اگر بندھ گئی ہوں تو ایک جلد لیکر مجتہد العصر کی خدمت میں حاضر ہو، میری طرف سے کورنش عرض کرو اور کتاب نذر کرو۔ اور کہو غالب نے بہت خونِ جگر کھا کر فارسی کی تحقیق کو اس پائے کو پہنچایا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں۔ جو قبلہ و کعبہ فرمائیں اس تقریر میں تغیّر بالمعروف بھی نہ ہو، جوالفاظ حضرت کی زبان سے سنو ہو بہو لکھ بھیجو" (اردوئے معلیٰ ۴۰۸)

نواب باقر علی خاں

نواب باقر علی خاں آغا میر کے لڑکے تھے۔ مفتی صاحب کے ساتھ خاص تعلق رکھتے تھے ۱۸۵۷ء میں ان پر بھی بغاوت کا الزام لگایا گیا اور قید کئے گئے۔ پھانسی تک کا حکم ہوا۔ لیکن پھر ۱۲۷۷ھ میں رہا کر دیئے گئے۔ قیام کانپور میں تھا۔ جہاں مفتی صاحب اکثر جایا کرتے اور کبھی کبھی کچھ دنوں کے لئے قیام بھی کرتے تھے ۱۸۶۲ء میں وہ وہیں موجود تھے اور اُن کے کربلا جانے تک وہ وہیں مقیم رہے سالِ وفات ۱۲۹۱ھ ہے۔

غالب کی ایک اور مُہر!

عزیز لکھنوی مرحوم مصنّف "تجلیات" نے اگر مہر صحیح نقل کی ہے تو غالب کی معلومہ مہروں میں ایک اور کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ غالب کی اب تک چھ مہروں کا پتہ چلا ہے[1]۔ مہر نمبر ۲ میں "اسد اللہ الغالب (۱۲۳۱ھ)" اور نمبر ۴ میں عربی شعر اور "اسد اللہ خاں غالب" ۱۲۵۴ھ" منقوش ہے۔ قیاس ہے کہ اس پیکیٹ کی مہر ان مہروں سے علیحدہ ہے۔ مہر نمبر ۴ ظاہر ہے کہ بڑی ہے۔ عربی شعر درج ہے۔ کتاب کے لفافے پر اتنی لمبی چوڑی مہر کیا لگائی ہوگی۔ مہر نمبر ۲ بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اس پر ۱۲۳۱ھ کندہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا سا نفاست پسند آدمی ۱۲۷۹ھ میں تقریباً پچاس سال پُرانی مہر استعمال نہیں کر سکتا۔ مہر نمبر ۵ منقوشہ ۱۲۶۷ھ اور مہر نمبر ۶ "غالب" منقوشہ ۱۲۷۸ھ کے درمیانی زمانے میں یہ لفافے والی مہر کندہ کرائی گئی ہوگی۔ گو اس میں سنہ کا نہ ہونا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مرزا کی ساری مہروں میں سنین منقوش ہیں۔

مکتوب مفتی میر عبّاس

"قاطع برہان" کے مطالعے کے بعد مفتی صاحب نے مندرجہ ذیل خط مرزا کو شکریئے اور جواب میں لکھا۔

"یا اسد اللہ الغالب و مظہر العجائب ...... ملتمس آنکہ تحریر
شکریہ بدیہ بہیّہ مثل مدح و ثنائے آں عطیّہ از حیزِ بیان و بنان
ایں ہیچ مدان بیرون است۔ سبحٰن اللہ فکریم کہ ایستایم و یکے
گرایم بہ ستایشِ "قاطع برہان" کہ در انقلابِ دوراں نام و نشاں
"برہان قاطع" را برہم زدہ و زیر و زبر کردہ۔ یا بہ سپاس گزاری

لہ "غالب کی مہریں" از جناب مالک رام مطبوعہ ادبی دنیا لاہور اپریل ۱۹۵۱ء پیشِ نظر ہے تو بہتر۔

آں خسرو خاور شیریں بیانی و ناظم قلم رو سخن دانی کہ امروز در شعر و شاعری نظیرے نہ دارد و کسے در پیرایش ظہوری نیارد۔ ہر گاہ در انجمن اہلِ سخن ذکرش بر آید یاد فردوسی فراموش است۔ و اگر در شہرستانِ نظم و نثر کوس لسن الملک زند زمانہ سرا پا گوش ۔۔۔۔ سبّ۔ باقر علی خاں کہ نکتہ رسے است یکتا ۔۔۔۔ بریں شعر

ازمن بمن سلام و ہم ازمن بمن پیام
ریخ دے صبا و پیام و سلام ما

وجد کردند و مکرر خواندند۔ و فقیر از تاریخ ختم کہ "مہرِ غالب" باشد محو شدم کہ چہ قدر بے تکلف و پُر تکلف ست و تاریخ وصول ایں ہدیہ از ہمیں مادہ بایں صورت بر آوردم۔

غالب آں مہر سپہر نظم و نثر	ہم صفیرِ صائب و طالب
تحفۂ با مہر از مہرش رسید	شد رقم تاریخ "مہرِ غالب" ۱۲۷۹ھ

محررۂ اضعف الناس السیّد محمد عبّاس ۔۔۔۔"

مرزا غالب کا جواب

اس کے جواب میں مرزا نے اردو میں وہ خط لکھا جو عودِ ہندی[1] اور اردوئے معلّٰی[2] اور تجلیات[3] میں موجود ہے۔ متن میں کہیں کہیں اختلاف ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عود اور اردوئے معلّٰی میں تاریخ تحریر درج نہیں۔ تجلیات میں اختتام مکتوب پر "انصاف کا طالب غالب۔ شنبہ ۱۹۔ صفر المظفر ۱۲۸۹ھ" درج ہے۔ اور اس کے بعد مہر [غالب] ۱۲۸۹ھ تو صریحاً کتابت کی غلطی ہے ۱۲۷۹ھ ہونا چاہیئے۔ مہر غالباً وہی ہے جو آخر زمانے میں غالب استعمال کرتے تھے۔ اس پر بھی سنہ کندہ نہیں۔ قیاس ہے کہ مہروں میں سنہ ضرور منقوش ہوگا۔ صاحب تجلیات نے نقل نہیں کیا۔ غالب کے لکھے ہوئے اصلی خطوط اُن کے بیان کے مطابق مفتی میر محمد عباس کی کشکول میں چسپاں تھے۔ راقم نے مفتی صاحب کے صاحبزادے مفتی سیّد احمد علی صاحب لکھنوی اور سید ظفر حسین عرف وزن صاحب لکھنوی سے (جن کی عنایت سے تجلیات کے مطالعے کا موقع ملا) غالب کے اصلی خطوط اور کشکول کے بارے میں دریافت کیا لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ان خطوط کے اصل کے مطالعے کا موقع ملے تو بعض صحیح نتائج تک پہنچنے کی راہ پیدا ہو سکتی ہے۔

کتاب معشوق اور قطعہ گہنا

عودِ ہندی میں مرزا غالب کا جو خط ہے مفتی میر محمد عبّاس کے نام، اس میں ایک فقرہ ملتا ہے، "قطعۂ تاریخ کا کیا کہنا ہے۔ گویا کتاب معشوق اور یہ قطعہ اس کا گہنا ہے"۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ مفتی صاحب نے غالب کی کتاب "قاطع برہان" یا کسی دوسری تصنیف کا قطعۂ تاریخ لکھا ہوگا۔ لیکن قاطع برہان یا اس کے دوسرے ایڈیشن "درفش کاویانی" میں یا مرزا کی کسی کتاب میں مفتی صاحب کا کوئی قطعۂ تاریخ موجود نہیں۔ یہ معمہ شائد لاینحل رہتا۔ اگر تجلیات تک ہماری رسائی نہ ہوتی۔ مفتی صاحب نے قاطع کی رسید میں ایک فارسی خط لکھا تھا جس پر تاریخ تحریر درج نہیں۔ آخر کی دو سطریں یہ ہیں۔

"فقیر از تاریخ ختم کہ مہرِ غالب باشد محو شدم کہ چہ قدر بے تکلف و پُر تکلف است و تاریخ وصول ایں ہدیہ از ہمیں مادہ بایں صورت بر آوردم۔

غالب آں مہر سپہر نظم و نثر	ہم صفیر صائبا و طالبا
تحفۂ با مہر از مہرش رسید	شد رقم تاریخ "مہر غالبا" ۱۲۷۹ھ

کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ غالب کے فقرے میں جس قطعۂ تاریخ کا ذکر ہے وہ یہی ہے۔ وہ قطعہ دراصل نواب نور الدولہ لیث الملک محمد حسن خاں بہادر محکم جنگ معروف نواب نادر مرزا کا لکھا ہوا ہے۔ مرزا کی کتاب جب مفتی صاحب کے یہاں پہنچی تو مفتی صاحب نے فارسی خط لکھا اور نادر مرزا صاحب نے یہ قطعۂ تاریخ نظم کیا۔ جو مفتی صاحب نے مرزا کے پاس بھیج دیا۔ قطعۂ تاریخ یہ ہے۔

چوں غالبِ شاعرِ مکرّم	استادِ سخن دراں عالم
آں غیرتِ صائب و نظیری	واں رونقِ عرفی و ظہوری
سحبانِ زماں ور فصاحت	حسّانِ زمانہ در بلاغت
در حضرتِ عالمِ محقق	آں فاضلِ کاملِ مدقق
کز جملہ بعلم بیش باشد	علّامۂ عصر خویش باشد
سیّد عبّاس اسمِ پاکش	وز نور سرشتہ جسم پاکش

---

[1] عودِ ہندی طبع اول ۔ ۔ ۱۷۰ [2] اردوئے معلّٰی کریمی لاہور ۱۹۲۲ء ص ۱۷۲
[3] تجلیات۔ سوانح عمری مفتی میر محمد عباس از مرزا عزیز لکھنوی ۱۹۵

تصنیفِ لطیف ارمغاں کرد   تحقیق خودش در دعیاں کرد
آمد بمیاں چو ذکرِ تاریخ   رفستیم صفا بہ فسکرِ تاریخ
از تحفۂ فسکر گوہرے ناب   شد "تحفہ" ارمغانِ نایاب"

غالب کے خط میں جس قطعۂ تاریخ کا ذکر ہے اُس سے مراد یہی نواب نادر مرزا کا قطعہ ہے۔ خود مرزا لکھتے ہیں۔ "قطعۂ تاریخ کا کیا کہنا ہے، گویا کتاب معشوق اور یہ قطعہ اس کا گہنا ہے۔ جناب نواب صاحب کا نیاز مند اور بندۂ فرماں بردار ہوں۔ بعد عرض سلام کے پسند آنے کا شکر گزار ہوں ....."

ظاہر ہے کہ اس خط میں نواب صاحب سے مراد نواب محمد احسن خاں بہادر معروف نادر مرزا ہی ہیں ان کے علاوہ کوئی اور نہیں۔

جوابِ مفتی میر محمد عبّاس

غالب کے اس خط کے جواب میں مفتی صاحب نے مندرجہ ذیل خط سپردِ قلم کیا۔ اس خط کا آخری حصہ ..... "کلام ہے معنی صاف ہیں" سے "اضعف النّاس عبّاس" تک مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی شائع فرما چکے ہیں؎۔ انھیں ایک ورق ملا ہے جو اوّل سے ناقص ہے۔ کل بارہ سطریں اس وقت موجود ہیں۔ یہاں اب مفتی صاحب کا مکمل خط درج کیا جاتا ہے۔

"جنابِ والا سلّمہ اللہ تعالیٰ۔ مکتوب مرغوب کو دیکھ کر مسرور ہوا۔ تعلق خاطر دور ہوا۔ لیکن کان پور میں بسبب تردداتِ سفر جواب کی نوبت نہ آئی۔ اور لکھنؤ میں ملاقاتِ احباب سے فرصت نہ پائی۔ کیا عرض کروں میں بہت ناتواں ہوں، مشتِ استخواں ہوں رنجوں میں گرفتار رہوں۔ رحمتِ الٰہی کا امیدوار ہوں۔ اگر کچھ بھی دل و دماغ میں قوت پاتا اور فی الجملہ درس و تدریس اور تحریرِ جواب مسائل سے فرصت پاتا، اس رسالے کو از اوّل تا آخر دیکھ کر جو ذہنِ ناقص میں گزرتا مفصّل عرض کرتا۔ ماشاء اللہ آپ کی نظم و نثر سے دل مزے اُٹھاتا ہے جو صاحبِ ذوق ہے۔ لذّت پاتا ہے۔ اس نگارش نے کتابِ دکنی کو نظر سے گرا دیا۔ حسنِ خط سبزانِ دکن کو بھلا دیا۔ اللہ ری شوخیٔ کلام کہ چشمِ غزالانِ ختن کو حیرت ہے اور یہ لطافت و

؎ کچھ بکھرے ورق ۸ از ہندستانی الہ آباد۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء

ظرافت کو اداے بتانِ طنّاز کو کیا نسبت ہے۔ سہامِ ملام کا جو آپ نے شکوہ فرمایا ہے حال اُس کا یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے، حضرت موسیٰ نے درگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ خدایا تیرا دم بھرتا ہوں، دو دعائیں کرتا ہوں۔ جنت مجھکو عطا کر اور خلق کی زبان سے رہا کر۔ ارشاد ہوا، دعاے اوّل قبول ہے۔ تو جنتی ہے کُل ہے۔ لیکن دوسرا جو سوال ہے، اس کا یہ حال ہے کہ ہم نے اپنے واسطے بھی نہیں کیا۔ غرض خلق کا حلق بند نہیں، وہ لوگ کم ہیں جو مردہ پسند نہیں۔ "قاطع برہان" خوب نام ہے، اس میں کیا جاے کلام ہے۔ معنی صاف ہیں، معترض ناانصاف ہیں، لطف یہ ہے کہ خود نام سے پیدا ہے کہ اس نے "برہان قاطع" کو کاٹا ہے۔ مگر ان دونوں باتوں کا ایک نمط پر ہونا جاے تامّل و غور ہے۔ ظاہراً اس کا مطلب اور ہے، اور آپ کا مقصد اور ہے۔ قطع کے معنی کاٹنے کے اور یقین کے بھی آئے ہیں۔ اس نے غالباً معنی ثانی مراد لئے ہیں، اور آپ معنی اوّل استعمال میں لائے ہیں۔ بہرصورت برہان کی طرف ظاہراً قاطع کی اضافت ہے اور اس ترکیب میں سراسر لطافت ہے۔ اس میں کچھ شک و ریب نہیں کہ ایہام میں حسن ہے کچھ عیب نہیں۔ لیکن تقصیر معاف۔

ظرافت نے آفت کو برپا کیا   درشتی نہ کرنی تھی یہ کیا کیا

خیر گزشتہ را صلوٰت، والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

مرزا غالب کا ایک نایاب خط

یہ زمانہ وہ ہے جب مرزا مسئلہ امتناع النظیر میں اُلجھے ہوئے تھے۔ "تقویت الایمان" کی عبارت کو مولانا فضل حق خیرآبادیؒ بے ادبی پر محمول کرتے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ سرورِ کائنات خاتم النبیین ہیں، اس لئے خدا اُن کی نظیر پیدا نہیں کرسکتا۔ مرزا نے ان کی "تائید میں" ایک مثنوی لکھی جو کلیات میں موجود ہے۔ مندرجۂ ذیل خط مرزا نے مجتہد العصر کو لکھا اور اس کے بعد اپنی مثنوی کے تیس اشعار بھی درج کئے ہیں۔ مرزا کے اس خط کا جواب خود وہ تو غالباً اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ دے سکے۔ لیکن اُن کے اشارے سے مفتی صاحب نے اس کا

جواب لکھا جو تجلیات ۱۹۹ میں موجود ہے۔ ذیل میں مرزا غالب کا خط نقل کیا جاتا ہے۔

خداوند نعمت آیۂ رحمت سلامت۔ تسلیم و کورنش بذریعہ نیازے کہ پیش ازیں بہ پائیخ ہمایوں توقیع رواں داشتہ ام بہ عز قبول قرین باد دریں ہنگام در شہر دو دانش مند باہم در آویختہ اند یکے مے سراید کہ آفریدگار رہتا ئے حضرت خاتم الانبیا علیہ و آلہ السلام مے تواند آفرید۔ و ایں یکے مے فرماید کہ ممتنع ذاتی و محال ذاتی است۔ بندہ چوں ہیں عقیدت دارد نظمے در گیرندہ بدیں مدعا سر انجام دادہ است، ہر آئینہ چشم دارد کہ سواد بہ نور نظر اصلاح روشن شود۔ زیادہ حد ادب

از غالب نگاشتۂ بست و یکم جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۷۰ھ

مثنوی "خطاب فاصل" مرزا نے جو بہادر شاہ کی طرف سے فارسی میں ایک مثنوی لکھی تھی جس میں شیعیت سے بیزاری کا اظہار تھا اور جس کا نام اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کے جواب میں میر دوست علی خلیل نے ایک مثنوی لکھنؤ میں ترتیب دی، اس کے رد میں شیخ امام بخش صہبائی نے مثنوی "دمغ الباطل" تصنیف کی۔ "دمغ الباطل" کے جواب میں مفتی میر عباس نے "خطاب فاصل" لکھی، یہ مثنوی غالب کی زندگی ہی میں ۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی تھی۔ لیکن اس کی اشاعت اُن کی وفات کے ایک سال بعد ۱۲۸۶ھ میں ہوئی۔ ان ساری مثنویوں کے مطبوعہ نسخے محترمی پروفیسر مسعود حسن رضوی کے پاس موجود ہیں۔ غالب کی مثنوی کی طرح "خطاب فاصل" بھی بیحد کم یاب ہے۔ "تجلیات" میں جستہ جستہ کچھ اشعار مرتب نے درج کر دیے ہیں۔ چند اشعار جن میں غالب کا ذکر ہے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

حالیا دیگرے ز قومِ ذلیل — رو نوشت است بر کلامِ خلیل
گرچہ روئے سخن بہ غالب بود — لازمش دفع آں مثالب بود
لیک غالب صلاحِ خویش ندید — در نشستن فلاحِ خویش ندید
زاں کہ بود ست او ز اہل کمال — نہ ز نصاب بود و نے ارذال
او نہ با سطح مرد جاہلے بود — تابع حکم شاہ دہلی بود

نئی کتابیں اور رسالے

انیس کی مرثیہ نگاری مصنف و ناشر اثر لکھنوی۔ سول ایجنٹ۔ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

ضخامت ۲۸۸ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے غیر مجلد دو روپے۔ کاغذ طباعت و کتابت عمدہ۔

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ آپ ایک بہت اچھے شاعر و ماہر فن اور نقاد ہیں۔ اور بقول انیس کے

باتوں میں وہ نمک کہ زباں کو مزا ملے

آپ کی باتوں اور گفتگو میں بھی بڑا لوچ ہوتا ہے۔ آپ کی میر پرستی سے تو سب واقف ہی ہیں۔ اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیس پرستی میں بھی آپ کسی سے کم نہیں۔ یہ کتاب آپ کے چار مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے ایک سلسلۂ مضامین اسی عنوان سے نگار میں شائع کیا تھا، اُسی کا جواب اثر صاحب کا پہلا مضمون ہے۔ دوسرا مضمون نیاز صاحب مدیر نگار کے تردیدی نوٹوں کے جواب میں ہے، جو موصوف نے اثر صاحب کے جوابی مضمون کے ساتھ اپنی طرف سے شامل کئے تھے۔ باقی دو مضمون انیس کی مرثیہ نگاری سے متعلق ہیں۔ جو اثر صاحب نے مختلف اوقات میں لکھے۔ اثر صاحب کے طرزِ استدلال میں جان ہے۔ آپ کی زبان و بیان سے متعلق معلومات بھی وسیع ہیں۔ پھر مشرقی اور مغربی دونوں علموں پر قادر ہونے کی وجہ سے آپ کی تنقید بڑا لطف دیتی ہے۔ علمی مذاق رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک قابل مطالعہ چیز ہے۔ فاروقی صاحب کا اس مضمون میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اور آنا بھی ناگزیر تھا۔ لیکن کہیں کہیں لہجے کی معمولی سی تلخی اس بات کی غمازی بھی کرتی ہے۔ کہ تنقید میں اختلافِ عقائد کار فرما ہو جائیں تو تنقید کنندہ کی تنقید نہیں رہتی۔

ملنے کا پتہ۔ اقبال بک ڈپو۔ جہندرو پٹنہ ۶ مصنف غلام سرور ایم۔ اے **پرکھ** قیمت دو روپے ضخامت ۱۲۸ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت و طباعت گوارا۔ کتاب مجلد ہے۔

یہ کتاب غلام سرور صاحب کے چھ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین نگار اور دوسرے متعدد علمی رسائل میں شائع ہو چکے۔ آل احمد سرور نے مقدمے میں آخری دو مضمونوں "ترقی پسند تحریک" اور "مواد اور ہیئت" کے باب میں لکھا ہے۔

"اس مجموعے کے آخری دو مضامین میں جس سنجیدگی، کاوش اور ادبی ذوق کا ثبوت ملتا ہے، اس سے یہ توقع ہوتی ہے کہ توازن، وسعت نظر اور جدت فکر سے مستقبل میں بہار اور اردو کو ایک اچھا خاصا نقاد مل سکتا ہے"۔

اثر دو صفحات بھی اچھی معلومات کا حامل ہے۔ اقبال کی غزلوں کے باب میں آپ نے بہت اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ موازنہ بھی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے "یاس و حرماں کی موج زنی، بے ثباتی دنیا و عشق کی ستم انگیزی، فقر و قناعت کی تلقین میر کے یہاں ملتی ہیں۔ جدت ادا، ندرت تخیل غالب کے یہاں، عرفانِ الٰہی اور عشق حقیقی، درد کے یہاں، نزاکتِ خیال مومن کے یہاں تو اقبال کے یہاں زور، قوت عمل، یقین، نگہ بلند، سخن دل نواز، اور جانِ پُرسوز" اسی سے اندازہ ہو جائے گا کہ مصنف تنقید میں اچھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ صاحب پرکھ ہیں، اس لئے پرکھنے میں بڑے ماہر ہیں۔ ان کا مستقبل سرور صاحب کے قول کے مطابق تابناک ہے۔ جہاں ادب میں نئی راہیں کھل رہی ہیں وہاں تنقید بھی اپنے پرانے بندھنوں سے آزاد ہو کر حق و صداقت اور انصاف کا پرچم بلند کر رہی ہے۔ قدامت کی فرسودگی کو ترک کر رہی ہے۔ غلام سرور بھی تنقید کے ارتقا کی منازل طے کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ آپ جوال سال ہیں۔ جوان سال رفتار میں بڑی حد تک تیز ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کی رفتار بڑی متوازن ہے۔ ایسی نہیں جسے مہلک کہا جا سکے۔

خطوطِ اکبر مصنف مختار الدین احمد آرزو تقطیع ۲۳×۳۶/۱۶ ضخامت ۱۰۸ صفحے

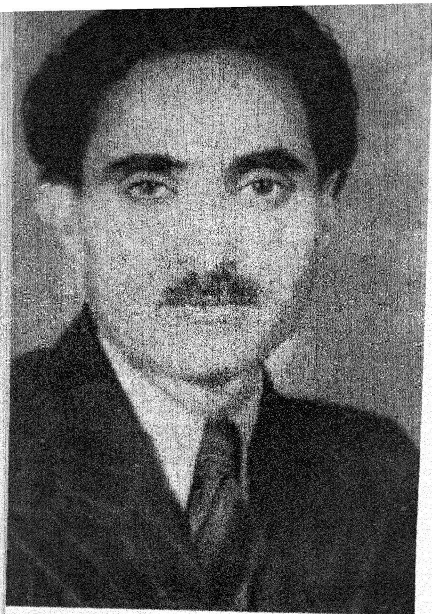

دینا ناتھ مست کاشمیری

راجندر ناتھ شیدا

آجکل کے چند لکھنے والے

طالب چکوالی

برج لال رعنا

ست پرکاش سنگر

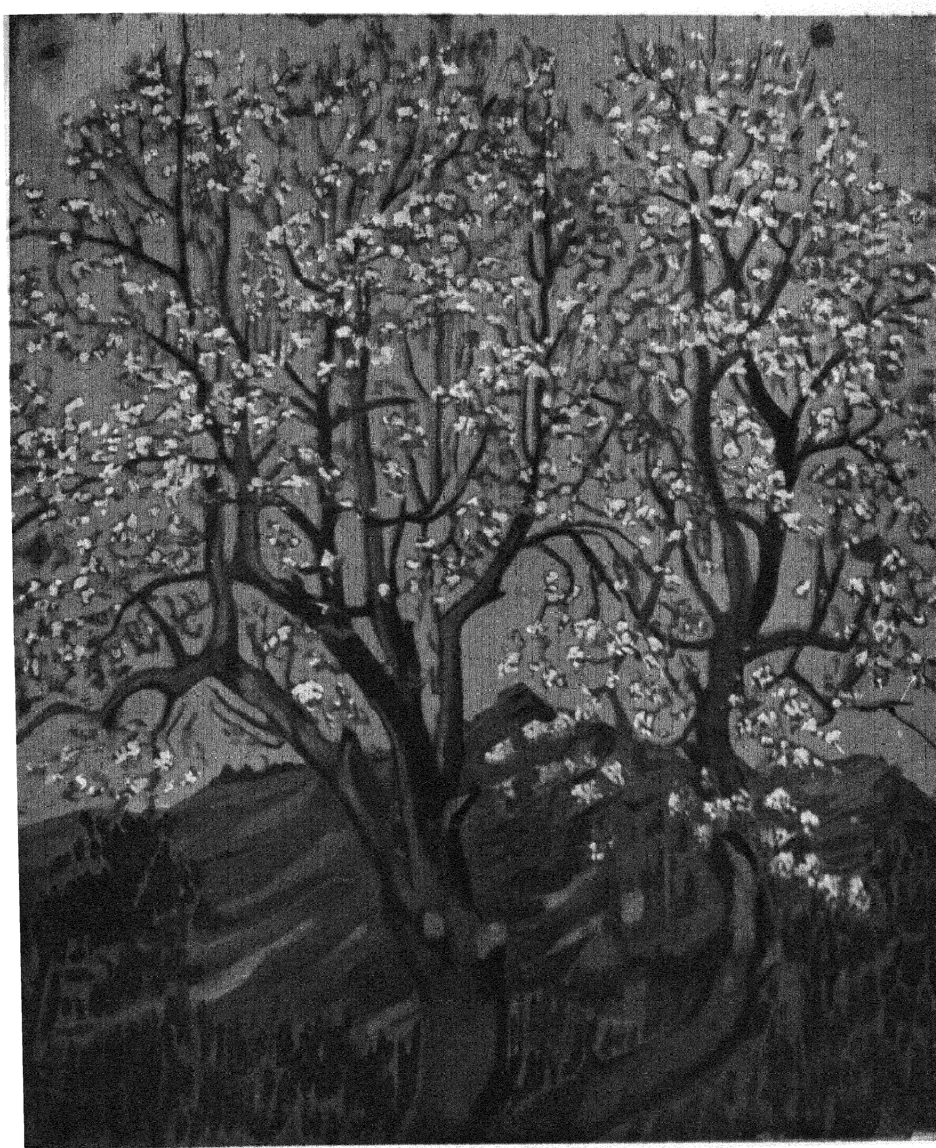

ہمالہ پر پھولوں کی بہار

کتابت وطباعت گوارا۔ ملنے کا پتہ۔ ۵۰ مرسید بک مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ قیمت ایک روپیہ۔

اکبرؔ اُردو شاعری میں ایک خاص رنگ لے کر آئے اور اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ شاعر بھی تھے مصلح قوم بھی۔ اضطراب و اضطرار اُنکی طبیعت میں اس قدر تھا کہ اصلاحِ قوم کی دُھن میں ہر اچھی تحریک کے مخالف بھی تھے۔ انگریزی تعلیم پر فقرہ بازی سے نہیں چوکے۔ لیکن شیخ و واعظ کی بھی بڑی گت بنائی ہے۔ ناانصافی ہوتی اگر ایسے حیرت انگیز کردار کے خطوط پردۂ اخفا میں رہتے۔ چنانچہ پانچ مجموعے ان خطوط کے اب تک شائع ہو چکے تھے۔ اس پر بھی تجسس و تفحص کے شیدائی مختار الدین احمد نے بڑی محنت سے کچھ غیر مطبوعہ خطوط اور کچھ ایسے خطوط جو مختلف اخباروں اور رسائل میں بکھرے پڑے تھے یکجا کر کے شائع کر دئے ہیں۔ اِس مجموعے میں شائع شدہ خطوط کے مکتوب الیہ احسن مارہروی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، پنڈت پدم سنگھ شرما۔ سر عبد القادر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، محشر لکھنوی۔ ڈاکٹر سید محمود، نیاز فتح پوری اور چند دیگر اصحاب ہیں۔ ڈاکٹر محمود کے نام جو خط ہے، اُس کا عکس بھی کتاب میں شامل ہے۔ ان خطوں سے مُرتّب نے دلچسپ نتائج اخذ کئے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خط نویسی کے متعلقات سے اکبر کی دلچسپی صفر کی حد تک تھی سادی کاغذ پر خط لکھ دیا کرتے تھے۔ بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ نیزے کے قلم سے لکھے گئے ہیں تو وہ معلوم نہیں کب کے بنے ہوئے ہیں، اور خط اگر لوہے کی نِب سے لکھا گیا ہے تو نب کے بدلنے کے اہتمام کا فقدان ہے۔ روشنائی ان سارے خطوں کی سیاہ ہے۔ لیکن کوئی نہایت پھیکی ہے اور کوئی اس قدر گاڑھی کہ اکبر کا قلم رُک رُک چلا ہے۔

حواشی کے عنوان سے جو نوٹ لکھے ہیں وہ بہت مفید مطلب اور مُرتّب کی محنت اور عرق ریزی کے آئینہ دار ہیں۔

مُرتب نے اس مجموعے کو آئندہ اشاعت میں اور جامع اور پُر از معلومات بنانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

انتخابِ سخن مؤلفہ ڈاکٹر یوگ دھیان آہوجہ۔ ایم، اے، پی ایچ۔ ڈی ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ کتابت و طباعت اوسط، جلد عمدہ۔ قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ دھنپت رائے اینڈ سنز، بک سیلرز۔ جالندھر شہر۔

ڈاکٹر آہوجہ نے شعرائے ماضی و حال کے کلام کا یہ انتخاب بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ پنجاب یونی ورسٹی کے ارباب بست و کشاد نے اسے ایف اے کے لئے نصابِ تعلیم مقرر کیا ہے۔

کلام کے انتخاب میں ڈاکٹر آہوجہ نے خوش ذوق اور دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں شعرائے ماضی میں دوسرے شعرا کے علاوہ درد، میر، انشا، غالب اور حالی کا انتخاب کیا ہے وہاں شعرائے حال میں اقبال، چکبست۔ جوش ملیح آبادی، محروم۔ جوش ملسیانی، فراق۔ جوش اور آزاد کو منتخب کیا ہے۔

نظموں کے انتخاب میں بھی ترقی پسندی نمایاں ہے۔ ابتذال عریانی اور پستیٔ ذوق کا کہیں نشان نہیں۔ اس کے برعکس حُبّ الوطنی، ملکی، تہذیب تمدن اور بلند اخلاقی کے نمونے اس انتخاب میں کثرت سے ملیں گے۔ امید ہے کہ یہ انتخاب طلبا میں صالح ذوقِ ادب پیدا کرنے میں معاون ہوگا۔

مقتل الحسین از حضرت سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری مجتہد العصر قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ مولوی سید نسیم کاظم کاموں پوری۔ باغ مکہ لکھنؤ۔

واقعۂ کربلا کے ابتدائی حالات کے ایک قدیم ترین ماخذ مقتل عقبہ بن سمعان کا ترجمہ۔ اس کا عربی متن اور اس پر تفصیلی مقدمات، تاریخی معلومات سے پُر ہیں۔

رسالے

علی گڑھ میگزین اکبر نمبر تقطیع $\frac{22 \times 36}{16}$ ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ ان کے علاوہ نوادرِ اکبر، مرتبہ سید شبیہہ الحسن نونہروی ۴۴ صفحات اور خطوطِ اکبر مرتبہ مختار الدین احمد آرزو بھی اس کے ساتھ شامل ہیں۔

یہ نہایت مفید نمبر شائع کر کے ادارے نے اردو ادب میں ایک قابلِ تعریف اضافہ فرمایا ہے۔ سید شبیہہ الحسن نونہروی اس ترتیب کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مخدومی پروفیسر رشید احمد صدیقی اس کے

نگراں ہیں۔ صرف نگراں ہی نہیں بلکہ مقدمتہ الجیش بھی۔ سب سے پہلا مضمون آپ ہی کا ہے۔ "اکبر پر ایک نظر" یہی ایک مضمون اس نمبر میں ہوتا تو کافی تھا۔ پہلا فقرہ ہی پڑھ لیجئے تکسل مند طبیعت بھی گرم ہو جائے گی۔ مردہ اشتیاق مطالعہ بھی جی اُٹھے گا۔ فرماتے ہیں۔

"جب تنقید کی گرفت یا گرم بازاری زیادہ ہو جاتی ہے
تو تصانیف بے جان نہیں تو نیم جان ضرور ہونے لگتی ہیں
آج کل اردو پر تنقید کا دورہ پڑ رہا ہے۔ جہاں جائیے،
جس سے ملئے یا تو نقاد ہوگا یا نیتا۔ ایک ادب کا لاگو
دوسرا آبرو کا۔"

اس شمارے میں زیادہ تر مضمون انھیں لوگوں کے ہیں جو اکبر سے مراسم رکھتے تھے۔ سب کے سب مضمون نگار اردو ادب میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، عبدالقادر سروری، محمد احسن فاروقی، جعفر علی خاں اثر، سید احتشام حسین اور آل احمد سرور خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ آج تک اکبر کی شاعری، سیرت اور ادبی حیثیت پر ایسا سیر حاصل مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

شاعر بمبئی

مقام اشاعت۔ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۲ بمبئی نمبر ۸۔ قیمت سالنامہ دو روپے

سالنامہ ۱۹۵۱ء

سالانہ چندہ۔ پانچ روپے آٹھ آنے۔

اعجاز صدیقی صاحب بعض حالات سے مجبور ہو کر "شاعر" کو آگرے سے منتقل کرکے بمبئی لے گئے۔ چنانچہ سالنامہ وہیں سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ۲ مقالے ۱۳ افسانے، ۳۰ نظمیں اور ۲۲ غزلیں ہیں۔ کتابت وطباعت عمدہ ہے۔ سالنامہ بڑی تقطیع کے ۲۰۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔

جوش ملیح آبادی، آل احمد سرور، ڈاکٹر اعجاز حسین، مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، فراق گورکھپوری، سید احتشام حسین، اختر نظمی، نصیر الدین ہاشمی اور بہت سے مقتدر ادباء و شعراء نے اس سالنامے میں حصہ لیا ہے۔ علامہ سیماب مرحوم کی یاد میں اعجاز صدیقی مدیر شاعر کا اداریہ اور راز چاند پوری کی نظم خلوص و محبت سے مملو ہیں۔ یہ سالنامہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مطالعے کی چیز ہے۔

نوبہار (خاص نمبر)

پٹنے کی سرزمین ادب خیز سے اس رسالے کا اجراء ایک فال نیک ہے۔ خالد رشید صبا اور مسعود عالم (اراکین ادارہ) کے پاکیزہ ذوق کا ثبوت ہے، کہ انھوں نے اس خاص نمبر میں اردو کے بڑے ممتاز شاعر اور ادیب جمع کئے ہیں۔ خاص نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہے۔

نور و نار (سالنامہ)

مقام اشاعت۔ ۱۴۱۱۔ ایف ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
چندہ سالانہ۔ چھ روپے

۱۱۲ صفحوں پر مشتمل یہ سالنامہ بڑی محنت سے شائع کیا گیا ہے۔ لکھنے والوں میں جگر مرادآبادی، شوکت تھانوی، الطاف مشہدی، زیب عثمانیہ، ماہر القادری، قتیل شفائی، سیف الدین سیف اور لطیف انور گورداسپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ مضامین اور نظموں میں تنوع قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چراغ

ترقی پسند ادب کا یہ ماہنامہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔ حیرت بدایونی اس کے مدیر ہیں، اور ادارے میں سری نیواس لاہوٹی بھی شامل ہیں۔ یہ ماہنامہ صوری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ مضامین اور نظمیں معیاری ہیں۔ قاضی عبدالغفار، خلیل الرحمن اعظمی، باقر مہدی اور دوسرے ادیبوں کے ساتھ ساتھ کملیشوری، کرن جیلانی بانو، بلقیس بانو اور زینت ساجدہ بھی زیر تبصرہ شمارے میں مضمون نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ دفتر ماہنامہ چراغ ولایت منزل۔ ہنومان ٹیکری حیدرآباد دکن کے پتے سے مل سکتا ہے۔

نیاز فتح پوری
"جوش صاحب کو شاعری کا ذوق ورثے میں ملا ہے اور ایک مستحق کی حیثیت سے ملا ہے"
عبدالماجد دریابادی
"اردو کے شاعروں اور خوش گو شاعروں کی تعداد ہندوستان میں اب بھی موجود ہے، اور اس طبقے کے ایک ممتاز فرد جوش ملسیانی ہیں"
جوش ملسیانی کا مجموعہ کلام "ہفت رنگ" ملنے کا پتہ
مرکز تصنیف وتالیف نکودر ضلع جالندھر
قیمت فی جلد تین روپے

رفتارِ زمانہ

نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران میں پردھان منتری شری نہرو نے اعلان کیا کہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو بھارت کشمیر کے سوال پر کسی طرح کی بیرونی زبردستی برداشت نہیں کرے گا۔ بھارت اور کشمیر کے اندرونی معاملات میں کسی ملک کو مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہم نے سیکیورٹی کونسل کے سامنے اس معاملے کو پیش کیا ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سیکیورٹی کونسل ہمارے اندرونی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دے۔ کشمیر کے متعلق پاکستان کا نقطۂ نظر بالکل غلط اور اصلیت سے کوسوں دور ہے۔ آپ نے کہا کہ اگر مسٹر گراہم یا یو۔ این۔ او کے کوئی اور نمائندے ہمارے پاس آئیں گے تو ہم اُن کے ساتھ دوستانہ سلوک روا رکھیں گے اور بات چیت کے ذریعے ان پر یہ ذہن نشین کرائیں گے کہ ہم نے کیوں سیکیورٹی کونسل کی قرار داد کو منظور نہیں کیا

دیش میں خوراک کی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ ہم نے صورتِ حالات پر قابو پالیا ہے اور اب ملک کے کسی حصے میں قحط پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ بھارت میں خوراک کی پوزیشن کافی بہتر ہو گئی ہے اور امید ہے کہ راشن میں جو کمی کی گئی تھی وہ بھی جلد بحال کر دی جائے گی۔ صوبہ بہار کا ذکر کرتے ہوئے نہرو جی نے کہا کہ وہاں ہر ماہ ۱۰۵۰۰۰ ٹن اناج بھجوایا جا رہا ہے جو کہ اس کی ضروریات سے بھی زیادہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں میں خرید کی طاقت بڑھے۔ آپ نے یہ رائے ظاہر کی کہ ہماری امیدوں کے مطابق امریکہ سے اناج کی سپلائی حاصل ہوتی رہی تو دیش کو خوراک کی کمی کے مسئلے سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک میں زیادہ خوراک پیدا کرنے کے ذرائع استعمال میں لائیں۔ ہندوستان میں گندم کی پیداوار فی ایکڑ ۹ من ہے جو بہت کم ہے۔ نئے اور جدید طریقوں سے میں اپنی زمین پر ۳۴ من گندم فی ایکڑ پیدا کر سکا ہوں اس لئے اگر ٹھیک طریقے سے کام کیا جائے تو ملک خوراک کی کمی کو بہت جلد پورا کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔

پردھان منتری نے یہ اعلان کر کے انتخابات کو مزید التوا میں ڈالنے کے متعلق تمام شکوک رفع کر دئے کہ اس سال کے آخری مہینوں میں انتخابات ضرور ہوں گے اور اُن کو ملتوی نہیں کیا جائے گا۔ معینہ تاریخوں میں چند ہفتے اِدھر یا اُدھر ہو جانا امکان سے خارج نہیں۔ ہم نے چناؤ کے سلسلے میں ابتدائی انتظامات پورے کرنے میں پوری کوشش کی ہے اور اب کم و بیش یہ کام پورا ہو چکا ہے۔

آبادان کے نزدیک خوزستان میں اینگلو ایرانی کمپنی کے صدر دفتر پر ایرانی جھنڈا لہرانے کی رسم کافی جوش و خروش سے ادا کی گئی۔ اس موقعے پر لوگ بھاری تعداد میں موجود تھے خوزستان کے نئے گورنر امین الٰہی نے بھی اس تقریب میں حصہ لیا۔

بھارت سرکار نے مرکزی حکومت کے ان سب ملازمین کے مہنگائی الاؤنس میں پانچ روپے کی ایزادی کی منظوری دے دی ہے جن کی تنخواہ ۲۵۰ سے زیادہ نہیں ہے یہ ایزادی یکم جون ۱۹۵۱ء سے نافذ ہو گی اور اس پر آئندہ بجٹ کے وقت پھر غور کیا جائے گا۔

اپنی ایک نشری تقریر میں بھارت کے وزیر خوراک نے اعلان کیا ہے

کر ما ، فروری میں راشن میں جو کمی کی گئی تھی اُسے یکم جولائی سے پھر بحال کر دیا جائے گا ۔ اس سلسلے میں تمام صوبائی حکومتوں کو اختیارات دے دئے گئے ہیں کہ وہ جہاں تک ممکن ہو جلد سے جلد ۹ اونس راشن کی موجودہ مقدار کو ۱۲ اونس تک بڑھا دیں ۔

امریکہ کی سینیٹ نے بالآخر ۲۰ لاکھ ٹن امریکی اناج خریدنے کے لئے ۱۹ کروڑ ڈالر قرضہ دینے کی منظوری دے دی ہے ۔ واضح رہے کہ گزشتہ کئی ماہ سے اس بات پر امریکی سینیٹ کے ممبران میں یہ اختلاف چلا آ رہا تھا کہ بھارت کو اناج بطور تحفہ دیا جائے یا قرضے کی شکل میں ۔ آخر یہ اناج قرضے کی صورت میں ہی دینے کا فیصلہ ہوا ۔

روس نے جولائی یا اگست ۱۹۵۱ء میں اُن سبھی ممالک کی امن کانفرنس بلانے کی قرارداد پیش کی ہے جنہوں نے گزشتہ جنگ میں جاپان کا مقابلہ کیا تھا ۔ اس کانفرنس میں سمجھوتے کا ایک مسودہ طیار کیا جائے گا ۔ روس کی رائے میں جاپان کے ساتھ صلح نامہ یک طرفہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اُن تمام ممالک کو اس میں شامل کیا جانا چاہیئے جو پچھلی جنگ میں جاپان کے خلاف تھے ۔ اس قرارداد کی نقل امریکی سفیر کے حوالے کر دی گئی ہے ۔

سری نگر میں سرکاری طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ صوبہ کشمیر میں ۲۱ ستمبر کو اور جموں، لداخ اور کارگل میں ۳۰ ستمبر کو آئین ساز اسمبلی کے لئے انتخابات ہوں گے ۔ اس سلسلے میں رائے دہندگان کی فہرستیں شائع کر دی گئی ہیں ۔ انتخابات کے لئے منشور طیار کرنے کے لئے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کو اختیارات دینے کے متعلق ایک قرارداد کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں منظور کر لی گئی ہے حکومت کشمیر کے سابق وزیر خواجہ غلام محمد صادق نے اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں خود ارادیت کے حق سے محروم کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی سازش کی جا رہی ہے ۔ ہم نے ملوکیت پسند ممالک کے ان بُرے ارادوں کا جواب دینے کے لئے اپنی تمام طاقت اکٹھی کر لی ہے اور ہمیں یقین واثق ہے کہ ہماری آزادی کو ختم کرنے کے متعلق ملوکیت پسند ممالک کے ارادے مٹی میں مل جائیں گے ۔

بھارت پارلیمنٹ کا بجٹ سیشن ۹ رجون کو اختتام پذیر ہوا ۔ نئے ہندوستان کی تاریخ میں یہ اجلاس سب سے بڑا اور پُر اہمیت تھا ۔ جمہوریت کے موجودہ دور میں اس اجلاس نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور مخالف تو کیا کانگرس پارٹی کے اکثر ممبروں نے معمولی سے معمولی غلطی کو طشت از بام کرنے اور سرکار کے رویے پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ بجٹ پر بحث کے دوران میں بھی کانگرس پارٹی کے ممبروں نے تنقید میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ایک مرتبہ اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا کہ جہاں تک جمہوریت کے صحیح معنوں کا تعلق ہے بھارت دنیا کے کسی ملک سے پیچھے نہیں ۔ بجٹ سیشن کے ۷۹ اجلاس ہوئے ۔ ۶۳ سرکاری بل پاس کئے گئے اور ۴۱۵۲ سوالات دریافت کئے گئے ۔ حکومت کے مختلف محکموں کے لئے مندرجہ ذیل اخراجات منظور کئے گئے ۔ محکمہ ڈیفنس ۱۸۶ کروڑ روپے ۔ تعلیم ۳ کروڑ ۶ لاکھ ۵۸ ہزار ۔ صحت ۱ کروڑ ۴ لاکھ ۲ ہزار ۔ محکمہ خارجہ ۵ کروڑ ۴۱ لاکھ ۴۶ ہزار ۔ سائنٹیفک ریسرچ ۲ کروڑ ۳۷ لاکھ ۶۲ ہزار ۔ پیداوار رسد ۱۴ کروڑ ۳۳ لاکھ ۴۷ ہزار ۔ بحالیات کا محکمہ ۹ کروڑ ۱۷ لاکھ ۔ محکمہ صنعت ۲ کروڑ ۱۷ لاکھ ۹۷ ہزار ۔ محکمہ زراعت و خوراک ۳ کروڑ ۳ لاکھ ۴۳ ہزار ۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ ۷ کروڑ ۶۲ لاکھ ۔ محکمہ لیبر ۲ لاکھ ۴۰ ہزار ۔ ریاستی محکمہ ۶ کروڑ ۲۴ لاکھ ۳۲ ہزار ۔ محکمہ رسل و رسائل ۸ کروڑ ۴۷ لاکھ ۴۲ ہزار ۔ محکمہ ڈاک اور تار ۴۱ کروڑ ۵۸ لاکھ ۴۶ ہزار ۔ محکمہ نشر و اشاعت ۳ کروڑ ۵ لاکھ ۵۰ ہزار ۔ کل خرچ ۴ ارب ۵۳ کروڑ ۹۳ ہزار ۔ بجٹ کے علاوہ اس سیشن میں آئندہ انتخابات کے لئے حلقہ ہائے انتخابات کا تعین کیا گیا اور آئین میں ترمیم بھی کی گئی ۔ آئین میں ترمیم کے سوال پر کافی گرما گرم بحث ہوئی اور کئی ممبروں نے اس کی مخالفت کی لیکن شری نہرو کی وضاحت کے بعد اکثر ممبروں کے شکوک رفع ہو گئے اور جب ترمیم پر ووٹ لئے گئے تو زاید از تین صد کے

ہاؤس میں صرف ۲۰ ہاتھ ہی اس کے خلاف اٹھے ۔

۲۵ مئی ۱۹۵۱ء کو یردن کا یوم آزادی منایا گیا ۔ اس موقعہ پر بھارت کے راشٹرپتی نے شاہ یردن ہز میجسٹی شاہ عبداللہ ابن حسین کو مندرجہ ذیل پیغام ارسال کیا ۔

مجھے مسرت ہے کہ میں یردن کے یوم آزادی کے موقعہ پر بھارت سرکار اور بھارت کے عوام کی طرف سے آپ کو اور آپ کی حکومت کو مخلصانہ مبارکباد اور یردن کے عوام کے لئے نیک خواہشات ارسال کر رہا ہوں ۔

تہران میں بھارت اور ایران کی ثقافتی انجمن کے پہلے اجلاس میں سابق وزیر تعلیم مسٹر آموزگر نے اپنی صدارتی تقریر کے دوران اعلان کیا کہ "ہمارے تعلقات بھارت کے ساتھ بھی اسی طرح دوستانہ ہیں جس طرح پاکستان کے ساتھ"

قریباً چار سو حاضرین جلسہ کو ایرانی وزارت تعلیم کے عریض وسیع ہال میں مخاطب کرتے ہوئے وزیر موصوف نے بیان کیا کہ بھارت کے ساتھ ایران کے دوستانہ تعلقات صرف نسل و تہذیب کی وجہ سے ہی نہیں ہیں بلکہ یہ تعلقات ان ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کی وجہ سے بھی ہیں جو آج بھارت میں سکونت پذیر ہیں ۔

وزیر موصوف نے اس جذبہ تعظیم و تکریم کو خراج تحسین پیش کیا جو بھارت دوسرے ملکوں کی زبان اور تمدن کے لئے رکھتا ہے اور کہا "اگر بھارت میں پچھلی صدیوں کے دوران میں فارسی کے کارنامے شائع نہ کئے گئے ہوتے تو آج اس زبان کو اتنی اہمیت حاصل نہ ہوئی ہوتی"

وزیر موصوف نے کہا کہ بھارت میں حافظ اور سعدی کی تصانیف اور دیگر فارسی ادیبوں کے کارناموں کو محفوظ رکھا گیا ایسے دور بھی گزرے ہیں جن میں ایران میں فارسی کی ایک بھی کتاب شائع نہیں ہوئی جبکہ بھارت میں اس عرصہ کے دوران میں بہت سی تصانیف مختلف مضامین پر شائع ہوئی ہیں"

پروفیسر پورداؤد نے ایران اور بھارت کے قدیم تعلقات پر ایک مقالہ پڑھا ۔ پروفیسر پورداؤد ایران کے ایک مشہور عالم ہیں اور ان کی رائے ویدوں اور اوستا کے متعلق مستند مانی جاتی ہے"

"بھارت بھر میں رقبہ جنگلات ۔ دو لاکھ سات ہزار سات سو ستتر مربع میل (قریباً ۱۲ کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ)

یہ رقبہ دیش کے کل رقبہ اراضی کا ۲ ر ۱۹ فیصدی ہے ۔ اس میں سے ایک لاکھ ۷۱ ہزار پانچ سو ۹۷ مربع میل (قریباً سات کروڑ ساٹھ لاکھ ایکڑ) ایسے جنگلات ہیں جو بھارت کے نقطہ نگاہ سے مفید ہیں ۔ اور پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ ایکڑ جنگلات ریاستی سرکاروں کے اور تین کروڑ پچاس لاکھ ایکڑ جنگلات نجی مالکوں کے ہیں ۔

بمبئی میں ۲۷ مئی ۱۹۵۱ء کو بھارتی بحری بیڑے کو راشٹرپتی کا پرچم پیش کرنے کی جو رسم ادا کی گئی اس کے بعد راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھارتی بحری بیڑے کی خدمات کی تعریف میں ایک خط وزیر دفاع کو بھیجا ہے جس میں آپ نے تحریر کیا ہے کہ

"میں آپ کو اس مراسلے کے ذریعہ مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ بھارتی بحری بیڑے کو پریذیڈنسی کلر کی پیش کش کے موقع پر اس کی پریڈ سے بہت متاثر ہوا ہوں ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک ایسا دلفریب نظارہ تھا جو بھارتی بحری بیڑے کی تاریخ میں بے مثال ہے ۔ پریڈ میں حصہ لینے والے افسروں اور جوانوں کی چستی اور آراستگی کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا کیونکہ یہ ہمارے بحری بیڑے اور خاص طور پر افسران کی خوبیوں کی آئینہ دار ہے ۔ اس موقعہ پر میں نے خود بحری کمانڈر انچیف کو مبارکباد پیش کی ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ یہ شعبہ روز افزوں ترقی کر کے مستقبل میں بھی شان امتیازی پیدا کرے گا ۔

راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے شاہ افغانستان ہز میجسٹی محمد ظاہر شاہ کو افغانستان کے یوم استقلال پر مندرجہ ذیل پیغام بھیجا ہے ۔

"مجھے انتہائی مسرت ہے کہ میں افغانستان کے یوم استقلال پر یور میجسٹی افغانستان کی حکومت اور عوام کو اپنی جانب بھارت سرکار اور بھارت نواسیوں کی طرف سے مبارکباد اور نیک خواہشات ارسال کر رہا ہوں ۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے ملکوں کے درمیان جو دوستانہ رشتہ اور جذبہ تعاون موجود ہے وہ اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا ۔

"ننھے بچے کیا تم گِن
سکتے ہو؟"
"جی ہاں۔ ایک۔ دو۔ تین
چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات
آٹھ۔ نونہال۔"
نونہال
ننھے بچوں کو مضبوط بنانے والا
اُن کا دِل پسند ٹانک
Hamdard
DAWAKHANA DELHI

آپ جہاں کہیں بھی ہوں...
ہمالیہ بُکے سنو
آپ کیلئے ایک بہتر کریم ہے
کیونکہ یہ ہندوستانی آب وہوا
کیلئے خاص کر کے بنایا گیا ہے
خواہ آپ ساحل پر ہوں جہاں آج کل اُمس ہے تو کل ٹھنڈی ہوا، خشک علاقوں
میں ہوں یا بارشی مقاموں میں، غرضیکہ ہندوستان میں آپ کہیں بھی ہوں
ہمالیہ بُکے سنو آپکی جلد کو نہایت ملائم، صاف اور تازہ
رکھے گا۔ اسکی خوشبو آپ کو نہایت پسند آئیگی۔
ایک اور عمدہ اراسمٹ پراڈکٹ
ایراسمک کمپنی لیمیٹیڈ، لنڈن، کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا
H.B.L. 648 UD

ان کے لئے ڈالڈا سے
بنا ہوا کھانا اچھا ہے - یہ ان کی
روزانہ قوت کی بحالی میں
مدد کرتا ہے!
موزوں غذا میں آپ کیلئے ضروری چکنائی مہیا کرتا ہے
HVM. 141-178 UD

Regd. No. E P - 689

"بچوں کا آج کل"

حامد اللہ افسر

برسات ہے برسات

(۱)

پھر اب کے برس آئی بڑی دھوم سے برسات
دن میں بھی تو ان کالی گھٹاؤں سے ہوئی رات
برسات تو برسات ہے برسات کی کیا بات
برسات ہے برسات

(۲)

پورب سے چلے آتے ہیں اُمڈے ہوئے بادل
ان کے لئے سب ایک ہے بستی ہو کہ جنگل
ہر چار طرف ملک میں کر دیں گے یہ جل تھل
برسات ہے برسات

(۳)

باغوں سے چلی آتی ہیں کوئل کی صدائیں
موسیقی سے ملتی ہوئی جل تھل کی صدائیں
اور دل کو ہلاتی ہوئی بادل کی صدائیں
برسات ہے برسات

(۴)

میدانوں کی باغوں کی زمیں تک بھی ہری ہے
کیاری مری ہر رنگ کے پھولوں سے بھری ہے
آنکھوں میں کھبی جاتی ہے کیا جلوہ گری ہے
برسات ہے برسات

راشد حسن قادری

پٹو فرید

(کھیل میں کام کرنے والے)

۱ - حمید ایک تاجر ۲ - فرید - حمید کا لڑکا ۳ - احسان - ایک موٹا آدمی حمید کا دوست

۴ - تقی
۵ - جعفر } دو چور ۶ - ایک نوکر

(حمید کے گھر کا ڈرائنگ روم - سامنے کھڑکیوں پر سیاہ پردے پڑے ہوتے ہیں - لیمپ جل رہا ہے - نوکر کرسیاں صاف کر رہا ہے - میز پر طرح طرح کے پھل اور مٹھائیاں رکھی ہوئی ہیں - باہر سے دستک کی آواز آتی ہے - نوکر دروازہ کی طرف جاتا ہے)

نوکر - فرمائیے کون صاحب ہیں (دروازہ کھولتا ہے)

تقی - (اندر آتے ہوئے) میرا نام احسان ہے - حمید صاحب کہاں ہیں

نوکر - آئیے آئیے میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا - حمید صاحب ابھی آتے ہیں -

تقی - تم شاید نئے نوکر ہو - میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا -

نوکر - میں چھ مہینے سے یہاں نوکر ہوں -

تقی - ٹھیک ہے - میں دو سال سے سیر و سیاحت کو گیا ہوا تھا - خیر حمید صاحب کو اطلاع کر دو - لو یہ ٹوپی رکھ دو (نوکر ٹوپی لے کر کھونٹی تک جاتا ہے - تقی جلدی سے ایک کھڑکی کو کھولتا ہے اور جعفر کھڑکی سے کود کر اندر آجاتا ہے اور پردے کے پیچھے چھپ جاتا ہے - نوکر لوٹ کر آتا ہے)

نوکر - آپ چائے نوش فرمائیں گے -

تقی - ہاں کوئی مضائقہ نہیں - (نوکر چائے لانے کے لئے جاتا ہے - جعفر جلدی سے ایک کپڑا اس کے سر پر ڈال کر باندھتا ہے - نوکر چلّانے کی کوشش کرتا ہے لیکن فوراً بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے -

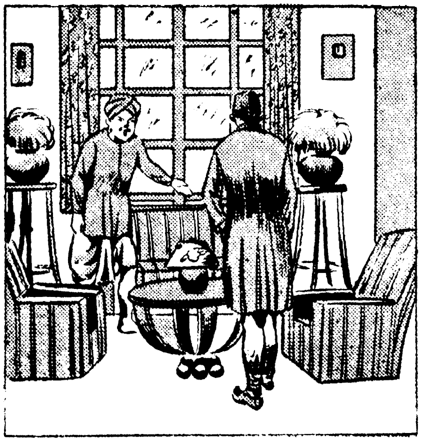

تقی - یار خوب تھی یہ دوا بھی

جعفر - میں نے نہ کہا تھا کہ ایک منٹ میں بے ہوش کر دیتی ہے - چلو اس کو چھپا دیں -

(دونوں نوکر کو اٹھا کر باہر لے جاتے ہیں اور ایک طرف کونے میں لٹا دیتے ہیں)

تقی - بس ٹھیک ہے (باہر سے کسی کے آنے کی آہٹ ہوتی ہے)

جعفر - جلدی کرو کوئی آرہا ہے (دونوں دوڑتے ہیں اور پردہ کے پیچھے چھپ جاتے ہیں)

فرید - (کمرہ میں داخل ہو کر) ابھی تک ابا جان کے دوست نہیں آئے - (میز پر رکھے ہوئے مربّہ کی طرف دیکھتا ہے) اس مربّہ میں سے ایک قتلہ میرا حصہ ہے - (ایک قتلہ اٹھا کر کھا لیتا ہے) کتنا مزے دار ہے - ایک اور قتلہ میرا حق ہے (ایک اور اٹھا کر کھا لیتا ہے - دروازہ تک جاتا ہے اور رک جاتا ہے - پھر لوٹ کر آتا ہے اور میز کے پاس جا کر ایک بڑا سا قتلہ اٹھا کر کھا لیتا ہے کہ اس کا باپ داخل ہوتا ہے)

حمید - ارے ـــ کس قدر برے لڑکے ہو تم - یہ مٹھائیاں احسان صاحب کے واسطے ہیں نہ کہ تمہارے - تم کو تو بالکل نہ کھانی چاہئے - مجھے ڈر ہے کہ تم کہیں موٹے اور کاہل نہ ہو جاؤ -

فرید - (ہاتھ میں کیک دبائے ہوئے ہے) ابا جان ـــ یہ میں نے بغیر اجازت لے لیا ہے - معاف کر دیجئے - میں اپنا حصہ خود کھا رہا تھا تاکہ جلدی سو جاؤں -

حمید - (ہنستا ہے) لیکن یہ سب تو تمہارا حصہ نہیں ہے -

فرید - ابا جان آپ کہہ رہے تھے کہ احسان صاحب ایک ضروری کام سے آرہے ہیں - وہ کیا کام ہے

حمید - احسان صاحب میرے پاس جو یاقوت ہے وہ خریدنے کے لئے آرہے ہیں سمجھے ؟

فرید - کیونکہ - آپ تو کہتے تھے کہ وہ یاقوت آپ ہمیشہ دوکان میں رکھتے ہیں -

حمید - چونکہ ہمارا گھر شہر سے باہر ہے اس لئے چوروں کے ڈر سے میں اس کو گھر پر نہیں رکھتا تھا مگر آج لے آیا ہوں -

فرید - ابا جان ذرا مجھے دکھا دیجئے

حمید - (جیب سے ڈبہ نکال کر اس میں یاقوت فرید کو دیتے ہوئے) لو دیکھو - (اسی عرصہ میں پردہ ہلتا ہے اور حمید ڈبہ فوراً جیب میں رکھ لیتا ہے) ارے فرید دیکھو تو پردہ کے پیچھے کون ہے - (فرید ڈر کر پیچھے ہٹتا ہے - تقی اور جعفر پردہ سے باہر آتے ہیں)

تقی (پستول حمید کی طرف کرتے ہوئے) ہاتھ اوپر اٹھاؤ - ذرا بھی ہلے تو گولی مار دوں گا - (فرید جلدی سے کیک کا ٹکڑا اور یاقوت منہ میں رکھ لیتا ہے)

جعفر (پستول فرید کی طرف کرتے ہوئے) ہاتھ اوپر اٹھاؤ - ذرا بھی ہلے تو گولی مار دوں گا -

تقی - (حمید سے) جلدی سے جواہرات کا ڈبہ دو -

حمید - تمہیں کیا معلوم کہ میرے پاس جواہرات ہیں -

تقی - بحث مت کرو ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا تم نے احسان سے جو وعدہ کیا تھا وہ میں نے سن لیا تھا -

حمید - میرے پاس ڈبہ نہیں ہے جو تمہیں دوں -

تقی - میں نے ابھی سنا ہے (جیب سے ایک کپڑا نکالتا ہے اور حمید کے منہ پر باندھ دیتا ہے - حمید بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے - تقی اس کی جیب میں سے ڈبہ نکال لیتا ہے) اوہ - یہ ہے ڈبہ - (ڈبہ کھولتا ہے) ارے اس میں یاقوت نہیں ہے - یاقوت کہاں گیا -

جعفر - (فرید کی طرف دیکھتا ہے) ارے لڑکے کیا تجھے معلوم ہے (فرید جلدی سے کود کر لیمپ گل کر دیتا ہے)

جعفر - ہلنا مت ! (اندھیرے میں پستول چلاتا ہے - پستول کی آواز کمرے میں گونج جاتی ہے)

تقی - جعفر یہ برا کیا - پستول کی آواز سے چوکیدار آجائیں گے اچھا تم ہوشیار رہو کہیں لڑکا بھاگ نہ جائے - میں لیمپ جلاتا ہوں۔

جعفر - میں سامنے ہوں جلدی کرو - (لیمپ جلتا ہے - فرید کرسی کے پیچھے سے آتا ہے اور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے کہ جعفر پکڑ لیتا ہے اور فرید کی پشت پر ایک گھونسہ مارتا ہے مگر فرید اُف تک نہیں کرتا) تیرے مُنہ میں کیا ہے ؟

فرید - کیک (کیک کی رکابی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

جعفر - منہ کھول - (فرید منہ کھولتا ہے کہ اتنے میں باہر آہٹ ہوتی ہے)

تقی ارے جلدی کرو - چور آگئے - (دونوں کھڑکی سے کود کر غائب ہو جاتے ہیں - ایک موٹا سا آدمی آتا ہے)

احسان - ارے فرید یہ تمہارے والد کو کیا ہو گیا -

فرید - دو چور یاقوت چھیننے کے لئے آگئے تھے - آپ کے آنے کی آہٹ سُن کر کھڑکی سے کود کر بھاگ گئے - (حمید کے پاس جاتا ہے اور پکارتا ہے) ابا جان ! ابا جان !! چور بھاگ گئے -

حمید - (ہوش میں آتے ہوئے) آہ - آہ - تم کیا چاہتے ہو مجھے چھوڑ دو - مجھے چھوڑ دو -

فرید - ابا جان میں ہوں چور تو بھاگ گئے - احسان صاحب بھی آگئے ہیں -

حمید - (تھوڑا سا اٹھ کر) ایں — کیا چور بھاگ گئے - اور ....اور یاقوت .... ارے کیا یاقوت بھی لے گئے کدھر سے گئے

فرید - کھڑکی سے کود کر گئے ہیں -

حمید - دوڑو - جلدی کرو -

فرید - ابا جان - یاقوت یہ رہا - (منہ میں سے یاقوت نکالتا ہے)

حمید - (یاقوت کی طرف دیکھتے ہوئے) ارے فرید — یہ تم نے کہاں سے پا لیا -

فرید - ابا جان جس وقت چور پردے سے باہر آئے تو میں نے یاقوت کو کیک سمیت منہ میں رکھ لیا تھا - انہوں نے بہت

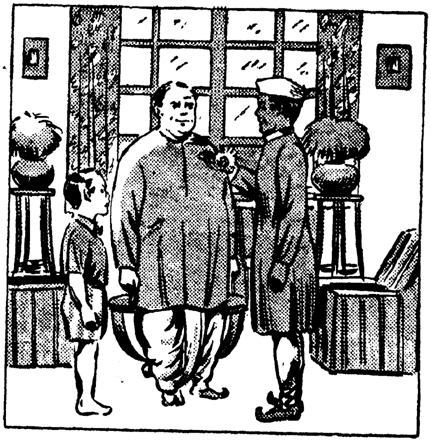

کوشش کی مگر نہ پا سکے - اب تو یہ میرا حق ہے کہ جو چاہوں کھاؤں

حمید - (یاقوت ہاتھ میں لیتا ہے) جو تم چاہو کھاؤ - تمہارا ہی حق ہے - اب میں تم سے نہ کہوں گا کہ بہت کھاتے ہو -

احسان - لیکن اگر زیادہ کھاؤ گے تو میری طرح ہو جاؤ گے - سب ہنستے ہیں) پردہ گرتا ہے -

اظہر علی فاروقی

زمین میں گڑی تہذیب

جب کوئی نئی تہذیب کسی پرانی تہذیب سے ٹکر لیتی ہے اور اُسے پیچھے دھکیل دینا چاہتی ہے تو دھرتی ماتا اُسے اپنی گود میں چھپا لیتی ہیں۔ ایسی چھپی ہوئی تہذیبوں میں سے موہنجو دارو، ٹیکسلا اور ایلورا کے غاروں کا حال پڑھا ہوگا۔ آج ہم تمہیں ایسی ہی ایک یادگار "گھوشتا رام" کا حال بتا رہے ہیں۔ جو سیکڑوں برس سے زمین میں دبے دبے سسکیاں لے رہی تھی۔ الہٰ آباد سے ۳۴ میل کی دوری پر جمنا ندی کے کنارے "کوشامبی" کے مقام پر جنوری ۱۹۵۱ء میں ایک پتھر ملا جس پر براہمی خط میں کچھ عبارت کھدی تھی جس سے یہ پتہ لگا کہ یہ پتھر ۲۰۰ء کا ہے۔

گھوشتا رام وہ آشرم ہے جہاں مہاتما بدھ اور اُن کے چیلے رہا کرتے تھے۔ یہ آشرم بڑا سندر تھا۔ مگر زمانے کے اُلٹ پھیر اور راجاؤں کے ٹکراؤ سے یہ آشرم دھرتی ماتا کی کوکھ میں چلا گیا اور اب اس کا پتہ کوشامبی میں لگا ہے "کوشامبی" بہت ہی پُرانا شہر تھا جس کا ذکر ہندوستان کی مہابھارت جیسی پرانی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ شہر آج سے سینکڑوں سال پہلے بڑی رونق پر تھا اور ونس راجاؤں کی راجدھانی ۵۴۴ ق۔م میں جب راجا اُدین راج کرتا تھا تو اس کی رونق انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ راجا اُدین نے ایک بھکشو پنڈولا بھاردواج کے ہاتھوں پر بودھ دھرم قبول کیا اور اس طرح یہ شہر بودھ دھرم کے پرچار کا اچھا خاصا مقام بن گیا۔ سیکڑوں سال کی گڑی ہوئی تہذیب آج ہمارے سامنے ہے۔

"کوشام بی" کی کھدائی میں جو چیزیں - مورتیاں اور کتبے ملے ہیں وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ آج سے سیکڑوں سال پہلے کا سماج کیسا تھا - گھوشتا رام کی نالیاں اور موریاں ہمیں بتاتی ہیں کہ اس وقت صفائی کا کتنا خیال تھا - عورتوں کی گدیوں پر پلیٹ دار بال اور اُن کے گھونگھر - مردوں کے

بال اور ان کی ٹوپیاں اور سر ڈھکنے کے طریقے - کانوں میں موٹے موٹے بُندے - موٹی موٹی آنکھوں پر کمان دار بھویں - ہمیں بہت کچھ ان مورتیوں اور پتھروں سے معلوم ہوتا ہے - وہ باتیں جو دھرتی ماتا نے اپنی کوکھ میں خزانے کی طرح رکھ چھوڑی تھیں آج کے انسان نے انہیں نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا -

---

جے موہن لال

چوہے سے چند سوال

بیٹھے بیٹھے دن بھر بل میں — کیا سوچا کرتے ہو دل میں
چوہے خاں باہر تو آؤ — ہم کو کچھ باتیں بتلاؤ

کترا کیوں گڑیوں کا جوڑا — کس لڑکی کو روتا چھوڑا
کس کے تم نے چنے چبائے — کس کے تم نے چاول کھائے
کس کا تم نے گھی پی ڈالا — کس سے لائے روٹی کا گالا
کتنے جھوٹے برتن چاٹے — کئے کہاں تک سیر سپاٹے

دانت یہ ننھے ننھے سارے — سچ مچ ہیں ہتھیار تمہارے
ان کی تیزی پر اترا کر — تم نے کھودا بل گا گا کر
پر سنتے ہی میاؤں میاؤں — بھاگے سر پر رکھ کر پاؤں

اب کیوں چپ ہو چوں چوں بھیا
موسی دیکھ مری کیوں میّا

فرحت فاطمہ

میری دُلھن

ایک بڑھیا ایک جھونپڑی میں رہتی تھی۔ وہ غریب چرخہ کاتا کرتی تھی۔ یہی اس کا ذریعہ معاش تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔

اس کے پڑوس میں ایک سوداگر آکر ٹھہرا۔ ایک روز بڑھیا کی روئی میں "چوہیا" کود رہی تھی۔ بڑھیا بولی "بیٹی تو روئی میں مت کود نہیں تو چوٹ لگ جائیگی"۔ سوداگر نے سُنا تو اس نے دل میں کہا۔ کہ اس کی بیٹی ایسی نازک ہے جو اس کے روئی سے چوٹ لگ جاتی ہے۔ میں تو اس کی ہی بیٹی سے شادی کروں گا"۔ اور بڑھیا سے کہا کہ تو اپنی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دے۔ بڑھیا نے کہا "بیٹا! میرے بیٹی نہیں ہے"۔ سوداگر نہ مانا اور اس نے شادی کا بہت اصرار کیا جب بڑھیا مجبور ہو گئی تو اس نے کہا "اچھا" اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

سوداگر نے بہت بڑھیا جوڑا بنایا اور خوبصورت زیور منگا کر بھیجے۔ بڑھیا زیور کپڑے پہن کر پالکی میں بیٹھ گئی۔ اور سوداگر کے گھر جا اُتری۔ جب رات ہو گئی۔ تو چاند نکلا۔

بڑھیا نے کہا "جے چا" (یہ کیا؟) سوداگر نے کہا "چاند" بڑھیا بولی "مانند"۔ پھر تارے نکلے۔ تو بڑھیا بولی "جے چا" سوداگر نے کہا "تارے"۔ بڑھیا نے کہا "مارے" پھر گیدڑ بولے بڑھیا نے کہا "جے چا" سوداگر نے کہا گیدڑ۔ بڑھیا بولی "گکنا۔ میرا ریشم کا سا پھندنا"۔ سوداگر بولا "ہاں"۔

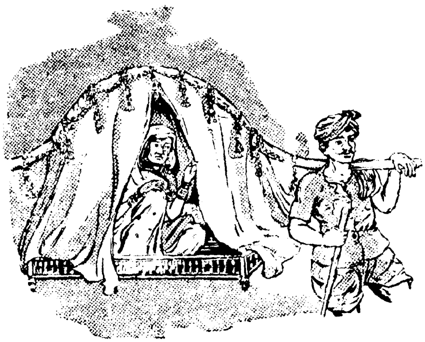

پھر بڑھیا نے کہا کہ "مجھے تو پیاس لگی ہے۔ ٹھلیا کا پانی پیوں گی" سوداگر پانی لینے چلا۔ سامنے امرود کا باغ تھا۔ اس میں ٹانڈ بندھ رہا تھا۔ موقع پاکر بڑھیا اس میں کود کر بیٹھ گئی۔ اور ہریا ہریا کہہ کر طوطے اڑانے لگی۔ جب زیادہ دیر ہو گئی۔ تو سوداگر ڈھونڈنے نکلا۔ وہ رو رو کر یہ کہتا جاتا تھا۔ "چاند کو کہتی مانند" میری گئی اکیلی۔ تاروں کو کہتی مارے میری گئی اکیلی۔ گیدڑ کو کہتی گکنا میرا ریشم کا سا پھندنا۔ میری گئی اکیلی

وہ سوداگر ڈھونڈتا ڈھونڈتا ٹانڈ کے پاس پہنچا اور بڑھیا سے پوچھا کہ تو نے میری بہو دیکھی ہے؟ بڑھیا بولی "میں کیا جانوں"۔ سوداگر رو دھو کر خاموش ہو گیا۔ بڑھیا زیور اور قیمتی کپڑے لے کر اپنے گھر آ گئی۔

قہقہے

لطیفہ۔ ایک پادری صاحب ریل گاڑی میں بیٹھے کہیں کا سفر کر رہے تھے ایک بڑا اسٹیشن آیا۔ تو جلدی سے نیچے اترے۔ انہیں بھوک لگ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر ایک لڑکا جا رہا تھا۔ پادری نے لڑکے کو آواز دے کر پاس بلایا اور کہا "یہ لو چونی دیکھو چار آنے کے دو شیرمال آئیں گے ایک مجھے لا دو اور ایک تم خود کھا لینا"

تھوڑی دیر بعد لڑکا واپس آگیا اس کے ہاتھ میں ایک شیرمال تھا اور وہ مزے سے اس کو کھاتا ہوا آ رہا تھا۔ پادری صاحب غصے میں بولے ارے کم بخت! میرے حصے کا شیرمال کہاں ہے؟

لڑکے نے آہستہ سے دونی پادری صاحب کے ہاتھ پر رکھ دی اور کہا جناب شیرمال والے کے پاس ایک ہی شیرمال تھا۔ میں نے اپنے حصے کا کھا لیا آپ اگلے اسٹیشن پر لے لیجئے گا۔

باپ ۔ تو نے میرا قلم کیوں توڑا؟

بچہ ۔ اس لئے کہ آپ مجھے سزا دیں۔

باپ ۔ کیا تجھے سزا اچھی معلوم ہوتی ہے؟

بچہ ۔ سزا تو اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن سزا کے بعد اماں جان مجھے کھانے کو مٹھائی دیتی ہیں!

ماسٹر ۔ رشید! فرض کرو تمہارے باپ نے مجھ سے پانچ ہزار روپے لئے اور ہر سال ۷۵ روپے کے حساب سے واپس دینا شروع کر دئے تو بتاؤ تین سال کے بعد میرا اُس پر کتنا روپیہ باقی رہے گا؟

رشید ۔ پانچ ہزار روپیہ۔

ماسٹر ۔ وہ کیسے؟

رشید ۔ جناب میرے باپ نے کسی سے روپیہ لے کر کبھی واپس نہیں کیا

آفاق ۔ میاں خالد! تم تو بالکل سفید جھوٹ بول رہے ہو۔

خالد ۔ اچھا تو کل سے کالا جھوٹ بولا کروں گا۔

(بھگت سنگھ)

عالمِ پیئرس کے خوبصورت بچّے

ایک خوبصورت خاتون بننے کی تیاری میں

''ہر ایک کوئی سُوزن کی جِلد کی تعریف کرتا ہے، لیکن سب یہ نہیں جانتے کہ میں اسکے لئے پیئرس صابن کے سوا دوسرا کوئی صابن استعمال نہیں کرنے دیتی'' اسکی ماں کہتی ہے۔
صاف و شفاف پیئرس صابن کا عملِ تقویت اسکی ماں کی طرح سُوزن کی جِلد کو بھی آنیوالے برسوں میں صاف و ملایم اور خوبصورت بنا رکھے گا۔ کیونکہ دُنیا بھر کے دیگر خاندانوں کی طرح اس خاندان میں بھی پیئرس صابن پشتوں سے ایک رازِ حُسن رہا ہے۔

پیئرس
صابن
پُشتوں سے حسین عورتوں کا سِنگار

90-172UD

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—21

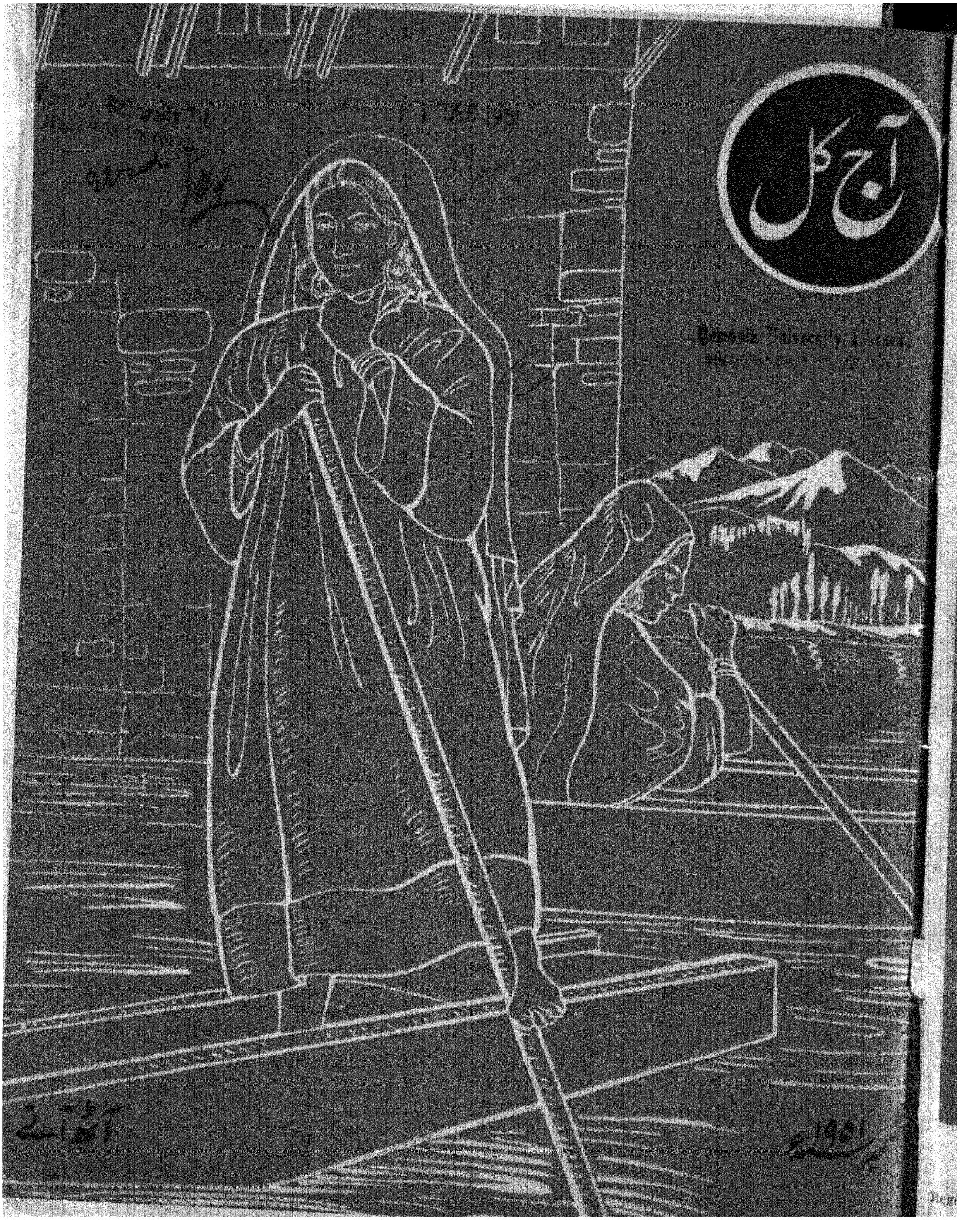

Osmania University Library,
HYDERABAD (DECCAN)
11 DEC 1951

Publications that keep you well informed

March of India

An English bi-monthly. Per copy Rs. 2/8/-. 3 Shs. 6 d. or 55 Cents. Annual Rs. 15/-. Shs. 21 or $ 3.

Kashmir

English fortnightly projecting Kashmir, its people, their arts and crafts. Per copy As. -/8/-. 9 d. or 10 Cents. Annual Rs. 10/-. Shs. 18 or $ 2

Ajkal Hindi

Short stories, poems, pictorial features. Per copy As. -/8/-. 9 d or 10 Cents. Annual Rs. 6/-. Shs. 9. or $ 1.

Ajkal Urdu

Cultural monthly. Edited by Hazrat Josh Malahebadi. Per copy As. -/8/-. 9d. or 10 Cents. Annual Rs. 6/-. Shs. 9 or $ 1.

Bal Bharati

Children's Hindi Monthly. Per copy As. -/6/-. 8 d. or 10 Cents. Annual Rs. 4/-. Shs. 7 or $ 1.

Vishwa Darshan

Hindi Monthly presenting the world to India. Per copy As. -/8/-. 9 d. or 10 Cents. Annual Rs. 6/-. Shs. 9 or $ 1.

A GROUP OF
MEDIA WITH ALL INDIA CIRCULATION

Available everywhere or direct from:

THE PUBLICATIONS DIVISION,
Old Secretariat, DELHI.

پھول جیسے بچوں
کی پرورش نونہال پر ہونی چاہیئے

قیمت فی شیشی
بارہ آنے

نونہال

ننھے بچوں کو مضبوط بنانے والا
اُن کا دل پسند ٹانک

ہمدرد دواخانہ (وقف)
دہلی

Hamdard

آج کل کا

گاندھی نمبر

یہ نمبر گاندھی جی کے بلیدان کے موقع پر شائع ہوا تھا۔ اس نایاب نمبر کی جلدیں فروخت کے لئے موجود ہیں۔ گاندھی جی کی ذات سے محبت اور عقیدت رکھنے والوں سے ہم اس نمبر کے مطالعے کی سفارش کریں گے۔

اس نمبر میں گاندھی جی کی ذات اور کارناموں کے متعلق بیش بہا مضامین اور نظمیں اور گراں قدر تصویریں موجود ہیں۔ پڑھنے لکھنے والوں کے لئے یہ نمبر ایک نادر چیز ہے۔ بہت کم کاپیاں باقی رہ گئی ہیں۔

چند ضروری مندرجات ذیل کی فہرست میں ملاحظہ فرمائیے۔

نظمیں

گاندھی مہاراج	رابندرناتھ ٹیگور
السّلام اے ہند کے شاہ شہیداں السّلام	جوش ملیح آبادی
مہاتما گاندھی	تلوک چند محروم
شہیدِ اعظم	عرش ملسیانی

مضامین

گاندھی جی امر ہو گئے	جواہر لال نہرو
گاندھی جی کی یادگار	سردار ولبھ بھائی پٹیل
عیسیٰ پھر سولی پر چڑھے	پرل بک
اب میں اناتھ ہوں	دیوداس گاندھی
گاندھی جی یاد رہیں گے	ہوریس الیگزینڈر
مہاتما جی ایک مسلمان کی نظر میں	محمد مجیب
گاندھی اور اردو ادب	رام پرکاش

ڈسٹری بیوشن آفیسر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی سے طلب فرمائیے۔ قیمت فی جلد بارہ آنے

(ادارہ)

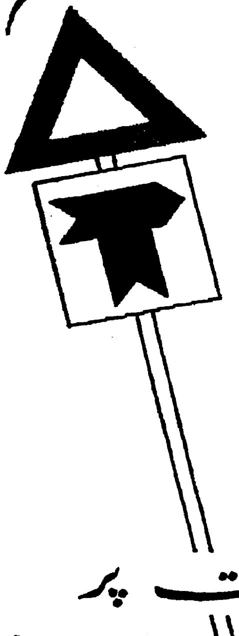

اس چائے کے آگے...

آپ اپنے دن کا کام ختم کر رہے ہیں۔ کچھ آدھے گھنٹے کے بعد آپ گھر کی طرف تیزی سے جا رہے ہوں گے، چائے پینے کی تڑپ میں۔ وہاں آپ کے لئے سموسے اور چٹنی رکھے ہوئے ہیں، اور ڈی لکس بسکٹوں کی بھری ہوئی پلیٹ — اور مکھن ان پر لگا ہوا۔ جی! ہاں.....

چائے پینے کے وقت پر

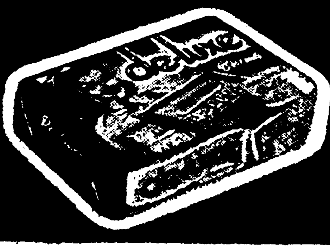

ڈالمیا ڈی لکس

عمدہ بسکٹ

پٹیالہ بسکٹ مینوفیکچررز لمیٹڈ — راجپورا، پٹیالہ

"لکس ٹائلیٹ صابن
ایک نہایت عمدہ محافظ
حُسن ہے"
سمرتی
وشواس
کہتی ہے
LUX
یہ سفید اور خالص صابن، جس کی
خوشبو دلکش ہے۔ آپ کی جلد
کو بھی دلکش بنا دے گا!
فلمی ستاروں کا حُسن بخش صابن

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر :- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد نمبر ۱۰ —— نمبر ۵

سالانہ چندہ —— { ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے }

غیر ممالک سے —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ —— { ہندوستان میں - آٹھ آنے
پاکستان میں - آٹھ آنے }

دسمبر ۱۹۵۱ء

ترتیب

اردو شاعری میں وحدۃ الوجود	میکش اکبرآبادی	۵
فن	جگن ناتھ آزاد	۱۰
گرجا کے سایے میں جنّت سے دُور	اختر اورینوی	۱۱
مصر کی کپاس	سری رام سرنا	۱۸
یگانہ آرٹ	مرزا یگانہ	۲۲
مجنوں گورکھپوری بحیثیت افسانہ نگار	ریاض الرحمٰن شروانی	۲۳
قدرت کے عطیے اور منصوبہ بندی	ادارہ	۲۷
حضرت چھچھوندر چھچھوروی	بلونت سنگھ	۳۳
ذکر و فکر	عبدالمجید حیرت، ارشد کاکوی ناظر الحسینی - فکر ندوی نازش پرتاب گڈھی، سیدہ فرحت	۳۷
جہان آرا	ذکیہ سلطانہ	۳۸
زندگی کا چکّر	برج لال جگی رعنا	۴۰
فلسفہ	عشرت حسن انور	۴۱
درد و تعب	نشتر سندیلوی	۴۳
اطبائے عہد مغلیہ کی ملکی و سیاسی خدمات	کوثر چاندپوری	۴۴
کامیابی اور اس کی اہمیت	راجندر ناتھ شیدا	۴۸
آزادی کے چار سال	——	۵۲
پوشیدہ رائے دہندگی کا صندوق	——	۵۴
رفتارِ زمانہ	ادارہ	۵۶

بچّوں کا آج کل

وطن کی خدمت	اطہر مالیگانوی	۶۱
دلچسپ معلومات	وکیل انصاری	۶۲
قہقہے	——	۶۵
پیر و جولاہا	حامداللہ افسر	۶۶
سنہری زمانہ	خوش باش	۶۸

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

میکش اکبر آبادی

اُردو شاعری میں وحدۃ الوجود

اردو شاعری میں ایرانی شعراء اور ہندوستان کی فلسفیانہ آب و ہوا کے اثر سے مسئلہ وحدۃ الوجود اس طرح رچ بچ گیا ہے کہ اس پر ہمارے شاعروں نے سمجھے اور بغیر سمجھے دونوں طرح طبع آزمائی کی ہے۔ اتفاق سے یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر قوم اور مذہب کے اختلافات کا اثر نہیں پڑا۔ اور یونانی، ہندوستانی، ایرانی اور عرب اہلِ مذاہب اور اہلِ فکر فلسفی سب ہی اس نظریے سے متاثر ہوئے۔ البتہ اس کی تفسیر و تشریح ہر قوم نے اپنے مذاق اور اپنے ماحول کے مطابق کی۔ مگر تفسیر و تشریح کے اس فرق پر ہمارے شاعروں اور شاعروں کے علاوہ مفکروں نے بھی کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے سے محقق مفکر نے اسرار کے دیباچے میں سری شنکر اور حضرت ابن عربی کو متحد الخیال ظاہر کیا ہے حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے اور غالب اور غالباً اُن کے اتباع میں فانی نے اس مسئلے کے مختلف نظریوں کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ان کی نظر میں اس نظریے کی تفصیلات ہی نہیں تھیں۔ اسی طرح ہمارے نئے ساتھی (ترقی پسند ادیب) جو ادب میں جذبات سے زیادہ تفکر اور حقیقت و افادیت کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اس مسئلے پر رائے زنی تو ضروری سمجھتے ہیں مگر اسے سمجھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

مثلاً غالب جب فرماتے ہیں۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی　　ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور فانی جب کہتے ہیں۔

تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گِل　　کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا
کیفیتِ ظہور فنا کے سوا نہیں　　ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے
یہ جستجو ہے کہ ہے عالمِ مجاز کہاں　　تلاشِ چشمِ حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات بدھ مت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ کیونکہ بدھ مت کے نزدیک یہ کائنات بلکہ مطلقاً ہستی کوئی شے نہیں ہے۔ سب کچھ عارضی ہے۔ استقلال کا تصور ہمارے خود اپنے وجود کے استقلال کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک فریب ہے۔ خود ہمارا شعورِ ذات کسی خاص لمحے کے جذبات و تصورات کی پیداوار ہے۔ نہ علت ہے نہ معلول نہ نفس ہے نہ روح اور نہ خدا۔ سب کچھ ایک خواب ایک خیال اور ایک سراب ہے۔ سری شنکر کے نظریۂ مایا اور بدھ مت کے نظریۂ عدم میں یہ فرق ہے کہ بدھ مت مطلقاً وجود کی قائل نہیں ہے۔ مگر سری شنکر برہم کے وجود کے قائل ہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ اس نظر آنے والے عالم کو معدوم محض نہیں مانتے بلکہ ایک خاص قسم کا دھوکا مانتے ہیں جس کی شرح ایک مستقل مقالہ چاہتی ہے۔ یہاں اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ شنکر اور ان کے شارحین کے نزدیک مایا ایجابی ہے، عدم محض نہیں ہے۔ اور پھر کہیں ہمارے یہ شاعر پورے بدھ بھی نہیں ہیں۔ بلکہ شنکر کی طرح ایک حقیقت کے قائل ہیں۔

غالب۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

علامہ اقبال کہیں بھی بدھ مت کی طرح عدم محض کے قائل نہیں ہوئے مگر شنکر کی طرح اس عالم کا انکار اُنھوں نے بھی کیا ہے۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری　　نہ ہے زمان و مکاں لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند　　بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

علامہ کے خیال میں بھی شنکر کی طرح یہ عالم نقشِ باطل ہے۔

کسے کہ از دو جہاں خویش را بروں نشناخت
فریب خوردۂ ایں نقشِ باطل است ہنوز

فانی نے بھی ایک ہستی کا اقرار کیا ہے۔

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے　　　تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز
کس کو کہئے ماسوا جب تو نہیں تو کچھ نہیں　　　تو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا مجھے
تو بھی تو ماسوا بھی تو ہی ہے　　　رنگ و بُو رنگ ہے نہ بُو ہی ہے

اور غالباً اسی لئے ان شعراء نے فنا کو اصل اصول قرار دیا ہے۔ جیساکہ ویدانت اور بُدھ مت کے حامیوں نے قرار دیا ہے۔ کیونکہ جب کائنات دھوکا اور باطل ہے تو اُسے دُور ہو جانا اور مٹ جانا ہی چاہیئے۔

غالب۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

فانی

ہمیں کھوئے گئے تجھ میں نہ جب تیرا پتا پایا　　　نہ پایا مُدّعا ہم نے تو گویا مُدّعا پایا

بُدھ مت اور ویدانت میں اپنی ہستی (اہنکار) اور اپنی خودی تمام جہالت اور دُکھ کی اصل سمجھی جاتی ہے۔

غالب نے کہا ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں　　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

فانی نے کہا ہے۔

میرا وجود کفر مری زندگی گناہ　　　ہستی کو ہوش ہوش کو لازم خودی ہوئی

اس موضوع پر ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال ہر اس فلسفے کے خلاف ہیں جو نفیِ خودی اور موت کا حامی ہے۔ افلاطون کے نظریۂ اعیان پر تنقید کرتے ہوئے سب سے زیادہ اعتراض افلاطون پر انھیں یہی ہے کہ اُس نے موت کو محبوب بنا کر پیش کیا ہے۔

گُفت سرِّ زندگی در مُردن است　　　شمع را صد جلوہ از افسردن است

مگر معلوم نہیں موت میں کیا کشش اور محبوبیت ہے کہ اقبال بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

تُو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے　　　حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق　　　جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست　　　زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

یہاں تک تو یہ شاعر بالکل ویدانتی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر کہیں کہیں یہ بالکل ابنِ عربی کے مقلد نظر آتے ہیں۔ جو وحدۃ الوجود کے قائل ہوتے ہوئے بھی اس عالم کو مایا یا دھوکا نہیں سمجھتے۔ بلکہ عین حقیقت سمجھتے ہیں۔

غالب۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا!
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل　　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے　　　جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

فانی۔

ہر باطل و ہر ناحق اک سازِ حقیقت ہے　　　جس شکل میں حق آیا وابستۂ باطل تھا
ہر جزو بجائے خویش کل ہے فانی　　　ذرّے ہی کو آفتاب بھی کہتے ہیں

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرقِ مجاز و حقیقت کیا
یہ عرضِ[1] حقیقت ہے وہ حقیقتِ ہستی باطل کوئی نہیں

اب ذرا اصل مسئلے کی طرف توجہ فرمایئے۔ کیونکہ اسی طرح معلوم ہو سکے گا کہ اس کی تشریح میں کتنا بنیادی فرق ہے۔

اس نظریے کے دو حصے ہیں (۱) یہ کہ ہستی ایک ہے یا یہ کہ ایک کے سوا کوئی موجود نہیں ہے اور (۲) یہ کہ ہم اور یہ عالم کیا ہے۔ کیونکہ جب ایک کے سوا کوئی نہیں ہے تو ہمیں اور اپنے اور اس دکھائی دینے والے عالم کے متعلق سوچنا ہی پڑتا ہے۔ کہ یہ کیا ہے۔ غالب نے اسی شکل کو محسوس کرکے کہا تھا۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے　　　نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے

---

[1] فانی صاحب کے اس شعر میں عرض کا لفظ قرض اور فرض کے وزن پر (بسکونِ را) استعمال ہوا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ عرض جوہر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے وہ (بفتحِ را) بروزن مرض اور کرم ہے۔ یہ غلطی فانی صاحب سے غالباً مرزا غالب کے ان شعروں کے سبب سے ہوئی ہے ؎

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا　　　نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں　　　کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

(میکش)

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اور فانی کو بھی کچھ اسی قسم کی اُلجھن پیش آئی تھی۔

"قطرہ دریا ہی کس قطرے کو دریا کہئے"

غرض یہ کہ اس نظریئے کا پہلا حصّہ تمام وحدۃ الوجودیوں کے نزدیک مسلّم ہے کہ ہستی یا ہستی کی حقیقت ایک ہے۔ اختلاف اگر ہے تو دوسرے حصّے میں ہے۔ رہا یہ کہ ہستی کے ایک ہونے کا خیال سب سے پہلے کس کو، کہاں، اور کیوں پیدا ہوا۔ یہ معلوم نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ۔

یونانی فلسفے کی ابتدا چھٹی صدی قبل مسیح سے ہوتی ہے، اس کا سب سے پہلا فلسفی طالیس تھا جس کے خیال میں مبدأ کائنات پانی ہے۔ اس طرح یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عالم کی حقیقت ایک ہے۔ اس موقع پر ہماری توجہ توریت کے باب پیدائش اور رگ وید کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ

"خدا کی روح پانی پر تیرتی تھی"

اور پھر طالیس کے بعد دوسرے یونانی فلسفی اس میں تو اختلاف کرتے آئے۔ کہ کائنات کا مبدا پانی ہے یا آگ ہے، ہوا ہے یا خدا ہے۔ لیکن یہ بات عموماً تسلیم کی جاتی رہی کہ کائنات کا ہیولا یا حقیقت ایک ہے۔ یہ یونانی اسکول آخر نو فلاطونیت کی شکل میں ختم ہوا جس کا عقیدہ ہے کہ خدا تمام کائنات کا منبع اور مرجع ہے۔ خدا ہر شے کی ابتدا، درمیان اور آخر ہے۔

عرب میں پیغمبر اسلام سے پہلے اور شنکر سے بہت پہلے ایک بے پڑھے لکھے شاعر نے کہا تھا "سوائے خدا ہر شے باطل ہے"

اور پھر پیغمبر اسلام نے اس بات کو سب سے زیادہ سچی بات کہہ کر پیرانِ اسلام کے لئے اس عقیدے کو محکم تر کر دیا۔ (اگرچہ ۸۰ فی صدی مسلمان اس عقیدے کے قائل نہیں ہیں) قرآن میں بھی ہے کہ اوّل و آخر ظاہر و باطن سب خدا ہی ہے۔

ہندوستانی ادب میں یہ عقیدہ اپنشدوں میں ملتا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ "وہ اوپر نیچے آگے پیچھے شمال و جنوب میں ہے۔ وہ یہ سب کچھ ہے"

لیکن اس مسئلے کا دوسرا حصّہ کہ یہ عالم کیا ہے، دراصل بہت اہم ہے اور اسی جگہ سے اربابِ فکر میں اختلاف ہے۔

سری شنکر [illegible] کو دھوکا (مایا) مانتے ہیں۔ مایا کا سبب (اودیا) جہالت ہے۔ یہ دھوکا برہمہ (حقیقت) پر عائد ہوا ہے۔ کیوں اور کس طرح یہ معلوم نہیں۔ شنکر اس عالم کو معدوم محض بھی نہیں مانتے بلکہ مایا کو ایک ایجابی مقولہ مانتے ہیں۔

نو فلاطونی اگرچہ مادے اور اس عالم کو خدا کا ظہور سمجھتے ہیں۔ مگر مادے کو حقیقت کا حجاب بھی سمجھتے ہیں اور اس طرح گویا مادے کی غیریت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ بھی شنکر کی طرح حقیقت اعلیٰ تک پہونچنے کے لئے مادے کا ترک ضروری سمجھتے ہیں۔

دوسرے مغربی فلسفی وحدۃ الوجود کی اس انداز سے صراحت کرتے ہیں کہ اُسے مادہ پرستی کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ زینو فینیز اسی دنیا کو خدا تسلیم کرتا ہے۔ اس کو پہلا وحدۃ الوجودی فلسفی کہا گیا ہے —— اسپنوزا بھی تقریباً اسی کا ہم خیال ہے۔ اس طرح خدا یا حقیقتِ اعلیٰ کا تنزیہی پہلو بالکل نظر انداز ہو جاتا ہے، اور حقیقت کا تصور کلی طبعی کی طرح محض ذہنی اور خیالی ہو کر رہ جاتا ہے۔

وحدۃ الوجود کے یہ تمام تصورات عموماً حقیقت کو بطور کلی کے تسلیم کرتے ہیں، اور اس طرح عالم کے وجود کے یا تو منکر ہیں اور یا اس کی توضیح سے گریز کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے عالم کو وہم کہا یا شعبدہ اور سراب سے تعبیر کیا ہے وہ اسی مکتبِ خیال کے مقلد ہیں۔

ان تمام نظریوں کے خلاف ہسپانوی صوفی فلسفی ابن عربی کا نظریہ ہے جو یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ وجود اور موجود ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر کائنات کو وہم اور معدوم نہیں مانتے، بلکہ عینِ حق سمجھتے ہیں اور اپنے اس نظریئے کو مختلف نظریوں سے ثابت کرتے ہیں۔ جن میں اعیانِ ثابتہ تنزلات اور جمع بین التشبیہ والتنزیہہ کے نظریئے بہت خاص ہیں، اور درحقیقت ان نظریوں کو سمجھے بغیر ابن عربی کا نظریہ سمجھنا دشوار ہے۔ بہرحال یہاں ان نظریات سے بحث کرنا مقصود بھی نہیں ہے بیان کرنا صرف اتنا ہے کہ شنکر اور ابنِ عربی کے نظریات میں بہت اختلاف ہے۔

آخر میں کچھ باتیں ترقی پسند ادیبوں سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ان میں سے بعض حضرات یا ممکن ہے سب وحدۃ الوجود کو بورژوائی اور سرمایہ دارانہ تہذیب کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ بغیر تحقیق دعوےٰ کرنے کے عادی تو نہیں ہیں مگر غلط فہمی تو اُنھیں بھی ہوسکتی ہے اور پھر

ان میں سب ڈاکٹر محمد اشرف، سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری وغیرہ کے سے ہی تو نہیں۔ چنانچہ بہت سے تو شاید یہ جاننے کی تکلیف بھی گوارا کرنا نہیں چاہتے کہ وحدۃ الوجود ہے کیا۔ اور ہے یہ کہ اس کا جاننا ضروری بھی نہیں ہے۔ مگر یہ بات ضرور قابلِ اعتراض ہے کہ بغیر جانے ہوئے اتنے اہم مسئلے پر لب کشائی کی جائے۔ مثلاً سنہ ۵۰ء کے "شاہراہ" کے سالنامے میں ممتاز حسین صاحب لکھتے ہیں۔

"غالباً محمد مہدی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وحدۃ الوجود کا فلسفہ اور تصوّف دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ وحدۃ الوجود کو انگریزی میں (Pantheism) کہتے ہیں۔ اسلامی تصوّف میں ایسی تحریکیں بھی ہیں جن میں وحدۃ الوجود نہیں ہے۔ جن میں ہمہ اوست اور لاموجود الا اللہ ہے۔ یہ سب حکمراں طبقے کے دیے ہوئے رجعی رجحانات ہیں"

اب یہ کس طرح عرض کیا جائے کہ وحدۃ الوجود، ہمہ اوست، اور لاموجود الا اللہ بالکل ایک ہی چیز ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے قرون اولیٰ اور وسطیٰ میں وحدۃ الوجود اُن لوگوں کا نظریہ رہا ہے جو شخصی سلطنت اور سرمایہ داری کے خلاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام نے اُن کا ساتھ دیا۔ کیونکہ وحدۃ الوجود انسان کو دوسرے انسان کے سامنے پست ہونے سے روکتا ہے۔ چنانچہ صوفیائے اسلام کے سرگروہ خواجہ حسن بصری اور آئمہ اہلبیت کی تاریخ اس بات کی تائید کر سکتی ہے۔ آج بھی اگر کسی نظریے کی بنا پر تمام دنیا کے انسان ایک برادری بن سکتے ہیں تو وہ یہی نظریہ ہے۔

وحدۃ الوجود کی مخالفت مختلف وجوہ سے کی گئی ہے لیکن جہاں تک خالص وحدۃ الوجود کا تعلق ہے یہ نظریہ نفیِ محض اور ثنویت کے سوا کسی اور نظریئے سے نہیں ٹکراتا۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ مادہ ہے یا دعویٰ کیا جائے کہ مادہ نہیں ہے، یا مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں ہے۔ حقیقت مادّی ہے یا غیر مادّی۔ روح اور مادّہ فانی ہے یا ازلی، تو یہ اور اس قسم کے تمام اختلافات وحدۃ الوجود سے غیر متعلق ہیں اور اس کو ان کی تردید یا تائید سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہستی اور اس کی آخری حقیقت ایک ہے، وہ مادّہ ہو یا روح۔ ایٹم ہوں یا ایتھر۔ اس لئے یہ نظریہ نہ کمیونزم سے ٹکراتا ہے نہ جمہوریت سے اور نہ فاشزم سے جس طرح مختلف نظریوں کے ماننے والے اپنی نوع اور جنس نہیں بدل لیتے، اسی طرح یہ نظریہ بھی

معشوقِ ما بشیوۂ ہر کس برابر است   با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

کا مصداق ہے۔

جدلیاتی اور مابعد الطبیعیاتی طریقِ استدلال میں جو فرق ہے اُس کا اثر بھی اتفاق سے نظریۂ وحدۃ الوجود پر نہیں پڑتا۔ کیونکہ آپ اشیاء پر بحیثیت سکون نظر ڈالئے یا بحیثیت حرکت دیکھئے۔ اُن کے تاریخی پس منظر اور قدرتی رشتوں سے منسلک کر کے دیکھئے یا ان رشتوں سے علیحدہ کر کے دیکھئے حقیقت نہیں بدلتی۔ کیونکہ اس نظریئے میں وجودِ مطلق کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ وہ حرکت اور سکون دونوں کو شامل ہے۔ سکون بھی اگر ہے تو اسی کا ہے اور حرکت بھی اسی کی ہے۔ جدلیات کی بنیاد ہی اس داخلی تضاد پر ہے۔ اور وحدۃ الوجود اس تضاد سے روگردانی نہیں کرتا۔ بلکہ جدلیات کی طرح اس تضاد ہی پر بنیاد قائم کرتا ہے۔

مغربی مابعد الطبیعیات کے حامیوں کے نزدیک مدرکات اور اُن کے ذہنی پرتو یعنی تصوّرات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مگر ابن عربی اور اُن کے مقلدین مدرکات اور تصوّرات کو ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر تسلیم کرتے ہیں جس طرح مارکس کے نزدیک علم و عمل ایک ہی شے کے دو رُخ ہیں۔ وجودی نقطۂ خیال سے وجودِ مطلق ازل سے ابد تک باعتبارِ حقیقت ایک ہی حال پر ہے (الآن کما کان) اور باعتبارِ مظاہر ہر آن بدلتا ہوا اور متحرک ہے (کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ) اس لئے جدلیاتی منطق بھی ابنِ عربی کے وحدۃ الوجود کے بالکل مطابق ہیں۔ یہ نظریہ خود بھی اشیاء کو انفرادی طور سے الگ الگ کر کے دیکھنے کا عادی نہیں، اور اشیاء کے باہمی رشتوں اور تعلقات بلکہ ان کی تفصیلات سے بھی قطع نظر کرنے کو جائز نہیں سمجھتا (گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی) اور نہ اشیاء کی ابتدا و انتہا کو نظر انداز کرتا ہے۔ بلکہ حرکت میں اشیاء کا سکون اور سکون میں اشیاء کی حرکت اُس کی نظر سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ نفی و اثبات کو جمع کئے بغیر وہ حقیقت کا تصوّر کرنا بھی جائز نہیں سمجھتا۔ اور یہی مارکسی جدلیات کا خلاصہ ہے۔ انجیلز نے کہا ہے۔

"چیزوں کو انفرادی طور پر الگ الگ دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مابعد الطبیعیات اُن کے باہمی تعلق اور رشتوں کو بھول جاتی ہے۔ ان کے وجود پر غور کرتے وقت اُن کی ابتدا اور انتہا کو نظر انداز کر دیتی ہے۔

سکون کی حالت میں ان کی جانچ کرنے سے وہ اُن کی حرکت کا خیال نہیں کرتی۔ فرداً فرداً درختوں کو دیکھنے سے جنگل اس کی نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔"

"اور زیادہ گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک متضاد کے دونوں سرے یعنی اثبات و نفی جتنا ایک دوسرے کی ضد ہیں اتنا ہی ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں۔

اینجلز نے دوسری جگہ کہا ہے۔

"دنیا طبیعی، تاریخی اور ذہنی طور پر برابر متحرک اور متغیر ہے۔ اور نت نئے قالب بدلتی اور ترقی کرتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی گئی کہ اس اندرونی تعلق اور اس داخلی رشتے کا پتہ لگایا جائے جو اس ساری حرکت اور ترقی کو آپس میں جوڑے ہوئے اور اُسے ایک وحدت بنائے ہوئے ہے۔" (سوشلزم باب ۲)

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسی وحدت کی دریافت وجودی تصوف کا بھی مطمح نظر رہا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس دریافت کے اصول مادی ہوں گے یا غیر مادی؟ تو اسی طرح یہ بحث کہ مادہ پہلے ہے یا شعور، اور روح پہلے ہے۔ اس لئے غیر اہم ہو جاتے ہیں کہ وجودی نقطۂ نظر سے مادّہ اور روح دونوں ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ دراصل مابعد الطبعیات کی مخالفت کرنے والوں کے ذہن میں عموماً وہی مکاتیب خیال ہوتے ہیں جو مادے سے منکر اور اس کے ترک کے قائل ہیں، جو اس زندگی کو دُکھ اور اس عالم کو شر اور ناپاک سمجھتے ہیں، اور جن کی ترویج و اشاعت میں ہمارے شاعروں کا بہت زیادہ حصّہ ہے۔

بے گھر لوگوں کے لئے مکانات کی فراہمی

تین سال کے کام کا ریکارڈ

اندازہ لگایا گیا ہے کہ مغربی پاکستان سے آئے ہوئے شہری بے گھر لوگوں کے لئے ایک لاکھ سے بھی زیادہ مکانات تعمیر ہو چکے ہیں یا زیر تعمیر ہیں۔ اور مجموعی طور پر مارچ ۱۹۵۲ء تک سوا بائیس لاکھ شہری بے گھر لوگوں کو مکانات وغیرہ فراہم کردئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ۲۸ ہزار پلاٹ الاٹمنٹ کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ اور مرکزی وزارت بحالیات نے تقریباً ۲۵ ہزار یونٹوں کے لئے تعمیر کی منظوری دے دی ہے۔

مارچ ۱۹۵۱ء تک مرکزی حکومت نے مغربی پاکستان کے بے گھر لوگوں کو مکانات فراہم کرنے کے لئے ۲۷ کروڑ روپیہ خرچ کیا اور موجودہ مالی سال میں ۱۲ کروڑ روپیہ صرف کیا جائے گا۔ مغربی پاکستان کے بے گھر لوگوں کے سلسلے مکانات کی فراہمی کے پروگرام کے مطابق ۱۵ ریاستوں میں دو سو نئی بستیاں آباد کی جائیں گی۔ ان نئی بستیوں میں ۱۲ قصبے بھی شامل ہیں۔ جن کی آبادی چار لاکھ سے زائد ہوگی۔

ریاستوں میں جون ۱۹۵۱ء تک جو مکانات تیار ہو چکے ہیں۔ اُن کی مجموعی تعداد ۷۷ ہزار ۷ سو اکیاون ہے۔ اور ۵۲-۱۹۵۱ء کے بجٹ میں سے جن مکانات کی تعمیر کے لئے منظوری دی جا چکی ہے یا زیر تعمیر ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۶ ہزار تین سو باون ہے۔

بہت سی ریاستوں میں آبادیوں کے قرب وجوار میں دوکانیں بھی تعمیر کی جائیں گی۔ چنانچہ ابتک ۲۷ ہزار دوکانیں تعمیر ہو کر الاٹ ہو چکی ہیں۔

دہلی میں مکانات کی تعمیر کا پروگرام۔ موجودہ مالی سال میں بارہ ہزار رہائشی کرے ایک ہزار مکانات اور دو ہزار دکانیں تعمیر کی جائیں گی۔ مارچ ۵۲ء تک مغربی پاکستان سے آئے ہوئے بے گھر لوگوں کو جائے سکونت کی فراہمی کے سلسلے میں ۹ ۳ کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ دہلی میں اب تک مکانات کے لئے ۲۸ سکیمیں جاری ہو چکی ہیں۔ خرید و فروخت کے ۱۳ مرکز تعمیر ہو چکے ہیں یا زیر تعمیر ہیں۔ ان مرکزوں میں سات بڑی بڑی مارکیٹیں بھی شامل ہیں۔

دہلی کے تعمیری پروگرام میں صرف رہائش کے لئے مکانات ہی شامل نہیں ہیں۔ بلکہ پرائمری اور ہائی اسکولوں۔ شفاخانوں۔ ہسپتالوں اور تربیتی مرکزوں کے لئے عمارتیں بھی شامل ہیں۔ لاوارث عورتوں اور بچوں کے لئے بھی دہلی میں ایک بستی آباد کی گئی ہے جس کی تیاری اور تعمیر پر حکومت کا ۵ ۱ لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہے۔

جگن ناتھ آزاد

فن

جس کا ہر جزو محبت ہے وہ زنجیر ہے فن — زہر تریاق بنے جس سے وہ اکسیر ہے فن
جس سے ہر فکر منوّر ہو وہ تنویر ہے فن — جس سے ناخوب بنے خوب وہ تدبیر ہے فن
نوعِ انساں کا اک آئینۂ تقدیر ہے فن
نقشۂ مہر ہے اخلاص کی تصویر ہے فن

فن کنارہ بھی ہے دریا کا سفینہ ہی نہیں — رفعتِ بام بھی ہے بام کا زینہ ہی نہیں
اوجِ سینا کی تجلّی بھی ہے سینا ہی نہیں — یہ تجسّس بھی ہے گم گشتہ دفینہ ہی نہیں
فن کا مفہوم جِلانا بھی ہے جینا ہی نہیں
یہ پلانے کا سلیقہ بھی ہے پینا ہی نہیں

فن یہ تسلیم بہ ظاہر کوئی تلوار نہیں — فن یہ تسلیم کہ آمادۂ پیکار نہیں
اس کی تلوار سے کم تیز مگر دھار نہیں — یہ ہے کردار بھی گفتار ہی گفتار نہیں
جس کا مقصود نمائش ہو وہ ہتھیار نہیں
فن فقط تذکرۂ کاکل و رُخسار نہیں

اختر اورینوی

گرجا کے سائے میں، جنّت سے دُور

اُن کی ایک منڈلی تھی۔ مگر اب وہ اتنی بارونق نہیں رہی تھی تاہم بکھری ہوئی منڈلی کے چند رکن ہنوز شہر میں موجود تھے۔ ایک پولیس کا افسر، ایک ڈاکٹر، ایک پرافسر، ایک کانسل کے دفتر کا ملازم، اور ایک صحافی۔ منڈلی میں ہندو، مسلمان، عیسائی۔ سُرخ، سبز، زعفرانی اور ترنگے، ہر طرح کے لوگ تھے۔

پرافسر کے کوارٹر کے احاطے میں ایک جیپ آکر رکی۔ شام بیت چکی تھی۔ عنفوانِ شب رسمسا تا ہوا آ چکا تھا۔ بجلی کے قمقمے کچھ روشن ہو رہے تھے اور کچھ ہو چکے تھے۔ احاطے کے لاؤن اور ٹٹیوں پر کوارٹر کے دروازوں اور دریچوں سے نکلنے والی بجلی کی روشنی مختلف اقلیدسی شکلیں بنا رہی تھی۔ اندھیرے کی کترنیں سامنے بکھری پڑی تھیں۔ جیپ پر سے دو ہستیاں اُتر پڑیں۔ ایک دوہرے بدن کی قدآور ہستی تھی اور ایک اوسط قد اور چھریرے بدن والی۔ وہ دونوں آگے بڑھتے ہوئے بنگلے کی سیڑھیوں پر چڑھ آئے۔ اُن کے حُلیوں پر نُور اور تاریکی سے کئی قماشیں بنیں اور بگڑیں۔ پرافسر اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھا آنے والوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیپ کے آنے اور رُکنے کی آواز نے اُس کی توجہ اس جانب پھیری تھی۔ وہ کمرے سے باہر آیا اور دونوں آنے والوں کو پہچان کر اُن سے مخلصانہ انداز میں لپٹ گیا۔

"بھئی خوب آئے! آج تو ایسی اُمس اور گھُٹن ہے کہ پڑھا لکھا بھی نہیں جاتا۔"

"آپ تو سٹری ہوئے جاتے ہیں جناب پرافسر صاحب! خبر ہے ڈاکٹر نے کھانے پر بُلایا تھا؟"

"ارے ٹھیک یاد آیا۔ بھئی صحافی، تم کیوں نہیں سویرے آگئے۔ یہ مردِ خدا تو خیر ہر وقت چور اُچکّوں کی فکر میں رہتا ہے۔ پولیس والوں کو کہاں فرصت؟

"میں تو کب کا آرہا تھا۔ یہ حضرت بُری بَلا ہیں۔ یہاں چلو، وہاں چلو، دُنیا جہان کی خاک چھان کر آرہے ہیں۔ اور اب بھی آپ کے ہاتھ میں ایک موٹی سی فائل ہے۔ ملاحظہ ہو!"

"چُپ رہو! تم تو نِرے گاؤدی ہوگئے ہو۔ جناب صحافی صاحب آپ اور یہ جناب پرافسر صاحب، شاعر اور ادیب ہیں نا، بس عقلِ سلیم تو روپوش ہو چکی آپ لوگوں کی۔ خیر چلو بھی نکلو آپ۔ اسی طرح بھئی پرافسر۔ آؤ چلیں جیپ حاضر ہے۔"

تینوں دوست شہر کے گنجان بازاروں سے ہوتے ہوئے میدان کی طرف نکل آئے۔ اور بڑے گرجا کے پہلو سے مُڑتے ہوئے اُنھوں نے کلب گھر کی جانب رُخ کیا۔ جیپ کے ہیڈ لائیٹ کی متجسّس روشنی رات کے پردے میں چھپے ہوئے مناظر کا بھید کھول رہی تھی۔ بائیں جانب پولیس لائن کا میدان اور بارکیں تھیں۔ داہنی طرف گرجا کے احاطے کے خاتمے پر ایک تکونا میدان تھا۔ جس میں جابجا درخت اُگے ہوئے تھے اور آگے کلکٹری کچہری اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی عمارتیں تھیں۔ سڑکوں پر دو رویہ درختوں کی قطاریں اور بیچ بیچ میں بڑ اور پیپل کے بڑے بڑے جٹا دھاری پیڑ دھیان لگائے کھڑے تھے۔ ان پیڑوں تلے اور کچہری کی عمارتوں کے سائبانوں میں کچھ سائے رینگ رہے تھے۔ کچھ اجسام کُنمنا رہے اور کچھ یونہی کونے کاترمیں ڈھیر تھے۔ یہ علاقہ روگی، بھک منگوں، اپاہج فقیروں، کوڑھی گداگروں اور مجبور دمعذور سائلوں کی پناہ گاہ تھا۔ انھوں نے سرِراہ درختوں کے نیچے، پسِ دیوار یا کھلے میدان میں بے در و دیوار سا گھر بنا رکھا تھا۔ دن کو تو اس جگہ کچہری کے عملوں فعلوں، وکیلوں، مختاروں، مقدمہ بازوں، پیروی کاروں، گواہوں، خوانچہ فروشوں، سڑک حکیموں اور تماش بینوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ لیکن اسی بھیڑ بھڑکے میں کسی درخت کے نیچے کوئی کوڑھی یا مفلوک الحال گداگر بیٹھا یا لیٹا ہوا صدائیں

گھناتا رہتا! "کوڑھی کو ایک پیسہ" "رام بھلا کریں۔ دیا کرو بابا" ان میں مرد عورت، جوان، بوڑھے۔ بچے سبھی تھے۔ ان کا ایک بڑا حصہ دن کو بھیک مانگنے شہر کی گنجان آبادی کی طرف نکل جاتا تھا اور رات کو سبھی اکٹھا ہو جاتے تھے۔ جیسے پرند اپنے گھونسلوں میں آجائیں۔ برسات اور جاڑے میں روگی فقیروں کی یہ آبادی کچہری کے سائبانوں میں پناہ لیتی تھی۔ غرض گرجا، کچہری اور کلب کے درمیان کا مثلث اُن کی دُنیا تھی۔ دن کو اس دُنیا میں بیرونی بھی گھس آتے تھے۔ مگر رات کو یہ اُن کی اور صرف اُن کی دُنیا ہوتی تھی۔ نہ جانے کب سے یہ طبقہ یہاں رہتا آیا تھا۔ یہیں وہ مرتے جیتے تھے۔ اور یہیں اُن کی عورتیں بچے جن کر زندگی کا ایک عجیب سوانگ اور سنجیدہ و تلخ طنز بن جاتی تھیں۔

جیپ گرجا کے احاطے سے آگے نکل کر پورب اوتر کی جانب بڑھتی چلی گئی اور جلد ہی کلب کے پھاٹک میں جا داخل ہوئی۔ پھاٹک کے کرخی ستونوں پر بجلی کے مہتابی قمقمے دمک رہے تھے۔ کلب داہنی جانب شہر کے چلتے ہوئے بیرسٹر مسٹر تلک کی رفیع الشان کوٹھی جھل مل کر رہی تھی — دربان نے صاحب لوگوں کو سلام کیا، اور جیپ بڑھتی ہوئی چلی گئی۔ کلب کی عمارت دریا کے کنارے واقع تھی۔ گرد اگرد بہت بڑا احاطہ پھول کی کیاریوں۔ ہری بھری ٹٹیوں، عطر فشاں بیلوں۔ گو لمبروں۔ موزوں ستونوں، جدولوں۔ خوش وضع راستوں، حوضوں، برقی قمقموں اور سبزۂ شاداب سے سجا ہوا تھا۔

تینوں دوست اُتر پڑے۔ چوتھا ڈاکٹر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ ازلی و ابدی مجرد آدمی تھا۔ وہیں کلب میں اُس نے ڈنر کا انتظام کرایا تھا۔ یوں بھی اُس شب کو کلب میں چہل پہل تھی۔ سنیچر کی شامیں وہاں خوب نکھرتی تھیں، اور راتوں کے سنورنے کا تو پوچھئے ہی نہیں۔ اکثر دعوتیں اور رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوا کرتی تھیں۔ اُس رات کو بھی کلب بُقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ آرکسٹرا کے گت بج رہے تھے۔ چاروں دوستوں نے بڑی خوش فعلیوں کے ساتھ عشائیہ نوش کیا۔ پھر دریا کنارے صوفوں پر بیٹھ کر جام ارغواں کے دور چلانے لگے۔ کچھ دیر بعد پولیس افسر نے کہا۔

"یارو! آج مجھے بڑی فراغت نصیب ہوئی ہے۔ شیطان کی آنت ایک پُر پیچ فائل مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ شکر ہے کہ انسپکٹر جنرل نے بھی ہار مان لی۔ اور حکومت کے قانونی مشیر اعلیٰ کی بھی ایک نہ چلی۔ حکم ہوا کہ فائیل کو تہ کر کے رکھ دو۔ یہ رہا! دیکھو اس تابوت کو—" اُس نے فائیل کو نچا کر دکھایا۔

"اب میں تمہارے سامنے گڑے مُردے اُکھیڑتا ہوں۔ مزے کا قصہ ہے سُنو!"

"ضرور سناؤ!..... ضرور سناؤ!...... اچھا آپ شام سے یہی جنازہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں...... خوب!" دوستوں کی ملی جلی آوازیں آئیں۔

"لو بھئی سنو! ٹوکنا نہیں۔ میں وضاحت کرتا جاؤں گا۔" پولیس افسر نے ترنگ میں کہا۔

"ساری شرطیں منظور ہیں....... ہاں بھئی سب کی سب......"

شیطان کی آنت کا جنازہ میز پر رکھ دیا گیا۔ لکھا تھا۔

محکمۂ پولیس ..... کلکشن نمبر ۹ ... فائیل نمبر ۲۵ ... سال ۱۹۳۸ء
سلسلہ نمبر ۵ ... مضمون ..... خاص محال کی زمین سے گداگروں آوارہ گردوں اور جذامیوں کا اخراج۔

"اسی آس پاس کی داستان ہے۔ کلب میں ڈنر کے تصور نے مجھے اُکسایا اور میں یاروں کی تواضع کے لئے جائے وقوع کے قریب ہی بیٹھ کر سنانے کو سارا کچا چٹھا لے آیا!" پولیس افسر بولا— "لو اب تابوت کا ڈھکنا کھلتا ہے۔"

فائیل کا کور کھلا۔ مراسلات کی نتھیاں لگی پڑی تھیں۔ ٹائپ۔ تحریر، دفتروں اور اجلاسوں کی رعب ڈالنے والی مہریں۔ آڑے ترچھے احکامات، نوٹ۔ سوالات، تشریحات۔ لال اور نیلی پنسل کے نشانات اور اندراجات کے نمبر ورق ورق پر لگے ہوئے تھے۔

"یارو! مخالف جانب سے میں تمہیں منتخب مراسلے سُناتا جاتا ہوں۔ یہ سامنے کا مراسلہ جو پہلا معلوم ہوتا ہے، دراصل آخری ہے" تابوت بردار نے کہا۔ پھر مراسلوں کا پلندہ اُلٹ کر سلسلے سے ضروری مراسلے سُنانے لگا

مراسلہ نمبر ۱۹۱/۱۵ بتاریخ ۲۷-۱۰-۳۸

صاحب انسپکٹر کوتوالی!

گداگروں کو دیکھ کر میری طبیعت مہینوں سے کوفت محسوس کر رہی ہے۔ کیا تم انھیں پولیس لائن۔ کلب۔ گرجا اور کچہری کے حلقے سے ہٹا نہیں سکتے؟

ایس۔ پی آفس کی مہر ج... جے۔ ایس پی ۲۸/۱۱

شہر حوالدار لال جی پانڈے تعمیل کرے۔ اور ۱۱/۴۸ تک رپورٹ کرے۔

......سب انسپکٹر کوتوالی۔ بتاریخ ۲۸/۱۱/۴۸

جناب عالی! گزارش ہے کہ سب کو ہٹا دیا گیا۔ لیکن جو بہت لاچار اور چلنے سے مجبور لگتا ہے وہ نہیں ہٹایا جا سکا۔ دیکھنے سے بھی بہت بیمار معلوم ہوتا ہے۔ تعمیل حکم کیا۔ حوالدار..... پانڈے ۱/۱۱/۴۸

جناب ایس۔ پی صاحب بہادر!

گد اگروں کو ہٹا دیا گیا۔ سوائے چند کے، جو ہلنے چلنے سے مجبور تھے، وہ ہٹنے سے انکار کرتے ہیں، جیسا کہ حوالدار کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپکے حکم کا منتظر ہوں۔ ......انسپکٹر کوتوالی ۲/۱۱/۴۸

انسپکٹر چالان!

کیا مذکورۂ بالا گداگروں کو چالان کرنے کی کوئی دفعۂ قانونی نہیں؟ وہ لوگ خاص محال کی زمین پر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ کیا خاص محال کا افسران پر مقدمہ نہیں چلا سکتا؟ ......ایس۔ پی ۴/۱۱/۴۸

جناب ایس۔ پی صاحب!

میرے خیال میں دفعات فوجداری میں سے کوئی دفعہ ان گداگروں پر نہیں لگ سکتی۔ لیکن ان کے اخراج کے لئے عدالتی کارروائی ضرور کی جا سکتی ہے۔ اس غرض کے لئے سول کورٹ میں خاص محال افسر کو مقدمہ دائر کرنا پڑے گا۔ خاص محال افسران گداگروں کو انخلا کا نوٹس بھی دے سکتے ہیں۔ اگر باوجود تنبیہ کرنے کے وہ خارج نہ ہوں تو قبضۂ مخالفانہ کے سلسلے میں زیر دفعہ ۴۴۷ تعزیرات ہند اُن کا چالان بھی کیا جا سکتا ہے۔

فدوی حضور کا فرماں بردار خادم، ......انسپکٹر چالان ۶/۱۱/۴۸

"شیطان کی آنت کا قرا قرتو دیکھنے کی چیز ہے" ڈاکٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"دیکھا یاروں نے؟ یہ تھا آغاز۔ پھر تو پیچھے دار چلی" پولیس افسر نے سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے کہا۔ "ایس۔ پی نے کلکٹر کو بتاریخ ۱۸۔ نومبر ایک خط لکھ مارا۔ اس میں مسئلۂ گداگراں و جذامیان سے سیر حاصل بحث کی اور صاحب کلکٹر کو توجہ دلائی کہ خاص محال کے افسران کو تاکید کی جائے کہ ان روگیوں کے اخراج کے لئے جلد از جلد قانونی چارہ جوئی ہو۔ تاکہ صحت عامہ کو نقصان نہ پہنچے۔ ۲۔ دسمبر کو خاص محال افسر نے جواب دیا کہ صاحب کلکٹر فرماتے ہیں کہ مذکورہ اُفتادہ زمینیں پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے ماتحت ہیں۔

اور جب تک اُن زمینوں کے گرد چہار دیواری نہ قائم کی جائے، جذامی گداگروں کے خلاف شاید کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔ خاص محال سے اُن زمینوں کو کوئی واسطہ نہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ مذکورہ حلقہ کوڑھی گداگروں سے پاک ہو جائے تو صاحب کلکٹر کا یہ مشورہ ہے کہ پولیس کے کارندے اُنھیں وہاں سے نکال باہر کریں"۔

"ارے بھائی، یہ تو انوکھی کارروائی ہے!" پر افسر نے کہا۔

پولیس افسر نے ایک پگ اور لیا۔ پھر مراسلات کا سلسلہ جوڑنے لگا۔ وہ کبھی مراسلات پڑھ کر سنا دیتا اور کبھی اُن کا خلاصہ پیش کرتا۔

"اب ایس۔ پی نے انتظامات کے انجینئر کے نام ۱۶۔ دسمبر کو خط لکھا کہ گرجا، کلب اور کچہری کے درمیان کی اُفتادہ زمینیں چونکہ پبلک ورکس محکمہ کے تحت ہیں۔ لہٰذا میں استدعا کرتا ہوں کہ کوڑھی گداگروں کے اخراج کے لئے ضروری کارروائی کریں۔ اس مسئلہ کی اہمیت کے متعلق بھی ایس۔ پی نے کاغذ سیاہ کئے"۔ ———

——— "اور اب جواب سنئیے۔ سپرنٹنڈنگ انجینئر نے ۱/۴۹ لکھا کہ مذکورہ زمینوں کا ایک بڑا حصہ سٹی میونسپلٹی کے تحت ہے، اور کچھ حصہ خاص محال اور پبلک ڈیپارٹمنٹ کے تحت۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا محکمہ اپنے طور پر کارروائی کرے گا۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی پولیس کی مدد کی ضرورت ہوگی۔ اُمید کی جاتی ہے پولیس اس سے دریغ نہ کرے گی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ بلدہ سے بھی خط و کتابت کریں"۔ ———

"ایس۔ پی نے بلدہ کے چیرمین کو بھی گداگروں کے اخراج کے مسئلہ کے متعلق تفصیلی خط لکھا۔ ۲/۴۹ ۲۰ کو جواب آیا کہ بیمار اور اپاہج گداگروں کا اخراج کامیابی کے ساتھ اُس وقت تک عمل میں نہیں آسکتا جب تک کہ اُن کے لئے کوئی پناہ گاہ نہ تعمیر کرادی جائے۔ لہٰذا میں یہ مشورہ دینے کی جرأت کرتا ہوں کہ آپ حکومت سے یہ استدعا کریں کہ جذامی اور گداگروں کے لئے ایک آسائلم قائم کیا جائے"۔

"یہ رپورتاژ کے لئے دلچسپ مواد مہیا کرنے والے واقعات ہیں" صحافی نے اپنی کرسی پولیس افسر کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا" پولیس افسر نے جواب دیا۔

"اچھا بھئی! پھر آگے کیا ہوا؟" پر افسر بولا۔

"ہوا یہ کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پئے بہ پئے مختلف افسری سمتوں

... ان مراسلات ... سکے۔ ایگزیکٹیو انجینئر اور ڈی۔ آئی۔ جی پولیس کے پاس ... ممبر ... کی کارروائی کے لئے معروضات پیش کی گئیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے جواب دیا ... آئی۔ جی۔ پولیس کے پاس مراسلہ بھیج دیا گیا ہے۔ اور ایگزیکٹیو انجینئر نے لکھا کہ ... منظور ہونے اور اس کی تعمیر کے لئے ... پیش ... حالانکہ جذامی گداگروں کے اخراج کا معاملہ فوری ... ہے۔ کیونکہ صحت عامہ کو خطرہ لاحق ہے۔ ان حالات کے پیش نظر ... آپ خود ہی سخت کارروائی کیجئے۔ اور پی۔ ڈبلیو۔ ڈی ... سے جیسے جلتے اور چلتے پھرتے خطروں کو دفع کیجئے۔"

... جناب سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب کو نئے سرے سے جوش آگیا ... انہوں نے انسپکٹر صدر اور کوتوالی دونوں کے نام حکم نامے روانہ کئے۔

انسپکٹر!

گرجا، کلب اور کچہری کے درمیان کی زمینوں سے روگی اور اپاہج گداگروں کو ... کے لئے سخت اور مؤثر کارروائی فوری طور پر کی جائے۔

ایس۔ پی ۱ ۵/۴۹

سب انسپکٹر!

ایک حوالدار اور چند کانسٹیبلوں کو جلد مذکورہ بالا کام پر لگایا جائے۔

انسپکٹر ۴ ۵/۴۹

ہیڈ حوالدار کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ فوری کارروائی کرے۔

سب انسپکٹر ۵ ۵/۴۹

پولیس افسر نے بتایا کہ پھر تو کوڑھیوں اور اپاہجوں پر جو طرفہ یلغار ہوئی ... برتن باسن پھوڑے اور اُن کے گودڑ بکھیرے گئے۔ اُن کے ... بالکل اُجاڑ کر انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔ وہ اچانک حملے سے گھبرا کر ... نکل گئے۔

"... یوں ختم ہوتا ہے" پولیس افسر نے مراسلات سناتے ہوئے کہا ______

سب انسپکٹر کوتوالی:

تم ... کے تخلیے کے بعد اُس طرف گئے ہو؟ ذرا اچانک اِس طرف جاؤ ... جذامی گداگر مستقلاً ہٹے یا پھر آن بسے۔ جلد رپورٹ کرو۔

ایس۔ پی ۱۸ ۵/۴۹

جناب والا!

میں اُس طرف گیا تھا۔ اب تک تو جذامی گداگر واپس نہیں آنے پائے۔

حضور کا خادم، سب انسپکٹر کوتوالی ۳۰ ۵/۴۹

ایک اور دَور شراب چل گیا۔ ڈاکٹر، پروفیسر، صحافی اور پولیس افسر "تازہ دَم ہو کر شیطان کی آنت کے دوسرے مرحلے میں داخل ہوئے۔

فائیل نے بتایا کہ گذشتہ واقعات کے دو سال بعد ایک شام کو اسی کلب میں سول سرجن مسٹر .... بیرسٹر اور چند اور چوٹی کے لوگ جمع تھے۔ جذامی گداگروں کا مسئلہ زیر بحث آگیا۔ کیونکہ اس مسئلے نے ایک تازہ شکل اختیار کر لی تھی۔ کوڑھیوں، اپاہجوں، کوڑھی گداگروں کی آبادی میں بڑی سرعت سے اضافہ ہو گیا تھا۔ صوبے کے مختلف دیہاتی علاقوں سے بھانت بھانت کے گداگر دارالسلطنت میں جمع ہو رہے تھے۔ یہاں بھیک ملنے کے امکانات زیادہ تھے۔ گرجا، کلب اور کچہری کا مثلث خاصا آباد تھا۔ گداگروں میں کوڑھ اور دوسری بیماریاں تیزی سے پھیل کر اُن کے بھیک مانگنے کی اشتہاری قیمت یعنی دُنیا اور دھرمی شہریوں کی نظر کرم کو کھینچنے کی صلاحیت میں روز بروز اضافہ کر رہی تھیں۔ اِن جذامیوں کی یورش جو بڑھی تو ۱۹۴۸ء کی برسات میں انہوں نے سول سرجن اور مسٹر ...... بیرسٹر کی کوٹھیوں کے احاطے پر راتوں کو یلغار شروع کر دی۔ یہی نیا مسئلہ کلب میں زیر بحث آیا۔ ایک اور معزز افسر نے یہ اطلاع دی کہ گرجا کے بڑے پادری صاحب بھی احتجاج کر رہے تھے کہ ہدایت وار یہ روگی بھکمنگے گرجا کے پھاٹک کے دو رویہ بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں تاکہ ایمانداروں سے خیرات وصولیں، اور انھیں دعا وشکریہ کے طور پر مختلف عوارض کے تحفے پیش کریں۔ آخرش کلب میں یہ طے پایا کہ ارباب اختیار کو اس طرف پُرزور انداز میں توجہ دلائی جائے۔ مراسلات کا تازہ سلسلہ شروع ہوا۔

ضلع سول سرجن کیپٹن اینڈرسن کے خط مورخہ ۲۰ ۴/۴۹ کا خلاصہ جو اُنھوں نے انسپکٹر جنرل پولیس کو لکھا حسب ذیل ہے۔

"جذامی گداگر کلب اور گرجا کے درمیانی میدان سے رینگتے ہوئے اکثر رات کو میری کوٹھی کے احاطے میں آ داخل ہوتے ہیں۔ اُن کا نکالنا میرے لئے بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ طبی اصول کے لحاظ سے جذام چھوت کی پھیلنے والی بیماری ہے۔ ان کے مستقلاً اخراج کے لئے پُر اثر کارروائی کی ضرورت ہے ......"

مسٹر...... بیرسٹر نے مختلف اربابِ اختیار کو تباریخ ۲۸ اسی مسئلہ سے متعلق خطوط تحریر کئے۔ شہر کی میونسپلٹی کے چیرمین اور ہیلتھ افسر کے خطوط میں ایک پُرزور بات اُنھوں نے یہ لکھی کہ۔

"جب تک بلدیہ اور بلدیہ کے افسرِ صحت کی آنکھیں کوڑھیوں کے خطرے کی طرف سے بند رہیں گی اور اُن کے ہاتھ مفلوج رہیں گے، میں میونسپلٹی کا ٹیکس ہرگز ادا نہ کروں گا۔ تاکہ اس شرمناک صورتِ حال کی خوب خوب تشہیر ہو۔"

محکمۂ انسدادِ سل و جذام کے افسرِ اعلیٰ اور کلب کے سکریٹری نے بھی انسپکٹر جنرل پولیس اور کلکٹر ضلع کو جذامیوں کے مسئلہ کی طرف توجہ دلائی۔ غرض ایک تہلکہ مچ گیا۔ آسمان سے زمین تک وسیع اختیار و اسباب کی کڑیاں ہلیں۔ انسپکٹر جنرل نے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو لکھا۔ ڈپٹی آئی۔ جی نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو۔ ایس۔ پی نے ڈی۔ ایس۔ پی کو۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے انسپکٹر پولیس کو اور انسپکٹر پولیس نے سب انسپکٹر کو۔ اسی طرح صاحب کلکٹر نے خاص محال افسر کو اس نازک مسئلہ کی طرف توجہ دلائی۔ اور انھوں نے ایس۔ پی کو لکھا اور ہر طرف کی بوچھار پولیس کے سب انسپکٹر پر پڑ گئی۔ داروغہ کا غصّہ کوڑھیوں پر اُترا۔ لیکن حسبِ دلخواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ آخرش داروغہ نے ایس۔ پی کے پاس رپورٹ پیش کی۔

حضورِ عالی!

میں نے کئی بار اُن تمام علاقوں کے دورے کئے۔ جہاں جہاں جذامی یا اپاہج گداگر ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ اُن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) آنشا گھاٹ نزد کلب۔

(۲) گرجا گھر سے اُتر خاص محال کی زمینوں میں۔

(۳) گرجا اور کالج کے درمیانی نالے کے کنارے۔ کل تعداد ۶۹ بشمول زنان و بچگان۔

ان کے علاوہ کچہری، لاؤن اور گول گھر کے درمیانی علاقے میں اِکّا دُکّا گداگر غیر مستقل طور پر رہائش رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا گداگر زیادہ تر دریا پار کے علاقوں کے ہیں۔ اور ویسے تو سارے صوبہ کے گداگر یہاں جمع ہیں۔ ان میں سے بعض سال کے اندر ایک دو مہینوں کے لئے اپنے عزیزوں سے ملنے وطن بھی جاتے ہیں۔ وہ دن بھر بھیک مانگتے اور رین بسیرے کے لئے اپنے اپنے پڑاؤ پر آ جاتے ہیں۔

کسی اسائلم یا دار العجزہ کی عدم موجودگی میں اس سے بہتر اور کوئی جائے قیام اُن کے تصور میں نہیں لائی جا سکتی۔ جو فی الحال اُن کے تصرف میں ہے۔ اگر ان جذامی گداگروں کو پورب جانب بھگایا جاتا ہے تو وہ ہمارے شہر کی فضا کو مسموم کرتے ہیں۔ اور اگر انھیں پچھم کی طرف دفع کیا جاتا ہے تو وہ حکومت کے دفاتر اور گورنمنٹ ہاؤس کی سمت جا نکلتے ہیں۔ ان کا اخراج ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ اس سے پہلے بھی انھیں گرجا، کلب اور کچہری کے درمیانی علاقے سے نکالنے کی سعی لاحاصل کی گئی ہے۔ وہ جن بھوت کی طرح کچھ دنوں کے لئے تو غائب ہو جاتے ہیں۔ مگر پھر تھوڑے عرصہ بعد وہ پھر واپس آکر پڑا جما لیتے ہیں۔

ابھی حضور والا کے تازہ حکم ملنے پر کوڑھی اور اپاہج گداگروں کے اخراج کی نئے سرے سے کوششیں کی گئیں۔ وہ اپنا جھول جھولی لے کر دفع ہو جاتے اور پھر واپس آ جاتے ہیں۔ بعض بدذات فقیر تو سیدھے سے بیٹھتے ہی نہیں، اور یہ دھمکی الگ کہ جو چھیڑا تو اپنے بچے کو [illegible] زمین پر دے ماروں گی۔

میں اس پریشان کن معاملے میں حضورِ عالی کی مزید [illegible] رہنمائی کا منتظر ہوں۔

حضور کا اطاعت شعار خادم۔ سب انسپکٹر [illegible] ۱۷

اب زمین سے آسمان کی طرف مراسلات کا سلسلہ چلا۔ ایس۔ پی کے پاس صدر بلدیہ نے اس امر سے متعلق اپنے دو سالوں کے [illegible] کا حوالہ دیتے ہوئے ردِ بلا کے طور پر ایک اور مراسلہ تحریر کیا اور اس کی نقل رفعِ شر کے لئے مسٹر... بیرسٹر کے پاس بھی بھجوا دی۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایس۔ پی نے افسرانِ بالا کے پاس کوڑھیوں کے لئے اسائلم یا کم از کم [illegible] کی تعمیر کے لئے پُرزور طور پر سفارش کی۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور کلکٹر ضلع کے توجہ دلانے سے کمشنر صاحب بھی حالات سے متاثر ہوئے اور دونوں نے حکومت کے مشیرِ اعلیٰ کے پاس جذامی گداگروں کے لئے اسائلم کی تعمیر کی تجویز پیش کی۔ اُن دنوں وزارتیں مستعفی ہو چکی تھیں۔ گورنر صاحب مشیروں کی مدد سے صوبے کا نظم و نسق فرما رہے تھے۔ اسائلم کی تجویز فرش سے عرش کی طرف پرواز کر چکی تھی۔ بہت جلد فیصلہ ہو گیا کہ سالِ رواں کے بجٹ میں اس کی گنجائش نہیں اور سپلیمنٹری بجٹ میں بھی کوئی صورت پیدا ہونے کی اُمید نہیں۔

"۔۔۔ عرش سے گر کر جذامی گداگروں کی فائل تحت الثریٰ میں جا کر سو گئی۔"

پولیس افسر نے کہا۔ ڈاکٹر، صحافی اور پر افسر نے خمار آلود جماہیاں اور انگڑائیاں لیں۔

"بھئی آواگون کا چکّر جلد ختم نہیں ہوتا۔ تاہم تناسخ کی تیسری گردش میں ہمارا قصّہ ختم ہو جاتا ہے۔" پولیس افسر نے کہا اور مراسلات کے پھیرے شروع ہوئے۔

۱۹۴۳ء میں خود حکومت کے مشیر اعلیٰ کو تین بلاؤں نے آگھیرا۔ انھوں نے ایس۔ پی کو ایک نوٹ لکھا۔

"ایس۔ پی!

شہر کے لاؤڈ اسپیکروں، کانگریس والوں کی پربھات پھیریوں اور آوارہ جذامی گداگروں نے میری رات کی نیند حرام کر رکھی ہیں۔ اوّل الذکر دو کا انتظام تو کسی حد تک ہوا بھی ہے۔ مگر کل کلب کے سامنے میری موٹر رکی تو ایک کوڑھی فقیر نے ٹائر کو چھو چھو کر مجھے سلام کیا اور بھیک کے لئے ہاتھ پھیلا دیا۔ اوّل تو یہ انتہائی شوخی ہے۔ حکومت کا رعب گھٹتا جاتا ہے جس کی ذمہ داری بہت حد تک پولیس پر ہے۔ دوئم یہ کہ میں اس گاڑی سے کوڑھ کی چھوت کے ڈر کے مارے سخت منتشر ہو رہا ہوں۔ کیا تم آئندہ کے لئے اس عظیم خطرے کا تدارک کر سکتے ہو؟"

اس نوٹ سے آپ کے ہندوستانی ایس۔ پی کے پیٹ میں گھوڑے دوڑنے لگے۔ اس نے فوراً گداگروں کے اخراج کے سخت احکام صادر کئے اور اپنا ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے حکومت کے پبلک پروسیکیوٹر سے قانونی مشورہ بھی طلب کیا۔ جواب حسبِ ذیل آیا۔

گداگروں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کچہری کی عمارت میں رات کو قیام کیا کریں۔ انھیں بالجبر وہاں سے مناسب طور پر خارج کیا جا سکتا ہے لیکن گرجا اور کلب کے درمیانی علاقے سے یا پیڑوں کے نیچے سے انھیں نکالنے کا کوئی قانونی حیلہ نظر نہیں آتا۔ اس معاملے میں نہ تو بلدیہ کا کوئی ذیلی دفعۂ قانون ہے اور نہ موجودہ قوانین ہند میں سے کوئی قانون ہی ان کے اخراج بالجبر یا ان پر مقدمہ چلانے کو صحیح قرار دیتا ہے۔

لہٰذا صرف ایک راہ کھلی رہ جاتی ہے یعنی گداگروں کو سمجھا بجھا کر یا خوف دلا کر پولیس کی مدد سے مذکورہ علاقوں سے نکلوانا۔"

ہندی۔ ایس۔ پی اس قانونی مشورہ سے بہت ہی چراغ پا ہوا۔ پھر اس نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو خط لکھا کہ جذامی گداگروں کے مقیّد کرنے کا جیل میں کوئی انتظام ہو سکتا ہے یا نہیں، جواب مایوس کن تھا۔ اس مایوسی نے اسے اور برہم کر دیا۔ حکومت کے مشیر اعلیٰ کا خط آکاش بانی کی طرح ہر آن اس کے ذہن و روح پر طاری تھا۔ وہ بنفسِ نفیس کوتوالی پہنچا۔ تھانیدار۔ جمعدار۔ حوالدار اور سارے سپاہیوں کو سخت ڈانٹ بتائی اور قطعی حکم نافذ کیا کہ گرجا کلب اور کچہری کے علاقے سے ایک ایک گداگر جس طرح سے بھی ہو خارج کر کے مستقلاً وہاں پہرہ بٹھا دیا جائے۔

بس اب کیا تھا، حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ ڈی۔ ڈے آگیا۔ محاذ کھل گیا۔ ادھر شام ہی سے جذامی اور اپاہج گداگروں پر حملہ شروع ہوا۔ ڈی ایس۔ پی انسپکٹر داروغہ۔ جمعدار۔ حوالدار اور سپاہیوں کے ایک مضبوط دستے نے گرجا، کلب اور کچہری کے مثلث پر چڑھائی کی۔ موٹر سائیکلیں دوڑنے لگیں۔ بڑی دوا دوش اور شورا شوری تھی۔ مسٹر..... بیرسٹر گرجا کے بڑے پادری اور کلب کے سکریٹری بھی اپنے اپنے پھاٹکوں پر نکل آئے۔ کچھ اور تماشبین بھی جمع ہو گئے۔ سپاہیوں نے بلٹز کیا۔ پہلے ہی طوفانی حملے میں مٹّی کے برتن بھانڈے پھوٹے۔ ٹین کے زنگ آلود ڈبّے لڑھکے۔ گودڑ پھٹے۔ چیتھڑے ریزہ ریزہ ہوئے۔ بیساکھیاں ٹکڑے ٹکڑے ہوئیں اور سارے گداگر مخوف ہو گئے۔ شکست و ریخت کے لئے جب کچھ نہ رہا تو ذرا سکون ہوا۔ پھر فقیرنیں رونے لگیں۔ گداگر بچّے بلبلانے اور چیخنے لگے۔ اور مرد سسکنے اور واویلا مچانے لگے۔ داروغہ آگے بڑھا اور اس نے انھیں سمجھایا بجھایا اور یہ حکم دیا کہ وہ شہر سے باہر جا کر رہیں ورنہ انھیں جیل میں بند کر دیا جائے گا۔ گداگروں کا ایک وفد آگے بڑھا اور اس نے عذر پیش کیا کہ وہ مائی باپ کے سایۂ لطف و کرم میں یہیں پڑے رہنا چاہتے ہیں۔ شہر سے باہر رہ کر وہ لنگڑے لولے اتنی دور بھیک مانگنے کیسے آ سکتے ہیں۔

..... چند نے دور سے ہی بے بسی کے انداز میں تکتے ہوئے کہا کہ اب تو ان کی بیساکھیاں بھی توڑ دی گئیں۔ وہ تو ہل بھی نہیں سکتے۔ کیسے جائیں، اور کہاں جائیں۔ اتنے میں ایس۔ پی اپنی کار پر آ نکلا۔ اس نے آتے ہی گرج کر حملے کا حکم دیا۔ تابڑ توڑ یلغار شروع ہوئی۔ اب کے کوڑھی گداگروں نے ستیہ گرہ کر دی۔ پولیس کی لاٹھیوں کی بوچھاریں وہ کرتے بھی تو کیا کرتے۔ ان کے روگی جسم مار کھا کھا کے حرکت کے قابل ہی نہ رہے۔ سبھی لڑھک گئے۔ کوئی اوندھا گرا، کوئی سیدھا۔ کلب۔ گرجا اور کچہری کا مثلث

اُفتادہ جذامی گداگروں سے پٹ گیا۔ اب اُنھیں اُٹھاتا کون۔ سپاہی اپنے ڈنڈوں سے تو اُنھیں مار سکتے تھے۔ مگر اُنھیں چھونا ناممکن تھا۔ ایس۔ پی کی گرج بیکار رہتی۔ کوئی کوڑھیوں کو پکڑ دھکڑ کر خارج کرنے کے لئے طیّار نہ ہوا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ اور ایس۔ پی برافروختہ ہو کر چل دیا۔ ہر طرف سنّاٹا چھا گیا۔ مسٹر۔۔۔۔ بیرسٹر اپنی کوٹھی میں واپس جا کر مقدموں کی فائلوں میں غوطے لگانے لگے۔ کلب کا سکرٹری شراب کی بوتلوں میں جا ڈوبا۔ اور گرجا کا بڑا پادری تسبیح و چلیپا ہلاتا آسمان کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا گرجا کے مقدّس و محفوظ گوشوں میں روپوش ہو گیا۔ حملہ آور شام کے دھندلکوں میں لپسپا ہو گئے۔ اور رات بھر گرجا، کلب اور کچہری کے درمیان کہرام مچتا رہا۔

"کیا نجات مل ہے واللہ!" پولیس افسر نے کرسی پر استراحت کی انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"کیا بات بنی ہے!" صحافی بول اُٹھا۔ ڈاکٹر زیادہ پی کر غلطاں تھا۔

"بڑا خیال انگیز قصّہ ہے" پرافسر نے سوچ کر کہا۔

رات گئے چاروں یار کلب سے واپس ہوئے۔ اُن کے دلوں میں کہانی کی گدگدی تھی، اور ایک مجہول سی خلش۔ صبح کو قصّہ معدوم تھا اور نشہ ہرن۔

کاجو کے درخت سے روٹری پریس اِنک

بھارت میں اخباری روشنائی کی صنعت

بھارت میں سب سے پہلا اخبار آج سے ۱۷۰ سال پہلے ۱۷۸۰ء میں "بنگال گزٹ" کے نام سے شروع ہوا۔ اس اخبار اور آج کے اخبار میں بہت فرق ہے۔ لیکن ۱۷۰ سال کے اس طویل عرصے میں اخباروں کے لئے اچھی قسم کی روشنائی کے پانچ ہزار سے زیادہ اخبارات اور رسالوں کے لئے ہم امریکہ سے تیس لاکھ روپے سالانہ کی بیس لاکھ پونڈ روشنائی منگواتے ہیں۔ لہٰذا اگر ایسی اچھی قسم کی روشنائی ملک میں بننے لگے تو نہ صرف ملک کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوگی بلکہ غیر ملکی زر کی بھی بچت ہوگی۔

سائنس اور صنعتی کھوج کی بھارت کونسل کے زیر اہتمام سائنس کے مختلف شعبوں میں گہری تحقیقات ہو رہی ہیں۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ تحقیق کے نتائج کو کام میں لایا جائے۔ اس سلسلہ میں پہلا تجربہ طباعت کی روشنائی بالخصوص اخباری روشنائی کے لئے کیا گیا ہے۔ یہ روشنائی ملکی خام مال سے تیار کی گئی ہے۔ اس پر پچھلے تقریباً تین سال سے تحقیق کی جا رہی ہے اور اب نئی دہلی کی نیشنل فزیکل لیبارٹری میں اخبارات، ٹھپّے بنانے اور مہریں لگانے کے لئے اچھی قسم کی روشنائی تیار کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ ملک میں جلد ہی روشنائی کی صنعت ترقی پائے گی۔

یہ روشنائی کاجو کے خول کے سیّال اور متعلقہ رالوں سے تیار کی جاتی ہے اور خوش قسمتی سے ملک ان خام اشیا کا قریب قریب اجارہ دار ہے۔ یہ سیال زیادہ تر بنگلور اور اس کے گرد و نواح سے ملتا ہے۔ بھارت اور برطانیہ کے پیٹنٹس میں اس سیال کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ اب تک جس خام مال سے یہ روشنائی تیار کی گئی ہے اُس میں سے ۹۰ فی صدی اشیا دیسی ہیں، اور باقی دس فی صدی بدیس سے منگوائی جاتی ہیں۔ ان کے لئے ملکی بدل معلوم کرنے کے تجربے جاری ہیں۔ اُتری بھارت کے بہت سے انگریزی اور بھارتی زبانوں میں چھپنے والے اخباروں نے ملکی روشنائی کو استعمال کیا اور اُسے تسلی بخش پایا ہے۔

مئی ۱۹۴۸ء سے سائنسی اور زرعی کھوج کی بھارتی کونسل کے زیر اہتمام ملکی مال سے ٹکٹ تنسیخ کرنے والی اور دیگر اغراض کی روشنائیاں تیار کرنے کے تجربے ہو رہے ہیں۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں ڈاک و تار کے محکمے کو یوم آزادی، اور گاندھی میموریل کے ٹکٹ تنسیخ کرنے کے لئے جو روشنائی دی گئی وہ بلحاظ قیمت قسم اور کام کے ایسی غیر ملکی روشنائی سے کمتر ثابت نہیں ہوئی۔

سری رام سرنا

مصر کی کپاس

بساط عالم میں مصر کی شہرت کا ایک باعث تو ہیں دَورِ فراعنہ کے اہرام۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین اور تاریخ والوں کی نظروں میں یہ اہرام گنجینۂ بے بہا ہیں۔ تاریخ کے لحاظ سے شہرت کا ایک اور باعث یہ بھی ہے کہ وہ نیل کی بیٹی اور رومان کی رانی کلوپیٹرا کا دیش ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے مصر کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ وہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کو ملانے والی شاہراہوں پر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ وہ بین الاقوامی آب رو نہر سویز کا مالک ہے۔ سیاست کی نظروں میں مصر کی اہمیت اس بات پر مرکوز ہے کہ وہ وسط مشرق کے خطّہ میں اور اسلامی ممالک میں بھی سب سے نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے کسی بھی ملک کو ممتاز حیثیت دلانے کے لئے یہ امور کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن دورِ جدید میں مصر کی ایک اور اہمیت بھی ہے، جسے اقتصادیات سے سروکار ہے، اور وہ مصر کی شہرۂ آفاق کپاس سے تعلق رکھتی ہے۔

سرکاری شماروں کے مطابق مصر کا کل رقبہ ۲۵۰،۰۰۰ ہزار ایکڑ ہے۔ جس میں سے جنگلوں، چراگاہوں اور بنجر علاقوں کو چھوڑ کر قابل کاشت رقبہ ۶۱۱۳ ہزار ایکڑ ہے۔ اس میں سے گیہوں کے زیر کاشت رقبہ ۱۵۹۳ ہزار ایکڑ۔ چاول کے زیر کاشت رقبہ ۸۲۵ ہزار ایکڑ اور کپاس کے زیر کاشت رقبہ ۱۵۱۵ ہزار ایکڑ ہے۔

۱۹۴۹ء میں کپاس کی کل پیداوار ۳۶۹ ہزار ٹن ہوئی تھی جبکہ روس کو چھوڑ کر دنیا بھر میں کپاس کی کل پیداوار ۶۱۸۰ ہزار ٹن ہوئی تھی۔ اس حساب سے مصر میں کپاس کی پیداوار عالمگیر پیداوار کا ۶ فی صدی حصہ ہے۔ لیکن اس کپاس کی شہرت کا باعث یہ ہے کہ کوالٹی کے لحاظ سے مصر کی کپاس دنیا بھر میں بہترین مانی جاتی ہے۔

مصر کی کپاس کی تاریخ بھی ایک دلچسپ موضوع ہے۔ مصر میں کپاس کی کاشت کب شروع ہوئی اس کے متعلق کوئی مصدق اور فیصلہ کن رائے نہیں دی جا سکتی۔ ہاں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مصر میں کپاس کی کاشت اٹھارھویں صدی کے آس پاس شروع ہوئی تھی۔ یہ زمانۂ قدیم کی میراث نہیں۔ اٹھارھویں صدی میں مصر جانے والے فرانسیسی لوگوں کے ریکارڈ بتاتے ہیں کہ اس زمانہ میں کپاس کی فصل وہاں باقاعدہ طور پر کی جاتی تھی۔ ان دستاویزوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں اُگائی جانے والی کپاس کی تین قسمیں تھیں۔ اوّل موسمی قسم کی کپاس جو دریائے نیل کے دہانے میں۔ بالخصوص سمانود اور محالہ ابوبکر کے مضافات میں ـــ بوئی جا رہی تھی۔ دوم ہر موسم میں پیدا ہونے والی کپاس، جو زیادہ تر شمالی مصر میں اُگائی جاتی تھی۔ اور سوم باغوں میں پیدا ہونے والی کپاس۔ بتایا جاتا ہے کہ جب فرانسیسی مصر سے واپس چلے گئے تو کپاس کی کاشت کم ہونے لگی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مصر میں کپاس کی کاشت بند ہو جانے یا متروک ہو جانے کا شدید خطرہ درپیش ہو گیا تھا۔

لیکن یہ نوبت نہ آسکی۔ کیونکہ والیٔ مصر محمد علی پاشا نے کپاس کے فائدہ بخش امکانات محسوس کرتے ہوئے اس طرف توجہ مبذول کی۔ مصر کو جدید روشوں پر چلانے میں محمد علی نے جو کاوشیں کیں وہ مصر اور مصر کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کاوشوں میں کپاس کی سرپرستی بھی شامل کی جا سکتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کپاس کی کاشت کو توسیع دینے اور کپاس کی فصل کو بہتر سے بہتر بنانے میں محمد علی نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ قدرت نے بھی محمد علی کا ساتھ دیا۔ خوش قسمتی سے بادشاہ کے ایک مشیر جمیل نے ایک دن سراسر اچانک کپاس کی ایک جھاڑی کو دیکھا۔ یہ جھاڑی مصر کے ایک سرکاری افسر بے العرفانی کے باغ میں لگی ہوئی تھی۔ عرفانی سوڈان کا گورنر رہ چکا تھا، اور سوڈان سے کپاس کی اس پود کو اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔

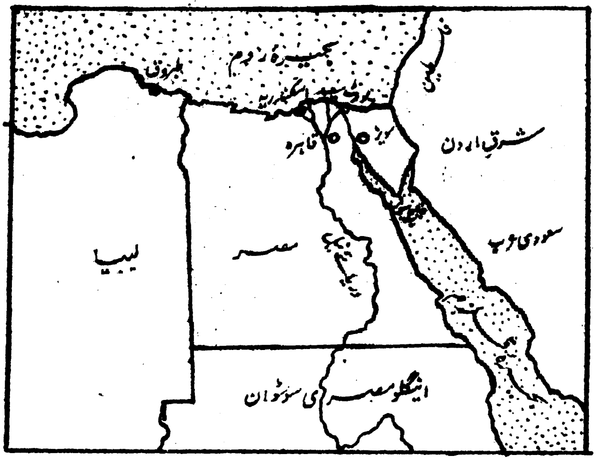

اس کپاس کے ریشوں کی لمبائی۔ صفائی۔ چمک اور رنگ کی سفیدی دیکھ کر جمیل مبہوت رہ گیا۔ جمیل کی وساطت سے محمد علی نے سنہ ۱۸۲۰ء میں اس کپاس کا ملاحظہ فرمایا۔ اس کپاس کے روشن مستقبل سے متاثر ہوکر بادشاہ نے حکم صادر فرمایا کہ اس کپاس کو بہت بڑے پیمانے پر اُگایا جائے۔ اس ہم کو فروغ دینے کے لئے جتنی بھی سہولیات دی جاسکتی ہیں دیں۔ والی مصر کی سرپرستی حاصل ہونے پر مصر میں کپاس کی فصل کیوں نہ فروغ پاتی؟ سرکاری ریکارڈوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جلدی کپاس کی فصل سرعت سے بڑھنی شروع ہوگئی، اور جلدہی دریائے نیل کے دہانے کے تمام علاقے میں رائج ہوگئی۔ بالآخر کپاس کا زیرِ کاشت رقبہ ۲ فیصدی سے بڑھ کر ۴۵ فیصدی ہوگیا۔

مصر کی کپاس عالمگیر مارکیٹ میں جن وجوہ سے کامیاب ہوسکی اُن کا مطالعہ بھی موجبِ دلچسپی ہوگا۔ ان وجوہ میں اولین درجہ تو محمد علی کی سرپرستی کو دیا جانا چاہیئے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ مصر کی زمین بھی کپاس کی کاشت کے لئے موزوں ثابت ہوئی۔ ایک اور وجہ یہ تھی کہ مصری کپاس کئی برتر صلاحیتوں کے باعث وہ غیر ممالک میں امریکہ اور ہندوستان کی کپاس کے مقابلے میں دل پسند ثابت ہوئی۔ کئی جگہ تو اس کپاس کو بلا شرکتِ غیرے ترجیح دی جانے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگلینڈ اور امریکہ کے سوتی کارخانوں میں اس مصری کپاس کی مانگ نمودار ہوئی اور بتدریج بڑھنے لگی۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ مصر کے لئے آمدنی کی ایک نئی راہ کھل گئی، اور دوسرا یہ کہ گیہوں کے زیرِ کاشت رقبہ میں نمایاں کمی ہوتی گئی۔ کیونکہ کاشتکاروں کو کپاس کی فصل سے زیادہ دام موصول ہورہے تھے۔ اور گیہوں کی فصل سے نسبتاً کم۔ آہستہ آہستہ کپاس ہی مصر کی خوش حالی کی شاہ رگ بن گئی۔ لیکن سب سے اہم وجہ جو مصری کپاس کی کامیابی میں ثابت ہوئی یہ تھی کہ مصر میں کپاس کی پیداوار بڑھانے کے ساتھ ساتھ کپاس کی نسلی ترقی پر بھی پورا پورا زور دیا گیا۔

اس مرحلہ پر مصر میں کپاس کی نسلی ترقی کے سبب پر روشنی ڈالنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ شاہ محمد علی اگر مصر میں کپاس کی کاشت کو ہی توسیع دینے پر زور دیتا رہتا تو وہ نہ تو مصر پر اور نہ مصر کی کپاس پر ہی کوئی دیرپا احسان کرتا۔ اور ہوسکتا ہے کہ مصر کی کپاس شاید

عالمگیر شہرت حاصل کرنے کے لائق بھی نہ ہو سکتی۔ لیکن محمد علی کی عظمت اسی سے عیاں ہوتی ہے کہ وہ یہیں پر رُک نہیں گیا، بلکہ اور بھی آگے بڑھا۔ اُس نے کپاس کی نسل میں سُدھار کرنے کے لئے باہر کے ملکوں سے بہترین اقسام کے بیج منگوائے۔ آغاز میں نانکن (چین) اور برازیل (جنوبی امریکہ) سے بیج منگوائے گئے۔ پھر سی۔ آئی لینڈ۔ اور نیو اورلینز (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) سے۔ اس کے علاوہ بہترین قسموں کی کپاس کی کاشت کو توسیع دینے۔ کاشتکاری کے طریقوں میں سدھار کرنے اور نئی نئی اختراعوں کو حاصل کرنے اور پھیلانے کے لئے بدیشی ملکوں سے کپاس کی کاشت کے ماہرین کو بھی مدعو کیا گیا۔

شروع شروع میں جمیل کی کپاس سے برازیل اور سی آئی لینڈ کی کپاس کے پیوند لگانے پر جو کپاس حاصل ہوئی اُسے دنیا بھر کی منڈیوں میں پسند کیا گیا۔ بدیشی ملکوں کے سوتی کارخانوں نے نئی کپاس کو نمایاں طور پر ترجیح دی اور اس کی مانگ بڑھا دی۔ ۱۸۶۰ء میں جمیل کی کپاس کی ایک نئی قسم اُشمونی حاصل ہوئی جس نے جمیل کی ابتدائی کپاس کو بھی پیچھے ڈال دیا۔ اشمونی آہستہ آہستہ سارے شمالی اور جنوبی مصر میں پھیل گئی۔

۱۸۸۲ء میں جنوبی مصر میں کپاس کی ایک سراسر نئی قسم متافیفی حاصل ہوئی جس نے اشمونی کی جگہ لے لی۔ اور قلیل وقفہ میں سارے جنوبی مصر میں مقبول ہو گئی۔ اس کپاس کا ریشہ ۳۳ سے ۳۵ ملی میٹر تک لمبا تھا۔ اس کے علاوہ پائیداری۔ چمک اور صفائی میں بھی یہ کپاس کی باقی سب قسموں سے بدرجہا بڑھ کر تھی۔ ان صلاحیتوں کے باعث متافیفی کپاس کی قدر اتنی بڑھی کہ بدیشی ملکوں میں مصر کی کپاس پہلے سے کہیں زیادہ قیمت پر بکنے لگی۔ شمالی مصر میں اسمونی کپاس کا اقتدار ۱۹۱۷ء تک بنا رہا۔ پھر اس کی جگہ زگورہ کپاس نے لے لی۔ یہاں تک کہ کچھ ہی عرصے کے بعد سارے علاقے میں زگورہ ہی زگورہ دکھائی دیتی تھی۔ یہ کپاس نوجیدہ اشمونی کی پیش رو کہی جا سکتی ہے۔ اُدھر جنوبی مصر میں متافیفی کپاس سے ۱۹۰۵ء میں نوباری کپاس تیار کی گئی۔ اس کا ریشہ ۳۴ ملی میٹر لمبا تھا۔ دریں اثنا ایک اور نہایت مقبول قسم قالینی تھی، جو سی۔ آئی لینڈ سے منگائی گئی کپاس کی ایک ہی پود تھی۔ کپاس کی ایک اور قسم بامیا تھی، جو بہت کم تعداد میں بوئی جاتی تھی۔ لیکن نسلی لحاظ سے بہت اعلیٰ شمار کی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ امیلی اور رلعنڈہ اقسام بھی کپاس کی اعلیٰ پودوں میں شامل کی جاتی تھیں۔ کپاس کی ان سب قسموں کو بھورے رنگ کی کپاس کے خاندان میں رکھا جاتا تھا۔ کئی وجوہ کے باعث آہستہ آہستہ کپاس کی ان قسموں میں مزید سُدھار اور توسیع بند ہو گئی۔ بلکہ تنزل شروع ہو گیا۔

سفید رنگ کپاس کی مختلف اقسام شاید ظلفری کپاس سے ہی حاصل کی گئی تھیں ظلفری کو قالینی کپاس سے چھانٹنے کے بعد حاصل کیا گیا تھا۔ اس خاندان میں عباسی۔ یتھیوڈوری۔ کسولی۔ فاتحی اور چند دیگر پودیں بہت مقبول ہوئیں۔ ایک اور قسم تھی یانووچ۔ اس کا ریشہ ۳۵ ملی میٹر لمبا تھا۔ اور رنگ بالائی سے مشابہت کھاتا تھا۔ یہ کپاس ۱۸۹۲ء میں قالینی کپاس سے چھانٹنے کے بعد حاصل کی گئی تھی۔ کچھ عرصہ تک یہ مصر کی سب سے عمدہ کپاس مانی جاتی تھی۔ پھر اسے ساکل نے ماند کر دیا۔ ساکل کی دریافت بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں ایک یونانی بنام ساکلاراڈیس نے یانووچ کپاس کے ایک کھیت میں اچانک کپاس کی ایک نئی اور قدرتی پود دیکھی۔ اس نے اس کپاس کا نام اپنے نام پر منسوب کیا۔ اور اس کی فصل کو توسیع دینے کے لئے اپنے تمام وسائل وقف کر دئے۔ اس کی راہ میں بدیشی ملکوں کے سوتی کارخانوں نے بہت رکاوٹیں ڈالیں۔ لیکن اُن کو ناکام ہونا پڑا۔ کیونکہ ساکل کپاس کی خوبیاں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ آخر کار وہ کامیاب ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بڑھیا اور قیمتی کپڑوں کو بنانے کے لئے ساکل کا استعمال لازم بھی ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے زمانہ میں ساکل کی کوالٹی کا مقابلہ کرنے والی اور کوئی کپاس دنیا بھر میں ملنی مشکل تھی۔ ایک اندازہ کے مطابق مصر کو اس کپاس کی فصل سے اندازاً ۱۵۰۰ کروڑ پونڈ منافع ہوا۔ کئی اور اندازے تو اس رقم سے بھی تجاوز کرتے ہیں۔ اس کپاس کی مقبولیت نے ہی مصر میں بھورے رنگ کی کپاس کی جگہ سفید رنگ کی کپاس کی کاشت کو مقبول کیا۔ جنوبی مصر میں تو اس کی کاشت ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک پھیل گئی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں ساکل کپاس کے زیر کاشت رقبہ ۱۱۹،۶۳۶ فدان (ایک مصری پیمائش) تھا۔ لیکن گیارہ سال بعد ۱۹۲۲ء میں یہ رقبہ بڑھ کر ۱،۳۵۸،۱۶۵ فدان ہو گیا۔ پھر کئی وجوہ سے ساکل کا تنزل شروع ہوا۔ آخر کار ۱۹۳۳ء میں رقبہ کم ہوتے ہوئے قریب

۴۳۷۰۰ قنطار رہ گیا، اور بعد میں اس کی کاشت خود بخود ختم ہوگئی۔

کپاس کی نسلی ترقی کے لئے مصر کے محکمۂ زراعت کی کارگزاری قابلِ تحسین ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آغاز میں مصر کو وقتاً فوقتاً کپاس کی اعلیٰ اقسام قدرت کی مہربانی سے ملتی رہیں۔ کسی کی تحقیقات یا محنت سے نہیں۔ لیکن ۱۹۰۰ء کے بعد دورِ جدید میں کپاس کی نسلی ترقی، سائنس کی تحقیقات کی بدولت ہی ہوئی۔ اور سائنس کی تحقیقات مصر کے محکمۂ زراعت کی ہی ذمہ داری اور سرپرستی میں ہوئی۔ ۱۹۰۰ء میں متافیفی کپاس سے نوباری کپاس تیار کی گئی۔ اس کا ریشہ ۳۴ ملی میٹر لمبا تھا۔ بعد ازاں ۱۹۰۶ء میں اصیلی کپاس تیار کی گئی۔ اصیلی کپاس سے ایک اور قسم نکالی گئی۔ جسے لعذہ کہا جاتا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں جب مصر میں کپاس کی فصل تنزل سے دوچار ہو رہی تھی۔ تو شاہی زراعتی مجلس نے امریکن کپاس پیما سے ایک نئی پیوند مراد ڈھونڈ نکالی۔ اس نئی کپاس کا ریشہ ۳۴ سے لے کر ۴۱ ملی میٹر تک لمبا تھا۔ اور یہ کپاس بہت اعلیٰ قسم کی تھی۔ اس کے بعد محکمۂ زراعت کی سرپرستی میں کپاس کی کئی پودیں تیار کی گئی تھیں۔ ۱۹۳۰ء میں گیزہ ۷ اور سخا ۴ تیار ہوئیں۔ سخا تو کامیاب نہ ہو سکی۔ اسی طرح گیزہ ۱۲ بھی جو بعد میں تیار ہوئی کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر گیزہ ۲۹ نکالی گئی جو بہت کامیاب رہی۔ کیونکہ یہ کپاس ہر لحاظ سے سکل کپاس سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس کے بعد محکمۂ زراعت کے سائنسدانوں نے ۱۹۳۲ء میں ملکی کپاس تیار کی اور ۱۹۴۲ء میں امون۔ امون اس وقت دنیا کی سب سے بہترین کپاس شمار کی جاتی ہے۔ لیکن یہ کپاس کسانوں میں زیادہ مقبول نہیں۔ کیونکہ اس کی فی ایکڑ پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن اس بات کا اثر زائل کرنے کے لئے امون کی قیمت مقابلتاً بہت زیادہ مقرر کی گئی ہے۔ جس سے کسانوں کو موزوں معاوضہ وصول ہو جاتا ہے۔ مصر کی آج کل مقبول ترین اقسام ہیں۔ نئی اشمونی جس کا ریشہ چھوٹا ہوتا ہے اور کارنک جس کا ریشہ لمبا ہوتا ہے اور گیزہ ۴۵۔ مصر سے آج کل انھیں اقسام کی زیادہ تر برآمد ہوتی ہے اور یہ تینوں اقسام محکمۂ زراعت کی محنت کا نتیجہ ہیں۔

کپاس کی پیداوار پر روشنی ڈالے بغیر کپاس کا مضمون تکمیل سے عاری ہی رہ جائے گا۔ اس لئے مصری کپاس کی پیداوار کے اعداد و شمار کو بھی اپنی کہانی سنانے دیجئے۔ ۱۸۲۱ء سے پہلے تو کپاس کی پیداوار نہایت معمولی تھی۔ ۱۸۲۱ء میں ——— اور اس سال کو مصر میں کپاس کی کاشت شروع کرنے کا فخر حاصل ہے ——— کل پیداوار ۹۰۰ قنطار (ایک مصری وزن) تھی۔ ۱۸۲۳ء میں کل پیداوار بڑھ کر ۲۱۸،۰۰۰ قنطار ہو گئی۔ پھر ۱۸۵۰ء تک کپاس کی پیداوار ۱۵۰،۰۰۰ اور ۲۰۰،۰۰۰ قنطار کے درمیان زیر و زبر ہوتی رہی۔ ۱۸۵۰ء میں پیداوار کا میزان اچھل کر ۵ لاکھ پر جا پہنچا۔ ۱۸۶۰ء میں جب امریکہ کی خانہ جنگی شروع ہوئی تو کپاس کی قیمتیں یک دم اور بے تحاشہ چڑھ گئیں۔ اس غیر متوقع تبدیلی کا مصری کپاس کی قیمتوں پر بھی اثر پڑا۔ اور ساتھ ہی مانگ بڑھ جانے سے کاشت کو بھی کافی فروغ ملا۔ ۱۸۶۱ء میں پیداوار ۵۹۶،۰۰۰ قنطار رہی ——— ۱۸۶۴ء میں بڑھ کر ۱۸۴۳۰۰۰ قنطار ہو گئی۔ ۱۸۶۵ء میں ۲۰۴۰۰۰۰ قنطار۔ ۱۸۷۶ء میں ۳۰ لاکھ قنطار۔ ۱۸۹۰ء میں ۴۰ لاکھ قنطار۔ اور ۱۸۹۲ء میں پیداوار کے اعداد ۵۰ لاکھ سے بھی تجاوز کر گئے۔ ۱۸۹۷ء میں ۶۰ لاکھ سے بھی اوپر۔ ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک پیداوار کی سالانہ اوسط ۷۳۰۱۰۰۰ قنطار رہی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اور دوسری جنگِ عظیم کے قبل کے وقفہ میں پیداوار کے اعداد انتہائی معراج تک جا پہنچے ——— ۱۹۳۷ء میں پیداوار ۱۱۰۹۰۰۰۰ قنطار رہی۔ اور یہ ریکارڈ ابھی تک نہیں ٹوٹ سکا۔ پچھلے ۲۰ سال میں کپاس کی سالانہ پیداوار کے ایک اور اندازہ میں مصر کی پیداوار کا عالمگیر پیداوار سے موازنہ کیا گیا ہے جو یوں ہے۔

سال	مصر میں پیداوار	عالمگیر پیداوار (روس کو چھوڑ کر)
۱۹۳۰ء	۳۷۲ ہزار ٹن	۴۳۴۰ ہزار ٹن
۱۹۳۵ء	۳۸۲ "	۵۴۸۰ "
۱۹۴۰ء	۴۱۲ "	۵۹۸۰ "
۱۹۴۲ء	۴۳۵ "	۴۲۳۰ "
۱۹۴۶ء	۳۶۹ "	۶۱۸۰ "

اب سوال اٹھتا ہے کہ مصری کپاس مصر کے کس کام میں آتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ شروع ہی سے مصری کپاس کو بیرونی ممالک میں سوت اور کپڑا تیار کرنے کے لئے برآمد کیا جاتا تھا۔ آغاز میں مصری کپاس کو فرانس بھیجا جاتا تھا۔ محمد علی کے زمانے میں مصری کپاس کو انگلینڈ اور امریکہ کے سوتی کارخانوں نے بھی خریدنا شروع کر دیا تھا۔ جب ریاست ہائے متحدہ امریکہ

نے برطانوی سلطنت سے آزادی حاصل کی تو برطانیہ کے کارخانوں کو امریکہ کی کپاس حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے برطانیہ نے کپاس حاصل کرنے کے لئے سوڈان اور مصر کی طرف رُخ موڑا۔ بعد میں یورپ کے دیگر ممالک بھی اس کپاس کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ جب ہندوستان میں کپڑے کے کارخانوں کا اجراء ہوا تو ان کارخانوں میں بھی مصر کی کپاس کی مانگ نمودار ہوئی۔ کیونکہ مصر کی کپاس دنیا کی عمدہ کپاسوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے جہاں بھی عمدہ کپڑے تیار کرنا مطلوب ہوگا، مصر کی کپاس کا استعمال ناگزیر ہوگا۔ اس لئے مصر کی کپاس کو خام مال کی شکل میں عالم گیر مارکیٹ دستیاب ہے۔ لیکن اس خاکہ میں ایک غیر پسندیدہ بات بھی چھپی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ مصر اس کپاس کو اپنے کارخانوں میں سُوت اور کپڑے کی شکل دینے میں ابھی تک بدرجۂ اتم کامیاب نہیں ہو سکا۔ کپاس باہر جاتی ہے اور بدیشی کارخانوں میں کپڑا تیار ہوتا ہے۔ اور پھر وہ کپڑا مصر کی ضروریات پورا کرنے کے لئے مہنگے داموں پر بھیجا جاتا ہے۔ گویا کپاس کے لئے تو اغیار مصر کے محتاج ہیں اور کپڑے کے لئے مصر اغیار کا محتاج ہے۔

۱۹۴۸ء میں کپاس کی کل برآمد ۳۴۴۰۰۰ ٹن ہوئی تھی۔ اس میں سے اشمونی کپاس کی برآمد ۱۰۳۰۰۰ ٹن اور کارنک کپاس کی برآمد ۱۳۲۰۰۰ ٹن ہوئی تھی۔ برآمد کے اعداد کا تجزیہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں کپاس کا کل برآمد میں سے ۷۶ فی صدی حصہ تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ۷۹ فی صدی ۱۹۴۹ء میں ۷۷ فی صدی اور ۱۹۵۰ء میں ۸۷ فی صدی۔ ۱۹۵۰ء میں کل برآمد میں سے برطانیہ کو ۲۳ فی صدی۔ ہندوستان کو ۱۲ فی صدی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ۶ فی صدی۔ روس کو ۵ فیصدی فرانس کو ۸ فی صدی۔ جاپان کو ۳ فی صدی۔ اٹلی کو ۹ فی صدی، اور جرمنی کو ۳ فی صدی مال بھیجا گیا تھا۔

یہ اعداد ثابت کرتے ہیں کہ مصر کی کپاس عالمگیر مارکیٹ میں کس حد تک اور کہاں کہاں تک مقبول ہے۔ مزید برآں یہ اعداد یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ مصر کے اقتصادی نظام میں کپاس کا کتنا گہرا دخل ہے۔

میرزا یگانہ

یگانہ آرٹ

جلوۂ حسن کا ہر چند اثر پڑتا ہے
پاس جاتا ہوں تو کچھ اور نظر پڑتا ہے

بے گناہوں کو بھی پامال کئے ڈالتے ہو
پاؤں رکھتے ہو کہاں اور کدھر پڑتا ہے

لڑکھڑاتی ہیں زبانیں سرِ محفل کیا کیا
تمہیں دیکھو جو مری چُپ کا اثر پڑتا ہے

تو ابھی پھونک دوں یہ پاپ کی بستی ساری
کیا کہوں بیچ میں اک آپ کا گھر پڑتا ہے

تجھے کیا دیکھے کوئی کون سے رُخ سے دیکھے
اک نظر دیکھ لے بس عکس جدھر پڑتا ہے

جان کھا جائے گا یہ عیش و طرب کا دَورہ
پڑنے لگتا ہے تو پھر شام و سحر پڑتا ہے

کیسے خوش ہوتے تھے پہلے مگر اب کیا کہئے
ناگہاں جب کوئی مہمان اُتر پڑتا ہے

حُسنِ بے باک کی اللہ رے بیگانہ روی
دستِ گستاخ جہاں کوئی نظر پڑتا ہے

دیکھ کس ناز سے دنیا تجھے ٹہکاتی ہے
ہاتھ جھوٹا ترا پڑتا ہے جدھر پڑتا ہے

فکرِ فردا وہ بلا ہے کہ یگانہ صاحب
سوکھنے لگتا ہے دم سایہ اگر پڑتا ہے

قدرت کے عطیّے اور منصوبہ بندی

قدرت نے ہندوستان کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے پھل پھول اور میوے بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ زمین بڑی زرخیز ہے اس لئے پیداوار جتنی ہو رہی ہے اس میں اضافے کے بہت بڑے امکانات ہیں۔ معدنی اشیا کثرت سے ملتی ہیں۔

حصول آزادی کے بعد ان تمام قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کا خیال زور پکڑ رہا ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں تیز رفتاری سے کام بھی جاری ہے۔ ہندوستان کی آئندہ ترقی کی منصوبہ بندی بڑے غور و خوض سے کی گئی ہے۔ مستقبل کی تمام امیدیں آب پاشی اور برقی قوت حاصل کرنے کے پراجیکٹوں پر منحصر ہیں۔ قدرت نے ہندوستان کو اپنی فیاضیوں سے نوازا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں دریاؤں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ ان دریاؤں کی وادیوں میں بہت سے پراجیکٹ اس وقت زیر تعمیر ہیں۔ ان کی تکمیل سے ہندوستان میں ضرورت سے زیادہ خوراک پیدا ہوگی۔ ترقی یافتہ صنعتی اداروں کو بجلی مہیا ہوگی۔ دیہات کے وسیع رقبے زرعی ترقی کی تصویر پیش کریں گے۔ گھریلو دستکاریاں فروغ پائیں گی۔ اور ان سب سے عام آدمی کا معیار زندگی بہتر ہو جائے گا۔

اس وقت ۱۳۵ پراجیکٹ ملک کے مختلف حصوں میں زیر تعمیر ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۲۲ پراجیکٹ ایسے ہیں جن کے سلسلے میں ابتدائی تحقیق ہو چکی ہے یا کی جا رہی ہے۔ مجموعی طور پر ان ۲۵۷ پراجیکٹوں پر ۱۹۰۰ کروڑ روپیہ خرچ آئے گا۔

اس وقت جو ۱۳۵ پراجیکٹ زیر تعمیر ہیں ان میں سے گیارہ پراجیکٹ کثیر المقاصد ہیں۔ ساٹھ محض آبرسانی اور چونسٹھ برقی قوت سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ۱۲ بڑے پراجیکٹ ہیں جن میں سے ہر ایک پر دس کروڑ یا اس سے زیادہ روپیہ خرچ آئے گا۔ ان ۱۲ پراجیکٹوں پر اندازاً ۴۳۹ کروڑ روپیہ خرچ آئے گا۔ باقی ۱۲۳ پراجیکٹوں کے خرچ کا اندازہ ۱۵۱ کروڑ روپیہ ہے۔ یعنی کل زیر تعمیر پراجیکٹوں کی مجموعی لاگت ۵۹۰ کروڑ روپے ہوگی۔

یہ سب آزادی کی برکتیں ہیں کہ ایسے مفید پراجیکٹوں پر ملک کی حکومت اپنی پوری توجہ مبذول کر رہی ہے۔ سنہ ۱۹۴۹-۵۰ میں ان پر انتالیس کروڑ چھیالیس لاکھ روپیہ اور سنہ ۱۹۵۰-۵۱ میں اٹھتر کروڑ انسٹھ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ ان ۱۳۵ پراجیکٹوں سے جو فائدے ملک کو حاصل ہوں گے وہ ذیل کے شجرے سے ظاہر ہو جائیں گے۔

سال	آبپاشی میں اضافہ (لاکھ ایکڑ)	پیداوار میں اضافہ (لاکھ ٹن)	برقی قوت میں اضافہ (کلوواٹ)
سنہ ۱۹۵۱-۵۲ء	۶	۲	--
سنہ ۱۹۵۲-۵۳ء	۱۱	۴	۳۵۱۰۰۰
سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء	۲۰	۷	۵۵۴۰۰۰
سنہ ۱۹۵۴-۵۵ء	۴۳	۱۴	۵۹۶۰۰۰
سنہ ۱۹۵۵-۵۶ء	۵۵	۱۸	۶۳۶۰۰۰
سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء	۶۷	۲۲	۷۰۸۰۰۰
سنہ ۱۹۵۷-۵۸ء	۷۵	۲۵	۷۹۱۰۰۰
سنہ ۱۹۵۸-۵۹ء	۸۵	۲۸	۸۱۷۰۰۰
سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء	۹۲	۳۱	۹۱۰۰۰۰
بعدہٗ	۱۲۹	۴۳	۱۹۹۶۰۰۰

اس وقت ملک میں ۲۰۰۰۰۰۰ (بیس لاکھ) کلوواٹ برقی قوت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں ۳۲۵۰۰۰۰ (بتیس لاکھ پچاس ہزار) اور ۱۹۵۹ء میں ۴۸۵۰۰۰۰ (اڑتالیس لاکھ پچاس ہزار) کلوواٹ برقی قوت پیدا کرنے کے ذرائع ہمارے پاس ہوں گے۔

چند قابل ذکر پراجیکٹ

بھاکڑا ننگل پراجیکٹ ۔ ضلع انبالہ میں روپڑ سے پچاس میل کے فاصلے پر بھاکڑا سے قریب دریائے ستلج پر ۶۸۰ فٹ اونچا ایک بند بنایا جائے گا۔ اس سے نیچے آٹھ میل کے فاصلے پر ایک ۹۰ فٹ اونچا بند قریب قریب تعمیر ہو چکا ہے۔ اس کا نام ننگل بند ہے۔ نہر ننگل پر تین پاور ہاؤس ہوں گے۔ اس پراجیکٹ سے ۳۶ لاکھ ایکڑ زمین کی آبپاشی ہو سکے گی اور چار لاکھ کلوواٹ برقی قوت پیدا ہوگی جس سے پنجاب، پیپسو یونین، راجستھان، دہلی اور اتر پردیش کو بجلی مہیا کی جا سکے گی۔ اس کی تکمیل کے بعد پنجاب پھر ہندوستان کے لئے اناج کا خزانہ بن جائے گا۔ اور صنعتی طور پر بھی بہت ترقی پذیر ہو گا۔

ہیرا کُڈ پراجیکٹ ۔ دریائے مہانَدی پر تین بند تعمیر کرنے تجویز کئے گئے ہیں۔ یہ پراجیکٹ انہیں نہروں میں سے ایک بند ہے۔ ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس بند کا سنگِ بنیاد ۱۳ اپریل ۱۹۴۸ء کو رکھا تھا۔ تکمیل کے بعد اس سے ۱۱۰۰۰۰۰ (گیارہ لاکھ) ایکڑ زمین کی آبپاشی ہوگی۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۵۳-۵۴ء میں اس سے آبپاشی کے لئے پانی مل جائے گا۔ ۱۹۵۲-۵۳ء میں ۲۴۰۰۰ (چوبیس ہزار) کلوواٹ برقی قوت اس سے مہیا ہو جائے گی۔ انجام کار اس سے کل ۳۲۲۱۰۰۰ (بتیس لاکھ اکیس ہزار) کلوواٹ برقی قوت حاصل ہو سکے گی جس سے جمشید پور کے عظیم الشان لوہے کے کارخانوں کو بھی بہت سی برقی قوت مہیا کی جائے گی۔

دامودر ویلی پراجیکٹ ۔ بہار اور مغربی بنگال کو اس پراجیکٹ سے بہت فائدہ ہو گا۔ ماہ جولائی ۱۹۴۸ء میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کی رو سے دامودر ویلی کارپوریشن قائم کیا گیا۔ اس اسکیم کے مطابق آٹھ ایسے بند تعمیر کئے جائیں گے جن کے ساتھ ہائیڈرو الیکٹرک کے اسٹیشن بھی قائم کئے جائیں گے۔ یہ پروجیکٹ وادی دامودر میں سیلابوں کی روک تھام کا ایک موثر وسیلہ ثابت ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ایک لاکھ ایکڑ زمین کو سال کے ہر حصے میں پانی مل سکے گا۔ اور بجلی بڑی فراوانی سے مہیا کی جا سکے گی۔

تنگ بھدرا پراجیکٹ ۔ ضلع بلاری میں ملاپورم کے مقام پر دریائے تنگ بھدرا پر ایک بند تعمیر کیا جائے گا۔ اس پراجیکٹ سے صوبہ مدراس اور ریاست حیدرآباد کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ دو نہریں نکالی جائیں گی۔ مدراس کی جانب والی نہر ۲۲۵ میل لمبی ہوگی اور تین لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کرے گی۔ حیدرآباد کی جانب والی نہر چار لاکھ انیس ہزار ایکڑ زمین کو سیراب کرے گی۔ اس پراجیکٹ سے ایک لاکھ پچپن ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کی جا سکے گی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس پراجیکٹ سے ۲ لاکھ ۱۰ ہزار ٹن مزید اناج پیدا ہو سکے گا۔ یہ پراجیکٹ ۱۹۵۳ء میں مکمل ہو جائے گا۔

مچکنڈ ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم ۔ دریائے مچکنڈ مدراس اور اڑیسہ کے درمیان بہتا ہوا ان کی سرحد کا کام دیتا ہے۔ اس کا محلِ وقوع وساکھاپٹنم سے ۱۲۵ میل کے فاصلے پر آبشار ڈڈوما کے قریب واقع ہے۔ مدراس اور اڑیسہ کی حکومتیں مشترکہ طور پر اس اسکیم کو تعمیر کر رہی ہیں اور دونوں اس سے ۷:۳ کی نسبت سے مستفید ہوں گی۔ اس پاور ہاؤس کے چھ یونٹ ہوں گے جن میں سے ہر ایک ۱۷۳۵۰ کلوواٹ برقی قوت پیدا کریگا

ککراپارا پراجیکٹ ۔ سورت سے پچاس میل اوپر کی طرف ککراپارا کے نزدیک دریائے تاپتی پر ایک بند بنایا جا رہا ہے۔ اس سے دریا کے دونوں طرف ایک ایک نہر جاری ہو جائے گی۔ پراجیکٹ سے ۵۶۲۵۲۰ ایکڑ زمین بمبئی کے صوبے میں سیراب ہو سکے گی۔ اور ۴۸۰۰۰ کلوواٹ بجلی پیدا ہوگی۔

ان کے علاوہ زیر تعمیر بڑی اسکیمیں مندرجہ ذیل ہیں۔

اتر پردیش میں شاردا پاور پراجیکٹ۔ مغربی بنگال میں میورکشی برقی قوت و آب رسانی کا پراجیکٹ۔ مدھیہ بھارت اور راجستھان میں چمبل پراجیکٹ، میسور میں لکاولی پراجیکٹ اور مدھیہ پردیش کے برقی پراجیکٹس

ان تفاصیل سے بخوبی ظاہر ہو جائے گا کہ ہندوستان کے دریا واقعی قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہیں۔ ان سے پورے طور پر کام لیا گیا تو ملک زرعی اور صنعتی دولت سے مالا مال ہو جائے گا۔ خوراک کے سلسلے میں خود کفیل ہی نہیں ہوگا بلکہ دوسروں کو بھی کچھ دے گا۔

بلونت سنگھ

حضرت چھچھوندر پچھوروی

تحقیق و تشویش

اس کمترین بلکہ بدترین بندۂ بے دست و پا و بدنما کی بے بضاعتی و کم مائیگی عیاں بلکہ عریاں ہے پر بزرگان کا فرمان ہے کہ انسان دو ہاتھ اور دو ٹانگ سے نہیں، اپنے افعال و کردار سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر چند بندہ ہیچمدان بہر رُخ ننگ خاندان، دہقان نہ خان بلکہ شاید شتربان ہے لیکن والد بزرگوار (خدا انہیں جنت نصیب کرے (نہ کرے) شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے اپنا سارا وقت اسی کارِ خیر میں بسر کرتے اور بوقتِ فرصت فکرِ معاش بھی کرتے۔ اکثر فرمایا کرتے کہ زیرِ زمیں گنج ہائے بے بہا اور نہ جانے کیا صورتیں تھیں کہ پنہاں ہو گئیں۔

اس وقت اس مسکین نے ان کے ارشاد کو محض شاعرانہ تعلی پر محمول کیا رہائے! سمجھا نہ جانا کہ ایک روز ایسا بھی طلوع ہوگا کہ جب ان کے قولِ زریں کا نقطہ نقطہ آفتابِ عالمتاب کی روشنی میں تاباں ہوگا بلکہ جگمگا اٹھے گا اور مخلوقِ خدا کی آنکھیں خیرہ اور چکا چوند ہوں گی ؎

تعریف ہو اس رب کی جس نے۔۔۔۔ الخ

خدا جھوٹ نہ بلوائے حقیر کو یوں یاد پڑتا ہے کہ اس خاک نشیں کے والد ماجد حضرت چھچھوندر پچھوروی کی تعریف میں شب و روز رطب اللسان رہتے اور کہتے کہ حضرت چھچھوندر ایسا شاعر پیدا ہوا نہ ہوگا یوں تو شری احمد نباض نے ایسی ہی بات حضرت پرواز کے بارے میں کہی ہے لیکن خدا لگتی بات یہ ہے کہ بات میں سے بات نکلتی ہے چنانچہ اگر بیسویں صدی میں یہ قول شری پرواز پر صادق آتا ہے تو انیسویں صدی میں یہی قول حضرت چھچھوندر پچھوروی پر صادق آتا تھا لہذا دونوں اصحاب اپنے اپنے مقام پر سرخاب ہیں۔

اس سرتاپا تقصیر نے عمرِ عزیز کے مبلغ چالیس برس حضرت چھچھوندر کی تحقیق میں گزار دیئے۔ قریب تھا کہ گنہگار مقصد حاصل کئے بغیر اللہ کو پیارا ہو لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا چنانچہ فقیر نے جی کی مراد اور جان کی امان پائی اس محنتِ شاقہ کے بعد ہاتھ بے اختیار خدا کی درگاہ کی جانب اٹھے اور رو رو کر یوں دعا مانگی ؎

میں نہ ہوتا تو کیا ہوتا تو نہ ہوتا تو کیا ہوتا

قارئین میں سے جن کو خدا نے کوڑی بھر عقل بھی دی ہے "(ایڈیٹران اس کمپی ٹیشن میں شامل نہیں ہیں) انہوں نے عمر بھر میں ایک بار چھچھوندر پچھوروی کا اسم گرامی ضرور سنا ہوگا۔

مجھے ببانگِ دہل یہ کہنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی کہ موجودہ صدی کے بڑے بڑے شعرا نے شہنشاہِ سخن حضرت فدوی (Sorry) چھچھوندر پچھوروی کی خوشہ چینی کی ہے جیسا کہ آگے چل کر خود بخود ظاہر ہو جائے گا میں نام نہیں لوں گا کہ

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

اب اللہ کا نام لے کر حضور پُر نور چھچھوندر کے چند مسلسل اشعار ملاحظہ فرمایئے۔ ذرا بحر پر نگاہ رہے

پُر تم پُر نم — گم سم گم سم
جہنم جہنم — ہنگم بے ہنگم
تُم تُم تُم تُم — ہم ہم ہم ہم
دل شکستہ — دنیا قائم
جگر سوختہ — چرخ دائم
بارش بارش — شبنم شبنم
چھچھوندر پُر غم — صنم پُر نم

واہ دیکھئے بس بجلیاں ہیں بجلیاں۔ جی چاہتا ہے کہ مندرجہ بالا اشعار کی بابت کچھ کہوں۔ وائے حسرتا! آگے بڑھیئے۔

ہم تم پر کیا گزری — تم ہم پر کیا گزری
بلبل پر کیا گزری — گل گل پر کیا گزری
قلقل پر کیا گزری — قل قل پر کیا گزری
ململ پر کیا گزری — دلدل پر کیا گزری
گزرنے کو چھچھوندر جی
گزر گئی پر کیا گزری

مرحبا! آمد کا زور ملاحظہ ہو۔ شعر پہ شعر ڈھلتا چلا جا رہا ہے۔ اب مندرجہ ذیل اشعار پڑھیئے اور سر دھنئے۔ حضرت موصوف کو غالباً پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ ایک روز ہندی راشٹر بھاشا مانی جائے گی۔ چنانچہ ان اشعار میں ہندی رنگ غالب نظر آتا ہے ؎

تم ہم پر مرتے ہو؟ اجی جاؤ — ہمیں پیار کرتے ہو؟ اجی جاؤ
رات اکیلے ہمرا جیا دھڑکا — اب کیا دم بھرتے ہو؟ اجی جاؤ
تین دن سے کہاں مر گئے تھے — اب یہ باتیں کرتے ہو؟ اجی جاؤ
سیدھے سیدھے جواب دو، یہ کیا — اگر مگر کیوں کرتے ہو؟ اجی جاؤ
اوہنوں، اوہنوں، اوئی رام!
اجی یہ کیا کرتے ہو؟ اجی جاؤ

واہ وا! کیا بے ساختگی ہے، کیا چاشنی ہے، کیا مکالمیت ہے، کیا غضب ہے صاحب!

آپ فن شاعری کی ہر صنف میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ نے ایک نہایت ہی دلگداز مثنوی بعنوان 'بحرِ عشق' تحریر فرمائی ہے۔ مجھ حقیر نے ایسی بلند پایہ مثنوی کسی زبان میں نہیں پڑھی۔ یہ ایک سوداگر بچہ کا قصہ ہے جس نے ایک پری رو کے عشق میں گرفتار ہو کر بے شمار مصائب کا سامنا کیا۔ ذیل میں اس واقعہ کا ذکر ہے جب کہ سوداگر بچہ کی معشوقہ سو کر جاگتی ہے اور اپنے باغ میں راتوں رات بڑھنے والے جاؤ[1] کے پیڑ کو دیکھ کر اظہار حیرت کرتی ہے۔

پہلے تو باغ تھا اک تختۂ گل — اوئی باجی! یہ کیا ہے کھڑا ہوا
خواب میں دیکھا جو گھسمسایا ہوا — کھلی آنکھ تو اُف!! پایا کھڑا ہوا
بستا تھا پہلے یہ سپنوں میں میرے — اب دیکھو کیا خوب ہے کھڑا ہوا
پہلے ننھا سا پودا تھا ہر دم ہرا تا — پھر اور بڑھ کر یہ اوئی اللہ ہوا
جادو ہے، ٹونا ہے یا سحر ہے
اوئی اللہ سے بڑھ کر الحمد اللہ ہوا

(یادش بخیر! مندرجہ بالا اشعار میں لفظ کھڑا راجہ ہے)

سلاست، نازک بیانی اور لطیف اشاروں کا جو سمندر یہاں ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے اسے نسیم یا میر حسن کے وہاں تو دکھائیے ذرا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود بینوں نے اس عظیم شاعر کو قعر گمنامی میں گرا کے چھوڑا۔ ہائے افسوس! حالی نے یادگار غالب تو لکھ ماری لیکن اس میں حضرت چھچھوندر کی بابت محض دو فقرے لکھ کر رہ گئے (اور وہ بھی قلمی نسخے میں) وائے حسرتا! مولانا شبلی نعمانی نے مثالیں پیش کرنے کے لئے شعرائے ہند و فارس کے دیوان کے دیوان چھان مارے لیکن ذری اس درویش کفن بدوش کی جانب ایک نگاہ تک نہ ڈالی۔ بعض اوقات شک گزرنے لگتا ہے کہ اس عظیم الشان ہستی کے خلاف تاریخ ادب کی سب سے بڑی سازش کی گئی ہے۔ اگر اس حقیر فقیر ہیچمدان کج مج بیان نے کمر ہمت باندھ کر اس مہم کا بیڑا نہ اٹھایا ہوتا تو... تو... کیا ہوتا؟...

چند اشعار میں معشوق کا 'سراپا' بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اور بے خود ہو جائیے۔

وہ یوں تو قاتل سرتا سر ہے — پر آنکھیں اس کی؟ ہائے!
وہ یوں تو قیامت سرتا سر ہے — پر رفتار اس کی؟ ہائے!
وہ یوں تو چمن سرتا سر ہے — پر گال[2] اس کی؟ ہائے!
وہ یوں تو نغمہ سرتا سر ہے — پر گفتار اس کی؟ ہائے!
یوں تو تل ہے کالا کلوٹا — گال پہ اس کی؟ ہائے!
یوں تو زلف زہریلی ناگن — رخ[2] پہ اس کی؟ ہائے!

[1] اسی پیڑ کے لئے پری رو نے سوداگر بچہ کو در در کی خاک چھنوائی۔

[2] گال اور رخ کو استاد بشرط ضرورت مذکر و مؤنث باندھا کرتے تھے

یوں بجلی جیا پر اڑائے چھچھوندر
پھر آنکھ میں اس کی ؟ ہائے

اس پائے کا سراپا فارسی میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے اردو کا تو ذکر ہی فضول ہے۔

اگرچہ انیسویں صدی کے شاعر تھے لیکن بعض اعتبار سے بیسویں صدی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمایئے۔ انھیں پڑھ کر بڑے بڑے زہریلے فلمی مہاکویوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔

دل اک نازک بستی ہے   یہ بستے بستے بستی ہے
اس کو کیوں تم لُوٹ چلے، ہائے!
نازک موتی دیا تھا تم کو   لگا کر دل سے رکھنے دل کو
اس کو کیوں تم توڑ چلے، ہائے!
جب تم ہم پر مہربان ہوئے   ہم تم پر پھر قربان ہوئے
مُنھ کو کیوں تم موڑ چلے، ہائے!
جی، جی ہم کہتے تھے جی!   جی، جی تم کہتے تھے جی!
جی ہما، کیوں جی؟ توڑ چلے ہائے!

کیا مجھ ناچیز کے داد دینے کی ضرورت بھی ہے؟ ذرا غور فرمایئے آخری بند میں لفظ "جی" کی تکرار سے کیا لطف پیدا ہو گیا ہے
اب ذرا شوکتِ بیان ملاحظہ ہو۔

یہ تیرا کلام! واہ وا   وہ تیرا بام! واہ وا
یہ میری صراحی، تھو تھو   وہ تیرا جام! واہ وا
بے بفا عقلِ عشق چھی چھی   حسن کا مقام! واہ وا
مری بے چینیٔ دل لعنت   اُٹل تیرا مقام! واہ وا
ایشو کو نمسکار، خوب   اللہ کو سلام! واہ وا
ترے پاؤں میں او صنم   ہو میرا مقام! واہ وا
مرا نام چھچھوندر، اخ تھو
میری تیرا نام، واہ وا

واللہ کیا ذہانت ہے۔ مقطع میں معشوقہ کا نام میری ظاہر کر کے کیا چٹکی لی ہے۔ اب شاعر استغنا کا مظاہرہ کس طرح کرتا ہے

درد دل کو دباتا چلا جا   اس بے وفا سے نبھاتا چلا جا
آنا ہے تو آ ہی جا ورنہ   جانا ہے تو جا چنتا چلا جا
کھونا ہے گر تو کھو دے مجھ کو   گر پانا ہے تو نہ ڈرپاتا چلا جا
بے وفائی پہ اپنی شرمسار نہیں تو   آ آنکھ سے آنکھ لڑاتا چلا جا
نہ سہی نہ سہی وصل نہ سہی   لے تیر تو دل پہ چلاتا چلا جا
میسر نہیں گر وصالِ صنم چھچھوندر
حلوہ مانڈہ بے دھڑک اڑاتا چلا جا

الحمد اللہ! کیا تیور ہیں۔ فی الحقیقت بغاوت کا بیج پچھلی صدی ہی میں بو گئے تھے۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

میں اس پیٹ کو کیوں بھروں   (کیا طنز ہے)
یہ مٹکا تیرا ہے کہ میرا؟
میں کھیت میں گندم کیوں بوؤں   (ذاتی ملکیت کے خلاف
یہ کھیت تیرا ہے کہ میرا؟   کس قدر زبردست مظاہرہ کیا ہے)
کیوں آخر کیوں؟ مُنہ یہ دھوؤں   (واہ تصوف کا رنگ فق ہے)
یہ نگوڑا (مُنہ) تیرا ہے کہ میرا
کیوں میری میّت اٹھائیں لوگ   (یعنی مر کر بھی باغی رہے)
لب سڑک مردہ یہ تیرا ہے کہ میرا

قارئین وزن کا خیال نہ کریں۔ جو غریب مر گیا بلکہ جسے مرے ہوئے ایک صدی گزر چکی ہو اس کے اشعار کا وزن جانچنا سراسر زیادتی ہے۔

مرحوم کی کون کون سی صفت بیان کی جائے۔ نیچر اور ویدک حکمت کے متعلق چند شعر ملاحظہ فرمایئے۔

چیلیں کوّے اڑتے ہیں   بادو بادل اُمڈتے ہیں
گھنن گھنن گرجتے ہیں   چھنن چھنن برستے ہیں
دیدار کو ہم ترستے ہیں
مینڈک جوہڑ جوہڑ ہیں   بھینسیں گوبر گوبر ہیں
صدائیں ٹرڑ ٹرڑ ہیں   بھولوں بر گرڑ ہیں
ٹیپ کا مصرعہ مٹا ہوا ہے
پیٹ میں کوئی گڑ بڑ ہے   جلن اینٹھن جھرڑ ہے

ہوتی ہڑ بڑ ہے غرض طبیعت کھڑ ہے
تو اس کی دوا ہڑ ہے

موسم برسات کا منظر چھوٹی بحر میں یوں بیان کرتے ہیں۔

بادل گرجیں گڑ گڑ گڑ گڑ
مینہاں برسے گھر گھر گھر گھر
چڑیاں پھڑکیں پھڑ پھڑ پھڑ پھڑ
سانپ سرکیں سر سر سر سر
جیا چھچھوندر
مر مر مر مر

دیکھئے مقطع میں قنوطیت پیدا ہوگئی۔ جوں جوں قبر کی جانب قدم بڑھتے گئے یہ کیفیت شدید ہوتی گئی۔

کیوں کمر کس کر باندھئے کستے کستے کس جائے گی
کیوں بستی دل کی بسائیے بستے بستے بس جائے گی
کیوں چندیا اپنی گھسائیے گھستے گھستے گھس جائے گی
کیوں زندگی رو کر کاٹیے کٹتے کٹتے کٹ جائے گی
کیوں چھچھوندر چھچھر چھچھوریئے
چھچھرتے چھچھرتے چھچھر جائے گی

زندگی کے آخری دنوں میں شامی کباب تک ہضم نہیں کر سکتے تھے اور بقول اقبال کے ابلیس کے فقط اللہ ہو، اللہ ہو بن کر رہ گئے تھے۔ ان تاریک دنوں کا نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

مرتے کھپتے اللہ اللہ سوتے جگتے اللہ اللہ
کھاتے پیتے اللہ اللہ روتے ہنستے اللہ اللہ
بیٹھتے اٹھتے اللہ اللہ مرتے مرتے اللہ اللہ
آتے جاتے اللہ اللہ لیتے دیتے اللہ اللہ
بچھوا کوا اللہ اللہ چھچھوندر چوہا اللہ اللہ

آخر آپ ۱۸۳۷ء میں راہی ملک عدم ہوئے اور ان کے شاگرد حضرت خرگوش آسمانی سے تاریخ وفات نکالی (اور پھر چھپالی)

وقت کی کمی اور جگہ کی تنگی مانع آتی ہے ورنہ دفتر کے دفتر لکھ ڈالتا۔ چناں چہ مشتے از خروارے کے بمصداق کلام چھچھوندر کے چند نمونوں پر اکتفا کرنا پڑا۔ حضرت موصوف پر ایک کتاب جو زیادہ سے زیادہ آٹھ سو (۸۰۰) اور کم سے کم دو (۲) صفحات پر محیط ہوگی اور مصنف "طلسم ہوش خطا" کے نام سے معنون کی جائے گی، زیر ترتیب ہے۔ نظر ثانی کے لئے اصل مسودے کے چند اوراق پریشاں کر کے بابائے اردو حضرت تلاش حق کی خدمت میں ارسال کئے جا چکے ہیں۔

صحت کی مہریں

آنریبل راج کماری امرت کور

قوم کی صحت اس کا سرمایۂ حیات ہوتا ہے۔ دوسرے شعبوں کی طرح ہماری صحت عامہ کی تنظیمیں بھی ضروریات پورا کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔ اور مالی دشواریوں کے ماتحت ضروری توسیع بھی جلد ممکن نہیں۔

لہٰذا عوام اور حکومت دونوں کو مل کر اس کمی کا ازالہ کرنا ہے۔ دوسرے ملکوں میں بھی صحت کے پروگرام کے لئے "ہیلتھ کے ٹکٹ" یا صحت کی مہریں، حکومتوں کی مدد کا ذریعہ بنتے ہیں۔ بھارت سرکار کی وزارتِ صحت نے بھی ۲۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء سے صحت کی مہریں" فروخت کرنے کی مہم کا افتتاح کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ٹکٹ تمام ڈاک خانوں میں ایک روپیہ۔ چار آنہ اور ایک آنے میں فروخت ہوں گے۔

اس مہم کی امداد کے لئے میں ہر شخص سے اپیل کرتی ہوں تاکہ بیمار اور معذور انسانوں کی امداد کی جا سکے۔ کسی اچھے مقصد کے لئے رضاکارانہ جدوجہد ہی ہمیشہ بہترین جدوجہد ہوتی ہے۔ اور مجھے سب کے تعاون اور اشتراک عمل کا یقین ہے۔

ذکر و فکر

عبدالمجید حیرت

وسعتِ قلب و نظر رکھتے ہیں
اہلِ دل سب کی خبر رکھتے ہیں

دے کے اک جام پلانے والے
دوسرا جام بھی بھر رکھتے ہیں

یہ زر اندوز بھی اللہ غنی
کس قدر تنگ نظر رکھتے ہیں

دل بھی رکھتے ہیں الٰہی کہ نہیں
یا فقط کیسۂ زر رکھتے ہیں

جب وہ سودائے حقیقت ہی نہیں
ایک دھوکا ہے کہ سر رکھتے ہیں

کس کی ہمت ہے کہ اُن سے پوچھے
کیوں ہمیں خاک بسر رکھتے ہیں

پاسِ خاطر ہے کسی کا ورنہ
ہم بھی آہوں میں اثر رکھتے ہیں

وہ شبِ غم سے ہراساں ہوں تو ہوں
ہم تو اُمیدِ سحر رکھتے ہیں

کچھ اثر ہی نہیں ہوتا جن پر
کیا وہ پتھر کا جگر رکھتے ہیں

ایک وہ بھی ہیں کہ چاہے کچھ ہو
بات حیرت کی مگر رکھتے ہیں

ارشد کاکوی

وہ ایک کھیل جو کھیلا گیا شراروں کا
چمن غریب کو دھوکا ہوا بہاروں کا

چمن کا رنجِ خزاں اس طرح مٹے شاید
چلو کہ چل کے کریں ذکر اُن بہاروں کا

لگے نہ ٹھیس تیرے ذوقِ خود نمائی کو
نظر کو صید بناتا ہوں میں نظاروں کا

پینے کی بات ہے لیکن چمن کو کون کہے
خزاں نے روپ نکھارا تری بہاروں کا

کہیں کھلے نہ وہ ارشد نگاہِ ساقی پر
وہ ایک جام جو ہے رازِ میگساروں کا

ناظر الحسینی

شاعر کے تجسس میں اثر ہے کہ نہیں ہے
دنیا کو حقیقت کی خبر ہے کہ نہیں ہے

گلچیں کا گلستاں میں اثر ہے کہ نہیں ہے
بیداد بہ اندازِ دگر ہے کہ نہیں ہے

کل پھوٹ کے روئے تھے مرے پاؤں کے چھالے
رنگین تری راہگذر ہے کہ نہیں ہے

افسردہ ہیں اربابِ وفا دورِ طرب میں
مطرب ترے نغموں میں اثر ہے کہ نہیں ہے

رنگینیٔ دل نورِ نظر لوٹنے والو
اُجڑی ہوئی مانگوں پہ نظر ہے کہ نہیں ہے

کل جس سے چمکتی تھی بہاروں کی جوانی
مایوس وہ معصوم نظر ہے کہ نہیں ہے

کل رات ستاروں نے بصد ناز یہ پوچھا
ناظر تری قسمت میں سحر ہے کہ نہیں ہے

فکر ندوی

سکوتِ غم ہے، باقی ہے مگر رسمِ پیام اب بھی
شبِ تاریک میں ہوں مہر و مہ سے ہم کلام اب بھی

نہیں وہ نسبتِ دیرینہ لیکن اس کو کیا کہیئے
وہی ہم ہیں وہی اگلی سی ہے رسمِ سلام اب بھی

سُن! او عہدِ وفا کی عظمتوں کو بھولنے والے
مری نظروں میں ہے عہدِ وفا کا احترام اب بھی

لبِ خاموش پر مانا کہ اب نالے نہیں آتے
نگاہوں میں مگر باقی ہے اندازِ کلام اب بھی

بایں بیچارگیٔ عشق اس دل کا یہ عالم ہے
اشاروں سے بدل سکتا ہے نظمِ صبح و شام اب بھی

نازش پرتاب گڑھی

نگہِ ناز! دیکھ اس کو نہ بھول
زیست ہے ان دنوں بہت مشغول

حسن کا ہے ہر احتجاج فضول
عاشقی کے بدل چکے ہیں اصول

زلفِ پیچاں بہت دراز سہی
کم نہیں کائنات کا بھی طُول

موج و طوفاں سے کھیلنے والے
توڑ دیتے ہیں آپ ہی مستول

چہرے ہوتے رہیں گے گرد آلود
ڈالتے جائیں لوگ چاند پہ دھول

سیدہ فرحت

خزاں کا صحنِ چمن میں ہے اقتدار ابھی
حدودِ خواب میں ہے موسمِ بہار ابھی

مرے ندیم مجھے دعوتِ نشاط نہ دے
نہیں زمانے کے حالات سازگار ابھی

ابھی نگارِ تمنا ہے محوِ آرائش
کچھ اور اے دلِ پرشوق انتظار ابھی

ابھی ادھوری ہے تصویرِ ارتقائے حیات
اسے تو دہر میں بننا ہے شاہکار ابھی

کرے گا حسن کا رتبہ بلند عشق اک دن
نہیں ہے کیف باندازۂ خمار ابھی

ابھی تو خونِ جگر کی اسے ضرورت ہے
نہیں ہیں نخلِ تمنا میں برگ و بار ابھی

ہمیں بدلنا ہے فرحت نظامِ فرسودہ
بہت ہے محفلِ ہستی میں انتشار ابھی

ذکیہ سلطانہ

جہاں آراء

کتنی عجیب بات ہے! جن مغلوں کے پرکھوں نے بغداد کا تاریخی کتب خانہ جلا کر خاک سیاہ کیا۔ انہی کی نسل آگے چل کر تہذیب و تمدن کی امانت دار بنی۔ جن کے بزرگوں نے محلوں کو زمین سے ملا دیا۔ ان کی اولاد نے تاج محل چنوایا۔ ان کی نسل میں دارا شکوہ ایسا فلسفی صوفی اور اورنگ زیب ایسا عالم و دیندار پیدا ہوا۔ جو قوم شہروں شہروں تعلیم و ترقی کے چراغ بجھاتی تھی۔ اسی قوم کی بزم گلبدن بیگم، زیب النساء اور جہاں آراء ایسی شمعوں سے روشن ہوئی۔

تاریخ کی نامور خواتین میں جہاں آراء ایک ایسا چمکتا ہوا ستارہ تھی جس کی ضو نے مغل خاندان کی تہذیبی روایتوں کو آج تک ماند نہیں ہونے دیا۔

جہاں آراء شاہ جہاں کی چہیتی بیٹی تھی۔ دارا شکوہ سے چھوٹی اورنگ زیب سے بڑی لیکن شاہ جہاں کی تمام اولاد میں وہ اپنی سیرت و عمل کے لحاظ سے تاروں میں چاند کی طرح نمایاں ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں باپ کے لیئے خدمت گزار اور فرماں بردار بیٹی اور ماں کی سچی غمگسار تھی۔ وہ بھائیوں کے لئے ہمدرد بہن اور اپنی رعایا کے لیئے شفیق ماں کی حیثیت رکھتی تھی۔

جہاں آراء کہنے کو تو شہزادی تھی لیکن وہ ایک اس مشرقی خاتون کے مانند تھی جو حویلی سے لے کر دیوان خانے کے تمام امور میں برابر کا عمل دخل رکھتی ہے۔ جس طرح ہندوستانی لڑکیاں شادی سے پہلے ماں کا گھر بار سنبھالتی ہیں۔ اسی طرح جہاں آراء نے ممتاز محل کی موت کے بعد محل کے تمام انتظامات اپنے ذمے لے لیئے۔ اس کی سعادت نے اسے شاہ جہاں کے تمام آرام و آسائش کا ذمہ دار بنا دیا۔ اور پھر ایک عام بیٹی کے مانند مرتے دم تک وہ باپ کی خدمت گزار بنی رہی۔ تاریخ اورنگ زیب و دارا پیدا کر سکتی ہے مگر جہاں آراء جیسی بیٹیاں مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

محل سے لے کر دربار تک اس کی بے حد عزت تھی۔ لوگ اسے احتراماً بیگم صاحب کے نام سے یاد کرتے، اورنگ زیب اپنے خطوں میں اسے "نواب تقدس نقاب بیگم صاحب جیو" سے مخاطب کرتا۔ شہر میں جب اس کا جلوس نکلتا تو نظریں بہکی کی بہکی رہ جاتیں۔ باقاعدہ بازاروں میں پردے کا انتظام ہوتا۔ جہاں آراء اپنے زہد، اپنی نیکی سچائی اور اپنی دانش مندی و دوربینی اور فکری اہلیتوں کی وجہ سے شاہ جہاں کی مشیر اور مجوِز تھی۔ بڑے بڑے راجاؤں کے نام جانے والے فرمانوں اور مکاتیب پر جہاں آراء شاہ جہاں کی مہر لگاتی۔ وہ باپ کی نگاہوں میں معتبر اور اراکین سلطنت کی نظر میں مستند تھی۔ اکثر سلطنت کے معاملات میں بہت سے راجاؤں سے جہاں آراء خود ہی مکاتبت کرتی تھی۔

بھائیوں پر یکساں فدا، کبھی دارا پر قربان، کبھی اورنگ زیب پر نثار، لیکن اس کی انصاف پسندی دارا ہی کو سلطنت کا صحیح وارث سمجھتی تھی۔ وہ شاید اپنے بڑے بھائی دارا شکوہ کو اس لیئے اور بھی چاہتی تھی کہ وہ ایک فلسفی اور صوفی مشرب انسان تھا۔ اس کے صوفیانہ اعتقاد نے دوسری ملتوں اور مذہبوں کو بھی اپنے ایمان کا جزو بنا لیا تھا ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں (غالب)

اور دوسرے دارا شاہ جہاں کا بڑا بیٹا تھا اس لئے بھی وہ دارا ہی کو تخت کا حق دار خیال کرتی تھی۔ اگر باپ اور بیٹی کی آرزو بر آتی اور شاہ جہان کا جانشین دارا شکوہ ہوتا تو ہندوستان کی تاریخ ہی دوسری ہوتی۔ گو وہ دارا کی ساتھی تھی پر دارا اور اورنگ زیب میں صلح کرانے کے لیئے اس نے

بڑی بہن کی حیثیت سے اورنگ زیب کو بارہا خطوط لکھے ۔ دونوں کو منایا سمجھایا ۔ پر سلطنت کا نشہ ایسا نہیں جو چڑھ کر اتر جائے ۔ شاہ جہان کی علالت کی خبر سن کر جب اورنگ زیب کی فوجیں آگرہ کے قریب آکر ڈٹ گئیں تو جہان آرا نے بڑی بہن کی طرح اورنگ زیب کو خط لکھا کہ وہ بڑے بھائی کے حق میں دست بردار ہو جائے اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی کا طالب ہو لیکن اورنگ زیب نے جواب دیا ۔ جب تک دارا قلعہ میں موجود ہے میں ہرگز نہیں آؤں گا ۔ بہرحال وہ ملاقات نہ ہو سکی جس کے نتیجے میں جنگ سموگرہ ہوئی ۔ جس نے تخت نشینی کا فیصلہ کر دیا اور تاریخ نے بالکل ایک نیا راستہ اختیار کیا ۔ دنیا ہی بدل گئی یہاں تک کہ اس جنگ کا انجام بادشاہ کی قید کی صورت میں بھی نکلا ۔ اس قید و بند کے دوران میں جہان آرا بادشاہ کے ساتھ رہی اور ایک خدمت گزار بیٹی کی طرح باپ کی خدمت کرتی رہی ۔ جہان آرا اگر چاہتی تو وہ باپ کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب کے ساتھ آرام کی زندگی بسر کرتی لیکن وہ سچی بیٹی تھی اس نے عام بیٹیوں کی طرح مرنے سے پہلے شاہ جہان کا ساتھ نہیں چھوڑا وہ اتنے بڑے دل کی عورت تھی کہ اس نے دارا کی موت کو برداشت کیا ۔ اور اورنگ زیب کو سمجھا بجھا کر شاہ جہان سے اس کا قصور معاف کرایا

باپ کے مرنے کے بعد اورنگ زیب جہان آرا کو نہایت احترام سے دہلی لے گیا اور اس کو حویلی مردان خاں میں ٹھہرایا ۔ جہاں کسی زمانے میں دارا کی لائبریری تھی اور جو عرصۂ دراز تک دلّی کالج رہ چکا ہے اور آج جس کی عمارت میں پولوٹیکنیکل اسکول قائم ہے ۔

شاہ جہان خود بھی جہان آرا کو بہت چاہتا تھا جس کی ایک معمولی مثال اس مشہور واقعہ میں ملتی ہے ۔ ایک رات جہان آرا شاہ جہان کے پاس سے لوٹ رہی تھی ۔ خواصیں دونوں طرف شمعیں لئے چل رہی تھیں چلتے چلتے ایک شمع گری اور جہان آرا کے کپڑوں میں آگ لگ گئی ۔ عطر میں بسے ہوئے لباس نے بہت جلد آگ پکڑ لی اور دیکھتے ہی دیکھتے جہاں آرا کے جسم کو جلا ڈالا ۔ شاہ جہان کو اس حادثہ کا بے حد رنج ہوا ۔

بادشاہ باپ ہوتے ہوئے شاہ جہان نے بیٹی کی تیمارداری ایک شفیق ماں کی طرح کی وہ رات رات بھر جہان آرا کے پاس بیٹھا جاگتا رہتا اور رو رو کر خدا سے جہان آرا کی صحت یابی کی دعائیں مانگتا ۔ صبح ہوتی تو ایک ہزار اشرفیاں غریبوں میں تقسیم کرتا ۔ شاہی حکیموں نے علاج کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی لیکن جہان آرا کو پوری صحت نہ ہو سکی ۔ آخر سورت کے ڈاکٹر باؤٹن کو بلایا گیا ۔ باؤٹن کے علاج سے جہان آرا بالکل اچھی ہو گئی ۔ بادشاہ نے خوش ہو کر ڈاکٹر سے پوچھا :۔

تم کیا چاہتے ہو ؟

ڈاکٹر باؤٹن نے کہا ۔ وہ اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا ۔ لیکن اپنی قوم کے لئے ملک میں بغیر محصول سامان درآمد کرنے کی اجازت چاہتا ہے

بادشاہ نے بخوشی باؤٹن کو یہ اجازت دے دی ۔

جہان آرا نے شادی نہیں کی ۔ تمام عمر خاندان اور رعایا کی خدمت کرنے یا لکھنے پڑھنے میں بتا دی ۔ وہ روزہ نماز کی پابند اور بڑی عبادت گزار تھی ۔ تصوّف سے اسے خاص لگاؤ تھا ۔ حق کی تلاش نے اُسے خواہشات کی منزلوں سے اونچا کر دیا تھا ۔ اس کا دلچسپ مشغلہ اپنی جیب سے غریب لڑکیوں کی شادیاں کرانا تھا ۔ اپنا گھر سُونا رکھ کر دوسروں کے گھر بسانے میں اس کے من کو سُکھ ملتا تھا ۔

جہان آرا تیاگ اور پریم کی دیوی تھی اپنی ماں ممتاز محل سے لے کر اورنگ زیب کی شہنشاہی تک سینکڑوں گھر اس نے بسائے ۔ عوام ہی نہیں خود اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ محمد شجاع بہادر کی شادی بھی جہان آرا نے اپنے خرچ سے رچائی ۔

جیون کا بناؤ اس کی فطرت تھا ۔ جہان آرا کو خوبصورت عمارتیں بنوانے کا بھی بڑا ذوق تھا ۔ یہ ذوق اسے اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا ۔ اس نے بہت سی عمارتیں بنوائیں ۔ لیکن زمانے کی کروٹوں نے چند کے علاوہ سب کو مٹا دیا ۔ کچھ جو باقی ہیں ان میں آگرہ کی جامع مسجد خاص طور پر ذکر کے قابل ہے ۔ اس مسجد کے بننے کے بعد شاہ جہان نے اس کے دیکھنے کی آرزو کی ۔ شاہ جہان خود بھی فنِ تعمیر کا ذوق رکھتا تھا ۔ چنانچہ مسجد کو دیکھ کر اس نے جہان آرا کی فیّاضی اور اس کے جمالیاتی ذوق کی بڑی داد دی ۔

دلّی کا وہ باغ جو ملکہ کے باغ کے نام سے مشہور ہے جہان آرا بیگم ہی کا بنوایا ہوا ہے ۔ جہان آرا کے زمانے میں یہ باغ "بیگم صاحب" کے باغ کے نام سے مشہور تھا ۔ اس باغ میں ہر قسم کے پھل دار درخت

تھے اور اپنی خوبصورتی میں آپ اپنی مثال تھا۔ اس باغ کے پہلو میں اس نے ایک سرائے بھی بنوائی تھی۔ یہ بہت بڑی تھی۔ اس سرائے میں کئی منزلیں اور ہال تھے۔ یہ تاجروں، سیاحوں، سفیروں کے لئے مخصوص تھی۔ اس سرائے میں عربوں، تاتاریوں، ایرانیوں اور دوسری قوموں کے لوگوں کے لئے الگ الگ حصّے تھے۔ ہر حصے میں قوموں کے مزاج و تمدن کے مطابق رہنے اور کھانے کے انتظامات تھے اور یہ سب جہان آراء کی جیب خاص سے ہوتے تھے۔

مشہور فرانسیسی مؤرخ برنیر نے بڑی حسرت سے اس سرائے کے بارے میں لکھا ہے

"کاش پیرس میں بھی ایسی ہی خوب صورت ایک دو عمارتیں ہوتیں"

دلّی اور کشمیر کے راستے میں بھی جہان آرا نے مسافروں کے آرام کی خاطر کئی سرائیں تعمیر کرائیں۔ نہ جانے زمانہ انہیں مٹا کر کہاں لے گیا۔ اجمیر شریف کی درگاہ میں بیگمی دالان آج بھی جہان آرا کی فیاضی، خوش اعتقادی اور ذوق کی یادگار ہے۔

ان تمام اشغال کے ساتھ ساتھ وہ ایک زبردست شاعرہ اور مصنف بھی تھی۔ اس نے ۲۶ برس کی ہی عمر میں "مونس الارواح" (خواجہ معین الدین چشتی رح کی زندگی کے حالات) فارسی میں لکھ کر شہرت حاصل کی۔

جہان آراء صرف شاعرہ ہی نہیں شاعر نواز بھی تھی۔ وہ شاعروں کا بڑا احترام کرتی۔ اس نے بعض اشعار کی داد میں شاعروں کے منہ موتیوں سے بھر دئے۔

گو جہان آرا اک شہنشاہ کی بیٹی تھی لیکن اس کے سینے میں فقیر کا دل دھڑکتا تھا۔ اس کا انتقال تقریباً ۷۰ برس کی عمر میں ہوا۔ اس کے بھائی شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے آخری مراسم نہایت تزک و احتشام سے ادا کئے۔

وہ شہزادی تھی لیکن اس نے مرنے کے بعد کسی عظیم الشان مقبرہ میں موت کی نیند سونا پسند نہیں کیا بلکہ حضرت نظام الدین اولیا دہلی کے قدموں میں پڑ رہی۔ سلطان جی میں اس کی قبر پر خود اس کا ایک شعر کندہ ہے جو ابدالآباد تک اس کی بلند و پاکیزہ سیرت کی گواہی دیتا رہیگا ؎

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزارِ مرا
کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

برج لال جگی رعنا

زندگی کا چکّر

شب کی تاریکی میں سورج ڈوب کر   پھر اُبھر آتا ہے ہنگامِ سحر
چاند تارے صبحدم پڑتے ہیں ماند   شب کو پھر لگتے ہیں ان میں چار چاند
سر کٹا کر پھولتی پھلتی ہے شاخ   پھر ہری ہوتی ہے جب جلتی ہے شاخ
خاک میں ملتا ہے جب دانہ کوئی   پھر جنم لیتا ہے گُل خانہ کوئی
گُل خزاں کی رُت میں مرجھاتے بھی ہیں   پھر بہار آتے ہی کھِل جاتے بھی ہیں

زندگی چکّر ہے اک چلتا ہوا
قالبِ ایّام میں ڈھلتا ہوا

وقت اور موسم سے ہو کر بے نیاز   آدم و عالم سے ہو کر بے نیاز
دم بدم بڑھتی ہے آگے زندگی   اوج و پستی کو برابر روندتی
چاہتی ہے ہر گھڑی اک انقلاب   چاہے رحمت ہو وہ چاہے ہو عذاب
اس کی رگ رگ میں تغیر کا ہے خوں   اس کا جوہر جوششِ عقل و جنوں
اس کا نصب العین پیہم ارتقا   اس کی ہے تخریب تعمیر آشنا
عاشقوں کے قلبِ مضطر کی طرح   میکدے کے جام و ساغر کی طرح
اس کی فطرت میں رچا ہے اضطراب   اس کی قسمت میں ہے گردش بے حساب
یہ نہیں رکھتی کبھی گن گن کے پاؤں   ہیں برابر اس کے آگے دھوپ چھاؤں
اس کے ہاتھوں میں ہے جنت کی بہار   اس کی سانسوں میں ہیں دوزخ کے شرار
اس کی ٹھوکر سے عیاں شام و سحر   اس کے پہلو میں مقامِ خیر و شر
اس کی نظروں میں مکان و لامکاں   اس کے دل میں فصلِ گل فصلِ خزاں

آب و گِل کی قید میں آزاد ہے
اک حسیں مجموعۂ اضداد ہے

نور و ظلمت عیش و غم کیف و خمار   شعلہ و شبنم۔ خزان و نو بہار
ہوش و مستی۔ نغمہ و شورِ فغاں   مرگ و ہستی کی طلسم آرائیاں

زندگی کی مختلف لڑیاں ہیں یہ
ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں یہ

ڈاکٹر عشرت حسن انور

فلسفہ

فلسفہ کے متعلق بعض لوگوں میں عجیب عجیب خیالات مشہور ہیں۔ کوئی اس کو حماقت سے تعبیر کرتا ہے، کوئی اس کو لایعنی اور بے معنی بحث بتاتا ہے، فلسفہ کے خلاف عام مخالفت کے علاوہ اور کئی محاذ بھی ہیں۔ مثلاً سائنس، مذہب اور کسی حد تک بعض عام سیاسی نظریات بھی اس کی مخالفت کے درپئے رہے ہیں۔ یہ تمام مخالفت بہت حد تک کم نگاہی اور کم فہمی کی بنا پر رہی ہے اور کسی حد تک تعصب اور بدگمانی کی بنا پر۔

فلسفہ آخر ہے کیا اور اس مخالفت اور مخاصمت کی خاص وجہ کیا ہے؟

فلسفہ کی تعریف کئی طرح سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہر ایک تعریف دوسری تعریفوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فلسفہ غور و فکر کرنے کا ایک دوسرا نام ہے۔ ہر ایک انسان بحیثیت انسان کے غور و فکر کرنے پر مجبور رہے۔ یہی قوتِ فکر انسان کو دوسرے حیوانات سے ممیز کرتی ہے۔ غور و فکر کرنا ہر ایک انسان کی فطرت میں ہے۔ اس قدرتی فکری صلاحیت کی رو سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر ایک انسان بقدر استعداد فلسفی کہلائے جانے کا مستحق ضرور ہے۔ لیکن غور و فکر کرنے کے بھی ڈھنگ اور سلیقے ہیں۔ چنانچہ بے ڈھنگے طریقے کو چھوڑ کر ڈھنگ اور سلیقہ کے ساتھ غور و فکر کرنا ہی فلسفہ ہے۔ یہ انسان کی فکری قوتوں کو اجاگر کرنے کا نام ہے۔ یہ انسان کی فکری صلاحیتوں میں فروغ اور تنظیم پیدا کرنے کے مترادف ہے۔

لیکن یہ کام تو ہر ایک علم و فن انجام دیتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے، کہ تاریخ یا سیاسیات یا معاشیات، طبیعات یا حیوانیات یا حساب سے فکرِ انسانی میں فروغ یا نظم نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اپنی جگہ پر درست ہے کہ تمام علوم و فنون اپنی اپنی وسعت کے مطابق انسانی عقل و فکر میں تنظیم اور ترقی کا موجب ہوتے ہیں۔ لیکن فلسفہ کے مقابلہ میں ان تمام علوم و فنون کا فکر و تعقل میں ترقی کا موجب ہونا بلا واسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ ہے۔ اس کے برعکس فلسفہ کا موضوع خود فکرِ انسانی ہے، اور اس کا حوصلہ ہی یہ ہے۔ کہ انسانی عقل و فکر کو جلا دے کر اس کو منظم، مکمل اور منقح بنا دے۔ چنانچہ فلسفہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ کس طرح غور و فکر کیا جائے۔ یا بالفاظِ دیگر یہ ایک نظامِ فکر و تعقل ہے۔ لیکن ابھی یہ کہا جا چکا ہے کہ ہر ایک انسان فطری طور پر غور و فکر کی طرف مائل ہے۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان بذاتہٖ غور و فکر کا حامل ہے تو پھر بھلا فلسفہ کی کیا ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان فی نفسہٖ غور و فکر کی طرف مائل ہے، لیکن ہر ایک انسان اس سے واقف نہیں، کہ کن بنیادی اصولوں کے تحت اس کا سوچ سچا، مستند اور مکمل اور منظم ہو سکتا ہے۔ غور و فکر کرنا تو حقیقتاً ہر ایک جانتا ہے اور ہر ایک شخص اپنے اپنے حلقہ میں غور و فکر کرتا بھی ہے۔ لیکن صحیح غور و فکر کرنے کے جو شرائط یا جو اصول اُن سے متعلق ہیں اُن سے عام طور پر عام لوگ بے خبر ہیں، اور بے خبر رہتے ہیں۔ اسی خیال کے تحت بعض اصحاب کا خیال ہے کہ "فلسفہ ایک غیر معمولی کاوشِ فکر کا دوسرا نام ہے"۔ فلسفی کا یہ کام ہے کہ وہ سوچے کہ حقائق کو کس طرح سوچے اور اس سوچنے میں سوچنے کی تمام شرائط کو بحسن و خوبی بجا لائے۔

اب یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید سوچنا نہ سوچنا خود اختیاری چیز ہے، اور جب ہمارا جی چاہے ہم غور و فکر اختیار کریں، اور جب جی چاہے اس سے باز رہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے، ہم جو اشرف المخلوقات ہیں اپنی خلقت سے مجبور ہیں کہ کائناتِ عالم اور اس کی جزئیات پر غور و فکر کریں اور حقائقِ عالم کو سمجھنے کی کوشش برابر کرتے رہیں۔ ہاں اس قدر اختیار ضرور ہے کہ ہم سرسری خیالات ہی پر قناعت کر لیں، یا اپنے خیالات کو منظم اور مستند اور روشن تر بنانے کی سعی کرتے رہیں۔ ہر ایک سلیم الطبع انسان یہ چاہے گا،

کہ اس کی فکر میں ہم آہنگی، درستی، نظم اور ضبط پیدا ہو سکے۔ تاکہ اس کی قوتِ پرواز اور بھی بلند ہو سکے۔ کوئی بھی سمجھ دار انسان یہ نہ چاہے گا کہ غور و فکر کیا جائے۔ مگر اس طرح کہ اس میں کوئی رنگ ڈھنگ اور طور طریقہ نہ ہو۔ غور و فکر میں اس طور طریقہ کو پیدا کرنا ہی فلسفہ ہے۔ اس تعریف کی رُو سے تمام علوم فلسفہ کے محتاج ہیں۔ چونکہ بغیر نظامِ فکر کو درست کئے ہوئے کسی علم یا فن کی بنیاد مضبوط نہیں ہو سکتی۔

اب ہر ایک علم اپنی اپنی جگہ کائنات کے کسی نہ کسی جزو کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھنے کے درپئے ہے۔ مثلاً طبیعات صرف مادہ کی کُنہ کو سمجھنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی حوصلہ نہیں۔ اسی طرح علم حیوانات صرف حیوانات تک محدود ہے، اس سے آگے قدم نہیں اُٹھا سکتی۔ اسی طرح دیگر علوم کا حال ہے۔ اس سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ تمام علوم و فنون ایک مخصوص تحقیقات تک ہی محدود ہیں۔ اور صرف ایک ہی آدھ حقیقت کو سمجھنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں، اگر طبیعات صرف مادّہ سے متعلق ہے تو نفسیات صرف احساسات، جذبات سے تعلق ہے۔ اپنی اپنی حدود میں رہ کر یہ تمام علوم و فنون اپنے متعلقہ موضوعات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ متعلقہ موضوعات کی حدود سے باہر قدم نکالنا ان کے لئے نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ فلسفہ دیگر علوم کے برعکس کائنات کے کسی جزو یا شعبہ سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا حوصلہ کائنات کل ہی کی اصلیت کو سمجھنا ہے۔ چنانچہ اس کا موضوع عین حقیقت ہے، کائنات کے کسی جزو یا شعبہ سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت فی نفسہٖ کی تلاش میں ہے۔ یہ کائناتِ عالم کے تمام رموز کے انکشاف کے درپے ہے۔ اس سعی میں اس کا سب سے بڑا ذریعہ تعقل اور تفکر ہے۔

یہاں پر پہنچ کر تمام دیگر علوم پر اس کی فوقیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اولاً یہ کہ تمام دیگر علوم بھی تعقل اور تفکر کے محتاج ہیں۔ مگر تعقل تفکر اور تبحر علمی کی جو شرائط یا جو بلندیاں ہیں اُن سے دوسرے علوم کے پرستار اکثر ناآشنا رہتے ہیں۔ ثانیاً اُن کا زاویۂ نگاہ جزوی حقیقت کو سمجھنے تک محدود ہے۔ لیکن ممکن ہے محدود حلقہ میں رہ کر پوری حقیقت کا انکشاف نہ ہو سکتا ہو، اس لئے ضرورت ہے کہ فلسفہ کی روشنی ڈھونڈی جائے۔ تاکہ کُل کی روشنی میں جزو پر نظر ڈالی جا سکے۔ بہت امکان ہے کہ اس سعی کے بغیر ہمارے تمام محدود علوم کی کوشش سعیِ لاحاصل رہے۔ اور عین حقیقت کے انکشاف سے قاصر رہے۔ ثالثاً ہمارے تمام علوم کے نتائج اپنی اپنی جگہ پر حتمی نہیں کہے جا سکتے۔ جب تک کہ فلسفہ کی رو سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ تمام نتائج اور فیصلے آپس میں متضاد اور منافی نہیں ہیں۔ اگر کسی علم کے نتائج کسی دوسرے علم کے فیصلوں سے ٹکرا رہے ہیں تو دیکھنا ہو گا کہ آخر وجہ تضاد کیا ہے، اور اس تضاد کو کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے۔ یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ کسی بلند تر منظر سے حقیقت کو دیکھا جائے۔ اس بلند تر منظر پر پہنچنے کی کوشش فلسفہ ہے۔ یہ تمام علوم کے آپس کے ظاہری تضاد اور تقابل کو ایک بلند تر زاویۂ نگاہ کی اعانت سے دور کرنے کا ضامن ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ طبیعات کی رُو سے تمام حقیقت مادّی ہے نفسیات کے خیال سے عین حقیقت نفس یا نفسانی واردات، احساسات اور خیالات ہی اصل حقیقت کہے جا سکتے ہیں۔ دونوں علوم میں بُعد المشرقین ہے۔ یہ مخالفت اور منافرت کس طرح دُور کی جا سکتی ہے، آخر دونوں بیانات بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتے، ان میں سے کس کو قبول کیا جائے، اور کس کو رد کیا جائے۔ یا اگر یہ نہیں تو ان دونوں کو کس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ بنایا جا سکتا ہے۔

تقریباً ساٹھ ستّر سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ حقیقت کی تلاش میں اگر کہیں ایک تجربہ کچھ کہتا ہو اور دوسرا تجربہ کچھ اور، تو ان دونوں میں سے صرف ایک ہی قابلِ قبول ہو سکتا ہے اور ایک کو رد کرنا لازم ہو گا۔ یہ خیال اپنی جگہ پر کسی حد تک صحیح تھا، اور قانون تضاد (Law of Contradiction) پر اس خیال کی بنیاد تھی۔ اس خیال کے اثرات کے تحت میں سائنس، مذہب اور فلسفہ سب ایک دوسرے کے دست بگریباں تھے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان سب کے آپس کے مناقشے اور ان کی آپس کی اجنبیت اور منافرت کو کس طرح دُور کیا جائے۔ مذہب تمامتر فلسفہ کے خلاف تھا اور اُس کے تمام بیانات اور انکشافات فلسفہ کا دم توڑتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اسی طرح سائنس مذہب کے خلاف تھی اور سائنس سے مذہب کے کسی دعوے کی تائید نہ ہوتی تھی۔ یہی نہیں، سائنس نے فلسفہ کے خلاف بھی احتجاج بلند کر رکھا تھا۔ شروع شروع میں جب مذہب کا زور تھا مذہب ہی کو حقیقت کی کسوٹی سمجھا جاتا تھا۔ فلسفہ کو ٹھکرا دیا جاتا تھا۔ سقراط کو کسی حد تک اسی وجہ سے زہر

پینا پڑا۔ اس کے خلاف یہ جرم تھا کہ وہ جوانوں کے خیالات خراب کرتا ہے اور یونانی دیوتاؤں کی عزت نہیں کرتا۔ برونو کو بھی اسی وجہ سے نذرِ آتش کیا گیا۔ لوگوں کے خیال میں وہ مذہب کے مخالفین میں سے تھا۔

سائنس نے بھی مذہب سے ٹکر لی، اور کچھ دنوں کے لئے سائنس کے انکشافات اور تجربات ہی کو حق نما اور حقیقت کا آئینہ دار سمجھا گیا۔ لیکن طرفین ایک دوسرے سے خائف رہے۔ اور جب کبھی ہو سکا ایک دوسرے کے درپئے آزار ہوئے۔ یہ حالت کسی طرح بھی اطمینان بخش نہ تھی اور انسان حقیقت کی تلاش میں برابر سرگرداں رہا۔ مخصوص طور پر فلسفیوں نے ازسرِ نو غور کرنا شروع کیا، کہ یقینی طور پر کہیں کوئی بنیادی غلطی ہے۔ جس کی وجہ سے مخالفین کو طعنہ تشنہ کا موقعہ مل رہا ہے۔ اس غور و خوض کا بہت جلد ہی ایک نتیجہ نکلا۔ فلسفیوں کو محسوس ہوا کہ فلسفہ سائنس کے نتائج کو ٹھکرا کر آگے نہیں بڑھ سکتا، سائنس کے تمام نتائج کو جمع کر لینے کے بعد بھی فلسفہ کی ضرورت باقی رہتی ہے، اور اس حالت میں اس کی ضرورت کسی قدر زیادہ شدید محسوس ہوتی ہے۔ سائنس کے ان تمام تجربات، نظریات اور انکشافات پر ازسرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے اور یہ اس طرح کہ سائنس کی جزوی تحقیقات کے بعد یہ بھی غور کرنا لازم ہے کہ جزوی حیثیت سے نہیں بلکہ من کلہ سائنس کے یہ آخری بیانات کس غائت حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس سوال کے اٹھانے سے سائنس کی جو مذہب سے اجنبیت تھی وہ بھی کسی حد تک کم ہو گئی۔

خوش قسمتی سے اسی عرصہ میں کچھ اس قسم کے سائنس داں گزرے جو اپنی شعبائی تنگ نظری سے تنگ آ گئے تھے اور انھوں نے دیگر علوم و فنون کی تحقیقات کی روشنی میں اپنے نظریات کو پرکھنا اور جانچنا چاہا، یہی نہیں انھوں نے اس جانچ پڑتال میں فلسفہ سے بھی امداد چاہی اور فلسفہ کو طریقۂ کار بنا کر جزوی تجربات پر قناعت نہ کی۔ بلکہ ان تجربات سے اس حقیقت کل کا تصور کرنا چاہا جو فلسفہ کا عین مقصود ہے۔ اس سلسلہ میں برگسان۔ رسل۔ وائٹ ہیڈ، آئینس ٹین کے نام انھیں اصحاب کی فہرست سے متعلق ہیں جنھوں نے سائنس کی تحقیقات اور نظریات ہی کا رُخ نہیں بدل دیا، بلکہ فلسفے کی بھی کایا پلٹ دی۔

نشتر سندیلوی

دردوتعب

(۱)

دردِ محبت ضبطِ تعب   اشک بہ چشم و مُہر بہ لب

(۲)

شکوے زباں تک آئے جب   ضبط نے بڑھ کر سی ڈالے لب

(۳)

کٹ نہیں چکتی ہجر کی شب   ہونا ہے کیا آخر، یا رب

(۴)

غم کی ہوا سے بُجھ ہی گیا   دل تھا جو شمعِ بزمِ طرب

(۵)

لاکھ جنونِ عشق سہی   ترکِ ادب پھر ترکِ ادب

(۶)

دل پہ نہ پوچھو کیا گزری   ٹوٹا ہوا سا ساغر ہے اب

(۷)

اشک ٹپک کر کچھ نہ رہے   خاک میں مل گئے موتی سب

(۸)

دل سے تغافل دانستہ   یہ بھی ہے نشانِ حُسنِ طلب

(۹)

گزرا زمانہ اے نشتر   بھولا ہوا سا خواب ہے اب

کوثر چاندپوری

اطبّائے عہدِ مغلیہ کی مُلکی و سیاسی خدمات

یوں تو ہمیشہ ہی اطبّا نے اپنے فنّی انہماک کے ساتھ ساتھ مُلکی اور سیاسی خدمات میں بھی تھوڑا بہت حصّہ لیا ہے لیکن سلاطینِ مغلیہ کے درباری طبیب اس سلسلے میں بہت ممتاز نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بابر سے لے کر آخری مغل تاجدار کے زمانہ تک مُلکی اور سیاسی مسائل میں حکومت کے ساتھ ہر موقعہ پر تعاون کیا ہے، اور اپنے وقت کا کوئی لمحہ بیکار نہیں جانے دیا۔ ایک طرف مریضوں کے علاج میں اپنی حذاقت، تجربہ کاری اور اعجازِ مسیحائی کے مظاہرے کرتے تھے، تو دوسری طرف میدانِ جنگ میں شجاعت اور مردانگی کے جوہر دکھاتے تھے۔ کہیں بادشاہوں کے درباروں میں سفارت کی اہم اور مشکل ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ جہاں اطبّا کی علمی، ادبی اور فنّی یادگاروں کو محفوظ رکھے گی وہاں اُن کی تمدنی اور ثقافتی روایات کے ساتھ سیاسی اور مُلکی مہمات کو بھی فراموش نہ کر سکے گی۔ جگہ جگہ تاریخ کے صفحات پر ایسے واقعات بکھرے پڑے ہیں جن سے اطبّا کے ان کارناموں پر روشنی پڑتی ہے جو وطن اور ملک کی خدمت کے سلسلے میں اُنھوں نے انجام دئے۔ اسی زمانے کے اطبّا کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک جماعت تو وہ تھی جو پزشکان کے زمرے میں محکمۂ طبابت کے تحت اپنی فنّی صلاحیتوں سے عملی طور پر مریضوں کو مستفید کرتی تھی۔ دوسری جماعت وہ تھی جو بڑے بڑے مناصب اور فوجی و مُلکی عہدوں پر ممتاز تھی اور اس کے باوجود فنّی کاموں میں مشغول رہتی تھی۔ یہاں دوسری جماعت ہی کا تذکرہ مقصود ہے۔ جب بابر نے ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیادیں مضبوط کر لیں اور آگرہ کو دارالسلطنت کی حیثیت سے امتیاز حاصل ہوا تو بابر کا وزیر اور معتمد ایک باکمال طبیب ہی تھا۔ اس کا نام میر نظام الدین علی خلیفہ تھا، اور اپنے مختلف اوصاف کے باعث بابر کی نگاہ میں نہایت معزز تھا۔ جس وقت ہمایوں کو بدخشاں سے ہندوستان بُلایا گیا ہے تو بابر اس کی جگہ میر خلیفہ ہی کو بھیجنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس نے روانگی میں تاخیر کی تو مجبوراً مرزا سلیمان کو بھیجا گیا۔

میر خلیفہ کا ملک میں اس قدر اقتدار تھا کہ وہ حکومتِ مغلیہ میں ایک زبردست انقلاب کا بانی قرار دیا جاتا اگر وہ شخص جسے اس انقلاب کا ہیرو بنایا جا رہا تھا، اپنی بے عقلی کا اظہار نہ کر دیتا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ بابر نے آخری وقت میں ہمایوں کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ لیکن میر خلیفہ ہمایوں سے خوش نہ تھا، اور وہ بابر کے داماد مہدی خواجہ کو اورنگِ حکومت پر بٹھانا چاہتا تھا۔ بدقسمتی سے مہدی خواجہ آپ ہی میر خلیفہ کی ہمدردی سے محروم ہو گیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ ہمایوں کی جگہ اس کا نام فرمانروائے ہندوستان کی حیثیت سے تاریخ کے صفحات پر چمکتا ہوا نظر آتا۔ مہدی خواجہ میں ملک داری کی اہلیت نہ تھی۔ ایک روز جب میر خلیفہ اُس کے خیمے سے اُٹھ کر گیا تو اُس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ انشاء اللہ تیری کھال ضرور کھنچواؤں گا۔ محمد مقیم ہروی نے یہ الفاظ میر خلیفہ تک پہنچا دئے، اور اُس نے اپنا

---

[1] اس مضمون کی ترتیب کے وقت حسبِ ذیل کتابیں پیشِ نظر تھیں۔ تاریخ فرشتہ ہر دو جلد۔ مآثر الامراء۔ مآثر رحیمی۔ مآثرِ عالمگیری۔ بادشاہ نامہ۔ عملِ صالح۔ سیر المتاخرین۔ آئینِ اکبری۔ اکبرنامہ۔ طبقاتِ اکبری۔ شاہ عالم نامہ۔ رقعاتِ ابوالفضل۔ سروِ آزاد۔ خزانۂ عامرہ۔ تزکِ جہانگیری۔ اقبال نامہ۔ تاریخ ہندوستان۔ دربارِ اکبری۔ اطبائے عہدِ مغلیہ مصنفہ کوثر چاندپوری۔

ارادہ تبدیل کر دیا۔ اُسی وقت ہمایوں کو بُلانے کا انتظام کیا گیا اور جہدی خواجہ پر دربار بند ہو گیا۔ بابر کے مرتے ہی میر نظام الدین علی خلیفہ نے درباری امراء کی امداد سے ہمایوں کو تخت پر بیٹھا دیا۔

میر خلیفہ بابر کے زمانہ سے ہمایوں کے ابتدائی دَور تک برسرِ کار رہا۔ اس کے بعد تاریخ یک بہ یک خاموش ہو جاتی ہے، اور پتہ نہیں چلتا کہ میر خلیفہ کا کیا حشر ہوا؟

اکبر کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک خاص ورق ہے۔ اسی عہد میں حکومتِ مغلیہ کی جڑیں سرزمینِ ہند میں بہت گہرائی تک گئیں اور ملک کے عوام میں نظامِ حکومت کو زبردست ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ اگر عہدِ اکبری کا تجزیہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ اس کے نقش و نگار کو چمکانے اور ان میں آب و رنگ بھرنے میں اطبّار کا بہت بڑا حصّہ ہے اُنھوں نے تمدّن اور معاشرت کو اُبھارا۔ تاریخی اور ثقافتی روایات کو بلند کیا۔ ملکی۔ مالی۔ سیاسی اور فوجی خدمات میں سرگرمی اور جانفروشی کے ساتھ مردانہ تعاون کرکے تاریخ میں اپنے لئے ایک خاص جگہ محفوظ کر لی۔ ان اطبّار کی خدمت کافی طویل ہے۔ جو اس دَور میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ میں بہت اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کرتا ہوں۔

حکیم ابو الفتح گیلانی سنہ ۹۸۳ھ میں ہندوستان آیا تھا۔ سنہ ۹۸۸ھ میں اس کو صوبۂ بنگال کی صدارت اور امینی پر مقرر کیا گیا۔ اگرچہ اس کا منصب ایک ہزاری ہی تھا۔ لیکن اعزاز کے اعتبار سے وکالت اور وزارت سے زیادہ تھا۔ ابوالفتح فوجی مہمات میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن اُس نے اپنی بیدار مغزی سے اکبر کو مذہب کے گورکھ دھندوں سے نکال کر ایک ایسا آئینِ حکومت بنانے پر آمادہ کر دیا جو ہندوستان کے لئے بہت زیادہ موزوں تھا۔ اگر اکبر کے جانشین بھی اسی کے بنائے ہوئے راستہ پر چلتے رہتے تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

ابوالفتح کے منجھلے بھائی حکیم ہمام نے بھی انتظامِ مملکت میں دانشمندانہ پارٹ ادا کیا۔ راجہ ٹوڈرمل۔ نظام الدین بخشی۔ میر فتح اللہ شیرازی اور علامہ فیضی کو ملکی معاملات میں بہت زیادہ دخل تھا۔ دفاتر کے انتظامات اور قواعد و ضوابط کی ترتیب اُنھیں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن ابوالفتح اور حکیم ہمام بھی اسی جماعت کے خاص عناصر تھے فیضی کی انشاء میں حکیم ہمام کے نام بہت سے خطوط ہیں۔ اُن کے دیکھنے سے ہمام کی شخصیت اور اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

سنہ ۹۹۳ھ میں حکیم ہمام کو عبداللہ خاں اوزبک کے پاس سفیر کی حیثیت سے توران بھی بھیجا گیا تھا۔

میر فتح اللہ شیرازی کو اکبر نے ابراہیم عادل شاہ سے نہایت آرزو کے ساتھ مانگا تھا۔ سنہ ۹۹۰ھ میں فتح اللہ فتحپور پہنچا۔ اکبر نے اُسے وزارت کے کاموں میں راجہ ٹوڈرمل کا شریک کر دیا۔ فتح اللہ نے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کئے۔

فتح اللہ بہت بڑا عالم تھا اور اکثر علوم میں اُسے زبردست مہارت تھی۔ ہندوستان کی تاریخ پر اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو مختلف علوم کا مدرسہ بنا دیا اور جن علوم کو شیراز سے اپنے سینہ میں بند کرکے لایا تھا۔ اُنھیں ہندوستانی عوام کے سامنے کھول کر پیش کر دیا۔ اکثر اطبّار نے اس سے استفادہ کیا۔

عین الملک شیرازی دربارِ اکبری کا ممتاز طبیب تھا۔ اسے کحالی اور جراحی میں کمال حاصل تھا۔ اسی اعتبار سے "عین الملک" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ فنّی کمالات کے ساتھ ہی عین الملک انتظامِ مملکت اور فوجی خدمات کی بہترین صلاحیت رکھتا تھا جس ہاتھ میں نشتر لے کر وہ آنکھ کے باریک اور نازک پردوں کا اپریشن کرتا تھا، اُسی ہاتھ میں جب تلوار سنبھال لیتا تو میدانِ جنگ کو زیر و زبر کر دیتا۔

عین الملک کی ملکی اور فوجی خدمات نہایت شاندار ہیں۔ سنہ ۹۸۰ھ جلوس میں اکبر نے اُسے چنگیز خاں کے پاس احمد آباد بھیجا۔ اس مہم میں عین الملک کو پوری کامیابی ہوئی اور وہ چنگیز خاں سے پیشکش لے کر آگرہ آ گیا۔ سنہ ۹۸۱ھ میں اُسے اعتماد خاں گجراتی کے پاس خط لے کر بھیجا گیا اور عین الملک اعتماد خاں کو بادشاہ کی خدمت میں لے آیا۔ عادل خاں حاکم بیجاپور کی رہنمائی کے سلسلے میں بھی عین الملک نے قیمتی خدمات انجام دیں۔ سنہ ۹۸۲ھ میں دکن سے واپسی پر اس کو سنبھل کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ فوجداری کے زمانے میں عین الملک نے نہایت دانشمندی اور بہادری کا ثبوت دیا اور بریلی کے قلعے میں ایک مضبوط مورچہ بنا کر عرب بہادر اور نیابت خاں کی

شورش کا مقابلہ کیا۔ ۹۸۶ھ میں بنگالہ کی صدارت پر ممتاز ہوا۔ ۹۹۱ھ میں آگرہ کا بخشی ہوگیا۔ اس کے بعد خانِ اعظم کے ساتھ دکن گیا۔ ان ملکی اور فوجی سرگرمیوں میں عین الملک نے اپنے فنی تقاضوں کو کبھی پس پشت نہیں ڈالا اور اہم معالجات میں ہمیشہ اُس نے اپنی حذاقت کے جوہر دکھائے۔

حکیم علی گیلانی اکثر علوم بالخصوص طب اور ریاضی کا ماہر تھا۔ عہد اکبری کے اطبا میں اپنے تجربہ اور حذاقت کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ مشہور ہوا۔ فن کی بے انتہا مصروفیتوں کے باوجود حکیم علی نے بھی سیاسی خدمات میں حصّہ لیا۔ اس کو سفیر کی حیثیت سے علی عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور کے پاس بھیجا گیا تھا۔ بیجاپور میں اس کا شایانِ شان استقبال ہوا۔ علی عادل شاہ پیشکش دے کر اُسے واپس کرنا ہی چاہتا تھا کہ ۹۹۵ھ میں دفعتہً اس کا انتقال ہوگیا۔

ابو الفیض فیضی نے اگرچہ کوئی ملکی یا مالی عہدہ قبول نہیں کیا تھا، لیکن اکبر کو فیضی اور اُس کے بھائی ابو الفضل پر بے حد اعتماد تھا۔ مہماتِ سلطنت میں وہ ان دونوں بھائیوں کا مشورہ ضرور لیا کرتا تھا اور جزوی معاملات میں بھی فیضی کی رائے شریک رہتی تھی۔ اکبر کی حکومت سے مذہبی عناصر کو الگ کرنے میں فیضی کی فطری آزاد خیالی اور وسیع النظری کو بہت بڑا دخل ہے۔ جب تک فیضی کی رسائی دربار میں نہ ہوئی تھی اکبر میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ اپنے ماحول سے نبرد آزما ہو سکے۔ اور قدامت پرستی کے ان دھندلکوں سے باہر نکل آئے۔ جو اس کے گرد چھائے ہوئے تھے۔ فیضی کے آتے ہی آزادی کی شعاعیں ہر طرف پھیلنے لگیں، اور اکبر کا رنگ بالکل بدل گیا۔

اکبر کے عہد تک دفتروں میں عام طور پر بہت زیادہ ابتری تھی۔ کاغذات کی ترتیب کا کوئی اصول نہ تھا اور دفاتر میں بڑی بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ اکبر نے چھ آدمیوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جس نے بڑی کوشش سے کاغذات کی ترتیب وغیرہ کے اصول اور قوانین مُرتب کئے نیز حساب کے قواعد بنائے اور سلطنت کے تمام محاسبوں کو اُن کا پابند کر کے کام میں یکسانیت پیدا کی۔ اس کمیٹی میں ٹوڈرمل۔ فتح اللہ شیرازی، نظام الدین بخشی۔ حکیم ابو الفتح۔ حکیم ہمام اور فیضی شریک تھے۔ جن میں ٹوڈرمل اور نظام الدین بخشی کے علاوہ سب طبیب تھے۔ فیضی کا نام دوسرے نمبر پر تھا۔ فیضی نے صرف اکبر ہی کے مزاج پر اثر نہیں ڈالا بلکہ اس نے اس کے تینوں بیٹوں سلیم، مراد اور دانیال کی تربیت بھی کی۔ یہ تینوں شاہزادے اسی کے شاگرد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہانگیر کی حکومت میں اکبر کی سلطنت کے اکثر نقوش باقی رہے۔ فیضی اگرچہ منصب اور حکومت کی ذمّہ داریوں سے پرہیز کرتا رہا۔ پھر بھی وہ "ملک الشعراء" کے خطاب سے ممتاز ہوا۔

اکبر فیضی کی جاں نثاری اور دانشمندی کا معترف تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس میں ہر مشکل کام کو انجام دینے کی پوری صلاحیت ہے۔ چنانچہ ۹۹۹ھ میں اُسے راجی علی خاں حاکم خاندیس کے پاس سفیر کی حیثیت سے بھیجا گیا۔ دکن میں راجی علی خاں کی شخصیت بہت زیادہ اہم تھی اس کو اپنی تجربہ کاری، دانشمندی اور فوج کی کثرت کے باعث سلاطینِ دکن میں اُسے مخصوص امتیاز اور رسوخ حاصل تھا۔

فیضی کو راجی علی خاں کی سفارت پر تعینات کرتے وقت یہ بھی طے کر دیا گیا تھا کہ اس مہم سے فارغ ہو کر وہ ابن الدین کے ساتھ برہان الملک فرمانروائے احمد نگر کے پاس بھی جائے گا۔ چنانچہ ان دونوں سفارتوں کے فرائض نہایت عمدہ طریقہ پر انجام دے کر وہ تقریباً ڈیڑھ سال کچھ ماہ کے بعد ۱۰۰۱ھ میں واپس آگیا۔

جہاں تک راجی علی خاں کا تعلق ہے فیضی کی سفارت کو نہایت کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن برہان الملک اس سے زیادہ متاثر نہیں ہوا۔

جہانگیر کے دورِ حکومت میں مقرب خاں شیخ حسن ایک مشہور خاندانی سرجن تھا۔ وہ پانچ ہزاری منصب رکھتا تھا۔ گجرات اور بہار کا صوبہ دار بھی تھا۔ سورت کی مشہور بندرگاہ گجرات ہی کے صوبے میں تھی۔ اُسے صحیح معنی میں ہندوستان کا دروازہ کہا جا سکتا تھا۔

۱۶۰۸ء میں جب ہاکنس جیمس اوّل شاہ انگلستان کا خط لے کر ہندوستان کے ارادے سے سورت پہنچا ہے اُس وقت مقرب خاں ہی وہاں کا صوبہ دار تھا۔ مقرب خاں کی اس اصابت رائے کی آج بھی تعریف کی جائے گی کہ اُس نے انگریزوں کو ہندوستان میں تجارت کی اجازت دینے کی شدید مخالفت کی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ان کو تجارت کی اجازت دیدی گئی تو وہ ہندوستان پر قابض ہو جائیں گے۔ چنانچہ جہانگیر نے امتناعی فرمان جاری کر دیا، اور ۱۶۱۱ء میں ہاکنس مع اپنی بیوی کے ناکام واپس چلا گیا۔ بعد کے واقعات شاہد ہیں کہ مقرب خاں کا خیال

کس قدر صحیح تھا۔ اگر مقرب خاں کی رائے پر آئندہ بھی عمل کیا جاتا تو ملک کے پاؤں میں غلامی کی اُس بیڑی کا نشان نہ ہوتا جو مسلسل ڈیڑھ سو سال تک پڑی رہی۔

شاہجہاں کے زمانے میں حکیم ہمام کا بیٹا حکیم حاذق بہات نگی میں نمایاں نظر آتا ہے۔ شاہجہانی دور کے شروع ہی میں یہ امام قلی خان الیٰ توران کے پاس بطور سفیر بھیجا گیا۔ حکیم حاذق کے چھوٹے بھائی حکیم خوشحال کو شاہجہاں نے مسند نشین ہوتے ہی دکن کی فوج کا بخشی بنا دیا تھا۔ وہاں کی واقعہ نویسی بھی اسی کے سپرد تھی۔ خوشحال نے دکن کے مختلف معرکوں میں بھی بہادری کے جوہر دکھائے۔

۲ سنہ جلوس میں شاہجہاں نے حکیم جمالا بخشی کو ایک ہزاری منصب دے کر پنجاب کی صوبہ داری عطا کی۔ حکیم جمالا ایک مشہور طبی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ ۵ سنہ میں اس کو دیانت خاں کا خطاب اور صوبہ سرہند کی دیوانی و امینی کے عہدے پر سرفراز کیا گیا۔ شاہجہاں کے آخری زمانے تک حکیم جمالا مختلف صوبوں کی صوبہ داری پر مامور ہوتا رہا۔ آخر میں معزول کر کے شہزادہ مرادبخش کی دیوانی پر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اورنگزیب نے اس کو پھر سرکاری ملازمت میں لے کر داروغۂ داغ بنا دیا۔ اس کے بعد دیوانِ بیوتات کر دیا گیا تھا۔ عہدِ شاہجہانی میں وزیر خاں حکیم علم الدین ملکی و سیاسی مہمات کے سلسلے میں سب سے زیادہ ممتاز نظر آتا ہے۔ شروع میں یہ شاہجہاں کے لشکر کا منصف تھا۔ اس عہدے کی ذمہ داریوں کو اُس نے نہایت دیانت کے ساتھ پورا کیا۔ اور ہر موقعہ پر اپنی معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔ عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی شاہجہاں نے وزیر خاں کو پانچ ہزاری منصب اور علم و نقارہ مرحمت کیا۔ ۲ جلوس میں اس کو پنجاب کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ سات سال تک وہ اسی عہدے پر مامور رہا، اور اپنے متعلقہ فرائض کو نہایت عمدہ طریقہ پر انجام دیا۔ آخر میں وزیر خاں کو آگرہ کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا تھا۔

حکیم ضیاءالدین شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانے میں مختلف عہدوں پر مامور رہا۔ شاہجہاں نے اُسے توشک خانہ کا داروغہ مقرر کیا۔ پھر صوبہ احمدآباد کا دیوان بنا دیا گیا تھا۔ شاہجہاں کے عہد میں ضیاءالدین نے ڈیڑھ ہزاری منصب تک ترقی کر لی تھی۔ عالمگیر کے عہد میں یہ دیوان بیوتات تھا۔

اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں ایک اور مشہور طبیب اور شاعر یعنی مرزا محمد علی شیرازی نے بھی ایک معزز عہدہ دار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۱۰۰ھ میں اس کو نعمت خاں کا خطاب اور باورچی خانہ کی داروغگی کا عہدہ ملا۔ اورنگ زیب کے آخری دور میں محمد عالی جواہر خانہ کا داروغہ ہو گیا تھا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب اُس کے دونوں بیٹوں، محمد اعظم شاہ اور شاہ عالم میں مقابلہ ہوا تو عالی پہلے محمد اعظم شاہ کے دامن سے وابستہ رہا، اس کے مقتول ہو جانے پر شاہ عالم کے دربار میں آگیا۔ شاہ عالم نے اس کو دانشمند خاں کا خطاب بھی دیا تھا۔ یہی خطاب ان کے استاد شفیعائے یزدی کو شاہجہاں کی بارگاہ سے عطا ہوا تھا۔

اگرچہ شاہ عالم کے بعد بلکہ اس سے پہلے ہی سلطنتِ مغلیہ کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور اس کی شوکت و سطوت سرنگوں ہو گئی تھی پھر بھی جب تک یہ شمع جھلملاتی رہی اطبا مختلف ملکی اور مالی عہدوں پر ممتاز رہے، اور اپنی ان شاندار روایات کی حفاظت کرتے رہے۔ جن کی ابتدا بابر کے عہد میں ہوئی تھی، اور پھر رفتہ رفتہ اُن میں ترقی ہوتی رہی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اطبا کے ان کارناموں کا ہندوستان کی معاشرت، ثقافت، سیاست اور اس کے تمدن پر گہرا اور نمایاں اثر نہیں پڑا؟

راجیندر ناتھ شیدا

کامایِنی اور اس کی اہمیّت

ہندی شاعری کے دورِ جدید کی سب سے اہم طویل نظم "کامایِنی" ہے۔ اس کے خالق شری جے شنکر پرشاد نے اس نظم میں ہمعصر زندگی کے کئی اہم مسائل سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی محض حیاتِ انسانی سے متعلق اپنی نظر کی گہرائی سے بلند مرتبہ شاعر نہیں بن سکتا ہے۔ عمدہ شاعری کے لئے اظہار و بیان کی جاذبیت ایک بہت ضروری شرط ہے۔ کامایِنی کی عظمت درحقیقت فکر و اسلوب کے خوشگوار امتزاج ہی کی وجہ سے ہے۔ نظم ایک تمثیلی کہانی ہے۔ جس کا پلاٹ یوں سمجھئے۔

دیولوک کے مغرور اور خودغرض دیوتا دن رات عیش و عشرت میں محو رہتے تھے۔ چنانچہ قدرت نے اُنھیں سزا دینے کے لئے ایک زبردست طوفان برپا کیا۔ پانی کی خوفناک موجوں نے اور سب چیزوں کے ساتھ دیولوک کو بھی تباہ و برباد کر دیا۔ دیوتاؤں میں ایک مَنُو بچ رہا۔ یہ کسی کشتی پر طوفان کے تھپیڑے کھاتا پھر رہا تھا کہ یکایک ایک بڑی مچھلی قریب آئی جس سے ایک پرزور لہر پیدا ہوئی اور منو کی کشتی ہمالیہ کی ایک اونچی چوٹی سے آلگی۔

اس کے بعد پانی اُترنا شروع ہو گیا۔ مگر منو گہری فکر میں ڈوبا ہوا ایک چٹان پر بیٹھا تھا۔ اس تنہائی اور اُداسی کے عالم میں اُس کا دل کسی ساتھی کے لئے بےچین ہو اُٹھا۔ غم نے ہمدردی کو جنم دیا۔ آخر غم کی شدّت کم ہونے پر دل میں اُمید کی کرن پھوٹنے لگی۔ اُس نے سوچا ممکن ہے میری ہی طرح کوئی اور بھی بچ رہا ہو، اور وہ کسی وقت اِدھر آ نکلے۔ منو ضروری سامان اکٹھا کر کے ہَوَن کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک روز شردّھا وارد ہوئی۔ اُس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "میں گندھار دیس میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ فنونِ لطیفہ کا اکتساب میرا محبوب مشغلہ تھا۔ طوفان نے وہ شیرازہ منتشر کر دیا اور میں اکیلی رہ گئی۔ چنانچہ گھومتے پھرتے آج اِدھر آ نکلی ہوں"۔

اس طرح اُس نے منو کی پُرالم زندگی میں تمنّا کو ختم کر دیا۔ شردّھا درحقیقت منّو کی بےکیف زندگی کے لئے مُسرّت کا غیبی پیغام بن کر آئی۔

یکایک کہیں سے کام کی آواز فضا میں گونجی۔ اُس نے شردھا کو اپنی اور اپنی بیوی رَتی کی بیٹی بتاتے ہوئے کہا "اے منو! شردھا نے دُنیا میں محبت کا پیغام سنانے کے لئے جنم لیا ہے۔ اسی سے تمھیں حقیقی سکون حاصل ہوگا۔ اگر تم اُسے اپنانا چاہتے ہو تو اِس کے قابل بنو"۔ منّو دیولوک کے اپنے ساتھی کام سے واقف تھا۔ اُس نے آواز ہی سے کام کو پہچان لیا اور پوچھا "میں کس طرح شردھا کے قابل بن سکتا ہوں؟" — لیکن اب کام کی آواز بند ہو چکی تھی۔

منّو اور شردھا ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ ایک غار اُن کا گھر تھا۔ محبت کی آتشِ خاموش منّو کے دل کو اندر ہی اندر جلانے لگی۔ ایک روز شردھا کسی چوپائے کو پیار کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر منّو میں رشک کا جذبہ بیدار ہوا۔ اُس پر عشق کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ اُدھر شردھا بھی خود کو پوری طرح منّو کے حوالے کرنے کے لئے بےچین تھی۔ کہ تجالے آکر اُسے حیا شعاری اور جذبات پر قابو رکھنے کی ہدایت کی۔

منّو کرم یگیہ کرنے کا آرزومند تھا، لیکن کرائے کون؟ اتفاق سے دیویوں کے دو پروہت کِلاَت اور آکُلی بھی اس طوفان میں بچ رہے تھے؛ انھوں نے منّو کے ایک ایسے مویشی کو دیکھا جسے شردھا بہت پیار کرتی تھی۔ مویشی بہت تندرست تھا۔ وہ گھاس کھاتے کھاتے اُکتا گئے تھے۔ مویشی کو دیکھ کر دل مچل گیا۔ منّو کے پاس آئے۔ اُن سے مل کر اُس کا یگیہ کرنے کا ارادہ مستحکم ہو گیا۔ یگیہ ہوا، مویشی قربان ہوا، اور سوم رس (شراب) پیا گیا۔ اُدھر شردھا کا دل ٹوٹ گیا تھا، وہ یگیہ میں شریک نہ ہوئی اور شام کے وقت اپنے غار میں آ کر سو رہی۔ آج نشہ نے منّو میں شدید جنسی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔

وہ غار میں آیا۔ باہمی شکوہ و شکایت کے بعد دونوں نے سوم پیا اور خود کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیا۔

رفتہ رفتہ منّو کے عشق کی گرمی کم ہونے لگی۔ اب اُسے شردھا کے حسن میں پہلی سی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ شردھا کا زیادہ وقت تکلی سے سُوت کاتنے اور منّو کا شکار کھیلنے میں گزرنے لگا۔ ایک دن وہ شکار کھیل کر دیر سے آیا۔ شردھا نے شکایت کی۔ اُس نے شردھا سے ہر وقت سُوت کاتتے رہنے کا شکوہ کیا۔ شردھا نے کہا "میں تنہائی کا وقت گزارنے کے لئے ایسا کرتی ہوں۔ اور پھر میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ ہمارا ہونے والا بچہ ننگا پھرے۔" منّو کو غرض محض اس کے حُسن کی تابناکی سے تھی۔ شردھا کی دوسری دلچسپیاں اُس کو رُوح فرسا محسوس ہوتیں۔ درحقیقت وہ دریا میں رہتے پر بھی پیاسا ہی تھا۔ اس لئے شردھا کو اُس کے حال پر چھوڑ کر چل دیا۔

یہاں سے منّو سرسوتی ندی کے کنارے سارسوت نگر پہنچا جو ویران پڑا تھا۔ اس جگہ اُسے پھر کام کی پُراسرار آواز سنائی دی جس نے کہا۔ "تم نے شردھا کے دلی جذبات کو نہ پہچاننے کے باعث اس کی قدر نہیں کی۔ اب تمھیں سکونِ خاطر نصیب نہ ہوگا۔"

سارسوت نگر میں منّو کی ملاقات ایڑا سے ہوئی جس سے اُس کے دل کو کسی قدر تسلّی ہوئی۔ ایڑا نے منّو کو اپنے دیس کا راجہ بنا دیا اور عقل کی قوت سے عمل پیرا ہو کر آرام کے اسباب تخلیق کرنے کی ہدایت کی۔ منّو کام میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔

ماہ و سال گزرتے گئے اور سارسوت نگر روز بروز ترقی کرتا گیا۔ لیکن منّو کے دل کو اطمینان حاصل نہ ہوا۔ ایک روز شردھا نے خواب دیکھا کہ منّو نے کسی عورت ایڑا سے زبردستی کرنا چاہی تھی جس پر عوام اور شیو بپھر رہے ہیں۔ منّو سخت مصیبت میں گرفتار ہے۔ یہ دیکھ کر شردھا کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اور وہ منّو کی کھوج میں نکل پڑی۔ اُس کا بیٹا مانو بھی ساتھ ہی تھا۔

تھا تو یہ خواب ہی لیکن واقعہ بھی یہی تھا۔ درحقیقت رعایا اور منّو میں بہت کشمکش تھی۔ اس میں نشۂ قوت اور خودسری بڑھ رہی تھی۔ رعایا کے لئے جو اصول بنائے گئے تھے وہ خود اُن کا پابند نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ایک دن عوام کی نمائندگی کرنے کے لئے ایڑا اس کے پاس گئی تو منّو نے اس کی بات ماننے کی بجائے اس کے ساتھ زبردستی کرنا چاہی۔ عوام کا ساغرِ صبر چھلک گیا اور وہ محل کا دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے۔ منّو اور رعایا میں جنگ ہوئی۔ اس مرتبہ آکلی اور کلات بھی پرجا کی صفوں میں شامل تھے۔ اُن کی نمک حرامی سے منّو چراغ پا ہو گیا، اور اس نے دونوں کو مار گرایا۔ آخر شیو کو غصّہ آیا اور اُنھوں نے منّو کو گھائل کر دیا۔ جنگ ختم ہو گئی۔

اس پر ایڑا کا غصّہ پشیمانی سے بدل گیا۔ وہ زخمی منّو کی خدمت کے لئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اُسی وقت دور سے شردھا کی پُکار سنائی دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بیہوش منّو کے قریب آگئی۔ اور محبّت سے اُس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ منّو کو افاقہ ہونے لگا۔ ماضی کی یاد اُسے پریشان کرتی تھی اور اپنے پُرآشوب حال سے وہ قطعی غیر مطمئن اور بیزار تھا۔ اس لئے ایک دن وہاں سے بھی روپوش ہو گیا۔

شردھا پھر کھوج میں نکلی اور اپنے بیٹے مانو کو ایڑا کے ساتھ رہ کر انتظامِ سلطنت کرنے کی ہدایت کرتی گئی۔ اُس نے سرسوتی کے کنارے جھاڑیوں میں منّو کو جا لیا۔ مانو کو شردھا کے ساتھ نہ دیکھ کر منّو گھبرایا، وہ ایڑا کو فریبی تصوّر کرتا تھا۔ مانو کو شردھا کے ساتھ نہ دیکھ کر شردھا سے کہنے لگا۔ "تو اُس کے دامِ فریب میں پھنس گئی۔" مگر شردھا نے اُسے دوسروں پر اعتماد رکھنے اور مطمئن رہنے کے لئے کہا۔

یکایک فضا میں شیو کا نورانی پیکر "تانڈو رقص" کرتا نظر آیا۔ منّو نے اُن کے قدموں تک پہنچنے کی تمنّا ظاہر کی۔ شردھا رہنما بنی۔ راستہ دشوار گزار تھا۔ مگر دونوں پہاڑ پر چڑھتے ہی گئے۔ آخر ایک مسطح زمین پر پہنچے جہاں سے تین سمتوں میں تین نورانی نقاط نظر آتے تھے۔ شردھا نے بتایا کہ یہ تینوں دراصل تمنا، علم اور عمل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سرخ نقطہ عالمِ تمنا ہے۔ اسے زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ حواسِ خمسہ اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ سیاہ نقطہ عالمِ عمل ہے۔ جہاں ہمیشہ ہنگامۂ حیات برپا رہتا ہے۔ اور سفید نقطہ عالمِ علم۔ یہاں کے باشندے زندگی کے سکھ و راحت سے بے پرواہ ہو کر عقل کے سہارے حقیقت کی تلاش میں محو رہتے تھے۔ مگر یہ تینوں الگ الگ ہیں حقیقی سکون حاصل ہونے کے لئے ان تینوں کا مل کر ایک ہو جانا ضروری ہے۔ یہ کہہ کر وہ مسکرائی جس سے آتشیں شعلے بلند ہوئے، اور یہ تینوں عالم ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ ساری فضا ایک غیبی نغمے سے گونج اٹھی۔

منّو پر حقیقت آشکار ہو چکی تھی۔ وہ مانسرور کے کنارے کیلاش پربت کی ترائی میں سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ ایڑا اور مانو بھی زیارت کی غرض سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اتفاق سے وہ بھی ادھر ہی آ نکلے۔ اُنھیں دیکھ کر منّو نے کہا، "تم دوئی کو بھول کر ایک ہو جاؤ۔" شردھا کے لبوں پر فاتحانہ مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ ساری فضا فرطِ انبساط سے ناچ اُٹھی۔ جدھر دیکھیے حسن کی رنگینیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سب کی آنکھوں سے بادۂ محبّت کا سرور چھلک رہا تھا۔

جیساکہ ظاہر ہے اس تمثیل کا ہیرو منّو ہے جو پُرانوں کے مطابق سب سے قدیم انسان ہے۔ غرض شاعر ہمیں ماضی بعید کے ایسے فاصلہ پر لے جاتا ہے جہاں پہنچ کر پلاٹ کے مافوق الفطرت عناصر مثلاً پرلے کا طوفان۔ کام کی پُراسرار آوازیں۔ شردھا کا خواب۔ شیو کا تانڈو رقص اور تین عالموں کا ایک دوسرے میں مدغم ہونا نہیں کھٹکتا۔ اس سے قطع نظر پرشاد جی نے واقعات کی تخلیق اور ترتیب میں اعلیٰ فنّی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ غیر ضروری تفصیلات سے تقریباً پاک اور انجام جاننے کی خواہش کسی مقام پر بھی سست پڑتی محسوس نہیں ہوتی۔

نظم کے تین کردار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ منّو۔ شردھا اور ایڑا۔ یہ درحقیقت انسانی من، عقیدت اور عقل کے نمائندے ہیں۔ منّو مرکزی کردار ہے اگرچہ مثالی نہیں۔ ابتدا میں وہ اپنی فطری کمزوریوں کے ساتھ سامنے آکر رفتہ رفتہ موافق اور مخالف حالات سے متاثر ہوتا ہوا ارتقائی منازل طے کرتا نظر آتا ہے۔ نظم کا سب سے جاندار اور دلکش کردار شردھا (یا کامائنی) ہے۔ منّو کی کامیابی بھی اصل میں شردھا ہی کی کامیابی ہے۔ کیونکہ اُسی کی مثالی نسوانیت، جس میں محبّت، عقیدت، خدمت، ایثار اور بخشش کے سبھی عینی تصوّرات شامل ہیں، منّو کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہے۔ تیسرا کردار ایڑا ہے، جو منّو کو عمل پر آمادہ کرکے اس کے لئے راحت کا پیغام لو بنتی ہے۔ لیکن روحانی عظمت سے ناآشنا رکھنے کی وجہ سے اُسے آخرکار شدید مادّی اور ذہنی اُلجھن میں مبتلا کرا دیتی ہے۔ عقل کی علامت کو عورت بنا کر اُسے عورت کی فطری زود پشیمانی کا حامل قرار دینے میں پرساد جی نے کیا مصلحت سمجھی، یہ کہنا بہت آسان نہیں ہے۔ محض افسانوی حیثیت سے تو ایڑا کا یہ طرزِ عمل غیر فطری معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن جس خاص مقصد کے پیشِ نظر ایڑا کی تخلیق وجود میں آئی ہے اُس کی وضاحت کو اس سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ ممکن ہے، شاعر کے ذہن میں یہ خیال رہا ہو کہ عقل سماج میں جو بے روح کشمکش پیدا کرتی ہے اُس کا نفسیاتی ردِّ عمل پشیمانی اور جذباتی انقلاب ہوگا۔

اپنے ہمعصر دوسرے مفکّرین کی طرح پرساد جی کو بھی موجودہ تہذیب میں (جسے عرفِ عام میں مغربی تہذیب کہا جاتا ہے) علم و عمل کی فراوانی مگر محبّت اور باہمی اعتماد کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ آج انسان نے علم میں اضافہ کرکے اپنی قوّت کو بھی بڑھا لیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی مستقل جد و جہد نے آرام کے اسباب میں بھی بہت توسیع کی مگر اس کی روح مُردہ ہو کر رہ گئی۔ درحقیقت آج انسانی عمل کا محرک اپنی ہی آسائش اور آرام ہے۔ اُسے اپنے بدنصیب بھائیوں کی فلاح و بہبود کی مطلق پروا نہیں۔ یہ صورت حالات اگر ایک طرف افراد میں ہوس پرستی، بے راہ روی اور غرور کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے تو دوسری طرف عوام کی حق تلفی اور زبوں حالی کی شکل میں اور پھر اس کا لازمی نتیجہ تصادم یا جنگ ہوتا ہے۔ سارسوت نگر میں منّو اور رعایا کے درمیان انھیں وجوہ سے ظہور میں آئی۔

پرساد جی زندگی میں تمنّا کو کم اہمیت نہیں دیتے اور نہ وہ قدیم فلسفیوں کی طرح ضبطِ نفس کو سکونِ دائمی کا ضامن ہی بناتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ حواسِ خمسہ کو عقیدت کا (جس میں انسانوں کی عام محبّت اور باہمی اعتماد بھی شامل ہے) پابند بنانا چاہتے ہیں۔ ہیروئن کامائنی کی تخلیق کا محرک یہی تصوّر ہے۔ شاعر کے نزدیک مثالی شعور وہ ہے جو زندگی میں تمنّا، علم اور عمل کو برابر اہمیت دے اور اُن کے توازن کو برقرار رکھ سکے۔ کیونکہ اسی طرح زندگی میں واقعی مسرّت کی فراوانی ہو سکتی ہے۔ نظم کا آخری حصّہ اس خیال کو واضح طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جابجا بصیرت افروز اشارات اور نفسیاتی رموز کی عقدہ کشائی کی گئی ہے جو کامائنی کو اعلیٰ درجہ کی تصنیف ثابت کرتی ہے۔

پوری نظم پندرہ حصّوں میں منقسم ہے، اور ہر حصّہ کی ایک سرخی ہے۔ سُرخیوں میں اکثر تو براہِ راست ذہنی کیفیات مثلاً فکر، اُمید، عقیدت،

تمنّا، ہوس، حیا وغیرہ ہیں۔ جو بظاہر ذہنی کیفیات معلوم نہیں ہوتیں بشمُول جاہ وجہد، خواب اور اسرار وغیرہ ان کا بھی کسی نہ کسی شعور سے تعلق ضرور ہے۔ ایک حصّے میں ایک بحر اور قوافی و ارکان کا ایک ہی قاعدہ چلتا ہے۔ مگر حصّہ بدلنے پر بحر اور قافیہ کی ترتیب وغیرہ بھی بدل جاتی ہے۔

جس طرح مختصر نظم کی کامیابی کا مدار تمامتر اس کی مجموعی تاثیر پر ہوتا ہے۔ اسی طرح طویل خاصکر افسانوی نظموں کی کامیابی بہت کچھ ان کے منصوبوں پر منحصر ہوتی ہے۔ اچھا فنکار واقعات اور کرداروں کی ترتیب کچھ ایسی رکھتا ہے کہ غیر ضروری اضافوں سے بچ کر بھی مختلف قسم کے جذبات اور خیالات کے اظہار کے لئے مناسب مقامات پیدا کر لیتا ہے۔ اس کام میں پرساد جی کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ وہ انسان کے مختلف النوع لطیف جذبات کو ان کے مناسب ماحول میں خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے سے کچھ اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ ان کے شعر نشتر کی طرح سینے میں اُتر جاتے ہیں۔ اُن کا انسانی فطرت کا علم اور مشاہدہ بھی بہت اچھا ہے جس سے وہ اپنے کلام میں گہرائی بھی پیدا کرسکتے ہیں اور دلکشی بھی۔ سچ پوچھئے تو کامائنی کی سب سے بڑی خوبی جذبات کی بوقلمونی اور نشیب و فراز کی کامیاب عکاسی ہی ہے۔

پرساد جی ہندوستان کی قدیم تہذیب کے حامی ہیں، وہ آج کی زندگی کے مسائل کا حل اسی تہذیب کے اصول میں تلاش کرتے ہیں۔ کامائنی کا کردار ایسی ہی کوشش کا نتیجہ ہے۔ بہرکیف جو لوگ شاعر سے نظریاتی اختلاف بھی رکھتے ہوں اُن کے لئے بھی کامائنی میں دلچسپی کی کمی نہیں ہے۔

کامائنی کے سلسلے میں جدید ہندی شاعری کی دو بڑی تحریکوں رہسیہ واد (سرّیت جسے ایک قسم کا تصوّف سمجھنا چاہیئے) اور چھایا واد (علامتیت) کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ رہسیہ واد میں شاعر کائنات کی محض حقیقتوں کی تلاش اور پردہ کشائی کرتا ہے، اور چھایا واد میں اپنی ذاتی اور فطرت کی روح میں اتحاد پیدا کرکے "حدیثِ دیگراں" کا پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے۔ یوں تو یہ دونوں رجحانات اس نظم کی پوری فضا پر مسلط نظر آتے ہیں۔ مگر اوّل الذکر چودھویں باب میں (جس کا عنوان خود رہسیہ ہے) اور موخرالذکر ابتدائی ابواب میں زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ نظم اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ ہندیونین کی تمام زبانوں میں بہت جلد ہونا چاہیئے۔

وشوبھارتی کا افتتاح

ایک مرکزی یونیورسٹی کے طور پر وشوبھارتی کا افتتاح کرتے ہوئے بھارت سرکار کے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے وہاں کے پڑھنے اور پڑھانے والوں کو اکتسابِ علم اور تلاشِ حق کے لئے گرو دیو رابندرناتھ ٹیگور کی روایات کو جاری و ساری رکھنے کی تلقین کی۔

انھوں نے کہا کہ گرو دیو نے آج سے تقریباً چالیس سال قبل وشوبھارتی کے قیام سے اس خلا کو پُر کیا جو ملک کی تعلیمی درسگاہوں میں کلیتاً پُرانی قدروں پر زور دینے یا کلیتاً مغربی رجحانوں کو اپنا لینے سے پیدا ہوا۔ وشوبھارتی کے مسلک میں شروع ہی سے یہ چیز رکھ دی گئی کہ قدیم ترکہ کی ہر قابلِ قدر چیز پر توجہ مرکوز کرنے کے ساتھ ان دریافتوں سے بھی کام لیا جائے جو مغرب نے جوہرِ انسانی کے لئے کی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ وشوبھارتی زمانۂ ماضی اور زمانۂ حال کا ایک ایسا سنگم ہے جہاں تفریق اور فرقہ پسندی سے بالا گرو دیو کے فلسفۂ انسانیت کو عملی شکل پانے کا موقع ملا۔ گرو دیو نے شروع عمر میں زندگی کے متعلق ایک ایسا نظریہ قائم کرلیا جس کے تحت قومی یا ملکی سرحدیں بے معنی تھیں اور ان کے نزدیک دنیا اُن کا گھر تھی۔ انھوں نے بنی نوعِ انسان سے ایک قلبی رشتہ محسوس کیا۔ انسان دوستی کا یہ احساس دراصل بھارتی ثقافت کا جوہر اور ارتقارِ عالم میں سب سے بڑی پیش کش ہے۔

وشوبھارتی ایکٹ میں حوالۂ خدا کو شامل نہ کرنے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا کہ یہ صرف اس لئے کیا گیا کہ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے ایک قانون میں خدا کا حوالہ بے جا ہوگا۔ اس وجہ سے ملک کے آئین میں بھی خدا کا نام نہیں رکھا گیا تھا۔ مولانا آزاد نے مزید کہا کہ اس یونیورسٹی کا مقصد وہی رہے گا جو گرو دیو کے "شانتم۔ شوم۔ ادویتم" کے اصول میں خدا کا ایک ایسا تصوّر ہے جو نسل، مذہب اور عقیدے کی قیود سے بالا و لعبیگر۔

مولانا آزاد نے کہا کہ وشوبھارتی ایکٹ پاس ہو جانے سے یونیورسٹی ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ لیکن یونیورسٹی والوں کو ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی یونیورسٹی ایک ہمیشہ درسگاہ ہے۔ یہاں گرو دیو نے استادوں کو مالی طمع یا جاہ و جلال کی خواہش سے نہیں بلکہ سادگی۔ غربت پسندی اور خدمت کے جذبے سے کام کرنے کی تلقین کی۔

آزادی کے چار سال

ریاستوں کا مسئلہ

آزادی ملی تو دو بہت پیچیدہ مسئلے ہمارے سامنے آ گئے۔ فرقہ وارانہ اختلافات اور راجواڑوں کا قضیہ۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ تقسیم نے جزوی طور پر پہلے مسئلے کو حل کر لیا۔ تو دوسرا مسئلہ پھر بھی حل طلب تھا۔ آزاد ہند ۵۵۰ ریاستوں کے وجود کو گوارا نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں برطانوی طاقتوں نے ہندوستانی ریاستوں کو اپنی نگہداشت میں لے لیا۔ اور یہاں کے حکمرانوں کو ہندوستان کی آزادی کے خیال ہی سے بے نیاز کر دیا۔ اور جب انگریز ہندوستان چھوڑ گئے۔ تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہندوستانی ریاستوں کی آزادی کے مسئلے کو حل کئے بغیر ہی وہ حکمرانی چھوڑ رہے ہیں۔ خطرہ تھا کہ مبادا کسی ردِ عمل سے حالات خراب ہو جائیں۔

بہر حال نئی حکومت نے بہت خوش اسلوبی سے کام کیا۔ اور ۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو سردار ولبھ بھائی پٹیل کی زیر سر کردگی ریاستوں کا ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا۔

لوہے کے اس انسان نے ایک بیان میں ان مسائل اور حالات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"یہ دیش اپنے رسم و رواج کے ساتھ ان لوگوں کی قابلِ فخر جنم بھومی ہے جو یہاں رہتے ہیں۔ اور یہ ایک اتفاق ہے کہ بعض لوگ ریاستوں میں رہتے ہیں اور بعض برطانوی ہندوستان میں۔ لیکن وہ سب تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔ اور ہم خون اور جذبات کے لحاظ سے شیر و شکر ہو چکے ہیں۔ ہمیں کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی اور ہمارے درمیان کوئی بھی ناقابلِ عبور دیوار حائل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میرے خیال میں ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم اکٹھے بیٹھ کر اپنے لئے قانون بنائیں۔ نہ کہ ہم دو مختلف طاقتوں کی مانند آپس میں معاہدے کریں۔ اور میں ریاستوں پر حکومت کرنے والے دوستوں اور وہاں کے باشندوں کو دوستانہ طور پر قانون ساز اسمبلی کی کونسلوں میں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ تاکہ ہم اپنے وطن سے وفاداری اور بہبودِ عام کے متعلق سوچ سکیں۔"

جب سردار پٹیل نے دوستی کا ہاتھ والیانِ ریاست کی جانب بڑھایا تو انہوں نے ان حالات کو بھی مدِ نظر رکھا جن کی وجہ سے والیانِ ریاست دوستی کے اس ہاتھ کو تھامنے سے انکار کر سکتے تھے۔ سردار پٹیل نے نے کہا تھا۔

"میں ہندوستانی ریاستوں کو اس امر سے مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر انہوں نے باہمی مفاد کے لئے ہمارا ساتھ نہ دیا اور ہمارے ساتھ اتفاق نہ کیا تو اس کا نتیجہ لاقانونی اور بد انتظامی ہوگا۔ اور اگر انہوں نے اس مشترکہ کام کے لئے تعاون نہ کیا تو یہ لاقانونی اور بد انتظامی سب چھوٹے بڑوں کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔"

انگریزوں کے زمانے میں ریاستوں کے حکمرانوں نے جو کچھ بھی کیا ہو اس سے ہمیں غرض نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس چیز کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس موقعے پر انہوں نے اس قدر حب الوطنی کا ثبوت دیا ہے کہ جمہوریت کے تمام شیدائیوں کے علاوہ انہیں خود سردار پٹیل نے خراجِ تحسین پیش کیا۔ انہوں نے گئے گزرے زمانے کے معاہدوں کو قانون کی روشنی میں دیکھ کر تنگ نظری کا ثبوت نہ دیا اور نہ ہی انہوں نے ہندوستان کی نئی حکومت کو تسلیم نہ کرنے کی کوشش کی۔ ورنہ وہ چاہتے تو ملک میں کسی حد تک بد نظمی اور گڑبڑ پیدا کر سکتے تھے۔ کیونکہ بھارت سرکار پنجاب کے فسادات اور کشمیر پر حملے سے پیدا شدہ نازک حالات کی بدعنوانیوں سے دوچار ہو رہی تھی۔ اور یہ حکمرانوں رعایا اور نئی حکومت کے باہمی اتحاد و اتفاق ہی کا نتیجہ ہے کہ پہلی بار عوام کو جمہوری

طور پر حکومت مل گئی - اس سلسلے میں سب سے قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ دو سال کی قلیل سی مدت میں ہوگیا -

جنوری ۱۹۴۸ء میں سردار پٹیل نے حیدرآباد اور جوناگڑھ کے علاوہ تمام ریاستوں کے الحاق کا اعلان کر دیا - اور سال ختم ہونے سے پیشتر ہی ان دو ریاستوں نے بھی انڈین یونین میں شامل ہونا قبول کر لیا -

حیدرآباد کے الحاق کی کہانی بہت مشہور ہو چکی ہے - ایک نیا متعصب فرقہ معرضِ وجود میں آیا - جس نے رضاکاروں کے نام سے ریاست حیدرآباد میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلا کر اپنی لاقانونی حرکتوں سے دہشت پھیلا دی - ہندوستان کے نقطۂ نگاہ سے یہ چیز اس طرح بھی باعثِ نقصان ثابت ہوئی کہ اس بدنظمی کا اردگرد کے علاقوں پر بھی اثر انداز ہونے کا امکان پیدا ہو گیا - ان جنونی لوگوں نے وہ زور پکڑا کہ ایک بدنام شخص قاسم رضوی کی قیادت میں انھوں نے نظام اور اُن کے صلاح کاروں کو اپنے اشاروں پر نچانا شروع کر دیا -

رضاکاروں کی سرگرمیوں نے نازک صورتِ حال اختیار کر لی - اور ضروری ہو گیا کہ حکومت کوئی شدید ترین قدم اٹھائے - ورنہ یہ خدشہ دامنگیر ہو گیا کہ اگر یہ لوگ من مانی کرتے رہے تو ہندوستان بھر میں لاقانونی اور بدانتظامی کا دَور دَورہ ہو جائے گا - اور آخر حکومت نے اہم کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا -

چنانچہ سخت اور بہادرانہ کارروائی کی گئی - اور پانچ ہی دن میں حیدرآباد کی پبلک کو رضاکاروں کے خونی پنجے سے نجات دلائی گئی اور نظام کو قول و فعل کی پھر آزادی ہو گئی - آخر اس نے ہند یونین میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا -

ایک بار ہندوستان بھر کی ریاستیں قومی جھنڈے کے نیچے اکٹھی ہو گئیں - اور ریاستوں کی وزارت نے سب ریاستوں کو طبقاتی، سیاسی، وزارتی اور اقتصادی طور پر ایک ہی قانون اور ایک ہی حکومت کے زیرِ سایہ بٹھا دیا - ۵۵۰ ریاستوں کو ایک ہی لڑی میں اس خوش اسلوبی سے پرونا ظاہراً طور پر بالکل ناممکن معلوم ہوتا تھا - کئی ریاستیں ایسی تھیں جن کے پاس نہ تو ذرائع تھے اور نہ ہی ان کی مشینری اس قابل تھی کہ وہ جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو سکیں - حکومت کا پہلا کام یہ تھا کہ ان ریاستوں کا آپس میں الحاق کر دیا جائے - اس کی تین صورتیں تھیں :-

۱- چند ریاستوں کو ہمسایہ صوبوں میں شامل کر لینا -
۲- دوسری ریاستوں کی "یونین آف سٹیٹس" میں درجہ بندی کرنا -
۳- چند ریاستوں کو مرکزی طور پر ایک ہی وزارت کے زیرِ اثر لانا -

چونکہ حیدرآباد، جموں و کشمیر، اور میسور بہت بڑی ریاستیں تھیں - اس سے اُن ریاستوں کو اس سکیم میں نہ لایا گیا اور ان کی سرحدوں کو محفوظ کیا گیا - کئی حالات میں اس الحاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرحدیں اور محصول چوکیاں سرے ہی سے غائب ہو گئیں - مصنوعی تقسیم کے ختم ہو جانے سے چھوٹی ریاستوں کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہو گیا اور خود کفیلی کے امکانات بڑھ گئے - اور وہ مادرِ وطن کی بہتری میں خوب حصہ لینے لگے -

یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو ایک عظیم تبدیلی ظہور پذیر ہوئی جبکہ چھتیس گڑھ کی ریاستیں اوڑیسہ میں شامل ہو گئیں - سب سے آخر میں کوچ بہار کی ریاست نے یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو مغربی بنگال میں شمولیت اختیار کر لی - اس طرح جملہ ۲۱۶ ریاستوں کا خاتمہ ہو گیا - اور ۱۰۸,۷۳۹ مربع میل رقبہ اور ۱۹ر۱۵۸ ملین آبادی اس میں انضمام ہوئی -

۶۱ ریاستیں مرکزی نظام کے تحت لائی گئیں - جن کا رقبہ ۶۳,۷۰۴ مربع میل ہے - جن کی آبادی ۶۹۲۵۰ افراد تھی - ان کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے - جن کا انتظام مرکزی طور پر ہوتا ہے -

ریاستوں کی پہلی یونین کا جنم اس وقت ہوا جب کاٹھیاواڑ کی ۲۲۲ ریاستیں مل گئیں - اور اب جنھیں "سوراشٹر" کہا جاتا ہے اور اس طرح ۲۷۵ ریاستوں کو ایسی ہی پانچ یونینوں میں تقسیم کیا گیا اور آخر ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ریاستوں کے اس گٹھ جوڑ کا سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا - اور ایک ایسی عوامی حکومت شروع ہوئی جو اکثر ملکوں کے لئے نئی ہے - اور یہ حیرت انگیز انقلاب صرف اڑھائی سال کے عرصے میں بغیر کشت و خون کے رونما ہوا - اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد میں پولیس کو پانچ دن کے لئے ایکشن لینا پڑا -

ریاستوں کے دیگر مسائل ابھی تک حل طلب ہیں - کیونکہ ان کا تعلق ان کی گذشتہ انوکھی تاریخ سے ہے - اس کے باوجود حکومت کو یقین ہے کہ عوام کے تعاون سے وہ سب کام بخوبی سرانجام دے سکے گی ٭-

پوشیدہ رائے دہندگی کا صندوق

جمہوریت کا مقدس نشان

حصولِ آزادی کے بعد ہونے والے پہلے عام انتخابات میں ووٹ ڈالنے کو خفیہ رکھنے پر بھارت کو ایک کروڑ روپیہ خرچ کرنا ہوگا۔

رائے دہندگان کے ووٹ ڈالنے کے لئے پولنگ کے مرکزوں پر فولاد کے بائیس لاکھ ننانوے ہزار چار سو اٹھتر چھوٹے اور ہلکے بکس رکھے جائیں گے۔ ان بکسوں میں خود بخود مقفل ہو جانے کی ایک نئی ترکیب کی گئی ہے۔ بکس پر رائے دہندوں کے حلقہ پولنگ اسٹیشن۔ پولنگ بوتھ اور امیدوار کے سلسلہ وار نمبر درج کرنے کے لئے ایک پترا لگایا گیا ہے۔ بکس کا بالائی ڈھکنا ایک بار بند اور مُہر ہو جانے کے بعد اُسے کھولنا یا اس کے اندر پڑی اشیاء کو چھیڑنا ناممکن ہو جائے گا۔ ان بکس سے اگر کوئی بھی تحریف کی گئی تو وہ رائے شماری کے وقت معلوم ہو جائے گی۔

اگر پولنگ کے کسی مرکز سے کوئی ایسا بکس ملا جس سے تحریف کی گئی ہو یا جو خراب یا گم ہو گیا ہو تو وہاں رائے دہندوں کو نئے سرے سے ووٹ ڈالنے کے لئے کہا جائے گا۔ لہٰذا بکس سے کسی قسم کی تحریف کرنے سے مجرم کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہوگا۔

ریاستوں کی قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات کے لئے چاکلیٹ یا بادامی رنگ اور پارلیمنٹ کے انتخابات کے لئے ہرے رنگ کے بکس ہونگے پولنگ کے ہر مرکز میں متعلقہ امیدواروں کی تعداد کے برابر بکس رکھے جائیں گے۔ ہر بکس کی اوسط قیمت چار اور پانچ روپے کے درمیان ہے رائے دہندگی کا ہر صندوق خاص پردے کے پیچھے ہوگا۔ اور تاک جھانک یا کسی قسم کی دخل اندازی کی قانونی طور پر ممانعت ہوگی۔

ناسک کے سیکورٹی پرنٹنگ پریس میں تین اعشاریہ پینتیس ضرب دو انچ کی ووٹ ڈالنے کی باسٹھ کروڑ پرچیاں چھاپی گئی ہیں۔ ان پر بادامی یا ہرے نشان ہیں۔ ان پر کچھ پیچیدہ نقوش اور سلسلہ وار نمبر درج ہیں، اس لئے جعلی پرچیاں تیار ہونے کا قریب قریب کوئی امکان نہیں۔ ان پر نشان لگانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان پر کوئی نام درج نہیں۔

انتخابات میں امیدواروں کے استعمال کے لئے آسانی سے پہچان لئے جانے والے نشانات منظور کئے گئے ہیں۔ ان میں بیل۔ ہاتھی۔ اونٹ۔ درخت جھونپڑا۔ انسانی ہاتھ۔ سائیکل۔ کشتی اور چراغ شامل ہیں۔ ہر نشان کے نیچے متعلقہ امیدوار کا نام ہوگا۔ ایک عام دیہاتی کو بھی اپنے پسندیدہ امیدوار کا بکس معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

رائے دہندہ کا کام بھی بہت آسان اور مختصر ہے۔ نشان سے اس امیدوار کا بکس معلوم کر لینے کے بعد جس کے حق میں وہ اپنا ووٹ ڈالنا چاہتا ہے اُسے بکس کے ڈھکنے کے شگاف سے اپنی پرچی ڈال دینی ہے

غلطیوں کے امکان میں کمی

اس طریقے میں بہت سے فوائد ہیں۔ اور یہ طریقہ خاص طور پر اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے کہ ملک میں رائے دہندگان کی اکثریت ناخواندہ ہے اور وہ نہ تو امیدواروں کے نام ہی پڑھ سکتے ہیں اور نہ وہ ووٹ کی پرچی پر لکھے ہوئے اُمیدواروں کے ناموں میں سے کسی ایک پر نشان لگا سکتے ہیں۔ اس طریقے سے یہ بھی فائدہ ہے کہ قلم اور دوات کی امداد حاصل کرکے نشان لگانے کی بجائے رائے دہندہ کو صرف پرچی صندوقچی میں ڈالنی ہوگی۔ جس سے یقیناً کافی وقت بچ جائے گا۔

ووٹ ڈالنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ رائے دہندہ بغیر کسی کی مدد کے خود پرچی امیدوار کی صندوقچی میں ڈال دے۔ جہاں ووٹ

ڈالنے کی صندوقچیاں رکھی ہوں گی ۔ وہاں ایک وقت میں صرف ایک رائے دہندہ جا سکتا ہے ۔ اگر رائے دہندہ پرچی صندوقچی میں ڈالنے کی بجائے پرچی صندوق کے اوپر چھوڑ دے تو ووٹ شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح کی غلطیاں ان نقلی انتخابات میں اکثر کی گئیں جو حال ہی میں ملک بھر میں کئے گئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ووٹ ڈالنے کی صندوقچی پر ووٹ ڈالنے کے لئے ڈھکن پر شگاف کے ارد گرد سفید روغن سے مستطیل یا دائرہ اس قدر واضح طور پر کھینچا ہوا ہوگا کہ اس طرح کی غلطی کے امکان بہت کم ہو جانے چاہئیں۔

انتخابات ریاستی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے لئے ایک ساتھ شروع کئے جائیں گے ہر مقام پر ووٹ ڈالنے کی جگہ دو حصوں میں تقسیم کی جائے گی جن میں سے ایک حصہ ریاستی اسمبلی کے لئے ہوگا اور ایک حصہ پارلیمنٹ کے لئے ۔ ہر ایک رائے دینے والے کو ریاستی اسمبلی کے انتخابات کے لئے بادامی رنگ کی ایک پرچی دی جائے گی ۔ یہ پرچی ڈالنے کے بعد جب وہ واپس نکل آئیگا تو اسے پارلیمنٹ کے امیدوار کے لئے ہرے رنگ کی پرچی دی جائے گی جو وہ اس غرض کے لئے مخصوص کیمپ میں جا کر صندوقچی میں ڈال دے گا ۔ اس کے بعد وہ ایک الگ کیمپ میں جا کر وہاں ایوانِ عام کیلئے اپنا ووٹ ڈال دیگا ۔ چونکہ ہر پولنگ اسٹیشن ایک ہزار ووٹ دہندگان کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اور وقت صرف آٹھ گھنٹے مقرر کر دیا گیا ہے اس لئے فی منٹ دو یا تین اشخاص کو اپنے ووٹ ڈالنے ہوں گے ۔ نقلی انتخابات کے دوران میں جو تجربے کئے گئے ہیں ۔ ان سے ثابت ہوا ہے کہ مختلف جماعتوں کے مختلف نشان رکھنے سے اور ان کے ذریعے ووٹ ڈالنے کا طریقہ نہ صرف سادہ اور آسان ہے بلکہ اس سے کافی وقت بھی بچ جائے گا۔

ووٹ کی قیمت

ہمارا آئین یوں شروع ہوتا ہے ۔

" ہم ہند کے لوگوں نے پوری سنجیدگی سے فیصلہ کیا ہے کہ ہند کو ایک پورے اختیار والی عوامی جمہوریہ بنائیں"۔ عوامی جمہوریہ کا مطلب یہ ہے کہ ہر مرد اور عورت کو قانون ساز اسمبلی کے لئے اپنا نمائندہ چننے کا حق ہوگا ۔ وہ جو ووٹ صندوقچی میں ڈال دے گا اس سے آخر میں یہ

قومی اداروں کے ڈپلومے اور ڈگری کی منظوری

بھارت سرکار نے یونین پبلک سروس کمیشن کے مشورے سے اپنے تحت نوکریوں اور دیگر خدمات پر تقرری کی غرض سے مندرجہ ذیل ڈپلوموں اور ڈگریوں کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔

مندرجہ ذیل کے مساوی تسلیم کیا گیا

۱۔ گوروکل یونیورسٹی (الف) الانکر بی اے (۵۔ جولائی ۱۹۴۸ء سے) کانگڑی ۔ ہردوار (ب) ودھیکلاویکار ۔ میٹرک (۵۔ مئی ۱۹۴۸ء)

۲۔ گوروکل یونیورسٹی ۔ بندرابن سادھیکاری ۔ میٹرک (۸۔ مئی ۱۹۴۸ء سے)

۳۔ پرایاگ مہیلا ودیا پیتھ ۔ الہ آباد ۔ ودیا ونود ینی ۔ میٹرک (۱۲۔ فروری ۱۹۴۹ء)

۴۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ دہلی

(الف) جامعہ سینیر ایگزامینیشن) انٹر آرٹس (۳۔ دسمبر ۱۹۴۶ء سے)

(ب) جامعہ سندی بی اے (۳۔ دسمبر ۱۹۴۶ء سے)

(ج) ٹیچرز ٹریننگ آنرز گریجویشن بی ۔ ٹی

۵۔ کاشی ودیا پیتھ ۔ بنارس شاستری بی ۔ اے (۶۔ مئی ۱۹۴۶ء سے)

مذکورہ بالا منظوری عارضی طور پر پانچ سال کیلئے (۱۹۴۶-۵۶ء) ہے ۔

فیصلہ ہوگا کہ ملک میں کس طرح کے قوانین اور کس قسم کا نظم و نسق ہوگا کیونکہ مرکز میں اور ریاستوں میں وہی امیدوار حکومت بنائیں گے جن کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں نے اپنے ووٹ ڈالے ہوں انتخابات کے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ نہ ہونے سے جمہوریت ذبح ہو جاتی ہے ، ووٹ ڈالنے والے کے علاوہ کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ اس نے کس کے حق میں ووٹ ڈال دیا ہے اور اس کے ووٹ ڈال دینے کے بعد کسی کو بھی ووٹ سے دست اندازی کرنے کا موقعہ نہیں ملنا چاہئے ۔ خفیہ طریقہ سے ووٹ ڈالنے کے طریقے سے اس بات کی ضمانت ملتی ہے کہ ووٹ دہندہ بلا خوف اور مکمل آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ووٹ ڈالنے کی صندوقچی کو جمہوریت کا مقدس نشان تصور کیا جاتا ہے ۔

رفتارِ زمانہ

وزیرِ اعظم پاکستان کا قتل

ہندوستان بھر میں یہ خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۱۶۔ اکتوبر کو پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں کو راولپنڈی میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ مسٹر لیاقت علی خاں ایک پبلک جلسے میں تقریر کرنے کے لئے اُٹھے ہی تھے کہ قاتل نے اُن پر دو گولیاں چلائیں جس پر وہ وہیں گر پڑے۔ اُن کی جان بچانے کی انتہائی کوشش کی گئی مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ مسٹر لیاقت علی خاں کے قتل کی خبر ملتے ہی بھارت سرکار کے تمام دفاتر میں قومی جھنڈے سرنگوں کر دئے گئے۔ اور ۱۷۔ اکتوبر کو تمام سرکاری اداروں میں نصف دن کی چھٹی کر دی گئی۔ راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پردھان منتری شری نہرو نے حکومت پاکستان اور بیگم لیاقت علی خاں کو بھارت سرکار کی طرف سے ہمدردی کے تار ارسال کئے اور تمام بھارتی لیڈروں نے اس افسوسناک سانحہ پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ اگلے دن مرحوم لیاقت علی خاں کی موت پر دہلی میں ایک بھاری ماتمی جلسہ منعقد ہوا جس میں راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ پردھان منتری شری جواہرلال نہرو اور وزیر داخلہ شری راج گوپال آچاریہ نے تقریروں میں پاکستان کو یقین دلایا کہ اِس افسوسناک حادثے میں بھارت کی دلی ہمدردی اُس کے ساتھ ہے۔ شری نہرو نے کہا کہ یہ قتل اہلِ پاکستان کے لئے ایک زبردست حادثہ ہے۔ ہمیں اُن سے پوری ہمدردی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا راستہ نکلے جس سے بھارت اور پاکستان کے جھگڑے ختم ہوں اور ہم ایک دوسرے کے معاون بن سکیں۔ آپ نے کہا کہ پاکستان ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ اُس سے ہمارا نزدیک کا رشتہ ہے لیکن تقسیم اور اُس کے بعد کے واقعات کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان ایک دیوار حائل ہو گئی ہے۔ کیا ہم اس دیوار کو گرا نہیں سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر دونوں طرف سے کوشش ہو تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں اس گہرے صدمے کے موقعے پر اس مسئلے کی گہرائی میں جانا چاہیئے۔ اور دشمنی اور عداوت کے جذبات کو ختم کرنے کا جتن کرنا چاہیئے۔

کانگریس کا سالانہ اجلاس

انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس دہلی میں جو ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ اکتوبر کو منعقد ہوا، صدرِ منتخب شری جواہرلال نہرو نے اپنا صدارتی ایڈریس پڑھتے ہوئے فرقہ پرستی کی زوردار الفاظ میں مذمت کی۔ اُنھوں نے کہا کہ یہی لعنت ہے جو ہندوستان کی تقسیم کا موجب بنی اور یہی خرابی تھی جس کی وجہ سے گاندھی جی قتل ہوئے۔ شری نہرو نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم کو منسوخ کرنے کی باتیں بالکل غیر حقیقی اور فضول ہیں۔ ہم نے تقسیم کو منظور کیا ہے اور ہم اس کے پابند ہیں۔ بعض لوگ حماقت سے کام لے کر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم اس حماقت کی مخالفت کریں گے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ گڑبڑ اور تباہی کے سوا کچھ برآمد نہیں ہو سکتا — فرقہ داری تنگ دلانہ اور انتشار پیدا کرنے والا نظریہ ہے جس کے لئے موجودہ دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے پردھان کانگریس نے کہا کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کشمیر کے عوام ہی کریں گے۔ ہم کشمیر میں استصواب رائے کرانا چاہتے ہیں۔ صرف اس لئے نہیں کہ ہم اپنے آپ کو اس چیز کا پابند بنا چکے ہیں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ہمیں اس کے نتائج کے متعلق پورا بھروسہ ہے۔ لیکن یہ ریفرنڈم آزادانہ ہونا چاہیئے۔ اور ایسے حالات میں نہیں ہونا چاہیئے جس سے حملہ آور کی حوصلہ افزائی ہو۔ پاکستان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا کہ ”ہمیں پاکستان کے ساتھ بھی اپنے تعلقات کو بہتر بنانا ہے۔ کئی مواقع ایسے آئے جب کہ پاکستان اور بھارت میں جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ دراصل جنگ سے بڑھ کر حماقت اور نقصان دہ بات کوئی نہیں۔ بھارت اور پاکستان کے ہر ذی ہوش آدمی کو اس حقیقت کا احساس ہونا چاہیئے۔ ہمارا مقصد نہ صرف پاکستان کے ساتھ اپنے جھگڑوں کو پُرامن طور پر حل کرنا ہے بلکہ اس ملک کے ساتھ جو کچھ مدت پہلے ہمارا اپنا حصہ تھا، خوشگوار تعلقات بھی قائم کرنا ہے —

ہندوکوڈبل کا ذکر کرتے ہوئے کانگرس پردھان نے کہا کہ اگر ہم برسرِ اقتدار رہے تو اس کو ضرور پاس کریں گے۔ بھارت کی ودیشی پالیسی کے متعلق آپ نے کہا کہ ہم کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کی پالیسی کو پسند نہیں کرتے مگر ہم باہمی تعاون اور امداد کے اصول پر یقین رکھتے ہیں، اور ہماری کوشش ہمیشہ یہ رہے گی کہ مختلف ممالک کے درمیان اختلافات کی خلیج کو ختم کیا جائے۔ اور امن قائم رکھا جائے۔

جموّں وکشمیر میں انتخابات

ریاست جموّں وکشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے انتخابات سے یہ امر صاف طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ ریاست جموّں وکشمیر میں صرف ایک ہی سیاسی جماعت ہے، جو ریاست کے عوام کی صحیح معنوں میں نمائندہ ہے۔ اور وہ ہے نیشنل کانفرنس۔ آئین ساز اسمبلی کی ۷۵ نشستوں میں تمام کی تمام نیشنل کانفرنس نے حاصل کر لی ہیں۔ ۳۱۔ اکتوبر کو آئین ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہو رہا ہے اور کشمیر کے عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے اس امر پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیں گے کہ کشمیر بھارت کے ساتھ ہے اور رہے گا۔

دہلی میونسپل انتخابات

دہلی میونسپل کمیٹی کے انتخابات میں کانگرس کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور اُس نے ۸۵ فی صدی نشستوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان انتخابات کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ کیونکہ آزاد ہندوستان میں یہ پہلے انتخابات تھے جس میں تمام بالغوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ اس انتخاب میں مسلمان اور سکھ بھی کافی تعداد میں کامیاب ہوئے۔ جس سے یہ امر صاف طور پر عیاں ہو گیا کہ مشترکہ انتخابات میں اقلیتوں کی حق تلفی کا کوئی امکان نہیں۔

بھارت کے چار کروڑ مسلمان

ایران کے ایک سرکردہ اخبار "قیام تلی" نے لکھا ہے: "بھارت اور پاکستان در اصل ایک ہی ہیں۔ کیا کبھی ناخنوں سے گوشت جدا ہوا ہے۔ یاد رکھو پاکستان بھارت کے مسلمانوں کی کسی طرح کی مدد نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا ایک صحیح قدم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ تقسیم سے صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو ہی تکلیفات برداشت نہیں کرنی پڑیں، بلکہ اس سے ایشیا میں ملوکیت پسند طاقتوں کو پنپنے کا موقعہ مل گیا، ہندوستان کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ اخبار لکھتا ہے کہ بھارت کے چار کروڑ مسلمان پوری آزادی کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہاں کی اکثریت کے دل میں اقلیت کے لئے عزت کے جذبات ہیں مسلمانوں کو سفیر بنا کر غیر ملکوں میں بھیجا جاتا ہے، کئی مسلمان وزارتوں میں ہیں لیکن پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہے۔

اینگلو مصری معاہدے کی تنسیخ

مصر کی نمائندہ اسمبلی چیمبر آف ڈپوٹیز نے اتفاق رائے سے ۱۹۳۶ء کے اینگلو مصری معاہدے اور ۱۸۹۹ء کے سوڈان کے متعلق معاہدے کو رد کر دیا ہے۔ اس سے مصر میں حالات بہت نازک صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ملک میں خطرے کی حالت کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ پولس اور فوج کو ہر وقت طیار رہنے کے احکام مل گئے ہیں۔

حفاظتی کونسل میں ڈاکٹر گراہم کی رپورٹ

ڈاکٹر فرانک گراہم نے حفاظتی کونسل میں کشمیر کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کے امن اور ترقی کا دارومدار کشمیر کے جھگڑے کے ختم ہونے پر ہے۔ اگر کشمیر سے فوجیں ہٹانے کے متعلق بھارت اور پاکستان میں سمجھوتہ ہو جائے تو یہ امن پسندوں کے لئے حوصلہ افزا بات ہوگی۔ اُنھوں نے اُمید ظاہر کی کہ دونوں ممالک کے لیڈر اپنی دُور اندیشی سے کوئی نہ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس سے کشمیر کا مسئلہ سلجھ جائے گا۔

کانگریس سیشن میں شیخ محمد عبداللہ کی تقریر

کانگرس کے ۵۷ ویں اجلاس میں بھاشن دیتے ہوئے ریاست جموّں وکشمیر کے پردھان منتری شیخ محمد عبداللہ نے کہا کہ جب تک ہماری قوم دماغی طور پر برطانوی سامراج کی غلامی سے آزاد نہیں ہوتی اُس وقت تک ہماری آزادی مکمل نہیں ہوگی۔ برطانوی سامراج کا سب سے بڑا حملہ ہندوستان کے دماغ پر ہوا ہے۔ اور اُس ذہنیت کی غلامی آج بھی بہت حد تک قائم ہے۔ اگر عملی اور مؤثر کارروائی سے ملک کو اُس غلامی سے آزاد نہ کیا گیا تو ہم صحیح راستے پر نہیں جا سکیں گے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ مرکزی اور صوبائی وزرائے تعلیم کا ڈھانچہ ایسا بنائیں جس سے غلامی کے عوض آزادی کا دماغ ڈھل کر نکلے۔

زمین کی تشکیلِ نو کا پروگرام

بھارت کے وزیر خوراک مسٹر کے ایم منشی نے ریاستوں کے زراعت کے ڈائرکٹروں کو خطاب کرتے ہوئے زمین کی تشکیلِ نو کے دس سالہ پروگرام کے ان پانچ نکات کو واضح کیا۔ (۱) چار کروڑ دس لاکھ ایکڑ زمین میں کاشت (۲) ایک کروڑ ایکڑ زمین کی بازیافت اور کاشتکاری (۳) تیس کروڑ درخت بونا (۴) بہتر اقسام کے ساٹھ ہزار سانڈوں کی نسل کی افزائش (۵) توسیع کی تحریک کو ایک لاکھ کسانوں تک پہنچانا۔

شری منشی نے مزید کہا کہ وسیع پیمانے پر کاشتکاری کے سلسلے میں خوراک کپاس اور پٹ سن کی پیداوار متضاد اقدامات نہیں ہیں۔ اور نہ ہی سنٹرل ٹریکٹر آرگنائزیشن ون مہوتسو جنگلات کی پالیسی اور مویشیوں کی نسل کشی محض وعدے اور کاغذی کارروائیاں ہیں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ زراعت کے ان مختلف شعبوں میں عملی طور پر کافی ترقی کی گئی ہے۔ انڈین کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ کو نہ صرف از سر نو ترتیب دیا جا رہا ہے بلکہ اُسے کل بھارت کے لئے زرعی تحقیق و توسیع کی یونیورسٹی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ تاکہ زمین کی تشکیلِ نو کے پروگرام میں کامیابی ہو۔

کھیتی باڑی کے نئے تجربات

حال ہی میں اُتر پردیش کے ضلع اٹاوہ میں جو زرعی تجربے کئے گئے ہیں ان سے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

ان تجربوں میں کسان نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح گندم کی پیداوار میں ۴۵ فی صدی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ گائے کے دودھ کو پندرہ سے پچاس فیصدی تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ گاؤں میں انکم ٹیکس لگانے سے ایک منتخبہ پنچائت کے لئے رقوم فراہم کی جا سکتی ہیں۔ اور مقامی باہمی جھگڑوں کو بات چیت سے حل کیا جا سکتا ہے۔ پیداوار بڑھانے کے آسان اور عام فہم طریقوں کا متعلقہ دیہاتوں کے کسانوں پر کیا اثر ہوا۔ اس کا اندازہ ۸۵ سالہ بوڑھے کسان رکھو رام کے اس جواب سے کیا جا سکتا ہے "کاش یہ طریقے ہمیں پہلے ہی معلوم ہوتے"۔

یہ اسکیم حکومت اتر پردیش کی طرف سے اکتوبر ۱۹۴۸ء میں چند امریکن ماہروں کی مدد سے ۶۴ دیہات میں شروع کی گئی تھی۔ اگرچہ اس کا تعلق ۹۷ دیہات سے تھا۔ ان دیہات کا رقبہ ساٹھ ہزار ایکڑ اور آبادی ۷۹ ہزار ہے۔ زمین کا اوسط پٹہ قریباً تین سے پانچ ایکڑ تک ہے۔ بارش کی سالانہ اوسط چالیس انچ ہے۔ گرمیوں میں درجہ حرارت ایک سو بیس تک پہنچ جاتا ہے۔

اس اسکیم کا مرکز موضع مہوہ تھا۔ امریکن اور بھارتی کارکنوں کی ٹیم نے مقامی کسانوں سے اس طرح مل کر کام کیا گیا گویا سب پُرانے ساتھی تھے۔ اس چیز کا دہقانوں پر بہت اثر ہوا۔

شاہ افغانستان کو مبارک باد کا پیغام

بھارت کے راشٹرپتی نے شاہ افغانستان ہز مجسٹی محمد ظاہر شاہ کی سالگرہ (۱۶۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء) کے موقعے پر حسب ذیل پیغام ارسال فرمایا ہے۔

"میں اور بھارت کی حکومت اور عوام یور مجسٹی کی سالگرہ پر پُرخلوص مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ کے سایۂ عاطفت میں افغانستان کے عوام مدت مدید تک امن اور خوش حالی سے زندگی بسر کرتے رہیں۔"

وزیر اعظم پاکستان کی تقریر

وزیر اعظم بننے کے بعد اپنی پہلی پبلک تقریر میں پاکستان کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے بھارت و پاکستان کے باہمی اختلافات پُر امن طور پر حل کرنے کے سلسلے میں شری نہرو کے خیالات کی تائیدکی اور کہا کہ مسٹر لیاقت علی خاں کے قتل پر شری نہرو نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہیں۔ اور میرا یقین ہے کہ بھارت و پاکستان کے تمام اختلافات جن میں کشمیر بھی شامل ہے پُر امن طریقوں سے حل کئے جانے چاہئیں۔ اور وہ حل کئے جا سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ مسٹر لیاقت علی خاں کے ماتمی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا تھا کہ بھارت اور پاکستان کو ماضی کی باتیں بُھلا کر از سر نو دوستی اور اچھے تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔

کشمیر کے بارے میں حفاظتی کونسل کے فوجی مشیر کے خیالات

جنرل جیکب ایل ڈیورس نے نیو یارک میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ کشمیر کی اُلجھن پُر امن طور پر حل ہو جائے گی۔ کیونکہ دراصل دونوں پارٹیوں میں ایک بھی جنگ نہیں چاہتا اور وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جنگ بھارت و پاکستان دونوں کے لئے تباہ کن ثابت ہو گی۔

عالمِ پیئرس کے خوبصورت بچے

ایک خوبصورت خاتون بننے کی تیاری میں

"ہر ایک کوئی سُوزن کی جلد کی تعریف کرتا ہے، لیکن سب یہ نہیں جانتے کہ میں اسکے لئے پیئرس صابن کے سوا دوسرا کوئی صابن استعمال نہیں کرنے دیتی" اسکی ماں کہتی ہے۔ صاف و شفاف پیئرس صابن کا اعلیٰ تقویت اسکی ماں کی طرح سُوزن کی جلد کو بھی آنیوالے برسوں میں صاف و ملایم اور خوبصورت بنا سکے گا۔ کیونکہ دُنیا بھر کے دیگر خاندانوں کی طرح اس خاندان میں بھی پیئرس صابن پشتوں سے ایک رازِ حُسن رہا ہے۔

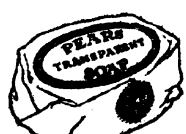

پیئرس
صابن
پشتوں سے حسین عورتوں کا سنگار

TG. 60-X30 UD

آپ جہاں کہیں بھی ہوں . . .

ایڈا سمتھ کمپنی لیمیٹیڈ، لنڈن، کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا
HBS. 3-80 UD

ڈالڈا میں بنی ہوئی

ہر ایک کوئی ڈالڈا پسند کرتا ہے کیونکہ یہ ہر قسم کے کھانے بنانے کیلئے موزوں ہے۔ کیونکہ یہ ذائقہ دار اور مقوی بھی ہے! یہ خالص ہے اور اسکی تیاری میں اس کو ہاتھوں سے چھوا نہیں جاتا اور سیل بند ڈبوں میں یہ ہمیشہ صاف اور تازہ رہتا ہے۔

اسے جلدی بنانے کا آسان طریقہ:-

ثابت پھول گوبی کو دھو لیجیے۔ پانی چھلکا دیجیے نہیں۔ اس پر نمک ملئے۔ برتن میں اس کے اوپر اور نیچے پسا ہوا سبز مصالحہ اور ڈالڈا رکھیئے۔ برتن پر ڈھکن کو گوندھے ہوئے آٹے سے بند کر دیجیے۔ ہلکی آنچ پر پکائیے۔ کبھی کبھی برتن کو ہلاتے رہیئے۔ مصالحہ کے بغیر بھی لذیذ بنتی ہے۔

اسے خریدنا مت بھولئے

انگریزی میں ڈالڈا کی پکانے کی نئی کتاب۔ با تصویر۔ آرٹ پیپر۔ اسّی صفحات۔ سارے ہندوستان اور یورپ کی پکانے کی تین سو نسخے ترکیبیں صحت، صفائی اور باورچی خانہ پر نکتے۔ قیمت صرف ایک روپیہ اور ڈاک خرچ آٹھ آنے۔

دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱

HVM. 148-172 UD

Homage

THE MOST AUTHENTIC COMPILATION OF UNIVERSAL TRIBUTES OF SORROW, LOVE AND PRAISE TO THE IMMORTAL GREATNESS OF MAHATMA GANDHI EVOKED BY HIS SUPREME MARTYRDOM.

HOMAGE *CONTAINS POTRAITS BY FOREMOST INDIAN PAINTERS AND SOME RARE PHOTOGRAPHS.*

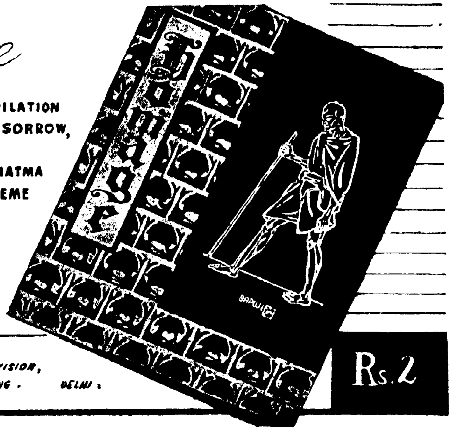

PUBLISHED BY *THE PUBLICATIONS DIVISION, MINISTRY OF INFORMATION & BROADCASTING. DELHI.*

Rs. 2

HELPFUL HINTS
ON
CHILD TRAINING

In her 12 broadcast talks over All India Radio Dr. Montessori emphasises the need of creating environments for the children to enable them to develop their abilities fully and freely. The book provides food for thought to all parents interested in the health growth of their children.

Price Rs. 1/8/-, Sh. 2/6/- or 35 cents.

The book could be had from the nearest bookshop or direct from:

THE PUBLICATIONS DIVISION
OLD SECRETARIAT, DELHI-8

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D. -21

2 - MAY ,52

آجکل

مئی ۱۹۵۲ء

DECCAN

(4)

آٹھ آنے

گل مرگ

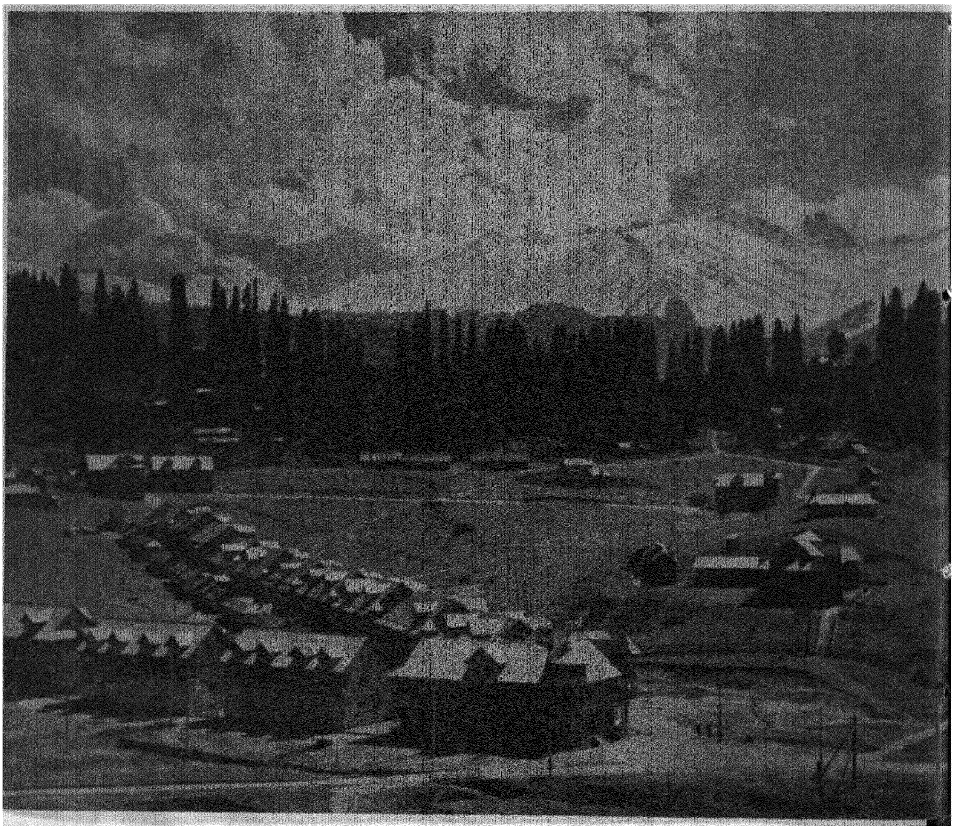

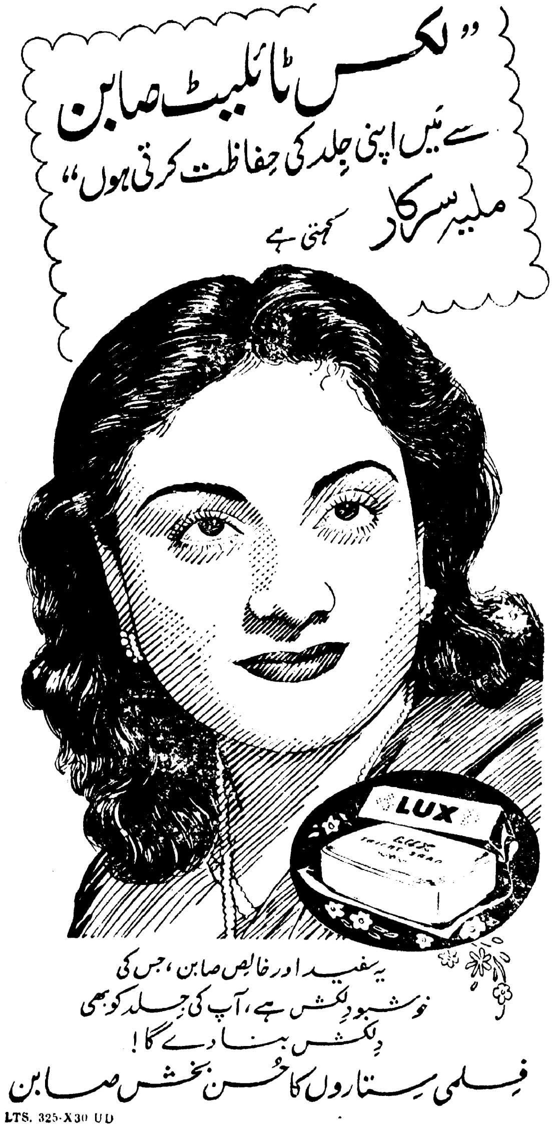
"لکس ٹائلیٹ صابن
سے مَیں اپنی جِلد کی حِفاظت کرتی ہوں"
ملیہ سرکار کہتی ہے
LUX
یہ سفید اور خالص صابن، جس کی
خوشبو دِلکش ہے، آپ کی جِلد کو بھی
دِلکش بنا دے گا!
فِلمی سِتاروں کا حُسن بخش صابن
LTS. 325-X30 UD

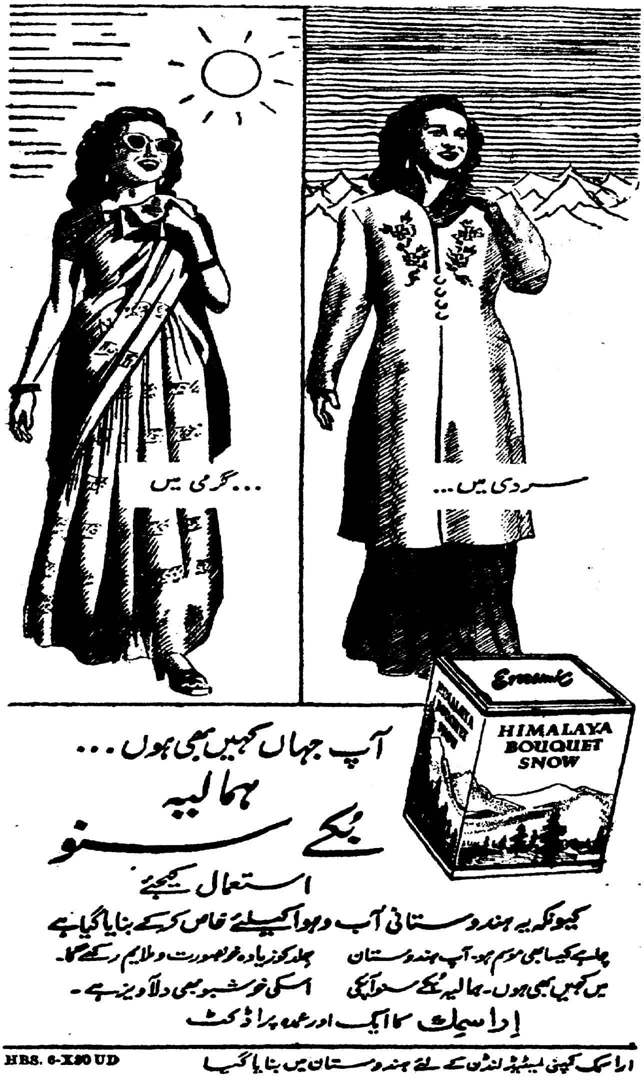
...گرمی میں
سردی میں...
Erasmic
HIMALAYA
BOUQUET
SNOW
آپ جہاں کہیں بھی ہوں...
ہمالیہ
بُکے سنو
استعمال کیجئے
کیونکہ یہ ہندوستانی آب و ہوا کیلئے خاص کرکے بنایا گیا ہے
چاہے کیسا بھی موسم ہو۔ آپ ہندوستان میں کہیں بھی ہوں۔ ہمالیہ بُکے سنو آپکی جلد کو زیادہ خوبصورت و ملایم رکھے گا۔ اسکی خوشبو بھی دلآویز ہے۔
اراسمک کا ایک اور عمدہ پراڈکٹ
HBS. 6-X80 UD
اراسمک کمپنی لیمیٹڈ لنڈن کے لئے ہندوستان میں بنایا گیا

اُردو کا مقبول عوام مُصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر :- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد نمبر ۱۰ —— نمبر ۱۰

سالانہ چندہ —— ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے

غیر ممالک سے —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ —— ہندوستان میں - آٹھ آنے
پاکستان میں - آٹھ آنے

مئی ۱۹۵۲ء

ترتیب

غالب (فیچر)	عرش ملسیانی	۳
اُردو زبان میں عربی لفظوں کا استعمال	عبدالرزاق ملیح آبادی	۹
دو آتشہ	نریش کمار شاد	۱۳
اجنتا کے غاروں میں	جگن ناتھ آزاد	۱۴
غالب کے تین غیر مطبوعہ خطوط	مختار الدین احمد	۱۹
حالی مرحوم کی غیر مطبوعہ تحریر	سحر رام پوری	۲۲
امرتا پریتم	ہنس راج رہبر	۲۴
فلمی دُنیا	——	۳۳
غالب کا ایک شعر	حمیدہ سُلطان	۳۵
مولانا حسرت موہانی	محمد علی خاں اثر	۳۷
ایوننگ اِن پیرس	تنویر احمد علوی	۴۰
اُمراؤ بیگم	ماہ منیر	۴۱
ذکر و فکر	صدق جائسی۔ جلیل ساز باسط بھوپالی۔ من موہن تلخ	۴۴
بیا پتا	جوگندر پال	۴۵
آسام کی وحشی قومیں	وحید عندی	۴۹
سوڈان مصری	محمد شفیع الرحمٰن	۵۳
رفتارِ زمانہ	——	۵۸

بچّوں کا آج کل

میرا دیش اور میری گڑیا	سکینہ عبّاس	۶۱
ہیروں کا بادشاہ	سیّد ابن سعید علی	۶۲
قہقہے	——	۶۳
وہ کون تھا	وسیم	۶۴
دلچسپ سوال	خوشباش	۶۸

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

عرش ملسیانی

غالب

(ایک ریڈیائی فیچر)

سازکی آواز . . . .

نغمہ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

راوی۔ نجم الدولہ، دبیرالملک، اسداللہ خان بہادر، نظام جنگ المتخلص بہ غالب ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ رند مشرب و درویش صورت، بذلہ سنج، انشا پرداز، ملکِ نظم و معانی کے بادشاہ، سخنورانِ ماضی و حال کے رہنما کے کردار کا مطالعہ اور اُس مطالعے کے بعد کوئی ناطق فیصلہ ایک بڑا مشکل کام ہے۔ اُن کے عقیدت مندوں نے اُن کے باب میں مختلف انداز میں کیا کچھ کہا ہے۔ ذرا سماعت فرمائیے۔ حالی نے کہا:۔

حالی۔ امیر خسرو اور فیضی کے بعد ہندوستان کی خاک سے کوئی ایسا جوہر قابل پیدا نہیں ہُوا جسے مرزا غالب کا ہم پایہ کہا جا سکے۔

راوی۔ اقبال نے غالب کی عظمت کا اعتراف اپنی مشہور نظم مرزا غالب میں یوں کیا ہے

اقبال نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دِلّی گُلِ شیراز پر
آہ تو اُجڑی ہوئی دِلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے
اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

راوی۔ رشید احمد صدیقی نے لکھا۔

رشید احمد صدیقی۔ مجھ سے اگر یہ پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف تین نام لوں گا۔ غالب، اُردو اور تاج محل۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں۔ غالب نے طویل عمر پائی اور اس زمانے میں طویل عمر پائی جو و مبدم منہدم اور متغیر ہو رہا تھا۔ وہ میر نہ تھے کہ عہد کے حادثات اور خود اپنے حادثات سے تمام عمر جانبر نہ ہوتے۔ وہ ذوق نہ تھے کہ شاعری کے ڈھرّے سے جُدا نہ ہو سکے۔ وہ مومن نہ تھے کہ حباب پر نقش بناتے رہے۔ وہ ظفر نہ تھے کہ سلطنت ہاتھ سے نہ جاتی تو شاید شاعری میں کوئی جگہ نہ پیدا کر سکتے۔

راوی۔ آلِ احمد سرور نے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

آلِ احمد سرور۔ غالب کے آرٹ کی وجہ سے غزل حدیثِ دلبراں سے بڑھ کر حدیثِ زندگی بنتی ہے اور زندگی کے مختلف دَوروں، کروٹوں اور انقلاب کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ ایک حد تک میر کی غزل بھی ایسی ہی ہے اور میر جیسے بڑے شاعر میں جو آفاقیت ملتی ہے اُس سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر غالب کے یہاں یہ جامع فکر دوسروں سے زیادہ ہے اور غالب کا اسلوب اُردو شاعری کو گہرے فلسفیانہ سیاسی اور علمی افکار کے اظہار پر قادر کر دیتا ہے۔ اس لئے بیسویں صدی کا شاعر جو سیاست سے اس طرح اپنا دامن نہیں بچا سکتا جس طرح یونانی تہذیب کے عروج میں ممکن تھا غالب کے اسلوب سے متاثر ہوتا ہے۔ اقبال اور جوش دونوں غالب کے خوشہ چیں ہیں۔

راوی لیکن خود غالب نے اپنے خاص انداز میں اپنے کردار کے ایک پہلو کو بیان کیا ہے عام انسان کے لئے جو درد اُن کے دل میں تھا ایک اُردو خط میں نہایت مؤثر طریق سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔

غالب قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دئے ہیں بقدرِ ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں

لوں۔ اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکاؤں۔ اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار، میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔

(وقفہ)

راوی - ۱۸۴۲ عیسوی - حکیم محمد حسن خاں مرحوم کی حویلی میں مرزا غالب کرایے پر رہتے ہیں محل سرا اور دیوان خانہ الگ الگ ہے مگر کمرے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ دیوان خانے میں سفید چاندنی کا فرش ہو رہا ہے۔ صدر میں قالین اور دو تین گاؤ تکیے لگے رکھے ہیں۔ ایک طرف قرینے سے لگن میں پیچواں رکھا ہے۔ قالین کے کنارے پہ چاندی کا پاندان پڑا ہے۔ کمرے میں تین چار پتیل کے اُگالدان ہیں اور ایک کونے میں بڑی سی سلفچی دھری ہے۔ ایک گاؤ تکیے کا سہارا لئے ذرا کچھ لکھ رہے ہیں کہ محل سرا سے وفادار لونڈی بیگم کا پیغام لائی۔

وفادار۔ مرزا صاحب بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔

مرزا - آتا ہوں ذرا یہ خط ختم کر لوں۔

وفادار۔ جلد چلئے حضور۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا ہے۔ بس بُلا ہی لاؤ۔

مرزا۔ ارے آتا ہوں کہہ تو دیا۔ دو سطریں باقی ہیں۔ ابھی ختم کئے دیتا ہوں۔

وفادار واپس جاتی ہے ....

اسے دیکھتے ہی بیگم پوچھتی ہیں

بیگم - کیا کہا تھا میں نے تجھ سے۔ نہیں آئے کیا۔

وفادار۔ نہیں بیگم صاحبہ - ابھی آ رہے ہیں۔ ایک خط لکھ رہے ہیں۔ فرمایا ہے کہ ختم کر لوں پھر آتا ہوں۔

امراؤ بیگم۔ آفت میں جان ہے ان خطوں سے۔ صبح خط، شام خط، سوتے خط، جاگتے خط۔ گھر میں کھانے کو ہو نہ ہو، نہیں اپنے خطوں سے ......

مرزا صاحب - یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ بابا عزیز ہیں، دوست ہیں، مُربّی ہیں۔ یہاں تو کسی غیر کو نظر انداز نہیں کر سکتا، یہ تو سب اپنے ہیں۔ ان کے خطوں کے جواب مجھ پر واجب تھے۔ آج لکھنے بیٹھا ہوں اور آج ہی ناک میں دم کر رہی ہو۔

امراؤ بیگم - سچی بات سب کو بری لگتی ہے۔ لیکن اتنا تو بتائیے کہ انھیں خطوں میں میری ذلت کے کیا کیا سامان آپ نے نہیں کئے۔ پاؤں کی بیڑی مجھے کہا۔ پھانسی کا پھندا مجھے قرار دیا۔ شاگردوں، دوستوں سب میں مجھے ذلیل کیا۔

مرزا صاحب - کیا غضب کر رہی ہو۔ یہ تو محض مزاح کی باتیں ہیں۔ تم انھیں سچ مان بیٹھی ہو۔ خیر یہ تو بتاؤ کہ بلایا کس لئے ہے۔

امراؤ بیگم ۔۔ اس لئے بُلایا ہے کہ یہاں میرے قریب بیٹھئے۔ آج میں اپنے دل کی سب باتیں کہوں گی۔ کن کن مصائب میں زندگی گزر رہی ہے۔ آپ کو تو اس کا ذرا بھی خیال نہیں۔ خدا جنت نصیب کرے میرے والد مرحوم کو، اُن کے خیال میں بھی نہیں آیا ہوگا کہ فخر الدولہ، دلاور الملک نواب احمد بخش بہادر رستم جنگ رئیس فیروز پور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کی بھتیجی اور اُن کے بھائی نواب مرزا الٰہی بخش معروف کی بیٹی جسے اُنھوں نے ناز و نعمت سے پال کر آپ ایسے رئیس زادے کے سپرد کیا تھا۔ اس طرح بھک منگوں سے بھی بُری حالت میں زندگی گزارے گی۔

مرزا صاحب - کیوں اس قدر برہم ہو رہی ہو۔ اپنے نام و نسب پہ ناز کرتی ہو۔ اور مجھے طنزاً رئیس زادہ کہتی ہو۔ آخر میری رئیس زادگی میں کیا شک ہے۔ میرا سلسلۂ نسب تو را بن فریدوں سے ملتا ہے۔ الپ ارسلان ملک شاہ سنجر اور ترسم خاں میرے اجداد میں سے ہیں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا۔ پہاسو کا پرگنہ جاگیر داد میں مقرر ہوا۔ میرے والد مرزا عبداللہ بیگ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ اور حیدرآباد میں نواب نظام علی خاں کی ملازمت میں رہے۔ چچا مرزا نصراللہ خاں لارڈ لیک کے ماتحت چار سو سوار کے بریگیڈیر تھے ایک ہزار روپیہ ماہانہ اُن کا ذاتی مشاہرہ تھا۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر تھی۔

امراؤ بیگم ۔ ہوگی۔ ہم نے تو یہی دیکھا۔ کہ اگر صبح کو مل گئی تو شام کی فکر ہے۔ اور اگر شام کو مل گئی تو صبح کی۔ یہ جاگیریں، یہ مال و منال جن کا تھا وہ لد گئے۔ اب آپ کیا ہیں۔ پنشن کے لئے دُنیا بھر میں جوتیاں چٹخاتے پھرے، لیکن نتیجہ مرغی کا ایک پاؤ۔

مرزا صاحب۔ تحمل سے بات کرو بیگم۔ آخر مقدر کے سامنے کس کی چلتی ہے۔

امراؤ بیگم - نہیں چلتی تو الٹے تلوں میں سب کچھ ضائع کیوں کیا تھا۔ اب بھی کیوں نہیں سنبھل جاتے۔ آپ نے کلکتے کا سفر اختیار کیا۔ پنشن تو خیر مقدر میں ہی نہیں تھی اُلٹا گھر لُٹا آئے اور انعام میں لائے کچھ اپنے ادبی جھگڑے اور کچھ کلکتے کے

نازنین و بتانِ خود آرا کی تعریف۔

مرزا صاحب، ارے کیا غضب کر رہی ہو۔ کوئی کام کی بات کرو۔ اب شاعری بھی کیا مردود ہو گئی۔

امراؤ بیگم۔ شاعری کیوں مردود ہوگی۔ مردود ہوگی وہ جس کے پاس گھر کے اخراجات چلانے کے لئے پھوٹی کوڑی بھی آج باقی نہیں۔ اِدھر اُدھر سے آ گیا تو دو دن نکل گئے یہاں تو بارانی کھیتوں کی سی بات ہے۔ برس گیا تو ہرا ول ورنہ ویرانہ اور بنجر۔ قرض بھی تو اب نہیں ملتا۔ میں کیا کروں۔

محل سرا کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔

وفادار لونڈی آواز دیتی ہے۔ کون؟

کلو وار وغہ۔ میں ہوں کلو۔ یہ ضروری خط ابھی ابھی سرکاری ہرکارہ دے گیا ہے۔ مرزا صاحب کو یہ خط ابھی پہنچا دو۔

مرزا صاحب، کیا ہے وفادار

وفادار۔ ایک خط ہے

امراؤ بیگم۔ ان خطوں نے تو ناک میں دم کر دیا۔

مرزا صاحب، بس چُپ رہو موسے کی بہن۔ خط تو پڑھ لینے دو (خط پڑھنا شروع کرتے ہیں)

امراؤ بیگم۔ وفادار انھیں خط پڑھنے دو۔ تم ذرا اتنا کام کرو۔ کلیان سے یا کلو داروغے سے کہو کہ مہاجن کے پاس جائے۔ دس روپے ادھار لائیے۔ ہم سب کے سب بہت جلد چُکا دیں گے۔ اِدھر اُدھر سے کچھ نہ کچھ آنے ہی والا ہے۔

وفادار۔ ابھی جاتی ہوں .... جانے کی آواز۔

مرزا صاحب۔ لو، ابھی کوس رہی تھیں مجھے، میرے آبا و اجداد کو اور اپنے مقدر کو۔ دِلّی کالج میں فارسی کے میر مدرس کا تقرر ہونے والا ہے۔ انگریزی حکومت کے سیکرٹری ٹامسن صاحب نے مجھے بُلایا ہے۔

امراؤ بیگم۔ واللہ خدا بڑا کارساز ہے۔ یہ سب میری نیت کی برکت ہے۔ لیکن ذرا مستعد ہو کر جائیے گا۔ یہ موقع اچھا ہے۔ عزّت و آبرو کا کام ہے۔ گھر کی گھر ہی میں مل رہی ہے۔ کب بلایا ہے۔

مرزا صاحب۔ کل ہی تو۔ خیر جاؤں گا۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ لیکن یہ صاحب لوگ کیا جانیں میری فضیلت علمی۔

امراؤ بیگم۔ پھر وہی انا، وہی نخرہ۔ خدا کا نام لیجیے اور شکر بجا لائیے کہ ایسا موقع نصیب ہوا۔

مرزا صاحب۔ شکر بجا لاتا ہوں حضور۔ خدا سے پہلے آپ کا اور آپ سے پہلے اب کیا کہوں اب جاتا ہوں مردانے میں۔ کہیں کوئی انتظار میں نہ ہو۔

جانے کی آواز

راوی۔ دوسرے دن مرزا عین وقت پر طیاری کرتے ہیں۔ انھیں بھی خواہش ہے کہ یہ جگہ مل جائے تو بیگم کی یہ روز روز کی بک بک بند ہو۔

کلو کو حکم دیتے ہیں۔

مرزا صاحب۔ کلو ذرا جاؤ۔ پالکی کا انتظام کرو۔ ہم ٹامسن صاحب کے بنگلے تک جائیں گے

کلو۔ ابھی جاتا ہوں حضور

مرزا صاحب۔ لیکن اس سے پہلے تن زیب کا انگرکھا ہمارے قریب رکھ دو۔

کلو۔ لیجئے (جاتا ہے) ......

مرزا، ٹامسن صاحب سے ملنے کے لئے طیّار ہوئے۔ داڑھی صفا چٹ۔ نازک باریک مونچھیں جن کو تاؤ دے رکھا تھا۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، سُرخ و سپید رنگ جس میں چمپئی دمک تھی۔ سر پر لمبے لمبے پٹھے قلموں پر لٹکتے ہوئے بال سر پر ایک پتلے کی ہلکی سی ٹوپی جس پر کشیدہ کا کام تھا۔ بدن پر تن زیب کا انگرکھا اور نیچے ایک بڑا سپید پاجامہ پاؤں میں گیتلی جوتی۔ یہ ہے مختصر سے الفاظ میں ان کی تصویر۔ اپنے زمانے کا قابل ترین جوہر، آبا و اجداد کی شوکت پر ناز کرنے والا۔ خود کو تاب میں برق اور بخشش میں ابر کہنے والا ترک زادہ فریدعل نژاد اس تلاش پر جس میں وہ معروف ہے فتح مندی کا نعرہ لگانے والا اور اس پر جو حاصل نہیں، خوشی کا اظہار کرنے والا۔ خود پر روتا ہوا اور روزگار پر ہنستا ہوا ایک معلم کی حیثیت سے خود کو بیچنے کے لیے گھر سے نکلا۔

کلو۔ پالکی حاضر ہے حضور۔ کب تک واپس تشریف لائیے گا۔

مرزا صاحب، جلد آؤں گا۔ اگر کوئی صاحب ملنے کے لیے آئیں تو انھیں بٹھانا۔ میکش آئیں تو کہنا کہ مجھ سے ملے بغیر نہ جائیں۔

(مرزا پالکی پر سوار ہو کر روانہ ہوتے ہیں)

امراؤ بیگم۔ وفادار! ادھر آ ذرا

وفادار۔ آئی بیگم صاحبہ

امراؤ بیگم۔ دیکھ تو، تشریف لے گئے ہیں یا ابھی طیاری ہی ہو رہی ہے۔ کلو سے کہو کہ دیوان خانے سے باہر نہ جائے۔ کوئی صاحب آئیں تو انھیں بٹھائے۔

وفادار۔ جاتی ہوں بیگم صاحبہ۔ ایک بات عرض کردوں۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں۔

امراؤ بیگم۔ کہو، تم سے ناراض کیوں ہوں گی۔

وفادار۔ بس مُنہ میٹھا کرائیے گا۔

بیگم۔ منہ میٹھا کیسا۔ جا کام چور کہیں کی۔ کیسا مُنہ میٹھا۔

وفادار۔ ابھی خوش خبری لاؤں گی۔ تھوڑی دیر میں۔ کلو نئے پاجامے، نئے کُرتے اور نئی ٹوپی کا اُمیدوار ہے۔ میں بھی کچھ نہ کچھ انعام پاؤں گی۔ دیکھنا اس وقت کُنجل نہ کرنا۔

بیگم۔ کیا بکتی ہے۔ عجب لوگ ہو تم۔ اور یہ کلو کو کیا سُوجھی کہ ابھی سے اتنی چیزوں کا اُمیدوار بن بیٹھا۔

وفادار۔ ابھی مرزا صاحب آئیں گے۔ دلّی کالج میں نوکری کا مژدہ سنائیں گے۔ ہر مہینے روپوں کی تھیلی آئے گی۔ واہ جی واہ . . . . (جاتے ہوئے) اچھا کلو سے کہے دیتی ہوں۔

بیگم (دبی ہوئی آواز میں) اللہ تو ہی آبرو رکھنے والا ہے۔ اس لونڈی کے مُنہ میں گھی شکر، کاش اس کا کہا پورا ہو۔

وفادار۔ داروغہ جی۔ بیگم کا حکم ہے کہ یہیں رہیئے گا۔ کہیں جائیے گا نہیں اور کوئی صاحب آئیں تو انھیں بٹھائیے گا۔

کلو۔ یہ تو سُن لیا۔ ہمارے انعام کا کیا بنا۔ کہا بھی تم نے یا نہیں۔ یا یونہی باتیں بنانا جانتی ہو۔

وفادار۔ کہہ دیا داروغہ صاحب۔ کہہ دیا ملے گا۔ انعام (جاتے ہوئے) لیکن پہلے مجھے تمہیں بعد میں۔

(وقفہ)

مرزا صاحب۔ کہاروں سے۔ دیکھو۔ وہ جو سامنے بنگلہ ہے اُس کے دروازے پر پالکی کو روک لو۔

مرزا صاحب پالکی میں بیٹھے انتظار کرنے لگے کہ حسبِ دستور کوئی صاحب ان کے استقبال کو آئیں گے۔ لیکن چند منٹ یونہی گزر گئے۔ اتنے میں ایک جمعدار آیا اور مرزا صاحب سے کہنے لگا۔

جمعدار۔ سرکار تشریف لائیے۔ صاحب بہادر اپنے کمرے میں آپ کے منتظر ہیں۔

مرزا صاحب۔ جیئ۔ کوئی لینے کو آئے تو اُتروں۔ دستور میں کیوں فرق آنے دُوں

اتنے میں ٹامسن صاحب خود باہر آئے اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کے کہنے لگے۔

ٹامسن صاحب۔ مرزا صاحب، آپ رسمی ملاقات کے لئے نہیں آیا۔ ملازمت کے لئے آیا ہے۔ اس لئے کوئی استقبال کو کس لئے آتا۔

مرزا صاحب۔ جناب کا شکریہ۔ میں تو ملازمت اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ میرے عزّ و وقار میں اضافہ ہو۔ نہ کہ جو پہلے سے ہے اس میں بھی کمی آجائے۔ اگر ملازمت کے معنی مرتبے میں کمی کے ہیں تو ایسی ملازمت کو دُور ہی سے سلام۔ ہم واپس جاتے ہیں۔ اچھا، خدا حافظ۔

راوی۔ مرزا نے کہاروں کو واپس چلنے کا حکم دیا۔ پالکی واپس جارہی تھی۔ مرزا کا جوہر بکتے بکتے بچ گیا۔

ساز کی آواز . . . .

نغمہ۔ بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

(وقفہ)

راوی۔ ۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم سال ہے۔ تیموری سطوت و شوکت تین سو سال سے زیادہ مدّت تک مختلف رنگ اختیار کرتی گئی۔ لیکن اس سال یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بُجھ گیا۔ چراغ بجھنے سے پہلے لَو دیتا ہے۔ یہی حال دلّی کی حکومتِ شاہی اور شرفا کا تھا۔ زوال آمادہ تہذیب اب بھی رنگ رلیوں پر مائل تھی۔ غم غلط کرنے کو چند ہم نفس اب بھی مل بیٹھتے تھے۔ اس ہنگامے سے ذرا پہلے ایک مجلس نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے مکان پر منعقد ہے۔ شیفتہ، صہبائی، نیر رخشاں، آزردہ، مولانا فضل حق خیرآبادی، میکش، تفتہ داغ اور ظہیر موجود ہیں۔ محفلِ سرود گرم ہے . . . . ساز اور گانے کی آواز . . . .

ادھر محفل گرم تھی۔ اُدھر مرزا غالب تشریف لائے۔ ملازم فوراً اندر نواب شیفتہ کو اطلاع دینے کے لئے گیا۔

ملازم۔ مرزا غالب تشریف لائے ہیں۔

نواب شیفتہ۔ زہے نصیب (اہلِ محفل سے) حضرات معاف فرمایئے۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

(پذیرائی کے لئے دروازے تک جاتے ہیں۔ مرزا پالکی سے اُترتے ہیں)

نواب شیفتہ۔ آداب بجا لاتا ہوں قبلہ

مرزا صاحب۔ تسلیمات۔ معاف فرمائیے کچھ تاخیر ہوگئی۔ کیا کروں ساٹھ سال کی عمر ہوگئی
قوے اضمحل ہو چکے۔ ہمّت مسدود ہے۔ پھر بھی آپ کی خاطر منظور تھی۔ حاضر
ہوگیا ہوں۔

(اندر آتے ہیں)

(سب آداب بجالاتے ہیں) (مرزا آزردہ کے پاس بیٹھے ہوئے فرماتے ہیں)
واللہ آپ بھی تشریف فرما ہیں۔ اس فقیرِ حقیر کا سلام تو لیجئے۔ ہاں تو میں بھی
لطف اُٹھاؤں۔ ساز و نغمہ پھر شروع ہو۔

راوی۔ دِلّی کی ایک مشہور گانے والی نے مفتی صدرالدین آزردہ کا مشہور شعر گانا
شروع کیا۔

سازوں کی آواز اور گانا

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

سب داد دیتے ہیں۔ واہ مفتی صاحب سبحان اللہ۔ کیا شعر کہا ہے۔

مرزا۔ گستاخی معاف مفتی صاحب۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

قہقہہ

مغنیہ نے آزردہ کے ایک دو شعر گا کر سنائے۔

کھڑا وہ بلا زلفِ سیاہ فام وہ کافر
کیا خاک جئے جس کی شب ایسی سحر ایسی

(داد کی آوازیں) سبحان اللہ۔ سبحان اللہ

یا تنگ نہ کر ناصحِ ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

(داد کی آوازیں)

واہ، واہ۔ مرحبا، کیا شعر ہے! یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی
(مغنیہ کو داد دیتے ہوئے ایک آواز) شعر بھی خوب اور پھر گانے کا بھی حق
ادا ہوگیا ہے۔ کیا گلا پایا ہے۔

مغنیہ آداب بجالاتی ہوں حضور۔ لیجئے نواب صاحب کا شعر بھی سنیئے۔

ساز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شاید اسی کا نام محبّت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

آزردہ۔ اب کیا کہے گا کوئی اس سے بہتر شعر۔ سبحان اللہ

مرزا صاحب۔ ہائے یہ آگ سی کہہ کر نارِ دوزخ سے بھی تیز آگ جلادی۔ آپ نے ع
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔ سبحان اللہ۔ نکو گفتی و دُر سفتی۔
ہر طرف سے فرمائش۔ ذرا مرزا صاحب کی بھی کوئی غزل ہو جائے۔

مغنیہ۔ میں تو خود منتظر تھی۔ لیجئے حاضر ہے۔ ایک گزارش کی گستاخی کروں گی۔ مال
ذرا آخر میں ملے تو بہتر رہے گا۔

سب۔ ضرور۔ ضرور

مغنیہ۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آواز فضا میں گم ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وقفہ

راوی۔ یہ رنگ رلیاں آخر کب تک۔ جنگِ آزادی جسے اب تک ہم غدر کہتے چلے
آئے ہیں شروع ہوگئی۔ دِلّی جو عیش و نشاط کا مرکز تھا یا بقولِ داغ
فلک زمیں و ملأنک جناب دلّی، ہنگامہ زار بن گئی۔ مرزا غالب اپنے مکان
میں ایک قیدی کی طرح بند اس دار و گیر کا افسانہ سنتے رہے۔

"۱۱ مئی کو پیر کے دن شہر پر ہندوستانی حکومت کا علم بلند ہوا۔ ۱۴ ستمبر کو
پیر کے دن انگریز دوبارہ اس پر قابض ہوگئے۔ زین العابدین عارف کے
بیٹے حسین علی خاں، باقر علی خاں، کلو داد وغیرہ کلیان مردانے کے مستقل
مونس و غم خوار تھے۔ کلو بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

کلو۔ سرکار غضب ہوگیا۔ شہر پر پھر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔
گولیوں کی آواز۔

مرزا غالب۔ ہونے دو۔ غلّہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ کچھ کھانے کو تو ملے گا۔ بادشاہ کا کیا ہوا۔

حسین علی خاں۔ دادا بادشاہ پکڑ لئے گئے۔ کہتے ہیں مقدمہ چلے گا۔

مرزا غالب۔ ارے اس خدا کے بندے کا کیا قصور ہے۔ اس بیچارے نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔

باقر علی خاں۔ نواب عبدالرحمٰن خاں والئے جھجھر فرخ نگر اور بہادر گڑھ کے نواب صاحبان بلب گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ بھی پکڑے گئے۔

مرزا غالب۔ ہمیں اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھنا تھا۔ ہمیں موت کیوں نہ آگئی۔ اب کہاں ملیں گے قلعہ اور چاندنی چوک کے وہ نظارے۔ مجمع بازار جامع مسجد کا ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔

.... گولیوں کی آواز ......

باقر علی خاں۔ دادا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بھی گرفتار ہو گئے ہیں۔ صدر الصدور مفتی صاحب بھی روبکاری میں بُلائے گئے ہیں۔

مرزا غالب۔ اللہ بچائے۔ اب اور نہ کوئی خبر سناؤ بیٹا۔ میرے تو حواس گم ہو رہے ہیں

حسین علی خاں۔ احمد حسین میکش کو پھانسی کی سزا ہو گئی۔ مہیائی توپ سے اڑا دئے گئے ۔۔ توپ چلنے کی آواز

مرزا غالب۔ (بہت غمزدہ ہوکر) نہ رلاؤ میرے بیٹے، نہ لاؤ میرے علم میں نہ لاؤ یہ باتیں۔ مجھے خوش فہمی میں مبتلا رہنے دو۔ یہی محسوس ہونے دو کہ سب اپنے اپنے گھروں میں محفوظ ہیں۔

راوی۔ کلو پھر ہانپتا ہوا آتا ہے اور مرزا کے بھائی یوسف خاں کے انتقال کی خبر سُناتا ہے۔

کلو۔ نواب یوسف بیگ خاں جان بحق ہوئے۔

مرزا غالب۔ انا للہ و انا الیہ راجعون (سرد آہ بھر کر) یہ بازو بھی ٹوٹ گیا۔ (بیٹھی ہوئی آواز میں) اب کسے کہوں گا بھائی، مجنوں تھا۔ لیکن اب دیوانہ بھائی بھی کہاں سے ملے گا۔ اس عمر میں یہ سانحے۔ کیا منظور ہے میرے اللہ کو۔

راوی۔ آخر عمر میں مرزا کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ شاگردوں اور احباب کے خطوں میں بار بار اپنے عوارض کا ذکر کرتے تھے۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

ستر ابہترا اُردو ترجمہ پیر خوف کا۔ میری تہتر برس کی عمر ہے۔ بس میں اخرف ہوا حافظہ گویا تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی مانند معدوم ہو گیا۔ اب مہینہ بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں۔ رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر۔ جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پہ لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرہ بادام مقشر دوپہر کو گوشت کا پانی، سرِ شام تلے ہوئے چار کباب۔ سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں، پوچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، رُوسیاہ ہوں، یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم\
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

مرزا غالب۔ دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

باقر علی خاں۔ دادا۔ اب تو آپ اچھے ہیں۔ یہ شعر نہ پڑھئے خدا کے لئے۔ اصلاح کے لئے کچھ غزلیں آئی ہیں۔ لاؤں۔

مرزا غالب۔ کیا کہہ رہے ہو۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا ہے۔ کلو جاؤ مرزا جیون بیگ کو بلا لاؤ۔ وہ آئے گی تو ہم کھانا کھائیں گے۔ جاؤ کیا سوچتے ہو۔ دولھن سے کہو اسے جلد ہمارے پاس بھیجے۔

راوی۔ کلو باقر علی خاں کی بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم عرف جیدو بیگم کو بُلانے کے لئے گیا۔ مرزا محبّت میں اُسے جیون بیگ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ بچّی کی والدہ بگا بیگم نے کہا کہ وہ سو رہی ہے۔ جونہی جاگتی ہے بھیجتی ہوں ادھر مرزا صاحب نے گاؤ تکئے پر سر رکھا اور بے ہوش ہو گئے۔ باقر علی خاں نے کلو کو آواز دی۔

باقر علی خاں۔ کلو، کلو، ذرا جلد آؤ۔ حکیم محمد خاں اور حکیم احسن اللہ خاں کو بلا لاؤ۔ جلد بُلا کر لاؤ۔

راوی۔ حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم محمود خاں تشریف لائے۔ انھوں نے تشخیص کیا کہ مرزا کے دماغ پر فالج گرا ہے۔ تمام کوششیں اور علاج بے سود ثابت ہوئے۔ آٹھ پہر اس عالم میں رہے۔ آخر ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ادب و شعر کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ دہلی دروازہ کے باہر نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور حضرت شیخ نظام الدین کی درگاہ کے قریب نواب الٰہی بخش خاں معروف کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی\
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

(آل انڈیا ریڈیو دہلی کے شکریے کے ساتھ)

مختار الدین احمد

غالب کے تین غیر مطبوعہ خطوط

والیانِ رام پور اور وہاں کے دوسرے اصحاب کے نام جو خطوط "مکاتیبِ غالب" میں شائع ہوئے ہیں ان کی تعداد ایک سو تیس ہے۔ اس کے فاضل مرتّب فرماتے ہیں: "نواب فردوس مکاں اور نواب خلد آشیاں کے فرامین کے مسوّدوں نیز مرزا صاحب کے زیرِ نظر مکاتیب میں تقریباً ۱۳۵ ایسے خطوں کے حوالے ملتے ہیں جو مثلوں میں موجود نہیں، یہ سب خط بھی محفوظ ہوتے تو مکاتیبِ غالب کی تعداد ۲۶۴ ہوتی جو اور بڑھ جاتی اگر ان کی اہل شہر میں خط و کتابت بھی دستیاب ہوتی"[1]۔

میرزا کے مکاتیب رام پور ایک لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ ان خطوط سے ان کی سیرت پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ رام پور کے اور سارے گم شدہ مکتوبات مل جائیں تو ان کی شخصیت کی اور بھی واضح تصویر ہمارے سامنے آجائے اور ساتھ ہی ساتھ ایسے پہلو بھی پیش نظر ہو جائیں جن سے ہم اب تک ناآشنا ہیں۔

آج کی صحبت میں مرزا کے تین غیر مطبوعہ خطوط اپنے مکرم امتیاز علی خاں صاحب عرشی کے شکریے کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں، جنہوں نے ہمیں یہ خطوط علی گڑھ میگزین "غالب نمبر" کی طبعِ ثانی کے لئے عنایت فرمائے ہیں۔ یہ خطوط "مکاتیبِ غالب" کی کسی اشاعت میں یا کسی اور جگہ اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں اور پہلی بار ناظرینِ "آجکل" کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

تینوں خطوط کے مکتوب الیہ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور (۱۸۳۵-۱۸۸۷ء) ہیں جو علی الترتیب ۱۸۶۶ء، ۱۸۶۷ء، ۱۸۶۸ء میں سپردِ قلم کئے گئے ہیں، پہلی ذیل میں ان مکاتیب کا متن پیش کیا جاتا ہے۔

(۱)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ورودِ توقیع ونویدِ عفو نے رواں پروری کے سو روپے بابت تنخواہ اکتوبر ۱۸۶۶ء از روئے ہنڈوی ملفوفہ معرضِ وصول میں آئے۔ یا امیر المسلمین، حضرت کا عزم رونق فزائے اکبر آباد سن کر چاہا کہ وہاں آؤں۔ ریل کی سواری کی تاب ہرگز نہ پائی۔ منزل بہ منزل جانے میں سوچا کہ آگرہ سات منزل، رام پور ۶ منزل، یہاں جو جاؤں وہیں کیوں نہ جاؤں۔ عزم مصمم کیا کہ اپنے فرزند اور آپ کے غلام کو بھیجوں۔ وہ بھی خوش خوش آمادۂ رہ روی ہوا۔ ناگاہ تپِ محرقہ نے اُسے گھیرا اور شانے کا درد علاوہ۔ مہینہ بھر ہوا کہ نہ تپ اترتی ہے نہ شانے کا درد جاتا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کی تجویز سے فصد بھی کھلی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا کسی شب کو کچھ سو رہتا ہے ورنہ ساری رات جاگتا اور ہائے ہائے کرتا ہے اس کے ساتھ سب جاگتے ہیں۔

راحتے نیست دراں خانہ کہ بیماری ہست

مجمل یہ ہے اور مکرمی میر محمد زکی صاحب عرض کریں گے، زیادہ حدِ آداب۔

تم سلامت رہو ہزار برس   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عریضۂ اسد اللہ خاں بے دست گاہ

معروضہ دو شنبہ پنجم ۵ نومبر ۱۸۶۶ء

(۲)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعدِ تسلیم معروض ہے کل حضرت کے اقبال سے ایک مسرتِ تازہ مجھ کو پہنچی، تفصیل اس کی یہ کہ اقبال نشان میرزا شہاب الدین خاں، انگریزی خوان ہے۔ اخبار انگریزی دیکھا کرتا ہے، اس نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے انگریزی اخبار میں دیکھا کہ جناب نواب صاحب قبلہ جو شریکِ اجلاس کونسل ہوتے نواب گورنر جنرل بہادر مع اور کونسل نشینوں نے نواب صاحب کے حسنِ صورت و فرطِ خلق و لطفِ تقریر سے بہت راضی و خوشنود ہوئے اور ان کی رائے سب

---

[1] دیباچہ ۲۵۴

کو پسند آئی ؎

این مراتب کہ دیدۂ جزو نیست　　کارِ کلی ہنوز در قدر ست

روز افزونیٔ دولت و اقبال کے مدارج ابھی بہت سنوں گا اور دیکھوں گا ان شاء اللہ العلی العظیم

تم سلامت رہو قیامت تک　　دولت و عزّ و جاہ روز افزوں

دوام دولت کا طالب ۔ غالب

۲۶ جنوری ۱۸۶۷ء

(۳)

حضرت ولیِ نعمت، آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے، آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مُردہ بے گور و کفن نہ رہے گا جیسا کہ میرزا جلال اسیر کہتا ہے۔

جرعۂ لطفِ تو بعد از ما بہ ما خواہد رسید

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ہے، خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے، اُس خط میں مَیں نے زوجۂ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ساٹھ روپے کرایہ کے مکان اس کے تحت میں ہیں، امین الرحمٰن اس کا بھانجا ہے مفتی جی کا کوئی نہیں۔

اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں اخیر عمر میں تین التماسیں ہیں آپ[1] سے ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو روپے کا قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے۔ دوسری التماس یہ ہے کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخششِ خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپے مہینہ جو مجھے ملتا ہے اُس کے نام پر اس کی حین حیات قرار پائے۔ یہ دو خواہشیں خواہ میری زندگی میں، خواہ میرے بعد اجرا پائیں ؎

تم سلامت رہو قیامت تک　　دولت و عزّ و جاہ روز افزوں

روز شنبہ ۵ ربیع الثانی و ۲۷ جولائی سال حال[2]

عرض داشت دولت خواہ اسد اللہ

---

[1] اصل: ہے　　[2] ۱۸۶۸ء

اب ان خطوں کے متعلق بعض قابلِ ذکر باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

خط نمبر (۱) ۔ اس خط کو مکاتیبِ غالب میں شامل کر لیا جائے تو اس کا نمبر ۷۷ اور اس کی جگہ خطوط مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء اور ۱۰ نومبر ۱۸۶۶ء کے درمیان ہوگی۔ گو راقم کا قیاس ہے کہ خط مورخہ ۱۶ اکتوبر اور اس خط کے درمیان کم از کم مرزا نے ایک خط اور ضرور لکھا ہوگا۔ خط نمبر ۷۶ میں مرزا نے نواب صاحب کو اپنی فارسی دانی اور دوسرے فرہنگ نویسوں کے متعلق کچھ ایسی باتیں لکھی تھیں[1] جن میں وہ کبیدہ خاطر ہوئے اور لکھ بھیجا۔

"پس اگر آں مشفق را ہم چنیں منظور باشد و اشارتے سازند کہ واسطۂ ترسیل رسائل از فیمابین برداشتہ شود، ورنہ بنانِ خامہ را بہ امورِ خارج المبحث تکلیف نہ دادہ باشند[2]"

مرزا بے چارے بہت گھبرائے اور فوراً ایک معذرت نامہ لکھ بھیجا[3]۔ توقیع دو قیع آیا، پڑھتے ہی کانپ اٹھا اور عالم نظر میں تیرہ و تار آ گیا" پھر آخر میں لکھا۔ گناہ معاف کیجئے اور نویدِ عفو میں مجھ کو تقویت دیجئے[4]۔ کلب علی خاں صاحب نے ان کی معذرت قبول کی[5]۔ گو ان کی طبیعت کا تکدر غالباً کلیتہً دور نہیں ہوا[5]۔

مرزا کے معذرت نامہ مورخہ ۱۶ اکتوبر اور اس خط مورخہ ۵ نومبر کے درمیان میں جو آپ کے پیش نظر ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ مرزا نے کم از کم ایک خط ضرور لکھا ہوگا جس میں ان کی معذرت قبول کرنے کا شکریہ ادا کیا ہوگا۔

مرزا غالب کی تحریر کے علاماتِ اوقاف سے جو اصحاب واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ ایک سو کی رقم کو ما عنعم لکھا کرتے تھے۔ اسے وہ محفوظ طریقۂ تحریر سمجھتے ہوں گے۔ اس کا ان کے یہاں التزام نظر آتا ہے لیکن یہاں ان کا عمل ان کے طریقۂ کار کے خلاف ہے گو اس عمل کی مثالیں اور بھی ملتی ہیں[6]۔

نومبر ۱۸۶۶ء میں آگرے میں گورنر جنرل کا دربار تھا جس میں والیانِ ریاست اور رئیسانِ نامی بھی شریک تھے۔ نواب صاحب بھی مدعو تھے لیکن

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۷۶　　[2] حواشی مکاتیب غالب ۔ ۱۷۵

[3] مکتوب نمبر ۷۷　　[4] حواشی ۱۷۶

[5] اس لئے کہ اس کے بعد پھر اور کوئی نثر انہوں نے مرزا کے پاس صلاح کے لئے نہیں بھیجی

[6] مکاتیب نمبر ۳۰، ۴۳، ۴۸

ناسازیِ طبع کے باعث راستے ہی سے لوٹ آئے اور آگرہ نہ پہنچ سکے ۔

'غلام' سے مراد عارف کے دونوں لڑکوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں میں سے کوئی ایک ہے' اس زمانہ میں حسین علی خاں کے لئے مرزا کو روپیوں کی ضرورت تھی اور متعدد خطوں میں نواب صاحب کو بھی اس کی طرف متوجہ کر چکے تھے' اس لئے قیاس ہے کہ ان کا ارادہ نواب کی خدمت میں حسین علی خاں ہی کو بھیجنے کا ہوگا' مزید اطلاع کے لئے ۱۸۶۶ء کے سارے خطوط مندرجۂ خطوطِ غالب دیکھے لیکن "خان برادران" کی اس علامت کا ذکر کہیں دیکھنے میں نہیں آیا ۔

خط نمبر (۲) نواب کلب علی خاں کو لارڈ لارنس گورنر جنرل نے لیجس لیٹو کانسل کا ممبر بنایا تھا جس کے جلسے کلکتے میں ہوا کرتے تھے' نواب صاحب وہاں گئے بھی لیکن ناسازیِ طبع کے باعث ایک ماہ بھی نہ ٹھہر سکے اور ۱۲ جنوری ۱۸۶۶ء کو رام پور واپس آگئے ۔

خط نمبر (۳) یہ خط ۱۸۶۸ء کا لکھا ہوا ہے' نواب مرزا خاں' داغ کا نام ہے جن سے مرزا کے تعلقات بہت اچھے تھے اور جنہیں وہ اکثر اپنی ضرورتوں کے لئے لکھا کرتے تھے ۔

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مرزا' ذہنی انتشار کے کس دور سے گزرے تھے اور یہ کہ مصائب کی گرفت ان پر اس قدر مضبوط تھی کہ اپنی ضرورت پیش کرنے اور مقصد حاصل کرنے کے لئے وہ جادۂ خلوص و محبت سے بھی بہک بہک جاتے تھے ورنہ ان کے قلم سے اپنے مخلص دوست مفتی صدرالدین خاں آزردہ کی موت کے بعد ان کی بیوہ کے خلاف وہ جملے نہ نکل سکتے جو انہوں نے سپردِ قلم کئے ہیں ۔ انہیں اپنی ضرورتوں کے پیش کرنے کا تو پورا اختیار تھا لیکن یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ وہ دوسروں کی ضرورتوں کو کم تر اور ہیچ گردانیں ۔

یہ نشان عع دراصل بیاض کا مخفف ہے' خط یا پیراگراف کے آخر میں بڑھا دیا جاتا ہے ۔

مرزا نے ابتدا میں بڑی خوش فہمی سے کام لیا تھا' اگست میں نواب صاحب کو لکھتے ہیں ۔ "تین التماسیں سابق [میں] پیش ہوئی تھیں سو اب پہلے مرزا خاں کی تحریر سے اور پھر مظفر حسین خاں کے خط سے ان خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی ۔ ان شاء اللہ .... نومبر دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائے گی اور اس کے واسطے اس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جائے گی[1] .... لیکن تین ہی چار ماہ میں یہ حالت ہوئی کہ وہ انتظار کرتے کرتے ایسے عاجز آئے کہ تین التماسوں میں سے دو سے دست بردار ہو گئے' وہ ۱۶ ر نومبر کے خط میں لکھتے ہیں .... ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی' اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال ؟ کبھی نہ کہوں گا .... شادی کیسی ! میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے[1] ...

مرزا اپنے قول کے پابند رہے اور مرتے دم تک اس عہد کو نباہتے رہے اور پھر کبھی ان دونوں امور کے متعلق انہوں نے رام پور کچھ نہ لکھا اور یوں ان کی زندگی میں نہ کسی لڑکے کی تنخواہ مقرر ہوئی' نہ حسین علی خاں کی شادی کے لئے کوئی مدد ملی اور نہ ان کا قرض ہی ان کے سامنے ادا ہو سکا' اور یہ ساری حسرتیں ساتھ لے کر وہ دنیا سے رخصت ہوئے ۔

مرزا کی تینوں التماسوں کا حسرت ناک انجام آپ دیکھ چکے ہیں جہاں تک لڑکوں کی تنخواہ کا تعلق ہے مرزا کے عریضہ مورخہ ۱۱ ر نومبر ۱۸۶۱ء جس میں انہوں نے اپنی بیماری کے پیش نظر درخواست کی تھی کہ میرے بیٹے (غالباً باقر علی خاں) کے لئے تنخواہ مقرر کر دی جائے[2] نواب صاحب صاف لکھ چکے تھے ۔

"ہر چند مخلص را پرورش و مراعات صاحب زادہ آں کرم فرما بدل ملحوظ و مرکوز' الا دستورِ ایں سرکار بہ عنوانِ مرقومۂ سامی نہ بودہ است[3] .."

مرزا کے انتقال کے بعد حسین علی خاں کو ۲۵ روپے ماہوار کی ملازمت رام پور میں مل گئی' گو ان کی شادی کے موقعے پر کوئی مدد کی گئی ہو اس کا پتہ نہیں چلتا' جہاں تک ادائیگیِ قرض کا تعلق ہے' امراؤ بیگم کے بار بار گڑگڑانے اور لکھنے پر کہ "مرزا صاحب کے قرض (مبلغ ۸۰۰) کی ادائیگی کا سامان کیا جائے" اور یہ کہ "میں اب نانِ شبینہ کو محتاج ہوں ۔ رحم فرمایئے اور خبر گیری کیجئے[4] ... اب قرض بھی نہیں ملتا' نوبت فاقہ کشی کی پہنچی[5] ۔ اتنا ضرور ہوا کہ ۸۰۰ کی رقم مرزا کا قرض ادا کرنے کے لئے عطا کی گئی[6] ۔ اس کے علاوہ انہیں جو نانِ شبینہ کی محتاج تھیں اور جنہوں نے نواب صاحب کو رحم فرمانے اور اپنی خبر گیری کے لئے لکھا تھا ۔ مرتے دم تک ایک حبہ بھی نہ پا سکیں ۔

مرزا غالب کے یہ تینوں خطوط بہت اہم ہیں' اور ان سے کاتب سے زیادہ مکتوب الیہ کی سیرت اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے ۔

---

[1] مکاتیب رقم ۱۱۱

[1] مکاتیب رقم ۱۱۵ ۔ [2] دیباچہ ۸ مرزا صاحب کا یہ خط متن میں محفوظ نہیں ۔

[3] دیباچہ ۹ [4] دیباچہ ۵

[5] دیباچہ ۵ [6] دیباچہ ۱۲۷

سحر رام پوری

حالی مرحوم کی غیر مطبوعہ تحریر

حال ہی میں میرے بڑے اچھے دوست جناب یونس الرحمٰن خاں صاحب مجھ سے ملنے آئے تو فرمانے لگے کہ اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں حالی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر دوں؟ میرے پاس بے کار سی پڑی ہے، تم اُسے کار آمد کر لو" مجھے بڑی مسرت ہوئی اور آج وہی تحریر میں چاہتا ہوں کہ دوسروں تک بھی پہنچ جائے، اور دوسرے بھی اندازہ کر لیں کہ اب سے قریباً چالیس، بیالیس سال اُدھر بھی ہمارا ادب، ہمارے ادیب اور ہمارے ملک کے حیثیت والے لوگ کس عالم میں تھے اور حالی مرحوم کی نظر میں ادب اور ادیبوں کے ساتھ کچھ کر سکنے والا طبقہ کون سا تھا!

حالی مرحوم نظم کے علاوہ نثر میں بھی جو درجہ رکھتے ہیں وہ یہاں دہرانے کی بات نہیں، یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ یہ تحریر کیوں لکھی گئی؟ اور رام پور سے اس کا کیا تعلق ہے؟ یونس الرحمٰن خاں صاحب کے حقیقی چچا مولوی عبدالمجید خان صاحب نے اردو کا ایک لغت طیار کیا تھا، اسی کی طیاری کے سلسلے میں وہ خاصی مدت رام پور سے باہر رہے اور اسی دوران وہ حالی مرحوم سے دو مرتبہ ملے تھے، یہ کتاب چھبیس سال کی محنت کے بعد طیار ہوئی۔ اس میں حالی مرحوم کی تحریر کے مطابق تیس ہزار (۳۰۰۰۰) مصادر مرکبہ اصطلاحیہ اردو اور سند کے اشعار تھے اور مؤلف کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب میں تخمیناً دو لاکھ (۲۰۰۰۰۰) لغات مستعملہ اردو تھے اور اتنے ہی سند میں اساتذہ کے اشعار۔ بہرحال مؤلف جب ۱۹۱۶ء میں رام پور آئے تو کسی نہ کسی طرح ان کی قابلیت اور اس بہترین کارنامہ کا حال نواب جنّت مکاں (حامد علی خاں) کے کانوں تک بھی پہنچ گیا۔ انہوں نے بلا کر قدر افزائی کی اور یہ کتاب جس کی انیس جلدیں ہو پائی تھیں مؤلف سے لے کر اپنے کتاب خانے میں داخل کرا دی جو غالباً اب بھی کتاب خانے میں غیر مطبوعہ موجود ہو گی، مؤلف نے بھی اس کتاب کا نام انہیں کے نام پر "فرہنگ حامدیہ" رکھا تھا، اسی کے صلے میں اور بقیہ لغت کی طیاری کے لئے دربار حامدی سے دو (۲) روپے یومیہ وظیفہ مقرر کیا گیا تھا جو جنّت مکاں کے بعد بند کر دیا گیا اور مؤلف کا کوئی دس (۱۰) برس ہوئے کہ انتہائی کس مپرسی کے عالم میں انتقال ہو گیا! اب آپ حالی مرحوم کی وہ تحریر ملاحظہ فرمایئے جو بہ یک وقت ایک تقریظ بھی ہے اور قوم کے صاحبِ ذوق و صاحبِ استطاعت حضرات سے ایک اپیل بھی! اصل یونس صاحب کے پاس ہے، اور نقل پیش ہے۔ (سحر رام پوری)

"مؤلف کتاب مذکور جولائی ۱۹۰۵ء میں پہلی بار پانی پت میں آکر مجھ سے ملے تھے اور فرہنگ مذکور کے مسوّدات جو اس وقت کتاب کی صورت میں ایک حد تک مکمل ہو چکے تھے، انہوں نے مجھے دکھائے، اب دوسری بار فروری ۱۹۰۸ء میں اُن مسودات کو بہت کچھ اضافے کے بعد وہ اپنے ساتھ لے کر خاکسار کے پاس پھر تشریف لائے ہیں، اور مجھ سے خواہش کی ہے کہ اس مفید اور نہایت مفید کتاب پر اپنی رائے لکھوں۔ اگرچہ ۱۹۰۵ء میں جو ایک مختصر رائے اس تالیف کی نسبت میں لکھ چکا ہوں۔ اس میں اختصار کے ساتھ مؤلف موصوف کی مساعی جمیلہ اور کتاب کے محاسن کے متعلق بقدر ضرورت لکھا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس مدت میں انہوں نے اس کی تکمیل کے لئے دور دراز سفر کئے ہیں اور اس مقصد کے لئے سخت تکالیف اٹھائی ہیں اور اپنے فرائض کو بے مثل کوشش کے ساتھ ادا کیا ہے اس لئے میرے نزدیک بھی وہ پہلی مختصر رائے کافی نہیں!

اگرچہ اس فرہنگ کو تمام و کمال مجھے دیکھنے کی فرصت نہیں ملی لیکن جس قدر مقامات مؤلف موصوف نے مجھے خود پڑھ کر سنائے ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصادر مرکبہ کے تفحص اور استقراء میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا، جو فرہنگیں یا ڈکشنریاں اس سے پہلے لکھی جا چکی ہیں ان کو مصادر مرکبہ کے لحاظ سے اس فرہنگ کے ساتھ کوئی نسبت نہیں معلوم ہوتی

خصوصاً اساتذہ کے کلام سے ہر محاورے یا مصدر مرکب پر سند بہم پہنچاتے ہیں مؤلّف نے فوق العادت کوشش اور دماغ سوزی کی ہے، حق یہ ہے کہ سند کے اشعار اہلِ زبان کے دواوین اور مثنویات اور ہر قسم کے نظم و نثر سے بہم پہنچانا ایک ایسا دشوار گزار مرحلہ تھا جس کا طے کرنا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا، مؤلّف کو اس کام کے سر انجام کرنے کے لئے صرف دماغی محنت اور جسمانی تکالیف کے اٹھانے ہی کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک مُدّت دراز تک جس کی میعاد تقریباً سولہ برس ہوتی ہے سفر دور و دراز کے اخراجات اور اپنے اور اپنے متعلقین کے مصارف خور و نوش کے لئے زرِ خطیر کی ضرورت تھی چنانچہ جو کچھ سرمایہ از قسم نقد و جنس ان کے پاس تھا وہ سب اس کتاب کی نذر ہو گیا۔

سب سے پہلے ۱۳۰۹ھ میں مؤلّف نے قریب پانچ برس دہلی میں قیام کیا، کیوں کہ زبان اردو کا اصل منبع دہلی ہے، جب سرمایہ بالکل خرچ ہو گیا، اور کتاب کی تکمیل میں بہت کچھ کرنا باقی تھا، دہلی سے اُٹھ کر جہاں جہاں دوست، احباب اور کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ وہاں وہاں جا کر دو دو چار چار ماہ قیام کیا۔ علی گڑھ، آگرہ، بلند شہر، تھوڑے تھوڑے دن قیام کر کے لکھنؤ کا ارادہ کیا اور وہاں کے مشاہیر سے مل کر اپنی کوشش کی داد لی۔ اور جس قدر اساتذہ کا کلام وہاں میسر آیا اس سے سند کے اشعار بہم پہنچائے پھر پنجاب کا سفر کیا۔ میرٹھ، مظفر نگر، انبالہ سے گزرتے ہوئے لاہور پہنچے پھر وہاں سے پانی پت!

بلند شہر کی راہ سے بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب کی خدمت میں جا کر ان کے کتب میں کئی مہینے تک کام کیا۔ اس کے بعد دیگر قصبات و قریات میں جہاں دواوین اردو کا سراغ لگا وہاں جا کر ان سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد حیدر آباد پہنچ کر ایک سال چھ ماہ تک مرزا سراج الدین احمد خاں اور مولوی عبدالحق بی۔ اے کی اعانت سے کتاب کو بہ ہمہ وجوہ طیّار اور مکمل کر دیا جو تیس ہزار مصادر مرکبہ اصطلاحیہ اور اشعار سند پر مشتمل ہے۔

مؤلّف موصوف نے بہ مقابلہ دیگر فرہنگوں کے یہ بہت بڑا کام کیا ہے کہ حتی الامکان ہر لفظ یا محاورے یا مصدر مرکب کی سند میں دہلی اور لکھنؤ دونوں شہروں کے اساتذہ کے کلام سے استناد کیا ہے اور صرف غزلیات کے دواوین پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ لکھنؤ کے تمام نامور مرثیہ گویوں کا کلام سند کے اشعار بہم پہنچانے کے لئے اوّل سے آخر تک مطالعہ کیا ہے!

اب یہ کتاب بہ ہمہ جہت مرتّب ہو چکی ہے اور وہ وقت آ گیا ہے کہ اس کو چھپوا کر شائع کیا جائے، لیکن حالتِ موجودہ میں اس کا چھپوانا اور ملک میں شائع کرنا مؤلّف کی استطاعت سے باہر ہے، اس کام کے لئے جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے کئی ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ اگرچہ امید واثق ہے کہ چھپ جانے کے بعد ملک میں اس کتاب کی بہت قدر ہوگی اور مؤلّف کی کوشش کا ثمرہ اُن کو خاطر خواہ ملے گا مگر جب تک کتاب مسوّدے کی صورت میں ہے اور ملک میں عام طور سے شائع نہیں ہو لیتی اس وقت تک مؤلّف کی محنت اور جاں فشانی کی داد ملنی ممکن نہیں!

افسوس ہے کہ ہمارے رؤسائے ذی اختیار جو ایسے مفید کاموں کی بہت کچھ قدر کر سکتے ہیں ایسے امور سے بالکل دلچسپی نہیں رکھتے۔ ورنہ ایک متوسّط درجے کا رئیس اس کو طبع کرانے اور شائع کرنے کا بہ آسانی متکفل ہو سکتا ہے۔ مگر ہم کو امید ہے کہ ہندوستان کے متوسط الحال لوگ جن کے علم و فضل اور لیاقت پر اس ملک کو فخر ہے اس کتاب کے چھپوانے اور اس کے شائع کرانے میں مؤلّف کی معقول امداد کریں گے۔ کیوں کہ ہندوستان میں اگر کچھ ملک کی بھلائی کی امید ہو سکتی ہے تو اسی متوسط درجے کے طبقے سے ہو سکتی ہے اور جو کچھ اب تک ہمارے ملک کی بھلائی کے لئے ظہور میں آیا ہے وہ انہیں لوگوں کی امداد و اعانت سے ظہور میں آیا ہے ؎

ملک کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جان آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی
تم ہمارے کام آؤ، ہم تمہارے کام آئیں
جس سے کل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت ہے یہی

مجھے اُمید ہے کہ ہمارے اہلِ وطن جو اس کتاب کے مسوّدے کو دیکھیں گے وہ ضرور تسلیم کریں گے کہ یہ کتاب جس قدر جلد شائع ہو بہتر ہے"!

(دستخط) خاکسار
الطاف حسین حالی ۔ ۱۰ر فروری ۱۹۰۸ء

ہنسراج رہبر

امرتا پریتم

پنجابی کی مشہور شاعرہ

ہندی شاعری میں جو درجہ مہادیوی ورما کو حاصل ہے۔ امرتا پریتم کو پنجابی شاعری میں وہی درجہ حاصل ہے۔ امرتا کی شہرت کا کارن اس کے رس بھرے گیت ہیں۔ ان گیتوں میں جذبات کی گہرائی اور تخیل کی بلندی کے علاوہ ایک گھریلو سادگی ہوتی ہے۔ اور سادگی ہی گیت کا سب سے بڑا حُسن ہے اور پھر امرتا کے گیتوں اور نظموں میں پنجاب کا قدرتی ماحول روایت اور روزمرہ کا محاورہ کچھ اس انداز سے رچا بسا ہوتا ہے کہ اُنھیں پڑھتے وقت قاری اپنے اندر ایک غیر معمولی شگفتگی اور آسودگی محسوس کرتا ہے۔ ہر ایک بند، ہر ایک سطر پڑھنے والے کے ذہن پہ شاعرہ کی لطیف اور دل کش شخصیت کا اَمٹ نقش قائم کرتی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کامیاب شاعری — اور ہر فنِ لطیفہ کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔

ادب اور آرٹ خارجیت اور داخلیت کے حسین امتزاج سے تخلیق ہوتا ہے۔ امرتا کی شاعری میں یہ وصف بدرجہ اتم موجود ہے۔ مثلاً "سائے" نظم کی یہ سطور ملاحظہ فرمائیے

سورج ڈھل گیا
سائے پھیلتے جا رہے ہیں
شام ہو گئی
سائے اور بھی پھیلتے جا رہے ہیں
جیسے بھولی بسری یادیں
کبھی کبھار ذہن میں آتی ہیں
اور ذہن میں آتے آتے
ایک تصویر سی بن جاتی ہے

اور ایک نظم ہے "امڑی دا ویہڑا" (ماں کا آنگن) جس میں اس لڑکی کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے جسے بیاہ کے بعد ماں کا گھر یاد آ رہا ہے۔

بیت گیا، دن بیت گیا!
جیسے ایک روئی کا پلندا (گوہڑا) کات، تُوم کر بُن لیا جاتا ہے۔
جہاں کئی سپنے بنائے تھے
آج بذات خود سپنا بن گیا — ماں کا آنگن!

اس آنگن کی یاد ہر لمحہ اُجاگر ہوتی جا رہی ہے۔ دوشیزہ کو اپنی سہیلیاں یاد آتی ہیں۔ وہ اُنھیں مخاطب کر کے کہتی ہے ؎

اِدھر شام کا ہونا اور اُدھر ہم سب کا اکھٹے ہو جانا
دادی کی چارپائی کے ارد گرد گھومنا
اسے نیند نہ آنا، ہمارا شور مچانا
اس کا نہ، نہ کرنا، ہمارا ہاں ہاں کہنا
اس کا خاموش کرانا، ہمارا شور مچانا
اس کی نہ نہ کا ختم ہونا ہمارا آفت برپا کرنا
اور آخر ہمارا دادی سے ہاں منوانا
تھوڑا سا رُوٹھ کر، تھوڑا سا ہنس کر
وہ بات شروع کر دیتی، ہمیں کوئی کہانی سُناتی

جو لوگ پنجاب کی زندگی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ پنجاب کی الھڑ، جوان اور بے باک لڑکیاں ماں باپ کے گھر میں اس طرح ضد کرتی ہیں اور حُسن اور جوانی سے متوالی پنجاب کی یہ دوشیزائیں مل کر "بھانگڑا" ڈالتی ہیں جو بالخصوص مغربی پنجاب کا زندگی سے بھرپور رقص ہے

امرتا بھی اسی پنجاب کی ایک دُختر ہے۔ اس کی عمر اس وقت اکتیس بتیس سال ہے۔ اس کا جنم ۳۱ اگست ۱۹۱۹ء کو گوجرانوالہ میں ہوا تھا۔ لیکن اس کا بچپن اور جوانی لاہور میں بسر ہوئی۔ ادبی ذوق اور شاعری اسے اپنے والد سے وراثت میں ملی ہے۔ جب امرتا کی عمر صرف دس سال تھی تو ماں کا انتقال ہو گیا۔ باپ ہی نے اپنی اس بیٹی کو لاڈ پیار

سے پالا۔ امرتا کے پتا سردار کرتار سنگھ ہتکاری مذہبی ٹریکٹ نظم اور نثر میں لکھ کر خود ہی چھاپتے اور فروخت کرتے تھے اور ایک ماہوار رسالہ "رنجیت نگارہ" نکالتے تھے۔ اُن کی یہ بڑی خواہش تھی کہ امرتا ایک شاعرہ بنے۔ اس لئے انھوں نے چھوٹی عمر میں ہی اپنی اس اکلوتی اور چہیتی بیٹی کو نہ صرف پنگل یعنی علمِ عروض کی تعلیم دی بلکہ پیار اور محبت سے اس میں شاعری کی رُوح پھونک دی۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں یعنی ۱۹۳۶ء میں امرتا کی نظموں اور گیتوں کا پہلا مجموعہ "امرت لہراں" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی سب چیزیں روائتی تھیں جن میں نیکی کر دریا میں ڈال اور محبت میں پروانے کی طرح قربان ہونے کی باتیں کہی گئی تھیں۔ اس میں باپ کی تعلیم اور مذہبی ماحول کا اثر بھی شامل تھا۔ اور شاعرہ کا اپنا شعور ابھی نکھرا نہیں تھا اس لئے امرتا کا یہ مجموعہ صرف مشقِ سخن کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد دوسرا مجموعہ "جیوندا جیون" (جیتی جاگتی زندگی) کے نام سے شائع ہُوا اور اسی مجموعے سے دراصل امرتا کی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے شعور میں پختگی اور نظر میں وسعت کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے اور خود شاعرہ کو اپنی انفرادیت کا احساس ہو جاتا ہے وہ کہتی ہے ؎

اے آنکھوں والے ذرا جھانک کر دیکھ
اس شاعر لڑکی کی آنکھوں میں
کوئی چھپی ہوئی ٹیس دریافت کر لینا
اس کی خاموش آواز میں

اس وقت شاعرہ کے سینے میں جو ارمان پرورش پا رہے تھے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ اس ماحول میں وہ پروان نہیں چڑھ سکتے۔ لہٰذا وہ ماحول کو بدلنے کی تمنّا ظاہر کرتی ہے

اے نوجوان ہمیں رنگ بدلنا ہے
جنگ کا امکان ختم کرنا ہے
ہمیں مر کر بہشت میں جانے کی خواہش نہیں
ہم تو اس زمانے کو بدلیں گے
ہم زندگی کے راگ گائیں گے
اے نوجوان ہمیں ہی سب کچھ کرنا ہے

پھر ہندوستان اور خاص طور پر پنجاب کے بیشتر باشندوں کی گذر کھیتی باڑی پر ہوتی ہے۔ کسان سب کا اَن داتا ہے۔ لیکن اس اَن داتا کی اپنی حالت بہت ہی خستہ اور افسوسناک ہے۔ زمانے کو اپنے سے کہیں زیادہ اُن کے لئے بدلنے کی ضرورت تھی لکھا ہے ؎

آج کے ہالی بھوک سے بیزار ہیں
کسانوں اور مزدوروں کے پیٹ خالی ہیں
جو دوسروں کو خوشحال بناتے ہیں
وہ خود کنگال ہیں
ہائے! آج وہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں
جو پانچ دریاؤں کے مالک ہیں
اے سکھیو! ہمارا دیس پنجاب
زندگی میں کوئی تبدیلی چاہتا ہے

یہ مجموعہ کافی مقبول ہوا۔ اس کے بعد جو دو تین مجموعے اور شائع ہوئے اُن میں رُومانیت اور انفرادیت غالب ہے۔ اکثر نظمیں آزاد بحروں میں لکھی گئی ہیں۔ اس زمانے میں اُردو کی طرح پنجابی شاعری پر بھی ٹیگور کے گیتوں کا بہت اثر پڑا۔ امرتا نے اس رجحان کی قطعی پیروی کرنے کے عوض اس سے استفادہ کیا۔ اس نے اپنی شاعری کی نوک پلک کو سنوارا۔ اس میں گہرائی اور خوبصورتی پیدا کی اور اچھوتی اور نادر تشبیہیں اختراع کیں مثلاً ؎

تیرا ننھا سا خیال
میرے دل کی گہرائیوں میں سویا پڑا ہے

شہر سے اُکھڑی ہوئی تان
قطار سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح چلاتی ہے

دو بدلیاں
عاشق کے ہونٹوں کی طرح سرد اور نیلی

امرتا کی رومانوی نظموں میں محبت کی کسک خیال کی نُدرت اور پنجاب کی روایت بدرجہ اتم موجود ہے۔ مثلاً اس کی ایک نظم "رانجھے دے تیرا ناں" دا اے رانجھے تیرا نام) اصل میں جو لُطف ہے وہ ترجمے میں قائم نہیں رہ سکتا۔ تاہم ترجمہ ہی پیش کیا جاتا ہے ؎

اے رانجھے تیرا نام
پہلے مولوی نے لیا
جس نے یہ نام تجویز کیا

پھر تیری خوش قسمت ماں
رانجھن رانجھن کہتی رہی
اے رانجھے تیرا نام
ماں نے لیا
باپ نے لیا
بھائیوں نے لیا
بہنوں نے لیا
بھابیوں نے لیا
سارے گاؤں نے لیا
اے رانجھے تیرا نام!
انھیں کسی نے مجرم نہیں ٹھہرایا
کسی نے منع نہیں کیا
لیکن اس وقت کیوں
اے رانجھے گناہ بن گیا؟
جب مجھ بدقسمت ہیر نے اپنے مُنہ سے نکالا
اے رانجھے تیرا نام!

رانجھن تیرے کا نام
اے ہیر!
رانجھن تیرے کا نام
کیا ہُوا اگر مولوی نے لیا
کیا ہُوا اگر ماں اور باپ نے لیا
کیا ہُوا اگر بھائیوں اور بھابیوں نے لیا
خواہ سارا گاؤں لیتا
لیکن اے ہیر! اگر تو یہ نام نہ لیتی
تو آج کون اس کا نام لیتا؟

صدیوں کے بعد بھی آج لڑکیاں
اپنے ساجن کا
رانجھا نام لکھ لیتی ہیں
اے ہیر!
تیرے رانجھے کا نام!

رانجھے اور ہیر کے نام سے کون واقف نہیں۔ وارث شاہ نے انھیں لافانی بنا دیا ہے اور اکثر فخر سے کہا جاتا ہے کہ پنجاب کی ہر ایک لڑکی ہیر اور ہر ایک لڑکا رانجھا ہے۔ دراصل یہ دو نام پنجابی قومیت کے مجموعی کردار کی نمائندگی کرتے ہیں اور امرتا کی اس سیدھی سادی رُومانی نظم کی تہ میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔

شاعر کی انفرادیت اپنے ماحول کی پیداوار ہوتی ہے اور یہ ماحول اس کے ملک سے اور تمام دُنیا سے وابستہ ہوتا ہے۔ بڑ کا پیڑ جتنا گھنا اور چھتنار ہوتا ہے اُتنا ہی وہ اپنی جڑیں دُور دُور تک پھیلا دیتا ہے وہ اُن کے ذریعے سے تندرستی، توانائی اور رعنائی حاصل کرتا ہے۔ اس پھیلاؤ کے بغیر پھلنا پھولنا مشکل نہیں اسی طرح شاعر اگر اپنی انفرادیت کی نشو و نما کو رُکنے دینا نہیں چاہتا تو اسے ذاتی خواہشات اور محسوسات سے گزر کر تمام انسانیت سے اپنا رشتہ وابستہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے دُکھ کو اپنا دُکھ اور سُکھ کو سکھ سمجھنا ہوتا ہے۔ تبھی اس کی تخلیقات میں توانائی اور رعنائی آتی ہے تبھی انھیں دوام حاصل ہوتا ہے۔

امرتا میں خلوص اور ہمدردی موجود تھی وہ زندگی کو مردہ اور بے حس نہیں بلکہ ہنستی، کھیلتی اور رواں دواں دیکھنا چاہتی تھی لیکن حالات اُس کے برعکس جا رہے تھے۔ عالمگیر جنگ کی تباہ کاریوں اور بنگال کے قحط نے امرتا کے جذبات کو نہایت شدت سے جھنجھوڑ دیا۔ انفرادیت کے معصوم اور خوبصورت گھروندے ٹوٹ گئے اور شاعرہ نے اپنی ذات کو وسیع انسانیت سے وابستہ کر دیا۔ اُس وقت اس کا جو مجموعہ شائع ہُوا اُس کا نام تھا "لوک پیڑ" یعنی انسانیت کا درد، اور انسانیت کا درد اس مجموعے کی ہر سطر میں موجود ہے

مہابھارت جیسا مہابھارت
جہاں روز۔ روز۔ ہر روز
روز ہی ایک پیچیدہ سوال بنتی جا رہی ہے
وہاں کوئی عشق و محبت کی بات کیا کرے

بم کی چوٹ سے
آج مروڑ کر اُلٹ گئی ہے
آج انسان کو

"جنگ" اور "قحط" ناچ رہے ہیں

اور انسان ابھی اس جنگ اور قحط کی تباہیوں سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ شاعرہ کے اپنے پیارے پنجاب پر مصیبت اور تباہی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پانچ دریاؤں کا دیس تقسیم ہو گیا۔ ہزاروں لاکھوں انسان مارے گئے۔ ہزاروں لاکھوں گھر سے بے گھر ہو گئے۔ امرتا کو لاہور چھوڑ کر دہلی آنا پڑا۔ اس ٹریجڈی سے ہر ذی روح لرز اُٹھا۔ اس خونریزی اور آبروریزی سے پنجاب کی اس شاعرہ کا لطیف احساس کس قدر مجروح ہوا ہو گا۔ اس کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک نظم ہے "پنجاب دی کہانی"۔ (پنجاب کی کہانی) جو اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

ہونی اُٹھ کھڑی ہوئی اور جھٹ رکاب میں پاؤں رکھا
اُس کا مُنہ زور گھوڑا پوٹھا ہار کو روندتا ہوا
تمام پنجاب میں سے گذر گیا
اس کی ٹاپ سُن کر زمین آسمان لرز اُٹھے
بھارت ماتا لرز اُٹھی اب کون لاج بچائے گا
ماں نے کوئی ایسا لال نہیں جنا جو اس مُنہ زور گھوڑے کی باگ پکڑ کر اسے اُلٹا موڑ دے
ماں نے کوئی ایسا لال نہیں جنا جو کالے ناگ کو کیلے

شاعرہ بے بس دیکھتی رہی جو کچھ ہونا تھا سو ہوتا رہا۔ جو کچھ ہوا وہ واقعی شرمناک اور ہولناک تھا۔ لیکن ہیر رانجھے کی اس سرزمین میں عورت کی جو توہین، جو بے حُرمتی ہوئی وہ پنجاب کے بہادر لوگوں کی شان کے شایاں نہیں تھا۔ جب انہی کے ہاتھوں انسانیت کی لاج لُٹنے لگی تو پنجاب کی بیٹی نے پنجاب کے سب سے حساس انسان شاعر وارث شاہ کو پُکارا ؎

میں وارث شاہ سے کہہ رہی ہوں کہیں قبروں میں سے بول
آج عشق کی کتاب کا کوئی اگلا ورق اُلٹ دے
پنجاب کی ایک بیٹی روئی تھی تو تُو نے اتنی بڑی کتاب لکھ دی تھی
آج لاکھوں بیٹیاں رو رو کر کہہ رہی ہیں
اے دردمندوں کے دردمند اُٹھ کر اپنے پنجاب کو دیکھ!
آج کھیت لاشوں سے پٹے ہوئے ہیں اور چناب لہو سے لبریز ہے
کسی نے پانچوں دریاؤں کے پانی میں زہر گھول دیا
اور اس زہر آلود پانی سے دھرتی کو سینچ دیا

پنجاب کی زرخیز دھرتی کے روئیں روئیں سے زہر پھوٹ پڑا۔

پنجاب کی اس تقسیم اور خونریزی پر امرتا کی ایک اور نظم "کنکاں دا گیت" (گیہوں کا گیت) ایک دو بند ملاحظہ فرمائیے ؎

گیہوں کی فصلیں اُگ آئی ہیں
اے راہ چلتے راہی
اے سننے سُنانے والو!
دُکھوں کی کہانیاں دُکھ سے بھی طویل تر ہیں
گیہوں کی فصلیں اُگ آئی ہیں

گیہوں کی فصل سیاہی مائل ہے
ماہی وال[1] رو رہے ہیں
سوہنیاں[2] رو رہی ہیں
آج چناب رو رہا ہے راوی رو رہا ہے
گیہوں کی فصل سیاہی مائل ہے

گیہوں کو بھوسے سے الگ کر لیا گیا
ہم نے اکٹھے کھیت جوتے تھے
اکٹھے بیج بویا تھا
یہ کون ہے جس نے آ کر دانہ دانہ بانٹ دیا
گیہوں کو بھوسے سے الگ کر دیا گیا

امرتا کی شاعری کی یہ ایک معمولی سی جھلک ہے۔ اس کے اور بہت سے پہلو ہیں۔ امرتا ایک عورت ہے۔ ہمارے موجودہ سماج میں عورت کی جو حیثیت ہے وہ واقعی رنجدہ ہے۔ عورت کی اس بے بسی اور مجبوری کو امرتا محسوس نہ کرتی تو ممکن نہیں تھا۔ اُس نے اپنی نظموں اور گیتوں میں صنفِ نازک کی غلامی کے خلاف بارہا احتجاج کیا ہے۔ اس سلسلے میں "نیا دان" "گنو شالہ" اور "دان دا تا" بہت ہی کامیاب نظمیں ہیں ایک حساس عورت کے جذبات کی شدّت کو بہت ہی حسین انداز میں پیش کیا گیا۔ امرتا

---

[1] ہیر رانجھے کی طرح ماہی وال بھی پنجاب کا ایک عاشق ہے

[2] اُس کی محبوبہ

کے شعور کی تعمیر میں حسن اور رومان کا عنصر اس درجہ زیادہ ہے کہ دُنیا کی بے رحمیاں بھی اسے تلخ نہیں بنا پاتیں۔ وہ احتجاج بھی متانت اور ملائمت سے کرتی ہے جس سے احتجاج کا اثر بڑھ جاتا ہے اور طنز گہرا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک نظم "راکھے" یعنی محافظ کے کچھ حصے پیش کرتا ہوں ؎

اُنہیں کتنی فکر ہے
پڑوسی کی بیٹی کی
ہمسائے کے لڑکے کی

کس طرح دھیان رکھتے ہیں
اپنے کام کا قیمتی وقت
کس طرح خرچ کر دیتے ہیں
محافظ ہونے کا حق ادا کرتے ہیں
(انھیں) کچھ لینا نہیں، دینا نہیں
صرف سماج کی سیوا پیش نظر ہے

دراریں جھانکتے ہیں
گھنٹوں صرف کر کے
گیان تلاش کرتے ہیں
یہ بے چارے محافظ

پھر فکر کے مارے
کانا پھوسی کرتے ہیں
کھسر پھسر کرتے ہیں
انھیں کتنی فکر ہے
پڑوسی کی بیٹی کی
ہمسائے کے لڑکے کی

امرتا آجکل دہلی میں رہتی ہے۔ نظموں کے متعدد مجموعوں کے علاوہ اس کے دو ناول بھی شائع ہو چکے ہیں جو مقبول ہوئے ہیں۔

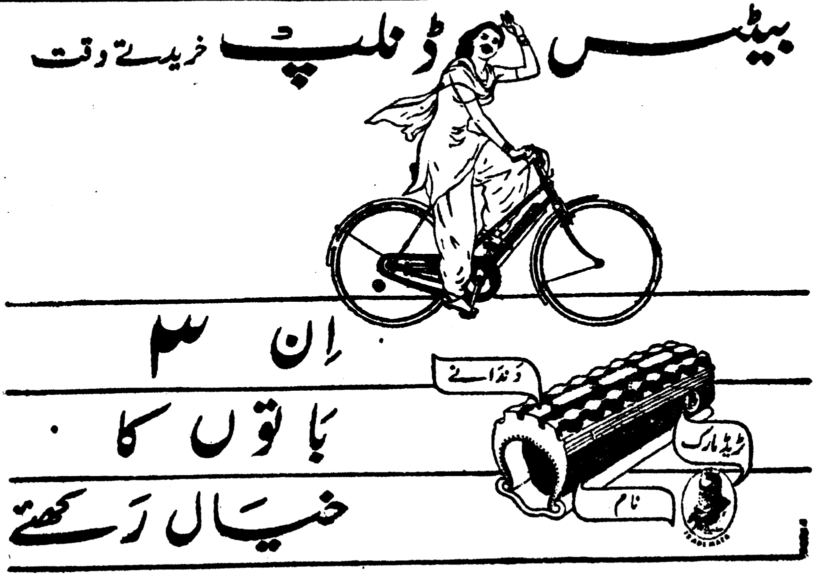

امرتا پریتم
پنجابی کی مشہور شاعرہ
آپ کی شاعری سے متعلق ہنسراج رہبر کا مضمون اسی شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

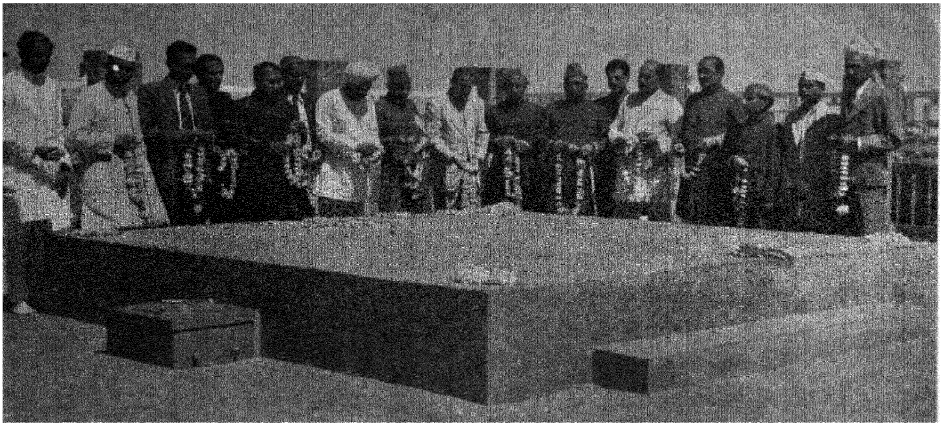

انڈو پاکستان مشاعرہ ۱۵ اور ۱۶ مارچ کو چیمسفورڈ کلب نئی دھلی میں ایک انڈوپاکستان مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت پہلے روز ہزایکسیلنسی مسٹر آصف علی گورنر اڑیسہ اور دوسرے روز شری شنکر پرشاد چیف کمشنر دھلی نے کی - پاکستان سے ابوالاثر حفیظ، مولینا عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور سید محمد جعفری مشاعرے میں شرکت کے لئے تشریف لائے - تصویر میں پاکستانی شعراء ھندوستانی شعراء اور ادبا کے ہمراہ گاندھی جی کی سمادھی پر عقیدت کے پھول چڑھا رہے ہیں -

پاکستان سے تشریف
لانے والے شعراء

گاندھی جی کی سمادھی پر

بائیں سے دائیں -
مولینا عبدالمجید سالک
صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
ابوالاثر حفیظ جالندھری
اور سید محمد جعفری

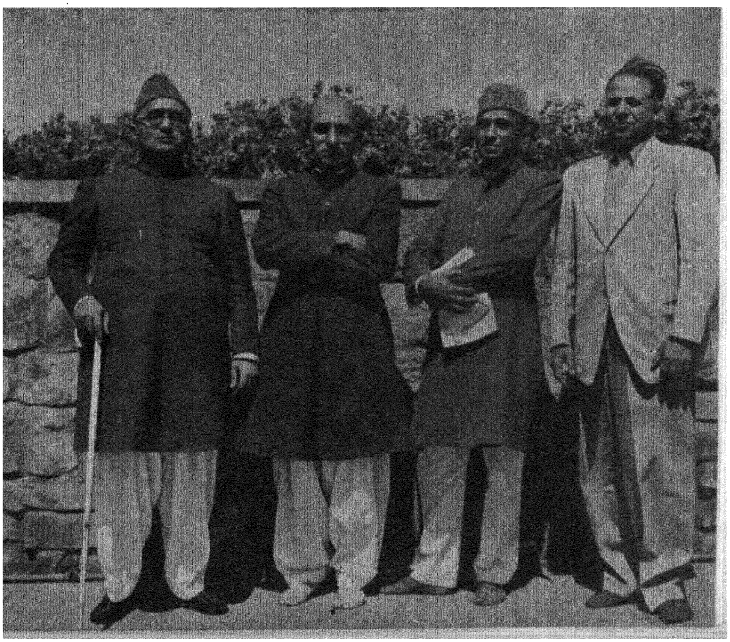

دھلی میں فلمی میلہ

دھلي میں فلمي میلے کي تقریب میں حصہ لینے کے لئے فلمي ستارے بمبئي سے دھلي آئے - أنھیں دیکھنے کے لئے ھزاروں کي تعداد میں شائقین نیشنل سٹیڈیم میں جمع ھوئے - اوپر کي دو تصویریں اسي موقع پر لي گئیں - بائیں طرف :- نسیم اور موتي لال دائیں طرف :- نرگس اور راج کپور -

فلمی ستارے نیشنل اسٹیڈیم میں بائیں سے دائیں :- دورگا کھوٹے ، وجیلکشمي ، مالا ، وینا ، نگار ، نسیم ، ملکہ (ثریا کي والدہ) اور ثریا -

ثریا
موجودہ دور کی ایک نامور اداکارہ

فلمی دُنیا

ہندوستان کی صنعتِ فلم سازی پر ایک نظر

آغاز

فلمی دنیا کی کہانی، فلم سے بھی زیادہ دلچسپ، حیرت انگیز اور ناقابلِ فراموش ہے۔ فلموں نے جس سرعت سے مقبولیت حاصل کی ہے اس کا اندازہ ہر فلم دیکھنے والا بخوبی لگا سکتا ہے۔

یہ ۱۸۹۰ء کا واقعہ ہے کہ برطانوی پولیس برسل کے ایک معمار کے لڑکے کے پاس گئی اور اُس سے درخواست کی کہ وہ اپنی اُس مشین کا استعمال بند کر دے، جس کے ذریعے سے وہ لندن کے پکاڈلی کی ایک کھڑکی میں چلتی پھرتی تصویریں لوگوں کو دکھاتا ہے۔

جب لڑکے نے اس کی وجہ دریافت کی تو پولیس نے کہا کہ "تمہاری اس نمائش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کا ہجوم دیکھنے کے لئے اکھٹا ہو جاتا ہے اور سڑکوں کی ٹریفک تک بند ہو جاتی ہے۔"

یہ تھا سینما کے موجد ولیم فریسے کی ابتدائی کوششوں کا صلہ اور آج ۴۶ برس کے بعد باکس آفس کی رُو سے وہی فلم کامیاب تصوّر کی جاتی ہے جس کے یومِ افتتاح پر ہی سنیما ہال کے سامنے وہ ہجوم اکٹھا ہو کہ سب راستے رُک جائیں، ساری ٹریفک بند ہو جائے۔

۱۸۹۶ء میں لنڈن کی ریجنٹ اسٹریٹ کے سنیما ہال میں جب سب سے پہلے عوامی طور پر ایک برطانوی فلم کی نمائش کی گئی تو صرف ۵۴ آدمی اسے دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ لیکن آج آپ سُن کر حیران ہوں گے کہ دُنیا کے ایک لاکھ سنیما گھروں میں تقریباً بتیس کروڑ لوگ ہر روز سنیما دیکھتے ہیں۔

ہندوستان میں :-

ہندوستان میں اس اہم، ہر دلعزیز اور دلچسپ صنعت کی ابتدا ۱۹۱۲ء میں ہوئی اور اس کے جنم داتا دادا صاحب پھالکے ہیں۔ جنہوں نے سب سے پہلے ایک خاموش فلم "ہریش چندر" بنا کر ہندوستان میں صنعت فلم سازی کی بنیاد ڈالی۔ اور بمبئی میں سب سے پہلے وہاں کے کارونیشن سنیما میں ایک خاموش فلم ریلیز کی گئی۔ اور اس کے بعد اٹھارہ سال تک خاموش فلموں کا دَور رہا۔

پہلی متکلم فلم

مارچ ۱۹۳۱ء میں ہندوستان کی فلمی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جبکہ امپیریل اسٹوڈیو بمبئی نے ملک میں سب سے پہلی ٹاکی فلم "عالم آرا" پردۂ سیمیں پر پیش کی۔

دلچسپ اعداد و شمار

اُس دن کے بعد ہندوستانی ترقی کی شاہراہ پر خوب تیزی سے گامزن ہوا۔ اور آج یہ عالم ہے کہ ہندوستان کی صنعتِ فلم سازی امریکہ کے بعد دُنیا بھر میں سب سے بڑی صنعت ہے اور اس وقت ملک میں ساٹھ فلم اسٹوڈیوز اور ۲۲۵۰ سنیما ہال ہیں۔ یہاں ہر سال پونے تین سو فلمیں تیار ہوتی ہیں۔ جن کی مجموعی لمبائی بیس کروڑ فٹ کے قریب خیال کی جاتی ہے اور ہر سال ساٹھ کروڑ کے قریب افراد فلم دیکھتے ہیں۔

کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس عظیم صنعت پر بتیس کروڑ روپے کا قائم اثاثہ اور نو کروڑ روپے کا چالو سرمایہ لگا ہوا ہے۔ ہر سال بیس کروڑ روپے کی آمدنی صرف اسی صنعت سے ہوتی ہے۔ ایک لاکھ آدمی اسی صنعت کی بدولت اپنی روزی کما رہے ہیں۔

آپ کو بظاہر سنیما گھروں کی تعداد بہت زیادہ نظر آتی ہوگی۔ لیکن آپ سُن کر دنگ رہ جائیں گے کہ ہمارے ملک میں ۱,۱۵,۴۰۰ آدمیوں کے لئے صرف ایک سنیما گھر ہے جبکہ برطانیہ میں ۹,۳۸۴ اور امریکہ میں ۷,۲۲۲ آدمیوں کے لئے ایک سنیما گھر ہے۔

ہندوستان میں آج کل ہندی۔ پنجابی، گجراتی، بنگالی، تیلگو، تامل، ملیالم، مراٹھی، کناری اور انگریزی تقریباً دس بارہ زبانوں میں فلمیں تیار ہو رہی ہیں۔

حکومت کا حصّہ

۱۵ جنوری ۱۹۵۱ء سے بھارت سرکار کی جانب سے فلموں کو سنسر کرنے کی غرض سے

بمبئی میں ایک سنٹرل بورڈ آف سنسرز قائم کر دیا گیا ہے۔ اور مدراس و کلکتہ میں اس کے علاقائی دفتر کھول دیئے گئے ہیں۔ نئے انتظام کے تحت بعض فلموں کی نمائش کو صرف بالغوں کے لئے مخصوص کرنے کے لئے اُسے "اے" کلاس کا سرٹیفکیٹ دے دیا جاتا ہے۔ مرکزی سنسر شپ کی طرف سے ایک ہزار فٹ کی ہر فلم ریل کے لئے چالیس روپے فیس حاصل کی جاتی ہے اور تعلیمی فلموں کے لئے یہ شرح پانچ روپے فی ہزار فٹ ہے۔

ہندوستانی فلموں کے معیار کو بلند کرنے کے لئے ایک "فلم کونسل آف انڈیا" کی سفارش کی گئی ہے جو فنی کاروں کی تربیت کے علاوہ انھیں ہر سال متعدد انعامات بھی پیش کیا کرے گی۔

بین الاقوامی فلمی میلہ

بمبئی میں ۲۴ جنوری ۱۹۵۲ء کو ہندوستان میں بہترین بین الاقوامی فلمی میلے کا افتتاح کیا گیا۔ اور بعد میں یہی میلہ مدراس، دہلی اور کلکتے میں شروع ہوا۔ یہ اپنی طرز کا واحد اور عدیم النظیر فلمی میلہ تھا۔ آج تک دُنیا بھر میں ایسا میلہ منعقد نہیں ہوا۔ جتنی فلمیں اس میلے میں دکھائی گئی ہیں اتنی آج تک کسی بھی ملک کے کسی میلے میں پیش نہیں کی گئیں۔ اس میلے میں مشرق اور مغرب کے ۲۳ ملکوں کی طرف سے تیرہ مختلف زبانوں میں ۴۵ فیچر اور ۱۵۰ ڈاکومینٹری فلمیں دکھائی گئیں۔

اس میلے نے اوپن ایئر تھیئٹر کے تجربے کو بہت کامیاب ثابت کیا۔ اُمید کی جاتی ہے۔ کہ اب ملک میں اوپن ایئر تھیئٹر کے سلسلے کو بہت فروغ ملے گا۔ اس میں بیک وقت چار ہزار سے سات ہزار تک لوگ بیک وقت فلم دیکھ سکتے ہیں۔

دوسرے ملکوں سے ڈیلی گیٹ اور نمائندے بھی اس میلے میں شمولیت کے لئے آئے۔ روس سے ۱۳۔ پاکستان سے ۸ اور چین سے ۵ ڈیلیگیٹوں کا ایک ایک وفد آیا۔ اور ان کے علاوہ فرانس، برطانیہ۔ چیکوسلواکیہ۔ اٹلی، سوئٹزرلینڈ، انڈونیشیا، مصر، ہنگری اور مغربی جرمنی سے فلمساز اور نمائندے آئے۔ روس کے ممبران میں پانچ عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پیغاماتِ خوشنودی دینے کے علاوہ آپس میں تبادلۂ خیالات بھی کیا۔

عوام نے اس میلے کا خوب گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ملک کے تیس سینما گھروں میں دنیا کی بہترین فلموں کی نمائش کی گئی اور انھیں کم و بیش دس بارہ لاکھ لوگوں نے ذوق شوق سے دیکھا۔

میلے کے اختتام پر وزارتِ نشر و اطلاعات کے منسٹر آف اسٹیٹ آنریبل شری آر۔ آر دیواکر نے کہا۔ کہ بہتر فلم دیکھنے، تیار کرنے اور ثقافتی تعلقات بڑھانے کے سلسلے میں متعدد مشکلات کے باوجود یہ میلہ کافی کامیاب رہا۔

پنڈت نہرو

فلم کی اہمیت کو وزیر اعظم پنڈت نہرو نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"آج عوام کی زندگی پر فلم کا بہت اثر ہے۔ یہ انہیں غلط اور صحیح دونوں قسم کی تعلیم دے سکتی ہے۔ اس بات میں تعلیمی اور معلوماتی فلمیں ایک اہم درجہ رکھتی ہیں۔ ایسی فلموں کو ترقی دینی چاہیئے۔ اس کے علاوہ دوسری فلموں کے ذریعے سے بھی لوگوں پر صحیح قسم کا اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر فلم کے ذریعے سے ایک بھونڈے انداز سے پروپیگنڈا کیا جائے۔ اس کے برعکس ان میں زندگی کے فن کارانہ اور جمالیاتی پہلو اُجاگر کئے جائیں۔ مجھے امید ہے کہ ہیجان خیز، جذبات فروشی اور جرائم کو ہوا دینے والی فلموں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گی۔ اگر ہماری صنعتِ فلمسازی اپنے سامنے ایسا آدرش رکھے تو یہ نہ صرف ذوقِ سلیم کو ترقی دے گی بلکہ نئے بھارت کی ترقی و تعلیم میں بھی معاون ہوگی۔"

فلم ڈویژن

فلم ڈویژن نے چار سال کی قلیل سی مدت میں بے حد ترقی حاصل کی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بھارت کی ڈاکومینٹری فلمیں بین الاقوامی تقریبوں میں دس بار انعام اور اعزاز حاصل کر چکی ہیں۔ بلجیم، ہالینڈ، لکسمبرگ اور جاپان وغیرہ نے تو بھارت کی شارٹ فلموں کو اس غرض سے حاصل کیا ہے کہ انھیں اپنی زبان میں تبدیل کر کے اپنے ملک میں اُن کی تجارتی نمائش کریں۔

ملک میں ان فلموں کی مدد سے تعلیمی اور تہذیبی پرچار کو خوب فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ فلم ڈویژن ہر ہفتے چیدہ چیدہ خبروں کو بھی فلم کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

سب سے پہلے ماہ فروری ۱۹۴۳ء میں سرکاری طور پر انفارمیشن فلمز آف انڈیا نے شارٹ فلمیں تیار کیں۔ اور پھر اس ادارے کی جگہ فلم ڈویژن نے جون ۱۹۴۹ء سے بھارت کی دستاویزی فلموں اور نیوز ریلوں کی باقاعدہ تقسیم شروع کر دی۔ اب فلم ڈویژن بھارتی آرٹ، تہذیب، صنعت، زراعت، صحت عامہ اور موجودہ معاشی و سماجی مسائل کے موضوع پر بہت مفید اور کارآمد فلمیں تیار کر رہا ہے۔ اور اس ڈویژن نے ۱۹۵۱ء کے آخر تک ملک میں ۱۰۶ ڈاکومینٹری اور ۱۶۷ نیوز ریلیں جاری کی ہیں۔ اور اب یہ ڈویژن ہر سال اوسطاً ۳۰ ڈاکومینٹری اور ۵۲ نیوز ریلیں تیار کر رہا ہے۔

حمیدہ سلطان

غالب کا ایک شعر

مرزا غالب کی جوانی کی دوپہر ابھی ڈھلی نہیں ہے ۔ استاد ذوق اور حکیم مومن خان سے شاعرانہ چوٹیں چلتی آتی ہیں ۔

شام کو مرزا صاحب کے دیوان خانے میں دلّی کے عمائد اور شرفا کا مجمع ہوتا ہے کبھی شعر و ادب کے تذکرے ہوتے ہیں اور کبھی گنجفہ چوسر۔ مرزا غالب کے جدید اسلوب شاعری اور انفرادی غور و فکر نے دلّی کے اکثر شعرا کو ان کا مخالف بنا دیا ہے ۔ یہ لوگ ہمیشہ مشاعروں میں مرزا غالب کو زک دینا چاہتے ہیں مگر ان کی طبعی جودت اور دلکش ذہانت کی بدولت تمام سربرآوردہ لوگ مرزا غالب کا احترام کرتے ہیں اس لئے مخالف کچھ کر نہیں سکتے جتنی دلّی کی اچھی سوسائٹی میں مرزا کی شاعری کی قدر کی جاتی ہے اتنی ہی مخالفت کی آگ اور بھڑکتی ہے ۔ اب چند بدطینت لوگوں نے اُن پر قماربازی کا جھوٹا الزام لگایا ہے ۔ یہ لوگ کوتوالِ شہر کو برابر مرزا صاحب کے خلاف بھڑکاتے ہیں ۔

مئی کی تپتی ہوئی دوپہر ہے ۔ مرزا صاحب اسی وقت اپنے دیوان خانے کی ایک تاریک مگر فراخ کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں چرخی کا پنکھا کھنچ رہا ہے خس کی ٹٹی چھڑکی جا رہی ہے اس جگہ اتنی ٹھنڈک ہے کہ گرمی کا احساس یہاں داخل ہونے کے بعد ذہن سے مٹ جاتا ہے ۔ مرزا صاحب دلّی کے اور شرفا کی طرح نین سُکھ کا بر کا پائجامہ اور تن زیب کا الٹی گریبان کا کُرتا پہنے ہوئے ہیں سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی پاس ہی تپائی پر رکھی ہے ۔ مجروح و سالک یہاں پہلے سے بیٹھے تھے تفتہ ابھی آئے ہیں مرزا غالب ارے بھائی تفتہ تم اتنے دن کہاں رہے جو آج صورت دکھائی ہے ؟

تفتہ: حضرت لُو لگ گئی تھی گھر میں پڑا تھا ورنہ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اب تک حاضر نہ ہوتا ۔

مجروح: جب ہی آپ پرسوں مشاعرہ میں شریک نہیں ہوئے اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ ہماری طرح آپ کو بھی غم کھانا پڑتا ۔

تفتہ: کیوں کیا کوئی خاص واقعہ ہوا ؟

مجروح: جی ہاں وہ حکیم آغا جان عیش اس نامعقول ہُدہُد کو لے کر پھر آئے اور اس نے اپنی ایک بے معنی غزل یہ کہہ کر سنائی کہ یہ میں نے حضرت غالب کے رنگ میں کہی ہے ۔ علائی و سالک تو بہت گرم ہو گئے تھے اور اس بیہودہ کو وہیں سزا دینا چاہتے تھے لیکن مرزا صاحب نے ان دونو کو روکا ۔

سالک۔ غضب آلود لہجے میں حضرت کی وجہ سے مَیں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا ورنہ ایسی سزا اس نامعقول کو دیتا کہ آئندہ لغوگوئی کی ہمت اس کو نہ ہوتی ۔ گنوار کو جمعہ جمعہ آٹھ دن دلّی آئے ہوئے اور استادانِ فن کے مُنہ آتا ہے ۔

تفتہ: خوب یہ گل کھلا تھا حضرت غالب کے رنگ میں اُن کے اُستاد محترم عیش صاحب تو ایک شعر کہہ نہیں سکتے اور وہ نابکار یہ لاف زنی کرتا ہے ۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک ! واقعی اس کو اس بکواس کی سزا ملنی چاہیئے جتنی درگزر کی جاتی ہے فتنہ اور بڑھتا ہے ۔

مرزا غالب: (تبسّم آفریں لہجے میں) ارے تم سب اتنے برہم کیوں ہوتے ہو ایک جاہل کندۂ ناتراش کی لغوگوئی کا بُرا کیا ماننا مجھے دیکھو میں تو پروا نہیں کرتا۔

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

تفتہ: یہ حضرت کی عالی ظرفی ہے لیکن نیازمندوں کو مفسدوں کی بیہودگی کا رنج ہونا لازمی ہے ۔

مرزا غالب: تم سب کی محبّت میرے سکون خاطر کے لئے کافی ہے عام آدمیوں کی بات کا بُرا کیا ماننا وہ نہ مرے خیال کو سمجھ سکتے ہیں نہ مجھ کو چھوڑو یہ فضول باتیں بیکار غم کھانے سے کیا فائدہ آؤ کچھ دیر چوسر کھیلیں۔

کھیلنے میں مشغول ہو جاتے ہیں تھوڑی دیر بعد ان کا منہ لگا خانہ زاد نیاز علی کان میں آکر کہتا ہے ایک پردہ نشین خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ ڈولی دروازے پر رکھی ہے۔

مرزا صاحب" حیران ہو کر مجھ سے" تم کو غلط فہمی ہوئی ہے نیاز وہ یہ مسماۃ یقیناً بیگم سے ملنے آئی ہوں گی"۔

"نہیں حضرت میں نے اُن سے اچھی طرح دریافت کر لیا وہ آپ سے ہی کوئی بات کہنا چاہتی ہیں نیاز و نے ادب سے سر کو خم کرتے آہستہ سے جواب دیا

اچھا اُن کو اُدھر دالان میں بٹھا دیں میں ابھی آتا ہوں مرزا صاحب نے کہا اور نیاز علی چلا گیا۔ مرزا صاحب چند منٹ کچھ سوچتے رہے پھر تپائی پر سے ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور اٹھتے ہوئے کہا حضرات آپ سے کچھ دیر کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ دالان میں پہنچ کر انہوں نے ان برقعہ پوش کو بیٹھا پایا نیاز علی کو باہر جانے کا اشارہ ہاتھ سے کر کے وہ برقعہ پوش کے قریب کھڑے ہو گئے اور کہا فرمائیے ایسی کیا ضرورت تھی جو آپ اس گرمی میں اس وقت تشریف لائی ہیں ؟

برقعہ پوش نے آہستہ سے کہا میں جہاں آپ تشریف رکھتے تھے وہاں جا کر اپنے آنے کی وجہ بتاؤں گی۔

مرزا صاحب نے عنایت آمیز لہجے میں کہا وہاں میرے چند دوست بیٹھے ہیں اس لئے میں تعمیل حکم سے قاصر ہوں آپ یہاں جو بھی کہنا ہو بے تکلف کہہ دیجئے مکمل تخلیہ ہے۔

برقعہ پوش نے مرزا صاحب کی بات کا جواب نہیں دیا اور کھڑی ہو گئی ابھی مرزا صاحب اُس کی اس حرکت کو حیرت سے دیکھ ہی رہے تھے کہ اس نے کوٹھڑی کی جانب قدم بڑھایا اور اُن کی تیز نظر پہچان گئی کہ اس برقعہ میں کوئی عورت نہیں مرد ہے اور انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس بے باک کا برقعہ پکڑ کر کھینچا برقعہ اترتے ہی کوتوال صاحب سامنے کھڑے نظر آئے۔

مرزا صاحب قہقہہ لگا کر آہا آپ ہیں حضرت یہ سوانگ بنا کر آنے کی کیا آپ کو سوجھی واللہ بہت خوش طبع ہیں آپ۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون خوش ذوق خاتون ہیں جو اس طرح بے باکی سے مردانے میں ملنے چلی آئی ہیں یہ کیا خبر تھی کہ اس پردۂ زرنگار میں آنجناب ہیں۔

کوتوال جواب اپنی اس حرکت پر بہت نادم تھا جھلا کر بولا بس کیجئے مرزا صاحب آپ کے افعال سے میں بخوبی واقف ہوں دن دہاڑے آپ کوٹھڑی میں بیٹھ کر جوا کھیلتے ہیں۔

مرزا صاحب (طنزیہ لہجے میں) سرکار! یہ نازِ معشوقانہ چھوڑیئے بدگمانی میں آپ بالکل صنفِ نازک بن گئے کیسا جوا! میں تو اس وقت اپنے چند دوستوں کے ساتھ چوسر کھیل رہا تھا۔

کوتوال تو پھر آپ مجھے وہاں جانے دیجئے۔

مرزا صاحب کوتوال کا راستہ روک کر ہرگز نہیں مجھ پر آپ کوئی جھوٹا الزام قائم کر کے مرے گھر کی تلاشی نہیں لے سکتے یہ میری توہین ہے۔ براہ کرم آپ واپس تشریف لے جائیے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

کوتوال (گرج کر) کیا اچھا نہ ہوگا میں ضرور کوٹھڑی میں جاؤں گا۔ راستہ چھوڑ دیجئے۔

مرزا صاحب (جوشِ غضب کو دبا کر) آپ اس وقت میرے گھر میں ہیں اس لئے میں آپ کی سخت کلامی برداشت کر رہا ہوں ورنہ بتا دیتا کہ ایک شریف آدمی سے اس طرح گفتگو کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ کوتوال مرزا صاحب کو دھکیل کر میں آپ سے دبنے والا نہیں جو جی چاہے کیجئے میں ضرور کوٹھڑی میں جاؤں گا۔

مرزا غالب (کوتوال کے تھپڑ رسید کرتے دھکا دیتے ہوئے) جائیے دفعان ہو جائیے آپ جیسے سینکڑوں کوتوالوں کی بھی مجھے پروا نہیں۔ اب خیر اسی میں ہے کہ آپ تشریف لے جائیں ورنہ ابھی میں اپنے خدمت گاروں کو آواز دیتا ہوں وہ اچھی طرح آپ کی مزاج پرسی کریں گے۔

کوتوال مرزا صاحب کے غصّے کو دیکھ کر مصلحت وقت اسی میں سمجھتا ہے کہ خاموش چلا جائے اس کے جانے کے بعد مرزا صاحب کوٹھڑی میں واپس آئے اُن کی تیوریوں پر بل دیکھ کر تفتہ نے سوال کیا حضرت خیر تو ہے ؟ مرزا غالب سارا واقعہ سُنا کر خیر کہاں ؟ کوتوال یہاں سے ذلیل ہو کر گیا ہے ضرور اس کا بدلہ لے گا۔

سالک لیکن اُس کی حرکت ہی اس قابل تھی کہ سزا پائے۔

مرزا غالب یہ صحیح ہے مگر بھائی وہ کوتوالِ شہر ہے اس کا دشمن ہو جانا یقیناً بُرا ہے میں نے یہ غلطی کی کہ تھپڑ مار بیٹھا اس کا انجام اچھا نہ ہوگا مُسکرا کر لیکن خیر ایک شعر اس واقعہ کی بدولت ہو گیا اور کیا عجب کہ پوری غزل ہو جائے

مجروح۔ وہ شعر تو عطا فرمائیے۔

مرزا غالب ہنس کر۔

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

محمد علی خاں اثر

مولانا حسرت موہانی

حال ہی میں نگار ۱۹۵۱ء کا حسرت نمبر شائع ہو چکا ہے جس میں ملک کے مشہور فاضلانِ ادب و شعر نے حسرت کی شاعری اور زندگی کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ممکن ہے کہ رسالہ اردو ادب بھی حسرت نمبر شائع کرے۔ مجھے بھی مولانا سے چند بار شرف نیاز حاصل ہو چکا ہے۔ اس لئے جی چاہتا ہے کہ جو واقعات میرے علم میں ہیں انہیں بھی منظر عام پر لاؤں۔ ان واقعات سے ان کی زندگی کے چند مزید پہلو نمایاں ہو کر اُن کے کیرکٹر کی بلندی کا مزید ثبوت دیں گے۔

۱۹۱۶ء

رام پور کے مشہور شاعر جناب رشید رام پوری کانپور میں سولہ برس تک بعہدۂ پیشکار ملازم رہے ہیں۔ اس زمانے میں حسرت مرحوم سے ان کی ملاقاتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ اُن کا بیان ہے کہ ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے نامی احرار لیڈر نظر بند کئے جا چکے تھے لیکن حسرت اس وقت تک آزاد تھے۔ ۱۹۱۶ء میں حکومت کی نگاہ انتخاب حسرت پر بھی پڑی۔ اسی سال باقر علی خاں رام پوری سپرنٹنڈنٹ پولیس کا تبادلہ میرٹھ سے کانپور ہوا۔ اور کانپور آکر سب سے پہلے اُنہیں مولانا حسرت سے سابقہ پڑا۔ جب گرفتاری کا وارنٹ لے کر اُن کے مکان پر پہنچے تو مولانا کو وارنٹ دکھا کر عرض کیا کہ میرے ساتھ موٹر میں تشریف لے چلئے۔ آپ حکومت کے مہمان رہیں گے۔

حسرت۔ میں اس حکم کی تعمیل میں کسی طرح قدم نہیں اٹھاؤں گا۔

سپرنٹنڈنٹ۔ مولانا! آپ کی انتہائی قدر میرے دل میں ہے۔ لیکن میں حکومت کا تنخواہ دار ملازم ہوں اور میں مجبور ہوں کہ آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچاؤں۔

حسرت۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں اس کے خلاف نہیں ہو سکتا (اور ہوتا بھی کیوں کر؟ مولانا خود فرما چکے ہیں)

کرکے وہی رہوں گا جو دل میں ٹھان لی ہے　　روشن ہے ہم پہ حسرت عزم امور تیرا

سپرنٹنڈنٹ بھی حیران تھے کہ ملازمت میں ہر قسم کے ملزمان سے واسطہ پڑا ہے جس میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ لیکن یہاں سنگ آمد و سخت آمد کا معاملہ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا کے احترام میں بھی فرق نہ آئے۔ اور حکم کی تعمیل بھی ہو جائے۔ اس گتھی کے سلجھانے میں اُنہیں بڑی دشواری پیش آئی۔ لیکن کچھ دیر بعد اُن کے دماغ میں ایک ایسا نقشہ آیا جس نے اس گتھی کو پوری طرح سلجھا دیا۔ وہ یہ کہ انھوں نے "خطا معاف" کہہ کر مولانا کو فوراً ہی گود میں اُٹھا کر موٹر میں بٹھا دیا۔ سپرنٹنڈنٹ اپنے ڈیل ڈول کے لحاظ سے مولانا سے لمبائی۔ چوڑائی اور موٹائی میں تقریباً دو گنے تھے۔ اس لئے مولانا کو کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ منزلِ مقصود تک پہنچانے میں ریل کا سفر بھی شامل تھا۔ جب موٹر اسٹیشن پر پہنچی تو وہاں بھی یہی معرکہ پیش آیا اور گود ہی کا ذریعہ ریل کی نشست کے لئے کامیاب ثابت ہوا۔ غرض ریل سے اُتارنے اور جیل کے اندر پہنچانے میں یہی تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ لطف یہ کہ جب مولانا کو رہا کیا گیا تو مولانا نے فرمایا "نہ میں اپنی خوشی سے آیا تھا نہ اپنی مرضی سے جاؤں گا۔" چنانچہ باقر علی خاں پھر طلب ہوئے اور مولانا کو اسی کامیاب طریقے سے جس کے وہ ماہر ہو چکے تھے موٹر میں لا کر مکان کے دروازے پر چھوڑ گئے۔

۱۹۲۱ء

رام پور کی بزمِ سخن نے جس کے سکرٹری ضمیر احمد ہاشمی صاحب ڈپٹی ریونیو منسٹر رام پور تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ایک ایسے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس کی ہر صحبت میں ملک کے چند منتخب شعراء بلائے جاتے تھے اور ایک نشست میں اُن کا منتخب کلام جی بھر کے سنا جاتا تھا۔ ان کی تصویر بھی لی جاتی تھی۔ حلات بھی ان سے دریافت کرکے لکھے جاتے تھے۔ اور اُنھیں کے قلم سے

منتخب اشعار بھی لکھوائے جاتے تھے۔

چنانچہ اسی سلسلے میں مولانا حسرت کو بھی نومبر ۱۹۴۱ء میں دعوت دی گئی تھی۔ جب مولانا کی تصویر لینے کے لئے فوٹوگرافر آیا تو ہاشمی صاحب نے مولانا سے استدعا کی کہ آپ اچھی تصویر کی خاطر اپنی آرائش فرما لیں۔ یعنی اُلجھی ہوئی ڈاڑھی کو سلجھا لیں اور لباس بھی درست کرلیں۔ مولانا نے اُن کے اصرار سے مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ اپنے میلے اور مٹیالے رنگ کے بیگ کو جس میں بکثرت پیوند بھی لگے تھے ٹٹولا اور ایک کنگھا نکالا جس کے دندانے تقریباً گھِس یا جھڑ چکے تھے۔ غرض ڈاڑھی درست ہوئی۔ ایک چھوٹا سا زنگ آلود آئینہ نکال کر اپنا چہرہ دیکھا۔ جب بن سنور کر تیار ہوئے تو شروانی کی باری آئی۔ ترکی ٹوپی کی جگہ ایک مخملی گول ٹوپی نے لی، جو رام پور کے وزرا اور صاحبزادوں کے لئے مخصوص تھی۔ (اس سے پہلے یا بعد میں مولانا کی کوئی تصویر مخملی گول ٹوپی میں نہیں پائی گئی) مولانا کا بیگ بھی تاریخی تھا جس میں اُن کی کل کائناتِ سفر رہتی تھی۔ حتیٰ کہ یہ بیگ ان کے ہر حج میں رفیقِ طریق رہا۔

انتخابِ کلام از حسرت

یوں تو حسرت کے اشعار کا انتخاب مختلف مشاہیر نے اپنے مذاق کے مطابق کیا ہے جس کو آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا۔ لیکن خود حسرت نے اپنے اشعار جو منتخب کئے ہیں وہ یہ ہیں۔ یہ اشعار خود حسرت ہی کے قلم سے تحریر ہوئے ہیں جن کا ایک عکس تذکرۂ اوراقِ گل میں بھی شامل ہے۔

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا　　شغل بیکار ہیں سب اس کی محبت کے سوا
سب سے منھ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم　　اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا
عقل حیران ہے اے جانِ جہاں راز ترا　　کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرت کے سوا

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے　　وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دوعالم سے کر دیا آزاد　　ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت　　اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

آپ کے حُسنِ جہاں سوز کا جلوا دیکھا　　ہم نے گھر پھونک کے خوب آج تماشا دیکھا
کھنچ گئی نُورِ علیٰ نُور کی تصویرِ جمیل　　بعد کعبے کے جو آنکھوں نے مدینا دیکھا
ہم نہ کہتے تھے یہ لپکا نہیں اچھا حسرت　　خاک میں مل کے محبت کا نتیجا دیکھا

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا　　باوجودِ حُسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق　　ربط تھا دونوں کو، گو ربطِ شناسائی نہ تھا
تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی　　اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

دل ہے نازاں کہ تری صورتِ زیبا دیکھی　　آنکھ حیران کہ اک حُسن کی دنیا دیکھی
پہلے آنکھیں ہوئیں گرویدہ، پھر آنکھوں کی طرح　　چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی
زلفِ شبرنگ پہ گلنار لباسی کی بہار　　آج حسرت نے رُخِ یار میں کیا کیا دیکھی

حسرت نے شاعری کی جو آٹھ قسمیں آمد و آورد کے تحت کی ہیں، اُن کا اظہار غالباً سب سے پہلی بار اسی صحبت میں کیا گیا ہے۔ اسی صحبت میں شریعت و طریقت کا ذکر بھی آیا تو فرمایا کہ یہ دونوں راستے خدا تک پہنچانے والے ہیں۔ شریعت کا راستہ طویل ہے اور طریقت کا راستہ "شارٹ کٹ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو عشق اور سوز و گداز کی بدولت برق رفتاری سے طے ہوتا ہے۔

۱۹۴۲ء

مارچ ۱۹۴۲ء میں ہاشمی صاحب نے مجھے مولانا کے پاس کلامِ قائم چاندپوری کی طلب اور حضرتِ صفی لکھنوی کے تکمیلِ کلام وغیرہ کی غرض سے بھیجا تھا۔ میں پہلے کانپور گیا اور ایک رام پوری کلاہ فروش کی دوکان پر ٹھہرا۔ جب میں نے مولانا حسرت کے مکان کا پتہ پوچھا تو جواب ملا کہ مولانا آتے ہی ہوں گے۔ یہیں ملاقات ہو جائے گی۔ ابھی گفتگو جاری ہی تھی کہ مولانا دور سے نظر آئے۔ لباس کھدر کا۔ پاؤں میں چپل۔ ایک ٹوکری ہاتھ میں۔ آتے ہی چٹائی پر بیٹھ گئے اور اردو کے اخبار دیکھ کر سودے کی غرض سے بازار کی طرف چل دئے۔ معلوم ہوا کہ مولانا کا معمول تھا کہ بعد نمازِ فجر علی الصباح ایک رئیس کے مکان پر روزانہ انگریزی کے اخبار دیکھنے کی غرض سے جاتے۔ صاحبِ خانہ نے یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ نشستگاہ کے دروازے کھُلے رہتے اور میز پر اخبار تیار رہتے۔ خواہ صاحبِ خانہ ہوں یا نہ ہوں۔ وہاں سے اُٹھ کر سیدھے کلاہ فروش کی دُکان پر آتے اور اردو کے اخبار دیکھتے۔ لوگ مولانا سے خبریں پوچھتے تو وہ مختصر سا جواب دیتے ہوئے بازار جاتے اور سودا خریدتے ہوئے اپنے مکان چلے جایا کرتے تھے۔

دوسرے دن میں اپنے میزبان کے ساتھ مولانا کے مکان پر حاضر ہوا۔ مولانا نے ہاشمی صاحب کا خط پڑھ الناظر پریس کے ایڈیٹر ظفر الملک علوی

کو قائم چاندپوری کے کلام کے متعلق ایک خط لکھا لیکن علوی صاحب نے معذرت ظاہر کی۔ اس لئے ناکام واپس آنا پڑا۔

۱۹۴۳ء

۱۹۴۳ء میں دوسری جنگ عظیم کا سلسلہ جاری تھا اور جنگ کی امداد کے سلسلے میں جابجا مشاعرے ہو رہے تھے۔ وار فنڈ کمیٹی کے ذریعہ سے تقریباً ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ ایک ڈپٹی کلکٹر کے زیر اہتمام مراد آباد میں بھی ہونا تجویز ہوا جس میں مولانا کو بھی دعوت دی گئی لیکن انھوں نے جنگ کے شبہ پر آنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ہاشمی صاحب پر ڈورا ڈالا گیا کہ وہ اپنے تعلقات سے کام لے کر مولانا کو شرکت پر آمادہ کرادیں۔ اور یہ بھی ظاہر کیا کہ مولانا کو دو سو روپے بسلسلۂ سفر خرچ پیش کئے جائیں گے۔ ہاشمی صاحب نے مولانا کو لکھا کہ اگر آپ نے جنگ کی وجہ سے انکار کیا ہو تو میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ مشاعرہ محض ادبی ہے بسلسلۂ جنگ نہیں۔ اس لئے آپ ضرور شرکت فرمائیں۔ جواب دیا کہ یہ سب دھوکا ہے۔ آج کل جتنے مشاعرے ہو رہے ہیں وہ سب جنگ ہی کے سلسلے میں ہو رہے ہیں۔ اس لئے میری شرکت کے یہ معنی ہوں گے کہ "میں نے انگریز کی جنگ کے طول دینے میں مدد کی؟" یہ مولانا کا کیرکٹر تھا کہ سخت ضرورتمند ہوتے ہوئے بھی انھوں نے دو سو روپے کی معقول رقم کو اپنے اصول پر قربان کر دیا۔

۱۹۴۴ء

مارچ ۱۹۴۴ء میں ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ میں نشری مشاعرہ ہوا تھا۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو رات کے ۱۲ بجے تھے میں نے اور مولانا دونوں نے خواہش کی کہ ہم ابھی اسٹیشن جائیں گے سواری کا انتظام کرادیا جائے۔ چنانچہ ہم دونوں موٹر میں بیٹھکر اسٹیشن پہنچے۔ جب سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں گئے تو کمرے کی تمام میزیں۔ بنچیں اور کرسیاں مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ میں نے کہا مولانا یہاں تو بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں، فرمایا "فرش تو ہے" میں نے یہ سنتے ہی اپنا کمبل ایک گوشے میں بچھا دیا جس کا آدھا حصہ مولانا کے قبضے میں آیا، آدھا میرے قبضے میں۔ مولانا نے تھیلے کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا اور گاڑھے کی چادر تان کر سو گئے، اور دو تین بجے رات کے چپکے سے اٹھکر نماز تہجد وغیرہ کی غرض سے کہیں چلے گئے۔ جب صبح صادق ہوئی تو مولانا نے واپس آکر مجھے جگایا کہ ہماری ریل کا وقت جانے والی بھی آنے والی ہے اور تمہاری ریل رام پور جانے والی بھی آرہی ہے۔ اس لئے تیاری کرلو۔ چنانچہ میں مولانا سے رخصت ہو کر رام پور کی ٹرین میں سوار ہوگیا۔ یہ چند گھڑی کی صحبت میرے لئے قابل فخر ہے۔

۱۹۴۷ء

فروری ۱۹۴۷ء میں کانپور کے ایک نشری مشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ شب میں طرحی مشاعرہ تھا۔ دوسرے دن تقریروں اور ادبی مضامین کا جلسہ تھا۔ اس طرح مولانا سے دو روز نیاز حاصل رہا۔ جب شعراء کے مجمع میں بیٹھتے بات بات پر ہنساتے اور نکتہ آفرینیوں کے گل کھلاتے تھے۔ افسوس کہ یہ ملاقات میری آخری ملاقات تھی جس کی یاد زندگی بھر نہ جائے گی۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت مضامین کا جلسہ ہوا جس میں فن شعر و ادب پر تقریریں ہوئیں۔ حضرت اثر لکھنوی کے بعد میری باری آئی۔ میرے مضمون کا عنوان "غزل کا مستقبل" تھا جس کو اثر صاحب نے بھی پسند کیا اور بعد کے مقررین نے غزل ہی کو موضوع قرار دے لیا۔

اس موقع پر مولانا کے ایک کیرکٹر کا واقعہ بھی یاد آگیا۔ اس مشاعرے میں ایک خستہ حال نوجوان شاعر بغیر دعوت سخن کے شریک ہوگئے تھے جن کے قیام و طعام کا تو انتظام ہوگیا تھا لیکن مصارف آمد و رفت وغیرہ کے دینے میں کمیٹی کو تامل تھا۔ چنانچہ انھیں مشاعرے میں غزل پڑھنے کا موقع بھی نہ دیا گیا۔ مولانا کو یہ علم ہوا تو چند شعراء کا کلام سننے کے لئے انھوں نے مختصر سی صحبت شعر و سخن دوسرے دن منعقد کی، اور سب سے پہلے انہی نوجوان شاعر کی طرحی غزل سنی اور ہر شعر پر خلاف معمول ایسی داد دی کہ شاعر کا رنج خوشی سے تبدیل ہوگیا۔ اور اس امتیازی شان نے کمیٹی کو رقم دلانے پر مجبور کر دیا۔

مضامین کے جلسے سے فارغ ہو کر اول شب خواجہ غلام السیدین صاحب۔ اثر صاحب لکھنوی اور میں تینوں ایک موٹر میں بیٹھکر کانپور سے لکھنؤ روانہ ہوئے۔ راستے میں فن ادب اور بالخصوص میر کی شاعری پر اثر صاحب گفتگو کرتے رہے۔ اثنائے راہ دور سے بجلی کی مسلسل روشنی نظر آئی۔ تو اثر صاحب نے کہا "ہم اب لکھنؤ کے قریب آگئے"! لیکن یہ نظر کا دھوکا تھا یہ روشنی لکھنؤ کے کھمبوں کی نہ تھی بلکہ آنے والی موٹروں کی تھی۔ جب موٹریں گذر گئیں تو معلوم ہوا کہ لکھنؤ ابھی ۸-۱۰ میل دور ہے۔ اس

موقع پر میں نے عرض کیا کہ یہاں میری طرحی غزل کا ایک شعر صادق آ رہا ہے۔
قریبِ منزلِ مقصود اے معاذ اللہ   قدم قدم پہ یہ سمجھا ہوں فاصلہ کم ہے
اس پر قہقہہ ہوا۔ غرض یہ ۵۰ میل کا سفر بہت دلچسپی کے ساتھ طے ہوا۔ لکھنؤ پہنچ کر دونوں سے رخصت ہوا۔ اور امین آباد پارک کے ایک ہوٹل میں رات بسر کر کے دن کی ٹرین سے رام پور واپس آ گیا۔

سنہ ۱۹۵۱ء

مولانا حسرت موہانی کا انتقال ۱۳۔ مئی سنہ ۱۹۵۱ء کو ہوا۔ جس کی خبر پا کر میں نے چند شعر اسی زمانے میں بطور قطعہ تاریخ وفات لکھے تھے جو اب پیش کر رہا ہوں۔

قطعہ تاریخ

ہائے دنیا سے گئے حسرتِ موہانی کیا   عزتِ شعر گئی اور گیا لطفِ غزل
اب کہاں پائیں گے ہم شعر کا ایسا نقاد   جس کا ہر فیصلہ ہوتا تھا بہر نوع اٹل
پیکرِ صدق و صفا، جامع اوصاف کمال   حق کے اظہار میں بیباک عمل میں اکمل
سولہ حج کر کے کہا دعوتِ حق کو لبیک   اے خوشا خاتمہ بالخیر زہے حسنِ عمل
ہوں مبارک تجھے جنت کی بہاریں حسرتؔ   برسیں تربت پہ تری رحمتِ حق کے بادل

پوچھا جب مصرع تاریخ تو دل نے یہ کہا
حاجی۔ کامل۔ حق گو شہنشاہِ غزل

۱۹۵۱ء

غالب نمبر

آجکل کا غالب نمبر جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ گراں قدر مقالات و تصاویر کا ایک بے بہا مجموعہ ہے۔ اس نمبر کی صرف چند کاپیاں دفتر میں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت آٹھ آنے

شائقین مندرجہ ذیل پتے سے طلب فرمائیں۔

ڈسٹری بیوشن آفیسر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

تنویر احمد علوی

ایوننگ اِن پیرس

یہ حسیں شام یہ منظر یہ معطر سائے   یہ افق غرفۂ فردوسِ بریں ہے گویا
یہ شفق زار ابھرتے ہوئے یہ رنگ محل   شوقِ بیدار بھی اک خوابِ حسیں ہے گویا

وقت کا جلوۂ رنگیں یہ زمانے کا جمال   ہاں یہ ماحول یہ گرتی ہوئی رنگوں کی پھوار
مسکراتی ہوئی کلیاں یہ چٹکتے غنچے   یہ ہواؤں کا تعطر یہ فضاؤں کا نکھار

نو شگفتہ یہ بہاریں یہ شمیمِ تازہ   گل کدوں میں یہ چھلکتا ہوا آوازۂ شباب
یہ حسیں منظرِ گل گشت یہ اندازِ خرام   حسنِ خود بیں و خود آرا ہے برافگندہ نقاب

سرمئی شام کا یہ نور سے بھیگا آنچل   جیسے ہنستی ہوئی پلکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ چمن زار یہ رنگوں کی حسیں قوسِ قزح   زندگی جیسے دھندلکوں کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ حسیں شہر یہ صورت کدۂ حسنِ مجاز   دھوکا ہوتا ہے خرابوں پہ صنم خانوں کا
یہ مہکتے ہوئے انفاس یہ رنگیں ملبوس   شاہراہوں پہ ہے دھوکا چمنستانوں کا

دوشِ مغرب پہ یہ لہراتی ہوئی زلفِ سیاہ   آسمانوں پہ یہ تاروں کا بکھرتا ہوا جال
جیسے پیرس کی جوانی ہے یہی خوابِ حسیں   جیسے اب وقت کے چہرے پہ نہیں گردِ ملال

یہ حسیں بار یہ کیفے یہ خمستاں یہ کلب   یہ فلک بوس محلات یہ ایوان یہ طاق
الوہی خانوں میں چھپ چھپ کے ابھی جیسے حیات   انقلاباتِ زمانہ کا اڑاتی ہے مذاق

امرود بیگم

آپ نے امرود ضرور کھائے ہوں گے یا کم از کم چکھے تو ضرور ہوں گے۔ کہیے ہاں، اچھا تو اب آپ اس کہانی کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے حقدار ہو گئے۔

میرا مکان بھی عجیب و غریب جگہ پر واقع ہے۔ عرفِ عام میں جسے گزرگاہ کہتے ہیں۔ بانکی پور کی آدھی نہیں تو چوتھائی آبادی تو کم از کم چوبیس گھنٹوں میں ایک بار اس گلی سے ضرور ہی گزر جاتی ہے۔ اپنی مرضی کے خلاف اسکول جاتے ہوئے بچے، گلدار جینٹ کی ساریاں نئی نئی وضع کے ٹوئیڈ کے کوٹ اور بش شرٹ کی پرچھائیاں اس گلی میں اکثر و بیشتر ہی نظر آجایا کرتی ہیں۔

ایک دن حسبِ معمول میں صحن میں بیٹھا صوبہ کی انتخابی دھینگا مُشتیوں کو اخبارات کے کالم میں بڑے شوق سے دیکھ رہا تھا۔ میرے بغل کی کُرسی ابھی گرم تھی۔ ابھی ابھی بھائی صاحب کسی ضرورت سے سامنے والے مکان میں گئے تھے۔ سائبان کی فضا میں ابھی تک ان کے اس مصرع کی گونج سنائی دے رہی تھی ؏

قسم اُس مانگ کی سیندور نہ میسّر ہو جسے

دفعتہً زینوں پر ایک بھاری پاؤں کی چاپ سنائی دی اور ہمارے کہنہ مشق قانونی دوست اپنے ڈنڈے سمیت اوپر چڑھ آئے۔

"کچھ سُنا آپ نے امرود بیگم آگئیں!" آپ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے فرمایا۔ کلکتہ اور پٹنے کی ربع صدی کے قیام کے باعث اُن کے چہرے کی جھرّیاں دن کی روشنی میں اور صاف اور ڈراؤنی نظر آرہی تھیں۔ ہبیز ہونٹوں میں دبا سگار دم توڑ رہا تھا۔ مگر اُنھیں اِس کی افادیت پر شاید ابھی کامل یقین تھا۔ گہری بادامی شیروانی اب ان کے جسم سے دم چُرانے لگی تھی۔ آخر کب تک ساتھ دیتی، ایک شیروانی کی بساط ہی کیا۔ رفاقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ متواتر چار یا پانچ جاڑے اُس نے ہماری آنکھوں کے سامنے کاٹے مگر غریب اب جاڑے کی سانس بھی اُکھڑ چلی تھی۔

"امرود بیگم" میں نے پوچھا "یہ موسمی خاتون کون ہیں؟" "آپ نہیں جانتے" ہمارے مہربان دوست نے سگار کی آنچ سے اپنے ہونٹوں کو بچاتے ہوئے فرمایا "ایک ہفتہ قبل وہ گوا سے پٹنے آئی ہیں۔ بھاری بھرکم، سانولی سلونی آنکھوں میں سمندر کے ایسا سکون لبوں پر ایک سیلابی دھارا!" "میں نے کہا" یہ گوا سے آئی ہیں اور ان کا نام بھی گوا یا گرآوا کی مناسبت سے امرود رکھ دیا جائے۔ سو میں انھیں اسی نام سے پکارتا ہوں اور یہ ہیں ہماری آپ کی نوواردِ امرود بیگم!"

میں پھلوں کا بڑا دلدادہ ہوں۔ موسم کے پھل بڑے چاؤ سے کھاتا ہوں۔ اور اگر موسم کے قبل یا بعد کوئی پھل مل گیا تو میں اسے ایک انوکھی نعمت سمجھ کر تنہا چٹ کر لیا کرتا ہوں۔ مگر امرود بیگم کا یہ مسئلہ ذرا مجھے ٹیڑھا معلوم ہوا۔

"امرود بیگم تک میری رسائی ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا "ہاں، ہاں، کیوں نہیں" میرے دوست نے اپنے ڈنڈے کو اپنی رانوں تلے زور سے دباتے ہوئے کہا "کل صبح آپ ناشتہ میرے ساتھ کریں" میں نے بخوشی منظور کر لیا "ہم امرود و ہم ثواب" "یا ہم ناشتہ و ہم امرود بیگم" اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

دوسری صبح میں کچھ سویرے تیار ہو گیا اور زینوں پر کھڑا اپنے قانونی دوست کی راہ تک رہا تھا۔ مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا وہ ہاتھ میں ڈنڈا لیے جلد ہی تیز تیز سامنے آتے دکھائی دیے، اور ہم دونوں امرود بیگم کی جلوہ گاہ کی جانب چل پڑے۔ لِلّٰہ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ ہم نے آبادی چھوڑ کر کسی باغ کا رُخ کیا یا شاہ راہ سے کھیتوں کی طرف اُتر آئے۔ ٹھیک اسی مقام پر جہاں ہمارے شہر کا قلبِ مضطرب چوبیس گھنٹہ تڑپتا اور دھڑکتا نظر آتا ہے۔ میرے دوست مجھے ایک دوکان کی جانب لے چلے۔ جس کے در و دیوار پر ایک افسردگی اور

بے کیفی سی دکھائی دے رہی تھی ۔ دوکان کے دونوں جانب چبوتروں پر لوگ بیٹھے پھیری والے کی چائے پی رہے تھے ۔ ایک نوجوان اپنی رات کی کرتوت سنا رہا تھا کہ ریجنٹ سنیما میں قبل سے خریدے ہوئے ٹکٹ بیچ کر اُسے صرف گیارہ روپے دو آنے مل سکے ۔ ہم دوکان کے اندر داخل ہوئے آگے آگے میرے دوست اور ان کے پیچھے ایک مختصر سا انسانی استفہامیہ ؟ یعنی میں ۔

میرے دوست نے مجھے ایک میز کی جانب بیٹھ جانے کا اشارہ کیا ۔ اور خود دوکان کے اندر والے کمرے میں چلے گئے ۔ جہاں سے مسلسل کسی مضطرب پرند کے پھڑپھڑانے کی آواز آرہی تھی ۔ مگر دوکان کے اندر بیٹھتے ہی دھوئیں کے سپید گیسو ہمارے سروں پر لہرانے لگے ۔ تب معلوم ہوا کہ غالبًا میرے دوست اس کمرے کی جانب تشریف لے گئے تھے جو اس ہوٹل کا غالبًا باورچی خانہ تھا اور جسے میں مضطرب پرند سمجھ رہا تھا ۔ اس کی حیثیت محض ایک معمولی پنکھے کی تھی جس سے غالبًا چولھے کی آنچ تیز کی جا رہی تھی ۔ میلے ملگجے رنگ کے پردے دوکان کے دروں پر لگے ہوئے تھے ۔ اور میں ان پردوں کے پیچھے بیٹھا سڑک اور صبح کے راہگیروں کو گھور رہا تھا ۔

دفعتًا اس کرسی کے پیچھے جس پر میں بیٹھا تھا ایک نسوانی کھنکھار سنائی دی ۔ اور پھر ایک ہلکی سی بدیشی خوشبو میری ناک میں آئی ۔ میرے دوست ابھی تک باورچی خانہ ہی میں ناشتے کے متعلق ہدایات دے رہے تھے ۔ مجھ سے نہ رہا گیا ۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا ۔

ایک "جنس نما" عورت میری پیٹھ سے تین فٹ کی دوری پر ایک بہت ہی باریک پردے کے پیچھے کپڑے بدل رہی تھی ۔ صافی جیسے پیٹی کوٹ پر "شیفون" کی نرم و نازک ساری لپیٹی جا رہی تھی ۔ جن کے بڑے بڑے گل بوٹے موسم سرما کے پھولوں کو شرما رہے تھے ۔ آبنوسی انگلیاں بڑی سرعت سے ساری کے حلقوں کو کھینچتی جا رہی تھیں ۔ گرم سانسوں کی حدت اس قدر تیز تھی کہ میں انھیں اب صاف محسوس کر رہا تھا ۔ اتنے میں میرے دوست آکر برابر کی کرسی پر بیٹھ گئے ۔ انھوں نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے اس پردے کے پیچھے دیکھا ۔ گویا ان کی نگاہیں اس انوکھے جلوۂ صباحی کی عادی ہو چکی تھیں ۔ میں خاموش بیٹھا رہا اور اپنے دوست کے بظاہر پرسکوں چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا ۔ دفعتہ وہ اپنے سارے دانت نسور کر ہنس پڑے ۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میری پشت پر ایک بڑا سا دہانہ کھلا سپید دانتوں کی نمائش کر رہا تھا اور وہی جنس نما عورت اب میلی دیوار سے لگی کھڑی تھی ۔

"آپ کون ہیں" میں نے اپنے دوست سے پوچھا " ارے آپ نہیں جانتے آپ ہی کا نام امرود بیگم ہے ۔ یہ دو چار دن قبل گوا سے آئی ہیں اور ابھی ہماری زبان بول یا سمجھ نہیں سکتیں ۔ میں نے کہا بہت خوب ع

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

چند منٹوں کے بعد توس مکھن ، انڈے میز پر آکر دھرے گئے اور ہم نے کھانا شروع کیا ۔ میں نے انڈے کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور انڈے کی طشتری اپنے سامنے رکھ کر نمک کی ایک چمچی لی ۔ سیاہ مرچوں کی شیشی میز پر نہ تھی ۔ میں نے میز کے طول و عرض پر نظریں گھمائیں اور پھر دوسری میز کی طرف دیکھا ۔ امرود بیگم نے شاید میری ضرورت سمجھ لی اور فورًا ایک آبنوسی سیاہ ہاتھ مرچوں کی شیشی لئے میز کی طرف بڑھا ۔ میں نے تشکر کی ایک نگاہ اٹھائی اور ع

سامنے وہ کھڑی تھی ماہِ منیر

اُس کی مسکراہٹ اب سولہ آنے سے کم ہو کر صرف چند آنے بچ گئی تھی ۔ چہرہ ایک سیاہ توے کی طرح تمتمایا ہوا ۔ آنکھیں اُس جھیل کی طرح جس کے پانی پر برسوں سے سورج کی روشنی نہ پڑی ہو اور صحت مندی اس درجہ جسے دیکھکر تندرست سے تندرست انسان کا جی گھبرا جائے ۔

ہمارے دوست نے میری جانب امرود بیگم کو متوجہ دیکھکر اپنی نگاہیں نہ جانے کیوں نیچی کر لیں ۔ توس کی کُرکُر اور چائے کے گرم اور شیریں گھونٹوں کے درمیان میں نے جب بھی نگاہیں اُٹھائیں تو امرود بیگم کو اپنی ہی میز کی جانب گھورتے دیکھا ۔ شاید اس دن ہمیں ناشتے سے فارغ ہونے میں کافی دیر لگی ۔ میں نے اپنے دوست سے کہا آپ انھیں امرود بیگم کہتے ہیں ۔ مگر یہ تو خود ہی ایک عظیم الشان امرود معلوم ہوتی ہیں اور اکبر الہ آبادی کے اس شعر کو قدرے تصرف کے ساتھ ہم یوں پڑھ سکتے ہیں کہ اس ہوٹل میں ع

یاں رکھا کیا ہے سوائے چائے اور امرود کے

ہنستے ہنستے میرے دوست نہ معلوم کیوں رفتہ رفتہ سنجیدہ بننے کی کوشش کرنے لگے ۔ حالانکہ اُن کی شیروانی کے بٹن اس امر کا صاف صاف ثبوت دے رہے تھے کہ ایک نوجوان اور تندرست دل اُنھیں بار بار اپنی جگہ سے ہلنے پر مجبور کر رہا ہے ۔ امرود بیگم کی نگاہیں کبھی ان کی شیروانی

کے بٹن کی جانب بڑھتیں۔

ناشتہ ختم ہوا۔ جانگیہ پہنے ایک عجیب و غریب ہئیت کا انسان ہماری میز کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے بیک اینڈ وہائٹ بال راکھ سے اٹے ہوئے تھے۔ جانگیہ اور سویٹر کی عمر بتانی معمولی حساب جاننے والے آدمی کے لئے مشکل تھی۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال زیادہ غلّہ اگاؤ کی سرکاری مہم سے بھی بہت آگے نکل چکے تھے۔

"مسٹر ڈی گوشال" میں نے کہا "یس سر" اس نے جواب دیا "توس لیڈی؟" میں نے پوچھا۔ "مائی سکنڈ وائف" اس نے جواب دیا اور اُس کے بعد ہندوستانی میں یوں گویا ہوا "ایک ہفتہ گو آسے آیا۔ ہمرا دوسرا وائف بہت اچھا ہم کو ہوٹل چلانے میں مدد دیتا ہے۔

میں نے ہوٹل سے باہر نکل کر اپنے دوست کے بھرے بھرے بازوؤں میں چٹکی لی اور کہا بولئے زندہ باد امرود بیگم۔ امرود بیگم کی جے۔

بھارت میں زرعی توسیع کے منصوبے

بھارت میں زرعی توسیع کی اسکیموں کے لئے امریکہ کے فورڈ فاونڈیشن کی امداد کے بارے میں وزیر خوراک و زراعت شری کے۔ ایم منشی نے بتایا کہ فاونڈیشن نے بھارت میں زرعی توسیع کے پندرہ ابتدائی منصوبے اور ان منصوبوں کے عملے کی تربیت کے لئے پانچ مرکز قائم کرنا منظور کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے فاؤنڈیشن سے فی الحال بارہ لاکھ امریکی ڈالر کی مالی امداد ملنے کی توقع ہے۔ اس کے علاوہ فاؤنڈیشن نے درج ذیل دو امور کے لئے مالی امداد دینے پر غور کرنا بھی منظور کیا ہے۔

(۱) بعض اعلیٰ تعلیمی اداروں میں توسیع سے متعلق تربیت کے لئے پروگرام (۲) دیہات میں زرعی ترقی کے لئے مؤثر کام کرنے والے موزوں اشخاص کے لئے امریکہ اور دیگر ملکوں میں تعلیم و مطالعہ کا انتظام۔

اس اسکیم کے تحت پندرہ ریاستوں میں زرعی توسیع کے منصوبے شروع کئے جائیں گے۔ ہر منصوبہ کا اثر قریباً ایک سو دیہات پر ہوگا۔ اس پروگرام میں کاشت کے بہتر طریقے۔ بہتر بیج اور کھاد کا استعمال۔ آب پاشی۔ پرورش مویشیان کے لئے بہتر طریقے۔ تعلیم بالغان۔ صفائی کے لئے بہتر انتظامات اور دیہات کے لوگوں میں امداد باہمی کے جدید طریقے رائج کرنا شامل ہوگا۔ اس کے لئے ریاستی حکومتوں کے مختلف محکموں کا اشتراک عمل حاصل کیا جائے گا۔ ریاستی حکومتیں مرکزی حکومت کی زیر ہدایت ان منصوبوں کو عملی شکل دیں گی۔

منصوبے کے ماتحت کام کرنے والے تربیتی مرکزوں میں نو مہینہ تک تعلیم دی جائے گی۔ کام سیکھنے والوں کو اپنے علم کے لئے عملی راہیں اختیار کرنا ہوں گی۔ توسیع و تربیت کے لئے دو امریکی ماہر بھارت میں کام کریں گے۔

فورڈ فاؤنڈیشن نے درج ذیل باتیں بھی منظور کی ہیں۔ (۱) زرعی توسیع کی تربیت دینے والے پانچوں مرکزوں کے پہلے تین سال کے اخراجات اٹھانا اور اس کے بعد متعلقہ تجربہ کی روشنی میں آئندہ دو سے چار سال تک ایسی امداد دینے کے معاملے پر غور کرنا۔ (۲) پہلے دو سال کے لئے ترقی کے پندرہ منصوبوں کا تمام خرچ اور تیسرے سال کے خرچ کا ایک تہائی حصّہ اٹھانا۔

ان پندرہ منصوبوں کے تیسرے سال کے خرچ کا باقی دو تہائی حصّہ نصف نصف کی شرح سے بھارت سرکار اور ریاستی حکومتوں کے ذمّے ہوگا۔

تربیت مع ترقی سے متعلق یہ پہلا مرکز ۳۱۔جنوری سے آنند میں شروع کیا جا چکا ہے۔

ذکر و فکر

غزل
صدق جائسی

پھرتا ہوں اپنے زعم میں کوئے بتاں سے دور
گویا زمیں ہے دسترسِ آسماں سے دور

عارض کی آب و تاب ہے حدِ بیاں سے دور
اللہ اس بہار کو رکھے خزاں سے دور

یا رب متاعِ درد بھی ہم کو بخش دے
رہنے دے غم کو اُن کے دلِ شادماں سے دور

تقدیرِ اہلِ دید کو لاتی ہے راہ راہ
یوسف ہیں نور پاش ابھی کارواں سے دور

افسوس اُن کو بادِ سحر نے گرا دیا
جو گُل چمن میں تھے نگہِ باغباں سے دور

کہتا ہوں اُن سے اِذن جو پاؤں تو کہہ چلوں
اک بات جا پڑی ہے بجلی سی خزاں سے دور

اے آہِ صبح حیف ہے تجھ پر ہزار حیف
اب تک عدو ہے کشمکشِ امتحاں سے دور

کس نے لیا ہے نام اُس آشوبِ دہر کا
میری زباں سے پاس، عدو کی زباں سے دور

ہے سنگِ در بھی، دیدۂ محرم کو سنگِ راہ
بیٹھے ہیں اہلِ شوق ترے آستاں سے دور

بلدہ چمن تھا، دوریٔ بلدہ قفس ہے صدقؔ
مایوس جی رہا ہوں علی[1] یار خاں سے دور

[1] نواب علی یاور جنگ بہادر

غزل
جلیل ساز

احساسِ نامرادی و حرماں لیے ہوئے
بیٹھا ہوں اپنی موت کا ساماں لیے ہوئے

اے تیرگیٔ شامِ شبِ غم! تجھے سلام
وہ آ رہے ہیں صبحِ درخشاں لیے ہوئے

طے کر رہا ہوں مرحلۂ عقل و آگہی
ہاتھوں میں اپنے مشعلِ عرفاں لیے ہوئے

اے نامرادِ شوق! وہ آئیں گے ایک دن
سامانِ انبساطِ فراواں لیے ہوئے

یا رب مرے سفینۂ ہستی کی خیر ہو!
ہر موجِ غم ہے شورشِ طوفاں لیے ہوئے

آئے ہوئے ہیں ہم تو تری بزمِ ناز میں
دل میں ہجومِ حسرت و ارماں لیے ہوئے

آرائشِ جمال کا عالم نہ پوچھیے
آئینہ خود ہے دیدۂ حیراں لیے ہوئے

بیٹھا ہوا ہوں کنجِ قفس میں ملول سا
یادِ بہارِ صحنِ گلستاں لیے ہوئے

اے میرے ناخدا! تجھے معلوم ہی نہیں
موجوں کی خامشی بھی ہے طوفاں لیے ہوئے

اے سازؔ ان فسانوں کی رنگینیاں نہ پوچھ
سرخی ہے جن کی خونِ شہیداں لیے ہوئے

پہلے تو نہ تھا
باسط بھوپالی

اس دارِ فتن میں بھی یا رب یہ دَورِ فتن پہلے تو نہ تھا
عبرت بہ لحد عزت بکفن دنیا کا چلن پہلے تو نہ تھا

ادبار و ہلاکت کا بادل یوں سایہ فگن پہلے تو نہ تھا
ہر آنکھ سے سیلِ اشکِ رواں اے گنگ و جمن پہلے تو نہ تھا

پیہم طرفِ دل چشمِ کرم ہر لحظہ ستم بالائے ستم
ہاتھوں میں لیے اک دشنۂ غم ہر اہلِ وطن پہلے تو نہ تھا

رنگین بہاریں آئی ہیں پُرکیف فضائیں چھائی ہیں
اللہ رے فیضِ قیدِ قفس یہ رنگِ چمن پہلے تو نہ تھا

ملنے کو نگاہیں ملتی تھیں ہونے کو اشارے ہوتے تھے
اندازِ نگاہِ ساقی کا یوں توبہ شکن پہلے تو نہ تھا

للہ سمجھ انجامِ وفا اے ہوش کے دشمن ہوش میں آ
یہ رنگِ جنوں یہ حالِ زبوں یہ رنج و محن پہلے تو نہ تھا

اس درجہ ہلاکت خیز نہ تھے تہذیب و خرد کے دیوانے
لاشہ کبھی انسانیت کا بے گور و کفن پہلے تو نہ تھا

ہر قطعۂ زمیں پر جنگ نہ تھی اللہ کی دنیا تنگ نہ تھی
انساں کے تصور میں کوئی مفہوم وطن پہلے تو نہ تھا

باسطؔ سے ملا لیکن میں نے باسط میں نہ دیکھا باسطؔ کو
یہ خاک نشیں یوں خاک بسر خاکم بدہن پہلے تو نہ تھا

غزل
من موہن تلخ

عشق پر دن کچھ اور بھاری ہیں
آج بھی امتحان جاری ہیں

دل ہے کیوں آج اک لبِ خاموش
آرزوئیں کہاں سدھاری ہیں

سعیِ تکمیلِ خواہشات ہو کیا
سعی نے خواہشیں اُبھاری ہیں

عشق طوفاں سہی، مگر اس نے
پار کچھ بستیاں اُتاری ہیں

جو سمجھتے ہیں مجھ کو دیوانہ
خود وہ عقل و خرد سے عاری ہیں

تلخؔ چلنے کی جب سکت نہ رہی
منزلیں پھر کہیں پکاری ہیں

جوگندر پال

بیاہتا

ارجن، اُس کا چچیرا بھائی رام لعل اور رام لعل کی خوبصورت بیوی شوبھا رات کے وقت فرنٹیر میل میں سیکنڈ کلاس کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں بیٹھے دہلی جا رہے تھے۔ ڈبے میں اُن کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ شوبھا آرام سے اپنے جسم کو پوری سیٹ پر پھیلائے لیٹی ہوئی تھی۔ رام لعل شوبھا کے پاؤں کی طرف اکٹھا ہوکر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور ارجن کھڑکی کے متصل آدھا لیٹا اور آدھا بیٹھا بجلی کی زرد روشنی میں دزدیدہ نگاہوں سے شوبھا کے سوئے ہوئے پُرامن حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی گھبرا کر اپنی نظریں باہر گھور سیاہی میں کھبو دیتا۔ یا پھر کبھی رام لال کے خراٹوں کی خراش کو محسوس کرتے ہوئے وہ اُس کے ڈھیلے اور موٹے وجود، بے ترتیب سانس سے اوپر نیچے ہوتے ہوئے پھولے پیٹ اور کھُلے ہوئے موٹے موٹے ہونٹوں کی طرف دیکھنے لگتا۔ تھوڑی دیر میں ایک خیالی بدبو کے احساس سے اُس کی آنکھیں اس کثیف دھبّے سے ہٹ کر تمام ڈبے میں گھومتی گھومتی شوبھا کے بالوں سے اُلجھ کر پھر اُس کے چہرے پر جم جاتیں۔

"شوبھا، نیم کی چاندنی کی طرح شفّاف اور دُھلی ہوئی جس کی دھیمی ہنسی ہواؤں میں گدگدی کرتی ہوئی مشتاق کانوں سے یوں ٹکراتی ہے جیسے پانی کا ہولا ہولا بہاؤ ساحل کے منتظر پہلوؤں سے، شوبھا، رام لعل کی پتنی! گویا کوئی بسنتی رنگ میں کیچڑ گھول دے" ارجن کو لاشعوری طور پر یونہی معلوم ہوا کہ وہ کسی دلدل کے قریب بیٹھا اپنے دونوں ہاتھ کیچڑ میں گھول رہا ہے۔ اس کا تمام جسم کیچڑ سے لت پت ہے۔

"بدمعاش" اُسے اپنے بائیں کندھے پر کسی نامعلوم بوجھل ہاتھ کی جھنجھوڑ محسوس ہوئی "شرم نہیں آتی پرائی استری کو یوں گھورتے ہوئے۔ بے شرم۔ کیچڑ مل لو اپنے چہرے پر۔ ڈوب مرو!"

اُس نے گھبرا کر سرعت سے اپنا منہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا اور اُس کی نظریں پہلے کی طرح پھر کھڑکی کے باہر اندھیرے کی دیواروں میں کھُب گئیں۔

رام لعل لاہور کے ایک دولت مند ٹھیکیدار کا لڑکا تھا۔ اُس کی شادی ہوئے ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے۔ وہ ہر وقت والہانہ انداز سے اپنی بیوی کے آگے پیچھے پھرتا رہتا۔ اپنی بیوی کی موجودگی میں اُس کی چھوٹی چھوٹی خالی آنکھوں میں۔۔۔ خواہشات ایک بے پردہ ناچ ناچنے لگتیں جس کے تماشے سے شوبھا کے رخساروں کی قدرتی، شرمیلی سرخی سمٹ کر جانے کہاں غائب ہوجاتی۔ اُس کے چہرے میں سہمی ہوئی سپیدی دیکھ کر رام لعل کی حرص اور زیادہ عریاں ہوجاتی۔ جب وہ شوبھا کے پیچھے پیچھے اپنی نیم سیاہ شکل پر ایک بدنما مسکراہٹ پھیلائے لمبے لمبے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا بے صبری سے چلتا تو معلوم ہوتا گویا کسی پریشان ملکہ کے ساتھ ساتھ کوئی حقیر اور گستاخ غلام چلا آرہا ہے۔

ارجن لاہور کے کسی کالج میں انگریزی کا پروفیسر تھا۔ وہ ایک زرد رُو گھمبیر سا کنوارا نوجوان تھا۔ ابتدا میں اس کی مشکل پسند طبیعت زندگی کے خطرناک ترین تجربات سے اُلجھنے سے بھی نہ گھبراتی۔ وہ طوفانوں سے خوف کھانے کی بجائے انھیں دعوت دیتا۔ لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ اب وہ اپنی جدوجہد سے بیزار ہوگیا تھا۔ زمانے نے اُسے قناعت پسند بننا سکھا دیا تھا۔ اب وہ اپنا ایک چھوٹا سا گھر بنانا چاہتا تھا، جہاں وہ اپنی پیاری بیوی اور ایک دو ننھے ننھے بچّوں کے ہمراہ اپنا جیون سُکھ شانتی اور اطمینان سے گزار سکے۔ بہاؤ کے خلاف چلتے چلتے اُس کے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے تھے، اور اب وہ بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے لہروں کے ترنم میں کھو جانا چاہتا تھا۔ اُس کے ماں باپ قریب کے ایک گاؤں میں قیام پذیر تھے اور اُس نے اپنا قیام رام لعل کے باپ کے پاس ہی اختیار کر رکھا تھا جو ٹھیکیداری میں ناجائز طریقوں سے ہزار ہا روپے کما کر اب شہر کے معزز ترین آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔

جب ارجن نے شوبھا کو پہلی بار دیکھا تھا تو وہ ابھی نئی نئی بیاہی سسرال میں آئی تھی اور اُس دن کوئی خاص تہوار ہونے کی وجہ سے سر سے پاؤں تک پھولوں میں لدی ہوئی تھی۔ اُس کی جھلکتی ہوئی بنارسی ساڑھی نے سینے کے متوازن اُبھار پر سے گزر کر اُس کے آدھے سر کو ڈھانپ رکھا تھا۔

اُس وقت اُس کی بھری ہوئی جھیل کی طرح گہری اور ٹمٹماتی ہوئی شربتی آنکھیں ارجن کی نگاہوں سے ہلکے سے ٹکرائیں اور ارجن نے بوکھلا کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے "نمستے"۔

جواب میں اُس نے پھولوں کی رس بھری پتیوں کے سے اوپر والے پھولے جوبن سے تمتماتے ہوئے گالوں پر جھکا دیئے اور نہایت آہستہ سے خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی نرم اور گیلی آواز میں کہا "نمستے"۔

اُس دن اپنے کمرے میں آکر ارجن کو اپنی تنہائی کا شدید احساس ہوا۔ اور وہ اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا شیشہ لئے چارپائی پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ رام لعل ایک خوش قسمت گدھا ہے جسے اتنی خوبصورت دلہن مل گئی ہے وہ اپنی آنکھیں بند کر کے تصویر میں رنگ رنگ کے پھولوں میں لدی شوبھا دیکھنے لگا۔

"نمستے، شہد کی ایک بوند ٹپ سے اُس کے منہ میں آگری۔

"نمستے، اُس کے لب کتنے پتلے، شیریں اور سُرخ ہیں، دانت کتنے سفید اور چھوٹے چھوٹے۔

"نمستے، گویا وہ چاند کی کرنیں گن رہا ہو۔

وہ شوبھا کے متعلق کتنی ہی دیر سوچتا رہا۔

چارپائی سے اُٹھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ آسمانی قوتیں شوبھا کو رام لعل کے حوالے کرنے کے عوض اگر اُس کے سپرد کر دیتیں تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ آتشِ حسد نے اُس کے اندر رام لعل کے لئے حقارت پیدا کر دی، رام لعل میلے میلے گوشت کی ایک ڈھیلی دیوار، قدرت کتنی ستم ظریف ہے کہ ستاروں کے دیش کی اِس سندر راج کماری کو ایک بدشکل دیو کے دانتوں تلے رکھ دیا ہے۔

اے کاش ــــ! وہ خواہشات کے ایک اُمڈتے ہوئے سیلاب کو دبا کر رہ شروع شروع میں وہ ارجن سے شرماتی رہی لیکن آہستہ آہستہ اُس کی جھجک دُور ہو گئی۔ دو چار ماہ کے بعد تو وہ آپس میں بہت بے تکلف ہو گئے۔

ارجن کے خیالات ہمیشہ ذہنی طور پر اُس کی قربت سے معطر رہتے۔ لیکن اپنی چاہ کا یہ راز اُس نے اپنے سینے میں دفن کر رکھا تھا۔ اِس کے افشا ہو جانے کے ڈر سے وہ اکثر کانپ اُٹھتا، کئی بار اُسے ندامت بھی ہوتی کہ وہ ایک شادی شدہ خاتون کے لئے گنہگار جذبات کی پرورش کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک اخلاقی مجرم سمجھنے لگتا۔ لیکن اپنی پشیمانی کے باوجود وہ شوبھا کے متعلق سوچے بغیر نہ رہ سکتا۔

باتوں باتوں میں جب کبھی شوبھا اُسے "بھائی جی" کہہ کر پکارتی تو اُسے خواہش ہوتی کہ وہ اُسے اُس کا نام لے کر پکارے۔ ارجن، ارجن اور شوبھا، محلوں کے پٹ کھل جاتے بسنتی رنگ بکھرنے لگتا۔ ستاروں کے دیش کی راجکماری اپنے بے چین راج کمار کو آملتی اور راج کمار کے کانوں میں بنسری کی تانیں اُڑنے لگتیں۔ ان سروں میں مست راج دُلارا، انجانے میں اپنے سپنوں کی راجکماری کو لئے ہوئے ہوا کے گھوڑوں کی طرف قدم بڑھانے ہی لگتا کہ رام لعل کے چھوٹے بھائی بہن کلو اور اچھی اُسے جھنجھوڑ کر سطح کی جانب کھینچ لیتے۔

"چلو بھیا، تاش کھیلیں"۔ اچھی نے گویا اُس کے کندھوں کو مسل ڈالنے کی ٹھان رکھی ہو۔

"بھیا کے پارٹنر ہم بنیں گے" کلو چیختا۔

شوبھا کلو کو چڑانے کی خاطر مسکراتے ہوئے کہتی "نہیں، بھائی جی کے پارٹنر تو ہم بنیں گے"۔

ارجن اُس کے خوش نما بالوں کی سیدھی مانگ کی طرف چھپی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگتا۔ کاش تم میری زندگی کی پارٹنر ہوتیں، اور پھر میں تمہارے ساتھ اپنی زندگی کی یہ کٹھن منازل کتنی آسانی سے طے کر سکتا۔ تمہاری رفاقت سے میری بے چین طبیعت میں سکون آجاتا اور جب تمہارے گرم گرم زندگی بخش سانس میرے چہرے سے چھوتے تو میری متزلزل حیات اپنے مرکز پر لوٹ آتی۔

"اچھا بھائی جی، آپ مجھے اپنا پارٹنر بنائیں گے یا کلو کو؟" وہ کلو کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھنے لگتی اور وہ گویا چوروں کی طرح آہٹ پا کر گھبرا جاتا اور جواب دیتا "کلو کو"۔

رام لعل کے باپ کے سوا جو دن کا کھانا اپنے آفس ہی میں منگا لیا کرتا تھا گھر کے تمام افراد اکثر اکٹھے ہی کھانے کی میز پر بیٹھتے۔ ارجن جو سب کے سامنے شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے جھجک محسوس کرتا تھا بڑی نفاست سے آہستہ آہستہ کھاتے ہوئے بڑے دلچسپ لطیفے سناتا جنھیں سن کر اچھی زور زور سے ہنسنے لگتی۔

کلّو لپک کر ارجن کے قریب آکھڑا ہوتا۔ قہقہوں سے رام لعل کا پیٹ ہلنے لگتا۔
شوبھا پانی پیتے ہوئے ہنسی کو بمشکل روک کر اپنا گلاس میز پر رکھ دیتی اور
رام لعل کی ماں نوکر کو دور سے پکار کر پھلکا لانے کو کہتی۔

کئی بار ارجن کو دنیا کے بڑے بڑے مفکروں اور شاعروں کی باتیں
کرتے سن کر شوبھا کا چھوٹا سا منہ حیرت اور تعریف سے تھوڑا سا کھل جاتا
ارجن کی آواز میں زندگی دوڑنے لگتی: "ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور ہندوستان
کی روح ہے۔ اُس کے گیتوں میں ہم ہر ہندوستانی کے دل کی دھڑکن محسوس
کر سکتے ہیں۔ ایک امریکن نے اُس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ــــــ"
اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹیمک پاور پر بحث کرتے ہوئے سیاسیات پر
اُترتا۔ شوبھا کو اپنی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ کر اُس کی باتوں میں ندی
کی سی فراوانی آجاتی۔ اگرچہ وہ بظاہر سب کو اپنی باتیں سنا رہا ہوتا لیکن
اُس کا باطن صرف شوبھا کی توجہ کا طالب ہوتا۔

رام لعل کی ماں جو جوانی میں مونڈھے پر بیٹھ کر تھالی کی بجائے ہاتھ ہی
پر روٹی کھا لیا کرتی تھی میز پر سے کھانے کی تھالی کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیتی۔
رام لعل اُسے ٹوکتا تو ارجن کہتا، "نہ بھائی، چاچی کے طریقوں پر یوں نکتہ چینی
کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ ہمیں ہر شخص کے اطوار کی قدر کرنی چاہیئے۔ سنا ہے
ایک مسز براؤن اپنے مہمانوں کو غلط طریقے سے کھاتے ہوئے دیکھ کر خود بھی
جان بوجھ کر وہی طریقہ اختیار کر لیتی تاکہ اُس کے مہمانوں کو اپنی کمتری کا
احساس نہ ہو۔ ہر شخص کا ڈھنگ اُس کی اپنی ذات کے لئے مناسب اور
اہم ہوتا ہے مسٹر رام لعل۔"

رام لعل کی ماں اپنی تھالی پھر میز پر رکھ دیتی اور شوبھا ارجن کو تعریفی
نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نیپکن سے اپنا منہ پونچھنے لگتی۔ ایسے مواقع پر
ارجن کو شوبھا کی پسندیدگی بہت اہم معلوم ہوتی۔ "شاید وہ مجھے چاہتی ہے
اس کی اس دھندلی دھندلی چاہ کو میرا دل اکثر اُس کی نسوانی نگاہوں میں
محسوس کرتا ہے۔ کاش کہ یہ مبہم لکیریں واضح ہو جائیں۔" اپنے کمرے میں آکر
وہ پہروں اپنے تصورات میں گم رہتا۔

اتوار کی سہ پہر کو ارجن سو رہا ہوتا تو کئی دفعہ شوبھا، اچھی اور کلو چپکے
سے اُس کے کمرے میں آجاتے اور اُسے ڈرا کر جگا دیتے۔ شوبھا اُس کی میز
کی درازوں کو کھول کر چیزوں کو چھیڑتے ہوئے کہتی، "آپ بڑے سست ہیں بھیا!
جی صبح بھی آپ آٹھ بجے سے پہلے نہیں اُٹھتے اور اسکول سے آکر بھی آپ ہیں
اور آپ کا بستر، اتوار تو آپ نے ہمیشہ سونے کے لئے ہی ریزرو کر رکھا ہے۔
بھلا کوئی اتنا بھی سوتا ہے۔"

وہ سونا بھول کر جلدی سے چارپائی پر اُٹھ بیٹھتا۔

"اگر آپ سویرے جلدی اُٹھ سکیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ ہم سب سیر کے
لئے جایا کریں، آپ کو تو اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں۔"

سرسری پیار کے یہ دو چار الفاظ سن کر اُس کی خاموش محبت تشکر
سے اُس کی آنکھوں سے جھانکنے لگتی اور وہ اسکول کے ایک سلجھے لڑکے کی
طرح جواب دیتا: "بس عادت ہی ہو گئی ہے کہ یونہی سویا رہتا ہوں۔"

"ہم آج میٹنی دیکھنے جائیں گے بھائی جی۔" وہ میز پر رکھی ہوئی کسی کتاب
کے اوراق الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہتی۔

اچھی میٹنی کا نام سن کر غالیچے سے اُٹھ کر اُن کے قریب آبیٹھتی۔

"اور ہم بھی" جیسے کلو کو یقین نہ ہو کہ وہ اُسے ساتھ لے جائیں گے۔

ارجن شوبھا کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگتا۔

"وہ کسی دوست کے ساتھ باہر گئے ہوئے ہیں۔" شوبھا رام لعل کے
متعلق کہتی "تین بج رہے ہیں۔ ان کا انتظار کرنے سے ہم شو مس کر دیں گے۔
آپ تیار ہو جائیں۔ میں ابھی میک اپ کر کے اچھی اور کلو کو ساتھ لئے آتی
ہوں۔"

دو چار منٹ میں ارجن تیار ہو کر خود ہی رام لعل اور شوبھا کے کمرے
کی طرف چلا آتا۔ اچھی اور کلو بھی ٹپ ٹاپ ہو کر وہیں منڈلا رہے ہوتے۔
شوبھا جلدی جلدی اپنے بال بنانے میں مصروف ہوتی اور اُسے شیشہ
میں کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہتی "آپ بڑی جلدی تیار
ہو کر آگئے ہیں۔ میں نے سوچا جلدی جلدی بال بھی بنا ہی لوں۔"

ارجن چاہتا کہ وہ اُٹھ کر کمرے کے باہر چلا جائے۔ لیکن وہ اُسے
باتوں میں مصروف رکھتی۔

جب وہ تانگے میں بیٹھ کر سنیما ہاؤس کی طرف جا رہے ہوتے تو لوگوں کو
اپنی طرف گھورتے ہوئے پا کر وہ سوچنے لگتا۔ "شاید یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ ہم
میاں بیوی ہیں۔ شاید شوبھا بھی میری طرح اس وقت یہی سوچ رہی ہو۔"
اس کی نظر شوبھا کے خوبصورت بالوں کی سیدھی مانگ میں سیندور کی مختصر اور

ہلکی سی سرخ لکیر پڑ جاتی اور اُن دونوں کے درمیان ایک ناقابلِ تسخیر دیوار اُبھر آتی جس پر رام لعل بیٹھا کبھی کبھی کرتا ہوا اُس کا مذاق اُڑا رہا ہوتا، وہ اپنی نگاہ گھوما کر اچھی کی طرف دیکھنے لگتا۔ یا پھر کلو کو ڈانٹ کر آرام سے بیٹھنے کے لئے کہتا۔

باہر اب پو پھٹ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ فرنٹیر میل زمین کی چھاتی دلتی سرپٹ بھاگتے ہوئے اندھیرے سے روشنی کی طرف چلی آ رہی ہے۔ ارجن سوچتے سوچتے اپنی سیٹ پر بیٹھے گھٹنوں پر سر جھکائے اب سو گیا تھا، شوبھا بدستور اپنے بدن پر کمبل اوڑھے لیٹی ہوئی تھی اور رام لعل اُس کے پاؤں کی جانب اپنے جسم کو اکٹھا کئے خراٹے بھر رہا تھا۔

یکایک فرنٹیر میل ایک پُر زور جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ اور یہ تینوں ہڑبڑا کر جاگ اُٹھے۔ گاڑی کے باہر شور اور چیخیں سن کر تینوں گھبرا کر کھڑکیوں کے باہر جھانکنے لگے۔ گاڑی کسی اُجاڑ جگہ پر کھڑی تھی اور چند لوگ پریشانی میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ انھیں پتہ چلا کہ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبّہ میں ایک فرقے کے چند آدمیوں نے کسی دوسرے فرقے کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا ہے۔

رام لعل پورے حالات کا پتہ لینے کے لئے ڈبّہ سے نیچے اُترنے لگا تو شوبھا نے جلدی سے اُس کا بازو پکڑ کر اُسے اندر کھینچ لیا "آپ کیوں بے وقوف بنتے ہیں آپ۔ فساد کا معاملہ ہے۔ باہر کوئی وار کر دے گا!"

بیڈول اور بد مذاق رام لعل کے متعلق شوبھا کی یہ بے چینی اس قدر واضح تھی کہ ارجن چونک سا اُٹھا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد بھی جب گاڑی وہیں رُکی رہی تو شوبھا بڑی بے صبری سے کھڑکی کے باہر جھانکنے لگی۔ پھر اپنا سر اندر کر کے اُس نے ارجن کی طرف دیکھا "پتہ نہیں اب گاڑی کیوں نہیں چلاتے!"

ارجن کو محسوس ہوا کہ وہ اُسے کہہ رہی ہے "آپ ذرا باہر جا کر پتہ تو لیں کہ گاڑی کیوں نہیں چلتی!" اُس کے منہ پر دھپ سے ایک چپت پڑی اور وہ کسی اجنبی کی طرح کوئی جواب دئے بغیر اپنی ٹانگوں پر کمبل ڈال کر بڑے اطمینان سے لیٹ گیا، گویا برسوں سے چھنا ہوا سکون اُسے واپس مل گیا ہو۔

وحید عذری

آسام کی وحشی قومیں

چین، تبت، پاکستان اور برما سے گھرا آسام کا علاقہ آج بھی ان قدیم قوموں کا مسکن ہے۔ جن کا ذکر ہندوستان کی قدیم تاریخ میں کیا جاتا ہے۔ موجودہ تہذیب و تمدن نے ان قوموں کو زرخیز میدان اور سرسبز وادیاں چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس وقت آسام کے ان حصوں میں جو موجودہ تہذیب و تمدن و معاشرت سے منقطع ہو گئے ہیں ایسی کئی قومیں آباد ہیں جو اپنے تئیں علم الانسان کی رو سے ایک علیحدہ دنیا پیش کرتی ہیں۔ یہ قومیں مختلف گروہ یا قبیلوں کی شکل میں آباد ہیں۔ اور اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایک دوسرے پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہیں۔ آسام میں اس قسم کے متعدد قبیلے آباد ہیں جو مستقل طور پر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں۔ ان ہی قوموں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بالکل غیر مہذب و وحشی ہیں اور ان میں اکثر برہنہ رہتے ہیں۔ ان کا تعلق جنوبی افریقہ سے بتایا جاتا ہے ان وحشیوں کے قاتلانہ حملے اور اپنے شکار کے لئے سروں کی تلاش عرصہ تک ہمسایہ انگریزی مقبوضات میں باعث پریشانی تھے۔ اور ان کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انگریزی حکومت کے دور میں جو حملے ہوئے ان میں دو حملے ناقابل فراموش ہیں۔ یہ حملے "ابھور" اور "مشمی" کے ناموں سے موسوم کئے جاتے ہیں۔

ان قبیلوں کا تعلق منگول نسل سے بتایا جاتا ہے۔ ان میں چند وہ قبیلے بھی ہیں جو انڈونیشیا اور انڈوملایا کے جنوبی خطے سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں"۔ "اہامس" یا "اہوس" جس سے آسام کا نام اختراع کیا گیا وہ لوگ ہیں جن کا تعلق جنوبی مغربی چین کے علاقہ "شان" سے ہے۔ آسام میں انگریزی حکومت قائم ہونے سے پہلے برہم پترا کی وادی میں یہی قوم برسر اقتدار تھی۔

ان قوموں میں آج تک وہی رسم و رواج پائے جاتے ہیں جو زمانہ قدیم میں رائج تھے۔ اس لئے ان کے رسم و رواج کا مطالعہ کرتے وقت اس زمانہ کے حالات کا مدنظر رکھنا ضروری ہے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سوسائٹی کی تشکیل نہیں ہوئی تھی۔ شادی بیاہ سے لوگ ناواقف تھے اور گھریلو زندگی کی نشوونما بھی نہ ہونے پاتی تھی۔ اس دور میں عورتیں کسی جگہ سکونت پذیر ہو کر اپنے بچوں کے ساتھ رہتی تھیں اور ان کی پرورش کی واحد ذمہ دار ہوتی تھیں۔ مرد شکار و خوراک کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ اس زمانہ میں بچوں کے باپ یا ان کے خاندان کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ بچے اپنی ماں کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ماں اور ماں کے خاندان کی ملکیت ہوتے تھے اور صرف لڑکی جائداد کی وارث قرار دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے مشہور قبیلے "گیرو" "کیشیا" "کوڈو" اور "کوچ" میں یہ رسم بدستور رائج ہے۔ ماں گھریلو زندگی کی سردار مانی جاتی ہے۔ بچے ماں اور اس کے خاندان کی ملکیت ہوتے ہیں۔ شوہر شادی کے بعد اپنی شناخت اور آزادی کھو دیتا ہے۔ شادی کے بعد اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے قبیلہ کے ساتھ رہے۔ تمام زمین و جائداد کی مالک اس کی بیوی قرار دی جاتی ہے۔ یہ رشتہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ شوہر کو ضرورت کے وقت اپنے قبیلے سے بھی لڑنا پڑتا ہے۔ لڑکی زمین و جائداد کی وارث ہوتی ہے۔

دیگر قبیلوں نے خاندان کی تشکیل کچھ زیادہ ترقی پسند بنیادوں پر رکھی ہے۔ یہ وہ قبیلے ہیں جنہوں نے مستقل طور پر ایک جگہ سکونت اختیار کر لی ہے۔ ان قبیلوں میں شادی خرید کر کی جاتی ہے۔ دولھا، دولھن کی قیمت اس کے خاندان کو ادا کر دیتا ہے۔ اس طرح اس کے لئے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ بیوی کے قبیلہ میں رہے یا اس کی خدمت کرے۔ قیمت ادا کرنے کے بعد وہ دلہن کو اپنے قبیلہ میں لے جا سکتا ہے۔ اس طرح خاندان وجود میں آتا ہے۔ جس میں ماں باپ بچے شامل ہوتے ہیں۔ گھریلو زندگی کا سردار باپ ہوتا ہے۔ بچے اس کی ملکیت ہوتے ہیں اور جائداد کے وارث لڑکے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ قبیلے ہیں جو ہندوستانیوں کی تہذیب و معاشرت سے کافی متاثر ہوتے ہیں۔

ان قبیلوں میں قانونِ وراثت زیادہ مہذب اصولوں پر قائم کیا گیا ہے۔ ان قبیلوں میں عورت کا خریدا جانا معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ طریقہ ایک رواج بن کر رہ گیا ہے۔ کچھ قبیلے اس رواج کے بالکل خلاف طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں جہاں مرد جہیز پاتا ہے۔ خاندان کے تمام افراد ایک گھر میں رہتے ہیں۔ لڑکے اور بھتیجے جائداد کے وارث ہوتے ہیں اس طریقۂ وراثت کے وحشی قوموں میں وجود میں آنے کی وجہ "ناگاس" کے قاتلانہ حملے ہیں۔ "ناگا" ایک جنگجو وحشی قوم ہے جو متعدد قبیلوں پر مشتمل ہے اور منگولین نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ "ناگاس" دوسرے قبیلوں سے علیحدہ تنگ گھاٹیوں میں رہتے ہیں۔ اور مستقل طور پر ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان قبیلوں میں ازدواج خارجی کی رسم رائج ہے۔ اس رواج کے مطابق مرد اپنے قبیلہ کے باہر ہی شادی کر سکتا ہے۔ اور عورتیں حاصل کرنے کے لئے مستقل طور پر حملے کئے جاتے ہیں۔

ان کا لباس بہت مختصر قسم کا ہوتا ہے۔ گھنے استوائی جنگلوں، تنگ گھاٹیوں اور پہاڑوں کے دامن میں رہنے والے قبیلے قریب قریب برہنہ رہتے ہیں۔ ان میں اکثر اپنے جسم کو نقش و نگار سے رنگین بنانے اور زیورات سے آراستہ کرنے کے شائق ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں اکثر مرد عورتوں سے بازی لے جاتے ہیں۔ یہ لوگ کان کی لو میں بانس کے ٹکڑے، بازو بند، ہار اور رنگے ہوئے بالوں کے شوقین ہوتے ہیں۔ محنتی اور جفاکش عورتیں مردوں سے کچھ زیادہ کپڑا پہنتی ہیں لیکن ان کا خاص لباس ایک رنگین دھوتی ہوتی ہے۔ یہ دھوتی اس قدر سادگی اور ذہانت طباعی کے ساتھ باندھی جاتی ہے کہ ان کی شرم، حیا اور لحاظ کا پورا پورا اظہار ہوتا ہے۔ مکمل لباس میں ایک "ناگا" مرد شمالی امریکہ کے انڈین سے مشابہ ہوتا ہے۔ "ناگا" بہت تندرست اور مضبوط ہوتا ہے۔ وہ اپنے قوی ہیکل بدن کو نقش و نگار سے رنگین بناتا ہے بدن پر ایک پیش بند قسم کا کپڑا ہوتا ہے جس پر سفید کوڑیاں ٹکی رہتی ہیں یہ پیش بند گزشتہ حملوں میں حصہ لینے کا امتیازی نشان ہے۔ سینہ ایک چارخانہ کپڑے سے ڈھکا رہتا ہے اس پر بھی کوڑی کی قسم کے زیورات لگے رہتے ہیں۔ کانوں میں بڑی سیپ آویزاں ہوتی ہے تاکہ لڑائی کے وقت گردن کی حفاظت ہو سکے کہنی تک بید کا بنا ہوا چوڑا بازو بند پہنتے ہیں۔ سر پر پھول اور تپیوں کا بنا تاج ہوتا ہے جس میں کپاس سے جنگلی سؤر کے دانت جڑے رہتے ہیں۔ اس تاج یا ٹوپی سے پیشانی چھپ جاتی ہے۔ کمر میں ایک پٹکا ہوتا ہے جس میں ایک کلہاڑی کی شکل کا ہتھیار آویزاں ہوتا ہے اور جس کا دستہ رنگین بالوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس کی ڈھال بعض اوقات اس کے قد برابر لمبی ہوتی ہے۔ یہ ڈھال شیر، چیتا، ہاتھی یا جنگلی سور کی کھال سے بنائی جاتی ہے اور اسے خوبصورت بنانے کے لئے اس پر بکری کے سخت بال لگا لئے جاتے ہیں ہاتھ میں قریب آٹھ فٹ لمبا بھالا ہوتا ہے۔ جس پر بکری کے بال نہایت ہی خوبصورتی سے لپٹے رہتے ہیں۔ جب کوئی "ناگا" نعرۂ جنگ بلند کرتا ہوا اپنے دشمنوں پر حملہ کرتا ہے تو اس کا لباس اور ہتھیار ایک بھیانک منظر پیش کرتے ہیں۔

"مشمی" قبیلہ میں بچہ جنگل میں پیدا ہوتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے وقت ماں چند عورتوں کی معیت میں یا تنہا کافی دور جنگل میں چلی جاتی ہے جنگل میں ماں اور اس کے بچہ کے رہنے کے لئے ایک جھونپڑا بنا دیا جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ہی ماں کو اپنا کام دھندا شروع کر دینا پڑتا ہے۔

"میرس" قبیلہ میں ایک عجیب رواج پایا جاتا ہے۔ بچہ کے پیدا ہونے کے وقت باپ کو بھی بستر پر پڑا رہنا پڑتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ باپ دوسری ماں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح باپ کو قریب چالیس دن تک بستر پر پڑا رہنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ مریضوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ عورتیں اسے کھانا کھلاتی ہیں۔ اس عرصہ میں عیش و آرام کی تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اور اشیاء خورد و نوش کی ان چیزوں سے پرہیز کرتا ہے جن سے ان کے عقیدہ کے مطابق بچے کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو۔ اس رواج کا واحد مقصد اس حقیقت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے کہ باپ اس کے نوزائیدہ بچہ سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ "کیشیا" "کیوکس" اور "کیچی" قبیلوں میں بھی جو "ناگا" قوم کی نسل سے ہیں یہ طریقہ رائج ہوتا جاتا ہے۔ "کیشیا" اور "کیچا" میں بچہ کا نام ماں کے نام پر رکھا جاتا ہے۔ بچے کا نام رکھنے کا حق صرف گاؤں کے مرد یا عورتوں کو ہے۔ اس رواج کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باپ کو اپنا نام کھو دینا پڑتا ہے۔ اور وہ فلاں فلاں کے باپ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک مضحکہ خیز چیز جو اس قاعدہ سے ظہور پذیر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی مرد کے یہاں عرصہ تک بچہ پیدا نہیں ہوتا ہے تو باپ کو "بغیر بچہ کا باپ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

"ناگا" قبیلوں کے گاؤں میں تمام کنوارے ایک بڑے ہال میں

رہتے ہیں جیسے "مورنگ" یا کنواروں کا ہال کہا جاتا ہے - اس قسم کے ہال شادی شدہ لوگوں کے قیام سے کافی دور گاؤں کے دروازے پر واقع ہوتے ہیں۔ اس لئے گاؤں کے دفاع کا فرض بھی ان پر عائد ہوتا ہے - اسی طرح نوجوان غیر شادی شدہ لڑکیاں گاؤں کی بوڑھی عورتوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ "ناگا" قوم جن کے یہاں عورت کو بزور حاصل کرنے کا رواج پایا جاتا ہے دوسرے قبیلوں کے قریب میں آباد ہونے کی وجہ سے کورٹ شپ کا موقع مل جاتا ہے - دوسرے قبیلوں میں جہاں اپنی حدود کے اندر شادی کرنے کی اجازت ہے وہاں کورٹ شپ کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں - نسبت قرار دینے کے لئے جشنِ رقص و سرود کا رواج پایا جاتا ہے۔ "ناگا" میں اس قسم کا جشن قبضہ کرنے کے اصولوں پر کیا جاتا ہے - ہوتا یہ ہے کہ ہر قبیلہ کی غیر شادی شدہ لڑکیاں ایک حلقہ باندھ کر شب میں آہستہ آہستہ رقص کرتی ہیں اور ہر قبیلے کے نوجوان اپنی مشعلوں کے ساتھ ان رقص کرنے والی لڑکیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اپنی پسندیدہ لڑکی کو اٹھائے جاتے ہیں - کنواری لڑکی اپنے بال ترشواتی ہے اور کافی زیورات سے اپنے جسم اور لباس کو آراستہ کرتی ہے - شادی کے بعد بال بڑھنے دئے جاتے ہیں اور جوڑے کی شکل میں باندھ لئے جاتے ہیں۔ تمام زیورات جن کا استعمال موزوں شوہر کو اپنی طرف راغب کرنا ہوتا ہے رکھ دئے جاتے ہیں یا غیر شادی شدہ لڑکیوں کو دے دئے جاتے ہیں -

شادی کی رسم زیادہ شان و شوکت سے ادا نہیں کی جاتی ہے۔ "گیروس" قبیلہ میں یہ رسم پائی جاتی ہے کہ دولھا اپنے دوستوں کی معیت میں دلہن کے گھر جاتا ہے جہاں ایک مُرغ اور ایک مُرغی بطور قربانی کے مارے جاتے ہیں۔ چاہے شگون نیک ہو یا بد شادی ہو کر رہتی ہے - مذہبی پیشوا کی غیر موجودگی میں کوئی بھی دوست شادی کی رسم ادا کرتا ہے۔ پہلے مُرغ کو اٹھا کر دولہن کی پیٹھ پر ضرب لگاتا ہے اور اسی طرح مردہ مُرغی سے دولھے کی پیٹھ پر ضرب لگائی جاتی ہے - اس رسم کے انجام پا جانے کے بعد شادی جائز قرار دی جاتی ہے - اس کے بعد خوشی اور دعوتوں کا دورہ شروع ہوتا ہے شادی کے بعد دُولہا دُولہن کے گھر میں قیام کرتا ہے اور دُولہن کے قبیلے کا ایک فرد قرار دے دیا جاتا ہے۔ "گیروس" میں ننہالی رشتہ سے حسب و نسب دیکھا جاتا ہے - ایک مرد جو کسی گھر کی خاص لڑکی سے شادی کرتا ہے اگر اتفاقاً اس کے خُسر کا انتقال ہو جائے تو اسے فوراً اپنی خوشدامن سے شادی کرنی ہوتی ہے وہ اپنی چچا زاد ہمشیرہ سے شادی نہیں کر سکتا۔ وہ صرف ننہالی رشتہ سے منسوب کسی بھی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے - اکثر ہوتا یہ ہے کہ لڑکا اپنی بہن کے خاوند کی بہن سے شادی کرتا ہے۔ "مشمی" قبیلہ میں کثیر ازدواجی کا رواج قائم ہے - عورتوں کی تعداد مرد کی قوت خرید پر منحصر ہے - فی عورت کی قیمت ایک سو اسے لے کر ۲۰ بیل تک ہوتی ہے - عورتوں کی تعداد مرد کی دولت سمجھی جاتی ہے - جتنی زیادہ عورتیں ہوں گی آدمی اتنا ہی زیادہ امیر کہلانے کا مستحق ہوگا - مرنے کے بعد تمام عورتیں سوائے وارث کی ماں کے لڑکے کی وراثت میں منتقل ہو جاتی ہیں چند قبیلوں میں شادی چند ہفتوں کے لئے عارضی ہوتی ہے - لڑکا اور لڑکی گاؤں سے باہر چلے جاتے ہیں اور اگر دونوں مطمئن ہو جائیں تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ شادی قرار پا گئی۔ "گیروس" اور "کیشیا" کے قبیلوں میں جہاں ننہالی رشتے قائم کئے جاتے ہیں عورت کے حقوق نسبتاً متمدن قوموں کے زیادہ ہوتے ہیں - عورت تمام معاملات میں برسرِ اقتدار ہوتی ہے - لڑکی ہی شادی کی تجویز پیش کرتی ہے - خاوند کو اس کے خاندان کے ساتھ رہنا پڑتا ہے - لڑکی جب چاہے اپنے خاوند سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے اور کسی بھی دوسرے شخص سے شادی کر کے اپنی تمام جائداد جس میں سابق خاوند کی جائداد بھی شامل ہوتی ہے نئے خاوند کے نام منتقل کر سکتی ہے - تمام بچے ماں ہی کی ملکیت ہوتے ہیں - جب قبیلے کے سردار کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا وارث سردار کی بہن کا لڑکا ہوتا ہے - اگر لڑکا شادی شدہ ہوا تو اسے فوراً اپنی بیوی کو چھوڑ کر سردار کی بیوی سے شادی کرنی پڑتی ہے - اس طرح اس کی بیوی تمام جائداد بمعہ بچوں کے قابض ہو جاتی ہے - اور لڑکا ضعیف عورت سے شادی کر کے سرداری کا رُتبہ حاصل کرتا ہے لیکن ضعیف عورت سے شادی باوجود سرداری کے شان و شوکت کے بڑی تکلیف دہ چیز ہوتی ہے - ایک لڑکا جسے خوش قسمتی سے اس قسم کی سرداری ملی تھی ایک انگریز سیاح سے شکایت کرتا ہے کہ اس کا چچا زاد بھائی ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ دن بھر کھیلتا ہے اور اس کی بیوی اتنی بوڑھی ہے کہ اس کے منہ میں دانت تک نہیں ہیں -

ان میں اکثر قبیلے مذہبی معاملات میں بہت پیچھے ہیں ان کے عقیدے بہت معمولی قسم کے ہوتے ہیں - یہ عقیدہ عام ہے کہ حیوانی مظاہر ایک غیر مادی روح کے پیدا کئے ہوئے ہیں مظاہر قدرت سنگ و شجر میں روح کی

موجودگی کے قائل ہیں ۔ مظاہر پرستی عام ہے ۔ بے جان چیزوں کو ذی روح جان کر انہیں پوجتے ہیں ۔ لیکن وہ صرف ان روحوں کی پرستش کرتے ہیں جنہیں وہ ضرر رساں سمجھتے ہیں ۔ چند قبیلوں کے مذہبی پیشوا بھی ہوتے ہیں "ابجور" قبیلہ میں درختوں میں رہنے والی روحوں کی پوجا کی جاتی ہے ۔ اگر وہ روح بہت ظالم قسم کی ثابت ہوتی مثلاً ہیضہ پھیل گیا یا جنگل میں بچہ گم ہو جائے تو روح سے انتقام لینے کے لئے آس پاس کے تمام درختوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دئے جاتے ہیں ۔ تب قربانی دی جاتی ہے ۔ اور صرف گاؤں کے بزرگ یا مریض اس کا گوشت کھا سکتے ہیں ۔ "گورس" آسمانی روحوں کو سفید مرغ کی اور زمین کی روحوں کو زمین کی پیداوار مثلاً چاول' پھول' شراب وغیرہ کی قربانی دیتے ہیں ۔ ان کے مندر نہیں ہوتے ۔ قربانی ایک بانس کے درخت کے سامنے جس کی شاخیں زمین میں گاڑ دی جاتی ہیں دیتے ہیں ۔ جب کوئی ناگہانی موت واقع ہوتی ہے یا آگ لگ جاتی ہے یا بچہ پیدا ہوتا ہے تو ایسی حالت میں مکان فوراً خالی کر دیا جاتا ہے اور تین دن تک اس میں داخل ہونے کی کسی کو اجازت نہیں ہوتی ہے ۔ لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے دروازے پر درخت کی شاخ لٹکا دی جاتی ہے ۔ جشن کے موقع پر گاؤں کے دروازے باہر کے لوگوں پر بند کر دئے جاتے ہیں نہ کوئی گاؤں میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ گاؤں سے باہر جا سکتا ہے ۔ لاشیں عموماً دفن کر دی جاتی ہیں ۔ "ناگا" کی لاش کے داہنی جانب دو بھالے' تلوار اور آگ کا ہتھیار جو کہ بانس کا بنا ہوتا ہے رکھ دئے جاتے ہیں ۔ تاکہ ضرورت کے وقت روح سے مقابلہ کر سکے جب کوئی ناگا قدرتی موت مرتا ہے تو اس کا کوئی قریبی رشتہ دار اپنے بھالے سے لاش پر زخم لگاتا ہے تاکہ دوسری دنیا میں اس کا استقبال ان بہادروں کے مانند کیا جائے جو کہ میدانِ جنگ میں مرتے ہیں ۔ عورت کے بازو سے ایک سیاہ کپڑا رکھ کر ایک ٹوکری چاول لاش پر ڈال دئے جاتے ہیں ۔ قبر پر قربانی کئے ہوئے جانوروں کے سر کی ہڈیاں اور ہتھیار جنہیں وہ استعمال کرتا تھا رکھ دئے جاتے ہیں ۔ عورت کی قبر پر وہ ٹوکری جس میں وہ بوجھ ڈھوتی تھی سل دبٹہ جس سے اناج پیستی تھی اور کپڑا بننے کی لکڑیاں رکھ دی جاتی ہیں ۔

اب ہندوستانی تہذیب و معاشرت سے یہ لوگ کافی متاثر ہوتے جاتے ہیں ۔ تیل کے چشموں اور چائے کے باغات کی وجہ سے کافی ہندوستانی آسام میں آباد ہو گئے ہیں ۔ مشن بھیجے جانے اور تعلیم رائج کرنے کی وجہ سے یہ لوگ متمدن ہوتے جا رہے ہیں اور اپنے پرانے رسم و رواج بھولتے جاتے ہیں ۔

شعر و ادب

دیوانِ غالب :۔ مع سہ رنگی تصویر قیمت مجلد تین روپے

شرح دیوانِ غالب :۔ از حضرت جوش ملسیانی اس وقت اس سے بہتر دیوانِ غالب کی شرح موجود نہیں ۔ قیمت مجلد پانچ روپے

فروزاں :۔ اردو کے مشہور نوجوان شاعر جذبی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا مجموعہ قیمت مجلد تین روپے

آہنگ :۔ اردو کے مشہور نوجوان شاعر مجاز کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا مجموعہ ۔ قیمت چار روپے

پرائی عورت :۔ دلیش کی شوخ و مزاحیہ کہانیوں کا مجموعہ قیمت مجلد دو روپے

بیگم :۔ دلیش کے دلچسپ مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ۔ قیمت مجلد دو روپے

ہفت رنگ :۔ حضرت عرش ملسیانی ایڈیٹر "آجکل" کے کلام کا مجموعہ قیمت مجلد تین روپے

اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر ۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا ایک عالمانہ مضمون ۔ قیمت آٹھ آنے

اردو کی عشقیہ شاعری ۔ فراق گورکھپوری کی عالمانہ تنقید قیمت دو روپے بارہ آنے

اصغر :۔ اصغر گونڈوی کے غیر فانی کلام پر عالمانہ مضامین قیمت دو روپے ۱۲ار

کلامِ اقبال :۔
بانگ درا ۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے
بال جبریل ۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے
ارمغانِ حجاز ۔ تین روپے آٹھ آنے

ہمارا آیندہ پروگرام

دودھ اور خون :۔ صدیقہ بیگم کے افسانوں کا مجموعہ ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

ماں بیٹا :۔ (ناول) از حیات اللہ انصاری قیمت ایک روپیہ چار آنے

تنقید اور عملی تنقید :۔ احتشام حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ (زیر طبع)

مینڈک کی گرفتاری :۔ کرشن چندر کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ (زیر طبع)

ملنے کا پتہ :۔ **آزاد کتاب گھر ۔ کلاں محل دہلی**

محمد شفیع الرحمن

سوڈان مصری

آجکل مصر میں اپنے ملک کو برطانوی شہنشاہی کے پنجے سے آزاد کرانے کی آخری کوشش جاری ہے۔ ایشیا کے ملکوں اور سب سے زیادہ ہندوستان کے عوام اور یہاں کی حکومت کو مصر کی آزادی سے دلچسپی اور ہمدردی ہے۔ یورپ کی شہنشاہی سلطنتیں اور نام نہاد جمہوریتیں جو ایشیا اور افریقہ کے ملکوں پر مدتوں سے اور اب اس جمہوریت کے زمانے میں بھی بدترین شہنشاہی کر رہی ہیں اس وقت برطانیہ کی ہمدرد ہیں۔ موافق یا مخالف سب لوگوں کی توجہ مصر اور سوڈان کی طرف ہے۔ خلفشار، حیص بیص اور کشت و خون کی روز افزوں خبریں آتی رہتی ہیں۔

۱۴-۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد ۱۹۲۲ء میں مصر تو برطانیہ کی دستبرد اور زبردستی سے آزاد ہو گیا لیکن اس ملک کا جزو سوڈان پریذیڈنٹ ولسن کے بلند بانگ، عالم گیر آزادی کے اصول کے باوجود برطانیہ کے تغلب اور تصرف کی چیرہ دستی سے رہا نہ ہو سکا۔ اور برطانیہ اور مصر کے درمیان جو طویل گفت و شنید ہوئی اس کے نتیجے میں برطانیہ نے اپنے ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء کے اعلان میں سوڈان کے متعلق آخری شہنشاہی حکم دیا کہ اس کے متعلق فیصلہ شہنشاہ معظم کی گورنمنٹ اس وقت تک ملتوی رکھے گی جب تک کہ شہنشاہ معظم اور مصر کی حکومت کے مابین آزاد گفت و شنید اور دوستانہ مفاہمت سے طے کرنا ممکن ہو۔

سوڈان کی جغرافی حدود کے متعلق مصری مصنف عبدالرحمن الرافعی بے نے اپنی کتاب المصر و السودان میں لکھا ہے کہ خدیو اسمٰعیل کے عہد کے آخر میں سوڈان کی حد خط استوا کے جنوب کی طرف تھی۔ اور البرٹ اور وکٹوریا جھیلیں اور ان کے درمیان کا علاقہ اس کی حدود میں شامل تھا۔ مشرقی حد بحر احمر اور خلیج عدن تھی۔ اور جنوب مشرق کی حد بحر ہند تک پہنچتی تھی۔ جس میں سواکن، مسوہ، طیلہ، بربرہ، حرر اور سومالی لینڈ کا شمالی ساحل شامل تھا۔ بحر احمر کا مغربی ساحل، سویز سے جنوب میں باب المندب تک سب مصر کا حصہ تھا۔ مصر کی مملکت، خلیج عدن میں باب المندب سے راس گردافوی اور راس حافون تک تھی۔ اور مغرب میں مصر کی سلطنت کی دارفور سے مغرب میں وادی تکسمتی تک۔

یہ حدود ترکی سلطنت کے عہد میں مصر کے صوبے کے جزو سوڈان کے تھے ۱۸۴۱ء کے فرمان کے ذریعے سے باب عالی یعنی حکومت ترکی نے سوڈان کو خدیو مصر کی سلطنت میں شامل تسلیم کر لیا۔ اس وقت کے بعد کے تغیرات اور دستبرد کے بعد اب موجودہ مصر اور سوڈان کا نقشہ یہ ہے۔

سوڈان کا رقبہ تقریباً دس لاکھ مربع میل ہے۔ یہ تمام یورپ کے چوتھائی حصے کے برابر ہے۔ دریائے نیل سوڈان اور مصر کا قلب اور مدار زندگی ہے۔ سفید نیل خط استوا کے قریب سے وکٹوریا، البرٹ اور ایڈورڈ جھیلوں سے نکلتا ہے اور سوڈان کے دارالسلطنت خرطوم کے پاس پہنچ کر نیلے نیل میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی دریا کے پانی اور طغیانی پر تمام مصر اور سوڈان کی آب پاشی، زرخیزی اور زندگی کا انحصار ہے۔ تاریخ سے پہلے سے اور فرعونوں کی سلطنت میں یہ دونوں حصے ایک ملک اور ایک سلطنت اور نظام میں رہے۔ تاریخ اور آثار قدیمہ سے یہ بات واضح اور مسلم ہے۔

عربوں اور مصریوں نے سوڈان کو آباد کیا۔ انہیں کا تمدن وہاں رائج ہے۔ سوڈان کے اصل باشندوں سے عربوں اور مصریوں نے مناکحت کے رشتے قائم کئے اور اس کا نتیجہ اب وہاں کی تمام آبادی ہے۔ اگرچہ جنوبی حصے اور جنگل کے علاقے میں اُن کے اپنے ہی رسم و رواج ہیں مصر اور سوڈان کی نسلی، زبان، رسم و رواج، تہذیب سب ایک ہی ہے ۱۹۴۷ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی ۷۵ لاکھ ہے۔ جن میں سے پچاس لاکھ عربی زبان بولنے والے مسلمان ایسے ہیں جن کا طرز تمدن و معاشرت، رسم و رواج مصری ہے۔

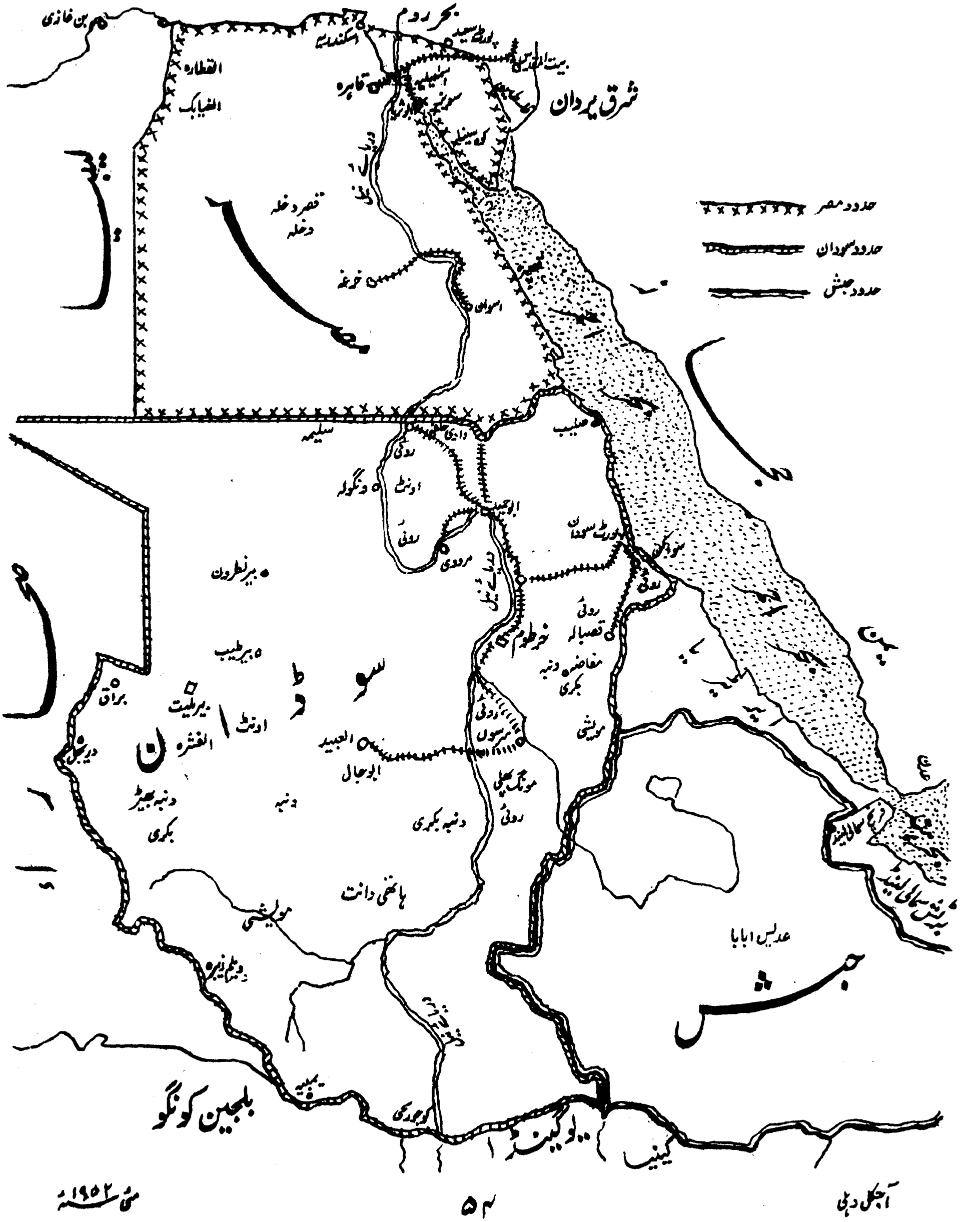

بحر روم
بن غازی
اسکندریہ
پورٹ سعید
بیت المقدس
قاہرہ
شرق یردان
القطارہ
قصر دخلہ
دخلہ
خرغہ
اسوان
حدود مصر
حدود سوڈان
حدود حبش
سلیمہ
ڈنگولہ
اونٹ
روئی
مروی
بیر نطرون
بیر طیب
سوڈان
بیر ملیت
الفشر
العبید
خرطوم
قصبالہ
پورٹ سوڈان
مویشی
ڈنبہ بکری
ہاتھی دانت
عدیس ابابا
حبش
بلجین کونگو
یوگینڈا
کینیا

خدیو محمد علی کے عہد میں سوڈان میں انتظام سلطنت کے نئے طریقے رائج ہوئے۔ اسی عہد میں وہاں کی دارالسلطنت خرطوم کی تعمیر ہوئی۔ خدیو اسمٰعیل نے کاشت کے ذرائع میں ترقی کی اور روئی کی کاشت کو رواج دیا۔ خرطوم اور قصالہ میں روئی کی فیکٹریاں قائم کیں۔ زیادہ آبادی کے مقامات میں اسکول کھولے۔ سلطنت کے تحت ہی غلام فروشی کا انسداد ہوا۔ یہ کام دشوار تھا۔ کیونکہ اس تجارت کا مرکز اور مخرج افریقہ کا یہی حصہ تھا۔

لیکن مصر کے اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے ۱۸۸۱ء میں سوڈان پر برطانیہ کا تسلط ہوگیا۔ اسی وقت محمد احمد المہدی کی قیادت میں مذہبی بغاوت ہوئی۔ برطانیہ نے اس بغاوت کو دبانے کے لئے کشت و خون کیا اور سوڈان پر قبضہ جما لیا۔ اور مصر کی سلطنت کو اپنی طاقت سے سوڈان چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ مصر کی سلطنت اور فوجوں کی علیحدگی سے سوڈان میں بدامنی کا دور دورہ ہوگیا اور ملک کا جان و مال کا شدید نقصان ہوا۔ ۱۹ جنوری ۱۸۹۹ء کو برطانوی اور مصری سلطنتوں میں معاہدہ ہوا اور مصر و برطانیہ کی مشترکہ حکومت سوڈان پر مسلط کی گئی۔ جس میں شریک غالب برطانیہ بن بیٹھا۔ اور جب سے ہی انگریز سوڈان مصری کو اینگلو ایجپشین سوڈان کہنے اور لکھنے لگے۔

۱۸۹۹ء کے معاہدے کی کچھ دفعات یہ ہیں۔

.... چونکہ خواہش یہ ہے کہ ملک معظم برطانیہ کو جو کچھ حقوق فتح سے حاصل ہوئے ہیں ان کو عملی صورت دی جائے اور موجودہ نظام حکومت میں شرکت اور آیندہ کے عملدرآمد اور ترقی اور قانون سازی کے لئے مناسب معلوم ہوا کہ کچھ ضوابط مقرر کئے جائیں اس لئے طے ہوا کہ

دفعہ ۱ - برطانیہ اور مصر دونوں کے جھنڈے استعمال ہوں گے۔۔

دفعہ ۲ - سب سے اعلیٰ فوجی اور سول اختیارات اس افسر کو حاصل ہوں گے جو گورنر جنرل سوڈان کہلائے گا۔ وہ ملک معظم برطانیہ کی حکومت کی سفارش پر خدیو کے فرمان کے ذریعے سے مقرر کیا جائے گا اور برطانوی حکومت کی رضامندی سے خدیو کے فرمان کے ذریعے سے علیحدہ کیا جائے گا۔

دفعہ ۳ - سوڈان کی عمدہ حکومت کے لئے قوانین، احکام اور قانون کی حیثیت کے قواعد اور دوسرے ضوابط وقتاً فوقتاً نافذ کرنے عائد کرنے، تبدیل و ترمیم اور منسوخ کرنے کا اختیار گورنر جنرل کو ہوگا۔

دفعہ ۴ - کوئی مصر کا قانون، فرمان، ڈگری، یا وزارت کا حکم یا کوئی اور قانون جو آیندہ بنایا جائے یا جاری کیا جائے، سوڈان پر نافذ نہ ہوگا۔ سوا اس صورت کے کہ وہ قانون گورنر جنرل کے اعلان کے ذریعے سے مندرجہ تحت طریقہ پر نافذ کر دیا جائے۔

اس معاہدے کے ذریعے سے سوڈان میں عجیب و غریب طریقے کی دو عملی حکومت قائم اور مسلط کی گئی۔ جس کو کنڈومینیم کا نام دیا گیا۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ مصر اور برطانیہ دونوں کی مشترک حکومت قائم کی گئی ہے لیکن اختیارات سب برطانوی گورنر جنرل کے ہاتھ میں دے دیئے اور مصر کو انتظام حکومت اور نظام سلطنت میں جو کچھ حق اور دخل معاہدے کے ذریعے سے دیا تھا وہ بھی عملاً رفتہ رفتہ ختم ہوتا چلا گیا۔ اور بالآخر ۱۹۱۴ء میں مصر، برطانیہ کی زیر حمایت حکومت انگریزی الفاظ میں پروٹیکٹوریٹ قرار دے دیا گیا۔ تو سوڈان خود بخود بغیر کسی قانونی حق یا مجاز کے مکمل طور پر برطانیہ کی مملکت ہو گیا۔ اور قبضہ و تسلط بلا شرکت غیرے مکمل ہوگیا۔

۱۴-۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد ہی مصر میں تحریک آزادی شروع ہوئی اور پریذیڈنٹ ولسن کے اصولوں کے مطابق قومی آزادی کی جد و جہد جاری ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کے ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء کے اعلان کے ذریعے سے مصر کی زیر حمایتی پروٹیکٹوریٹ ختم ہوگئی اور مصر با اختیار آزاد سلطنت ہوگیا۔ اگرچہ سوڈان کا معاملہ بھی اس تحریک اور اس کے متعلق گفت و شنید میں شامل تھا۔ لیکن اس کے متعلق کچھ نہ ہوا اور اس اعلان میں ہی اس طرح کا تذکرہ کیا گیا۔

سوڈان اس وقت تک ملک معظم کی گورنمنٹ کے اختیار میں رہے گا جب تک کہ اس کے متعلق فریقین کے مابین آزادانہ تبادلۂ خیالات اور دوستانہ مفاہمت کے ذریعے سے باہمی فیصلہ و قرارداد نہ ہوجائے اور ملک معظم کی حکومت اور مصر کی حکومت کے مابین کچھ طے نہ ہو۔

مصر کی حکومت کا جو کچھ تھوڑا بہت دخل سوڈان کے انتظام میں تھا وہ بھی رفع ہوگیا۔ برطانیہ نے مصر کو سوڈان سے اپنی فوج نکال لینے کا الٹی میٹم دے دیا۔ برطانوی افسروں نے سوڈان میں مختلف فرقوں میں نا اتفاقی اور علیحدگی کی تحریک تیز کر دی اور مصر کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔

مصر کی قومی تحریک جاری رہی۔ سعد زاغلول پاشا اور محمد محمود پاشا بھی وقتاً فوقتاً ریمزے میکڈانلڈ اور ہینڈرسن وغیرہ سے گفت و شنید کرتے رہے لیکن سوڈان میں کوئی تبدیلی اور بہتری نہ ہو سکی۔ آخرکار ۲۶ اگست ۱۹۳۶ء کو ایک صلح نامہ برطانیہ اور مصر کی حکومتوں میں ہوا لیکن اس کے ذریعے سے بھی کوئی بہتری سوڈان کے نظام حکومت میں نہ ہوئی۔ بجائے مصر کا کوئی مطالبہ تسلیم کرنے کے مصر اور سوڈان علیحدہ علیحدہ ملک قرار دے دیا گیا برطانوی گورنر جنرل کے سب اختیارات حسب سابق بحال رہے۔ مصر کے عوام اور حزب مخالف کی طرف سے اس صلح نامے کی بہت مخالفت ہوئی۔

۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ عظیم کے بعد مصر میں ۱۹۳۶ء کے صلح نامے کی مخالفت اور زیادہ بڑھی اور اس کی ترمیم و تنسیخ کے لئے نہایت سرگرم تحریک جاری ہوئی۔ صدقی پاشا اور مسٹر بیون کی باہمی گفتگو سے پھر اس تحریک کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ ایک اعلان پھر جاری کر دیا اور ۱۸۹۹ء کے معاہدے کو برقرار رکھا۔ صرف یہ اقرار کیا سوڈان کے باشندوں کو اپنی آیندہ حیثیت مقرر کرنے کا حق حاصل ہے وہ خواہ مکمل آزادی یا مصر سے کسی قسم کا تعلق ہو لیکن وہ مختصر آیندہ کسی متناسب وقت پر رہا۔ اختلاف رائے کی وجہ سے نیا صلح نامہ نہ ہو سکا۔

محمود فہمی النقراشی پاشا نے ۱۹۴۶ء میں وزارت بنائی اور یہ بات واضح طور پر بیان کی ملک کو اس کے سوا کوئی سمجھوتہ منظور نہ ہوگا کہ برطانوی فوجیں غیر مشروط طور پر فوراً سوڈان و مصر خالی کر دیں اور وادیٔ نیل کا کامل اتحاد ہو جائے۔ مصری گورنمنٹ نے یہ معاملہ ۵ اگست ۱۹۴۷ء کو سیکیورٹی کونسل میں پیش کیا۔ اور مصر و سوڈان سے برطانوی فوجوں کے تخلیے اور سوڈان میں موجودہ نظام حکومت کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ لیکن سیکیورٹی کونسل نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

برطانیہ سے مسلسل گفت و شنید ہوتی رہی۔ ۱۹۵۰ء میں مصطفیٰ النحاس پاشا کی وفدی وزارت قائم ہوئی۔ مصری وزیر خارجہ نے لندن جا کر بالمشافہ گفتگو کی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا بلکہ سوڈان میں برطانوی حکومت کی مصر کے مطالبے اور سوڈان کے باشندوں کی آزادی کی تحریک کے خلاف کوششیں اور اختلاف پھیلانے کی تدبیریں اور تیزی سے ہونے لگیں۔ آزادی کی تحریکوں کو دبایا گیا ایسے افسر متعین کئے گئے جو مصر کے مخالف ہوں۔

جون ۱۹۴۸ء میں ایک آرڈیننس کے ذریعے سے ایگزیکیوٹو کونسل اور لیجسلیٹو اسمبلی قائم کی گئی۔ ایگزیکیوٹو کونسل گورنر جنرل کے تحت ہے اور مزعومہ کیبنٹ ہے۔ آدھے ممبر سوڈانی ہیں اور آدھے انگریز۔ اسمبلی حکام میں سے منتخب شدہ اور نامزد ممبروں اور صرف دس عام انتخاب سے منتخب شدہ ممبروں پر مشتمل ہے جو کہ ۶ بڑے شہروں میں سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اس تجویز کا نام "سوڈان کی آزادی" ہے۔ اور اس کے ذریعے سے برطانوی اقتدار کو مضبوط اور سوڈان اور مصر میں جدائی اور اختلاف پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اس مقصد کے لیے پارٹیاں قائم کی گئی ہیں اور گورنمنٹ ان کی اسی طرح امداد کرتی ہے جس طرح ہندوستان میں مختلف پارٹیوں میں اختلاف پیدا کرتی تھی۔

برطانیہ نے جب مصر کی حکومت کو سوڈان سے اپنی فوجیں نکال لینے پر الٹی میٹم کے ذریعے سے مجبور کیا تو ۲۷ نومبر ۱۹۲۴ء کو سوڈان کی فوجوں نے بغاوت کر دی۔ اس کو شدید خونریزی سے دبایا گیا۔ بہت سے قومی لیڈروں کو مار دیا گیا۔ کچھ کو جلا وطن کر دیا۔ اور بعض نے بھاگ کر مصر میں پناہ لی۔ قومی تحریک آزادی کو دبانے کے لئے سوڈان کی برطانوی حکومت نے قبیلوں کو قوت دینا شروع کی اور قبیلوں کو تحریک آزادی کا مدمقابل بنایا۔ ایک اور عنصر کو لاکر تحریک آزادی کے خلاف اور اتحاد وادیٔ نیل کا مقابل بنا کر کھڑا کیا جو عبدالرحمن المہدی کو اپنا لیڈر مانتے ہیں یہ عبدالرحمٰن المہدی اسی محمد احمد المہدی السوڈانی کا پوتا ہے جس نے ۱۸۸۲ء میں انگریزوں کے خلاف شدید بغاوت کی تھی۔ اور انگریزوں نے بڑی فوج کشی کر کے اس بغاوت کو دبایا اور سوڈان میں شدید کشت و خون کر کے مغلوب کر دیا تھا۔

سوڈان کے باشندوں کی تحریک آزادی اور اتحاد وادیٔ نیل کی کوشش برطانوی ریشہ دوانیوں کے باوجود جاری تھی۔ ۱۹۳۶ء کے صلح نامے سے بہت بڑی ناامیدی ہوئی۔ تحریک آزادیٔ وطن کے لئے سوڈان میں مختلف پارٹیاں ہیں، کچھ پارٹیوں کو گورنمنٹ کی امداد حاصل ہے کہ وہ آزادی کا نام لیتے رہیں اور برطانوی حکومت کو کسی نہ کسی طرح کسی مدت کے لئے باقی رکھنے کی کوشش کریں۔

یونینیسٹ پارٹی۔ ۱۹۴۴ء میں اس پارٹی نے سوڈان میں آزاد جمہوری حکومت کا قیام اپنا نصب العین قرار دیا۔ مصر کے ساتھ تعلق کی

نسبت ان کو یہ اصول تسلیم ہے کہ مختلف صوبوں کو برابر حقوق اور اختیارات حاصل ہوں - وہ عملی حکومت' کنڈومینیم کا اختتام بھی ان کا مقصد ہے - آزاد سوڈانی حکومت کو جدید معاہدے یا صلح ناموں کی آزادی ہوگی - اس پارٹی میں تعلیم یافتہ طبقہ ہے - اس طبقے کے نمایندہ ہے -

اَشقّاء پارٹی - یہ پارٹی سب سے زیادہ با اثر اور مقتدر سیاسی جماعت ہے - اس کو ۸۰ فیصدی سوڈان کے باشندوں کی نیابت کی قوت حاصل ہے - اس نام کے معنی ہیں ایک خون اور نسل کے بھائی - ان کا مطمح نظر اور مقصد مصر کے اتحاد کے ساتھ مصری حکومت کے تحت آزاد جمہوری سوڈانی حکومت کا ہے - سوڈانیوں کو مصر میں برابر کے حقوق حاصل ہوں - اور سوڈان مصر کی فوجوں کے ساتھ اپنی فوجیں رکھے -

اتحاد وادیٔ نیل پارٹی - یہ پارٹی ۱۹۴۶ء میں قائم ہوئی - وادیٔ نیل کے مکمّل اتحاد کی حامی ہے - ان کا مقصد یہ ہے کہ سوڈان میں متحدہ حکومت قائم ہو جس میں سوڈانیوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں اور یہ آزادی اور اتحاد پُرامن طریقے سے یا جس طرح بھی ممکن ہوں حاصل کیا جائے -

لبرل یونینیسٹ پارٹی - یہ یونینیسٹ پارٹی کی ایک شاخ ہے - ان کی کوشش مصر اور سوڈان کے اتحاد اور سوڈان کی آزادی کے لئے ہے -

ان سب پارٹیوں کا مقصد مصر سے اتحاد ہے - کیونکہ یہ اتحاد قومی' نسلی' لسانی' مذہبی' جغرافیائی - معاشی اور تمدنی یگانگی کی وجہ سے لازمی ہے - یہ اتحاد ہمیشہ سے رہا - صرف برطانیہ کے اس تغلّب کے زمانے میں اس میں بیگانگی اور تفرقہ ڈالنے کی زبردستی اور ناکام کوشش ہوتی رہی - اس اتحاد پر مصر اور سوڈان دونوں کی حکومتوں کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے - وادیٔ نیل کے دونوں شمالی اور جنوبی حصے مصر اور سوڈان ایک ملک کے اجزائے لاینفک ہیں -

سوڈان کی ان سیاسی جماعتوں کا متفقہ مقصد سوڈان کی آزادی اور مصر سے اتحاد ہے - ان کی قوت اور اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے پہلی اسمبلی کے انتخاب کی ترکیب کو ناکافی سمجھ کر انتخاب کا بائیکاٹ تجویز کیا وہ تحریک کامیاب ہوئی - نتیجہ سوڈان کی برطانوی حکومت کے لئے مایوس کن ہوا - رائے عامہ نے یہ واضح طور پر ثابت کر دیا کہ اسمبلی میں عوام کے نمایندے نہیں ہیں -

اُمّہ پارٹی - برطانوی گورنمنٹ جس طرح ہندوستان میں راجاؤں' نوابوں' زمینداروں اور خوشامدی لوگوں کو اپنے ساتھ رکھتی تھی - عہدے دیتی تھی - ان کا اثر قائم کرتی تھی اور ان کے اثر سے حکومت کے کام نکالتی تھی - اسی طرح سوڈان کے جاگیرداروں - امرا اور قبائل کے سرداروں کو سوڈان کی برطانوی گورنمنٹ ساتھ رکھتی ہے - انہیں میں سے قابل اعتماد اور پکے وفاداروں کو عہدے دیتی ہے - اس قسم کے لوگوں کو جمع کر کے سوڈان کی عوامی آزاد خیال اور ترقی پسند جماعتوں کی مخالفت اور مقابلے کے لئے یہ پارٹی بنوائی - سر عبدالرحمٰن المہدی اس کے لیڈر ہیں -

سر عبدالرحمٰن المہدی - برطانیہ کے نائٹ ہیں - پوتا تو اُس دادا کا ہے جس نے انگریزوں سے لڑائی لڑی تھی - لیکن یہ غرض مند اور خوشامدی ہے سوڈانی اور مصری ان کو ٹوڈی اور کوئسز لنگ سمجھتے ہیں - سوڈانی گورنمنٹ نے اسی پارٹی کے لوگوں کو اسمبلی میں منتخب کیا - اس پارٹی کا مقصد اصلی گورنمنٹ کے ہر فعل کو سراہنا' اس کی امداد کرنا اور ملک کی آزاد خیال اور عوام کی نمایندہ جماعتوں کی مخالفت کرنا ہے - لیکن اس سلسلے میں ملک اور اصلاحات کا نام لینا بھی ضروری ہے - اس لئے یہ مقصد بتاتے ہیں کہ سوڈان میں اصلاحات ہونی چاہئیں لیکن کچھ مدّت برطانیہ کی سرپرستی اور نگرانی میں رہنا ہی ضروری ہے - اور مصر کے ساتھ اتحاد کی مخالفت ہے - ان باتوں اور برطانیہ کی وفاداری کی ترغیب دیتے اور اشاعت کرتے ہیں -

مصر اور سوڈان کے مطالبات کو ماننے کے عوض برطانیہ کی فوجیں مسلسل مصر اور سویز کے علاقے میں جمع ہو رہی ہیں - کشت و خون برابر جاری ہے - سیکیورٹی کونسل' یو - این - او - وغیرہ سب خاموشی سے تماشا دیکھ رہے ہیں - مصریوں کا اشتعال قابو سے باہر ہو رہا ہے اور یہ مسئلہ امن کے مبلغوں اور اجارہ داروں کی توجّہ کا مستحق ہے -

رفتارِ زمانہ

جداگانہ نمائندگی کا قانون

یونین آف ساؤتھ افریقہ کی سپریم کورٹ نے ملان گورنمنٹ کے اس فیصلے کو ناجائز قرار دے دیا ہے کہ رنگدار لوگوں کے لئے الگ انتخابی فہرستیں تیار کی جائیں یہ فیصلہ کورٹ کے پانچ ججوں نے متفقہ طور پر کیا ہے۔ اور اس سے ڈاکٹر ملان کی نسلی امتیاز کی پالیسی پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ اس فیصلے کے پیشِ نظر اپوزیشن پارٹی کے لیڈر مسٹر سٹراس نے ملان گورنمنٹ سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کیا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ جداگانہ انتخاب اور جداگانہ نمائندگی کا قانون ایک غیر اخلاقی قانون ہے اور غیر یورپینوں کے ساتھ لیڈروں کی طرف سے کئے ہوئے تمام وعدوں کے منافی ہے۔

اس سلسلے میں انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ملان گورنمنٹ کو انتباہ کیا ہے۔ کہ اس کی انسانی حقوق کو نظر انداز کرنے کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک وسیع پیمانے پر تصادم شروع ہو جائے گا۔

شیر کشمیر کی تقریر

ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے جموں میں ایک تقریر کرتے ہوئے بعض اشخاص کے اس خیال کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی۔ کہ جموں کو کشمیر سے علیحدہ کر دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کے یہ دونوں علاقے ایک ساتھ مل کر ترقی کی راہ میں آگے بڑھیں گے اور جو لوگ ان کی علیحدگی کا خیال کرتے ہیں وہ ریاست کے ساتھ غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

مسئلۂ کشمیر

ڈاکٹر گراہم بھارت اور پاکستان میں مسئلۂ کشمیر پر سمجھوتہ کرانے کے لئے اپنی کوششوں میں بدستور مصروف ہیں۔ دہلی میں انھوں نے شری نہرو اور سرکردہ سرکاری افسروں سے اس سلسلے میں بات چیت کی۔ اور اب کراچی میں پاکستانی وزراء سے گفت و شنید کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مشن کی کامیابی کے متعلق پر اُمید ہیں اور انھیں توقع ہے کہ بہت جلد دونوں ممالک میں باعزت طور پر سمجھوتہ ہو جائے گا۔

راشٹرپتی کا چناؤ

بھارت کے راشٹرپتی کی طرف سے جاری کی گئی ایک ہدایت کے مطابق اب جموں اور کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے منتخب شدہ ممبر اور پارلیمنٹ میں ریاست جموں و کشمیر کے ممبر بھی راشٹرپتی کے چناؤ میں حصہ لے سکیں گے۔

سر آرچیبالڈ نائی کا الوداعی بیان

ہند میں برطانیہ کے ہائی کمشنر سر آرچیبالڈ نائی نے بھارت سے وداع ہونے سے پیشتر ایک بیان میں کہا۔ کہ برطانیہ اور بھارت میں اتنے زیادہ دوستانہ تعلقات کبھی نہیں تھے جتنے کہ اب ہیں۔ سر آرچیبالڈ کینیڈا میں برطانیہ کے ہائی کمشنر مقرر ہوئے ہیں اور آزادی ملنے کے بعد سے بھارت میں برطانیہ کے ہائی کمشنر رہے ہیں۔

مہاجرین کے مستقل حقوق

پاکستان کے وزیرِ مہاجرین ڈاکٹر قریشی نے پاکستان پارلیمنٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ جن مہاجرین کے دعووں کی جانچ ہو گئی ہے اور جو درست مان لئے گئے ہیں اُن کے مستقل حقوق کو فی الحال تسلیم کر لیا جائے گا۔

انگلینڈ جانے والی ہندوستانی کرکٹ ٹیم

سالِ رواں کے موسم گرما میں ہندوستان کی جو کرکٹ ٹیم انگلینڈ جا رہی ہے۔ مرکزی کرکٹ بورڈ نے اُس کے ممبروں کے ناموں کا اعلان کر دیا ہے۔ اُن میں وی ایس ہزارے کپتان، ایچ آر ادھیکاری (نائب کپتان) جی ڈی پھڈکر، پی آر اُمریگر، پی سین، سی ڈی گوپی ناتھ، پی۔ وائے۔ این چودھری جی ایس رامچند، ایچ جی گائیکواڑ، این کے منتری، ایس جی شندے، سی ڈی سروٹے۔ رمیش دویچا۔ وی ایل مانجریکر۔ غلام احمد اور ڈی کے گائیکواڑ شامل ہیں۔

مصری وزراء کی نظربندی

مصر کے وزیراعظم ہلالی پاشا نے دو وزیروں کو جو وفد پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اپنے اپنے گھروں میں نظربند کر دیا ہے۔ بائیں بازو کے ایک اخبار کا کہنا ہے کہ وفد پارٹی کے اکثر ممبروں نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے۔ اب وہ ہلالی پاشا کے لئے ہند کے اصول پر چلنے کو تیار ہیں۔

مصر کی وزارتِ خارجہ کے ایک ترجمان نے بتایا کہ مصر نے نہر سویز کو بین الاقوامی تحویل میں دینے کی تجویز کو رد کر دیا ہے۔ یہ تجویز ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کی جہازی کمپنیوں کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔

انڈو پاکستان مشاعرہ

پچھلے دنوں دہلی میں ایک عظیم الشان انڈو پاکستان مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت ایک روز ہز ایکسیلنسی مسٹر آصف علی گورنر اڑیسہ نے اور دوسرے روز مسٹر شنکر پرشاد چیف کمشنر دہلی سٹیٹ نے کی۔ پاکستان سے ابوالاثر حفیظ، مولانا عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور سید محمد جعفری اس مشاعرے میں شریک ہوئے۔ ہندوستان کی طرف سے دہلی اور دہلی سے باہر کے نامور شعراء نے شرکت کی۔ اکثر غیر ملکی سفیر اور ہندوستان کے والیانِ ریاست بھی مشاعرے میں تشریف لائے۔

بھارت سرکار کی نئی ٹکسال

بھارت سرکار کے وزیر اقتصادیات شری دیش مکھ نے کلکتے کے نزدیک علی پور میں بھارت سرکار کی نئی ٹکسال کی رسم افتتاح ادا کرتے ہوئے کہا کہ ملک اقتصادی ترقی کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اس لئے ایک مضبوط ہوتی ہوئی اقتصادی پوزیشن کے تبدیل شدہ ڈھانچے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک نئی اور جدید قسم کی ٹکسال سے بڑھ کر دوسری کوئی چیز زیادہ کارآمد اور مفید نہیں ہو سکتی۔ یہ ٹکسال ۲۷ ایکڑ زمین پر بنی ہے۔ اور یہ آٹھ گھنٹوں کی ایک شفٹ میں ۱۲ لاکھ سکے ڈھال سکتی ہے۔

چینی پر کنٹرول

بھارت کے وزیر خوراک شری کے۔ ایم۔ منشی نے بمبئی میں ایک بیان دیتے ہوئے اس امر کا ایک بار پھر اعادہ کیا کہ چینی پر سے کنٹرول نہیں ہٹے گا۔ اور بازار میں چینی کے سستے ہونے سے گورنمنٹ کی کنٹرول پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

اُجڑے مسلمانوں کو پھر بسانے کا فیصلہ

اُتر پردیش کی ودھان سبھا میں وزیر تعلیم شری "سمپورنانند" نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ صوبے سے جو مسلمان مغربی پاکستان چلے گئے تھے اُن میں سے ۲۰۰۷۹ اشخاص کو مستقل طور پر پھر اپنے علاقوں میں بسا دینے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔

بھارت اور مغربی جرمنی میں نیا تجارتی سمجھوتہ

بھارت اور مغربی جرمنی میں ایک نیا تجارتی سمجھوتہ طے پایا ہے۔ یہ سمجھوتہ ایک سال کے لئے رہے گا۔ اس کی رُو سے بھارت جرمنی سے مشینری اور ٹیکنیکل سامان منگوائے گا جس کے بدلے میں جرمنی بھارت سے خام فیبا، تمباکو، کھالیں، جوتے اور سینگ خریدے گا۔

عرب لیگ کی ساتویں سال گرہ

عرب لیگ کی پیدائش کی ساتویں سالگرہ پر ایک پریس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے عرب لیگ کے سکرٹری جنرل عزام پاشا نے آزادی کی جنگ لڑنے والے وسط مشرق اور شمالی افریقہ کے ممالک کی حمایت کرنے کے سلسلے میں بھارت کو خراج تحسین ادا کیا۔ آپ نے کہا کہ بھارت نے مظلوم قوموں کی حمایت کرنے کا جو بیڑہ اُٹھایا ہے اس سے اس کا وقار بہت بلند ہو گیا ہے۔ کراچی میں اسلامی ممالک کی کانفرنس کے سلسلے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے عزام پاشا نے کہا کہ ابھی یہ باتیں ہی باتیں ہیں اور میں اس پر اظہار خیال کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جہاں تک عرب لیگ کا تعلق ہے یہ کوئی مذہبی جماعت نہیں ہے۔ اسے تو جغرافیائی اور تمدنی یگانگت کی بنا پر قائم کیا گیا ہے۔

کانگریس کے اجلاس کی ایک قرارداد

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک قرارداد کے ذریعے ٹیونس کے عوام کے ساتھ اُن کی آزادی کی جد و جہد کے سلسلے میں ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ قرارداد میں اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک نے ٹیونس کی آزادی کے کاز کی حمایت کی ہے۔

لنکا کے پردھان منتری کا انتقال

لنکا کے پردھان منتری شری سینانائکے ۲۲ مارچ کو رحلت فرما گئے۔ گھوڑے سے گرنے پر سخت چوٹ آئی۔ بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا لیکن جانبر نہ ہو سکے۔

صحت کے لئے موزوں
غذا کھائیے
ہر ایک قسم کے کھانے میں جُدے جُدے غذائی اجزا ہوتے ہیں اسلئے ہمیں جدی جدی قسم کا کھانا کھانا چاہیئے تاکہ پانچوں غذائی اجزا ہمیں مہیا ہوں، کیونکہ یہ ہماری صحت اور طاقت کیلئے بہت ضروری ہیں۔ اسی کو موزوں غذا کہتے ہیں۔ اسلئے موزوں غذا وہ ہے جسمیں (۱) وٹامن، (۲) پروٹین، (۳) معدنیات، (۴) کاربو ہائیڈریٹ اور (۵) چکنائی شامل ہو۔ یہ پانچوں ہمارے لئے ضروری ہیں۔ چکنائیاں ہمیں دیرپا قوت مہیا کرتی ہیں اور استعمال میں سب سے زیادہ آسان اور صحت بخش چکنائیوں میں سے ڈالڈا ایک ہے۔ ڈالڈا ہر قسم کے کھانے پکانے کیلئے موزوں ہے اور مہر بند ڈبوں میں آپ اسے ہمیشہ صاف اور تازہ پائینگے۔ موزوں غذا پر مکمل اور مفید صلاح مفت حاصل کرنے کیلئے آج ہی۔ یا کبھی بھی لکھیے۔
دی ڈالڈا ایڈوایزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱
وٹامن
پروٹین
معدنیات
کاربوہائیڈریٹ
چکنائی
DALDA
قوت کیلئے ڈالڈا
سے کھانا پکائیے
HVM. 175-50UD

Regd. No. E P - 689

بچوں کا آج کل

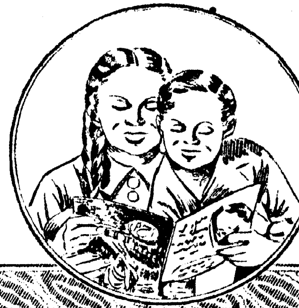

سکینہ عباس

میرا دیش اور میری گُڑیا

میری پیاری پیاری گڑیا　　میری راج دُلاری گڑیا
ببّا' امّی' بجیا' اچیا　　سب کی لاڈو میری گڑیا
قومی گانے گانے والی　　میٹھے گیت سُنانے والی
کیسی صُورت والی ہے یہ　　کوئل جیسی کالی ہے یہ
باتیں خُوب بناتی ہے یہ　　سب کو خُوب ہنساتی ہے یہ
ہنستی ہوں تو ہنس لیتی ہے　　روتی ہوں تو رو دیتی ہے
بے بی لوسی نام ہے اِس کا　　چوکلٹ کھانا کام ہے اِس کا

چاند کے اندر چاند کی بُڑھیا
میرا دیش اور میری گُڑیا

سید ابن سعید علی

ہیروں کا بادشاہ

بہت زمانہ گزرا یونان اور مصر کی سرزمین پر لوگ بڑے بڑے جتھے بنا کر تجارت کو جایا کرتے تھے۔ وہیں ایک لڑکا سہیل رہا کرتا تھا جو بڑا عقلمند تھا۔ ایک دفعہ کچھ لوگ تجارت کو جہاز پر روانہ ہوئے تو سہیل کے ماں باپ نے اس کو کچھ روپیہ دے کر ان لوگوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔

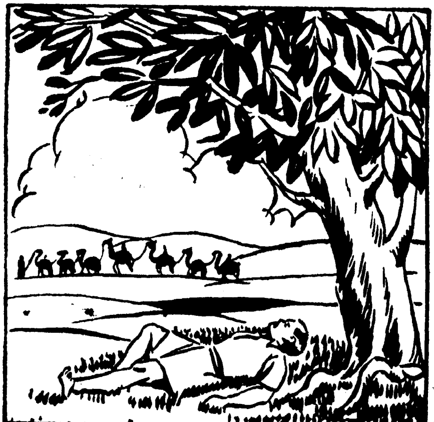

سفر کو کئی دن گزر چکے تھے۔ اور لوگوں کو زمین کا پتہ بھی نہ ملتا تھا۔ خدا خدا کر کے لوگوں کو ساحل نظر آیا اور ان لوگوں نے وہاں لنگر ڈال دیئے دوپہر کا وقت تھا لوگ بہت تھکے ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے دو دن دو راتیں جاگ کر کاٹی تھیں۔ سب نے کھانا کھایا اور ہر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ سہیل بھی ایک درخت کے نیچے سو گیا۔ وہ مسلسل ایک دن اور ایک رات سوتا رہا۔ صبح کے وقت جب اس کی آنکھ کھلی تو سب جا چکے تھے اور وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اُس نے راستے کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنا شروع کر دیا۔ ایک طرف اس کو ایک پہاڑی نظر آئی اور وہ راستے کی تلاش میں برابر چلتا رہا۔ شام کے وقت اس نے پھل کھائے اور چشمے کا پانی پی کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ گہری نیند سو گیا تھا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں اور وہ ایک غار میں پڑا ہوا ہے۔ اس غار میں کئی جگہ شگاف تھے اور بڑے بڑے سانپ اپنے مُنہ نکالے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے آس پاس بڑے بڑے ہیرے پڑے ہوئے ہیں جن کی روشنی سے چاند بھی شرما جائے سہیل نے اُٹھ کر راستہ تلاش کرنا شروع کیا۔ لیکن اسے کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ غرض کہ وہ اس پریشانی میں اِدھر اُدھر پھر رہا تھا کہ اس کے ایک طرف سے کھڑ کھڑ کی آواز آئی اس نے اس طرف جو نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے پہاڑ پر سے لڑھک رہے ہیں۔

یکایک اس کے دماغ میں وہ کہانی آ گئی جو اس کی دادی نے کہی تھی کہ نیوگنی کے غاروں میں جب لوگ ہیرے اور جواہر لینے جاتے ہیں تو پہاڑ کے اندر گوشت کے ٹکڑے ڈالتے ہیں۔ وہاں کے جنگلوں میں ایک بڑا پرندہ رہتا ہے جس کو عقاب بولتے ہیں۔ ہر شخص

ایک ایک گھونسلا ہے بیٹھا ہے۔ اس گوشت میں ہیرے چپک جاتے ہیں اور یہ پرند شام کے وقت غار میں جاتے ہیں اور ان ٹکڑوں کو اُٹھا کر لاتے ہیں تو ان میں ہیرے چپکے ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ پرند گوشت کا ٹکڑا چھوڑ دیتا ہے اور یہ لوگ ہیرا لے لیتے ہیں۔

غرض کہ سہیل نے فوراً اُٹھ کر اپنی قمیص کے دامن میں بڑے بڑے ہیرے بھر لئے۔ اور ان گوشت کے ٹکڑوں کو اپنے سر پر باندھ لیا۔ اور ایک سکون کے عالم میں وہ لیٹ گیا۔ یکایک غار میں اندھیرا چھا گیا اور ایک پرند نے جھپٹا مارا اور سہیل کو اُٹھا کر اوپر لے آیا۔ جیوں ہی وہ اپنے گھونسلے میں پہنچا لوگوں نے شور مچانا شروع کیا اور وہ سہیل کو چھوڑ کر چلا گیا۔

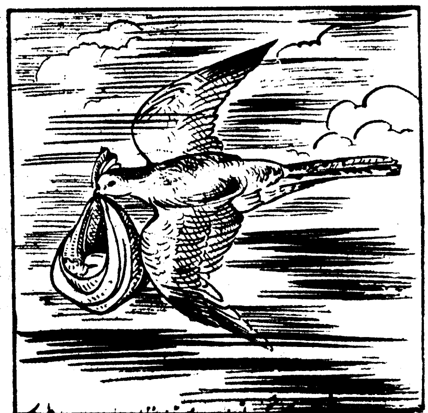

سہیل جس شخص کے گھونسلے میں پہنچا تھا وہ اس سے ڈر کر بھاگ گیا لیکن اس نے ان سب کو بُلا کر پوری کہانی سنائی اور ہر شخص کو ایک ایک ہیرا دیا جو اتنا قیمتی تھا کہ کوئی شخص اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتا تھا۔ سہیل نے اپنے شہر میں پہنچ کر ایک بڑا محل طیار کروایا اور غریبوں کو خوب خیرات بانٹی اس طرح سہیل ہیروں کا بادشاہ کہلایا۔

قہقہے

اُستاد - لڑکو! کس مہینے کے ۲۸ دن ہوتے ہیں ؟

لڑکا - (کچھ سوچ کر) جناب ۲۸ دن تو سب کے ہوتے ہیں - اور اکثر اوقات زیادہ بھی -

---

ماسٹر جی - اس فقرے کو درست کرو "میری دوات خود مجھ سے ٹوٹی ہے"

لڑکا - میری دوات بالکل سالم ہے -

موہن - کیا آپ کے لڑکے کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے ؟

کریم - جی نہیں -

موہن - کیا وہ اپنے دوستوں کی چغلی کھاتا ہے ؟

کریم - جی نہیں -

موہن - کیا وہ آوارہ گرد ہے ؟

کریم - جی نہیں -

موہن - شراب تو نہیں پیتا ؟

کریم - جی نہیں -

موہن - سگریٹ ؟

کریم - نہیں

موہن - پرماتما اُس کی عمر دراز کرے - کتنی عُمر ہے اُس کی ؟

کریم - خیر سے ڈیڑھ سال کا ہے -

بیٹا - ابّا جان! آپ کے کمرے میں کالی بلّی ہے -

باپ - کوئی بات نہیں بیٹا - کالی بلّیاں خوش قسمت ہوتی ہیں -

بیٹا - واقعی ابّا جان! وہ آپ کا کھانا کھا گئی ہے

وسیم

وہ کون تھا؟

جاڑوں کی ایک رات تھی - بچوں کو یوں بھی جلد نیند آجاتی ہے مگر نہ جانے کیوں کلوا کو آج نیند نہیں آرہی تھی اور وہ پلنگ پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا کہ باہر گاؤں کے کنارے بوڑھے نیم کے درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے اور شاید کوئی فقیر کچھ پکا رہا ہے - کلوا تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر لحاف پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور دوڑتا ہوا فقیر کے پاس پہنچا -

"بابا! یہ جگہ بہت خطرناک ہے - آپ یہاں نہ رہیں یہاں ایک کالا اژدہا رہتا ہے جو سب کو کاٹ کھاتا ہے - اور اس کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں - آدمی تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے" کلوا ہانپتے ہوئے بولا -

"مگر وہ سانپ مجھے کیوں کاٹے گا میں نے تو اس کا کچھ بگاڑا نہیں" - سادھو نے روٹی سینکتے ہوئے کہا - وہ اژدہا کے نام سے بالکل نہیں ڈرا - "ہمارے گاؤں والے بھی تو اس کا کچھ نہیں بگاڑتے مگر یہ ان کو کاٹ لیتا ہے - خیر میرا کام آپ کو سمجھانا تھا میں نے سمجھا دیا - اب آپ جانیں اور آپ کا کام" یہ کہہ کر لڑکا جانے لگا - فقیر نے کہا "سنو بیٹا! خفا نہ ہو تم نے بہت بڑے ثواب کا کام کیا ہے - بھگوان اس کا بدلہ دے گا - میں فقیر ہوں تیری کیا خاطر کر سکتا ہوں - روٹی کھاؤ گے"؟

جب کلوا نے کہا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں تو فقیر بولا "بچوں کو کھانے کے علاوہ کھیل اور کہانیوں کا شوق ہوتا ہے - اگر تو نہ ڈرے تو سانپ کی ایک کہانی تجھ سے کہوں"؟ کلوا مسکرایا اور آگ کے پاس کہانی سننے کے شوق میں بیٹھ گیا -

"کسی زمانے میں ایک سادھو رہا کرتا تھا جو میری ہی طرح دنیا کا چکر لگایا کرتا تھا - ایک رات وہ ایک درخت کے نیچے ڈیرہ ڈالے روٹی بنا رہا تھا کہ درخت پر سے ایک کالا سا سانپ اترا اور اس کی طرف جھپٹا - فقیر نے بہت زور سے اس سانپ کو ڈانٹا - سانپ غصہ میں چُور اپنے پھن پر کھڑا ہو گیا مگر آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی - سادھو بولا "تو انسان کا دشمن ہے دیکھ پاپ کرتے کرتے تیرا تمام بدن کالا ہو گیا ہے پھر بھی تجھ کو اپنے گناہوں کا احساس نہیں" - سانپ نے جواب دیا "تم جس شکل میں مجھے آج دیکھ رہے ہو وہ شکل ہمیشہ نہ تھی - میں بھی

کبھی تمہاری ہی طرح ایک انسان تھا۔ مگر جنگلوں میں مارا مارا پھرنے والا فقیر نہیں بلکہ محلوں میں رہنے والا بادشاہ۔ آج قسمت نے مجھے وحشت پر سونے اور انسان کا خون چوسنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دن شکار میں ایک دیہاتی مجھ سے بدتمیزی کے ساتھ پیش آیا۔ میں نے نوکروں کو حکم دیا کہ اسے پکڑ لیں اور اسے پھانسی کی سزا دی جائے۔ مگر اس سے پہلے کہ نوکر اسے پکڑتے۔ اس شخص نے کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونک دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے میں غائب ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک جھاڑی میں پایا۔ اور میں ایک سانپ بن گیا۔ میرے نوکر پریشان

ہو کر مجھے ڈھونڈنے لگے۔ میں جھاڑی سے نکلا کہ انہیں بتاؤں کہ مجھے اس شخص نے سانپ بنا دیا ہے کہ ایک نوکر تلوار لے کر مجھے مارنے بڑھا۔ میں جان بچانے کے لیے دم دبا کر جھاڑی میں گھس گیا۔ میرے نوکر روتے پیٹتے واپس چلے گئے اور اب میں اپنا غصّہ آدمیوں پر اتارتا ہوں"۔ سادھو نے جواب دیا کہ تم بے گناہ آدمیوں سے کیوں بدلہ لیتے ہو۔ یہ بہت بڑا پاپ ہے۔ اگر تم بدقسمتی سے سانپ ہو ہی گئے تو پاپ کرنے سے کیا فائدہ؟ اپنی عادت چھوڑ دو"۔ اس کا جواب سانپ نے یوں دیا کہ میں اپنی عادت چھوڑ تو سکتا ہوں مگر بدنام کی کون قدر کرتا ہے۔ لوگ مجھے لاٹھی اور تلوار سے مار ڈالیں گے"۔ سادھو نے کہا کہ اگر اس گاؤں میں نہیں رہنا چاہتا تو کسی دوسرے گاؤں میں چل۔ وہیں رہا کر اور کسی کو تکلیف نہ پہنچا"۔ غرض دوسرے دن سادھو اور سانپ اس گاؤں سے نکل کر چلے گئے اور سادھو نے سانپ کو دوسرے گاؤں میں چھوڑ دیا"۔

"تجھے شاید نیند آ رہی ہے تو جماہی لے رہا ہے" فقیر نے کہانی کا ایک حصّہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ لڑکے نے کہا "نہیں نہیں کہئے کہانی بہت دلچسپ ہے"۔

"سانپ اس نئے گاؤں میں زندگی گزارنے لگا۔ گاؤں والے پہلے تو اس سے ڈرے اور سانپ نے ڈنڈے بھی کھائے مگر لوگوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ سانپ کاٹتا نہیں۔ اور اس طرح بڑوں نے اس کی طرف دھیان دینا چھوڑ دیا۔ مگر وہ بچّوں کی تفریح کا مرکز ہو گیا۔ کبھی کوئی اسے گلے میں لئے پھرتا اور کوئی کنکروں سے مارتا۔ اور کبھی کوئی لڑکا اس کو فضا میں پھینکتا اور جب سانپ زمین پر گر کر چیختا تو لڑکے تالیاں بجاتے اور شور مچاتے۔ ایک دن چاندنی رات تھی۔ تمام بچے سڑک پر جمع ہوئے۔ اور سڑک پر سے گزرنے والوں کو سانپ سے ڈراتے اور ہنستے اور جب کھیلتے کھیلتے تھک گئے تو انہوں نے سانپ کو دو تین بار آسمان میں پھینکا اور جب سانپ بالکل مرنے کے قریب ہو گیا تو اسے لڑکوں نے سڑک پر لٹا دیا کہ یا تو کسی سواری سے کچل جائے یا کوئی انجان راہی اس کا کام تمام کر دے۔ دوسرے دن علی الصباح ایک راہی ادھر سے گزرا تو اس نے سانپ کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ نہ جانے کیوں اسے سانپ پر ترس آیا اور اس نے سانپ کو ہاتھ سے اٹھا لیا۔ اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب

اس کو سانپ کاٹنے کی بجائے مُنہ کھول کر زبان ہلا ہلا کر فریاد کرنے لگا۔
سانپ نے اپنی پوری رام کہانی اس راہی کو سُنائی - راہی کو سانپ کے حال پر اتنا ترس آیا کہ وہ اسے اپنے گھر لے گیا - اور زخموں کو دھو کر اس نے اس پر مرہم لگایا - یہاں تک کہ سانپ اچھا ہونے لگا - سانپ کی مرہم پٹی وہ خفیہ طور پر کرتا یہاں تک کہ اس نے اپنی بیوی کو بھی کچھ نہیں بتایا کیونکہ وہ مذاق اُڑاتی کہ انسان سانپ کو پال رہا ہے - جب سانپ اچھا ہو گیا تو راہی نے اسے ایک جنگل میں چھوڑ دیا مگر نصیحت کی کہ اگر تم کسی کو دُکھ نہ پہنچانے والی عادت پر برقرار رہو گے تو بہت جلد ہی تمہارا کام تمام ہو جائے گا - یہ ٹھیک ہے کہ پاپ کرنا بُرا ہے مگر اس طرح تمہارا بچنا ناممکن ہو جائے گا اگر میری مانو تو ایک بات کہوں جب کوئی تمہارے پاس آئے تو اس کو اپنے پھن سے ڈرا دو - اس طرح تم زندہ بھی رہ سکو گے اور پاپ سے بھی بچو گے" - یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا - اور سانپ ایک نئی طرح سے زندگی گزارنے لگا"۔

"تم کو اب واقعی نیند آ رہی ہے - مگر اب کہانی تھوڑی سی رہ گئی ہے سُن لو" سادھو نے کہا - اب وہ تمام روٹیاں پکا چکا تھا مگر اس نے کہا کہ پوری کہانی ختم کرنے کے بعد روٹی کھائے گا "ہاں! تو وہ سانپ گاؤں میں کنوئیں کے پاس جھاڑیوں میں رہنے لگا - گاؤں کی عورتیں جب پانی بھرنے جاتیں تو اس سانپ کو دیکھتیں مگر جتنی دیر میں وہ دوڑ کر مردوں کو بُلاتیں اُتنی دیر میں سانپ جھاڑیوں میں غائب ہو جاتا - گاؤں میں ایک نئی بہو آئی - ایک رات کنوئیں پر پانی بھرنے جانے لگی کہ ساس نے کہا کہ دیکھ کر جانا کنوئیں پر زہریلا سانپ رہتا ہے - کہیں کاٹ ہی نہ کھائے - بہو بچاری بہت سنبھلتی سنبھلاتی گئی - جیسے ہی اس نے جگت پر گھڑے رکھے گھڑے کے نیچے سے سانپ پھنکارتا ہوا نکلا - اصل میں گرمی سے بچنے کے لئے سانپ ٹھنڈے جگت میں بیٹھا ہوا تھا - سانپ کو دیکھ کر وہ عورت ڈری نہیں - اس نے سانپ کو دُم سے پکڑ کر اُٹھا لیا اور ہوا میں اس غریب کو نچانے لگی - سانپ گھبرایا کہ یہ کون بہادر عورت پیدا ہو گئی - اس نے چیخنا شروع کیا کہ خدا کے لئے مجھے زمین پر رکھو میں مر رہا ہوں - جب اس بہادر عورت نے سانپ کو زمین پر رکھ دیا تو سانپ نے حیران ہو کر پوچھا "تو کون عورت ہے جو مجھ سے ذرا بھی خوف زدہ

نہیں ہوتی - یوں تو انسان ہمیں دیکھتے ہی مار ڈالتا ہے اور ہم اس کو موقع پا کر کاٹنے کی فکر میں رہتے ہیں - مگر تو کون سی عورت ہے جو نہ مجھ سے ڈری ہی اور نہ مجھے مارنا چاہا" - عورت بولی کہ میں تیرا تمام راز جانتی ہوں - میں جانتی ہوں کہ تو نہیں کاٹ سکتا اور کیوں نہیں کاٹ سکتا - میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تو سانپ نہیں بلکہ ایک ظالم بادشاہ تھا جو رعایا پر ظلم کیا کرتا تھا - تجھے رعایا سے کوئی ہمدردی نہ تھی - تجھے صرف رعایا سے لگان وصول کر کے عیش کرنا آتا تھا - اگر قحط پڑ جاتا تو تو رعایا کے ساتھ ہمدردی اور مدد کے بجائے اُن کی جائدادیں ضبط کر لیا کرتا تھا - یہاں تک کہ رعایا تجھ سے

تنگ آگئی۔ اور ایک دن شنکار کو میں انسان کی شکل میں گئی اور غصّہ میں آکر تجھے سانپ بنا دیا۔ اور تو لوگوں کی جان لینے پر اور لوگ تیری جان لینے پر تُل گئے۔ پھر میں نے ایک سادھو کی شکل اختیار کر کے تجھ کو گناہ سے باز رہنے کو بتایا۔ پھر جب تیری شرافت سے فائدہ اُٹھا کر بچّوں نے تجھے مار کر سڑک پر ڈال دیا تھا تو میں نے ہی تیری مرہم پٹی کی۔ اور لوگوں کو پھن مار کر ڈرانا بتایا۔ اب تو شاید سیکھ گیا ہو۔ کہ نہ تو ظلم کرنے سے ہی فائدہ ہے اور نہ حد سے زیادہ شرافت سے بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک تیسرا راستہ نکال کر اس پر چلنے ہی میں بھلائی ہے۔ دل میں کسی کی برائی نہ سوچ اور نہ ہی کسی کی برائی کر مگر اپنا دبدبہ قائم رکھ۔ اگر تو چاہے تو پھر سے تجھ کو حکومت مل سکتی ہے۔ جا تیری رعایا تیرا انتظار کر رہی ہے۔ وہاں جا کر حکومت کی باگ ڈور سنبھال" یہ کہہ کر اس عورت نے کچھ پڑھا اور سانپ غائب ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے کو شاہی محل میں ایک بادشاہ کی شکل میں پایا۔ تمام سلطنت میں خوشیاں منائی گئیں

کیونکہ بادشاہ کے نہ رہنے سے سلطنت کا انتظام خراب ہو گیا تھا۔ اب بادشاہ پہلا بادشاہ نہ رہا۔ وہ رعایا کے ساتھ بھائیوں کی طرح پیش آتا۔ اور رعایا کو ہر ممکن سہولتیں دیتا۔ بعد میں بادشاہ نے اعلان کیا کہ جس بہو، راہی یا سادھو نے کسی سانپ کی سیوا کی ہو وہ دربار میں حاضر ہو۔ کیونکہ بادشاہ کا خیال تھا کہ اس بہو سے شادی کر لیتا۔ راہی کو وزیر اعظم بناتا اور سادھو کو سرکاری پروہت۔ مگر کسی نے یہ اقرار نہیں کیا کہ اس نے سانپ کی سیوا کی ہے۔ وہ شخص بادشاہ کو نہیں مل سکا مگر وہ ہمیشہ ہمارے درمیان گھوما کرتا ہے اور صحیح راستہ پر لگاتا ہے...."

"اچھا بابا! آپ اتنے دیس گھومے ہیں کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے"۔ کلو جو تمام کہانی سُن گیا مگر درمیان میں ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا بعد میں بول پڑا۔

"ہاں"! یہ کہتے ہی فقیر غائب ہو گیا۔ صرف آگ جلتی رہی۔ لڑکے کو بہت حیرت ہوئی۔ تھوڑی دیر تک وہ آگ سے کھیلتا اور سوچتا رہا کہ یک بیک وہ اُٹھا اور تیزی سے بھاگتا ہوا اپنے مکان میں گھس کر دروازے کی کُنڈی لگائی۔ اور جب لحاف میں چُھپ گیا تب کہیں جا کر اس کو اطمینان ہوا۔

خُوب رہی

مالک نے نوکر سے پوچھا "کیا تم نے اس شخص کو کہہ دیا ہے کہ میں گھر پر نہیں ہوں"؟

نوکر نے جواب دیا "جی ہاں میں نے کہہ تو دیا ہے کہ مالک گھر پر نہیں ہیں۔ لیکن وہ اتنا ضدی ہے کہ مانتا ہی نہیں۔

یہ سُن کر مالک نے کہا "یہ باتیں طریقے سے کہی جاتی ہیں۔ اچھا تو میں خود جا کر اُسے کہتا ہوں۔

جواب۔ اُس نے صرف ایک لیموں توڑا تھا۔

- भारतीय संस्कृति और प्रगति का प्रतीक
- हिन्दी का लोकप्रिय मासिक
- राष्ट्रभाषा का सफल माध्यम
- 'आजकल' को प्रथम कोटि के लेखकों का सहयोग प्राप्त है।

वार्षिक ६)
एक प्रति ॥)

PUBLICATIONS DIVISION
OLD SECRETARIAT, DELHI

READ THE STORY OF

FREE INDIA

ON THE MARCH

IN THE FOLLOWING PAMPHLETS

Already Issued

IN THIS SERIES

- *Projects for plenty*
- *Square deal for labour*
- *The railways go ahead*
- *On the home front*
- *How to vote*
- *More from mother earth*
- *Democracy on the march*
- *We stand for peace*
- *Since Independence*

From leading booksellers or direct from

PUBLICATIONS DIVISION
OLD SECRETARIAT, DELHI 8

बच्चों को योग्य और नागरिक बनाने के उद्देश्य से

बाल-भारती

में

ज्ञान-विज्ञान की सभी बातें बच्चों की भाषा में परोसी जाती हैं।

कम से कम चार कहानियां, ४० सुन्दर चित्र, चुटकुले, साधारण ज्ञान सम्बन्धी इस पत्रिका का वार्षिक मूल्य केवल ४ रुपये, और एक प्रति के छः आने हैं। हिन्दी में बालकों की सर्वोत्तम पत्रिका। इस पत्रिका का उद्देश्य केवल मनोरंजन न होकर मनोरंजन के द्वारा साहसी और बुद्धिमान नागरिक बनाना है -सब बुकस्टालों पर महीने की पहली तारीख को पहुंचती है, पर निश्चित रूप से पत्र मिले इसलिये ग्राहक बन जाना अच्छा है।

FROM LEADING BOOKSELLERS
OR DIRECT FROM
THE BUSINESS MANAGER

PUBLICATIONS DIVISION
OLD SECRETARIAT, DELHI

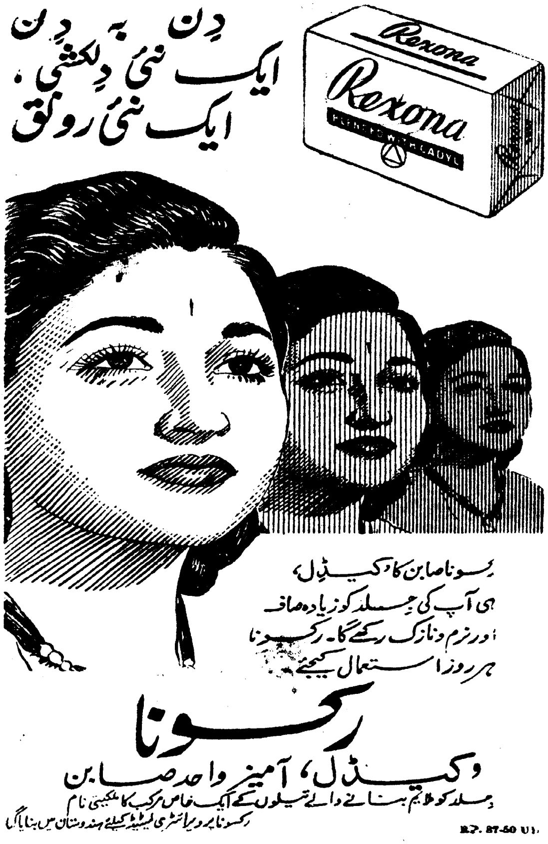

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D.--21

آٹھ آنے

"جلد کی خوبصورتی کے لئے
لکس ٹائلیٹ صابن
بہترین ہے"
نروپا رائے
کہتی ہے

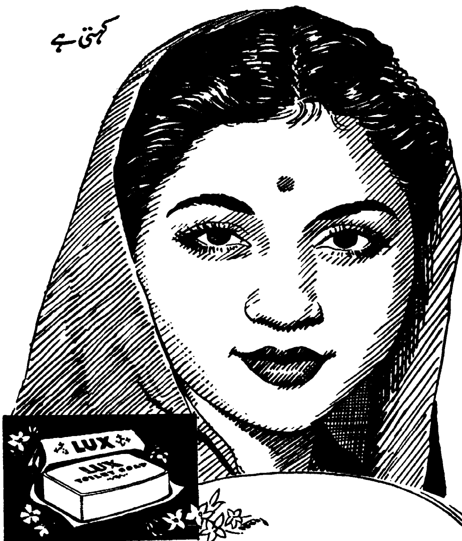

یہ سفید اور خالص صابن، جس کی
خوشبو دلکش ہے، آپ کی
جلد کو بھی دلکش بنائے گا!
فلمی ستاروں کا
حسن بخش صابن

LTS. 333-X30 UD

پہلا سبق
سمجھدار مائیں جانتی ہیں کہ ننھے بچوں
کی زندگی کا پہلا سبق انہیں نونہال پر
پرورش کرنا ہے۔
نونہال معدہ کی تمام خرابیوں کو
دور کرتا ہے۔ ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے۔ اور
دانت نکالنے میں مدد دیتا ہے۔
نونہال
ننھے بچوں کو مضبوط بنانے والا
ان کا دل پسند ٹانک
قیمت فی شیشی بارہ آنے (۱۲/)
نوٹ:۔ بچوں کی پرورش کیلئے کتابچہ "ہمدرد اطفال" مفت طلب فرمائیں۔
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی
a Hamdard Product

"روزانہ قوت کے لئے ہم
گھر پر ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا پکاتے ہیں"
DALDA
ڈالڈا موزوں غذا میں
آپ کے لئے ضروری قوت بخش
چکنائی مہیا کرتا ہے

NVM. 160-50 UD

ترتیب

فیضان	جوش ملیح آبادی	۴
آلِ احمد سرورؔ بہ حیثیت شاعر	سیّد احتشام حسین	۶
کشمیر سے خطاب	تلوک چند محروم	۱۱
اجنبی	ایران بانو	۱۲
مہدی علی خاں، ذکی، ملک الشعراء	ظفر حسین خاں	۱۷
تماشا گر سا	جوگندر پال	۲۳
لیونارڈو دا ونسی	راج مہتہ	۲۶
آج کل	افقر موہانی	۲۸
مصوّری اور اُس کی پرکھ	بیتاب بریلوی	۳۳
غزل	وفا کرمانی	۳۹
غزل	ساحر ہوشیارپوری	۴۰
غزل	غلام ربّانی تاباں	۴۰
وارث شاہ کا ایک کردار	اے حمید ناز جالندھری	۴۱
تصویر	کوثر چاندپوری	۴۵
غزل	رئیس امروہوی	۴۸
ذکر و فکر	محمد عبدالحفیظ، محمد منشاالرحمٰن خاں منشا، پورن سنگھ ہنر، بسلم الحریری، مظفر حیدری	۴۹
جنگجو ڈاکوؤں کی سرکوبی	——	۵۰
انڈونیشیا کی بدیشی تجارت	شری رام سرنا	۵۲
نئے مطبوعات	ج - ن - ا	۵۶
ہیراکڈ ڈیم	——	۵۸
رفتارِ زمانہ	——	۵۹

بچّوں کا آج کل

بچوں کا گیت	مضطر کگوڑوی	۶۱
کانچ کی آنکھیں	ایم، اے واحد	۶۲
پریم داس کا پریم	رادھا کرشن ہنڈو	۶۴
لوکمانیہ بال گنگادھر تلک	شو کمار	۶۵
گدھے کے کان	خوشباش	۶۷
دو مفت خورے	رام لبھایا سوتہ	۶۸

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ نمبر ۴

سالانہ چندہ:— ہندوستان میں - چھ روپے، پاکستان میں - چھ روپے
غیر ممالک سے:— نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ:— ہندوستان میں - آٹھ آنے، پاکستان میں - آٹھ آنے

نومبر ۱۹۵۲ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

جوش ملیح آبادی

فیضان

خوشا طالع کہ رازِ این و آں بخشا گیا ہم کو
مقامِ فقر میں نازِ شہاں بخشا گیا ہم کو

اجل کی حکمرانی ہے جہاں اُس کُنجِ ظلمت میں
نصیبِ خضر و آبِ جاوداں بخشا گیا ہم کو

جہاں شاہوں کو اِذنِ کفش برداری نہیں ملتا
وہاں تاج و نگیں، طبل و نشاں بخشا گیا ہم کو

جہاں قدسی بھی اک جامِ سفالیں کو ترستے ہیں
وہاں پیمانۂ ہفت آسماں بخشا گیا ہم کو

جہاں ہر پنکھڑی اک باغِ جنت ہے وہاں ساقی
سجا کر طشتِ زر میں گلستاں بخشا گیا ہم کو

کمان و تیر ڈھلتے ہیں جہاں اُس کارخانے میں
خمِ قوس و جمالِ کہکشاں بخشا گیا ہم کو

جمود و شیب کی پرچھائیں بھی جس پر نہیں پڑتی
وہ عزمِ زندہ و قلبِ جواں بخشا گیا ہم کو

عروسِ بادہ خود جس کا طواف اے دوست کرتی ہے
سبک رُوحی کا وہ رطلِ گراں بخشا گیا ہم کو

خوشا قسمت کہ اس خورشید کے دورِ سیاست میں
مہکتی کاکلوں کا سائباں بخشا گیا ہم کو

بہاراں کے جدید آئینِ جاں پرور کے ایماء سے
بجز برق پر وہ آشیاں بخشا گیا ہم کو

بفیضِ عشق اپنے دور کے ہم وہ برہمن ہیں
کہ نظمِ دیر و دامانِ بتاں بخشا گیا ہم کو

یہ کیسی خوش نصیبی ہے کہ ریگستانِ تقویٰ میں
شراب و شعر کا آبِ رواں بخشا گیا ہم کو

نقاب افگندہ ہیں رعنائیاں ذرات و انجم کی
تماشائے زمین و آسماں بخشا گیا ہم کو

بہشت و عرش خود مجرے کو آئے دل کے حجرے میں
نئی معراج، انوکھا ارمغاں بخشا گیا ہم کو

دماغِ کافری نے سینۂ ویراں کو یوں دیکھا
دلِ آسودۂ پیغمبراں بخشا گیا ہم کو

دیارِ عشق میں روشن ہوئیں جب عقل کی شمعیں
سرِ نجد افسرِ یونانیاں بخشا گیا ہم کو

حریمِ فکر میں یوں ڈوب کر بیٹھے کہ بالآخر
یقیں جس پر فدا ہو وہ گماں بخشا گیا ہم کو

جلوسِ شوق کے پیچھے چلے اور اتنی مدت تک
کہ اعزازِ امیرِ کارواں بخشا گیا ہم کو

رہے سرکارِ غم کے زیرِ فرماں اس عقیدت سے
کہ خوش نودی میں قلبِ شادماں بخشا گیا ہم کو

جوانی تج کے یوں کی خدمتِ اقطابِ مے خانہ
کہ آخر منصبِ پیرِ مغاں بخشا گیا ہم کو

بحمداللہ کہ جوش اس بدمذاقی کے زمانے میں
جمیلِ مظہری[1] سا قدرداں بخشا گیا ہم کو

[1] حضرت علامہ جمیل مظہری (پٹنہ)

سید احتشام حسین

آلِ احمد سرور — بہ حیثیت شاعر

اب سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے ابتدائی کلام کا مجموعہ "سلسبیل" شائع کرنے کے بعد آلِ احمد سرور پورے طور پر تنقیدی ادب کی جانب متوجہ ہوگئے اور کچھ دنوں تک ایک آدھ نظموں کے سوا انھوں نے نثر ہی کو اظہارِ خیال اور پختگیٔ شعور کا ذریعہ بنایا۔ اس لئے سلسبیل کے شاعر سرور اور موجودہ سرور کے درمیان ارتقائے شعور کی ایک طویل زنجیر نظر آتی ہے۔ سلسبیل کی شاعری کو ایک موجِ تاثر کہہ سکتے ہیں جس میں اونچی لہریں اور طوفان نہیں ہیں۔ لیکن تفکر اور رکھ رکھاؤ کے بعض اشارے جو بعد کی شاعری میں اہمیت اختیار کر گئے یہاں بھی نظر آجاتے ہیں۔ بیس بائیس سال کی عمر کی شاعری میں رنگینی، کیف اور تحیّر کے عناصر تو ہو سکتے ہیں، لیکن سنجیدگی، بلند خیالی، اور فنی پختگی کی محض جھلک ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ جھلک ہلکی سہی لیکن موجود تھی، اور شاید اسی سے مرعوب ہو کر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سرور کو "بالطبع ذرا توبۃ النصوح قسم کا" انسان کہا تھا۔ ایک طرح کا ضبط سرور کے یہاں ۱۹۳۳ء میں بھی تھا، جب وہ کشمیر کی وادیوں میں گلگشت کر رہے تھے اور آج بھی ہے جب وہ ادب کے پیچیدہ مسائل پر فلسفیانہ اور علمی حیثیت سے غور کر رہے ہیں۔ سلسبیل میں ایک شاعرانہ مزاج ملتا ہے۔ مشاہدہ کی صلاحیت نظر آتی ہے۔ تازگی کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ ان خصوصیات میں سے ہر ایک کا ارتقا بعد میں ہوا۔ خود سرور نے اپنے اس مجموعے کے متعلق اس کے دیباچے میں بعض دلچسپ اشارے کئے ہیں۔

جس درمیانی دور میں سرور تنقیدی مضامین لکھتے رہے وہ بھی اُن کے شاعرانہ مزاج کی تعمیر اور فنی شعور کے ارتقا کا دور تھا۔ اچھی تخلیق کے لئے اچھے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور سرور نے مطالعہ ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ مغربی ادبیات کے وسیع اور گہرے مطالعے نے انھیں اُردو شاعری کی روایات سے بدظن نہیں کیا۔ بلکہ اُن کے سمجھنے میں مدد دی۔ اس کا پتہ سلسبیل کے بعد کی شاعری کے سرسری مطالعہ سے بھی چل سکتا ہے۔ مختلف اسالیب اور نظریاتِ فن کے مطالعہ نے اُن کے اسلوب میں پختگی اور اندازِ بیان میں قادر الکلامی کی شان پیدا کر دی ہے۔ یہ بات محض عروض اور معانی و بیان کے مطالعہ سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ شعور کی وسعت اور گہرائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تنقید اور تخلیق ساتھ نہیں چل سکتیں۔ ایک اچھا نقاد اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔ اس کے نفسیاتی اسباب بھی بتائے جاتے ہیں۔ لیکن تقریباً ہر زبان میں ایسے ادیب اور شاعر ملتے ہیں جنھوں نے تنقیدی اور تخلیقی دونوں قسم کے ادبوں کے گیسو سنوارتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ حالات اور مقتضیات کی بنا پر ایک کے مقابلے میں دوسرے کی جانب زیادہ توجہ دی گئی ہو۔ اور بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہو کہ تنقید کی زلفوں کا اسیر شعر کی دیوی کا پجاری نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کوئی فیصلہ کن دلیل نہیں ہے۔ اردو ادب ہی کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں۔ گذشتہ پانچ چھ سال میں آل احمد سرور نے جو شعری سرمایہ پیش کیا ہے وہ اُن کی شاعرانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ یہاں تخلیقی کا مفہوم کسی قدر محدود کرنا ضروری ہوگا۔ کیونکہ سرور کے یہاں وہ بیانیہ شاعری نہیں ملتی جو تخیلی پیکر تراشتی اور واقعات کو ترتیب دیتی ہے بلکہ وہ خیال انگیز شاعری پائی جاتی ہے جو تخیل سے تفکر کا کام لیتی ہے۔ یہ بھی ایک نوع کی تخلیقی صلاحیت ہے جو طول و عرض میں سطح پر دور تک پھیلنے کے بجائے اوپر بلندی کی جانب اور نیچے گہرائی کی طرف پھیلتی ہے۔ اس صورت حال کو اُن کی قوتِ نقد کا نتیجہ کہنا بجا نہ ہوگا۔

گذشتہ دس سال میں سرور نے اتنی نظمیں اور غزلیں کہہ لی ہیں کہ اُن سے ایک معقول حجم کا مجموعہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک اُن کے

تنقیدی مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نظموں کا ایک مجموعہ مدّت ہوئی شائع ہوا تھا۔ موجودہ دور کی نظمیں اور غزلیں طویل وقفوں کے بعد اس طرح شائع ہوتی رہیں کہ اُن کا مجموعی تاثر کھو سا گیا ہے۔ اس لئے موجودہ جائزے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ شعر و ادب سے عام دلچسپی لینے والے سرور کے فن اور تصوّرات سے متعارف ہو سکیں۔

سرور دورِ جدید کے اُن شعراء میں سے ہیں جو شاعری کی تمام فنّی تحریکات سے واقف ہونے کے باوجود فنّی حیثیت سے اپنے لئے کلاسکی طرز کو پسند کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کسی ادبی مباحثے میں آزاد نظم نگاری کی موافقت میں بحث کریں گے۔ لیکن اُس کا جواز ثابت کرنے میں کسی وقت بھی قدیم اسالیب کے احترام میں کمی نہیں کریں گے۔ جن لوگوں نے سرور کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ قدیم اور جدید کے ردّ یا قبول کرنے میں اُن کا روّیہ جذباتی نہیں عقلی ہے۔ وہ قدیم شاعری اور فنِ شعر کی اُن خصوصیات کو اپنانے سے گریز نہیں کرتے جو اثر اور لطف میں اضافہ کرتی ہیں، جو اظہارِ خیال میں مدد دیتی ہیں۔ یہ حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر تنقید ہی میں نہیں شاعری میں بھی اُن کی رہنمائی کرتا رہا ہے کہ قدیم اور جدید محض قدیم اور جدید ہونے کی حیثیت سے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ بلکہ تسلسلِ اقدار اور افادیت کے لحاظ سے اہمیت حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے دو شعروں کا حوالہ اُن کے یہاں اکثر ملتا ہے۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصّۂ قدیم و جدید

اور

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

لیکن کلاسکی معیاروں سے سرور کی وابستگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ جدید رومانیت، تشبیہہ اور استعاروں، اشاروں اور کنایوں کے نئے پن کو اپنی شاعری میں جگہ نہیں دیتے۔ اچھے معیار اور پُر اثر اسلوب کی یہی دریافت اُن کے تنقیدی شعور کا عطیہ ہے جو جدید اور قدیم دونوں سے قریب ہے اور دونوں کی اضافی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔

ابتدائی دور کی شاعری کے بعد سرور کی نظموں اور غزلوں میں دورِ جدید کی وہ آواز سنائی دینے لگتی ہے جو جانی پہچانی ہونے کے باوجود بے حد پیچیدہ ہے۔ اس میں غم، خوشی، اُمنگ، افسردگی، شکست، فتح، بے یقینی اور خود اعتمادی ہر ایک کی آمیزش ہے۔ کبھی یہ نغمے الگ الگ سُروں میں الاپے جاتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے میں مکمل مل جاتے ہیں۔ دورِ جدید کی یہ آواز غمِ محبت اور غمِ روزگار کے بہت سے پہلوؤں سے مل کر بنی ہے۔ اور یہ اُسی وقت بلند ہوتی ہے جب اس غم کو اُکسایا جاتا ہے۔ غم کے لفظ سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس میں رونے دھونے کا ذکر ہوتا ہے۔ بلکہ دردمندی، طلبِ صادق، انفرادی سربلندی اور اجتماعی بہبودی کے جذبات مل کر اس جذبے کو ترتیب دیتے ہیں۔ اس میں مادی، ذہنی اور روحانی بے چینی کا احساس نظر آتا ہے۔ یہی باتیں بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو قنوطیت کی طرف لے جاتی ہیں۔ کیونکہ انھیں اس بے چینی کا احساس تو ہوتا ہے اس کا راز نہیں معلوم ہوتا۔ انھیں اندھیرا تو دکھائی دیتا ہے روشنی کی خبر نہیں ہوتی۔ سرور اس حیثیت سے اُس طبیب سے مشابہ ہیں جو مرض کو سمجھتا ہے۔ صحیح تشخیص کی کوشش کرتا ہے۔ مریض سے ہمدردی رکھتا ہے اور علاج کے طریقوں سے واقف ہے۔ اس لئے مرض کے دور کرنے میں کامیابی ہو یا نہ ہو۔ لیکن اُسے بھروسہ ہے کہ وہ جو نسخہ تجویز کر رہا ہے درست ہے۔ یہ ساری باتیں سرور میں اُسی جاندار تنقیدی شعور کی پیدا کردہ ہیں جس کی تربیت اور تہذیب میں اُنھوں نے ریاضت کی ہے۔

اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ دور نہ صرف ہندوستان بلکہ دُنیا کے بڑے حصّے میں مادی اور روحانی حیثیت سے زیادہ تر انسانوں کے لئے اُلجھن اور بے چینی کا دور ہے۔ مختلف لوگ اپنے شعور کے لحاظ سے اس سے مختلف شکلوں میں عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ مایوسی اور شکست خوردگی زندگی کے مسائل سے گریز۔ حقائق سے چشم پوشی ایک عام طریقہ ہے جس کا اظہار ادب میں مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ لیکن جن کے پاس علم کی دولت ہے وہ یقین کی منزل پر پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اُس انسانی جدوجہد کا ساتھ دیتے ہیں جو ایک پُر اُمید عقیدے کے بہاؤ میں آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اُن کے یہاں رجائیت کا جوش ہوتا ہے۔ رجائیت ہوائی قلعے بنانے کا نام نہیں ہے۔ حقائق سے گریز نہیں ہے۔ ہواؤں سے دامن بچا کر گزرنا نہیں ہے۔ بلکہ انسانی جدوجہد کے اُن پہلوؤں سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہے جو عزم اور یقین کی روشنی میں منزل کی طرف لے جانے والی ہیں۔ سرور کی

ذہنی اُلجھنیں اور ان کا تجزیہ موجودہ دور کے اکثر باشعور تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی اُلجھنوں سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن اُن کا شعور اُنھیں اس منزل کی جانب لے جاتا ہے۔ جہاں یقین کے سہارے انسانی کارواں کو جانا ہے — یہ آہنگِ نشاط سرور کی نظموں اور غزلوں کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اُمید سرور کے لئے محض ایک سہانا خواب نہیں ہے کشمکش اور جدّ و جہد کا منطقی نتیجہ ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ہیں۔

غمِ جاناں، غمِ دوراں کے ہیں کتنے نشتر
لیکن اب بھی مرے سینے میں لہو باقی ہے

قیدِ گیسو کے سوا اور ہیں قیدیں کیا کیا
سرکشی کی ترے عشاق میں خو باقی ہے

جن کا تھا مجھکو جنوں یہ وہ بہاریں تو نہیں
مری پلکوں میں ابھی اور لہو باقی ہے

آج شعلوں کی لپک ہے، نہ شراروں کا وہ رقص
خاک میں میری مگر ذوقِ نمو باقی ہے

تلخیِ زیست کے باوصف یہ کیا ہے کہ ہنوز
فکر میں مستیِ صد جام و سبو باقی ہے

سرور کا انسان کی عظمت پر عقیدہ اس جذبے کا سب سے بڑا محرک ہے۔

کتنے خوابوں کا امیں، کتنے خیالوں کا نقیب
یوں تو انسان اکیلا نظر آتا ہے مجھے

کرنیں پامال بھی ہو جائیں تو برباد نہیں
نقش مٹ مٹ کے سنورتا نظر آتا ہے مجھے

جانتا ہوں کہ بڑا سخت گنہگار ہوں میں
اس اندھیرے میں اُجالے کا پرستار ہوں میں

اندھیرے میں اُجالے کی یہ پرستاری ایک لمحے کی ترنگ یا خوابناک کیفیت نہیں ہے۔ اس عقیدے کا نتیجہ ہے کہ ع

ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہوگی

سرور کا یہ ایک پسندیدہ موضوع ہے، اندھیرے اور روشنی کی پیکار میں وہ روشنی کی طرف، یاس اور اُمید کی کشمکش میں اُمید کی طرف اور شبِ تار اور سحر کی آویزش میں سحر کی طرف ہوتے ہیں۔ یہ صورت مسلسل ہمارے سامنے آتی رہتی ہے۔ سرور اسی جذبے سے سرشار ہو کر عمل کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ ذکر واعظانہ پند یا اخلاقی درس نہیں۔ بلکہ جہدِ حیات کے سنجیدہ، باہوش اور پُر آگہی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ انسان کی ہزارہا سال کی جد و جہد نے تہذیب کے محل کھڑے کئے ہیں۔ شہیدوں کی قربانیوں اور عالموں کے باشعور عمل نے زندگی کو برکتوں سے مالا مال کیا ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس لئے نئے انداز کے شہیدوں اور تجسس کے شیدائیوں کی ضرورت ہے۔ جن بے حس قدامت پرستوں اور قناعت پسندوں کے سینے میں یہ آگ روشن نہیں ہے وہ تہذیب اور علم کے سرمایہ میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ لیکن جنھیں انسان سے محبت ہے اُن کے لئے ہر وقت جد و جہد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ سرور نے اپنی ایک بڑی ہی خوبصورت اور معنی خیز نظم میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

سفر آساں تھا تو منزل بھی بڑی دلکش تھی
آج کس درجہ پُراسرار ہیں راہیں اپنی

کتنی پرچھائیاں آتی ہیں تجلّی بن کر
کتنے جلووں سے اُلجھتی ہیں نگاہیں اپنی

کتنے ماضی کے پرستار بُلاتے ہیں مجھے
دلِ دیوانہ منانے سے کہیں منتا ہے

کب سے پیاسی ہے شہیدوں کے لہو کی دنیا
اور لہو ہی سے سدا رنگِ عمل بنتا ہے

یہ لہو سرخیِ لب، غازۂ رخسار بنا
ورقِ لالہ بنا، ساغرِ گلنار بنا

تشنگیِ دشت کی شبنم سے بھلا کیا بجھتی
زندگی کے لئے عزمِ رسن و دار بنا

عالمِ نور کے خوابوں سے بہلتے کب تک
اشک ساں دیدۂ پُرنم میں مچلتے کب تک

آندھیاں تیز سہی، منزلِ نو دور سہی
روشنی لے کے ہم اپنی نہ نکلتے کب تک

وادیوں میں سرِ رہ پھول جنیں کس کے لئے
ہم ہمالہ کی بلندی کے طلبگار ہیں آج

آج کل عظمتِ انساں کا قدم چومے گا
کیا اندھیرے سے یونہی برسرِ پیکار ہیں آج

ایک اور نظم میں

روشنی عام کرو، فکر و نظر پاک کرو
یہ جنوں اور ابھی سرکش و بیباک کرو

پستیاں ہمسرِ افلاک بھی ہو سکتی ہیں
ہمتوں کو تو ذرا ہمسرِ افلاک کرو

نغمے برساؤ کچھ ایسے کہ خزاں چیخ اٹھے
اب ہمیشہ کے لئے شب کی ردا چاک کرو

جیسا کہ ابھی کہا گیا یہ سرور کا پسندیدہ اور محبوب موضوع ہے اور اس کی جڑیں اُن کے شعور کی گہرائیوں میں ہیں۔ کیونکہ اُنھوں نے زندگی اور اُس کے مختلف مظاہر کے مطالعہ سے یہی سیکھا ہے کہ عمل اور صحیح، باشعور اور پُرخلوص عمل سے دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ اسی جذبے کے ماتحت اُنھوں نے اپنی ایک تازہ ترین نظم میں ایک قنوطی دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ع

ہجومِ غم سے ہراساں ہے کس لئے اے دوست
ہر ایک رات کی آخر سحر بھی ہوتی ہے

جہاں سیاہ گھٹاؤں نے دام ڈالے ہیں
وہیں نمائشِ برق و شرر بھی ہوتی ہے

یہیں، سرد چٹانوں کے سخت سینے سے
کبھی تراوشِ لعل و گہر بھی ہوتی ہے

جہاں خزاں نے اُجاڑے ہیں رنگ و بو کے دیار
وہیں بہارِ بہشتِ نظر بھی ہوتی ہے

بھڑکنے لگتے ہیں جب شعلہ ہائے جنگ و جدال
نسیمِ امن و اماں چارہ گر بھی ہوتی ہے

یہ گردِ راہ، یہ ذرّوں کی موجِ آوارہ
جہانِ تازہ کی پیغامبر بھی ہوتی ہے

بڑھے جو رنجِ اسیری تو قید ہے کیا چیز
قفس میں تربیتِ بال و پر بھی ہوتی ہے

حدیثِ غم کا تری سلسلہ دراز سہی
یہ داستان کبھی مختصر بھی ہوتی ہے

ان چند اقتباسات سے اس بات کا اندازہ بھی ہوگا کہ سرور کن تہذیبی قدروں کے لئے جد و جہد کا پیغام دیتے ہیں۔ اُن کی تیز اور حقیقت فہم نگاہ ان قدروں کے پہچاننے میں دھوکا نہیں کھاتی، وہ ایسے پُرفریب مواقع کا پردہ چاک کرنے میں طنز سے کام لیتے ہیں اور بڑی کامیابی سے اپنے نقطۂ نظر کی برتری اور اہمیت جتاتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی نظموں میں سے "جب اور اب"، "ابھی تک"، "ریاست اچھی ہے جو غیر مذہبی بھی رہے" اور "بربادی یا آبادی" کا مطالعہ اِس حقیقت کو واضح کر دے گا کہ سرور طنز کا نشتر بھی کس چابک دستی سے چلا سکتے ہیں۔

سرور کی شاعری شخصیتوں، تحریکوں اور تجربوں کا جائزہ لینے میں تخیل سے کام لیتی ہے اور کسی شخصیت، تحریک یا تجربے کے مرکزی نقطے کے گرد تخیل کے جال بنتی ہے۔ اپنے موضوع سے گہری واقفیت کے ساتھ ساتھ وہ جذباتی لگاؤ بھی پیدا کر لیتے ہیں، اسی وجہ سے اُن کی کئی نظموں میں شادابی اور تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ اس نکتے کی تفصیل کا موقع نہیں ہے اور نہ بہت سے اقتباسات دئے جا سکتے ہیں۔ پھر بھی وضاحت کے لئے اتنا کہنا ضروری ہے کہ وہ تخیل کی پرواز پر روک رکھنے کے باوجود احساس کی شدّت سے کام لے کر اشاروں ہی اشاروں میں بہت سی معنی خیز باتیں کہہ جاتے ہیں جن کو پھیلا کر کہنے میں اثر کا بھرپور وار نہ پڑتا۔ ایسے مواقع پر وہ بعض اجتماعی تصوّرات کو بھی انفرادیت کے پردے میں بیان کر کے پڑھنے والے کو قریب کھینچ لاتے ہیں۔ اُن کی ایک بہت ہی مکمّل، جامع اور پُرمعنی نظم "سعیِ وفا" اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ اس کے سارے اشارے اور کنائے شخصی بھی ہیں اور جماعتی بھی۔ اِس میں خیال کا ارتقا جذباتی بھی ہے منطقی بھی۔ کیفیات کے تنوّع کا یک جا ہو کر نظم بن جانا جہاں ایک طرف اپنے موضوع سے گہری واقفیت کا پتہ دیتا ہے وہاں اسلوب اور اندازِ بیان پر قابو حاصل کر لینے کا مظہر بھی ہے۔ اس نظم میں کل بائیس شعر ہیں جو تین ٹکڑوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ ان سے شاعر کے ذہن کے تعمیری اور تخلیقی عمل پر روشنی پڑتی ہے، اسے تمام و کمال نقل کر دینا ہی اس کے حسن کو واضح کرے گا۔

مجھے ہر ناصحِ مشفق یہی تلقین کرتا ہے
کہ بزمِ ہند میں سعیِ وفا کرنے سے کیا حاصل

مریضِ ناتواں کا حال اب ناگفتنی سمجھو
دوا کرنے سے کیا حاصل، دعا کرنے سے کیا حاصل

حرم کے کارنامے دیر میں مقبول کیا ہوں گے
بتوں کے سامنے ذکرِ خدا کرنے سے کیا حاصل

خزاں میں نغمۂ اہلِ بہاراں کون سنتا ہے
بیاباں میں چمن کا تذکرہ کرنے سے کیا حاصل

سمجھ کر گردِ رہ وہ جھاڑ دیں گے اپنے دامن سے
دل و جاں اُن کے قدموں پر فدا کرنے سے کیا حاصل

یہاں ہر موج کے حلقے میں سو گرداب پنہاں ہیں
سفینہ نذرِ طوفانِ بلا کرنے سے کیا حاصل

جہاں نفرت کی آندھی ہو تعصب کی ہوائیں ہوں
اک ایسے دشت میں خیمہ بپا کرنے سے کیا حاصل

گلوں کا کیا ہے نذرِ طاقِ نسیاں ہو ہی جائیں گے
شگوفوں کو اسیرِ ابتلا کرنے سے کیا حاصل

حریفوں کی سیاست سے اندھیرا ہی سہی گھر میں
نگاہِ لطفِ شمعِ انجمن کچھ اور کہتی ہے

ہوئی دو دو جنوں میں لاکھ رسوا رسمِ دلداری
کسی یوسف کی بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے

غبارِ کارواں میں چھپ گئی منزل تو کیا غم ہے
اُفق سے پھوٹتی ننھی کرن کچھ اور کہتی ہے

یہ اچھے باغباں گو سبزۂ بیگانہ ٹھہرائیں
عروسِ وادیِ گنگ و جمن کچھ اور کہتی ہے

اُٹھائی جا رہی ہیں گرچہ میخانے میں دیواریں
مری تہذیب کی رسمِ کہن کچھ اور کہتی ہے

بڑی پُرشور ہے زاغ و زغن کی نغمہ آرائی
مگر جمہور کی طرزِ سخن کچھ اور کہتی ہے

یہ اوجِ بے ستوں، یہ حلقہ ہائے دامِ پرویزی
زبانِ تیشہ، وضعِ کوہکن کچھ اور کہتی ہے

شکوہِ خسروی کیا، عزّ و نازِ لعل و گوہر کیا
کہ مجھ سے سنّتِ دار و رسن کچھ اور کہتی ہے

کہاں تک پستیِ اہلِ وطن پر نوحہ خوانی ہو
حدیثِ عظمتِ اہلِ وطن کچھ اور کہتی ہے

وہی مے آج بھی ہے تاج کے جاموں میں
اودھ کی شام کے وہ میکدے آباد ہیں اب بھی

بہاریں میری صدیوں کی چمن بندی کا حاصل ہیں
لبِ تاریخ کو میرے فسانے یاد ہیں اب بھی

"قفس کیا، حلقہ ہائے دام کیا، رنجِ اسیری کیا"
یقیں کی روشنی جاگے تو دل آزاد ہیں اب بھی

بہارِ جنتِ کشمیر سے تا ارضِ کاویری
وطن میں میرے کتنی نکہتیں آباد ہیں اب بھی

یہ صدیوں کی حنا بندی کبھی تو رنگ لائے گی
بہاروں میں مری سعیِ وفا بھی جگمگائے گی

یہ پوری نظم بلند خیالی، اعلیٰ نصب العین، پختگیِ خیال، ترقی پسندی، فنّی تعمیر، قدرتِ بیان اور رنگین نوائی کی بہت اچھی مثال ہے۔ سرور کم الفاظ سے زیادہ کام لیتے ہیں اور پُرمعنی اشاروں، لطیف استعاروں اور عام فہم ترکیبوں سے وہ فضا پیدا کر لیتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔

سرورکی متعدد نظموں میں اعتراف کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک نازک اور نوبتہ دارانہ موقع ہوتا ہے جہاں تعلّی اور خاکساری کے درمیان اپنی واقعی ذہنی کش مکش اور عقائد کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ ان نظموں کی کامیابی یہ ہے کہ پڑھنے والے چاہے شاعر کے ہم خیال نہ ہوں لیکن اُس کی جراُتِ اظہار سے متأثر ہوں۔ سرورکی کئی دلکش نظمیں اسی زمرے میں آتی ہیں۔ "میری کہانی"، "یہ آرزو تھی"، "یہ شمع"، "پاکستان بننے پر"، "معذرت"، "ڈھاکے کے ایک دوست کو" اور "آدابِ سخن" ان تمام نظموں میں ایک شخصی غنائی عنصر ہے۔ مطالعہ، ضبط و تنظیم، تنقیدی شعور، حوصلہ مندی نے اُن کے ذہن کی جس طرح تعمیر کی ہے اُس کے عکس ان نظموں میں ملتے ہیں۔ کہیں کہیں اُنھیں میں اُن کے فنّی عقائد کا پتہ بھی چل جاتا ہے، "نار کے طور سے نور" اور "جذبہ و فکر کا طور" بنا لینے کی خواہش شعور اور اندازِ بیان دونوں کو ظاہر کرتی ہے۔ عام طور سے سرور کی نظمیں مختصر اور گٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کے کچھ حصّوں کا اقتباس نظم کے پورے حسن کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ تاہم ایک نظم کے چند شعر مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں، پوری پوری نظموں سے مضمون طویل ہو جائے گا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جراُت نہیں نغمے میں ترے — گرمیِ جوشِ محبت نہیں نغمے میں ترے
نہ وہ طوفانوں کی شوکت، نہ وہ شعلوں کی لپک — نہ مئے کہنہ کی تیزی نہ وہ بجلی کی چمک
تیرے الفاظ میں جادو تو ہے للکار نہیں — تیری تلوار میں جوہر تو ہے جھنکار نہیں

سوچتا ہوں کہ یہ جذبات کی شورش کے مریض — کیسے چلتی ہے نسیمِ سحری کیا جانیں
یہ سیاہی کی سپیدی کی لکیروں کے اسیر — کیسے شیشے میں اُترتی ہے پری کیا جانیں

اس مختصر جائزے میں نہ تو تفصیلی جائزے کی گنجائش ہے اور نہ طویل اقتباسات کی۔ اقتباسات زیادہ تر اس خیال سے دیئے گئے ہیں کہ عام طور سے سرور کی نظمیں ایک جگہ نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح پوری بات سامنے نہیں آتی۔

سلسبیل کے دور میں سرور نے غزلیں بھی لکھی تھیں جن میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔ خود سرور کا خیال تھا کہ ان غزلوں میں اچھے اشعار کے ساتھ معمولی اشعار بھی جگہ پا گئے ہیں جن پر اس ابتدائی مشق کی حالت میں قابو پانا محال ہے۔ لیکن اِدھر تین چار سال میں سرور نے پھر غزلوں کی طرف توجہ کی ہے اور فنی نزاکتوں کے احساس کے ساتھ۔ انھوں نے اپنے مضامین میں متعدد مقامات پر غزلوں پر خیال آرائی کی ہے۔ اور اُسے تنقیدی نظر سے دیکھا ہے۔ اُس کے حدود کا اندازہ لگایا ہے، اور اُس کی مرصّع کاری کو سراہا ہے۔ اس لئے جب اُنھوں نے غزل کی طرف توجہ کی تو اُس میں تغزّل اور کیف کا خاص خیال رکھا ہے۔ سرور کی غزلیں پڑھ کر کبھی کبھی یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص زمین یا کسی خاص قافیہ کے جادو سے متأثر ہو کر لکھ رہے ہیں، ورنہ عام طور سے اُن کی غزلیں شگفتہ، شاداب اور معنوی حُسن سے آراستہ ہوتی ہیں۔ وہ محض بات میں بات نہیں نکالتے اور نہ غزلوں کو بہت ہی سنجیدہ فلسفیانہ مسائل کے اظہار سے بوجھل بناتے ہیں۔ جہاں سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل آتے بھی ہیں وہاں گفتگو بلیغ اشاروں میں ہو جاتی ہے۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

مطالبے تو بہت سخت تھے زمانے کے — مگر حقوقِ محبّت کی یاد آ ہی گئی
ہے آج اور ہی کچھ زلفِ تابدار میں خم — بھٹکنے والے کو منزل کا راستا تو ملا
روشن ہوئے جس سے غمِ دنیا کے بھی سائے — ایسے بھی دیئے تیرے تصوّر نے جلائے
زُلفوں کو دیا ہے رُخِ روشن نے عجب رنگ — جلوؤں سے ترے اور بھی روشن ہوئے سائے
آخر شب بن ہی گئے وقت کے ماتھے کی کرن — میرے سجدے جو ترے نقشِ قدم تک پہونچے
جب زمانے میں کہیں چشمِ مروّت نہ ملی — غمِ دنیا کے ستائے ترے غم تک پہونچے

اگر چند لفظوں میں سرور کی غزلوں کی خصوصیات کا اظہار کرنا ہو تو ہم معنویت کیف اور ترنّم کے الفاظ استعمال کر سکتے ہیں، یہی وہ عناصر ہیں جن سے غزل غزل بنتی ہے۔

سرور کا رچا ہوا ذوق، اُن کا تنقیدی شعور، اسالیبِ سخن کی گہری واقفیت، قومی درد، شائستگیٔ جذبات اور خوب سے خوب تر کی خواہش، یہ بھی باتیں اُن کی شاعری پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ زندگی کے مخصوص ترقی پسندانہ نصب العین نے اُن کے یہاں گرمی اور خلوص پیدا کیا ہے۔ نئے دور کے تقاضوں کو سمجھنا اور سمجھ کر اُنھیں فن کارانہ طور پر شاعری کا جزو بنانا بہت کم شاعروں کو آتا ہے۔ سرور نے اس کی کوشش کی ہے۔ ایک جگہ اُنھوں نے خود لکھا ہے: "میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آنکھیں بند کر کے نئے عنوانات پر طبع آزمائی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جب تک آپ اس قوت اور حقیقت سے واقف نہ ہو جائیں جو ان عنوانات کے پیچھے کام کر رہی ہے، عنوانات پر طبع آزمائی بیکار ہے۔ ہوائی جہاز یا جوہری بم پر نظم یا افسانہ لکھنا بڑی بات نہیں۔ بڑی بات اس کو سمجھنا ہے کہ اُن چیزوں نے زندگی کے مفہوم کو کس قدر بدل دیا ہے۔" سرور کی شاعری کا مطالعہ اُن کے تنقیدی تصوّرات کی روشنی میں کرنا چاہیئے، یوں کیف حاصل کرنے کے لئے اُن کی نظمیں اور غزلیں پڑھی جا سکتی ہیں اور سنجیدہ فکر و نظر کے طالب کو وہاں بہت کچھ ملے گا۔

تلوک چند محروم

کشمیر سے خطاب

صورت‌گرِ ازل نے صبحِ ازل دکھایا — اپنا کمالِ صنعت، کر کے تجھے نمایاں
تجھ سا نظر نہ آیا روئے زمیں پہ کوئی — گلپوش، گل بداماں، سر تا قدم گلستاں
اے انتخابِ عالم، اے افتخارِ دوراں
اے وادیٔ گل افشاں

جو فیضِ حسنِ فطرت سے تیرے جھونپڑوں میں — شاہوں کے قصر و ایواں اس کو ترس رہے ہیں
تیرا جمالِ رنگیں رخشاں ہے چیتھڑوں میں — تو ریشمی دوشالے دنیا کو دے رہا ہے
دورِ خزاں بھی تیرا ہے رشکِ صد بہاراں
اے وادیٔ گل افشاں

وہ نقشِ ثانی ہے تو دنیائے رنگ و بو میں — بے رنگ جس سے رونقِ حسنِ فرنگ کی ہے
دنیا کے اہلِ ایماں کہتے تھے جس کو جنت — شرمندہ ہو کے تجھ سے روپوش ہو گئی ہے
ورنہ کہیں تو ہوتے آثارِ باغِ رضواں
اے وادیٔ گل افشاں

یہ چشمہ ہائے سیمیں، یہ آبشار تیرے — دریا دلی سے اپنی قدرت نے تجھ کو بخشے
بھر پور یہ سیم و زر سے یہ کوہسار تیرے — جانِ بہار تیرے باغات اور جنگل
کیا تجھ کو احتیاجِ ظلِّ ہوس پناہاں
اے وادیٔ گل افشاں

کس کو نصیب ہے یوں اس زندگی میں جنت — جنت کی زندگی ہے جینا فضا میں تیری
موجِ ہوا یہاں ہے رشکِ دمِ مسیحا — عرفی نے سچ کہا تھا: "آب و ہوا میں تیری
مرغِ کباب آ کر ہو جائے مرغِ پرّاں
اے وادیٔ گل افشاں

عزمِ صمیم ہے یہ تیرے فدائیوں کا — نذرِ ہوس پناہاں اب ہوں گے تیرے دشمن
تجھ کو صلہ ملیگا درد آشنائیوں کا — اللہ کے کرم سے دن پھر چکے ہیں تیرے
اس پہ تلے ہوئے ہیں ہندو ہیں یا مسلماں
اے وادیٔ گل افشاں

گزری مصیبتوں پہ یہ کہہ کے مطمئن ہو — "سرمایۂ سعادت ہے دردمند ہونا"
آئے ہیں خاتمے پر ایامِ نامساعد — تقدیر میں تری ہے اب سربلند ہونا
دھو ڈال اپنے دل سے داغِ ملالِ حرماں
اے وادیٔ گل افشاں

ایران بانو

اجنبی

کوریا کی سرزمین کئی بار خون سے سینچی گئی ہے اور نا معلوم کتنے بار اس سرزمین پر اور خون کی بارش ہوگی۔ اس بھیانک تاریکی میں کبھی کبھی ہلکی ہلکی کرن انسانیت کی بھی نمودار ہوئی ہے۔ موہیا ایک گاؤں کی لڑکی ہے جو محبت، انسانیت اور ایثار کا مجسمہ ہے۔ ابھی چند گھنٹے ہوئے اس گاؤں کی زمین روندی جا چکی ہے۔ موہیا اپنی جھونپڑی میں سہمی بیٹھی تھی کہ اس کے کان میں دور سے کراہنے کی آواز آئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ مگر انسانیت کا تقاضا تھا کہ مرتے کو پانی دے۔ کل تک اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سامنے کے دھان کی فصل اپنے بھائی کے ساتھ کاٹ کے گھر لا سکے۔ مگر اس وقت وہ آواز کی طرف قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی۔ کسی نیم بسمل کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں کھیت میں چلی جا رہی تھی۔

دھان کے کھیت جو چند دن ہوئے تیز ہوا کے جھونکوں سے مست بھری انگڑائیاں لیتے تھے جن کی ہر ہر زندگی کا قیام تھی ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو رہے تھے۔ جن ہاتھوں نے اُنہیں پال پوس کر پروان چڑھایا تھا وہ کب کے خاموش ہو چکے تھے۔ اب آہنی دیو، تباہیوں کے دیوتا ٹینک کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ زمین پر تو یہ راکشش زندگی کا خون چوس رہے تھے اور آسمان سے بموں کی بارش اس سرزمین کی مانگ کا سیندور چھین رہی تھی۔ وہ سپاہی جو اس تباہی کے دیوتا کے پجاری تھے ہر مسرت کے غنچۂ سربستہ کو ظلم کی چٹکیوں سے دل کھول کر مسل رہے تھے۔

موہیا نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا ہرا بھرا کھیت اُجڑتے دیکھا مگر کیا مجال کہ اُف تک زبان پر لا سکتی۔ بہت سے گاؤں والے اسے چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ اس کی بہن نے ہاتھ جوڑ کر اُسے بھی بھاگ نکلنے کو کہا مگر اس باہمت لڑکی نے آن بان کو بھینٹ چڑھانے کی ٹھان لی۔

گاؤں پر سناٹا چھا گیا تھا۔ بڑھتی ہوئی فوجیں گاؤں میں آ چکی تھیں۔ وہ گاؤں والے جو گاؤں چھوڑ کر بھاگے تھے۔ سہمے ہوئے امید و بیم کی حالت میں خدا کا سہارا لئے بیٹھے تھے۔

موہیا جب جھاڑی کے قریب پہنچی تو ایک آدمی زمین پر بے حس پڑا دکھائی دیا۔ ایک سپاہی۔ جسم پر فوجی وردی پھٹی تھی۔ کہیں کہیں خون کے دھبے۔ وہ چپکے سے اس کے قریب گئی۔ اُس کے دماغ میں طرح طرح کی باتیں گھومنے لگیں "مر گیا، نہیں، شاید زندہ ہو، اس کی جان بچانا چاہیئے۔ مگر نہیں — بھائی اور نانیلان کا کیا ہوگا۔" "نہیں، نہیں، نہیں۔ نہ خود خطرے میں پڑوں گی نہ اپنے بھائی اور بہن کو مصیبت میں ڈالوں گی۔ اُونہہ مر گیا ہوگا۔ یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔" جب وہ اسی ذہنی کشمکش میں تھی تو یکایک اس نے اس سپاہی کے ہونٹ ہلتے دیکھے اور اس نے پانی مانگا۔ یہ دیکھتے ہی اس کے خیالات میں سارا انقلاب آگیا۔ وہ گھر جاتے جاتے رُک گئی۔

"میں بزدل نہیں ہوں، میں سنگدل نہیں ہوں۔ کوئی دم توڑے۔ اور میں پانی کی ایک بوند بھی نہ دوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ گھر کی طرف جھپٹی۔ دونوں بھائی بہن اُس کو گھر اُٹھا لائے۔

"ارے یہ دیکھو کتنا گہرا زخم ہے۔ تم نہ دیکھتیں تو کب کا مر جاتا۔"

بہن نے سُنا مگر خاموش رہی۔

"ہاں سنو۔ مگر اس کو کب تک رکھو گی۔ اگر۔ . . . ."

اس نے پھر سُنا۔ اس کے بدن کو ہلکی سی جنبش ہوئی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ جب یہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ سپاہی نے بڑے کرب کے ساتھ کروٹ لی۔ اب موہیا نے اپنے بھائی بہن کو اشارے سے کہا کہ خاموش رہیں اس کو کچھ ہوش آ چلا تھا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے کچھ لوگ تھے۔ تین چہرے اس کی طرف متوجہ تھے۔ اُن کی توجہ انہماک کا رنگ لئے ہوئے تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ "یہ سب کیا ہے" "میں کہاں ہوں"۔ "یہاں مجھے

کون لایا ؟

پھر اُس نے پوچھا "میں کہاں ہوں ؟"

موہیا خاموش تھی۔ بھائی نے موہیا کی طرف اشارہ کر کے معصومیت سے کہا۔ "اس نے تمہیں کھیت میں زخمی دیکھا تم کو یہاں لے آئی۔"

سپاہی۔ "ہوں۔ میں اپنی رجمنٹ سے الگ ہو گیا تھا۔ میں جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر کیا ہوا مجھے [illegible] نہیں"۔ موہیا سن رہی تھی۔ مگر ایک لفظ زبان پر نہ لائی۔ پھر سپاہی نے اپنے زخمی چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اپنے جسم پر پٹیاں بندھی پائیں۔ اس کے چہرے پر تشکر کی جھلک تھی۔

سپاہی۔ "میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے کتنی تکلیف کی۔ کاش میں اس کا کچھ بدل کر سکتا۔"

موہیا۔ خیر، اس کی ضرورت نہیں یہ محض ہمارا فرض تھا۔ کوئی مر رہا ہو، اور ہم نگاہیں پھیر لیں یہ تو نہیں ہو سکتا۔ (لہجے میں ترشی تھی)

"(خجالت کے ساتھ) نہیں نہیں ہرگز میرا مطلب یہ نہ تھا۔ مجھے معاف کیجئے گا۔ کیا آپ کو میرے الفاظ سے تکلیف ہوئی ؟"

موہیا۔ "نہیں، نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ میری بہن آپ کے لئے کچھ کھانے کے واسطے لا رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ جب وہ باہر سے واپس آئی۔ اُس کا بھائی بھی ساتھ ساتھ آیا۔ دونوں وقت مل چکے تھے۔ رات کی آمد تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ دروازے اچھی طرح بند تھے۔ مزید احتیاط کے لئے دروازوں کے قریب میز اور کرسیوں کا انبار تھا۔

بھائی۔ (سرگوشی سے) بہن سنتی ہو۔

موہیا۔ کیا ہے ؟

بھائی۔ کیا یہ آج اسی گھر میں رہے گا۔

موہیا۔ کیا مطلب ؟ کیا تم چاہتے ہو کہ اسے گھر سے نکال دیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔

بھائی۔ لیکن ان لوگوں کو اگر معلوم ہو گیا تو جانتی ہو کیا ہو گا۔ یہ تو مارا ہی جائے گا اور ہماری جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔

موہیا۔ یہ ہے تو ٹھیک۔ لیکن مجبوری ہے۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

گھر پر خاموشی اور تاریکی چھائی تھی۔ کمرے میں ایک شمع ٹمٹما رہی تھی۔ باہر سے گھر سُونا اور تاریک نظر آتا تھا۔ گھر کے اندر بھی سنّاٹا تھا۔ کبھی کبھی یہ سکوت کا عالم تھائے اور تائیلان کی سرگوشی سے ٹوٹ جاتا تھا۔ موہیا الگ سوچ میں ڈوبی بیٹھی تھی۔ قریب ہی اجنبی پڑا تھا۔ اُسے نیند آنے لگی تھی۔ موہیا کی نظر نامعلوم کیوں اس کے چہرے پہ بار بار پڑ رہی تھی۔ شمع کی روشنی کا بھی وہ مرکز بن گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے اور اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ اُس کے کرب کا عالم بتا رہے تھے۔ لانے کو تو لے آئی۔ مگر یہ مہمان اس سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ جب اُس کی طرف دیکھتی، اُس کے دل میں رحم اور ہمدردی کی امتزاجی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اسے اب ندامت ہو رہی تھی کہ اس کے ساتھ اس نے بیگانگی کا برتاؤ کیوں کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شوربے کا پیالہ اُس کے لئے لے آئی۔ آہٹ سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے شوربے کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا اور کہا "اسے پی لو۔"

سپاہی۔ "میں تمہارے لئے ایک وبالِ جان بن گیا ہوں۔ خیر آج رات کو تو چلا ہی جاؤں گا۔"

موہیا۔ مگر تمہاری حالت تو ایسی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں چل پھر سکو گے ؟

سپاہی۔ "کسی طرح چل ہی لوں گا۔"

اس نے کوشش کی کہ وہ اسے بیٹھ کر دکھائے۔ مگر موہیا کے ہاتھ یکدم اُس کے کندھے پر چلے گئے اور اس نے پھر اسے لٹا دیا۔

موہیا۔ میں تمہیں ایسی حالت میں ہرگز نہ جانے دوں گی۔ جانتے ہو کیا ہوگا۔ یا تو جان جائے گی یا قید خانے میں پڑے رہو گے۔

موہیا کو معلوم تھا کہ یہ دُور اندیشی نہیں ہے۔ وہ اپنے لئے اور اپنے بھائی بہن کے لئے خطرہ مول لے رہی ہے مگر اس کے سوا، دوسرا راستہ اُس کے سامنے تھا بھی تو نہیں۔

سپاہی۔ میں کسی طرح چلا ہی جاؤں گا۔ میں اپنے واسطے تم سب کو مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

جب اُس نے دیکھا کہ وہ جانے کو تُلا ہی ہُوا ہے تو اسے ایک ترکیب سوجھی۔

"ہاں سنو، اُوپر دیکھو، تم دیکھ رہے ہو یہ چھت، اصل میں یہ تختہ ہے۔ چھت تو اُوپر ہے۔ اس تختہ اور چھت کے درمیان کافی جگہ ہے۔ ہم اس میں غلّہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک آدمی آرام سے چھپ سکتا ہے۔ یہ دیکھو، یہ

سوراخ اس سے ہوا اور روشنی آسکتی ہے۔ وہ ہنسا۔

"میں سمجھا مگر سوال تمہارا ہے۔"

موہیا۔ "اس کی تم فکر نہ کرو۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

سپاہی۔ "اجنبی"۔ (دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

رات بھر اس کی آنکھ نہ لگی۔ کبھی گولیاں چلنے کی، کبھی بھاری ٹینکوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ "میں صبح ہوتے ہی اسے چھپا دوں گی۔"

ان ہی خیالوں میں ڈوبی وہ سو گئی۔

ابھی صبح کی پو بھی نہ پھٹنے پائی تھی کہ کسی نے دروازے کو دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کیا۔ سارا گھر ہل سا گیا۔

ایک بھیانک آواز یہ کہتے سنائی دی۔ "دروازہ کھولو۔"

موہیا نے دروازہ کھول دیا اور الگ ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کھلتے ہی چند قوی ہیکل فوجی داخل ہو گئے۔

"اس گھر کا مالک کون ہے"؟ ایک بھاری آواز نے کہا۔ کمرے بھر میں وردی پہنے ہوئے فوجی نظر آرہے تھے۔

موہیا نے بے فکری اور بے پروائی سے کہا۔ "اس گھر میں کوئی مرد نہیں ہے بس ہم تین یہاں رہتے ہیں۔"

اس شخص کے تیوروں پر بل تھے اور وہ تھائی اور تائیلان کو غصے کی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"ہو" اس نے عجیب سی آواز نکالی۔ جس پر سارے آدمی گھر کے مختلف حصوں کی کھوج میں مصروف ہو گئے۔

"ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس گھر میں مشکوک اشیاء تو نہیں ہیں"؟

موہیا کے چہرے سے بے فکری ظاہر ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہے۔ چند ہی لمحوں کے بعد سب فوجی واپس آگئے۔ ان کو کچھ نہ ملا۔ اس شخص نے پھر گھور کر موہیا کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسے ان سب پر شبہ ہے۔

"اس گھر میں کھانے پینے کی اشیاء کا ذخیرہ ہے؟"

موہیا۔ "تھوڑے سے آلو اور مٹھی بھر چاول، بس اور کچھ نہیں۔ تمہارے سپاہیوں نے تو خود ہی دیکھ لیا ہے۔ اگر اب بھی شک ہے تو پھر دیکھ لو۔" موہیا نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کتنی کامیاب اداکارہ ہے۔ فوجیوں نے ہوا، کھوج لگائی۔ ان کو کچھ نہ ملا۔ خالی ہاتھ واپس گئے۔ فوجی اپنی ناکامی سے جھنجھلا گیا تھا۔ چلتے چلتے بھی غصے میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

جب موہیا کو اطمینان ہو گیا کہ اب کوئی خطرہ باقی نہیں ہے۔ اس نے اپنے بھائی اور بہن کو دروازے پر نگرانی کے لئے چھوڑا۔ اور خود جہاں سپاہی چھپا تھا پہونچ گئی۔ موہیا جب اس تنگ و تاریک جگہ پہ پہونچی تو سپاہی کے چہرے پر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ موہیا نے تختے کو تھوڑا سا ہٹا کر شمع روشن کر دی۔ ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے نے سپاہی میں روح پھونک دی۔ شمع کی ہلکی ہلکی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ اب بشاش نظر آتا تھا۔ پریشانی کے آثار نہ تھے۔ موہیا کی نرم اُنگلیاں اس کی کلائی تک گئیں جیسے وہ اس کی نبض دیکھ رہی ہو۔

"اب تو تم اچھے ہو۔ بخار تو بالکل نہیں معلوم ہوتا۔"

سپاہی "میں بالکل اچھا ہوں" (کچھ مسکراہٹ کے ساتھ) "تم پر کیا گذری"

موہیا۔ "کوئی خاص بات نہیں۔ گھر کی تلاشی لی گئی۔ وہ لوگ غلہ اور چھپائی چرائی مشکوک چیزوں کی کھوج میں تھے۔"

سپاہی۔ "پھر کیا ہوا؟"

موہیا۔ ہوتا کیا۔ اپنا سا منہ لئے چلے گئے۔

یکایک موہیا کی نظر اُس کے قریب کے پستول پر پڑی۔ اور اُس کے چہرے پر ایک دلچسپ تبسم تھا۔

سپاہی۔ ہوں، تو آئے بھی وہ گئے بھی وہ۔ اچھا اب مجھے بہت جلد چل دینا چاہیئے۔ جان بچی، لاکھوں پائے۔ مگر وہ میرا پیچھا ضرور کریں گے۔ شاید کوئی خفیہ تعینات کر دیں۔

موہیا۔ ہو سکتا ہے ناممکن تو نہیں۔

موہیا بڑے غور سے اُس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ابھی اس کے چہرے پر زردی ہے اور تکلیف کے آثار بھی باقی ہیں۔

موہیا۔ نہیں آج نہیں۔ تم کل جانا۔ ابھی فی الحال تو خطرہ نظر نہیں آتا۔ کم از کم ایک دن تو آرام کر لو۔

دونوں کے لبوں پر پھر سکوت ثبت سی ہو گئی۔ مگر دونوں کسی خاص احساس سے متاثر نظر آتے تھے۔ اس میں شک نہیں موہیا ہمدردی کی حدوں سے بڑھی جا رہی تھی اور وہ خود اپنے کو خطرے میں ڈال چکی تھی۔ پھر اُس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر آج رات ہی کو وہ چلا جائے تو اچھا ہے۔ خطرہ دور ہو جائے گا

اسے اپنے اوپر غصہ سا آنے لگا۔ یہ اس میں تذبذب کیوں پیدا ہو گیا۔ کسی بات پر قائم نہیں۔ کبھی یہ، کبھی وہ۔

سپاہی موہیا کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ وہ کھوئی ہوئی بیٹھی تھی، عجیب محویت کے عالم میں۔ موہیا سپاہی کی زندگی میں پہلی کورین لڑکی تھی۔ جس سے وہ اتنا بیباکانہ ملا تھا جو جیتا سا تھا کہ اُس نے اپنے دماغ میں ایک کوریا کی لڑکی کا بت رکھا تھا اُسے ویسا تو نہ پایا۔ اُس کے دل میں ایک تعریف کا جذبہ گھر کر چکا تھا۔ جرأت اور ہمت کی اُس کے دل میں بڑی قدر تھی۔ لیکن اب اُسے فکر اس بات کی تھی کہ اُس کا اور اُس کے بھائی بہن کا حشر کیا ہوگا۔

سپاہی۔ عجیب بات ہے ہم لوگوں کی عجیب دلچسپ ملاقات ہوئی اور تم میری زبان سے بھی واقف نکلیں۔ اپنی کہہ سکتا ہوں اور تمہاری سُن سکتا ہوں۔

موہیا۔ جانتے ہو۔ میرا باپ ایک ٹیچر تھا۔ سمجھے۔

سپاہی۔ تمہیں یہ نہیں معلوم کہ میرا بھائی بھی ٹیچر تھا (دونوں ہنستے ہیں) ہم ایک فارم پر رہتے ہیں۔ ہم لوگ تین ہیں۔ میں، میرا بھائی اور میری بہن بس اور کوئی نہیں۔ بہن کا تمہارا اتنا سن ہے۔ خصلتیں لڑکوں کی سی۔

موہیا۔ اور کچھ۔

سپاہی (کچھ مسکراہٹ کے ساتھ) ہاں تم کچھ تو اس سے ملتی جلتی ہو۔ اس کی نگاہوں میں چھپی ہوئی محبت نظر آتی تھی۔

موہیا۔ تم اپنے گھر کی باتیں کئے جاؤ۔ اپنے کھیت، اپنی بہن، اپنے بھائی کی باتیں۔ ہاں کہتے کیوں نہیں۔

موہیا اس کے قریب آ چکی تھی اور اُس کی باتیں بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھی۔ اور وہ بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اس نے اس کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ موہیا یہ دیکھ کر کہ کافی دیر ہو گئی ہے۔ چلنے کی طیاری کرنے لگی۔

موہیا۔ اچھا کل پھر ملیں گے۔

سپاہی۔ ہر گھڑی آہٹ پہ کان اور در پہ نظر رہے گی۔

موہیا مسکرائی اور چلتے چلتے اُس کے ہاتھ کو چھیڑ گئی۔

تمام دن خیریت سے گزر گیا۔ تینوں بھائی بہن بڑی بے چینی سے رات کا انتظار کر رہے تھے۔ رات ہوتے ہی ایک سناٹا سا چھا گیا۔ دُور سے گولیوں اور بموں کی آوازیں کبھی کبھی سنائی دیتیں۔ سب دروازے سے لگ کر کھڑے ہو گئے پتا کھڑکا اور دل دھڑکا۔ رات کی ہر گھڑی سکون کا ایک پیام لاتی تھی۔ جب رات اپنے شباب پر آئی تو ان لوگوں کے جان میں جان آئی۔ موہیا نے اپنے بھائی سے کہا کہ دروازے پر نگاہ رکھے اور وہ خود جہاں مہمان سپاہی کو چھپایا تھا جا پہونچی۔

سپاہی۔ کہو سب خیریت ہے۔

موہیا۔ ہوں، دن بھر تو کوئی نہیں آیا۔

سپاہی۔ اچھا، تو اب اجازت ہے۔

موہیا۔ ابھی جلدی کیا ہے۔ رات اور گزر نے دو نا۔ اگر جانے پہ تلے ہی ہو تو بارہ بجے چلے جانا۔

سپاہی۔ موہیا۔ تم کتنی اچھی ہو۔ کیا میں تمہیں، تمہاری جرأت، محبت اور اُس سلوک کو کبھی بھول سکتا ہوں۔ آج رات تو رخصت ہونا ہی ہے

دونوں پر سکوت طاری تھا۔ مگر خاموشی گویا تھی۔ کہنے کو تو بہت کچھ تھا لیکن زباں پر کچھ نہ آتا تھا۔ موہیا غم اور ہیجان کا مجسمہ بن گئی تھی۔ یہ کیا تھا۔ کیوں تھا اُس کی نظریں سپاہی کو دیکھے ہی جا رہی تھیں۔ سپاہی خود بھی کھو سا گیا تھا اور اس کی نگاہ اس شمع پر تھی جو جل جل کر پگھل رہی تھی۔

موہیا نے اس خاموشی کو یوں توڑا۔ "گھر یاد آ رہا ہے؟" "نہیں" اس نے اپنا سر ہلا دیا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب کیف تھا۔ دونوں چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ اس کے مُنہ سے بس اتنا ہی نکلا تھا۔ "تم مجھ سے اگر کبھی ملنا چاہو تو......" کہ لیکایک کچھ دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ موہیا بھی ایک دم چونک سی پڑی۔ وہ لپک کر آگے بڑھی اور اس نے تختہ کو کھینچ لیا۔ نیچے دیکھتے ہی اس پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔

ایک کثیف اور بدہیبت فوجی بے رحمی سے اُس کی بہن تائیلان کو شکنجے میں لئے تھا۔ وہ بیچاری اس کے پنجے سے نکلنے کی ہزار کوششیں کر رہی تھی۔ مگر اس کی سعی بے سود ثابت ہوئی۔ ادھر اس کا چھوٹا بھائی اپنی بساط بھر اس کو چھڑانے کی کوشش میں لگا تھا۔ کبھی فوجی کو ٹھوکریں مارتا۔ کبھی مُنہ سے کاٹ کر زخمی کرتا۔ اس ہاتھا پائی میں وہ بھی زخمی ہو گیا اور اُس کی پیشانی سے خون نکلنے لگا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ تھائے نے اپنی بھرپور طاقت سے ایک بار پھر حملہ کیا۔ فوجی تلملا گیا۔ واقعات بڑی تیزی سے ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ آن واحد میں فوجی کے ہاتھ میں ایک آبدار ہتھیار نظر آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ننھے تھائے کے اوپر بجلی اب گری اور اب گری۔ موہیا ششدر تھی کہ کیا کرے کیا نہ کرے کہ اس کے کانوں کے

پاس سے ایک گولی سن سے نکل گئی۔ اس کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ سپاہی جہاں چھپا تھا وہاں سے نیچے آچکا تھا۔ اور یہ گولی اُسی کے ریوالور سے نکلی تھی۔ وہ حواس کھو چکی تھی۔ گولی کی اس آواز کی برداشت کی تاب اس میں نہ تھی وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔ مگر کسی کا مضبوط ہاتھ اسے سہارا دئے ہوئے تھا۔ اُس فوجی کا ہاتھ جو کسی کے خون کے لئے اُٹھا تھا بے حس ہو کر گرا۔ اُس کا سر بھی زمین پر آرہا اور قضا اُس کے سر سے کھیل گئی۔ موہیا کے کان میں پردیسی سپاہی نے کہا۔ "وہ مرگیا" ابھی اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ موہیا کے ہوش و حواس جیسے ہی درست ہوئے اُس نے اپنی بہن کو چمٹا لیا۔ وہ غریب اب بھی سہمی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔ ادھر بھائی کی پیشانی سے خون جاری تھا۔ سپاہی نے یہ دیکھتے ہی اس کی مرہم پٹی کی۔ سپاہی تماشائے کو نظرِ تحسین سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "اس ننھے سپاہی نے کیا کام دکھایا۔ سپاہی اس ننھے جانباز کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ موہیا اپنی بہن کو تسکین دینے میں مصروف تھی لیکن یکبارگی اس نے سپاہی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب کیا ہوگا۔" سب سے پہلے تو اس لاش کو دفن کرنا چاہیئے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ اب رات کے بارہ بجے تھے اور لاش کو یہ سب دفن کر چکے تھے۔ مٹی اس طرح ڈال دی تھی کہ ذرا بھی شک نہ ہوتا تھا۔ اب سپاہی نے موہیا کی طرف اور موہیا نے سپاہی کی طرف دیکھا۔

سپاہی۔ موہیا اب مجھے جانا ہی چاہیئے۔ مگر یہاں تم کیا کروگی؟"

موہیا خاموش رہی اور اپنے بھائی اور بہن کی طرف دیکھنے لگی کہ اُن کی کیا رائے ہے۔ اس کی بہن نے فوراً کہا کہ یہ راز چھپ نہیں سکتا۔ آج نہیں تو کل یہ قتل رنگ لائے گا۔ ہم لوگوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ بھائی خاموشی سے اپنی بہن کی تائید کر رہا تھا۔

"پردیسی!" آج پہلی بار موہیا نے اس طرح اس کو پکارا۔ اس کو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے ایک لفظ میں کتنے معنی پنہاں تھے۔

سپاہی اس کے قریب گیا اور اس کے شانہ پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

"موہیا، میری ایک بات سنوگی؟"

موہیا کے لبوں نے تو نہیں لیکن نگاہوں نے "ہاں" کہہ دی۔

سپاہی۔ اچھا تو سنو، تم بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔"

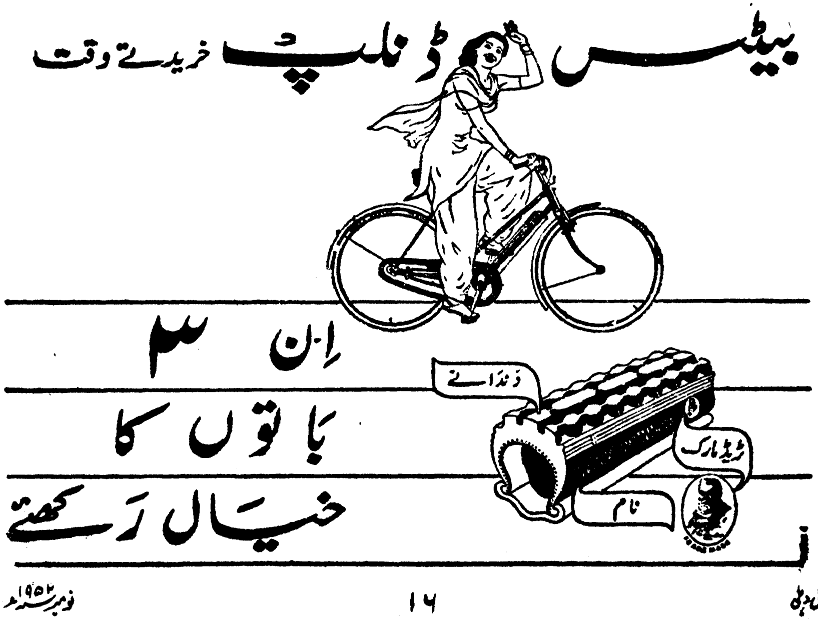

ظفر حسین خاں

مہدی علی خان، ذکی، ملک الشعراء

میری عمر کوئی سات آٹھ سال کی ہوگی جب گھر میں ایک انگوٹھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس پر ایک بڑا سا سرخ عقیقِ یمنی جڑا ہوا تھا اور اس پر یہ عبارت کندہ تھی "ملک الشعراء شیخ مہدی علی خاں ۱۲۶۵ھ" اسی کے ساتھ بزرگوں نے بتایا کہ میرے دادا کی مہر ہے جن کا ذکی تخلص تھا اور میرے والد کا نام "ذکی حسین خاں" اسی تخلص پر رکھا گیا تھا۔ مجھے "ملک الشعراء" کے معنے بھی بتائے گئے، حالاتِ زندگی سنائے گئے اور دو دیوان دکھائے گئے جن میں سے ایک قلمی اور دوسرا چھپا ہوا تھا۔ یہ میرا اپنے جدِ امجد ذکی مرحوم سے سب سے پہلا تعارف تھا۔

اس انکشاف پر سات آٹھ سال کے بچے کے تخیل نے جو رنگ بھرا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ اب بھی جبکہ نصف صدی کا فاصلہ حائل ہو چکا کچھ دھندلا سا عکس نظر آتا ہے کہ کس طرح باریک کاغذ پر مہر کی عبارت معکوس خط میں لکھ کر دن میں دھوپ اور رات کو لیمپ کے مقابل کاغذ کو پلٹ کر پڑھتا تھا اور کس طرح دل میں مشاعرے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ اور اپنی بساط کے موافق کچھ تک بندی کر کے اسی روز بزرگوں کے سامنے پیش بھی کی تھی لیکن مشیتِ ایزدی میں یہ میری سب سے پہلی اور سب سے آخری شاعری تھی۔ کاتبانِ قضا و قدر کا منشاءِ تحریر جیسا آگے چل کر کھلا، یہ تھا کہ قسمت میں شعر و سخن کے باغ و بہار کی سیر کی جگہ، فلسفے کے بیابان کی خاک چھاننا بدا ہے، جس کا سراب جتنا اس کے قریب جاتے جائیے، اتنا ہی پیچھے ہٹتا جاتا اور ہر بار نیا پیامِ تشنگی دیتا چلا جاتا ہے۔

غرض کہ جتنا زمانہ گزرتا گیا شعر و شاعری سے بُعد ہوتا گیا، کبھی عمرِ رفتہ کو واپس بلانے کے انداز سے، ذکی کے دیوان کی ورق گردانی کر لیتا تھا مگر کارکنانِ مشیت کو یہ بھی ناپسند ہوا چنانچہ دونوں دیوان یکے بعد دیگرے میرے ہاتھوں سے چھین لیے گئے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قلمی دیوان تو میرے عمزاد بھائی ابوالنصر نواب رشید الدین احمد خاں صاحب نے مانگ لیا اور پھر واپس نہ کیا اور دوسرا مطبوعہ دیوان ایک اور دوست کی نذر ہو گیا۔ دونوں بزرگ اب مرحوم ہو گئے۔ چار و ناچار ان کے ساتھ دیوانوں پر بھی فاتحہ پڑھ کے بیٹھ گیا۔

لیکن عمر کے ساتھ دل کی یہ خلش بڑھتی گئی کہ ذکی کا کلام کہیں سے ہاتھ آ جائے تو اسے طبع کرا دوں۔ تاکہ ان کا نام مٹنے نہ پائے۔ اتفاق سے ایک روز راجہ صاحب محمود آباد کے دولت کدے پر مولانا حسرت موہانی سے ملاقات ہو گئی یاد دلایا کہ انہوں نے "ذکی ملک الشعراء" پر اردوئے معلّی کا ایک اسپیشل نمبر نکالا تھا جس میں ردیف وار ذکی کے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا۔ مولانا موصوف کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں ذکی کا پوتا ہوں، بڑے محبت اور تپاک سے ملے اور وعدہ فرمایا کہ وہ مجھے ذکی کا سارا کلام جو ان کے پاس محفوظ ہے بھیج دیں گے۔ مجھے چاہیے یہ تھا کہ ان کے ہمراہ کانپور چلا جاتا۔ اور دیوان لے آتا لیکن شومیٔ قسمت نے مکاتبت کافی سمجھی اور انجام یہ ہوا کہ وہ بھی داغِ مفارقت کے ساتھ داغِ حسرت دے گئے۔ اس کے بعد پتہ چلا کہ ندوۃ العلما کے کتب خانے میں ذکی کا دیوان ہے۔ بے تابانہ منگا کر دیکھا یہ ذکی کے کلام کا انتخاب تھا جس کا مواد اردوئے معلّی کے اسپیشل نمبر سے بھی کم تھا۔ رامپور آ کر ریاست کے کتب خانے کو کھنگالا۔ یہاں کچھ نثر کے نایاب موتی تو دستیاب ہوئے لیکن نظم کے جواہر سے یہ خزانہ بھی خالی تھا اس کتب خانے میں داستانوں کی بڑی تقطیع پر پانچ قلمی جلدیں ہیں جو ۴۳۸۸ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان منشورات کا ذکر اپنے محل پر آگے آئے گا۔

ذکی مرحوم کے کلام کی دستیابی سے بالکل نا امید ہو چکا تھا کہ ایک روز خیال آیا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی قسمت آزمائی کروں۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب مجھے یہاں مطبوعہ کلیاتِ ذکی کا وہ نسخہ جو میرے

پاس تھا اور جو نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپا تھا دستیاب ہوا۔ اجازتِ طبع کے بعد اس کو چھپوا دینے کا قصد ہی ہے اگرچہ اب عمر اس منزل پر پہنچ چکی ہے جب نقشِ محبت بھی دل پر بار ہوتا ہے۔ بہر طور جس طرح ہو سکا اس فریضے کو انجام دینے کی کوشش کرونگا۔ اس سے پہلے مناسب معلوم ہوا کہ "آج کل" کی وساطت سے جو ہندوستان کے ایک نامور شاعر کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے ذکی کی بھولی ہوئی یاد کچھ تازہ کر لوں۔ حیاتِ مستعار کا کچھ اعتبار نہیں۔ کم از کم کچھ نقش تو باقی رہیں جو آئندہ تحقیق کو راہ بتا سکیں۔

پہلے ذکی کی زندگی کے متعلق جو مشہور تذکروں میں حالات درج ملے ہیں اور جو بزرگوں سے سُنے ہیں بیان کرتا ہوں۔ اس کے بعد اُن کے نثر و نظم کے خصوصیات عرض کروں گا اور اخیر میں اُن کے کلام کا نمونہ پیش کیا جائے گا۔

حالاتِ زندگی

خم خانۂ جاوید مؤلفہ لالہ سری رام ایم۔ اے جلد سوم صفحہ ۲۵۴ تا ۲۶۵ میں ملک الشعراء مہدی علی خاں ذکی کے مندرجۂ ذیل حالات پائے جاتے ہیں۔

"شاعر خوش مذاق مفتی مہدی علی خاں ذکی خلف شیخ کرامت علی کے بزرگ شیخ زادگانِ لکھنؤ سے تھے مگر اُن کا مولد و مسکن مراد آباد ہے۔ نواب محمد سعید خاں والی ریاست رامپور کے عہد میں برسوں وظیفہ خوار ریاست رہے پھر نواب غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں جا کر شیخ امام بخش ناسخ کی شاگردی اختیار کی اور نواب صاحب موصوف کی شان میں قصیدہ کہہ کر سنایا خلعت و انعام سے مالا مال ہوئے۔ پھر تھوڑے دنوں کے لئے دہلی آئے۔ ان دنوں نواب مصطفیٰ خاں بہادر متخلص بہ شیفتہ کے یہاں بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ آپ بھی اس جلسے میں شریک ہو کر موردِ تحسین و آفریں ہوئے۔ مگر ان دنوں دلّی اپنے حال میں مبتلا تھی۔ یہاں سے بھی دل برداشتہ ہو کر سہارن پور پہنچے لیکن دل اُچاٹ رہا۔ حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں دن رات چاندی سونے کی گنگا جمنا بہتی تھی۔ وہاں اُن کے کمال کی بھی قرار واقعی قدر دانی ہوئی۔ یہ بھی اپنے فن میں استاد مسلم الثبوت تھے نواب ناصر الدولہ نظام الملک بہادر والیٔ ریاست کی مدح میں دو دو عمدہ قصائد کہہ کر پیش کئے جن میں خوب خوب صنعتیں تھیں۔ اُن کو سُن سُن کر اہلِ دربار کیا وہاں کے تمام رؤسا ادب کے ساتھ پیش آنے لگے اور نواب صاحب بہادر نے خلعت سے مالا مال فرمایا۔ آخر کششِ حبِ وطن نے پھر اپنی طرف کھینچا اور مراد آباد آئے۔ چند روز بعد لکھنؤ پہنچ کر قطب الدولہ کی وساطت سے واجد علی شاہ کی سرکار میں ملازم ہوئے اور ملک الشعراء کا خطاب پایا۔ چنانچہ اُن کی مہر میں "ملک الشعراء شیخ مہدی علی خاں ۱۲۶۵ھ" کندہ تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد وطن میں خانہ نشین تھے کہ نواب یوسف علی خاں نے ان کے کمال کا شہرہ سُن کر اپنے دربار میں طلب کیا۔ چنانچہ رامپور چلے گئے اور جب تک نواب "ناظم" زندہ رہے وہیں رہے۔ ان کی وفات کے بعد وہاں سے دل اُکتایا اور ۱۲۸۲ھ میں انبالہ پہنچے۔ دو برس کچھ مہینے وہاں قیام کو گزرے تھے کہ پیامِ اجل آپہنچا۔ ماہ ذیقعد ۱۲۸۳ھ قضا کی۔ انتخابِ یادگار میں اُن کی تاریخِ وفات ۱۲۸۱ھ درج ہے۔ مگر غلط ہے۔ یہ صاحبِ سخن، مورخِ بے بدل، فاضلِ بے مثل، شیریں سخن، ظریف اور زود فکر تھے۔ طرزِ سخن نہایت دلفریب اور پسندیدہ ہے۔ ایک رسالہ عروض و قوافی میں مسمی بہ یادگیر ۱۲۶۵ھ میں مرتب کیا تھا۔ کلیاتِ ذکی عرصہ ہوا نولکشور نے اپنے مطبع سے شائع کیا تھا۔"

تذکرۂ انتخابِ یادگار مصنفۂ امیر مینائی مرحوم جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، مندرجہ ذیل احوال کا حامل ہے۔

"ذکی شیخ مہدی علی ابن شیخ کرامت علی مراد آبادی حضرت جنت آرام گاہ طاب ثراہ کے عہد میں برسوں اس سرکار فیض آثار کے نمک خوار رہے۔ چندے لکھنؤ چلے گئے پھر حضرت فردوس مکان انار اللہ برہانہ کے عہد میں نوکر ہو کر موردِ افتخار رہے۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگردوں میں نامور تھے۔ بہتر برس کی عمر پائی۔ ۱۲۸۱ھ میں انبالہ گئے۔ ذیقعد کے مہینے میں انتقال ہوا۔ وہیں دفن ہوئے ...."

۱۲۸۱ھ کو صاحبِ خم خانۂ جاوید نے غلط قرار دیا ہے۔ اس حساب سے عمر پچھتر سال اور سنہ ولادت ۱۲۰۸ھ مطابق ۹۴-۱۷۹۳ء نکلتا ہے اور ماہ و سنہ وفات ذیقعد ۱۲۸۳ھ مطابق مارچ ۱۸۶۷ء قرار پاتا ہے

تذکرہ سخن شعرا مصنفہ عبدالغفور خاں نساخ میں یہ مختصر حال ملتا ہے۔

"ذکی تخلص شیخ مہدی علی مراد آبادی خلف شیخ کرامت علی واجد علی بادشاہ لکھنؤ نے اُن کو ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ صاحب دیوان ہیں شعر اچھا کہتے ہیں"

گلستانِ سخن مؤلفہ شہزادہ مرزا قادر بخش بہادر صابر دہلوی میں یہ تذکرہ ہے۔

"ذکی تخلص محمد مہدی علی ساکن مراد آباد مردِ شیریں سخن، ظریف طبع، خوش کلام، تیز فکر، طرز سخن اس کی دل پسند۔ مادہ تاریخ بہم پہنچانے میں بے مثل و مانند۔ بیشتر لکھنؤ میں رہا۔ اور اربابِ کمال کی ملاقات سے فیض یاب ہوا۔

ایک عرصہ ہوا کہ نواب مصطفےٰ خاں بہادر شیفتہ کے مکان میں بزم شعر خوانی منعقد ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں یہ سخن سنج بھی دہلی میں وارد تھا۔ راقم نے ایک روز مشاعرے میں اس کی صورت سے آشنائی اور اس کے سخن سے دلبستگی بہم پہنچائی۔ اب ایک مدت سے اس گزمین میں قدم رنجہ نہیں کیا۔ یہ اشعار اس کے نتائج افکار سے مرقوم ہیں"۔

"تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا مؤلفہ سعادت خاں ناصر لکھنوی مرتبہ ۱۲۶۲ھ میں جس کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو اور دوسرا نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے ذکی کا نام ناسخ کے شاگردوں میں دیا ہے۔ حالی کے تذکرے مثلاً تاریخ اردو رام بابو سکسینہ مذکورہ بالا مستند تذکروں سے ماخوذ ہیں لہذا اُن کا اقتباس غیر ضروری سمجھ کر قلم انداز کیا گیا۔ تذکروں میں تخلص ذکی ذال اور زے دونوں سے لکھا ہے لیکن ذال سے صحیح ہے۔

اکثر تذکروں میں ذکی کو ناسخ کا شاگرد بتایا گیا ہے لیکن خاندانی روایات کی شہادت یہ ہے کہ ذکی طبع زاد شاعر تھے چنانچہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں جب لکھنؤ پہنچے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ناسخ کی شاگردی اختیار کی۔ اس سے قبل نواب محمد سعید خاں والیٔ ریاست رامپور کے دربار سے برسوں شاعر کی حیثیت سے وابستہ رہ چکے تھے اور ایک پختہ و بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے شہرت کے مالک تھے۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں ناسخ کے وہاں شعر و سخن کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ اپنے کلام کی داد لیتے اور دوسروں کے کلام کی داد دیتے تھے۔ ناسخ نہایت محبّت سے پیش آتے تھے وہ خود بھی کسی کے شاگرد نہ تھے اور ذاتی تجربہ سے جانتے تھے کہ شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے جس کی تخلیق میں استاد کا ہاتھ تک نہیں ہوتا۔

شجرہ نسب براہ راست نواب عظمت اللہ خاں عضد الدولہ یمین الملک جو شاہان مغلیہ کے زمانے میں صوبہ سنبھل مرادآباد کے گورنر تھے پہنچتا ہے۔ حالانکہ خاندان میں نام کے ساتھ "نواب" لکھنے کا عام رواج ہے مگر وہ اگر کوئی لکھتا تھا تو بُرا مانتے اور منع کرتے تھے۔ ہاں البتہ "خاں" اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے اگرچہ ایک حیثیت سے یہ بھی خطابی ہے اس لئے کہ ہم لوگ شیخ ہیں مگر یہ کثرت استعمال سے نام کا جزو بن گیا ہے

۱۸۵۷ء کے زمانے میں ہماری جائدادیں ضبط ہوئیں اور بعض اراکین خاندان کو نہایت بے رحمی سے سزائے موت دی گئی۔ چنانچہ جیسا کہ مرادآباد کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں مذکور ہے نواب مجید الدین احمد خاں (عرف مجو خاں) کو جو ذکی کے عمو زاد بھائی تھے، جلتے چونے کے تغار میں دھکیل کر ہلاک کیا گیا۔ ذکی اس شورش کے زمانے میں کپور تھلے میں تھے۔ مہاراجہ کپور تھلہ نے ان کی صفائی میں گواہی دی جب جان بچی اور جائداد کی واگزاری کا حکم ہوا لیکن ہماری اس جائداد کے عوض جو ضبط ہو کر دوسروں کو بطور انعام دی جا چکی تھی ممالک متوسط میں صحرائی جائداد دی جا رہی تھی جس کے لینے سے ذکی نے انکار کیا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں وہ گورنر جنرل سے ملنے ملتان جہاں صاحب موصوف دورہ کر رہے تھے گئے ہوئے تھے ایک قدیم غلام ہمرکاب تھا اس نے زہر دے دیا اور نقد و جواہر لے کر بھاگ گیا۔ یہ بھی سنا کہ مقامی عقیدت مندوں نے ذکی کا ایک بہت اچھا مزار تعمیر کرا دیا تھا۔ تذکروں میں ذکی کی وفات انبالے میں دکھائی گئی ہے۔ اس مسئلے کا فیصلہ آثارِ مزار اگر باقی ہوں تو بآسانی ہو سکتا ہے۔ رسالہ "یادگیر" ملتان ہی میں چھپا ہے۔ جائے وفات کی تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ امید ہے کہ کلیات کے طبع ثانی تک یہ امر قطعی طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وفات انبالہ ہوئی یا ملتان میں۔ بتایا یہ بھی جاتا ہے کہ انبالے سے ملتان گئے تھے وہاں اچانک انتقال ہو گیا۔ چنانچہ والد ماجد نے شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کے موقع پر جب واگزاریٔ جائداد کے متعلق عرضداشت کی تجدید کی ہے تو اس میں ملتان میں وفات پانے اور گورنر جنرل سے ملاقات نہ ہو سکنے کا ذکر ہے۔

تصنیفات ذکی منشورات۔

نثر میں مشہور رسالہ عروض ہے جس کا نام "یادگیر" ہے اس کا ایک نسخہ میرے پاس ہے۔ یہ رسالہ "مطبع ریاضیئہ ملتان میں بہ اہتمام منشی محمد مہدی حسین خاں چھپا ہے" رسالہ کے دیباچے میں ذکی لکھتے ہیں کہ یہ رسالہ "بعد فراغ تالیف شرح معیار الاشعار" لکھا گیا ہے تاکہ عوام اردو داں کو سہل پیرائے میں فنِ عروض کے مطالب بتلائے جا سکیں۔ شرح معیار الاشعار میرے دیکھنے میں نہیں آئی اور نہ بزرگوں سے کچھ اس کے متعلق سنا ہاں البتہ یہ سنتا تھا کہ انہوں نے نثر میں کچھ داستانیں بھی لکھی ہیں چنانچہ اس کا ثبوت رامپور کے کتب خانے سے ملا۔ انہوں نے پانچ ضخیم داستانوں کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ میں اس باب میں جناب عرشی مہتمم کتب خانہ مذکور کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے کاوش کی تسکین میں ہر امکانی اعانت فرمائی۔

تیسری داستان کا نام سحر نامہ ہے۔ یہ بھی بوستانِ خیال سے ماخوذ ہے اور ۷۴۸ صفحوں کی ہے۔

چوتھی داستان موسوم بہ طلسم حیرت کدہ آصفی، ۸۴۰ صفحوں کی داستان ہے۔ اس کی بنا بھی بوستانِ خیال پر ہے

یہ چاروں داستانیں جو بڑی تقطیع پر قلمی خط نسخ میں لکھی ہوئی ہیں نواب سید محمد سعید خاں بہادر جنت آرام گاہ، والیِ ریاست رام پور کی فرمائش پر ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء لکھی گئی تھیں۔ ذرا غور کیجئے ایک سال کے اندر ۲۲۶۴ صفحوں کا دفتر قلم بند کر دینا، جب کہ شاید بعض ادبا کے کل زندگی کی کائنات اتنے صفحوں پر محیط ہو، کس دل و دماغ کا پتہ دیتا ہے۔ پھر بعض داستانوں کے آخر میں اپنی پریشان خاطری کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ طلسم سعید کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں "بناً علیٰ ہذا اس نالائق روزگار نے بجا آوریِ امر خداوند نعمت پر کمرِ ہمت استوار باندھ کر عرصہ میں چار مہینہ اور کئی روز کے قصہ طلسم جام جم۔ بزیادتی و نقصانِ بیش و کم ترجمہ کیا"۔ یہ داستان ۲۱۱۹ صفحوں کی ہے۔

پانچویں داستان مالا باختر ہے۔ یہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کی فرمائش پر لکھی گئی۔ یہ داستان بھی بڑی تقطیع پر ۱۲۶۲ صفحوں کی ہے۔

طلسم سعید جو ۱۸۴۲ء میں لکھی گئی تھی اور جس کو اب ایک سو دس برس ہونے کو آئے، بغیر کسی ارادہ و اہتمام کے ایک صفحہ کھولنے پر یہ عبارت نظر آئی۔

"اُن میں ایک فقیر کو دیکھا کہ تاج بہت لمبا نوکدار اُن کے سر پر تھا، اور سیل منکا ٹھنکا، ہاتھ گلی میں پڑا ہوا، تسمہ چمڑے کا کمر سے بندھا ہوا، غرفی کھنچی ہوئی، بدن خشک۔ ریش و بروت سفید، مگر چار ابرو کی صفایہ" (معلوم نہیں یہ "کی" کاتب صاحب کی عنایت ہے یا اُس زمانے میں "چار ابرو کا صفایا" کی جگہ "چار ابرو کی صفایہ" بولتے ہی تھے) صفحات پر نمبر نہیں ہیں۔ اس لئے صفحے کا حوالہ نہیں دے سکتا۔ کتب خانے میں مخطوطات کا ایک علیحدہ رجسٹر ہے جس میں ہر مخطوطہ کے صرف کل اوراق کی تعداد درج ہے۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سو برس پہلے کی زبان ہے۔ اس زمانے کے نثر کے نمونے یہ ہیں۔

(۱) یہ نامہ ہے بندۂ خدا پسر تیرے سکندر کی طرف سے کہ مدتِ اندک اور زمانہ قلیل میں اہلِ زمین کے ساتھ بے حد رفاقت کی اور اب بھی زمانہائے دراز اور قرنہائے بے شمار، مجاورتِ اہلِ آخرت کرے گا۔ بسوئے والدہ کہ سرائے غربت میں مواصلت اور ملازمت اُس کی سے متمتع نہ ہوئے۔۔۔۔" (عجائب القصص ترجمہ سید باقر حسین ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء، ماخوذ از تاریخ نثر اردو، مرتبہ احسن مارہروی)

(۲) "سید فضل علی بن شاکر علی ۔۔۔۔۔ رہنے والے قدیم شاہجہاں آباد کے کہ استاد پڑھانے اور لکھوانے میں بادشاہزادوں کے ہوتے رہے ہیں۔ اور اب بھی اسی خدمت پر بجائی صاحب اعلیٰ درجات اوپر نوکری روزگار بیچ سرکار بادشاہ کے جلوہ گستر ہیں" (مفید الاجسام مصنفہ سید فضل علی، ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۴ء، ماخوذ از تاریخ نثر اردو)

(۳) "اب سنا چاہیئے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاعر شاگردِ رشید ناسخ صاحب کے ہیں اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے ہوئے تھے اور وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعہ کا تھا، اور اُس کے مصنف کی فکرِ رسا پر سب نے زبانِ ثنا کھولی تھی" (ترجمہ انوار سہیلی موسوم بہ بستانِ حکمت ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء ماخوذ از داستانِ تاریخ اردو مصنفہ حامد حسین قادری)

انوار سہیلی کے اس ترجمے میں جا بجا فارسی اور عربی الفاظ و تراکیب مترجم نے بدستور اختیار کر لی ہیں۔ اس لئے کہ اس زمانے کا طرز ہی یہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ اردو نثر میں قدامت کی جھلک سر سید احمد خاں تک کے نوشتوں میں پائی جاتی ہے۔ الفاظ کی صحیح و باقاعدہ ترتیب، نذیر احمد اور حالی کے زمانے سے شروع ہوئی اور مولانا شبلی مرحوم نے سب سے پہلے سنجیدہ ادب کا اسکول قائم کیا جس کے روایات پر دار المصنفین اعظم گڈھ چل رہا ہے۔ سنجیدہ مضامین لکھنے والوں کا اب وہی شائل ہے جو دار المصنفین کا ہے۔

مذکورۂ بالا قدیم نثر اردو کے نمونوں سے جب ذکی کی تحریرات کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کم و بیش آج کل کی سی منجھی ہوئی زبان بول رہے ہیں جس سے اُن کے ذوقِ سلیم کی پیش بینی کا پتہ چلتا ہے۔

ذکی کی خصوصیاتِ شاعری

ہر زمانے میں شعر کے کچھ مقررہ و مروجہ محور ہوتے ہیں۔ چنانچہ ذکی کے زمانے میں شاعری کا مدار حسن و عشق، گل و بلبل، نالہ و فریاد، زحمتِ انتظار،

رقابت، وعدہ و پیام ۔ نامہ بری ۔ شب وصل وہجر ۔ ساقی ، زاہد وغیرہ پر تھا ۔ ہر شاعر انھیں تصورات کے تحت طبع آزمائی کرتا ۔ نئے نئے معنی آفرینیاں کرتا ، اور اچھوتے مضمونوں سے اپنے کلام کو آراستہ کرتا ۔ لیکن اگر غور کیجئے تو ہر زمانے کے رائج الوقت تصورات شاعری کی تہ میں کچھ ایسی اٹل قدریں پوشیدہ ہوتی ہیں جو ریاضی ، منطق اور اخلاق کے بنیادی تصورات یا مقولات (Categories) کی طرح زمان و مکان کی قید سے آزاد ، ہر ملک ، ہر زمانے میں ہر شخص سے خراج قبول و تسلیم حاصل کرتی ہیں اور یہ جواہر ہیں انھیں وقتی و عارضی نگینوں میں ملے جلے مل جاتے ہیں ۔ حال ہی ایک جرمن فلسفی (Pfeiffer) پفائفر نے اپنی معرکہ آرا تصنیف

Zwischen Dichtung Und Philosophie

(درمیانِ شاعری و فلسفہ) میں اِن مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے ۔ اِس کتاب کا جرمن سے ابھی کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ہے ۔ جی چاہتا تھا کہ اسے اردو کے لباس میں پیش کروں ۔ اس لئے کہ یہ کتاب بہتوں کے ذہنی کش مکش کی آئینہ دار ہے ۔ لیکن فرصتِ عمل کم ، اور کام بہت ۔ کوئی کیا کرے اور کیا نہ کرے ۔

یوں تو ماہیت شعر کے متعلق صدیوں سے ہر زبان میں موشگافیاں ہوتی آئی ہیں لیکن غور کیجیے تو ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ شاعری نتیجہ ہے دو ذہنی عملوں کے امتزاج کا ۔ جن میں سے ایک عمل ، حرکت صعودی اور دوسرا حرکت ہبوطی کا حامل ہے اور شاعری کا سارا مدوجزر اسی ذہنی چڑھاؤ ، اُتار کے اندر محدود ہے ۔ اس مسئلے کے حل کے لئے ذکی کا ایک شعر لیجئے ۔

غبارِ قیس میں جاں آگئی ٹھوکر سے لیلیٰ کی
اُڑا جاتا ہے مجنوں بن کے ہر ذرہ بیاباں کا

(۱) عامیانہ اور ٹھیٹ مادی نظر میں صورتِ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ ریگستان میں بگولہ اُڑا جا رہا ہے ۔

(۲) شاعرانہ نظر عالم صوری کی اس مادی مشاہدہ کی زمین سے اُڑکر عالم معنوی کے آسمان پر پہونچتی ہے ۔ جہاں وہ اس حقیقت کا تماشا کرتی ہے کہ یہ بگولہ دراصل غبارِ قیس ہے جس کو لیلیٰ کی ٹھوکر کی مسیحائی نے حیاتِ تازہ بخشی ہے ۔ چنانچہ غبار کے ذرے ، ذرے نہیں ، بلکہ نورِ حیات سے لبریز مجنوں ہیں جو اِدھر اُدھر اُڑے جا رہے ہیں ۔

(۳) عالم معنوی کی اس بلندی پر پہونچ کر شاعر عالم صوری کی جانب پھر اُترتا ہے ۔ یعنی اپنے معنوی تاثرات کو شعر کی محسوس شکل میں پیش کرتا ہے ۔ یہ سب سے زیادہ کٹھن منزل اور اس کے آرٹ کی جان ہے ۔ عالم شاعری کا مرکز ثقل ، مادی دنیا کے مرکز ثقل کے برعکس ہے جہاں چڑھنا نسبتاً آسان ہے لیکن اترنا نہایت مشکل ہے ۔ دل و جگر خون کرنا ہوتے ہیں ۔ تب کہیں شعر موزوں ہوتا ہے ۔ سقراط کے نزدیک فلسفے کا بھی سب سے زیادہ مشکل کام یہی تھا ۔ یعنی فلسفے کے تارے آسمان سے توڑ کر زمین پر اُتار لانا ۔

(۴) اب عالم صوری کے دو مظہر ہوئے ، ایک تو وہی بگولہ اور محض بگولہ جو اِدھر آیا اور اُدھر ہوا ہُوا ، اور دوسرے ذکی کا شعر جس کو شاعر نے بگولے کے اندر معنویت و موزونیت کی رُوح پھونک کر پیش کیا ہے ۔ اِن دونوں کے تقابل سے شعر کا اثر یا اس کی تڑپ کا احساس ہوتا ہے جیسے محسوس کرکے شعر کا ہر سننے والا سر دھننے لگتا ہے ۔ شعر اس منزل پر پہونچ کر شاعر کی انفرادی کیفیت کی حد سے نکل کر اب پبلک جنس بن جاتا ہے ۔ صورت اوّل یعنی بادِ ہوا بگولہ کے مقابلے میں ، صورت دوم یعنی شعر کو ایک ایسی چٹان سمجھئے کہ جس پر صدیاں گزر جاتی ہیں اور وہ اپنی جگہ قائم رہتی ہے ۔ اس لئے کہ صورتِ دوم کے اندر کچھ دائمی قدریں کار فرما ہیں ۔ جو صفحۂ ہستی پر اُس کے ثبات و قیام کی ضامن ہیں ۔ وہ قدریں کیا ہیں ؟ یہ ایک نہایت دقیق مابعد الطبعیاتی بحث ہے ، جسے کسی اور صحبت کے لئے اُٹھا رکھئے ــــ فی الحال سہولت فہم کے لئے اس شکل کو ملحوظ رکھئے ۔ اس لئے کہ مسئلہ کے تمام مابعد الطبعیاتی حقائق و علائق کا ڈھانچا اِس شکل میں آگیا ہے ۔

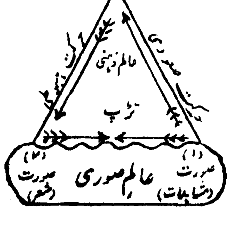

زبان کی صفائی ۔ بندش کی چستی ، محاورے کی چاشنی ، ذکی کے کلام کے خاص جوہر ہیں ۔ لیکن اُن کا سب سے بڑا کمالِ شاعری تاریخ گوئی ہے ۔ نواب ناصر الدولہ نظام الملک والیِ حیدرآباد دکن کی تاجپوشی کے موقع پر ذکی نے ایک قصیدہ فارسی

فارسی میں کہا تھا۔ اس وقت اُن کا قیام کلکتے میں تھا جس کے متعلق ہے کہ "مصنف ہنگامِ ورودِ شہر کلکتہ قصیدہ مدح و این تاریخ تصنیف کردہ بودند کہ مہتمم اخبار جامِ جہاں نما این ابیات دراخبار چھاپہ کردہ بود ....." رسالہ یادگار کا نسخہ جو میرے پاس ہے اُس کے حاشیے پر بارہ بیت اور ایک مصرع توشیح قصیدہ کے صنائع و بدائع کی تشریح کے ساتھ قلمی درج ہیں، اُسی کا آخری ٹکڑا اوپر نقل کیا گیا ہے اس قصیدہ کی صنعت کا ماحصل یہ ہے کہ (۱) ہر مصرع سے جدا جدا تاریخ نکلتی ہے (۲) ہر بیت کے حروف منقوط و غیر منقوط جداگانہ مادۂ تاریخ کے حامل ہیں۔ (۳) ہر بیت کے مصرع اوّل کے حروف منقوط اور مصرع ثانی کے حروف منقوط سے تاریخ نکلتی ہے (۴) ہر بیت کے مصرع اوّل کے حروف غیر منقوط اور مصرع ثانی کے حروف منقوط مادہ تاریخ بہم پہنچاتے ہیں (۵) صرف یہاں تک بس نہیں بلکہ "این امر بمصرعہائے متفقہ بیت بیت مختص نیست بلکہ از مصرع اوّل تا مصرع توشیح بہر مصرع کہ ربط دہند مادہ تاریخ (۱۲۴۴ھ) برمی آید"! اسی کے ساتھ چونکہ جلوس ممدوح ستر ھواں تھا زبر و بینات کے قاعدے سے وہ بھی مادہ تاریخ نکلتا ہے۔ کلیات میں یہ قصیدہ بہ تفصیل صنائع و بدائع شامل ہے۔

وزن و قافیہ کی پابندی اور دیگر محاسنِ شعر کو قائم رکھنے کے شرائط کے ساتھ ساتھ الفاظ کا ایسا انتخاب کہ قصیدے کے ہر گوشے سے مادۂ تاریخ نکلتا ہو، قدرتِ کلام کا ایک حیرت انگیز معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟

آیئے اب محفلِ مشاعرہ برپا ہو۔ دیوان میرے پیشِ نظر نہیں اور نہ مولانا حسرت موہانی کا وہ انتخاب میرے پاس ہے جو اردوئے معلّٰی میں شائع ہوا تھا۔ اس لئے تذکروں میں دبے ہوئے شعر اِدھر اُدھر سے سناتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ تذکروں کے شعر، شعریت کے اعتبار سے انتخاب نہیں ہوتے۔ اگر تذکرہ نویس کسی شاعر کا پورا کلام پڑھ کر، نمونہ پیش کرے تو شاید میرؔ ہی کے دیوانوں میں اُلجھ کر رہ جائے اور تذکرہ میرے آگے نہ بڑھے، اس لئے تذکرہ نویس یہی کرتے ہیں کہ تذکرہ لکھا اور شاعر کے دیوان کے ورق اُلٹ پلٹ کر چند شعر دیدئے۔ اس پر میری ناواقفیتِ فن کا اور اضافہ کرلیجئے۔ ان دونوں خرابیوں کے باوجود ذکیؔ کے کلام میں کچھ خوبیاں نظر آئیں تو سمجھ لیجئے کہ ان کا جنسِ سخن سو برس کے بعد بھی ہر کسادبازاری کا حریف ہے۔

ہوا ہے آفتابِ صبح شعلہ داغِ پنہاں کا
بنا تارِ شعاعی تار تار اپنے گریباں کا

غبارِ قیس میں جاں آگئی ٹھوکر سے لیلیٰ کی
اُڑا جاتا ہے مجنوں بن کے ہر ذرّہ بیاباں کا

سمجھ کر ساقیِ دریا دل ان باتوں کی چھاؤں
زباں شوخی دکھاتا ہے ہر اک کانٹا بیاباں کا

بہار آئی ہے قاصد جی میں ہے ورہ کریہ آتا ہے
کہ جائے نامہ بھیجیں یار کو پرزہ گریباں کا

اسے نامہ بر جو پڑھ کے وہ خط ہو رہیں خموش
زنہار تو سوال نہ کرنا جواب کا

گزرے فراقِ یار میں افسوس یہ بہار
دل پر رہے گا داغ شبِ ماہتاب کا

وحشت ہے آشکار زلیخا کے حال سے
آنکھیں بیان کرتی ہیں افسانہ خواب کا

بسے ہوئے تھے دلوں میں ہزار ہا نیرنگ
طلسمِ ہستیِ موہوم اک بہانہ ہوا

شمع گل ہونے لگی یارانِ محفل اُٹھ گئے
ایک میں رونے کو تنہا انجمن میں رہ گیا

سوچ میں تعبیر کے یوسف کو نیند آنے لگی
ماجرا خوابِ زلیخا کا عجب افسانہ تھا

غفلت میں کام دل نہیں بے جستجو ملا
اپنی تلاش تھی کہ نصیبوں سے تو ملا

چل بسے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گئے
جابجا اُلجھے ہوئے کانٹوں میں داماں رہ گئے

نہ پائے خستہ جاں مجھ سا جو ڈھونڈھے
فلک خورشید کی مشعل جلا کر

خوں ہو دلِ بیقرار کب تک؟
آنسو ہو گلے کا ہار کب تک؟

بُو ہے غنچے میں نہاں یا ترے ہونٹوں پہ ہنسی
مے شیشے میں پری ہے کہ حیا آنکھوں میں

اے رب کیا ہے کہ کانٹا سا کھٹکتا ہے دل کی
یہ وہی دل تھا کہ رہتا تھا سدا آنکھوں میں

وحدت ہے درمیاں تو پھر اے دل دوئی کہاں
شوقِ وصال ہے تو سمجھ لے کہ تو نہیں

دیر سے کچھ خبرِ خاطرِ ناشاد نہیں
دل کہاں بھول گیا ہوں یہ مجھے یاد نہیں

شاید چلی ہے جنبشِ دامانِ یار سے
آتی ہے بوئے نازنسیم بہار سے

گلدستہ بن کے آنکھوں سے گرتے ہیں لختِ دل
یہ ہار گوندھے جاتے ہیں اشکوں کے تار سے

ہم کو ملا کے خاک میں بھی تم ہوئے نہ صاف
دل میں وہی غبار ہے اس خاکسار سے

طرزِ سخن سے رنگ ٹپکتا ہے اے ذکیؔ
گویا زبان دعویٰ ہے خونِ ہزار سے

یہ چمن کی خاک میں ہے اثر نمِ اشکِ بلبلِ زار سے
کہ جنوں کی لہر سی اُٹھتی ہے رگِ گُل میں خونِ ہزار سے

محشر نے آکے قبر میں تڑپا دیا مجھے
کس کی خرامِ ناز کا دھوکا ہوا مجھے

زمیں سے لالہ نکلتا ہے داغ کھائے ہوئے
بہارِ عشق کے ہیں یہ بھی گُل کھلائے ہوئے

پیری و عہدِ شباب آہ خرابی میں کٹے
شبِ غم دیکھ چکے، صبحِ الم دیکھ چکے

گلا ہے غمِ فراق، گہے آرزوئے وصل
کیا کیا ہو دل لگی جو کہیں دل لگا ہے

دل ہم سے جدا رہا ہمیشہ
گویا وہ ضمیرِ منفعل ہے

جوگندر پال

تماشا گر سا

شگفتہ چہرہ، شریر آنکھیں اور چمکتی ہوئی کشادہ پیشانی جس پر ہمیشہ بالوں کی ایک لٹ گری ہوتی۔ اُسے دیکھنا تو ایک طرف رہا۔ اُس کے خیال ہی سے لبوں پر مسکراہٹیں ناچنے لگتیں اور ذہن میں کوئی ہلکا پھلکا سا ریکارڈ بجنے لگتا۔

ٹریننگ سنٹر میں گھوش ہمارے ساتھ ہی پڑھایا کرتا تھا۔ طلبا اور اسٹاف میں وہ یکساں ہر دل عزیز تھا۔ جوں ہی کہ وہ اسٹاف روم میں قدم رکھتا تھکن اور بیزاری دونوں کسی بھوت کی طرح جادر اُوڑھ کر آناً فاناً غائب ہو جاتیں۔

"ہیلو، سُنا تم نے۔ چائے کے پیکٹ کی قیمت میں اڑھائی شلنگ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میں تو اب چائے کی بجائے برانڈی ہی پی کر سنٹر آیا کروں گا۔"

کئی پروفیسر مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے۔

"برانڈی کا بھاؤ حسبِ معمول ہے"۔ وہ اپنے پائپ میں تمباکو ڈالتا ہوا کہتا۔ "اگر پرنسپل نے میرے برانڈی پی کر سنٹر آنے پر اعتراض کیا تو میں اُسے افسرانِ اعلیٰ کی اگلی میٹنگ میں کاسٹ آف لِونگ الاؤنس بڑھانے کی سفارش کرنے کے لئے کہوں گا۔"

سب ہنسنے لگتے۔

"مسٹر سنگھ" وہ موہن سنگھ کے پاس آ بیٹھتا، جو ابھی تک لمبا سا منہ بنائے اخبار پر جھکا ہوتا، "آخر تم اخبار پڑھتے ہوئے اتنے سنجیدہ کیوں نظر آتے ہو؟"

موہن سنگھ مجبوراً اپنے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ لا کر اپنا سر اوپر اٹھا لیتا۔

"کل جو میں گھر پہنچا وہ اپنا جسم کرسی پر پھیلائے پائپ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے کہتا، "تو بیٹھتے ہی بے اختیار ہنسنے لگا۔ میری بیوی حیر سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ تم بھی ہنسو، میں نے اُسے کہا، بچوں کو بُلا کر انھیں بھی کہو کہ وہ زور زور سے ہنسیں، یقین کرو بھائی، گھر پہنچ کر ان چُپ چاپ متین چہروں کا خیال آتا ہے تو ہنسی روکے نہیں رُکتی، معلوم نہیں ہم پڑھے لکھے لوگ تعلیم کا ماحصل اپنی ریاکارانہ سنجیدگی کیوں سمجھتے ہیں؟" وہ اخبار موہن سنگھ سے اپنے ہاتھوں میں لے لیتا اور وہ بیچارہ احمقانہ طور پر ہنستے ہوئے اپنی الجبرا کی کتاب کھول لیتا۔

"مسٹر گھوش، دیکھو تمہاری پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی" ٹھگنا سا بھٹ کہتا "میں نے نہیں کہا تھا کہ اب کے الیکشن میں چرچل کا ہاتھ بھاری رہے گا؟ تمہیں واقعی لیبر کی شکست پر بہت افسوس ہو گا"

"ہونہہ، افسوس، بھلا وہ کیوں؟ جو وہ جیت جاتے تو یقیناً خوشی کا مقام تھا، کیونکہ میں ایک مزدور ہوں، اب جو ٹوری جیت گئے ہیں تو بھی میں خوش ہوں۔ کیونکہ اب میں نے اپنا ایک خوبصورت مکان بنوا رکھا ہے۔ میرا بنک بیلنس بھی کافی ہے۔ میرا خیال ہے ہر عقلمند انسان کی طرح مجھے بھی ایک ٹوری ہو جانا چاہیئے، نہیں تو ———"

"ٹرن کوٹ!" منحنی اور زرد رو دایا بھائی اُسے ٹوکتا۔

"دنیا کا ہر کامیاب انسان ایک ٹرن کوٹ ہے، میرے بھولے دایا بھائی ـــ اگر میں بھی تمہاری طرح اصول پسند ہوتا تو بے چارگی کی صورت بنائے تمہاری زردی اور کمزوری کا شریک ہوتا۔"

"گڈا ولڈ گھوش" میں اُس کے پائپ سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا، "میرا خیال تھا کہ انگلستان میں ایک سال کے قیام سے تم پر انگریزی رسومات کا ملمع چڑھ جائے گا۔ لیکن تم تو سر سے پاؤں تک وہی ہو، وہی تماشہ گر سے۔"

"مسٹر پال" وہ متبسم آواز میں جواب دیتا "یہ تو انگلینڈ تھا۔ انسان

دوسرے جہان میں پہنچ کر بھی اپنی فطرت نہیں بدل سکتا۔ اگرچہ ہم اپنی معصوم فطرت کو مصنوعی عادات کا لباس پہنا کر اسے بڑے فخر سے ڈنر پارٹیوں میں لے جاتے ہیں۔ لیکن دیکھنے والی آنکھ فوراً ہی اس مرصع لباس کو چاک کر کے ہماری فطرت کو ٹٹول لیتی ہے اور پھر اس انکشاف پر کانٹے چھری سے ایک لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے ہم ایک بھدی سی ہنسی ہنس دیتے ہیں۔ کیا یہ گدھے پن کی انتہا نہیں ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے بھائی۔ لیکن شاید تم بھولتے ہو کہ ماحول کے زیر اثر کسی بھی انسان کے لئے کوئی نہ کوئی عادت قبول کر لینا لازم ہے؟"

"مگر ان عادات کو اپنی فطرت کے مطابق ہونے دو۔" وہ فوراً دلیل قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔ "تاکہ تمہاری عادات تمہاری فطرت کو مزید ابھارنے کا ذریعہ ہو جائیں، ماحول کے زیر اثر اپنی فطرت کو چند مصنوعی عادات سے ڈھانپنا اپنی قدرتی صلاحیتوں کا گلا گھونٹنا ہے۔"

"تم سمجھتے ہو کہ ہم سب واقعی تمہاری باتوں کو بڑے غور سے سن رہے ہیں؟" کھنہ اسے چڑانے کی خاطر کہتا گویا اسے یقین ہوتا کہ اب گھوش گھبرا کر پائپ کے دو تین لمبے کش لگاتے ہوئے چپ ہو جائے گا۔

"اور تم سمجھتے ہو کہ واقعی میرا مطلب وہی ہے جو کچھ کہ میں کہہ رہا ہوں؟" سب کے قہقہوں کی آواز سے اسٹاف روم گونجنے لگتا، اسی اثنا میں گھنٹی بج جاتی اور وہ بڑے اطمینان سے اپنی کتابوں کو لئے مسکراتے ہوئے اپنی کلاس کی راہ لیتا۔ جہاں اس کے طلبا بڑی بے صبری سے اس کے منتظر ہوتے۔

اس کی موجودگی میں اس کے طلبا گدگدی سی محسوس کرتے اور اپنے نوجوان چہروں سے بناوٹی متانت کا غبار اتار کر اپنے اصل روپ میں نظر آنے لگتے، ان کے دلوں میں خود بخود سیکھنے کی خواہش جاگ اٹھتی۔ مشکل سے مشکل مسئلہ سلجھاتے ہوئے بھی گھوش اس میں مزاح کا رنگ بھر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا مضمون طلبا کے لئے محض ایک بوجھل فرض نہیں تھا۔ بلکہ ایک ایسا دلچسپ ناول تھا جس کا ہر باب گذشتہ باب سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔

وہ اکثر کہا کرتا "میں ایسے ٹیچر کو قطعاً معاف نہیں کر سکتا جو اپنے طلبا کو ان کی مرضی کے بغیر کچھ سکھانا چاہتا ہے۔"

"اور اگر چند طلبا کو سرے سے ہی اپنی پڑھائی میں دلچسپی نہ ہو تو؟"

"تو ٹیچر کو چاہئے کہ وہ اپنی نوکری سے استعفا دے کر کسی گلی میں نمک تیل کی دوکان کھول لے۔" وہ نہایت آسانی سے جواب دیتا اور اپنا پائپ پھر منہ میں ڈال لیتا۔

پچھلی دفعہ آخری سال کے سنٹر چھوڑنے والے طلبا کے اعزاز میں ٹی پارٹی کے موقع پر وہ ہمارے انگریز وائس پرنسپل مسٹر فرینچ کے جو ہر شخص کو مشکوک نظروں سے دیکھنے کا عادی تھا۔ دائیں پہلو میں بیٹھا بڑی بے تکلفی سے نگار ریسٹوران کے لذیذ سموسے کھانے میں منہمک تھا۔ اس کے کھانے کی رفتار دیکھ کر مسٹر فرینچ جان بوجھ کر حیران نظر آتے ہوئے کہنے لگا "مجھے یقین ہے کہ تم یہ سب سموسے ہضم نہیں کر سکو گے۔"

"سموسوں کی تو چھوڑیئے مسٹر فرینچ، مگر آپ کے یہ روغنی الفاظ میرے ہاضمہ کے لئے ضرور بھاری ہیں۔"

ایک خفیف سی مسکراہٹ سے مسٹر فرینچ کے چہرے کے کھچے ہوئے اعضا میں ایک ہلکا سا ڈھیلا پن آ گیا۔ لیکن فوراً ہی سنبھل کر اس نے اپنے چہرے میں پہلے سے دوگنا کھچاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا ہاتھ وائٹ ہاؤس کی خوش نما پیسٹری کی طرف بڑھا دیا۔

اسٹوڈنٹس یونین کا پریذیڈنٹ کرشن چندر اپنے نئے سوٹ میں ملبوس ہمارے پرنسپل ڈاکٹر سینٹ کی بائیں طرف سکڑا سا بیٹھا تھا اور بڑی نفاست سے آہستہ آہستہ چمچے سے کاٹ کاٹ کر گلاب جامن کھا رہا تھا۔ وہ اب تک بمشکل نصف گلاب جامن ختم کر سکا تھا، گھوش نے سالم گلاب جامن منہ میں پھینکتے ہوئے دور ہی سے آواز دی "ڈاکٹر کرشن کو میری طرف بھیج دیجئے، بیچارا آپ کے ساتھ بیٹھا کھاتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہے۔"

کرشن نے گھبرا کر جلدی سے باقی ماندہ نصف گلاب جامن اکٹھا ہی منہ میں رکھ لیا۔

چائے کے بعد جب ڈاکٹر سینٹ طلبا کو مخاطب کر چکا تو اس نے اب گھوش کو بھی کچھ کہنے کو کہا۔ تالیوں کی گونج میں گھوش مسکراتے ہوئے اٹھا۔

"مسٹر پریذیڈنٹ، رفقا اور طلبا، ڈاکٹر سینٹ کو تو آپ سب سن ہی چکے، اب مسٹر سنز کو بھی سن لیجئے۔"

سب ہنستے ہوئے ڈاکٹر سینٹ کی طرف دیکھنے لگے اور ڈاکٹر سینٹ مسکراتے ہوئے اپنی عینک کے شیشے صاف کرنے لگا۔

"مجھے یقیناً افسوس نہیں ہے" گھوش نے وداع ہونے والے طلبا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا کہ "آج تم سنٹر سے جا رہے ہو۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم میں سے ہر ذہین طالب علم لاشعوری طور پر شروع ہی سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔ خدا کرے کہ تم سب کامیاب اساتذہ ثابت ہو"

"ٹیچر کا کھلا ہوا چہرہ" آخر میں اُس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "اُس کے طلبا کی ذہنی صحت کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اُس کے لئے اپنی زردی دُور کرنے کی خاطر ساؤتھ افریقہ کا ایک پکا ہوا سُرخ سیب"

"ایسا شخص" میں نے اُس دن ڈاکٹر سینٹ کو کہتے ہوئے سنا "اگر موت کے دھندلکوں میں بھی اتر جائے تو سب مُردے اس کے پائپ کا دھواں ہی سُونگھ کر خوشی سے باؤلے ہوتے ہوئے مسرّت کے اس سرچشمے کے ارد گرد ناچنے لگیں"

لیکن ایک دن میٹرو میں اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے پہلی بار اُس کی نظروں میں بے اطمینانی اور حرماں پھیلتے ہوئے دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ شاید یہ زیادہ پی لینے کا اثر ہو۔ کیونکہ وہ کتنی ہی دیر سے پیے جا رہا تھا، اور میرے کئی بار وہاں سے اُٹھنے کے لئے اصرار کرنے کے باوجود ہلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

"تم سمجھتے ہو کہ میں بہک رہا ہوں لیکن یقین کرو کہ میں اکثر بہت زیادہ پی کر اپنے آپ کو ہوش میں محسوس کرتا ہوں"

"گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو" میں نے کہا "کہ جب تم نہ پیے ہوئے ہو تو تم نشے میں ہوتے ہو"

"ہاں، ٹھیک ہی تو ہے، کیونکہ پی کر ہی میں اپنے آپ کو اصل حالت میں پہچان سکتا ہوں، ورنہ اپنی عام حالت میں تو میری ذات میرے لئے کئی بار اتنی اجنبی نظر آتی ہے جتنا کسی ہندوستانی دیہاتی عورت کے لئے اُس کا انگلینڈ ریٹرنڈ لڑکا۔ جسے شروع میں اُس کے بدلے ہوئے اطوار دیکھ کر وہ بھول ہی جاتی ہے کہ یہ تو اُس کا اپنا ہی بیٹا ہے، جسے اُس نے اتنے نازوں سے پالا تھا۔ مجھے اور پی لینے دو، دوست، مجھے مت روکو"

مایوسیوں کے سائے اُس کے چہرے میں گہرے ہوتے چلے گئے اور میں مجسمۂ حیرت بنا اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ کیا یہ وہی مسیح والا گھوش ہے جس کے بے پرواہ قہقہے ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"درحقیقت میں اپنی پرائیویٹ زندگی میں جتنا زیادہ رنجیدہ خاطر ہوں، اُتنا ہی زیادہ اپنی پبلک لائف میں مسرور نظر آتا ہوں۔ اپنے غموں کے باوجود میں بیرونی طور پر خوش نظر آنے کا عادی سا ہو گیا ہوں"

اُس کی آواز کے خلوص سے متاثر ہو کر میں نے سگریٹ سلگایا اور اُسے بغور سننے لگا۔

"اگرچہ میں دیگر اشخاص کو اپنے آپ کو اصل روپ میں اُجاگر کرنے کی ترغیب دیتا ہوں لیکن خود ایک بدترین ریاکار ہوں — میں ابھی لڑکا ہی تھا کہ اپنے والدین کو ہر وقت غربت کی پریشانیوں میں گھرا ہوا دیکھ کر اکثر تنہائی میں غمناک شکل بنائے بیٹھا رہتا۔ لیکن اسکول میں اپنے ساتھیوں کے درمیان بیٹھا زور زور سے ہنستا، مانو اپنی بیزاری کی تضحیک اُڑا رہا ہوتا — تم لوگ سنٹر کا کام ختم کر کے چھٹی کے وقت گھر جانے کے خیال سے اطمینان کا سانس لیتے ہو اور میں ہر صبح گھر کی چار دیواری سے نکل کر اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا کو دیکھتے ہوئے محسوس کرنے لگتا ہوں کہ باہر کی فضا ہی میرا اصل گھر ہے" وہ پائپ سلگانے کے لئے ذرا رک گیا۔

"میری بیوی میلے رنگ کی ایک سوکھی ہوئی جھگڑالو عورت ہے۔ جسے کھانے، بچے پیدا کرنے اور گھٹیا قسم کے ناول پڑھنے کے سوا اور کسی چیز کا شوق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مس سینٹ کے بھرے ہوئے تازہ رخساروں کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے میں اپنے گھر کے خیال سے اور بھی متنفر ہو جاتا ہوں، میری کہانی ہر موڑ پر ایک نئی شکست کا پیش خیمہ ہے، میرے عزیز دوست"

میں ہمہ تن گوش بنے اُسے سنتا رہا۔ تھوڑی دیر کی گمبھیر خاموشی کے بعد یکایک ہنسی کے مارے اُس کا دم اُلٹنے لگا۔

"یہ بھی کیا عجیب مسخرہ پن ہے" میں حیرت سے ٹمٹماتے ہوئے اُس کی طرف دیکھنے لگا "تم بھی نرے گاؤدی ہو پال، میرا خیال ہے کہ سنٹر میں نفسیات کی بجائے تم ریاضی پڑھانا شروع کر دو تو اچھے رہو گے، تمہیں میں نے جو کچھ بتایا ہے اُسے کتنی آسانی سے مان گئے ہو۔ میں تو یونہی دلچسپی کے اظہار سے لطف اندوز ہو رہا تھا، گھوش اور مایوسی، ہا ہا ہا — کتنے متضاد نام ہیں"

شرابی قہقہوں کی بوچھاڑ میں اُس نے جلدی سے ایک اور پیگ منہ میں انڈیل لیا۔

"کیا وہ اب بھی واقعی سچ کہہ رہا ہے یا یہ بھی اُس کی تماشہ گری ہے"

میں اُس کے ذہن کی تھاہ پانے کے لئے اُس کی آنکھوں میں کتنی ہی دیر بے سود گھورتا رہا۔

راج مہتہ

لیونارڈو دا وِنسی

آرٹسٹ نے ایک لمحہ مادام لِزا کی طرف دیکھا۔ پھر اُن حسین پھولوں کو دیکھا جو پس منظر میں مہک رہے تھے۔ اُن فواروں کو دیکھا جو پانی کے سوتی اُگل رہے تھے، اُن سازندوں کو دیکھا جن کے سازوں سے نکلنے والے سُر سحر کی خنک فضاؤں میں رس گھول رہے تھے، اور پھر اُس نے مادام لِزا کے اُن لبوں کو دیکھا جن پر ایک میٹھی مسکراہٹ سورج کی پہلی کرن کی طرح چپکے سے آن بیٹھی تھی ——— اُس کے ہاتھ میں بُرش لرز سا گیا۔ سفید اور سپاٹ کینوس نے گویا اُس کا منہ چڑا دیا ——— اور اُس نے سوچا یہ مسکراہٹ کتنی حسین اور واضح ہے۔ لیکن اس مسکراہٹ کو جنم دینے والے خطوط کتنے مبہم اور ہلکے ہیں! ———

تین سال تک سازوں کے سُر، پھولوں کی مہک اور فواروں کا ترنم سحر کی فضاؤں میں پھیلتا رہا۔ مادام لِزا مسکراتی رہی اور وہ تصویر بناتا رہا۔ رنگوں کی مناسب ملاوٹ کو دیکھ کر لوگوں کے منہ حیرت اور احترام کے جذبات سے کھُلے رہ گئے۔ لیکن اُس نے بُرش پھینک دیا، ایک مضمحل انداز سے وہ سٹول پر بیٹھ گیا۔ ایک سرد آہ اُس کے سینے میں گھُٹ کر رہ گئی۔ اُس نے کہا "تصویر نامکمل ہے"!

یہ مصوّر جس نے ایک شاہکار تصویر کو نامکمل کہا" لیونارڈو دا ونسی تھا!

ونسی کے چھوٹے سے گاؤں میں اُس کا بچپن گذرا۔ اُس کی ماں ایک کسان خاندان سے تھی۔ لیونارڈو نے سنہرے بال۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی جاذبیت ماں سے ہی ورثہ میں پائی تھی۔ ان سب چیزوں کے علاوہ ناجائز پیدائش کا الزام بھی اُسے ورثہ میں ملا ——— آغازِ شباب میں اُس کی ماں نے ایک وکیل پائرو دا ونسی کے بازوؤں کے حلقہ میں ابدی راحت کے خواب دیکھے تھے، اور اُسے ایک ناجائز بچّے کی ماں بننا پڑا۔ کیونکہ اُس کی شادی رسوم کے مطابق نہ ہوئی تھی ———

بچپن ونسی میں گزارنے کے بعد وہ اپنے باپ کے پاس فلورنس چلا گیا۔

اُن دِنوں ناجائز پیدائش کو اتنا بُرا نہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر بھی اُس کے سوتیلے بھائی اور بہنیں اسی بات کا سہارا لے کر اُسے تنگ کرتے تھے، وہ سب اُس سے حسد کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بہت ذہین اور محنتی تھا۔ ریاضی اور موسیقی غیر متعلق سے مضمون ہیں۔ لیکن لیونارڈو کو ریاضی کے فارمولے بھی اتنی ہی اچھی طرح یاد تھے، جتنی اچھی طرح اُسے ساز اور سُر کا احساس تھا ——— بچپن ہی سے اُس نے اپنے گرد و نواح کا غور سے مطالعہ شروع کر دیا، اور اپنے احساسات کو ٹھوس مُتوں، ساز کے سُروں اور رنگین تصویروں کا رُوپ دے دیا۔ یہ بُت بھدے تھے۔ اُس کی آواز اور سُر ہم آہنگ نہ تھے۔ اُن تصویروں کے خطوط بے ڈھنگے اور غیر متناسب تھے۔ پھر بھی یہ سب چیزیں اُس کے شوق اور محنت کی مظہر تھیں۔

تیرہ برس کی عمر میں وہ Verracchio کا شاگرد بن گیا۔ وہ ایک بہت بڑا بُت ساز، ایک اچھا مصوّر اور عالم تھا۔ دن بھر وہ اپنے اُستاد کے سٹوڈیو میں پتھر تراشتا، نقاشی کرتا اور Verracchio سے نقش و حُسن، رنگ اور سائے کے رموز سمجھنے کی کوشش کرتا، اور جب فلورنس کی گلیوں میں رات کی خنکی اور تاریکی پھیل جاتی، عشرت کدوں میں حریری ملبوس سرسراتے اور حُسن نغمہ و مے سے سرشار، رقص و مستی کے آغوش میں جاتا تو لیونارڈو بے چینی سے کروٹیں بدلتا۔ بساطِ فلک پر اونگھتے ستاروں کو دیکھا اور اپنے آوارہ خیالات کو بیجان، پتھروں اور کھُردرے کینوس پر ثبت کرنے کے طریقے سوچتا۔

بارہ برس تک وہ اسی حال میں کام کرتا رہا، سینٹ جیروم Vergir of The Rocks, اور Adoraeion of the Magi

اسی ذوق کی یادگار ہیں۔ ان میں سے دو تصویریں نامکمل ہیں۔

بارہ برس کے اسی تعلیمی دور میں اُس نے ایک روز محسوس کیا کہ زندگی کو سمجھنے کے لئے رنگ اور سنگ ہی کافی نہیں، دل کی فتنہ سامانیوں کے ساتھ ساتھ ذہنی استدلال کی بھی ضرورت ہے۔ اور اُس کے ساتھیوں نے حیرت سے دیکھا کہ وہ تجربہ گاہ میں Organic Life کا تجربہ کر رہا ہے۔ وہ سب حیران تھے کہ لیونارڈو دو بالکل متضاد چیزوں، برش اور تیزابی مادوں والی تجرباتی صراحی کو اکٹھا کر کے کہاں پہنچنا چاہتا ہے؟

فلورنس اُس زمانے میں فن کاروں کا مسکن تھا لیکن یہاں کی زندگی اُسے راس نہیں آئی۔ اپنی نوٹ بُک میں اُس نے لکھا "یہ جگہ دلالوں، چہرہ رنگنے والوں، ساہوکاروں اور ریشہ دوانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور میرے فنی ذوق کی تکمیل کے لئے تنگ ہے"۔۔۔۔ تیس برس کی عمر میں اُس نے ڈیوک آف میلان کی ملازمت کر لی۔ یہ جگہ پانے میں اُسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ اب کافی مشہور ہو چکا تھا۔ ملازمت کے لئے جو درخواست اُس نے دی وہ بہت دلچسپ ہے۔ اس میں اُس نے خود کو پُل، بم، عمارتیں اور جنگ کے لئے ڈھکی ہوئی گاڑیاں بنانے کا ماہر انجینئر ظاہر کیا اور بہترین مصوّر اور سنگ تراش ہونے کا دعویٰ کیا، آخر میں اُس نے لکھا، "۔۔۔۔ اگر یہ سب باتیں کسی کو ناممکن یا ناقابلِ عمل معلوم ہوں تو میں آزمائش کے لئے تیار ہوں۔۔۔۔"

میلان میں اُسے شاگردوں اور مددگاروں کا کافی عملہ مِل گیا، یہاں اُس نے ڈیوک کی داشتہ سیسیلیا اِنکرنیریا کی تصویریں بنائیں۔۔۔ شاہی دربار کو سجایا اور اکثر تہواروں پر ڈیوک نے اُسے پارٹیوں کا منتظم بنایا۔۔۔۔ شمالی اٹلی میں اُس کا قیام بہت اہم گنا جاتا ہے۔ اسی اسی زمانے میں اُس نے ایک بہت بڑا بُت بنانا چاہا جو کبھی مکمل نہ ہوا اور ایک تصویر (آخری طعام) The Last Supper بنائی۔ اس تصویر کا شمار دُنیا کی شاہکار تصویروں میں ہوتا ہے۔

انہی دنوں فرانسیسیوں نے ایلپس کے پہاڑ پار کر لئے اور اُس کے آقا ڈیوک کو گرفتار کر لیا گیا تو لیونارڈو سیزر بورگیا کے ماتحت ملٹری انجینئر کے عہدے پر کام کرنے لگا۔ بہت عرصہ پہلے اُس نے فلورنس کی میونسپلٹی سے کسی جگہ کو مصوّر کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا۔ اِسی کنٹریکٹ کو پورا کرنے کی غرض سے وہ فلورنس چلا آیا۔ یہیں اُس نے مادام لزا کی تصویر مونا لِزا بنائی۔ اُس کی مضطرب روح کو فلورنس کی فضائیں نہ پہلے مطمئن کر سکی تھیں نہ اب ہی اُسے بہلا سکیں، اور وہ رُوم چلا آیا، جہاں اُسے مشہور مصوّر رافیل اور اس کے سرپرست لیو دہم کے طنز و تضحیک کا شکار رہنا پڑا۔

جب وہ روم میں پورے دو برس ضائع کر چکا تھا، اُسے فرانسس اوّل کا دعوت نامہ ملا۔ فرانسس اُس کی فنی عظمت کا معترف تھا، اُس نے لیونارڈو کو ٹورین کے مقام پر ایک خوبصورت کوٹھی دے دی۔ یہاں آکر اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے ذہن نے اطمینان پا لیا ہے۔ یہیں اُس نے اپنی نوٹ بُک میں وہ فقرہ لکھا جس پر فلسفی گھنٹوں بحث کر سکتے ہیں، اُس نے لکھا "۔۔۔۔ میں نے سوچا کہ میں زندہ رہنے کے طریقے تلاش کر رہا ہوں، حقیقتاً میں صرف مرنے کی راہ ڈھونڈ رہا"۔۔۔۔ اور یہیں ٹورین میں سٹاسٹھ برس کی عمر میں وہ لوگوں کی مسکراہٹوں کو لافانی بنا کر خود فنا کی گود میں جا سویا۔۔۔۔ وہ مر گیا، لیکن وہ معصومیت نہ مر سکی، جو اُس نے مریم اور مسیح کے چہروں کے ذریعے کُھردرے پردوں پر بکھیری تھی وہ شگفتگی اور تازگی نہ مر سکی جو اُس نے شاداب پھُولوں میں پائی تھی۔ اور جسے اُس نے رنگوں اور خطوط کے حلقہ میں اسیر کر دیا تھا۔۔۔۔

حُسن اور مسرّت لیونارڈو داونسی کی زندگی کے محور تھے، دوسرے اکثر مصوّروں کے مقابلے میں وہ بہت خوش تھا۔ شاہوں نے اُس کی خدمات حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ ڈیوک آف میلان کی بہن ازابیلا سے لے کر تقاضا ڈُوب تک۔۔۔ سب نے اُس کے لئے موڈل بننا قابلِ فخر سمجھا۔۔۔۔

اس تمام کامیابی کا صرف ایک راز تھا۔ وہ جو کام کرتا تھا خلوص اور تہِ دل سے کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی تصویروں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ شاید ہی کسی اور مصوّر نے اُس جتنے متنوع موضوع چُنے ہوں۔ جوان لڑکیوں کے گدرائے ہوئے عریاں جسموں اور مردہ انسانوں کی کھوپڑیوں کے درمیان ایک بھیانک فاصلہ ہے لیکن لیونارڈو نے بھیانک کھوپڑیوں کی تصویریں بھی اتنی ہی مہارت سے بنائیں، جتنی مہارت سے اُس نے لب و رخسار اور سینے کی مخملیں ڈھلوانوں

ساحسن اپنی تصویروں میں سمویا ——— انسانی ڈھانچے کی تصویریں جو اُس نے بنائیں اب تک اناٹومی کے نصاب میں دی جاتی ہیں۔

لیونارڈو کی تصویروں کی زیادہ تعداد مریم، یسوع اور دوسرے عیسائی راہنماؤں سے متعلق ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم تصویر "آخری طعام" The Last Supper ہے۔ اس تصویر کی تیاری کے دنوں میں وہ کھانا پینا سب بھول گیا۔ نوٹ بک ہاتھ میں لئے وہ ہر اُس جگہ گیا، جہاں اُسے موڈل ملنے کی اُمید تھی۔ تھیٹر کے اداکاروں سے پھانسی کی سزا پائے ہوئے قیدیوں تک ——— سب کے چہروں کا اُس نے مطالعہ کیا۔ اُسے مسیح کی تصویر بنانی تھی، اور اس مقصد کے لئے اُسے ایک ایسا موڈل چاہئیے تھا جس کے چہرے سے سکون، معصومیت اور قدوسیت کے جذبات ہویدا ہوں۔ آخر اُس نے ایک حسین یہودی کو اس تصویر کے لئے چن لیا ——— اس تصویر کے رنگ اب مدھم پڑ گئے ہیں۔ لیکن اب بھی اس میں وہ کشش اور مسیحی عقیدت کی رُوح موجود ہے جس کی وجہ سے مسیحی حلقوں میں خصوصاً اور عوام میں عموماً اس کی اتنی قدر ہے۔

لیونارڈو نے ایک دفعہ کہا تھا: "ہر خوبصورت چیز مر جاتی ہے اور اسے محفوظ کرنے کا بہترین ذریعہ آرٹ ہے!" اس فقرے کی اہمیت اور سچائی کا احساس ہمیں اُس وقت ہوتا ہے جب ہم اُس کی بنائی ہوئی تصاویر دیکھتے ہیں۔ لیونارڈو کے بکھیرے ہوئے رنگوں کی داستان پڑھتے پڑھتے ہم محسوس کرتے ہیں کہ میٹھی مسکراہٹوں کا خالق ابھی مرا نہیں وہ آج بھی ہمارے درمیان سانس لے رہا ہے ——— اور ایک فنکار کی اس سے بڑھ کر کوئی تعریف نہیں ہو سکتی۔

آج کل

افقر موہانی

چرخ پر کالی گھٹاؤں کا سماں ہے آج کل — آسمانِ پیر کا بھی دل جواں ہے آج کل
دسترس جذباتِ فطرت پر کہاں ہے آج کل — جوشِ ارماں، ضبطِ دل کا امتحاں ہے آج کل
منتشر شیرازۂ شرح و بیاں ہے آج کل — نزع کے آغوش میں اپنی زباں ہے آج کل
اپنی بربادی کا کچھ ایسا سماں ہے آج کل — ہم زمیں والوں پہ روتا آسماں ہے آج کل
دیکھیے، ہاں وسعتِ ذوقِ تکلم دیکھیے — ہر زباں کی بات گویا داستاں ہے آج کل
جب نہیں پہلو میں اپنے وہ بہارِ رنگ و بو — پھر تو یہ فصلِ بہاراں بھی خزاں ہے آج کل
ہر ادا ہے رُوح پرور، ہر نگہ ہے جانستاں — حُسن سے رنگیں کسی کی داستاں ہے آج کل
یاد آ آ کر کسی کی، دل دُکھاتی ہے مرا — بنگالِ گریۂ اشکِ رواں ہے آج کل
کر دیا ابرِ کرم نے سوز کو سازِ مکاں — مجھ کو ہر بجلی چراغِ آشیاں ہے آج کل
فیضِ ساقی سے زمانہ بے پئے سرشار ہے — کیف میں ڈوبی فضائے دو جہاں ہے آج کل
رُوح مست و جان مست و عقل مست و ہوش مست — مستِ کیفِ بیخودی پیر و جواں ہے آج کل
شیشہ مست و جام مست و بادۂ گلفام مست — مست اپنے حال میں پیرِ مغاں ہے آج کل
دیکھیے جس کو چلا آتا ہے سجدے کے لیے — سجدہ گاہِ خلق اُن کا آستاں ہے آج کل
گر پڑے دو چار آنسو جس طرف اُٹھی نظر — چشمِ تر منجملۂ ابرِ رواں ہے آج کل

کس کو لطفِ آشیاں حاصل نہیں برسات میں
پھر بھی تو افقر خرابِ آشیاں ہے آج کل

آل احمد سرور

اردو کے منفرد نقاد سید احتشام حسین جو مصنف ، ناشر اور قاری کے باہمی رشتے کا مطالعہ کرنے ریاستہائے متحدہ امریکہ تشریف لے گئے ہیں - آپ قریباً نو ماہ امریکہ میں قیام کریں گے اور تین چار ماہ کے لئے برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں جائینگے -

آپ کا مقالہ "آل احمد سرور — شاعر کی حثیت سے" زیر نظر شمارے میں ملاحظہ فرمائیے -

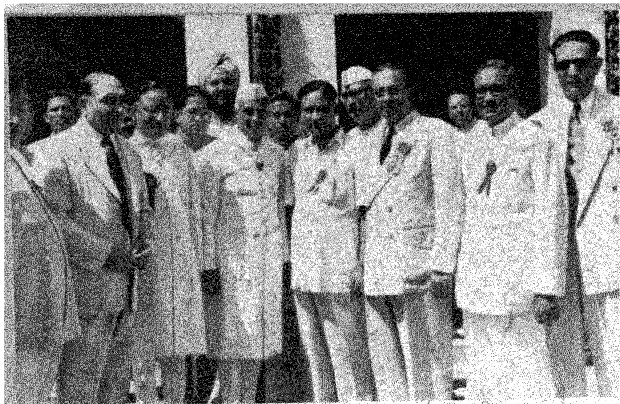

حال هي میں نئي دهلي میں آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس کا سالانه اجلاس هوا - کانفرنس نے پردهان منتري کے اعزاز میں ایک لنچ کا اهتمام کیا - یه تصویر اسي موقعے پر لي گئي - اس میں پردهان منتري استقبالیه کمیٹي کے ممبروں کے درمیان کهڑے هیں - نیچے کي تصویر میں پردهان منتري کانفرنس کے اجلاس میں تقریر کر رهے هیں - (نیچے بائیں کونے میں) انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ کے وزیر ڈاکٹر بي. وي. کیسکر آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس سے خطاب کر رهے هیں -

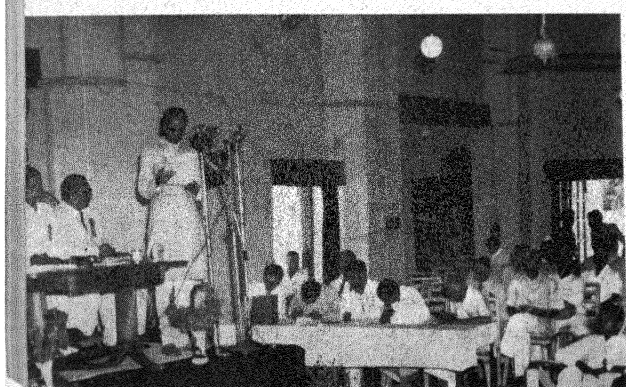

جنوبی افریقه میں جدوجهد

جنوبي افریقه میں غیر منصفانه نسلي امتیاز ک
خلاف ستیه گره کي تحریک کا ایک نمایاں پهلو ی
هے که اس میں افریقي اور هندوستاني عورتیں
زور و شور سے حصه لے رهي هیں - اس تصویر میں
یه عورتوں کا جتها ٹرانسوال میں پرمٹ کے قوا
کي خلاف ورزی کر رها هے -

یادگار ذکی ـاب ظفر حسین خان

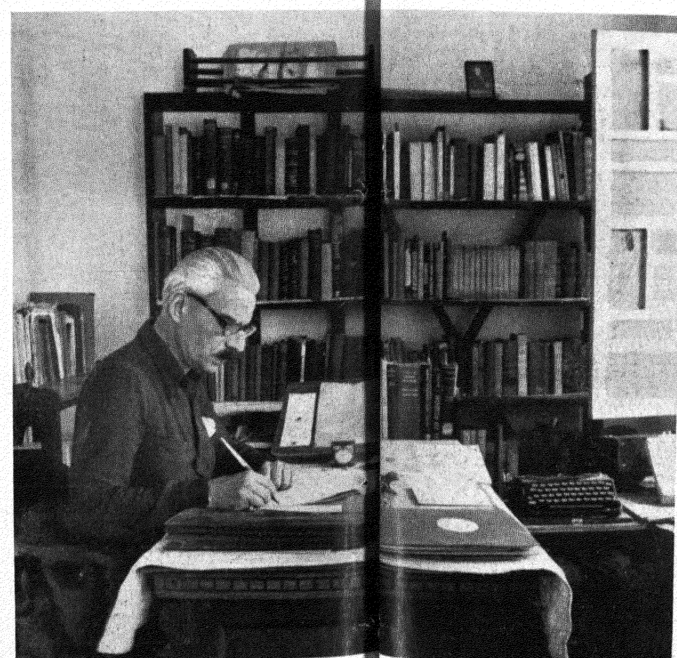

ذکي مرحوم کے متعلق ـی شمارے میں شائع هو رها هے

ڈاکٹر کیسکر کشمیر میں

حال هي میں ڈاکٹر بي. وي. کیسکر وزیر نشر و اطلاعات کشمیر تشریف لے گئے جهاں انهوں نے بهارتي سینا کے جوانوں سے ملاقات کي - تصویر میں آپ بریگیڈیر راجندر سنگھ (مهاویر چکر) کي یادگار پر پهول چڑها رهے هیں -

میسور میں لکڑی کا کام

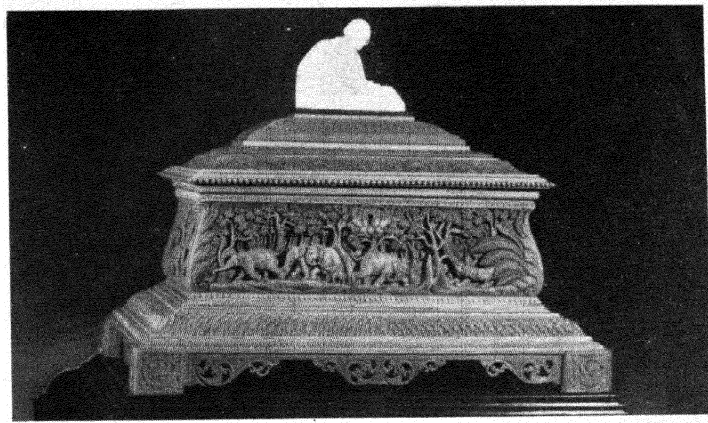

میسور میں لکڑی کی صنعت فن اور دستکاری کا ایک حسین امتزاج پیش کرتی ہے یہاں کی لکڑی کی بنی ہوئی چیزیں ساری دنیا میں ایک خاص شہرت رکھتی ہیں- اس قسم کے کام میں طرح طرح کی لکڑیاں استعمال کی ہیں جو دیش کے مختلف حصوں میں دستیاب ہوتی ہیں- یہ ایک ڈبیہ کی تصویر ہے جو صندل کی لکڑی سے بنائی گئی ہے

یہ بھینس گلاب کی لکڑی سے بنائی گئی ہے - اسی سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ میسور میں یہ صنعت کتنے عروج کو پہنچی ہوئی ہے-

بیتاب بریلوی

مُصوّری اور اُس کی پرکھ

تاثرات کے اعتبار سے مُصوّری کا میدان صرف نشاطِ باصرہ تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت صنعتِ تصویر سازی براہِ راست ہمارے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ماہرین دینیات کی قطعی رائے ہے کہ جو چیز ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے اس کے نقوش باصرہ کی وساطت سے ہمارے پردۂ شعور پر من وعن مرتسم ہو جاتے ہیں اور ہم اسی ذہنی تصویر کی مدد سے نہ صرف اس شے سے متعارف ہوتے ہیں بلکہ اس کی ہم جنس و غیر جنس اشیا میں تمیز کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شے یا منظر کے ادراک کے احساسات مختلف ہوتے ہیں۔ حُسن کاری ان احساسات کو شدّت و گیرائی سے ہم دوش بھی کرتی ہے اور ہمارے نہان خانۂ دل میں مختلف النوع کیفیات پیدا کرنے کی موجب بھی ہوتی ہے۔ انہیں کیفیات کا نام علمائے ہند کی اصطلاح میں رس ہے۔ پس مصوّری کا منشائے حقیقی بھی دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح کسی ایک یا دوسرے رس کی تحریک کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ محض نظر نوازی اس فنِ رنگین کی صریحاً توہین ہے۔ کسی تصویر کو دیکھ کر کوئی بھی اسے اچھا یا بُرا تو کہہ سکتا ہے لیکن اس کے حُسن و قبح کی تفاصیل سے بحث کرنے کی صلاحیت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ جیسے کوئی اچھا شعر سُن کر ایک اُمّی بھی پھڑک اٹھتا ہے لیکن اس کے اوصاف و نقائص تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔ پس جس طرح کسی شعر کے حُسنِ ذاتی سے لطف اندوز ہونے کے لئے زبان اور علم بیان کا وقوف لابدی ہے اسی طرح کسی تصویر کے جمال و کمال، اس کے لب بستہ پیام سے مستفید ہونے کے لئے اسی فنِ لطیف کے بنیادی اصولوں کا ادراک بھی ضروری ہے۔

شعر بعض ارکان کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن اس کی روح رواں متخیلہ تخیل کی وہ آوازیں ہیں جو موسیقی کے زیر و بم کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہیں بعینہٖ اسی طرح مصوّری (جسے سراپا شعریت سمجھنا چاہیئے) کی جان بھی ایک نہ ایک مخصوص رس ہوتا ہے جو خطوط اور رنگوں کے قید و بند میں جکڑا رہتا ہے۔

ہر مکمل تصویر کے یہ پانچ بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔ (۱) خطوط (۲) وضع و جسامت (۳) اقدار و تضاد (۴) رنگ (۵) عمق، وسعت اور شدّت۔ ان میں سے آخر الذکر دو عناصر کا تعلق کم و بیش رنگوں کی آمیزش اور خطوط کی اوصاف سے ہے۔ ان عناصرِ خمسہ کی اہمیت کو ذہن نشین کئے بغیر کسی تصویر کے محاسن و معائب کو اجاگر کرنا ناممکنات سے ہے۔

دراصل چابکدست مصوّر کا تمام منشائے تخلیق خطوط ہی میں پنہاں رہتا ہے۔ بقیہ عناصر اربعہ اس کی وضاحت کرنے میں بغایت ممد و معاون ہوتے ہیں۔ خط یا لکیر کی تعریف یہ ہے کہ اس میں صرف لمبائی ہوتی ہے موٹائی یا چوڑائی نہیں ہوتی۔ اقلیدس کے اس نظریے کو محض اصطلاحاً تو صحیح تصوّر کیا جا سکتا ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا خطوط کتنے ہی باریک کیوں نہ ہوں کچھ نہ کچھ موٹائی یا چوڑائی لئے ہی رہتے ہیں۔

خطوط تصویر میں خطوط کی پرکھ ان کی جسامت اور اوصاف سے ہوتی ہے۔ اوصاف کی مظہر ان کی موٹائی ہوتی ہے۔ خطوط کی کئی قسمیں ہیں:- (۱) سیدھے (۲) ٹیڑھے ترچھے (۳) خمیدہ و دندانہ دار (۴) بیضاوی (۵) خفی و جلی (۶) روشن و ناریک یا مدھم وغیرہ۔ قوس و دوائر کا شمار بھی خطوط ہی میں کیا جاتا ہے۔ سطحوں کے اتّصال سے بھی خطوط خود بخود معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں۔ ان کے مختلف اوصاف کے اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مدھم اور پھیکے خطوط سے نزاکت ٹپکتی ہے بہت سبک یا مبہم لکیریں ضعف و ناپائداری کی حامل ہوتی ہیں۔ خط جتنا گہرا اور روشن ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ قریب کا احساس کراتا ہے۔ خفی اور

تاریک خطوط دوری کے مظہر ہوتے ہیں۔ اسی لئے اشیا کے قرب و بعد کو نمایاں کرنے کے لئے خطوط کے ان اوصاف کے اختلافات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ بہت گہری لکیریں خود اعتمادی سنجیدگی اور استقلال کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور کبھی کبھی قرب و بعد کو بھی آشکارا کرتی ہیں ۔

خطوطِ مستقیم لاتعداد زاویا سے کھینچے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کھڑے پڑے یا ترچھے وغیرہ۔ سمتوں کے الٹ پھیر سے ان میں اختلاف و افتراق ڈالا جا سکتا ہے۔ مختلف اقسام کے خطوط کے مشاہدہ سے دل و دماغ پر مختلف قسم کے اثرات ہوتے ہیں۔ سیدھی کھڑی لکیر سادگی صفائی چستی استواری اور استقلال کی ضامن ہوتی ہے۔ پڑے خطوط کے تسلسل سے روانی اور تھم تھم کر کھینچی گئی پڑی لکیروں سے کاہلی اور آرام طلبی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ نیچے سے اوپر کو کھینچے گئے خطوط علوے روح کے حامی ہوتے ہیں۔ اور ناظر کو ہاتھ پکڑ کر فضائی بلندیوں میں لے اڑتے ہیں۔ لیکن اوپر سے نیچے جانے والی لکیروں کا معکوس اثر ہوتا ہے اور وہ ہمیں پستی و مایوسی کی تاریکیوں میں کھینچ لاتی ہیں۔ نیچے سے اوپر جانے والی لکیریں بتدریج پتلی اور مدھم ہوتی چلی جاتی ہیں اور اوپر سے نیچے جانے والی لکیریں ان کے بالکل برعکس ہوتی ہیں ۔

ترچھے خطوط کے اثرات کا علاقہ ان کے ترچھے پن کی کمی و بیشی سے ہوتا ہے۔ معمولی ترچھی لکیروں میں محدود قوت و توانائی ہوتی ہے قوس میں حُسن و رعنائی و برنائی کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس سے نفاست مترشح ہوتی ہے بےحد ترچھی لکیریں اپنی الجھنوں میں کوئی نہ کوئی راز چھپائے رہتی ہیں۔ ترچھی لکیروں میں نگاہ الجھتی ہے اور نظر پر غیر معمولی زور پڑتا ہے۔ کسی خطِ مستقیم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں کم سے کم فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ ترچھے اور گنجلک خطوط میں الجھنیں نہ صرف دوری میں اضافہ کرنے کا باعث ہوتی ہیں بلکہ پائے نگاہ کو متزلزل بھی کر دیتی ہیں۔ عمودی خطوط سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ دو متقابل قوتیں کھینچ کھینچا کر ایک نقطہ پر ٹھہر گئی ہیں۔ مگر یہ دونوں کبھی مل کر ایک نہیں ہو سکتیں ۔ غیر عمودی خطوط کی ملاوٹ سے پہاڑوں کی چوٹیوں اور ناہمواری کا گمان ہوتا ہے ۔

کامیاب مصوّر مختلف النوع خطوط ہی کی مدد سے دلوں کو حسب منشا متاثر کرنے کا اہتمام کرتا ہے ۔ اور ناظر کی نگاہ کو انگلی پکڑ کر اس مقام تک لے جاتا ہے جسے وہ اپنی منزلِ مقصود سمجھ کر گامزن ہوتا ہے۔ دراصل خطوط کی کشش صحت، موزونیت اور نفاست ہی میں فنکار کی عظمت مضمر ہوتی ہے۔ خطوط کے صحیح مصرف ہی سے جذب و کشش، اثر و تاثیر کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا جا سکتا ہے ۔

کسی ایک سطح کو دوسری سے ملا کر یا ایک کا سایہ دوسری پر ڈال کر بھی خطوط کو ہویدا کیا جا سکتا ہے۔ بہترین خطوط وہ ہوتے ہیں جو تضاد یا رنگوں کے امتزاج سے خود بخود اُبھر آتے ہیں ۔

وضع و جسامت

سطح کے خارجی خطوط سے تصویر کی جسامت متعیّن ہوتی ہے۔ جسامت کے اختلافات کا انحصار محدودہ رقبہ اور سطح کے خارجی خطوط کے اوصاف پر ہوتا ہے۔ مناظر کی جسامت و وسعت کے دو یا تین حدود ممکن ہیں۔ جسامت اگر سادہ ہو تو دو اور ٹھوس ہو تو تین پہلو ہوتے ہیں جن میں لمبائی چوڑائی اور موٹائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جسامت اور وضع بالعموم خطوطِ مستقیم سے واضح کی جاتی ہے۔ مربعے مستطیل یا مثلث نما جسامتیں عام طور پر پسند کی جاتی ہیں۔ سطح و سطور کے اوصاف کے مطابق وضع قطع میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے ۔

ترچھے خطوط سے بیضاوی، ہلالی، بدری اور قوسی وغیرہ انواع و اقسام کی جسامتیں منصۂ شہود پر لائی جا سکتی ہیں۔ صوری و نسبتی اختلاف کے ساتھ ساتھ سطحی تفاوت سے بھی وضع میں فرق آ سکتا ہے۔ سطح کی بجی بناوٹ سے وضع و جسامت کے اثرات میں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اگر زمین سپاٹ اور چکنی ہے تو وضع و جسامت کا اثر کھدری اور ناہموار سطح کے مقابلے میں بالکل مختلف ہوگا ۔

اشکال و صور کے مشاہدہ سے کس نوع کا منظر یہ شعور بیدار ہوتا ہے اور کس قسم کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں اس کا اندازہ ان کے تناسب، شباہت اور نقش کردار سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا مثلث جس کا قاعدہ اس کے طول کے برابر ہو متانت و پائداری کا علمبردار ہوتا ہے۔ مساوی الاضلاع مثلث میں بھی یہی وصف ہوتا ہے مگر اس کی یکسانیت و یک رنگی دلکشی سے عاری ہوتی ہے۔ پڑی مستطیل ارتباط و اختلاط کی اور کھڑی ارتقا و ارتفاع کی حامل ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں نگاہ صرف ایک سمت سے دوسری سمت کو متحرک ہوتی ہے لیکن دوسری میں اوپر کو اٹھتی ہے۔ ہم مرکز قوسی جسامتیں

تسلسل کی امین ہوتی ہیں۔ الغرض سیدھے خطوط کی جسامت سے چستی و صفائی اور ترچھی لکیروں کی جسامتوں سے سستی و بیدلی کا پتہ چلتا ہے۔ ترچھی ٹیڑھی سمتوں میں گامزن ہونے پر مائلِ نگاہ کو قدم قدم پر لغزش ہوتی ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے میں توقف ہوتا ہے۔

جسامت جس سطح کا احاطہ کرتی ہے اس کی پیمائش میں فرق پڑنے سے اثرات میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ اگر وسعت زیادہ ہو تو کشادگی کا اور کم ہو تو انقباض کا احساس ہوتا ہے۔ جب ایک جسامت دوسرے کے قرین ہوتی ہے تو اثرات کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ سطح کی ناہمواری سے اُبھار صفائی اور رعنائی عود کر آتی ہے اور اس کی لطافت و ہمواری سے نزاکت پھُوٹ نکلتی ہے۔ قصہ کوتاہ فنکار کے دستور العمل کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام لوازمات بیک وقت ایک ہی طرح کے جذبات کا محرک ہوتا ہے خطوط کی طرح جسامت بھی نگاہ کی رہبری کرتی ہے۔ اور رفتارِ نگاہ جذبات کی تحریک کی موجب ہوتی ہے۔ اس لیے جسامت کی الجھنیں جذبات میں انتشار پیدا کر دیتی ہیں۔ پس جسامت میں ہمرنگی سے معمولی گریز تو مستحسن ہو سکتا ہے لیکن غیر معمولی تضاد کو ہمیشہ معیوب قرار دیا جاتا ہے۔ سیاہی سفیدی کو اور سفیدی سیاہی کو فروغ یا جلا دیتی ہے۔

اقدار و تضاد

مخالف رنگوں کے پاس پاس ہونے سے دونوں ایک دوسرے پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ دونوں میں چمک اور شوخی آجاتی ہے۔ یہ چمک یا روشنی تضاد ہی کی رس ہوتی ہے۔ اسی لیے فروغ یا روشنی کی مقدار کو تضاد سے تعبیر کیا جاتا ہے جو بجائے خود اجتماعِ ضدین کا منت کش ہوتا ہے۔

تضاد کی ابتدائی و انتہائی حدود کو دو مخالف رنگوں سے نمایاں کیا جاتا ہے۔ سپید و سیاہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سیاہی ساری روشنی کو سمیٹ کر اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ جس سے اس کا پھیلاؤ رک جاتا ہے اور سیاہی زیادہ سیاہ نظر آنے لگتی ہے۔ سپیدی ہمہ تن نور ہوتی ہے۔ اس لیے اُجالے کے پھیلنے میں سفید زمین سے جس قدر مدد ملتی ہے اتنی کسی دوسری چیز سے نہیں ملتی۔ سیاہ اور سپید رنگوں کے وسط میں بھورے رنگ کو جگہ دی جاتی ہے۔ اس سے رنگوں کی اقدار بڑھ جاتی ہیں۔ بھورا رنگ ہلکا بھی ہوتا ہے اور شوخ بھی۔ نیم سیاہ و سفید سطح کے درمیان ہلکا بھورا اور نیم سفید و سیاہ سطح کے مابین شوخ بھورا رنگ تضاد کے قیام کے لیے افضل و برتر مانا گیا ہے تضاد کو فروغ، ہم آہنگی اور سایہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اسے بڑھانے گھٹانے کے لیے سپید و سیاہ متضاد رنگوں کی آمیزش کی جاتی ہے۔ کسی رنگ میں سفیدی شامل کر دینے سے اس کی چمک یا روشنی میں اضافہ ہو جاتا ہے مگر سیاہی ملانے سے جو حل تیار ہوتا ہے اسے سایہ کہا جاتا ہے۔ خطوط سے بھی تضاد پیدا ہوتا ہے۔ پاس پاس کھینچی ہوئی لکیروں سے تضاد میں کمی اور فاصلہ سے کھینچے ہوئے خطوط سے اضافہ ہوتا ہے۔ یہی بات لکیروں کی موٹائی کو گھٹا بڑھا کر بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ موٹے خطوط باریک لکیروں کی بہ نسبت دوری کو کم کر کے تضاد کی مقدار گھٹا دیتے ہیں۔

سورج کی روشنی اور تاریکی سے بھی تضاد کا ظہور ہوتا ہے۔ گو روشنی کی قلت و افزائش سے خطوط، وضع اور جسامت کی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ لیکن ان کے رنگ و روغن، حُسن و جمال میں فرق پڑ جاتا ہے۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے دوپہر اور غروب کے بعد ایک ہی چیز کا نظارہ مختلف کیفیتوں کا مرقع پیشِ نظر کرتا ہے۔ تاج محل کو لوگ اسی خیال سے مختلف اوقات میں بار بار دیکھتے ہیں اور ہر دفعہ ایک نئے نظارۂ جمیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ روشنی کے رخ اور اس کی مقدار کی کمی بیشی سے تضاد میں تبدیلیاں پیدا کرنے سے بھی مطلوبہ اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

رنگ پر روشنی کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ روشنی رنگ کی کایا ہی پلٹ دیتی ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

تیز دھوپ میں ہرے بھرے درخت کے سبز پتے پیلے اور چمکدار دکھائی دیتے ہیں۔ نیلا آسمان رات کی تاریکی میں کالا ہو جاتا ہے۔ وضع و طرح میں سرِ مو فرق نہ آنے کے باوجود تضاد کی بدولت جو جدت و شوخی آجاتی ہے وہ ہمیشہ مصوّر کے بنیادی مقاصد کے تابع رہتی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے مرکزی خیال کو حسن و نور کی خلعت سے مزیّن کر کے جنّتِ نگاہ بنا دیتی ہے۔ اور ہمارے سازِ شعور کے تاروں کو اپنے لمسِ شیریں سے چھیڑ کر علوئے روح کا سامان فراہم کرتی ہے۔ تضاد میں جو عمق ہوتا ہے وہ حسن و احترام کے جذبات کا محرک ہوتا ہے۔ عمیق ترین تضاد حزن و یاس کی علامت ہے لیکن اگر یہ عنصر سبک اور فرد تر ہو تو کیف و سرور کے دریا بہا دیتا ہے۔ اس سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی کو خیرباد کہنے کی خواہشات کا بھی اظہار

ہوتا ہے۔

شوخی یا رنگوں کی ہم آہنگی کا غلبہ اور چمکیلی روشنی کا اشتراک و اتحاد ڈرامائی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ تضاد کی یک رنگی نہایت تسکین دہ ہوتی ہے اس میں بعد و تذبذب کی جھلک ہوتی ہے۔ مگر اس کی رنگینیاں جدوجہد مخالفت اور تیقن کی شفاف فضاؤں میں کھینچ لے جانے کی سکت رکھتی ہیں اس طرح عیاں و متظاہر کے درمیانی فاصلہ اور ان کے تقرب و بعد کو بآسانی دکھایا جا سکتا ہے۔ تضاد کی دوری افتراق کی اور اس کی قربت اتحاد کی علامت ہوتی ہے۔

تضاد کا اجتماع اور اس کا باہمی ربط وضع و جسامت نیز خطوط پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر اس میں اختلافات کی کثرت ہے تو خطوط اُبھر کر بہت زیادہ نمایاں اور جاذب توجہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے برعکس ربط و ہم آہنگی کا اہتمام ہو تو لکیریں دھندلی اور کھوئی ہوئی سی محسوس ہوتی ہیں۔ رنگوں کے باہمی تعلقات کا بھی تضاد پر کافی اثر پڑتا ہے۔ سیاہ و تاریک پس منظر بھورے رنگ کو فروغ دیتا ہے۔ لیکن سفیدی کے مس سے اس میں پھیکا پن آجاتا ہے۔

رنگ

فی الاصل نور کی تبدیلِ ہئیت ہی سے رنگ کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی لئے نور کو رنگوں کا منبع قرار دیا جاتا ہے۔ جھاڑ کے تین پہلوؤں والے شیشے کے ٹکڑے کو سورج کے سامنے کر کے دیکھنے سے قوسِ قزح کی تمام رنگینیاں آنکھوں میں بھر جاتی ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ رنگوں کا مخرج آفتاب ہے اور تمام بنیادی رنگ جو تعداد میں صرف سات ہیں اسی کی روشنی کی تقسیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ گویا آفتاب سرچشمۂ رنگ و نور ہے لیکن آفتاب سے صرف روشنی کی کرنیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس طور سے یہی روشنی مجموعۂ ہفت رنگ قرار پاتی ہے۔ پس نور کو جذب و منعکس کر کے ہم بھی اسے تقسیم کر سکتے ہیں۔ جب کوئی چیز روشنی کو تمام و کمال جذب کر لیتی ہے تو وہ کالی دکھائی دینے لگتی ہے۔ لیکن اس سے نور چھننے لگتا ہے تو اس کا رنگ سفید نظر آتا ہے۔ جذب و انعکاس کے جزوی عمل سے رنگینی آتی ہے۔ یعنی اگر روشنی محض جزوی طور پر جذب ہو تو بقیہ حصہ رنگین دکھائی دے گا۔ ہریالی چونکہ ہرے رنگ کو چھوڑ کر روشنی کے بقیہ رنگوں کو جذب کر لیتی ہے اس لئے سبز نظر آتی ہے۔

آفتاب کی وہ شعاعیں جو منعکس ہو کر ہم تک پہنچتی ہیں رنگوں میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ باصرہ کو متاثر کرنے والی سب سے پہلی چیز رنگ اور وضع ہی ہوتی ہے اس سے ہم کسی چیز کی شناخت کرتے ہیں۔ شباہت اور اس کی جزئی تفصیں نقشہ اور خط و خال وغیرہ پر ہماری نظر بہت بعد میں جاتی ہے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جو رنگ سے مملو و متاثر نہ ہو۔ ہم اپنے جذبات و خیالات کا اظہار بھی رنگوں سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء کے کلام کی رنگینی ہمارے دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ اور شاید اسی لئے رنگ کو حال کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر پھول کا رنگ جداگانہ ہوتا ہے۔ شعراء کا بھی اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ رنگ کے معانی کی وسعتیں اس کی ہمہ گیری کی قائل ہیں۔

ہر رنگ کا ایک خاصہ ہوتا ہے۔ آفتاب کا رنگ زرد ہے۔ پیلے رنگ کو نور کا مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے مسرت ٹپکتی ہے یہی اس کی خاصیت ہے۔ اُودا رنگ تزک و احتشام کا نشان ہے۔ اور نیلا عظمت و احترام کا اسی طرح سرخی کو خدائے جدال و قتال سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور سرخ رنگ سے غیض و غضب نیز خطرات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آگ کا طبعی رنگ نیلا ہے مگر اس کی لپٹوں کو سرخی سے نمایاں کیا جاتا ہے۔

ہمارے حواس پر رنگوں کا اثر ان کے خواص کے مطابق ان چھوٹے چھوٹے مرکوز کو سمیٹنے اور پھیلانے والے شیشوں کے ذریعے سے ہوتا ہے جو ہمارے نظام بصارت کے تاروں میں پیوست ہیں اور جن کا تعلق ہمارے عضوِ شعور سے ہے۔ یہ بے شمار شیشے تین طرح کے ہوتے ہیں کچھ سرخ اور سبز رنگ کے اثرات قبول کرتے ہیں کچھ پیلے اور نیلے رنگ کے اور کچھ کالے اور سفید رنگ سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح رنگوں کے اوصاف بھی تین ہیں: ۔ (۱) رنگت (۲) فروغ اور (۳) تمری یا وزن۔ ان میں سے ہر وصف اپنے مخصوص رنگ میں ہمارے جذبات کی رو پر اثر انداز ہوتا ہے۔

رنگت کی بنا پر ہی رنگوں کی تخصیص ہوتی ہے۔ اصطلاحِ عام میں رنگ اور رنگت متحد المعنی الفاظ ہیں۔ لیکن فنی نقطۂ نگاہ سے رنگت کو رنگ کا جوہر مانا گیا ہے۔ رنگت نیلی، پیلی، کالی یا سفید کسی طرح کی بھی ہو سکتی ہے لیکن رنگ کا تذکرہ اس وقت تک تشنہ رہتا ہے جب تک اس کے فروغ یا وزن وغیرہ کی تفصیل بیان نہ کی جائے۔ ہلکا، نیلا، شوخ، سبز وغیرہ

سے رنگ کی ہی تفصیل مراد ہوتی ہے ۔ بعض رنگتیں ایسی ہوتی ہیں جو دو رنگوں کے امتزاج سے حاصل ہوتی ہیں اور بعض ایسی جن کا کیمیاوی مرکب بنانا ناممکن ہے ۔ رنگ رنگین روشنی اور رنگتوں سے دستیاب ہوتے ہیں ۔ اشیاء کی بنیادی رنگتیں تین ہیں (۱) نیلی (۲) لال (۳) پیلی ۔ روشنی کی بنیادی رنگتیں بھی ہیں (۱) لال (۲) ہری اور (۳) عنابی نیلی ۔ یہ رنگتیں کسی قسم کی ملاوٹ سے نہیں بن سکتیں مگر ان کو ملا کر دوسری رنگتیں بنائی جاتی ہیں ۔

مختلف رنگوں کی اشیاء کی ملاوٹ سے جو تنوّع پیدا ہوتا ہے وہ رنگتوں کی نور کے جذب و اثر کی صلاحیتوں کا رہین ہوتا ہے ۔ جب رنگ برنگ کی چیزیں اکٹھی ہوتی ہیں تو وہ نور کی شعاعوں کو مختلف رنگوں میں جذب کرکے اس کی مقدار گھٹا دیتی ہیں جس سے رنگتوں میں فرق پڑ جاتا ہے ۔ روشنی سے پیدا کی ہوئی رنگتوں میں شعاعوں کا فقدان نہیں ہوتا بلکہ ان کی افراط ہوتی ہے ۔ مادّی اشیاء کی رنگتوں شعاعوں کی کمی سے فرق پڑتا ہے ۔ اس کے برعکس روشنی کی رنگتوں میں ان کی زیادتی ہی سے یہ بات حاصل ہوتی ہے ۔ جس کا مظاہرہ صرف اسٹیج تک محدود ہے ۔ مادی اشیاء اور روشنی کی بنیادی رنگتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ زرد رنگ مادی اشیاء کا بنیادی رنگ ہے اور ہرا روشنی کا ۔ دونوں صورتوں میں علی الترتیب یہ دونو رنگ کسی ملاوٹ کا نتیجہ نہیں ہو سکتے ۔ لیکن ایک دوسرے میں ملاوٹ سے حاصل ہو سکتے ہیں ۔ ملاوٹ سے پیلا رنگ روشنی میں اور ہرا مادی اشیاء میں ہویدا ہوتا ہے

مصوّر صرف مادی اشیاء کی رنگتوں کا استعمال کر سکتا ہے ۔ اس لئے مادی اشیاء کی بنیادی رنگتوں اور ان کی مختلف آمیزشوں ہی سے ہمارا سابقہ پڑ سکتا ہے ۔ اثر و تاثیر کے اعتبار سے اشتعال اور تسکین ہی رنگتوں کی خاصیت قرار پاتی ہے ۔ سرخ اور سرخی مائل رنگتوں سے اشتعال اور نیلی اور نیلگوں رنگتوں سے تسکین میسّر آتی ہے ۔ سرخ رنگت اپنی شوخی و شدّت کے باعث ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے چونکہ پیلی رنگت نور کی مظہر ہے اور اس سے تازگی و مسرّت ٹپکتی ہے اس لئے اس میں سرخی کی آمیزش سے جو نارنجی رنگ بنتا ہے اس میں بھی یہی خاصیت پائی جاتی ہے ۔ نیلی رنگت سے دوری اور سکون کا احساس ہوتا ہے ۔ نیلی پیلی کو ملانے سے عنابی رنگ بنتا ہے یہ رنگ پرسکون مگر نمائشی ہوتا ہے ۔

نظامِ فطرت میں ہری رنگت کی فراوانی ہے ۔ سبزی سے آنکھوں کو تازگی اور دل کو سرور ملتا ہے ۔ اگر اس میں نیلا رنگ شامل کر دیا جائے تو اس کے اثرات میں بغایت اضافہ ہو جاتا ہے ۔ درمیانی رنگت ان رنگتوں کے اثرات کو نمایاں کرتی ہے جن کو ملا کر وہ طیّار کی جاتی ہیں ۔

رنگ جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے نور ہی کا پرتو ہے اس لئے رنگ و نور کا اجتماع ایک فطری چیز ہے ۔ چنانچہ ہر رنگ میں کچھ نہ کچھ فروغ ہوتا ہے یہی فروغ رنگ اور رنگت کے اختلاف کا ضامن ہے ۔ رنگوں کے فروغ کی مقدار گھٹائی بڑھائی جا سکتی ہے ۔ اور ان میں اختلاف پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ سپیدی سے فروغ کو بڑھایا اور سیاہی سے گھٹایا جاتا ہے ۔ وہ رنگت جو انتہائی فروغ کی حامل ہوتی ہے سفید سے نسبتاً زیادہ سیاہ اور جو کم سے کم فروغ کی مظہر ہوتی ہے کالی کی بہ نسبت زیادہ پرنور یا منوّر ہوتی ہے ۔ سپیدی کی آمیزش سے رنگ ہلکا کیا جاتا ہے اور سیاہی کے استعمال سے تیرگی یا چھاؤں کا ظہور ہوتا ہے ۔ سپیدی ملانے سے رنگت طرفہ تر اور مسرّت اثر ہو جاتی ہے مگر سیاہی کی آمیزش سے سنجیدگی اور عمق عود کر آتا ہے ۔ اول الذکر میں لطافت ہوتی ہے اور اس کا اثر سرور آگیں ہوتا ہے لیکن آخر الذکر میں بھاری پن ہوتا ہے جو اداسی کا پہلو لئے رہتا ہے

رنگتوں کا ایک دوسرا وصف شوخی ہے ۔ اس کا تعلق رنگتوں کی مقدار اور آمیزش سے ہے ۔ رنگتیں ایک دوسری کی معاون کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہیں ۔ اور ان سے شوخی اور کمی میں اضافہ ہو سکتا ہے رنگتوں میں جتنی زیادہ شوخی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ وہ جاذب توجہ ہوتی ہیں ۔ شوخی میں جتنی کمی آتی جاتی ہے ان کی یہ صلاحیت اسی اعتبار سے کم ہوتی جاتی ہے شوخ رنگ اگر کم رقبہ کو احاطہ کرتا ہے تو دیدہ زیب ہوتا ہے لیکن اس کا غیر معمولی پھیلاؤ آنکھوں میں کھٹکتا ہے ۔ بالعموم شوخ رنگتیں یکسانیت کے پھیکے پن کو دور کرنے ہی کے لئے استعمال کی جاتی ہیں ۔ رنگوں کے استعمال میں فطرت کی متابعت لازم ہے ۔

وزن، تناسب، ربط، لطافت اور ہم آہنگی وغیرہ بھی وہ اوصاف ہیں جو خطوط وضع اور رنگ سب میں مشترک ہیں ۔ تصویر میں وزن دراصل جذبات ہی کا ہوتا ہے ۔ اگر اسے صحیح طور پر نبھایا جا سکے تو دلکشی میں فرق نہیں آ سکتا ۔ اپنے اپنے وزن ہی کے مطابق خطوط وضع اور رنگ ہماری توجہ کو جذب کرتے ہیں ۔ ایک ہی سمت کو کھینچے ہوئے خطوط کی رفتار میں سرعت

آجاتی ہے ۔ یہی خطوط کا وزن ہے ۔ وضع کا وزن اس کی جسامت پر منحصر ہے جسامت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی وزنی سمجھی جائیگی ۔کشش کے ساتھ ساتھ وزن بڑھتا ہے ۔ ایک بڑی چیز چھوٹی چیز کی بہ نسبت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے ۔خطوط کا الجھاؤ ان کی سادگی کی بہ نسبت زیادہ توجہ کا مستحق ہوتا ہے اس سے ان کا وزن بڑھ جاتا ہے ۔ توازن قائم رکھنے کا ایک گر یہ بھی ہے کہ جذبات کے اتار چڑھاؤ میں حسب موقع کمی و بیشی روا رکھی جائے ۔تضاد کے بڑھاؤ گھٹاؤ سے بھی وزن بڑھتا اور گھٹتا ہے ۔ یکساں رنگ کبھی بھلے نہیں معلوم ہوتے ۔ مخالف رنگوں کے استعمال سے ان کی جاذبیت بڑھ جاتی ہے ۔ یکساں سامتوں کو ایک دوسرے سے پرے رکھ کر توازن قائم کیا جا سکتا ہے ۔ یہی چیز چھوٹی بڑی چیزوں کا فاصلہ کم کر کے بھی مل سکتی ہے ۔

توازن برابر اور نابرابر دونوں طرح کا ہوتا ہے ۔ دونوں سروں پر دو ہموزن اشیاء کے رکھنے سے توازن کی یکسانیت قائم رہتی ہے ۔ لیکن اس کی کثرت دلکشی کی حامل نہیں ہوتی ۔ نابرابر توازن کے حصول کے لئے نابرابر اشیاء کو سروں سے ہٹا کر رکھا جا سکتا ہے ۔ رنگوں کا توازن قائم رکھنے کے لئے مخالف رنگوں کا استعمال کرنا یا یکساں رنگوں کی قربت و دوری میں اضافہ کرنا ضروری ہوتا ہے ۔خطوط کا وزن کم کرنے کے لئے مخالف سمتوں سے خطوط کھینچے جاتے ہیں ۔

جس طرح موسیقی سُر لَے اور تال کی پابند ہوتی ہے اور اس کے یہ اجزائے ترکیبی ایک سم کے تحت گرداں رہتے ہیں اسی طرح مصوّری کے عناصر اربعہ میں بھی ہم آہنگی ہونا ضروری ہے ۔ ہم آہنگی کو شعر کی بحر یا اس کے وزن کے مترادف سمجھنا چاہئے جو فی الحقیقت ایک معینہ رفتار ہی کا دوسرا نام ہے ۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں ــــ سانس کا مدّ و جزر سب ایک قاعدہ کلیّہ کے پابند ہیں اور ان کا درمیانی وقفہ بالکل برابر ہوتا ہے گویا ہماری زندگی کا انحصار یہی مدّ و جزر و اوزان پر ہے ۔ اس لئے اگر ہم فطرتاً ہم آہنگی کے دلدادہ ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ۔

تصویر میں خطوط اور جسامت دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ ملتی ہے لیکن اس سے حسن کاری کا اہتمام نہیں ہوتا ۔ مختصر یہ کہ ہم آہنگی فنِ مصوّری کا سنگِ اساس ہوتے ہوئے بھی بجائے خود اس فنِّ لطیف کا بدل نہیں ہو سکتی ۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے آوازوں کی معینہ رفتار کے اعادہ کو لَے دُھن یا ترنم تو کہا جا سکتا ہے مگر موسیقی کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا حالانکہ اس کے قصرِ بلند کا سنگِ بنیاد یہی لَے یا دُھن ہوتی ہے ۔

تصویر سازی میں پیمانہ کی کمی و بیشی تو ایک اختیاری امر ہے مگر متناسب اعضاء متوازن خطوط اور موزوں رنگوں کے بغیر مصوّر اپنے فریضہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ۔ اسی اتحادِ ثلاثہ سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے ۔ ہم آہنگی دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو وہ جو وضع و پیمانہ کی یکسانیت کے تابع ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں پیمانہ کو ایک مفروضہ کلیّہ کے تحت بتدریج کم یا زیادہ کیا جاتا ہے اس طور سے پہلی صنف کو وضعی یا اصولی اور دوسری کو غیر وضعی یا بے اصولی کہا جا سکتا ہے ۔ پہلی صنف سے حواشی اور دوسری سے سطح مترتب ہوتی ہے ۔

خطوط اور جسامت جب ایک دوسرے سے قدم ملا کر چلتے ہیں تو وضعی ہم آہنگی معرضِ وجود میں آتی ہے ۔ درمیانی فاصلہ کی برابری سے بھی اسے قائم رکھا جاتا ہے ۔ لیکن اس کی یک رنگی کے نقص کو دور کرنے کے لئے غیر وضعی ہم آہنگی کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ اس تضاد سے وہ بے کیفی و خشکی دور ہو جاتی ہے جو یکسانیت کا خاصہ ہے ۔ سپاہیوں کی مارچ کا جوش و خروش اور رقاصہ کے پاؤں کی لطیف حرکات کی مٹھاس سے ہمارے جذبات پر مختلف النوع اثرات ہوتے ہیں ۔ مصوّر کا منتہائے مقصود ہم آہنگی سے یہی کام لینا ہوتا ہے ۔

تصویر میں متعدد مراکزِ کشش ہوتے ہیں لیکن ان کے مناسب مدارج کا تعین کرنا بڑی کاریگری کا کام ہے ۔ ان مراکز میں کسے فوقیت دی جائے اور کسے ذیلی حیثیت سے نمایاں کیا جائے اس کا فیصلہ اس اصول پر کیا جاتا ہے کہ جس مخصوص رس یا جذبہ کی تحریک کی خاطر تصویر بنائی گئی ہے اس کی نمائندگی کرنے والی چیز کو افضل رکھا جائے ۔ اور اس کے زیر سایہ اس کے معاونین کو اس اہتمام سے جگہ دی جائے کہ سارے کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی تمام تر توجّہ اصلی مرکزِ کشش پر مرکوز رہے اور دیگر مراکزِ کشش بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو سکیں ۔ اس لئے ہم آہنگی میں اختلاف کو اسی حد تک گوارا کیا جاتا ہے ۔ جہاں تک اس سے الجھن نہ پیدا ہو ۔ تصویر کا پس منظر ہمارے سامنے ایک موضوع پیش کرتا ہے جو بظاہر اس موضوع سے مختلف ہوتا ہے لیکن اس اختلاف میں بھی گہرا رشتۂ اتحاد پنہاں ہوتا ہے

جیسے ناٹک میں ہم ایک مسلسل کہانی اداکاروں کے چہرے مہرے کی تبدیلیوں میں پڑھتے وقت انواع و اقسام کے پردوں کو بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ ان پردوں سے بھی کہانی کی وضاحت و صراحت ہی ہوتی ہے۔

اختلافات کے ذریعے مصوّر کشش پیدا کرتا ہے اور نگاہ کو اصلی منظر کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ ہماری نظر سطح سے اٹھ کر نقش پر پڑتی ہے تصویر میں متعدد نقوش ہو سکتے ہیں لیکن جسے اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے اس کی تفصیلات کو بھی نمایاں کرنا پڑتا ہے کبھی کبھی منظورِ نظر کو ایک مخصوص مقام پر فائز کر کے بھی یہ کام لیا جاتا ہے۔ یہ مقام مرکز وسطی سے جتنا قریب ہوگا اتنا ہی اہم ہوگا۔ کسی پیکر تصویر سے دیگر اوضاع کو دور ہٹا کر یا قریب لا کر بھی اس کی اہمیت کو گھٹایا بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس کی جسامت بڑھا کر اس کے وزن میں اضافہ کر کے یا رنگت کو جلا دے کر بھی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اجتماعی تصاویر میں سواریوں' آرائش و زیبائش' مقام کی بلندی و پستی' لباس کی نفاست اور حسنِ صورت وغیرہ سے بھی کسی فردِ واحد کو امتیاز و برتری مل سکتی ہے۔ لیکن حفظ مراتب کے احساس کی مظہر حرکات و سکنات کا مظاہرہ کر کے کسی فردِ واحد کو ممتاز بنانا آسان کام نہیں ہے۔

تصاویر میں تضاد کا تنوع ہوتا ہے۔ مگر یہ تنوع متحد المرکز ہونا ضروری ہے۔ جس طرح درخت کا تنہ اور شاخیں سب مل کر پورے درخت کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دیتے ہیں اسی طرح تصویر کے مختلف مظاہر و مناظر کا اجتماع ایک ہی نقطہ خیال کی وضاحت میں محو نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں کمتری و برتری کے احساسات کے تاروں کو چھیڑ کر الجھنوں کو سلجھایا اور انتشار و بے قاعدگی کو باقاعدگی و خوش سلیقگی کی نورانی فضاؤں میں گم کر دیا جاتا ہے۔

تناسب کو جملہ فنونِ لطیفہ کی روحِ رواں مانا گیا ہے۔ شعر مختلف نگر موزوں آوازوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان آوازوں کا درمیانی وقفہ اس درجہ متناسب ہوتا ہے کہ اس سے تسلسل و روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیائے مصوّری میں یہ تناسب افراد و مناظر کے درمیانی بعد یا فاصلہ سے قائم رہتا ہے۔ جس کے لئے سطح کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ تناسب میں ایک خاص کشش ہوتی ہے جو سطح کے اختلاف سے بڑھ جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مربع کے مقابلے میں مستطیل زیادہ خوشنما معلوم ہوتی ہے کیونکہ ضلعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تناسب میں پیمانہ کی کمی و بیشی سے تنوع پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جس میں سب سے زیادہ کشش ہوتی ہے وہی تناسب بہترین قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی اختلاف کی کثرت کشش کا خون کر دیتی ہے۔

وفا کرہانی

غزل

غم ہی غم بے شمار کیا کہئے
لطفِ پروردگار کیا کہئے

جب سے دیر و حرم ہوئے تعمیر
عشق ہے بے دیار کیا کہئے

کس نزاکت سے دل دھڑکتا ہے
ہو کے امیدوار کیا کہئے

کتنی مظلوم کتنی ظالم تھی
نگہِ شرمسار کیا کہئے

ذرّے ذرّے کے دل میں ہے بیتاب
عزمِ انجم شکار کیا کہئے

آسماں گیر ہو گئی کیونکر
ایک مشتِ غبار کیا کہئے

آشیانے لٹے، چمن اجڑے
کیسی آئی بہار کیا کہئے

ناخدا خود ہو جب تذبذب میں
ناؤ کیونکر ہو پار کیا کہئے

جل رہے ہیں چراغ راہوں میں
شوق کا انتظار کیا کہئے

حق پہ جب آنچ آ رہی ہو وفا
تخت بہتر کہ دار کیا کہئے

ساحر ہوشیارپوری

غزل

عدوئے بدگماں کی داستاں کچھ اور کہتی ہے
مگر تیری نگاہِ خوش بیاں کچھ اور کہتی ہے

خزاں کے دم سے اپنی خوش دلی کا ہے بھرم ورنہ
بہار آتے ہی یادِ آشیاں کچھ اور کہتی ہے

سنو دل سے تو پھر ہر نغمۂ عشرت کے پردے میں
الم کی داستانِ خونچکاں کچھ اور کہتی ہے

نظر اُن کی، زباں اُن کی تعجب ہے کہ اس پر بھی
نظر کچھ اور کہتی ہے، زباں کچھ اور کہتی ہے

ہزار انداز سے اہلِ زمیں اب دام پھیلائیں!
نوائے طائرِ عرش آشیاں کچھ اور کہتی ہے

ترے لطف و کرم کا معترف ہے اک جہاں لیکن
کسی مجبورِ غم کی داستاں کچھ اور کہتی ہے

خوشا تیری نظر کا امتیازِ جلوت و خلوت
وہاں کچھ اور کہتی تھی یہاں کچھ اور کہتی ہے

گلستاں میں بہارِ گلفشاں آنے سے کیا حاصل
کہ مستقبل کی تصویرِ خزاں کچھ اور کہتی ہے

وہ میرے حال پر ساحر کبھی جو مسکراتے ہیں
تو دل سے اپنی سعیِ رائیگاں کچھ کہتی ہے

غلام ربانی تاباں

غزل

وہ جانِ شوق بھی جانِ جہاں بھی
مگر اک فتنۂ عصرِ رواں بھی

بہ ایں سازِ وفا و نغمۂ شوق
مجھے بخشا گیا ذوقِ فغاں بھی

ہمیں لب تشنۂ الطافِ ساقی
ہمیں سے گرمیِ بزمِ مغاں بھی

فقط اک داستاں اپنی حقیقت
حقیقت ہے کسی کی داستاں بھی

امینِ رازِ خار و برق و صرصر
حیاتِ رنگ و بو کا رازداں بھی

کہانی غم کی بے ربط و تسلسل
اور اُن کی طبعِ نازک پر گراں بھی

وہ شعلہ تاک کی رگ رگ میں بیتاب
جو بجلی بھی چراغِ آشیاں بھی

کسی کا جلوۂ بے باک تاباں
مرے ذوقِ نظر کا امتحاں بھی

اسے۔ حمید ناز جالندھری

وارث شاہ کا ایک کردار

قومی زبان کی اہمیت مسلم۔ لیکن معاشرے کی روح کو پانے اور سماج کو جنم دینے والے مختلف طبقوں کی ذہنی کیفیات کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں مقامی بولیوں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ یہ بولیاں یا علاقائی زبانیں اس ارتقا کا واضح پس منظر بناتی ہیں۔ جس کا سلسلہ "اشاروں" اور "غوں غاں" سے شروع ہو کر مرصع و مقفیٰ نثر کی گلگشت نظر وادی اور نظم کی تخیلی کائنات تک پہنچتا ہے۔ اس طرح اگر ادبی نقطۂ نظر سے ان بولیوں کا مطالعہ قومی زبان کو صحیح معنوں میں قومیت کا روپ اور خلوص بخش سکتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سماج کی اکثر گتھیوں کو سلجھانے میں بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

یورپ کے ملکوں میں مقامی بولیوں کی اہمیت بدستور تسلیم کی جاتی ہے بلکہ جب سے لسانیاتی تحقیق کا سلسلہ زیادہ وسیع پیمانے پر شروع ہوا ہے۔ محققین ان کے شعر و ادب کی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ ہیں۔ قومی زبان کو عوام کے ذہنوں کے قریب لانے اور اسے معاشرے کی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے ان بولیوں میں نظم کئے گئے قصوں اور کہانیوں کو مختلف قومی زبانوں میں منتقل کرنے کا رواج روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی مجلسِ ادبا کی کوششیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مجلس نے مختلف جمہوریتوں کی بولیوں پر تحقیق اور تراجم کے لئے ایک خاص ادارہ قائم کیا ہے جس نے آج تک بیسیوں کتابوں کو ازسرِ نو شائع اور ترجمہ کیا ہے۔

پنجاب کی مجلسی زندگی کے متعلق کسی شخص کا علم اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک کہ وہ پنجابی سے کما حقہٗ واقفیت نہ رکھتا ہو۔ کنارِ راوی کے باسیوں کے احساسات کی ترجمانی تبھی ممکن ہے جب فن کار نے بڑ کے گھنے اور چھتنار درخت کے نیچے بیٹھ کر گاتے کسانوں سے ماہیا سنا ہو۔ جب اس نے گھٹنوں گھٹنوں "لنگے" پہنے دوشیزاؤں کو پانی کی گاگریں بھرتے دیکھا ہو۔ بہر نو پنجاب کو سمجھنے کے لئے پنجابی کا جاننا اشد ضروری ہے۔ اور پنجابی کو جاننے کے لئے "ہیر وارث شاہ" کا۔

بیشتر اس کے کہ ہم ہیر وارث کا ذکر کریں۔ پنجابی کی ابتدا کے متعلق ایک مختصر سا تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ "پنجابی کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو اس کو لاہوری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور ابوالفضل ملتانی کہتے ہیں۔ مغربی مؤرخین نے شمالاً جنوباً ایک خط کھینچ کر مشرقی اور مغربی حصوں میں اسے تقسیم کر دیا ہے۔ مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی رکھا ہے اور مغربی حصّہ کی زبان کا نام لہندا۔ پنجابی کو وہ مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں۔ اور لہندا کو بیرونی دائرہ میں داخل کر کے سندھی اور کشمیری کا رشتہ مانتے ہیں"۔ یہ لکھنے کے بعد حافظ محمود شیرانی مرحوم اہل پنجاب کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی چیز ہے مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے۔ وہ اصولی نہیں۔ بلکہ تدریجی اور ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر پیدا ہوتا چلا گیا ہے۔ اور یہ تقسیم ہر حال میں ناجائز ہے"۔

جدید تحقیق نے بھی حافظ محمود شیرانی مرحوم کی رائے کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ دراصل یورپین محققین کو یہ غلط فہمی پانچ دریاؤں کی موجودگی کی وجہ سے ہوئی۔ انہوں نے مختلف دوآبوں کو الگ الگ وحدتیں تسلیم کیا اور ساتھ ہی مقامی رسم و رواج سے ناواقفیت بھی اسی چیز کا سبب بنی۔

ایشیا کے دوسرے بڑے شاعروں کی طرح وارث شاہ کے زمانہ کے متعلق بھی مختلف رائیں ہیں۔ لیکن اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی بنا پر ہمیں شاعر کی طبع اور حالات کے متعلق اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ وارث شاہ ایک سیلانی فقیر تھے۔ فارسی نظم و نثر پر شاہ صاحب کو کافی عبور تھا سعدی کی گلستان، ابوالفضل، سکندرنامۂ نل دمینتی، قرآن سعدین اور دیوان حافظ

جیسی کتابیں مدرسہ میں پڑھیں۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب نے اللہ باری، رازق باری، صادق باری، اعظم باری اور طوطی نامہ فارسی کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں سے اکثر آج کل ناپید ہیں۔

پنجاب کے بیشتر اضلاع میں گھومے۔ دنیا دیکھی۔ کائنات اور اس کے باسیوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس طرح عرفان کی اس منزل پر پہنچے جہاں وجدان اور تجربہ ایک ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے دل کی دھڑکن کو سُنا اسے اپنے شعور کی روشنی سے منوّر کرنے کے بعد بیان کر دیا۔ اپنی کتاب کی نسبت لکھا ہے:۔

گوشے بیٹھ کے ہیر کتاب لکھی یاراں واسطے نال قیاس دے ہیں
پڑھن گھبرو دلیں وچ خوشی ہو کے پھل بھیجیا واسطے باس دے ہیں
ہور شاعراں چکیاں جھوتیاں نی غلہ پیسیا وچ خراس دے ہیں
سمجھ لیں عاقل غور فکر کر کے بھید رکھیا وچ بھاس دے ہیں

(میں نے ہیر کو با شعور انداز میں اس لئے لکھا کہ اسے میرے دوست پڑھیں اور ملک کے نوجوان اس پھول کی خوشبو سے اپنے ذہن معطّر کریں۔ میں نے دوسرے شاعروں کی طرح محض مشاہدے اور تجربے کی نمائش نہیں کی۔ بلکہ ہر بات کو اچھی طرح جانچنے کے بعد اشاروں میں بیان کیا ہے۔ تاکہ عقلمند اس پر غور کریں)

ماحول فطرتِ انسانی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ احساس کی کشمکش اور ذہنی نشو و نما کے ماحول سے ربط کے طور طریقے کا بیان کوئی وارث شاہ سے سیکھے۔ سنیئے صبح کا بیان ہے:۔

ہوئی صبح صادق جدوں آن روشن اُکھیں لالیاں آن چہلانیاں نی
کاروبار وچ ہویا جہان شاغل چرخے کتدیاں اُٹھ سوانیاں نی
چڑی چوہکدی نال اُٹھ ٹرے پاہندی پیاں دودھ دے وچ مدھانیاں نی
گھر بار ناں چکیاں جوتیاں نی جنہاں نادناں گھر لکانیاں نی
اُٹھ غسل دے واسطے جان دوڑے چھیجاں جنہاں نے رات نوں مانیاں نی

(صبح جب درختوں پر شفق رنگ سرخی اپنی بہار دکھاتی ہے۔ تو ہر کوئی اپنے کاروبار میں مشغول ہو جاتا ہے۔ عورتیں چرخے کاتنے شروع کر دیتی ہیں۔ صبح کے راہی اپنا سفر جاری کر دیتے ہیں۔ کچھ دودھ بلوتی ہیں۔ تو کچھ کھانا پکانے کے لئے آٹا پیسنا شروع کرتی ہیں۔ محبوب کے وصل سے شاد کام غسل کے لئے دوڑتے ہیں)

صبح کا کیسا اچھا سماں باندھا ہے۔ دیہات کی صبح — وارث شاہ نے تفصیل سے بچتے ہوئے بھی ہر چیز کہہ دی ہے۔ الفاظ کا جڑاؤ اور بیان کا زور آپ کو اکثر زبانوں میں ایسا بیان نہیں ملے گا۔

ہیرو اور ہیروئن کے بعد ہیر وارث شاہ کا سب سے نمایاں کردار سہتی ہے۔ سہتی اور جوگی (رانجھا) کی گفتگو کتاب کے ایک طویل حصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ کہنے کو تو یہ گفتگو صرف سہتی اور رانجھے تک ہی محدود ہے لیکن دراصل ان مکالموں کی صورت میں وارث شاہ نے پنجاب کی گھریلو زندگی کے متعلق اپنے تجربات کا نچوڑ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ وارث شاہ نے سہتی کی زبان سے درختوں کی گھنی چھاؤں تلے جھولا جھولتی ہوئی، بھینسوں کا دودھ دوہتی اور گندم کی ہری بالیوں سے کھیلتی ایک تندرست اور حسین دیہاتی دوشیزہ کے دل کی دھڑکنوں کا شمار پیش کیا ہے۔ جو بیک وقت بہن بھی ہے اور نند بھی۔ محبوبہ ہوتے ہوئے بھی ایک عورت ہے۔ اس کی نس نس میں زندگی ہے۔ وہ کمزور ہے۔ لیکن مرد کی کمزوریوں سے آگاہ اخلاقی ضابطے اور سماجی مشکلات جب اُسے کسی ایک راستے پر نہیں چلنے دیتے۔ جب سوچ مفلوج ہو جاتی ہے۔ تو وہ دل سے مشورہ کرتی ہے۔ اور پھر کوئی چیز یہاں تک کہ موت کا خوف بھی اُسے اس مشورے پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتا۔ وہ ایک الھڑ دوشیزہ کی سچی اور بے لاگ تصویر ہے۔ مختلف مواقع پر اس کا ردّ عمل۔ وارث شاہ نے کہیں بھی اُسے بے جان نہیں ہونے دیا۔

گو ہیر کے کردار کو استوار رکھنے کی کوشش وارث شاہ نے جا بجا کی ہے۔ لیکن اکثر جگہ اس کی محبوبیت غالب آ گئی ہے۔ اس کی عظمت اور وقار کی روح نے جب کبھی جھنجھوڑا لیا۔ کوئی نہ کوئی سماجی الجھن، کوئی نہ کوئی "اخلاقی بند" اُسے رام کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پہلی دفعہ ہمیں اس کی روح کا باغی عنصر اس وقت دکھائی دیتا ہے جب اس کا والد اس کی شادی کھیڑیوں کے ہاں کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ ہیر اپنی والدہ سے جھڑپ لینے کے بعد رانجھے کے پاس آتی ہے اور اس سے کہتی ہے۔

ہیر آکھیا رانجھیا قہر ہویا ایتھوں چل جے اٹھ کے چلنا ئیں
دونویں اٹھ لمبڑے راہ پیئے کوئی اساں نے دیس نہ ملنا ئیں
جدوں جھگڑے وڈی میں کھیڑیاں دے کسے اساں نوں مول نہ گھلنا ئیں
ماں باپ نے جدوں ویاہ دتا کوئی اساں دا زور نہ چلنا ئیں

(ہیر رانجھے کو اپنے باپ کے ارادے سے باخبر کرتی ہوئی کہتی ہے۔ کہ اب وقت ہے۔ کہ ہم اس دیس کو خیرباد کہہ دیں۔ کیونکہ شادی کے بعد کوئی ہمیں نہیں ملنے دیگا)

لیکن یہ زور و شور زیادہ دیر قائم نہیں رہتا اور جب رانجھا یہ کہتا ہے۔

معلوم ہویا تیرے سخن اُتوں چلے دستی ایں ہتھ کالیا ندے

(تیری باتوں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ تو بے راہوں کی راہ اپنانا چاہتی ہے)

آگ دب جاتی ہے۔ اور وہ رضائے الٰہی پر شاکر ہو جاتی ہے۔ ہیر کے کردار کو جابجا شاعر سہارا دیتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے سہتی کے کردار میں عظمت اور وقار کی جھلک ہے۔ "باتوں میں گلوں کی خوشبو" کے ساتھ ساتھ تمکنت اور شعور کی ایک لہر بھی ملتی ہے۔ اس کی محبوبیت کا انداز انفعالی نہیں۔ نہ ہی اس کی محبوبیت اس سے نسوانیت کا غرور چھینتی ہے۔ اُس کے سینے میں جلن ہے۔ لیکن وہ اُسے ماحول کی "تنگ دامنی" کے ہاتھ فروخت نہیں کرتی۔

رانجھا جوگی بن کر رنگ پور جا نکلتا ہے۔ سہتی کی سہیلیوں اور سہتی سے ملاقات ہوتی ہے۔ کافی دیر تک نوک جھونک رہتی ہے۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ کس قدر جاندار ہے۔

سہتی گج کے آکھدی چھڈ جٹا کھوہ سبھ نوالیاں سٹیاں نی
ہور سبھ ذاتاں ٹھگ کھادیاں نی پر ایس ویہڑے وچ جٹیاں نی
ایہہ رمز نہ سنی ہے راولا دی رناں جٹیاں ہور سبھ چٹیاں نی
تیری پیری فقیری سبھ کھول دیئے ساڈے نال جے کرے اپٹھیاں نی
کدی وید حکیم بن آونا ایں گلاں کرنا ایں بھوآں کٹھیاں نی
اساں اینتی گل معلوم کیتی ایہہ جٹیاں ملک دیاں ڈھٹیاں نی
گھر جٹاں دے منگ نہ ڈھیوئی منگ ڈھیو خوجیاں ہٹیاں نی
تاواں رمزداراں گلاں تیریاں نی تندرے ڈھنگ کھلار کے سٹیاں نی

گنتے چھیڑ کے ویہڑے دے مگر لاویں پھریں نہدا پٹیاں بھٹیاں نی
جنہاں جٹیاں دے نال اڑی بدھی انہاں کجھ نہ کھٹیاں کھٹیاں نی

(سہتی رانجھے کی باتوں پر خفا ہو کر اسے ڈانٹتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ کہ تم نے بہت سی ذاتوں کو لوٹا ہے۔ لیکن یہاں تمہارے چھلے کام نہیں دیں گے۔ کیونکہ اس صحن میں جاٹ عورتیں بستی ہیں۔ اور ساتھ ہی اسے بتاتی ہے۔ کہ کیا تم نے راولوں کی یہ مثل نہیں سنی کہ عورتیں تو صرف جٹیاں (جاٹ عورتیں) ہی ہیں۔ باقی تو نام کی عورتیں ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ ٹیڑھے چلنے کی کوشش کرو گے۔ تو نقصان اٹھاؤ گے۔ اور اس پیری فقیری کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے گا۔

تم نے آج تک کبھی جاٹوں کے گھر سے بھیک نہیں مانگی۔ اس لئے تمہیں ان کی عورتوں کا کچھ پتہ نہیں۔ تم باتیں تو خوب بناتے ہو۔ لیکن یہ چال یہاں کام نہیں دیں گے۔ ابھی گنتوں کو چھیڑتی ہوں۔ تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ جاٹ عورتوں سے کس طرح بات کرتے ہیں۔ جنہوں نے جاٹ عورتوں سے ضد باندھی انہوں نے کچھ فائدہ نہ پایا)

لیکن نسوانیت کا غرور اس سے اس کا عورت پن نہیں چھینتا وہ ایک دردمند دل بھی رکھتی ہے۔ وہ رانجھے کا کاسہ توڑ دیتی ہے لیکن اس کے ماحول کے عطا کردہ وہم اُسے رانجھے کی بددعاؤں کے سامنے لاچار کر دیتا ہے۔ وہ تقدیر کا سہارا لیتی ہے۔

گیا بھج تقدیر دے نال ٹھوٹھا لے جا قیمت ساتھوں ہٹ دی وے
تقدیر اللہ دی نوں کون موڑے تقدیر پہاڑاں نوں پٹ دی وے

سہتی کی اس گفتگو میں وارث شاہ نے دیہات کے توہم اور بے بنیاد عقیدوں کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ وہ عقیدے جو اس ماحول میں اس درجہ رچ چکے ہیں کہ ایک روایت بن گئے ہیں۔

اس کی طبیعت میں ایک الھڑ دوشیزہ کا خمار ہے۔ جذبات کی ہیجان خیزی کے ساتھ ساتھ ایک متوازن طبع بھی پائی ہے۔ وہ سب کچھ برداشت کر لیتی ہے۔ لیکن اس کے کنوارپن پر حملہ اس سے برداشت نہیں ہوتا۔ وہ رانجھے کی اس گستاخی پر اسے پیٹتی ہے اور اسے دھکے دے کر باہر نکال دیتی ہے۔

لیکن جب ہم آگے چلتے ہیں۔ تو حیرانی ہوتی ہے۔ کہ وارث شاہ آج

سے کئی سو برس پیشتر بھی تمثیل کے فن سے کس قدر شناسا تھا۔ وہ ماحول کی مطابقت کا کس قدر خیال رکھتا ہے۔ سہتی ہیر کی منت زاری پر جب دوبارہ جوگی کے لئے خیرات لاتی ہے۔ تو اس کی ذہنی کشمکش رنگ لاتی ہے۔ جوگی اس کی طشت میں لائی ہوئی خیرات کو اپنے "جوگ" کے بل پر بدل دیتا ہے' سہتی کا رُواں رُواں کانپ اُٹھتا ہے۔ اُس کی کمزوری اسے پھر لوٹ لیتی ہے۔ وہ جوگی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہے۔

وارث شاہ نے اس کردار کو اس کے ماحول اور سماج کے تقاضوں کے درمیان کچھ اس طرح نکھارا ہے کہ اُس کی مثال اکثر زبانوں میں نہیں ملتی۔ اس میں ساوتری کا حوصلہ اور دروپدی کا اخلاق ہے۔ اردو زبان میں مثنوی میر حسن کی مہرالنسا کچھ کچھ اس سے مناسبت رکھتی ہے۔ اردو ناول میں امراؤ جان ادا کا کردار اپنے ماحول کی نمائندگی کے اعتبار سے کچھ کچھ سہتی کے کردار سے ٹکر لیتا ہے۔ لیکن سہتی کا کردار کئی حالتوں میں اس سے بڑھ گیا ہے۔

اجتماعی ترقّی کے منصوبے

چودھویں اگست کو جہاں ایک طرف ملک بھر میں یوم آزادی منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں وہاں نیلوکھیڑی کیمپ میں اجتماعی ترقی کے منصوبوں سے متعلق افسروں کو ان کے مشن اور کام کے بارے میں آخری درس بھی دے دیا گیا۔ اس کیمپ میں ایک دفعہ پھر ہاتھ کی محنت کی قدر و قیمت کی وضاحت کی گئی۔ مجتمع افسروں کو بتایا گیا کہ انہیں کس طرح دیہات کے لوگوں سے مل جل کر دیہات کی اصلاح و ترقی کی تدبیریں کرنا ہے۔ دیہات بھارت کے معاشی نظام کی پشت و پناہ ہیں اور اس نظام کی مضبوطی اور شادکامی کا انحصار دیہات کے کسانوں۔ کاشتکاروں اور زمینداروں پر ہے۔ یہ کاشتکار اور کسان اکثر محنتی اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی۔ ماحول اور قدروں کو جدید زمانہ کے معیاروں کے مطابق بنانے کے لئے بہت سارا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اجتماعی ترقی کے منصوبے اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہیں۔

نیلوکھیڑی کے کیمپ کا افتتاح پردھان منتری نے ۱۲ر جولائی کو نئی دہلی سے ایک نشری تقریر کے ذریعہ کیا۔ یہ کیمپ مختلف ریاستوں کے افسروں کو اجتماعی ترقی کے منصوبوں سے متعلق تعلیم و تربیت دینے کے لئے شروع کیا گیا تھا۔

شہر کے لوگوں کو اپنے درمیان آتے دیکھ کر گاؤں کے لوگ اکثر شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں چنانچہ ان افسروں کو بھی پہلے ہی دن ان شکوک سے سامنا ہوا۔ کھیتوں اور میدانوں میں جا کر عملی کام کرنا ان افسروں کے پروگرام کا نہایت اہم حصہ تھا۔ اب ان افسروں کا ایک گروپ ہاتھوں میں پھاوڑے لئے جو نیلوکھیڑی کے گاؤں میں گیا تو ایک مضبوط اور جفاکش سکھ ان کے گرد ہو گیا اور ان سے طرح طرح کے سوال کرنے لگا۔ ان افسروں نے بتایا کہ وہ اس کے گاؤں میں کھاد کے لئے ایک گڑھا کھودنا چاہتے تھے اور وہ انہیں کوئی جگہ بتائے جہاں گڑھا کھودا جائے۔ وہ سکھ کسان مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ میں چھپا ہوا تمسخر بالکل نمایاں تھا۔ چنانچہ اس نے انہیں ایک ایسی جگہ بتائی جو چٹان کی طرح سخت تھی لیکن ان افسروں نے کوئی گریز نہیں کیا وہ آگے بڑھے اور تین دن کے اندر اندر ایک چوبیس فٹ لمبا۔ چھ فٹ گہرا اور تین فٹ چوڑا گڑھا کھود دیا۔

اب اس سکھ کسان کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ افسر اس کے رفیق اور مددگار تھے۔ چنانچہ تیسرے دن وہ ان سے بغلگیر ہو گیا اور ان کے مشورے و معاونت میں دلچسپی لینے لگا۔ اب ساتھ کے پانچ گاؤں میں کام شروع ہو چکا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں نالیاں تعمیر ہونے لگیں۔ کنوؤں کی مرمت ہوئی۔ کھاد کے لئے گڑھے کھودے گئے۔ درخت لگا دئے گئے اور نئے راستے تعمیر کر دئے گئے۔

کوثر چاند پوری

تصویر

موٹر مچھلی کی مانند سڑک پر تیرتی رہی اور اس کے دونوں طرف کھڑی عمارتیں جیسے آگ اُگل رہی ہوں ان کی اونچی چھتوں اور دیواروں پر پھیلی ہوئی دھوپ چنگاریاں سی اُچھال رہی تھی ۔ موسم زیادہ گرم تو نہ تھا فروری کا مہینہ تو سردی اور گرمی کے بیچ میں ایک ایسا جزیرہ ہے جس کے ایک طرف برف کی جمی ہوئی سلیں ہوتی ہیں اور دوسری جانب کھولتا ہوا لاوا لیکن اس میں نہ برفیلی اور ٹھٹھرا دینے والی ہوائیں آتی ہیں ۔ نہ جسم کو پھونک دینے والی گرم لپٹیں، وہ دونوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے لیکن اس وقت اس کے شعور میں کوئی انگارہ دہک اُٹھا تھا وہ کندھوں پر بال بکھیرے خاموش بیٹھی رہی اور جمیل آدھی آستینوں کی بُش شرٹ پہنے اسٹرنگ گھماتا رہا اس کی گوری کلائیوں پر نیلی رگیں ابھری ہوتی تھیں اور چھوٹے چھوٹے بال ہوا میں لہرا رہے تھے عمارتیں سیدھی قطار بنائے مخالف سمت سے بھاگ رہی تھیں ان کے اس فرار میں کوئی ترتیب نہ تھی، کوئی مقصد نہ تھا بس یونہی بھاگے جا رہی تھیں اور جس وقت موٹر رنگیل اسٹوڈیو کے سامنے سڑک کے ایک کنارے آکر رکی تو عمارتوں کی یہ بھاگتی ہوئی قطاریں بھی جم کر رہ گئیں اور یوں محسوس ہوا جیسے سارا شہر اپنی جگہ قائم ہو گیا اسے بسنت پر اپنی ایک سہیلی کو تازہ تصویر بھیجی تھی کتنی التجا آمیز محبت کے ساتھ لکھا تھا اُس نے — راشدہ — کتنے دن بیت گئے تمہیں دیکھے ہوئے تمہاری صورت دن رات آنکھوں میں پھرتی ہے — لال لال ہونٹ اور ان کے بیچ چمکتے ہوئے موتی سے دانت، ابھرے ہوئے سانولے گال، لمبی سیاہ پلکوں سے ڈھکی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں — لیکن راشدہ ذرا سی دیر میں تمہاری آنکھیں چھوٹی ہو جاتی ہیں اور ان کی کالی چمکدار پتلیوں پر نیلاہٹ پھیل جاتی ہے کبھی وہ بالکل بھوری ہو جاتی ہیں، اور میں سوچنے لگتی ہوں کیا سچ مچ تمہاری آنکھیں چھوٹی ہیں ؟ — اور ان کی پتلیوں کا رنگ گہرے سمندر کی طرح نیلا یا بالکل بھورا ہے — اور ٹھگنی تو تم کبھی نہ تھیں، تمہارا قد کافی لمبا اور حسین تھا، بھرے ہوئے کولھے اسے نیچے اور اوپر کے دو حصوں میں بانٹ دیتے تھے — لیکن اب کبھی کبھی تم بہت ٹھگنی ہو جاتی ہو، اور میں فیصلہ نہیں کر پاتی کہ تم لمبی ہو یا کوتاہ قامت، میں ایک عجیب الجھن میں پڑ جاتی ہوں اور اس الجھن کو مٹانے ہی کے لئے تصویر مانگ رہی ہوں بسنت پر میں اپنا فوٹو تمہیں بھیجوں گی کیا تم اس کے جواب میں اپنی نئی کھنچی ہوئی تصویر مجھے نہ بھیج دو گی ۔ جمیل کوئی بہت بڑے مذہبی آدمی بھی نہیں ہیں کہ ناک بھوں چڑھائیں اور پھر تمہیں بے پردہ تھوڑا ہی کرونگی، خوبصورت سے فریم میں لگا کر اس پر ایک رنگین نقاب ڈال دوں گی — اور جب اس نے اپنے جیون ساتھی جمیل کو یہ خط دکھایا اور اس نے لال رنگ کی موٹی کمانی کی عینک کے دبیز آئینوں کی اوٹ سے خط کی ٹیڑھی لائنوں کو دیکھنا شروع کیا تو راشدہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی، اور اس پر بننے اور بگڑنے والے باریک نقوش کا تجزیہ کرتی رہی جمیل نے خط پڑھا وہ مسکرایا اور پھر رانی کی تائید کرتے ہوئے بولا ۔

ضرور بھیجنا اپنی تصویر تم ! — آج ۲۴ر دسمبر ہے کل شام کو رنگیل چلیں گے اور تم ایک عمدہ سی تصویر کھنچوا لینا ۔ ساڑھی میں تو رانی تمہیں زیادہ پسند نہیں کرتی وہ اسے اپنے ہی حسن کی ایک خصوصیت سمجھتی ہے اور پرانے کپڑوں میں کوئی سوٹ بھی ایسا نہیں جو مجھے بھاتا ہو — نیچی گوٹ کے بے ڈھنگے پائنچوں کے غرارے، اور اونچے کرتے جو تمہارے کولھوں کا سارا حسن غارت کر دیتے ہیں مجھے قطعی ناپسند ہیں، میں آج ہی شاموس کا ایک تھان لے آؤنگا تم ایک شلوار اور قمیص بنوا لینا ایک ہی دن میں یہ نیا سوٹ تیار ہو جائیگا ۔ ہلکے گلابی رنگ کا شاموس تمہارے ان سانولے رخساروں کی دمک کچھ اور بڑھا دیگا کیوں ٹھیک ہے نا ؟ — اور اسی دن تم سفید کرتے پر سرخ رنگ کی شلوار ہی تو پہنے تھیں جب اوپر گہرے نیلے

رنگ کے آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے اور سامنے تالاب کے اس کنارے پر بجلی کے قمقمے چمک رہے تھے' اور ہم پہاڑ پر سڑک کے ایک طرف بیٹھے یہ حسین نظارہ دیکھ رہے تھے' تالاب کا پانی پارے کی طرح شفاف تھا اور بے چین موجیں ایک دوسری سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کے نیچے آسمان کے ستارے' اور بجلی کے قمقمے ایک عجیب حسن کے ساتھ تھرتھرا رہے تھے' تمہارے ماتھے پر چپکی ہوئی بندی چپکے چپکے ان ستاروں اور قمقموں کی تھرتھراہٹ کا جواب دے رہی تھی اسی وقت پہاڑ کی چوٹی سے چاندنی کھیت کرنے لگی تھی - ستاروں اور قمقموں کی چمک پھیکی پڑ گئی تھی لیکن تمہارے ماتھے کی بندی اور دمک اٹھی تھی' سانولا چہرہ ماہتاب کی کرنوں سے تمتمانے لگا تھا' کتنی اچھی تھی وہ شام! —— جمیل نے اس وقت اپنی تجارتی مصروفیت کا بوجھ شعور سے بالکل اتار پھینکا تھا وہ چار سال پہلے والا جمیل بن گیا تھا جب ہی تو آخری جملہ اس نے راشدہ کے حسین گالوں کو چھوتے ہوئے ادا کیا تھا اور راشدہ کی چھاتی میں برسوں کا جما ہوا لاوا پگھلنے لگا تھا جذبات طوفان بن کر رگوں میں پھیل گئے تھے اور آنکھوں کے سامنے ڈھاک کے ہزارہا درخت کھڑے ہو گئے تھے جن پر انگاروں کی مانند لال لال پھول دمک رہے تھے کائنات کہ مٹی کی کھولتی ہوئی دو پہرتے اپنی آغوش میں بھینچ لیا تھا اس نے ایک انگڑائی لے کر سینہ کے مرمریں میناروں کو نمایاں کرتے ہوئے ذرا شوخی کے ساتھ کہا تھا -

دیکھیں یاد بھی رہتی ہے آپ کو آج کی یہ بات؟ یاد کیوں نہ رہے گی بھائی! جمیل کے ایک ٹھنڈے بوسہ نے اس وعدہ پر تصدیق کی مہر لگا دی تھی' پھر دیر تک دونوں مسہری پر لیٹے رہے تھے - راشدہ نے اسی دن رانی کو خط لکھ دیا تھا جمیل اپنے حساب و کتاب میں مشغول ہو گیا تھا اور وہ لکھنے کی میز پر جا بیٹھی تھی جس کے ایک کونہ پر کچھ تصویریں لگی ہوئی تھیں اور بیچ میں ہلکے سُرخ رنگ کا لیٹر پیڈ پڑا تھا - اس کے آس پاس چند قلم بکھرے ہوئے تھے یہ تصویریں ایک سال پہلے تو اسے پسند تھی مگر اب ان میں زیادہ کشش نہ رہی تھی عمر کے ساتھ ساتھ جذبات بھی بھاگتے رہتے ہیں' ناچتے ہوئے تیز و تند بگولوں کی طرح اس نے تصویروں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی - ایک تصویر تو نیچے سے اوپر تک سوکھے ہوئے بانس کی نقل کر رہی تھی - سر سے لے کر پیر تک سارا جسم ایک ہی قطر اور ایک ہی زاویے میں بڑھتا چلا گیا تھا' بڑے بے ڈول اور بھدے انداز سے ایک اور تصویر جو اس کے برابر ہی رکھی تھی کسی فوجی آدمی کی معلوم ہوتی تھی اس کے سڈول جسم میں طول کے ساتھ عرض اور عمق کا پتہ بھی چل رہا تھا اور بدن مختلف زاویوں میں بڑی خوبصورتی سے تقسیم ہوا تھا اس تصویر کی سب سے بڑی خصوصیت اس میں ایک مخلصانہ اکھڑپن کی موجودگی تھی' اور اکھڑپن بظاہر کتنا ہی بُرا ہو اس کے نیچے خلوص اور محبت کی موٹی موٹی تہیں ہوتی ہیں جن میں پختگی' سنجیدگی' اور متانت کا حسین لوچ ہوتا ہے' جو لوگ بظاہر نرم ہوتے ہیں وہ موم کی طرح جلد ہی ہر نقش کو قبول کر لیتے ہیں اور ان کے سینہ میں ہمیشہ فولاد کا دل ہوتا ہے راشدہ نے تصویروں کی طرف دیکھا اور پھر خط لکھنے کے لئے میز پر جھک گئی اس کے بالوں کی لٹیں بار بار آنکھوں کا نقاب بن جاتی تھیں - اور وہ غصہ کے ساتھ جھٹک کر انہیں پیچھے ڈال دیتی تھی غصہ کی گرمی سے اس کے گال دمک اٹھتے آنکھوں کی سرخی اور گہری ہو جاتی اور چھاتی میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ایک بار تو بالوں کا ایک گچھا سانپ کی طرح خم کھا کر اس کی ٹھوڑی کے نیچے آ پڑا تب جمیل نے بھی اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ فوراً میز چھوڑ کر وہ پھر مسہری پر جا لیٹے' لیکن —— کاغذات کے انبار میں اس کی آرزو الجھ کر رہ گئی اور راشدہ خط لکھتی رہی بالوں کی بے چین لٹیں غصہ کی لطیف گرمی کو بھڑکاتی رہیں -

اور اگلی صبح بڑی پر کیف تھی تیز ہوائیں چل رہی تھیں سورج کی کانپتی ہوئی زرد کرنیں کمرے کے پردوں سے یوں کھیل رہی تھیں جیسے کم سن بچہ ابھی ابھی جاگ کر آیا ہو اور ماں کا آنچل پکڑ کر کھڑا ہو گیا ہو' جمیل سوٹ پہنے صحن میں کھڑا تھا وہ چلتے پی کر اب جانے والا تھا - رات کی سی کوئی بات بھی اس میں نہ تھی جس طرح دہکتا ہوا انگارہ بجھنے کے بعد ایک سیاہ نقطہ بنا دیتا ہے اسی طرح جمیل کے جذبات ٹھٹھر کر ادلے کی شکل اختیار کر چکے تھے کاغذات سے بھرا ہوا بیگ اس کے ہاتھ میں تھا اور پیٹ میں مزید ار پراٹھے اور انڈے گڈمڈ ہو کر تھکی ہوئی قوتِ ہاضمہ کو چڑھا رہے تھے رگوں میں خون کی روانی حسب معمول اپنے انداز پر تھی - اعصاب میں نئے نئے پروگرام رینگ رہے تھے حافظہ نے ناموس کے تھان اور اس کے سوٹ کو کبھی کا جھٹک دیا تھا - راشدہ کی نئی تصویر بھی ایک طرف جا پڑی تھی دن گزرتے رہے' رات

اور دن کی فلمیں گھومتی رہیں، بسنت بھی گزر گیا رانی کا پھر ایک خط آگیا، اس نے نہایت حیرت سے پوچھا تھا —— راشدہ تصویر بھیجنا کیوں بھول گئیں تم ؟ اور راشدہ پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی اس نے غصہ میں اپنا گریبان پھاڑ ڈالا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اسی وقت جمیل گھر میں داخل ہوا۔ راشدہ کے رخساروں کی سرخی اب سیاہی میں تبدیل ہونے لگی تھی اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور چہرہ بھیانک ہو گیا تھا جمیل یہ حالت دیکھ کر سہم گیا۔ اس نے جلدی جلدی راشدہ کی آنکھوں میں وہی سرخی اور چھاتی میں وہی ہلچل تلاش کی جس نے اس روز اسے حد درجہ محبوب بنا کر جمیل کے سوئے ہوئے احساس کو جگا دیا تھا لیکن آج تو اس کے غصہ نے خوبصورتی کے سارے ہی نقوش بگاڑ دئے تھے ۔

خیر تو ہے ؟ جمیل نے پوچھا

راشدہ اس پر برس پڑی ۔

آپ کو مجھ سے محبت نہیں ! —— آپ جھوٹے وعدوں میں مجھے الجھا دیتے ہیں اب میں جینا نہیں چاہتی، زندگی اس بے بسی کا نام نہیں —— مسلسل فریب کو بھی زندگی نہیں کہتے، آگ جلنی اور گھٹنی کو بھی اس سے کوئی نسبت نہیں، زندگی تو سکون کو کہتے ہیں، اطمینان اور مسرت کو کہتے ہیں !

جمیل آج بہت ہی زیادہ تھکا ہوا تھا وہ اپنے چند ماتحتوں پر بہت زیادہ خفا ہو کر آیا تھا۔ راستہ بھر وہ یہی سوچتا آیا تھا کہ ان سب کو الگ ہی کیوں نہ کر دیا جائے زیادہ ضبط بھی بے غیرتی کی علامت ہے غصہ کے ساتھ حملہ نہ سہی متانت کے ساتھ مدافعت تو انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اب راشدہ کی باتوں نے اس کے آخری ارادے کو مضبوط بنا دیا اور راشدہ کے مقابلے میں بھی مدافعت کے لئے آمادہ ہو گیا، اس نے اپنے ذہن میں ایک مورچہ بنا کر کہا ۔

معلوم نہیں تم کیسی باتیں کیا کرتی ہو ؟

تمہیں پتہ نہیں میں کتنی الجھنوں میں پھنسا رہتا ہوں !

کبھی سوچنا تو چاہئے تمہیں، میرے سر پر کتنا بوجھ ہے ؟

یہ سارا گھر رکھا ہوا ہے میرے سر پر جس میں تم آرام سے بیٹھی رہتی ہو !

چار نوکر، ایک موٹر، ایک گھر یہ سب میری کھوپڑی پر لدے ہوئے ہیں اور میں اکیلا ایک سنگین ستون کی طرح ان کو اٹھائے کھڑا ہوں معلوم نہیں کس وقت میرے جسم کا ڈھانچہ چرچرا کر بیٹھ جائے !

پانچ سو روپے مہینہ کے مصارف کچھ کم نہیں ہوتے ۔ معلوم نہیں کیونکر میں انہیں پورا کرتا ہوں ۔

میرا ہی کلیجہ ہے کہ ان سارے دھندوں کو چلا رہا ہوں ۔

اور اس پر آپ کے پاؤڈر، لپ اسٹک، غازے، سینٹ کی شیشیاں اور تیل کی بوتلیں ——

میرے سنگار کی چیزیں بھی اب زبان پر آنے لگیں، میں کہتی ہوں چپ ہو جائیے ان چیزوں کا نام لیا ہے تو ..... راشدہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور بنگال میر آئل کی بوتل اٹھا کر فرش پر پھینک دی، پھر افغان سنو کی شیشی —— اور اس کے بعد ایک ایک کر کے سب چیزیں ۔

تم یہ کیا کر رہی ہو ؟ —— یوں میرا بوجھ ہلکا نہیں ہوگا اور بڑھ جائے گا ۔

اب میں ان میں سے کوئی چیز استعمال نہیں کروں گی ۔

شاید تم یہ بھول رہی ہو کہ میں ابھی زندہ ہوں ۔

—— تمہارے سیاہ بالوں کی لٹوں کو سونگھنے اور غازہ ملے ہوئے رخساروں کو چومنے کے لئے !

اور تمہاری زندگی اب ان چیزوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی میرا بس چلے تو میں ابھی اس مکان سے نکل جاؤں تاکہ مکان ہلکا ہو جائے ۔ اور تم آسانی سے اسے اٹھا سکو —— یا پھر مکان ہی چھوڑ دو اس میں بھی تو کافی وزن ہے پچھتر روپے مہینہ ! —— کتنی بڑی رقم ہے یہ ضرور تمہارا شعور اس سے دبا جا رہا ہوگا —— جب ہی تم نے تصویر اور شاموس کے تھان کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا ۔

اور یہ سنتے ہی جمیل کے منہ سے ایک قہقہہ ابل پڑا —— اچھا اب سمجھا میں اس غصے کی وجہ —— معاف کرو راشدہ، میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا اس روز کے وعدے کو رانی غریب انتظار ہی انتظار میں سوکھ رہی ہو گی لیکن تمہیں جنگ شروع کرنے سے پہلے کم سے کم مجھے یاد تو دلا دینا چاہئے تھا، اچانک کسی پر چڑھائی کر دینا تو ٹھیک نہیں ۔

میں کیوں یاد دلاتی ؟

کوئی ہرج نہ تھا !

بالکل تھا۔

آخر پھر اب اسی وقت میں تمہاری تصویر کھنچوا دوں!

نہیں اب ضرورت نہیں، بسنت گزر چکا!

نہیں راشدہ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اسٹڈیننگ اپنے لئے نہیں تو میرے لئے، رانی کے لئے!

میں کسی کے لئے نہیں چلوں گی تم سے میری لڑائی ہے اور رانی خوب جانتی ہے کہ لڑائی میں سارے وعدے ٹوٹ جاتے ہیں اور دوسری اخلاقی پابندیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

اچھا میں تم سے صلح کی درخواست کرتا ہوں تمہیں اس وقت چلنا ہی پڑے گا میرے ساتھ!

بہت اصرار کے بعد وہ موٹر میں بیٹھ گئی اور موٹر ریگل اسٹڈیو کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئی۔ عمارتیں اپنی جگہ قائم ہو گئیں جیسے اس صلح کے بعد فوراً ہی کائنات نے ایک نئی کروٹ لی ہو، عمارتوں نے فرار سے توبہ کرلی ہو۔ دنیا اور انسانیت اپنی جگہ آ گئی ہو جمیل کا دل بدل گیا ہو لیکن راشدہ کے تیوروں میں ابھی آگ جل رہی تھی اس کی پیشانی پر شعلے ناچ رہے تھے چنانچہ جب وہ کیمرے کے سامنے پہنچی ہے اسٹڈیو کا منیجر جس سے ہمیشہ ہی اس نے ہنس کر باتیں کی تھیں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ غصہ میں بھری ہوئی ہے۔

طبیعت کیسی ہے آپ کی؟ اس نے پوچھا۔

میں بالکل اچھی ہوں آپ تصویر کھینچئے!

تصویر تو ضرور کھینچوں گا لیکن آپ کے نقش و نگار میں گرمی بھری ہوئی ہے، میں برسوں کے ری ٹچنگ کے بعد بھی انہیں ٹھنڈا نہ کر سکوں گا اور ممکن ہے تصویر میں کچھ بھیانک پن آ جائے۔

بات یہ ہے جمیل بولا۔ یہ مجھ سے لڑ پڑی ہیں۔

اچھا یہ بات ہے!

آپ تصویر کھینچئے اور جلد تیار کر دیجئے!

کل سے پہلے تو نہ ہو سکیگی!

کل ہی سہی!

اگلے دن منیجر نے تصویر راشدہ کو دیتے ہوئے کہا

دیکھئے میں نہ کہتا تھا کہ تصویر میں بھدا پن پیدا ہو جائے گا۔ یہ دیکھئے آپ کی آنکھیں کتنی پھیل گئی ہیں تیور چڑھے ہوئے ہیں اور نقش و نگار اور نقش و نگار میں حیوانیت بھر گئی ہے! راشدہ نے جلدی سے جملہ پورا کر دیا۔

جی ہاں آپ جانتی ہیں لڑائی تو انسانیت کے نقوش بگاڑ دیتی ہے چہرے کا تو ذکر ہی کیا ہے، آدمی جانور بن جاتا ہے اس میں وحشت اور بربریت کے سوا کچھ رہتا ہی نہیں، ایلورا کی خوبصورتی اور اجنٹا کی دلکشی یہ سب امن ہی کی برکتیں ہیں، منیجر بولتا گیا۔ اس کے لب و لہجہ میں مؤرخ کے قلم کی سی روانی اور خشکی تھی ——— مصوّر اور مؤرخ میں فرق ہی کیا ہے مصوّر انسان کی شبیہہ بناتا ہے اور مؤرخ انسانیت کی تصویر کھینچتا ہے۔

رئیس امروہوی

غزل

قافلے جن کی ہدایت پہ رواں ہوتے ہیں
کسی گمراہ کے قدموں کے نشاں ہوتے ہیں

دلِ وارفتہ! شبِ غم میں کوئی خواب ہی دیکھ
خواب بھی مایۂ بیداریٔ جاں ہوتے ہیں

نفسِ گرمِ عنادل کی حقیقت معلوم
پھولِ "ہیجانِ تجلّی" سے جواں ہوتے ہیں

کس کو معلوم ان اشکوں کی حقیقت اے دوست
روح کی سمت جو آنکھوں سے رواں ہوتے ہیں

دل پہ یوں چھوڑ گیا سیلِ بلا اپنے نقوش
جس طرح ریت پہ لہروں کے نشاں ہوتے ہیں

گاہے گاہے ترے کوچے سے گزرنے والے
رہ نمایانِ جہاں گذراں ہوتے ہیں

جو بدل دیتے ہیں رفتارِ شب و روز رئیس
عشق ہی کے کچھ اشارات نہاں ہوتے ہیں

ذکر و فکر

غزل
محمد عبد الحفیظ

زمیں والوں پہ بہ مشقِ ستم اے آسماں کب تک؟
بہت نازاں ہے تو جس پر وہ دورِ کامراں کب تک؟

کہاں تک باغباں کے ناز اُٹھائیں گے چمن والے
رہے گی میہماں گلشن میں یہ برقِ تپاں کب تک!

بدلنا ہو تو رفتار اپنی بدلیں کارواں والے
یوں ہی مُڑ مُڑ کے میں دیکھوں گا سوئے کارواں کب تک؟

بزورِ فطرتِ آزاد زنداں میں بنا گلشن!
یہ آہ و نالہ و شیون بیادِ آشیاں کب تک؟

بجھانے سے کہیں بجھنے کی ہے یہ آتشِ اُلفت
ارے او دیدۂ گریاں یہ سعیِ رائیگاں کب تک؟

نگاہوں کو فریبِ فصلِ گل بھی تا کجا دوں گا؟
رہے گا گلشنِ اُمید بربادِ خزاں کب تک؟

تسلّی قلبِ مضطر کو کہاں تک دوں بتا اے دوست
یوں ہی دیکھوں شبِ فرقت ستاروں کا جہاں کب تک؟

مزا تو جب ہے دوہرائے زمانہ داستاں میری
کہے گا تو زمانے سے حدیثِ دیگراں کب تک؟

ذرا اپنے دلوں میں دردِ انسانی کرو پیدا
وطن والو! گرفتارِ غمِ سود و زیاں کب تک؟

تلقینِ خیر
محمد نثار الرحمٰن خاں نشا

شکایتِ ستمِ آسماں کو ختم کرو — بپاسِ عشق، غمِ این و آں کو ختم کرو
مصافِ زیست میں ذوقِ یقیں بڑی شے ہے — دلوں سے غلبۂ وہم و گماں کو ختم کرو
جنوں میں وسعتِ ہر دو جہاں پہ چھانا ہے — تو ان قیودِ زمان و مکاں کو ختم کرو
روش روش پہ بہاروں کا نور برسا کر — چمن سے ظلمتِ دورِ خزاں کو ختم کرو
بنا کے ذرۂ خاکِ وطن کو تابندہ — غرورِ مہر و مہ و کہکشاں کو ختم کرو
جہاں میں گر تمہیں آسودگی کی خواہش ہے — تو ہر خرابیٔ عصرِ رواں کو ختم کرو
قدم قدم پہ لٹا کر خلوص کی دولت — تعصبات کے نام و نشاں کو ختم کرو
اگر وقار بڑھانا ہے آدمیت کا — تمیزِ دیدۂ خورد و کلاں کو ختم کرو
جو کچھ بھی کر نہ سکے دردِ بیکسی کا علاج — اُٹھو اور ایسے نظامِ جہاں کو ختم کرو
یہ ظلم و جبر، یہ بندوں کی بندگی تا کے — خدا کے واسطے اس داستاں کو ختم کرو

غزل
پورن سنگھ ہنر

ایک سننے کی بات لایا ہوں — شکوۂ التفات لایا ہوں
تحفۂ شیخ و برہمن کے لئے — آبِ گنگ و فرات لایا ہوں
پھر نہ شاید سُنا سکوں تم کو — لب پہ مشکل سے بات لایا ہوں
دُھوم تیرے کرم کی سُن کر میں — آرزوئے نجات لایا ہوں
رشک ہے خود حیات کو جس پر — وہ طریقِ حیات لایا ہوں
اُن کی محفل سے دل میں رکھنے کو — نگہِ التفات لایا ہوں
ملک الموت مجھ سے کہتا ہے — میں پیامِ حیات لایا ہوں
پوچھنا کیا ہے وسعتِ دل کا — عالمِ بے جہات لایا ہوں
نگہِ صبر سوز کے آگے — میں شکستِ ثبات لایا ہوں
کچھ تصنّع نہیں غزل میں ہنرؔ — قلب کے واردات لایا ہوں

دُنیائے خودی
مسلم الحریری

دُنیائے خودی میں سانس لی ہے تم نے — آوازِ حیات کو بھی دی ہے تم نے؟
منزل کی تلاش میں بھٹکنے والو — اپنی بھی کبھی تلاش کی ہے تم نے؟

سرمایۂ دفترِ جوانی کو پڑھو! — رودادِ کتابِ زندگانی کو پڑھو!
مل جائیں گے سینکڑوں ہی عبرت کے سبق — اوروں کی نہیں، اپنی کہانی کو پڑھو!

سوئی ہے خودی اسے جگاؤ تو سہی! — بے ہوش ہو، ہوش میں بھی آؤ تو سہی!
تقدیر زمانے کی بدل سکتے ہو! — خود اپنے میں انقلاب لاؤ تو سہی!

غزل
مضطر حیدری

مقامِ فکر و نظر ہے بلند بینوں کو — زمیں نے چیر دیا ہے فلک کے سینوں کو
مری زمیں کے ستاروں کی آ رہا ہے حجاب — بلندیوں پہ چمکتے ہوئے نگینوں کو
لرز رہا ہے ہر اک پیرِ میکدہ کا غرور — کہ آج رند چڑھائے ہیں آستینوں کو
مجھے فریبِ اثر دے نہ اب غمِ ہستی — بہت عزیز میں رکھتا ہوں آبگینوں کو
مری جبیں سے ہی ٹپکے ہوئے یہ موتی ہیں — زمیں کی کوکھ نے اُگلا ہے جن خزینوں کو
نہیں رموزِ خودی سے وہ آشنا مضطرؔ — ہر ایک در پہ جھکاتے ہیں جو جبینوں کو

جنگجو ڈاکوؤں کی سرکوبی

حصولِ آزادی اور قیامِ جمہوریت کے بعد ملک میں نئی قدروں اور نئے آدرشوں کو فروغ دینے کی ضرورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ پولیس کی اہمیت اور فرائض کے بارے میں کئی ریاستوں کے محکمۂ منتریوں نے نئے نظریوں کی وضاحت کی۔ پولیس سے کہا گیا کہ وہ "مظلوم کے لئے تسکین اور ظالم کے لئے تنبیہ" اور "داخلی امن و امان کے لئے نگراں و محافظ" بنے۔ بھارت کی پولیس نے جو کارنامے سرانجام دئے ہیں وہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ عملۂ پولیس میں فرض کا ایک گہرا احساس موجود ہے۔

ان کارناموں کے صلے میں ہی اُنھیں پولیس کا اعلیٰ ترین اعزاز یعنی راشٹرپتی کا میڈل ملا ہے۔ آزادی کے بعد یہ میڈل پولیس کے قریباً تیس ارکان کو مل چکا ہے، ان میں سے چھ سات نے تو فرائض کی انجام دہی میں اپنی جانیں قربان کردیں، اور باقی نے ذاتی سلامتی کی پروا نہ کرتے ہوئے بڑی جرأت اور جاں نثاری کا ثبوت دیا۔

ان میں اکثر اعزاز جنگجو ڈاکوؤں اور مجرموں سے نمٹنے کے صلے میں دئے گئے۔

اشونی کمار

ڈاکوؤں اور مجرموں سے کامیاب مقابلہ کرنے والوں میں پنجاب پولیس کے معاون انسپکٹر جنرل پنڈت اشونی کمار کی سوداد سب سے زیادہ دلپذیر ہے۔ سوراشٹر کے بدنام ڈاکو بھوپت کا پیچھا کرنے میں اُنھوں نے جس جگرداری کا ثبوت دیا اُسے پردھان منتری نے بھی سراہا ہے۔

اشونی کمار کئی بار رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال چکے ہیں جب وہ فیروزپور میں سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے تو اُن کے ضلع اور اُس کے ساتھ پیپسو کے اضلاع میں ڈاکوؤں کے کئی مسلح گروہ لوٹ مار کر رہے تھے ان میں سے ایک گروہ کی طرف سے تو سولہ بار قتل اور ڈکیتی کی وارداتیں ہو چکی تھیں اور یہ گروہ کئی سال تک پولیس کی گرفت میں نہ آسکا تھا۔ اس کا سرغنہ کیلا عرف کرنیل سنگھ تھا اور اس میں قہر سنگھ و سات آٹھ اور ڈاکو تھے۔ اس سرغنے کو پکڑنے کے لئے اشونی کمار برابر کوشش کرتے رہے آخر جولائی ۱۹۴۹ء میں انھوں نے کیلا کو اُس کے دو ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کرلیا۔ اس کے لئے اشونی کمار اپنے ہمراہ ایک پولیس پارٹی لے گئے اور انھوں نے چپ چاپ اس مکان کے گرد گھیرا ڈال دیا جہاں وہ ڈاکو چھپا بیٹھا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک چھوٹی سی پارٹی کے ہمراہ مکان کے اندر چلے گئے۔ انھیں دیکھتے ہی قہر سنگھ نے اپنی بھری ہوئی بندوق اُٹھائی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ بندوق چلاتا اشونی کمار اُس پر لپکے اور اُس سے گتھم گتھا ہو گئے۔ قہر سنگھ ایک ہٹا کٹا اور گرانڈیل آدمی تھا لیکن اشونی کمار کے فوراً بعد ان کی پارٹی کے دوسرے ارکان نے ڈاکو سے ہتھیار چھین لئے اور اُسے گرفتار کرلیا۔

ایک بار موگہ میں وہ روزِ روشن میں ایک ڈاکو سے گتھم گتھا ہو گئے اور سارا نگر یہ مقابلہ دیکھنے آیا۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ اشونی کمار کو معلوم ہوا کہ جن چار ڈاکوؤں کا وہ تعاقب کر رہے تھے وہ موگہ کے ایک کھیت میں چھپے ہوئے تھے۔ اشونی کمار اپنی پارٹی کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ ڈاکو گولیاں چلا رہے تھے۔ اشونی کمار اور اُن کی پارٹی آگے بڑھتی رہی حتیٰ کہ وہ ڈاکو درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے چھپ گئے۔ تعاقب جاری رہا اور گولیاں بھی چلتی رہیں۔ اب اشونی کمار اور ڈاکوؤں میں صرف ایک سو گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہاں اشونی کمار اپنی سلامتی کی پروا کئے بغیر اپنی پارٹی کے ساتھ درختوں کے جھنڈ میں ان ڈاکوؤں پر جا لپکے اور چاروں ڈاکوؤں کا کام تمام کر دیا۔ ان میں سے تین اُڑی کے محاذ کے فوجی بھگوڑے تھے۔ ان سے تین بندوقیں اور دو سو کارتوس برآمد ہوئے۔

ایک اور مقابلے میں اشونی کمار ایک ایسے گروہ سے بھڑ سے جس نے پنجاب نیشنل بنک کی چالیس ہزار روپیہ کی اشیاء لوٹی تھیں۔ اس کے سرغنہ بلبیر سنگھ نے فیروز پور میں ایک دہشت پھیلا رکھی تھی۔ بلبیر سنگھ تو اپنا پیچھا کرنے والے تمام افسروں کو تباہ کرنے کی بھی ڈینگیں مارا کرتا تھا۔

۱۹۔ نومبر ۱۹۲۹ء کو اشونی کمار کو معلوم ہوا کہ بلبیر سنگھ اور اُس کے ساتھی موگہ میں شیشم کے ایک جنگل میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ اشونی کمار نے فوراً ایک پولیس پارٹی ہمراہ لی اور اپنے آدمیوں کو اس جنگل سے ڈاکوؤں کو تلاش کرنے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد اس جنگل سے دنا دن گولیاں چلنے لگیں اشونی کمار نے اپنی پارٹی کو تین حصّوں میں تقسیم کیا اور آگ لگا کر اس کی آڑ میں ڈاکوؤں کی جھاڑی تک جا پہونچے۔ ڈاکو بھی مقابلے پر اُتر آئے اور آمنے سامنے گولیاں چلنے لگیں۔ ایک ڈاکو نے تو اشونی کمار پر بالکل قریب سے وار کیا لیکن خوش قسمتی سے یہ نشانہ چُوک گیا اور پھر پولیس نے ایک پہلو سے گولیوں کی ایسی بارش کی کہ سب ڈاکو وہیں چت ہو گئے۔

کانسٹیبل کی جاں بازی

کیلا کو پکڑنے کے وقت ایک پیادہ سپاہی ناہر سنگھ نے کمال بہادری اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ اس کارنامے کی بدولت اُسے پولیس کا سب سے اعلیٰ اعزاز ملا۔ کیلا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایک گاؤں میں پناہ گزیں تھا۔ ناہر سنگھ اور دوسرے سپاہی وہاں گشت پر تھے۔ انھوں نے تین چار آدمیوں کو ساتھ لیا اور کیلا کے مکان پر دھاوا بول دیا۔ کیلا نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ناہر سنگھ نے لپک کر اس کے ہتھیار چھین لئے اور کیلا گرفتار ہو گیا۔

دہشت پسندوں سے مڈبھیڑ

مغربی بنگال میں پولیس کو اکثر دہشت پسندوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔

۲۸۔ مارچ ۱۹۵۰ء کو دہشت پسندوں کے ایک گروہ نے جدید طرز کے فوجی سامان سے لیس ہو کر دن دہاڑے کلکتے کے بازار میں سنٹرل بنک آف انڈیا کی شاخ پر دھاوا بولا۔ انسپکٹر چکرورتی فوراً موقعہ پر پہنچے۔ اور دہشت پسندوں کا پیچھا کیا۔ دہشت پسند گولیاں چلاتے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے چکرورتی پر بم پھینکا اور دوسرے نے دو بار ان پر گولی چلائی۔ چکرورتی مقابلہ کرتے رہے اور ایک موقعہ پر جب وہ بدمعاش کے قریب تر آئے تو بدمعاش نے اُن پر سنگین سے حملہ کیا۔ خوش قسمتی سے یہ سنگین اُن کی آہنی پیٹی پر لگی اور چکرورتی تھوڑے سے مقابلے کے بعد بدمعاش کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اور ڈاکو کو پکڑا جس کے پاس چھ نالی پستول تھا۔

مغربی بنگال کے ایک اور پولیس انسپکٹر کیلاش پتی دوبے نے ۱۹۵۱ء ان حملہ آوروں کو پکڑنے میں اپنی جان قربان کردی جنھوں نے ۲۶۔ فروری کو ڈم ڈم کے ہوائی اڈے پر ایسر پورٹ کے چھوٹے خزانہ پر حملہ کیا تھا۔ دوبے کو اُن کی جاں نثاری کے لئے موت کے بعد میڈل ملا۔

زرعی شورش کی سرکوبی

بہار کے ایک گاؤں میں کانسٹیبل ایشور رام نے ایک ایسی واردات کی روک تھام میں جان دی جو شاید ایک زبردست زرعی شورش ثابت ہوتی۔

بہار کے اس گاؤں میں ایک قطعہ آراضی پر ہل چلانے کے بارے میں دو مسلح حریف جماعتوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ ایشور رام ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر کے ساتھ گئے اور فریقین کو سمجھا بجھا کر رام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک فریق اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس پر ایشور رام نے انھیں گرفتار کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن ضدّی فریق نے ان پر ہی حملہ کر دیا اور یہ حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔

مضامین نگار حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ آج کل کے لئے اپنے مضامین بھیجتے وقت اپنے خط میں اِس امر کی وضاحت کر دیا کریں کہ وہ سرکاری ملازم ہیں یا نہیں۔ (ادارہ)

شری رام سنہا

انڈونیشیا کی بدیشی تجارت

روایت ہے کہ سیاسی آزادی کے لئے جدوجہد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے اقتصادی آزادی کے لئے جدوجہد شروع ہو جاتی ہے۔ بیشک یہ جدوجہد خون اور آگ کی حامل نہیں ہوتی لیکن محنت اور قربانی کے تقاضے کسی حالت میں بھی کم نہیں ہوتے۔ صدیوں کی سیاسی محکومی، اقتصادی لوٹ اور مجلسی پس ماندگی کے باعث سیاسی خودمختاری کے باوجود بھی مسائل حل ہونے میں ہی نہیں آتے۔ تعمیری پروگرام کے تمام ارادے اور پلان کسی کروٹ سیدھے نہیں بیٹھتے۔ اقتصادی خوش حالی اور مجلسی بہبودی کے تعمیری پروگرام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سرمایے کی اشد قلت ہوا کرتی ہے۔ اس سوال کا کہ سرمایہ کہاں سے آئے جواب یا تو ملتا ہی نہیں یا پھر ملتا ہے تو اتنی شرطوں کے ساتھ کہ اُسے قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آج جنوب مشرقی ایشیا کے اُن ممالک میں جہاں صدیوں کے بعد آزادی کا سورج پھر طلوع ہوا ہے۔ تعمیری پروگرام کے منصوبے اور سرمایے کی قلت آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ اس مضمون میں انڈونیشیا کے تجارتی اور مالی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

موجودہ انڈونیشیا میں جاوا، سماٹرا، بورنیو، سیلے بیز اور دیگر تین ہزار چھوٹے بڑے جزائر شامل ہیں۔ قدرت نے اس خطے کو زرعی اور معدنی پیداوار سے مالامال کر رکھا ہے۔ زرعی پیداوار میں سنکونا (کونین کا ماخذ)، کالی مرچ، کپوک، ربڑ، سیپال، ناریل، گنا، کافی، چائے، کھجور، چاول اور تمبا کو قابل ذکر ہیں۔ معدنی پیداوار میں قلعی، باکسائٹ (جو ایلومینیم کا ماخذ ہے) اور پیٹرول قابل ذکر ہیں۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں ان اجناس کی ہمیشہ مانگ رہتی ہے اس لئے ان اجناس کی عالمگیر تجارت میں انڈونیشیا کا حصہ گراں قدر ہے۔ اس کا اندازہ لگانے کے لئے مندرجہ ذیل خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

انڈونیشیا کی پیداوار کا عالمگیر تجارت میں حصہ (۱۹۳۹ء سے پہلے)

سنکونا کی چھال	۹۱ فیصدی	کالی مرچ	۸۶ فیصدی
کپوک	۷۲ "	ربڑ	۳۷ "
سیپال	۳۳ "	کھوپرا	۲۷ "
کھجور کا تیل	۲۴ "	چائے	۱۰ "
کھانڈ	۱۱ "	قلعی	۱۷ "
باکسائٹ	۷ "	پیٹرول	۳ "

لیکن اس فراوانی کے باوجود انڈونیشیا کے سامنے کچھ پیچیدہ مسائل بھی ہیں۔ سب سے پہلے آبادی اور سامانِ خوراک میں توازن قائم کرنے کا مسئلہ ہے۔ انڈونیشیا کی آبادی ۷۰۰ لاکھ نفوس ہے۔ اور برما، تھائی لینڈ، ملایا، انڈو چائنا اور فلپائن کی مشمولہ آبادی کے مساوی ہے اور یہ آبادی ہر سال مائل بہ ترقی ہے۔ دوسری طرف چاول جو اشیائے خوردنی میں ممتاز ہے کی پیداوار قریباً ۷۰ لاکھ ٹن ہوتی ہے۔ یہ مقدار ملک کی اندرونی ضروریات پورا کرنے میں قاصر ہے۔ اس لئے ہر سال ۳ لاکھ ٹن چاول باہر سے منگوائے جاتے ہیں اور اس برآمد پر ۴ کروڑ روپے کا صرف اُٹھتا ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی موجب دلچسپی ہوگا کہ انڈونیشیا کا سکہ بھی روپیہ کہلاتا ہے اور ہندوستان کے سوا روپیہ کے مساوی ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انڈونیشیا میں زراعت کے مقابلے میں صنعتوں کی ترقی بحیثیت مجموعی کمزور رہی ہے۔ اس کا باعث یہ تھا کہ جن دنوں انڈونیشیا پر ڈچ حکومت کا اقتدار تھا۔ انڈونیشیا کے مفادات کے خلاف غیر ملکی حکومت کے مفادات کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ڈچ حکومت کا مفاد اسی میں تھا کہ انڈونیشیا زرعی پیداوار اور صنعتی خام مال مہیا کرتا رہے، دوسرے لفظوں میں صنعتی پیداوار کا فقدان رہے اور مصنوعات کی ضرورت پوری کرنے کے لئے غیر ملکوں کی بالخصوص ہالینڈ کی منڈی بنا رہے۔ اس لئے انڈونیشیا میں جنگلات صاف کئے گئے۔ آبپاشی کے ذرائع منظم کئے گئے۔ ربڑ اور چائے کی پیداوار پر خاص زور دیا گیا۔ ۱۹۳۱ء کی عالمگیر اقتصادی

بدحالی میں محسوس کیا گیا کہ جب تک ملک میں صنعتوں کو فروغ نہیں دیا جاتا تب تک اقتصادی نظام توازن کا روادار نہیں ہوگا۔ مزید براں آبادی میں بتدریج اضافہ کے باعث زراعت پر آبادی کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا اس لئے بیکاری بھی بڑھتی جارہی تھی۔ اس تحریک کو رد کرنے کے لئے روزگار کے دیگر ذرائع کو ڈھونڈنا از بس ضروری ہوتا جارہا تھا۔ اور اس تلاش کا جواب بھی صنعتوں کا فروغ ہی تھا۔ لیکن صنعتوں کے جامع اور ہمہ گیر فروغ سے غیر ملکی حکومت کے اقتصادی مفادات پر ضرب لگتی تھی اور ایک تجارتی منڈی ہاتھ سے نکل جاتی تھی۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ بڑی صنعتیں تو بدیشی سرمایے کے زیر تحت رہیں اور گھریلو صنعتوں کو ملک میں جاری کیا جائے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ میں ایک طرف تو ہالینڈ کو جو انڈونیشیا پر قابض تھا جرمنی نے مفتوح کرلیا اور دوسری طرف انڈونیشیا پر جاپان کا تسلط ہو گیا۔ اس طرح سیاسی اقتدار میں ایک غیر متوقع انقلاب رونما ہوگیا۔ بعد میں جب جرمنی اور جاپان نے شکست تسلیم کرلی تو انڈونیشیا کے سیاسی مستقبل کا یوں تصفیہ ہوا۔ کہ انڈونیشیا کو پھر سے ہالینڈ کے حوالے کردیا گیا۔ لیکن انڈونیشیا کے قوم پرستوں نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ڈچ گورنمنٹ اور قوم پرستوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ بعد میں ہندوستان کی مداخلت پر ڈچ گورنمنٹ نے انڈونیشیا کو آزادی دینا منظور کرلیا۔ یہ تو ہوا کہ جنگِ عالمگیر اور جنگ آزادی میں انڈونیشیا میں وسیع پیمانے پر تباہی ہوئی۔ عالمگیر جنگ میں بدیشی تجارت تو ختم ہی ہوگئی تھی۔ چائے اور ربڑ کے باغات اور تیل کے چشمے قریباً مسمار ہوگئے تھے۔ کالی مرچ اور ناریل کی نگہبانی کرنے والا ہی کوئی نہ تھا۔ جاپانی قبضہ کے دوران میں اور پھر جاپان کے خلاف اتحادی مہم میں بھی ملک کو کافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ رہی سہی کسر ڈچ گورنمنٹ کے خلاف جنگ آزادی میں نکل گئی۔ ڈچ گورنمنٹ نے قوم پرستوں کو تنگ کرنے کے لئے انڈونیشیا کی اقتصادی ناکہ بندی کردی تھی۔ اور قوم پرستوں نے "بھونک دو" کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ ان سب حادثات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۱۹۴۹ء میں انڈونیشیا کو آزادی حاصل ہوئی تو اس کا اقتصادی نظام درہم برہم ہوچکا تھا۔

اب ذرا انڈونیشیا کے تجارتی نقشے کو ملاحظہ فرمایئے۔ انڈونیشیا کی ضروریات تین حصوں میں منقسم کی جاسکتی ہیں۔

(۱) سامانِ خوراک (۲) مصنوعات (۳) مشینری وغیرہ۔ ان اشیاء کی تجارت درآمد آزادی کے بعد دو سالوں میں یوں تھی۔

انڈونیشیا کی تجارت درآمد

(ہزار روپیوں میں)

اشیاء	۱۹۴۹ء	۱۹۵۰ء
۱۔ سامانِ خوراک		
دودھ، مکھن اور پنیر	۵۲,۲۲۷	۲۷,۱۶۳
چاول	۱۳۳,۲۵۶	۱۴۳,۶۵۶
۲۔ مصنوعات		
ادویات	۳۵,۲۶۸	۴۴,۹۷۲
رنگ	۹,۳۷۹	۱۳,۲۸۱
سوتی دھاگہ	۴۱,۱۲۲	۸۰,۵۳۵
سوتی دھاگہ (کورا)	۲۸,۳۵۳	۸۳,۷۴۶
سوتی دھاگہ (دھلا ہوا)	۵۹,۹۶۵	۷۶,۹۹۲
رنگا ہوا سوت	۱۶۱,۱۸۶	۱۶۸,۰۱۰
کپڑے	۲۷,۹۶۲	۲۰,۷۷۴
بوریاں	۱۶,۰۳۸	۱۸,۹۰۷
کیمیائی کھاد	۱۴,۹۲۲	۱۷,۳۵۵
گھریلو برتن	۷,۵۷۸	۷,۳۲۶
۳۔ مشینری وغیرہ		
صنعتی مشینری	۹۶,۴۳۲	۶۸,۸۷۹
انجن	۲۴,۰۴۰	۲۶,۴۶۴
لوہے اور فولاد کا سامان	۲۲,۶۴۱	۱۶,۰۱۲
لوہے اور فولاد کی نالیاں	۵۳,۳۳۱	۱۶,۵۵۰
پٹرول اور پٹرول کا سامان	۱۱۲,۶۱۹	۱۰۵,۴۳۵
سیمنٹ	۱۷,۸۸۰	۱۱,۷۳۲
کل میزان	۱,۵۷۳,۶۱۲	۱,۵۲۶,۴۹۶

ان اعداد سے خیال ہوتا ہے کہ انڈونیشیا کی اندرونی ضروریات ہر سال

۱۵۰ کروڑ روپے سے اُوپر جا پہنچتی ہیں۔ اتنی زرکثیر کو بہم کرنا بھی ایک مسئلہ ہے لیکن خوش قسمتی سے انڈونیشیا کی زرعی اور معدنی پیداوار کی بدیشی تجارت اس بوجھ کو برداشت کر سکتی ہے اور برداشت کر رہی ہے۔ اس بدیشی تجارت کا خاکہ یُوں ہے۔

انڈونیشیا کی تجارت برآمد (ہزار روپیوں میں)

اشیاء	۱۹۴۹ء	۱۹۵۰ء
چمڑہ اور کھالیں	۷,۱۲۲	۲۰,۷۸۸
مونگ پھلی	۹,۱۶۴	۲۰,۲۸۳
کھوپرا	۱۱۵,۶۴۷	۲۱۱,۰۰۹
کالی مرچ	۹,۶۵۲	۸۰,۲۶۹
کھانڈ	۱۶,۸۱۶	۱,۴۱۵
کافی	۹,۰۶۵	۵۵,۶۸۹
چائے	۵۳,۰۸۶	۱۰۱,۰۰۲
تمباکو	۵۷,۵۸۲	۸۰,۷۳۴
کھجور کا تیل	۵۹,۹۸۸	۸۱,۷۹۸
ربڑ	۳۴۸,۵۲۹	۱,۱۴۶,۲۷۴
کیپوک	۱۳,۶۲۹	۲۰,۸۴۶
پٹرول اور پٹرول کی اشیاء	۴۱۲,۲۰۴	۵۳۸,۶۸۹
قلعی	۱۶۹,۱۰۹	۱۸۵,۲۵۴
کل میزان	۱,۴۷,۵۵۸	۲۷۴۱,۷۴۱

ان اعداد سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تجارت برآمد سے حاصل ہونے والی آمدنی ۱۹۴۹ء کے مقابلے میں ۱۹۵۰ء میں قریباً دوگنی ہو گئی۔ تفاصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ربڑ اور قلعی کی برآمد جنگِ عظیم سے قبل کے مقابلے میں اب زیادہ ہو گئی ہے۔ تیل اور کونین کی برآمد اب مساوی ہو گئی ہے۔ لیکن دیگر اشیاء کی برآمد ابھی تک مقابلتاً بہت پیچھے ہے۔ ان میں سے کھجور کے تیل کی برآمد ۵۰ فیصدی سے کم۔ چائے کی ۳۳ فیصدی سے کم، تمباکو کی ۲۵ فیصدی سے کم اور چائے کی ۱۰ فیصدی سے کم ہے۔ انڈونیشیا کی تجارت برآمد میں ایک اور نمایاں تبدیلی برآمد کی منزلِ مقصود کے خاکے میں ردّ و بدل سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں بدیشی تجارت کا رُخ زیادہ تر یورپین ممالک کی طرف ہوتا تھا اور دیگر ممالک کی طرف کم لیکن ۱۹۵۰ء میں بدیشی تجارت میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ممتاز حیثیت حاصل ہو چکی تھی اور یورپین ممالک کا طرۂ امتیاز ختم ہو چکا ہے۔ تفاصیل یوں ہیں۔

انڈونیشیا کی بدیشی تجارت میں منتخب ممالک کا حصّہ

ملک	۱۹۳۸ درآمد	۱۹۳۸ برآمد	۱۹۵۰ درآمد	۱۹۵۰ برآمد
ہالینڈ	۲۲٫۰ فیصدی	۲۰٫۰ فیصدی	۱۷٫۱ فیصدی	۲۴٫۲ فیصدی
برطانیہ	۸٫۱ "	۵٫۴ "	۷٫۳ "	۳٫۷ "
جرمنی	۱۰٫۲ "	۳٫۷ "	۳٫۰ "	۲٫۹ "
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۹٫۷ "	۱۴٫۲ "	۲۰٫۷ "	۱۶٫۲ "
ہندوستان	۲٫۵ "	۰٫۷ "	۵٫۵ "	۰٫۳ "
برما	۱٫۶ "	—	۴٫۴ "	—
چین	۱٫۸ "	۱٫۴ "	۰٫۵ "	—
جاپان	۱۵٫۹ "	۱٫۳ "	۱۰٫۵ "	۱٫۴ "
ملایا	۹٫۰ "	۱۸٫۶ "	۴٫۷ "	۳۶٫۴ "

اس نقشے سے عیاں ہوتا ہے کہ برآمد میں ہالینڈ کا حصہ ابھی تک ممتاز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی سے پہلے سیاسی محکومی کے باعث انڈونیشیا کی بدیشی تجارت ہالینڈ کے ہاتھ میں تھی۔ آزادی کے بعد بھی اس پوزیشن میں نمایاں فرق اس لئے نہیں آیا کہ ہالینڈ اور انڈونیشیا کے مابین سیاسی اور تجارتی معاہدے ہو چکے ہیں۔ برطانیہ اور جرمنی کے ساتھ ہونے والی تجارت بہت کچھ تبدیل ہو چکی ہے اور مائل بہ تنزل ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا حصّہ مقابلتاً اضافے کی طرف مائل ہے۔ ہندوستان کی تجارت بھی پہلے سے بہتر ہو چکی ہے۔ جاپان کے ساتھ ہونے والی تجارت اب کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس سارے نقشے میں ملایا کی حیثیت وضاحت طلب ہے۔ انڈونیشیا کی تجارت برآمد زیادہ تر ملایا کی آزاد بندرگاہ سنگاپور کی معرفت ہوتی ہے۔ اعداد بتلاتے ہیں کہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں ۱۹۵۰ء میں ملایا کے ساتھ ہونے والی برآمد تقریباً دوگنی ہو گئی تھی۔

اس مرحلہ پر تجارت برآمد اور تجارت درآمد کا میزان بتانا بھی ضروری ہو جاتا

ہے جو یوں ہے۔

انڈونیشیا کا میزان تجارت (لاکھ روپیوں میں)

	درآمد	برآمد		میزان
۱۹۳۶ء	۲۸۲	۵۹۵	+	۳۱۳
۱۹۳۷ء	۴۹۱	۹۹۰	+	۴۹۹
۱۹۳۸ء	۴۷۸	۶۸۷	+	۲۰۹
۱۹۳۹ء	۴۷۲	۷۷۴	+	۳۰۲
۱۹۴۰ء	۴۳۳	۹۳۳	+	۵۰۰
۱۹۴۱ء	۴۷۲	۱۰۸۶	+	۶۱۴
۱۹۴۶ء	۲۸۱	۱۵۵	-	۱۲۶
۱۹۴۷ء	۸۱۰	۳۳۹	-	۴۷۱
۱۹۴۸ء	۱۱۳۴	۱۰۴۰	-	۹۴
۱۹۴۹ء	۱۵۷۴	۱۴۷۸	-	۹۶
۱۹۵۰ء	۱۵۲۷	۲۷۴۲	+	۱۲۱۵

اس نقشے سے عیاں ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک یعنی انڈونیشیا پر جاپان کے قبضے سے پہلے انڈونیشیا کی بدیشی تجارت ہمیشہ اس کے لئے منافع بخش رہتی تھی۔ جتنا مال باہر سے منگوایا جاتا تھا اس سے کہیں زیادہ باہر بھیجا جاتا تھا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک ملک پر جاپان کا قبضہ رہا اور بدیشی تجارت مفقود ہوگئی۔ اس کے بعد جب جنگِ عظیم ختم ہوئی اور جاپان کو شکست ہوئی تو ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تک بدیشی تجارت لگاتار خسارہ دکھاتی رہی۔ لیکن سیاسی آزادی کے پہلے سال میں ہی بھرپور منافع ہوا۔ اس منافعے کا باعث یہ تھا کہ کوریا کی جنگ شروع ہونے کے بعد خام مال کی قیمتیں یکدم چڑھ گئی تھیں اور ان کی عالمگیر مانگ بھی بڑھ گئی تھی۔ بالخصوص ربڑ، قلعی اور کھوپرا کی قیمتوں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ اس منافعے کے باعث ۱۹۵۰ء کے سونے اور بدیشی تبادلے کے سرمایے میں ۶۵ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا۔

نہایت ہی منافع بخش

آپ کے لئے اور قوم کے لئے

روپیہ بچائیے اور

بارہ سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفیکیٹ خریدئیے

ان پر ۴½ فیصدی سالانہ سود میچور ہونے پر ملتا ہے

دس سالہ

ٹریژری سیونگز ڈیپازٹس

ان پر ۳½ فیصدی سالانہ سود ملتا ہے۔ جو ہر سال ادا کیا جاتا ہے۔

اپنی چھوٹی بچتوں کو

پوسٹ آفس سیونگس بنک میں جمع کرائیے

۲۵/- روپے سے ۱۰۰۰۰/- روپے کے بیلنس پر ۲ فیصدی سود ملتا ہے

کسی حالت میں بھی سود پر ٹیکس نہیں لگے گا

مزید تفصیلات اور سود کے متعلق قواعد کے لئے مندرجہ ذیل پتے پر درخواست بھیجئے۔

نیشنل سیونگز کمشنر۔ گورٹن کیسل شملہ ۳

اے۔سی۔۲۰۰۴

نئے مطبوعات

کمار سمبھو

شاعرِ اعظم کالی داس کا مشہور شاہکار ہے جس کا ترجمہ اُردو کے نامور شاعر جناب بشیشور پرشاد منوّر نے کیا ہے۔ منوّر صاحب ایک شاعر اور مترجم کی حیثیت سے مسلّم حیثیت کے مالک ہیں آپ نے اپنے مجموعۂ کلام اور بھگوت گیتا کے اُردو نظم میں ترجمے کے بعد کمار سمبھو کا اُردو نظم میں ترجمہ کرکے ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ ترجمہ اوّل سے آخر تک مصنّف اور مترجم کے شاعرانہ کمال کا حامل ہے اور اُردو کے شعری ادب میں ایک جاودانی اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ساری نظم میں ایک مقام بھی ایسا نظر نہیں آتا جہاں پڑھنے والے کو مترجم کی قوتِ نظم کا قائل نہ ہونا پڑے۔

حضرت جوش، جنابِ فراق، سری بال کرشن شرما نوین اور ملک کے دوسرے ادیبوں نے اس منظوم ترجمے کو بہت اچھے الفاظ میں سراہا ہے۔ جنابِ فراق لکھتے ہیں۔ "سنسکرت شاعری کی روح، اس کی فضا، اس کا نظریہ، اس کی وجدانیت اور رنگا رنگ خوبیاں اس منظوم ترجمے میں اس طرح جھلک رہی ہیں جیسے صبح کے آئینہ خانے میں شبستاں جلوہ گر ہو۔"

کتاب ۱۷×۲۷/۸ سائز کے قریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ عمدہ کتابت، طباعت دیدہ زیب۔ قیمت پانچ روپے۔ ناشر انجمن ترقیٔ اُردو بک ڈپو، اُردو بازار دہلی۔

قطعات و رُباعیاتِ اکبر الٰہ آبادی (حصّہ دوم)

یہ بزمِ اکبر کراچی کی تازہ ترین پیشکش ہے۔ اس سے قبل کلامِ اکبر کے تین حصّے اور قطعات و رباعیات کا پہلا حصّہ اہلِ نظر حضرات ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہ اس سلسلے کی پانچویں کڑی ہے۔ اس مختصر سے ذکر میں لسان العصر کے کلام کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جہاں تک بزمِ اکبر کی کوششوں کا تعلق ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور قابلِ مبارکباد ہیں۔ کلامِ اکبر بزمِ اکبر کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے نایاب ہو چکا تھا۔ مقامِ شکر ہے کہ اس بزم کی بدولت یہ گم گشتہ دولت پھر ہمارے ہاتھ آ گئی ہے۔ ضخامت قریباً ڈیڑھ صد صفحات۔ کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ درجے کی ہے۔ جلد پختہ اور خوشنما ہے۔ قیمت تین روپے چھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ بزمِ اکبر کراچی ۴۔

آہنگ

مجاز کا مجموعہ کلام ہے۔ جس کا نیا ایڈیشن آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی نے شائع کیا ہے۔ مجاز کا شمار عصرِ نو کے محبوب ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری سنگم ہے نئے اور پرانے محاسن کا ایک حسین امتزاج ہے روایت اور جدّت کا۔ اور یہی وہ خوبی ہے جس نے مجاز کو ایک ممتاز مقام دیا ہے۔

آہنگ کا یہ ایڈیشن جو ۱۸×۲۲/۸ سائز کے ۲۱۶ صفحات پر شائع ہوا ہے مجاز کے سنہ ۱۹۵۲ء تک کے کہے ہوئے کلام پر مشتمل ہے۔ شروع میں فیض احمد فیض کا دیباچہ شامل ہے جس میں آپ لکھتے ہیں:۔ "مجاز بنیادی طور پر اور طبعاً غنائی شاعر ہے، اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی کڑک نہیں، باغی کے دل کی آگ نہیں، نغمہ سنج کے گلے کا وفور ہے۔ یہی وفور مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اس شعر کی کامیابی کا سب سے بڑا امین۔ بیچ کے ایک مختصر سے دور کے علاوہ مجاز ہمیشہ سے گاتا رہا ہے۔ اس کے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی لیکن اُس کے آہنگ میں فرق نہ آیا۔"

جہاں تک کتاب کے حُسنِ ظاہر کا تعلّق ہے آزاد کتاب گھر کا نام ہی اس امر کی ضمانت ہے کہ یہ مجموعہ پیش کرتے وقت اشاعت کے ایک بلند معیار کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت تینوں دیدہ زیب ہیں۔ جلد خوشنما اور رنگین اور سرورق جاذبِ نظر ہے۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔

گُلشن

مجموعہ ہے سری کشور ساہو کی کہانیوں کا جو جناب امانت ہلال نے ہندی سے اُردو میں منتقل کی ہیں۔ کشور ساہو کا نام فلمی دُنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ بیک وقت ایک کامیاب ڈائرکٹر، پروڈیوسر اور ایکٹر ہیں۔ یہ مجموعہ اُن کے ادبی کمالات پر مشتمل ہے۔ ہندی میں اس کے علاوہ آپ کی

متعدد کتابیں چھپ کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ زیرِ کتاب نظر کے بھی "ٹیکے پھول" کے نام سے ہندی میں تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو کی دنیا میں آپ پہلی بار قدم رکھ رہے ہیں۔

یہ مجموعہ بارہ افسانوں پر مشتمل ہے تقریباً تمام افسانے اصلاحی اور اخلاقی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ جس کی بدولت ان کی افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ عالمگیر محبت کا جذبہ ان افسانوں میں شروع سے آخر تک نظر آتا ہے آپ ملک کی ہر قسم کی اجتماعی ترقی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو ایک ضروری بنیاد سمجھتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے صحت مند نظریے اس مجموعے میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔

جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے امانت ملال صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے ہندی کو اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ زبان رواں سلیس اور عام فہم ہے۔ ترجمے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھتے وقت اس پر ترجمے کا گمان نہ ہوا اور مترجم نے اس مشکل مرحلے کو بڑی کامیابی سے عبور کیا ہے۔ ان تمام محاسن کے باعث اس بات کی پوری اُمید کی جاتی ہے کہ اُردو کی ادبی دنیا میں اس کتاب کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا ضخامت ۲۴۴ صفحات۔ قیمت تین روپے۔ پبلشر ہندوستان چترا، بھیمپور بمبئی۔

"ساتھی" پٹنہ کا سالنامہ

ترتیب دینے والے :- غلام سرور، ولایت علی
عزیز ہاشمی اور اسد حسین

"ساتھی" پٹنے کا ایک روزنامہ اخبار ہے جو قومی اور علمی و ادبی حلقوں میں عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ اس کا سالنامہ ہے جسے ادارے نے بڑی محنت سے مرتّب کیا ہے اور ہندوستان کے نامور شعراء ادباء اور افسانہ نگار حضرات کا تعاون حاصل کر کے اسے ایک مستقل حیثیت کے ادبی تحفے کی صورت دے دی ہے۔ ادارے میں جن حضرات کے نام نظر آ رہے ہیں یہ بہار میں اُردو کی ترقی کیلئے بے غرض اور ان تھک کام کرنے والے نوجوان ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی زیرِ نگرانی "ساتھی" مسلسل ترقی کرتا جائے گا اور اس قسم کے خاص نمبر اکثر دیکھنے میں آئیں گے۔ ضخامت قریباً سو صفحات۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- دفتر ساتھی روزانہ پٹنہ ۴

بنتِ رادی کا سالنامہ

یہ خواتین کا ایک پانزدہ روزہ جریدہ ہے۔ جو جناب ابو سعید بزمی مرحوم کی یاد میں لاہور سے محترمہ ادیبہ بزمی، محترمہ سعیدہ اسلم اور محترمہ عقیلہ شاہین کی زیرِ ادارت باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس شمارے میں اُردو کے نامور فنکاروں کے مضامین، نظمیں، غزلیں اور افسانے موجود ہیں۔ ضخامت ۸۴ صفحات قیمت چار آنے۔ ملنے کا پتہ :- اے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور (پاکستان)

غیر ممالک میں بھارتی طلباء

بھارت سرکار کی توجہ بھارتی اخبارات کی اُن آراء کی طرف دلائی گئی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے کچھ بھارتی طلباء نے قابلیت کا ثبوت نہیں دیا۔ ماہ اپریل ۱۹۵۱ء تک بھارت سرکار کی طرف سے کسی بھی طالب علم کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے آسٹریلیا نہیں بھیجا گیا تھا۔ اور اس کے بعد جو تھوڑے سے بہت طلباء بھیجے گئے اُن کی اچھی رپورٹ ملی۔ بھارت سرکار اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ حکومت کی طرف سے وظائف کی اسکیموں کے تحت جن طلباء کو سمندر پار ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے اُن کا انتخاب ہندوستان کے بہترین طلباء میں سے کیا جاتا ہے۔ انتخاب سے پہلے ان اسکیموں کو وسیع پیمانے پر مشتہر کیا جاتا ہے اور انتخاب خاص کمیٹیوں اور بورڈوں کے ذریعے سے عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہ طلباء غیر ممالک میں جن پروفیسروں کے تحت کام کرتے ہیں اُنھوں نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔

بھارت سرکار کی طرف سے عام طور پر غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جانے والے پرائیویٹ طالب علموں پر کسی قسم کی پابندیاں عائد نہیں کی جاتیں۔ بشرطیکہ انھوں نے منظور شدہ یونیورسٹیوں یا اداروں میں داخل ہونے کی منظوری حاصل کر لی ہو اور تعلیم مکمل کرنے کے لئے اُن کے مالی انتظامات تسلی بخش ہوں۔ ایسے پرائیویٹ طلباء کے لئے بھارت سرکار کی معرفت درخواستیں بھیجنا بھی ضروری نہیں اور وہ عام طور پر غیر ملکوں کے متعلقہ اداروں سے براہِ راست خط و کتابت کے ذریعے سے ہی وہاں داخل ہونے کی منظوری حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لئے ایسے طالب علموں کی درخواستوں کی اچھی طرح سے چھان بین کرنا اور متعلقہ نصاب کے لئے اُن کی موزونیت یا غیر موزونیت کا فیصلہ کرنا ان غیر ملکی یونیورسٹیوں یا اداروں کا کام ہے۔

آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے جن طلباء کے بارے میں یہ خبریں شائع ہوئی ہیں کہ انھوں نے وہاں اپنی قابلیت کا ثبوت نہیں دیا۔ انھیں بھارت سرکار کی طرف سے منتخب کر کے یا سرکار کی کسی اسکیم کے تحت وہاں نہیں بھیجا گیا تھا۔ یہ طلباء وہاں نجی طور پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں نے انھیں براہِ راست خط و کتابت کے نتیجے کے طور پر داخل کیا تھا۔

ہیراکڈ ڈیم

ہیرکڈ کے ارد گرد برسات کے دنوں میں اس قدر بارش ہوتی ہے کہ دریائے مہاندی کا پانی بے محیط ہو جاتا ہے۔ ویسے تو پانی کی بہتات ریاست میں چاول کی فصلوں کے لئے بہت مفید ہے۔ کیونکہ اس سے زمین میں ضروری نمی قائم رہتی ہے۔ لیکن یہ بہتات صرف برسات کے چار ماہ کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس عرصہ میں بھی اس کی تقسیم اکثر غیر مساوی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سال میں آٹھ مہینے پانی کی کمی رہتی ہے اور زمین دوسری فصل پیدا نہیں کر پاتی۔

اڑیسہ میں تین بڑے دریا ہیں۔ مہاندی۔ برہمنی اور بیتارنی۔ یہ تینوں ہر سال دس کروڑ ستر لاکھ ایکڑ فٹ پانی سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔ مہاندی مدھیہ پردیش میں ضلع رائے پور کے دکھن پچھم سے سہاوا سے نکلتا ہے۔ اور کل پانچ سو تینتیس میل لمبا ہے۔ اڑیسہ کے دریاؤں کے پانی کو باندھنے اور اس طرح ریاست کی زراعت کا تحفظ کرنے کے متعلق پچھلے قریباً ایک سو سال سے تجویزیں ہو رہی ہیں۔

مہاندی کے پانی سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے انجینئروں نے اس پر تین بند باندھنے کی تجویز کی تھی۔ ان میں سے سامبل پور کے نزدیک ہیراکڈ ڈیم کو سب سے پہلے تعمیر کرنے کے لئے چنا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے سب سے جلدی نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

اس ڈیم کے لئے بھارت سرکار کی طرف سے ۴۹-۱۹۴۸ء سے ۵۲-۱۹۵۱ء تک حکومت اڑیسہ کو سولہ کروڑ ستائیس لاکھ روپیہ قرض دیا گیا۔

اس ڈیم کے خاص مشینوں سے پختہ کی گئی مٹی سے مہاندی پر تین میل لمبا بند باندھا جائے گا۔ دریا میں اس بند کی زیادہ سے زیادہ اونچائی ایک سو بچانوے فٹ ہوگی۔ یہ دنیا کے سب سے لمبے پشتوں میں شامل ہوگا۔ اس کے دونوں طرف مٹی کے اونچے اونچے پشتے ہوں گے۔ جن کی بالائی سطح پر پانی کا ذخیرہ کیا جائے گا۔ یہ دونوں پشتے کل سترہ میل لمبے ہوں گے۔

ہیرکڈ جھیل کا علاقہ ڈیڑھ لاکھ ایکڑ ہوگا اور ساحل ایک سو پچپن میل۔ اس جھیل کا پانی استعمال کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے گا کہ اس کا ایک تہائی پانی اس میں ہمیشہ رہے۔ تاکہ بجلی گھر کے مسلسل عمل کے لئے کافی پانی میسر رہے۔ ہیراکڈ کے بجلی کے کارخانوں کو نزدیک کے ایسے کارخانوں مثلاً دامودر ویلی اسکیم اور رج کنڈ سے ملایا جائے گا۔ تاکہ متعلقہ علاقوں کو برابر بجلی ملتی رہے۔

مٹی کے بند اور پشتوں کے لئے جو مٹی کھودی اور بھری جائے گی اس کے لئے ستر کروڑ مکعب فٹ سے بھی زیادہ مٹی کی ضرورت ہوگی۔ یہ مقدار اتنی ہے کہ اس سے دہلی سے راس کماری تک کے چودہ سو میل پر دس فٹ اونچا اور اوسطاً دس فٹ موٹا مٹی کا بند تیار ہو سکتا ہے۔ مٹی کی اتنی بڑی مقدار کو ہاتھ کی محنت سے ہی حاصل کرنا امر محال ہے۔ اس لئے وہاں ایک وسیع علاقہ میں جدید قسم کی بڑی بڑی مشینیں لگائی گئی ہیں۔ مشینوں کے علاوہ تیس ہزار مزدور بھی کام کر رہے ہیں۔

ہیراکڈ ڈیم کی تعمیر ۱۹۴۸ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس تعمیر کی رفتار ترقی اب تک بڑی اچھی رہی ہے۔ مٹی کے وسیع پشتے مکمل ہو چکے ہیں اور نہر کے لئے ساڑھے تین سو میل کھدائی ہو چکی ہے۔

اس منصوبہ کو جون ۱۹۵۶ء میں مکمل کرنے کا پروگرام ہے۔ لیکن امید ہے کہ جون ۱۹۵۵ء تک اتنا کام ہو جائے گا کہ کچھ بجلی اور پانی کی فراہمی ممکن ہو جائے گی۔ ہیراکڈ سے آبپاشی میں جو اضافہ ہوگا اس سے ساڑھے سات لاکھ ٹن مزید اناج اور تین لاکھ ٹن مزید گنا پیدا ہونے کی توقع ہے۔

۱۰ اکتوبر سے
اوڈین - نیو دہلی
جوبلی اور کھنہ - دہلی
جے ہند اور نگار - کانپور
نشاط - لکھنؤ
موتی محل - الہ آباد
نشاط ٹاکیز - بنارس
پربھات ٹاکیز - ڈیرہ دون
کنور تھیئیٹرز - مراد آباد
کمار ٹاکیز - بریلی
اور
اس کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی ریلیز ہو رہی ہے
ہزار اداؤں والی
نازنین
جوپیٹر کا شاہکار
رانی
ڈائرکشن
پرساد
سٹوڈیو: پنیچون
اداکار
بھانومتی
انوپ کمار
راجہ
وہاب کاشمیری
ہندی زبان میں
جاری کردہ: آل انڈیا فلم ڈسٹری بیوٹرز دہلی

دِن بہ دِن ، ایک نیا حُسن ،
ایک نئی دِلکشی
رکسونا صابن ہر روز
استعمال کیجئے۔ اسکے "کیڈِل"
سے آپ کی جلد میں ایک نئی آب و
ایک نیا حُسن پیدا ہوگا۔
رکسونا
"کیڈِل" آمیز واحد صابن
* جلد کو ملائم بنانے والے تیلوں کے
ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام
رکسونا پروپرائیٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا
Rexona
Rexona

آجکل

ستمبر ۱۹۵۲ء

آٹھ آنے

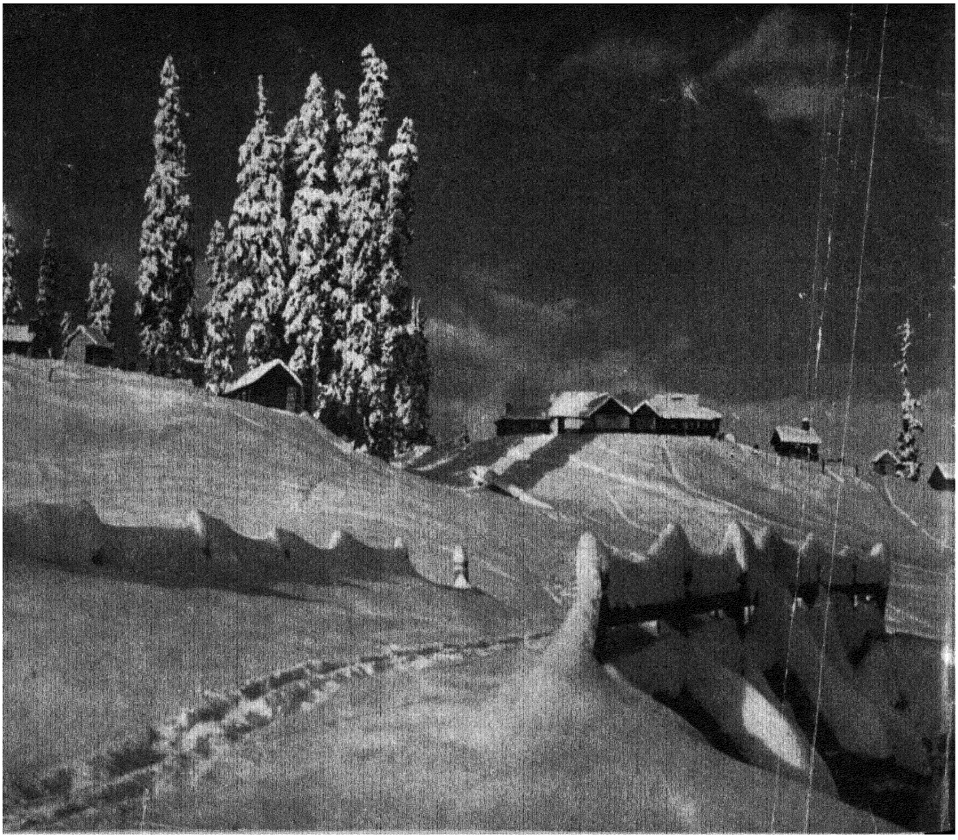

FROM LEADING BOOKSELLERS OR DIRECT FROM-

PUBLICATIONS DIVISION

OLD SECRETARIAT DELHI

A G 378

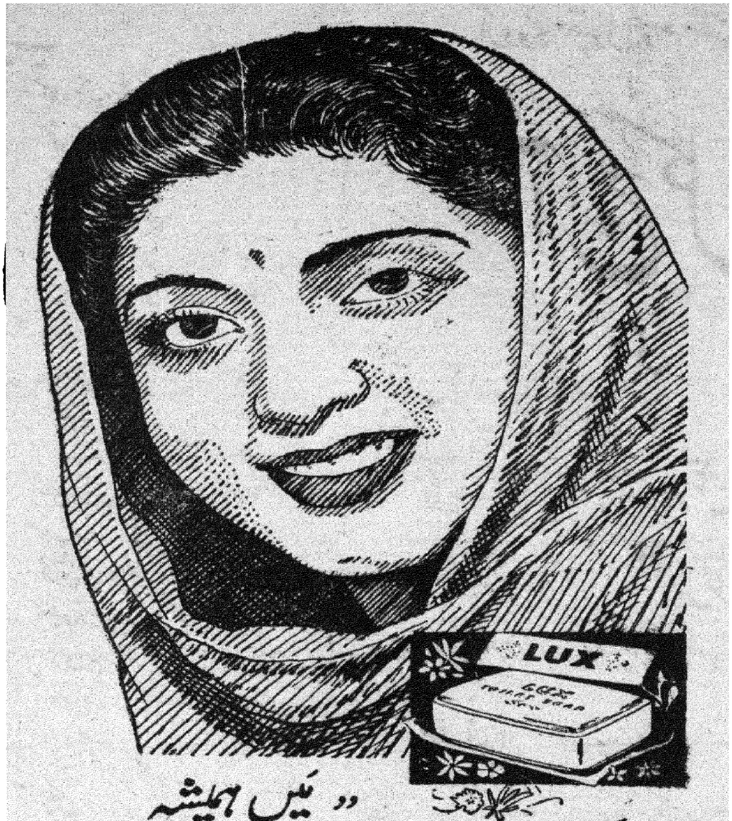

"میں ہمیشہ
لکس ٹائلیٹ صابن
استعمال کرتی ہوں"

دیو جانی کہتی ہے

یہ سفید اور خالص صابن، جس کی خوشبو دلکش
ہے، آپ کی جلد کو بھی دلکش بنائے گا!

فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن

LTS. 320-X30 UD

ترتیب

یگانہ آرٹ	یگانہ چنگیزی لکھنوی	۳
دلی اورنگ آبادی اور ولی گجراتی	محی الدین قادری زور	۴
سحرِ سامری	تاجور سامری	۸
غالب اور اُردو خطوط نویسی	برجموہن دتاتریہ کیفی	۹
ماں	صالحہ عابد حسین	۱۳
دوستی	شہاب ملیح آبادی	۲۰
کامیاب ادب اور ادیب	ڈاکٹر اعجاز حسین	۲۱
غزل	ابر احسنی گنوری	۲۷
غزل	شمیم کرہانی	۲۷
وساکھاپٹم میں جل پشپا کا افتتاح	ــــــ	۲۸
فن کے دائرے	خلیل الرحمٰن اعظمی	۳۳
بلینک چیک	گلاب داس بروکر	۳۷
بچوں کا شاعر	اخلاق احمد اعظمی	۴۴
مرحیات	سلیم الرحمٰن	۴۹
افغانستان کی بھیڑیں	شری رام سرنا	۵۳
نئی کتابیں اور رسالے	ع۔م	۵۷
رفتارِ زمانہ	ــــــ	۵۸

بچوں کا آجکل

راشٹریہ گیت	وشوا ناتھ درد	۶۱
نینی تال	شارق علوی پھلواری	۶۲
آلو کی تتلی	صفدر عباس نقوی	۶۴
گورکھوں کا گھر	وی رام چندرا ریڈی	۶۶
لطیفے	ایس، این سادھو	۶۸

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر — جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر — بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد نمبر ۱۱ ———— نمبر ۲

سالانہ چندہ —— { ہندوستان میں۔ چھ روپے
پاکستان میں۔ چھ روپے }

غیر ممالک سے — نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ —— { ہندوستان میں۔ آٹھ آنے
پاکستان میں۔ آٹھ آنے }

ستمبر ۱۹۵۲ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ دہلی

یگانہ چنگیزی لکھنوی

یگانہ آرٹ

فریبِ آرزو کب تک، اُمیدِ سخت جاں کب تک
مجھے خود بھی تعجب ہے رہے گا دل جواں کب تک

رہو گے پردۂ سیمیں پہ رُسوائے جہاں کب تک
ارے یہ خود نمائی خود فروشی کی دکاں کب تک

دو روزہ نوجوانی کیا ہے مٹّی کا کھلونا ہے
تمہارے ساتھ دل بہلائیں گے پیر و جواں کب تک

زمانہ کون سا تھا؟ نوجوانی کا زمانہ تھا
زمانے سے لڑی رہتی نگاہِ پاسباں کب تک

عجب حربہ ہے خاموشی، چلانا جس کو آتا ہو
چلے گی اس کے آگے آپ کی تیغِ زباں کب تک

زمانہ ساتھ دیتا ہے چلو جب ساتھ ساتھ اُس کے
مگر بچھڑے ہوؤں کی تاک رکھتا کارواں کب تک

دلِ تاریک میں نیکی جو آئی بھی تو کیا آئی؟
اندھیرا ہی اندھیرا ہے تو ٹھہرے میہماں کب تک

کہاں لے جائے گی یہ فکرِ دُور اندیش کیا جانے
نظر کے سامنے نیرنگِ باطل کا دھواں کب تک

یگانہ کی غزل تم نے سُنی کی اَن سُنی کر دی
مگر دردِ سخن کی تاب لائے گی زباں کب تک

محی الدین قادری زور

ولی اورنگ آبادی اور ولی گجراتی

۱۹۳۷ء میں حیدرآباد کے چند علم دوستوں نے جب ایک عالی شان پیمانے پر "یوم ولی" منانا چاہا اور حیدرآباد کے ایک ایسے امیر کو اس تقریب کی سرپرستی کے لئے ہموار کیا جو دولت کے صرفہ میں محتاط تھے۔ اور علمی وادبی کاموں میں دلچسپی لینے سے گریز کرتے تھے تو ایک مضمون نگار نے ایک طویل مقالہ بعنوان "چار ولی" قلم بند کرکے ایک مقامی اخبار میں شائع کیا جس میں "ولی" تخلص کے چار اردو شاعروں کے حالات بیان کرکے بطور طنز اس تقریب کے بانیوں سے سوال کیا تھا کہ وہ کونسے ولی کا یوم منا رہے ہیں؟ اور نواب یوسف علی خاں سالار جنگ کس ولی کے یادگاری جلسہ کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں؟

اس مضمون کی بنا پر اندیشہ تھا کہ محتاط اور متشکک نواب اپنا دست تعاون کھینچ لیں گے اور یہ تقریب ناکام ہو جائے گی۔ لیکن ولی کی کرامت کا ہم سب کو قائل ہونا پڑا کہ نواب نہ صرف افتتاحی اجلاس میں تشریف لائے، تقریر کی اور اپنے کتب خانے کے نوادر ادب "نمائش ولی" کے لئے روانہ کئے، بلکہ اس تقریب کی یادگار کے طور پر قدیم دکنی کتابوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ بھی اپنے نام سے قائم کیا۔ چنانچہ تقریباً پچاس ہزار روپے صرف کرکے اس "سلسلۂ یوسفیہ" کی طرف سے محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، نصرتی، ابن نشاطی اور صنعتی کی اردو کتابیں طبع اور شائع کرائیں۔

اس "یوم ولی" کے مختلف اجلاسوں کے لئے ولی کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اصحاب علم وفضل نے بلند پایہ مقالے مرتب کئے اور سنائے تھے۔ جن کو بعد میں ایک مجموعہ "یادگار ولی" کی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔ ان مقالوں میں ایک مضمون ولی کے وطن کے بارے میں بھی تھا جس میں دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ ولی اورنگ آبادی ہی تھے۔

حال ہی میں بمبئی کے انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی کی مرتبہ ایک کتاب بعنوان "ولی گجراتی" شائع ہوئی ہے جس میں مرتب نے ولی کے زمانے علمی استعداد، ولی اور اردو زبان' اور ولی کے مرغوب فارسی شعراء جیسے مختلف پہلوؤں پر نہایت شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر بعض اہم معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن اس کتاب میں سوانح حیات کے عنوان سے جس ولی کے حالات بیان کئے گئے ہیں وہ کوئی اور ہی ولی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ایسے ولی جن کا نام تو ولی اللہ ضرور تھا، مگر جو بابائے ریختہ تو کجا شاید شاعر بھی نہ تھے۔ صاحب دیوان ولی کا نام نہ تو ولی اللہ تھا اور نہ وہ احمد آباد میں پیدا ہوئے، اور نہ وہاں دفن ہوئے۔ عجب اتفاق کی بات ہے کہ یہی باتیں خود اس کتاب کے مطالعے سے بھی پیدا ہوتی ہیں۔

سوانح حیات کے سلسلے میں سب سے پہلے ولی کے نام کو متعین کرنے کے لئے جو بحث کی گئی ہے اور جو ثبوت پیش کئے ہیں وہ سب شاہ وجیہہ الدین گجراتی کے خاندان کے ایک بزرگ حضرت شاہ محمد ولی اللہ العلوی سے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں جتنے دستاویزوں اور تمسک ناموں وغیرہ کا ذکر ہے ان سب میں انہی شاہ ولی اللہ کا نام ہے، اور ان سب سے کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ شاہ صاحب شاعر بھی تھے، اگر وہ خود کسی وجہ سے اپنا تخلص استعمال کرنا مناسب نہ سمجھتے تو اُن کے فرزند ہی اس کی طرف اشارہ کر دیتے۔ حالانکہ انھوں نے اپنے ناموں کے ساتھ ہی اپنے والد کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ اگر اُن کے والد شاعر ہوتے اور ولی اورنگ آبادی جیسے مشہور استادِ سخن اور صاحبِ دیوان ہوتے تو

ان کے فرزند ضرور ان کا تخلص بھی لکھتے۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنے نام یوں لکھے ہیں۔

(۱) احمد ولی اللہ بن محمد شریف العلوی

(۳) امجد بن محمد ولی اللہ العلوی

(۴) محمد مجتبیٰ ابن ولی اللہ العلوی

ولی کی وفات کے کافی عرصے بعد انہی شاہ ولی اللہ کے ہم جد سیّد عبد الملک نے اپنی "ملفوظۂ کبیری" میں شاہ صاحب کے والد محمد شریف کی اولاد کا ذکر لکھا ہے۔ اور اس میں چوتھے فرزند کا نام صرف میاں ولی اللہ درج کیا ہے۔ (دیکھو عبارت ملفوظۂ اکبری منقولہ ولی گجراتی صفحہ ۸۴) اگر یہ میاں ولی اللہ وہی مشہور شاعر ولی ہوتے تو ظاہر ہے کہ عبد الملک اُن کے نام کے ساتھ ہی کچھ اس طرح کی وضاحت ضرور کر دیتے کہ "مشہور شاعر ہندی" یا "المتخلص بہ ولی" وغیرہ۔ اس سے واضح ہے کہ میاں ولی اللہ کی عبد الملک کی نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی۔

اسی سلسلے میں "مرتب" ولی گجراتی" نے احمد آباد کے ایک مشہور عالم اور بزرگ سید منظور حسینی المعروف بہ حسینی پیر کے مملوکہ نسب نامے سے جو عبارت بطور سند نقل کی ہے (صفحہ ۸۴) اُس میں بھی صرف شاہ ولی اللہ بن شریف محمد متوفّی ۱۱۲۰ھ بن سید عبد الرحمٰن بن سیّد احمد" وغیرہ درج ہے۔ اس سے بھی یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ یہ نسب نامہ مشہور شاعر ولی کا ہے۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہی شاہ ولی اللہ صاحب کا ہے۔ جن کو نہ اُن کے فرزند شاعر بتاتے ہیں اور نہ اُن کے خاندان کے ایک فرد عبد الملک ہی شاعر سمجھتے تھے۔

پھر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ان حضرت شاہ محمد ولی اللہ العلوی کو کس طرح شاعر سمجھ لیا گیا، اور ان کے سوانح حیات کو بابائے ریختہ ولی اورنگ آبادی کی ذات پر کیوں کر منطبق کر دیا گیا؟

اس کے خلاف خود اس کتاب میں ولی کے دوست شاہ ابو المعالی کے فرزند کی ایک تحریر پیش کی گئی ہے جو عبد الملک کے "ملفوظۂ کبیری" سے قبل اور ولی کی وفات کے چند سال بعد ہی لکھی گئی ہے، جس میں لکھا ہے:-

"تمت تمام شد دیوانِ مغفرت شان میاں ولی محمد مرحوم دکن بتاریخ دوئم شہر ذی قعدہ ۱۱۲۶ھ .... مالک و کاتب ایں دیوان عاجز المذنب محمد تقی ولد سیّد ابو المعالی است ......" (صفحہ ۸۰)

ان ابو المعالی کی نسبت خود مرتب "ولی گجراتی" فرماتے ہیں۔

"سیّد معالی اس (ولی) کا بہت ہی جاں نثار دوست تھا۔ یہ سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہا ہے"۔ (صفحہ ۳۷)

ایسے جاں نثار دوست کے فرزند کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ولی کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ اور اگر اُس کے والد کے شاعر دوست کا نام شاہ محمد ولی اللہ گجراتی ہوتا تو اُس نے جہاں ولی کے پورے دیوان کو نقل کرنے کی زحمت اُٹھائی ہے، ضرور پورا اصلی نام شاہ محمد ولی اللہ گجراتی لکھتا نہ کہ "میاں ولی محمد مرحوم متوطن دکن"۔

اسی طرح اسی کتاب میں صفحات ۸۰ و ۸۱ پر ولی کے قدیم ترین مخطوطۂ دیوان کے ترقیمہ کی ایک عبارت اس طرح بطور سند پیش کی گئی ہے۔

"پنجاب یونیورسٹی میں دیوان ولی کا ایک نسخہ رکھا گیا تھا۔ جسے ۳ جلوس محمد شاہی (م ۱۱۳۲ھ) میں ثناء اللہ فانی نے لکھا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:-

"دیوان اشعار ولی مسمی سیّد ولی محمد مرحوم بتاریخ چہاردہم شہر محرم الحرام ۳ جلوس میمنت مانوس محمد شاہ بادشاہ ..... در بلدۂ خیر البلاد احمد آباد .... بخط ثناء اللہ فانی ...... صورت اتمام پذیر رفت"۔

یہ دیوان خود احمد آباد گجرات میں ولی کی وفات کے قریب تر زمانہ میں لکھا گیا تھا، اور اس کے کاتب شاہ محمد ولی اللہ علوی کے ہم وطن بلکہ ہم شہر اور ہم عصر تھے۔ ایسی صورت میں اگر یہ دیوان اُن کی تصنیف ہوتا تو وہ اُن کا نام "مسمی سیّد ولی محمد" ہرگز نہ لکھتے۔

اس طرح ولی کے قریب تر زمانے کے اور قریب تر تعلق رکھنے والے دو علم دوستوں کی شہادت کے بعد یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اُن کا نام ولی محمد تھا، نہ کہ شاہ محمد ولی اللہ علوی۔ اور ان بیچارے شاہ صاحب کو شاعر قرار دے کر خواہ مخواہ اُن پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور چونکہ ایک گجراتی شاہ صاحب کے نام میں جو اتفاق سے بابائے ریختہ کے ہم عصر تھے لفظ ولی ایک جزو کی حیثیت سے

مل گیا، اس لیے ولی اورنگ آبادی کی وطنیت ہی بدل دی گئی۔ اور اس کو سچ مچ گجراتی ثابت کرنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ اس کی زبان کی جو خصوصیات ہیں اُن کی مثالیں گجرات کے چند دوسرے شاعروں کے کلام میں بھی تلاش کی جائیں۔

عجیب بات ہے کہ گجرات کے جتنے شاعروں کے کلام کے نمونے اس سلسلے میں بطور مقابلہ پیش کیے گئے وہ سب یا تو مذہبی بزرگ ہیں یا مثنوی نگار۔ کوئی غزل گو شاعر ولی سے قبل یا اس کے عہد کا نہ مل سکا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ گجرات میں غزل گوئی کا اتنا چرچا نہ تھا جتنا کہ دکن میں صدیوں سے رہ چکا تھا۔ اور ولی کے وقت میں تو اورنگ آباد پورے دکن کے علم و فضل اور شعر و سخن کا مرکز تھا۔ اور ولی جیسا شاعر وہیں پیدا ہو سکتا اور نشو و نما پا سکتا تھا۔ نہ کہ گجرات میں، جہاں کہ کسی غزل گو شاعر کا ولی سے پہلے پتہ ہی نہیں چلتا۔ خود مُرتبِ "ولی گجراتی" نے لکھا ہے کہ ـــ

"اردو کو اس جگہ (گجرات میں) کوئی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ اُردو کی خدمت یا تو صوفیا اور مشائخ نے انجام دی یا صوفی مشرب شعرا نے مذہبی مثنویاں لکھ کر اُردو کی ترقی میں حصہ لیا۔" (صفحہ ۴۵)

ایسی صورت میں اگر ولی گجراتی ہوتے تو شاید اتنے اعلیٰ پایہ کے غزل گو ہی نہ بن سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ایک بلند پایہ مثنوی نگار ہوتے جو وہ نہیں تھے۔

ولی کو گجراتی ثابت کرنے کے لئے یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ گجرات کے شاعروں کی زبان میں ولی کی زبان کی مشابہت یا مطابقت پائی جاتی ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ گجراتی شعراء کی زبان، محاورہ اور لب و لہجہ کا ولی کے کلام میں پایا جانا ثابت کیا جائے۔ اور یہ دکھایا جائے کہ زبان و محاورہ کی یہ خصوصیتیں جو صرف گجراتی شعراء کے لئے مخصوص ہیں اور دکن کے دوسرے شعراء میں نہیں پائی جاتیں۔ اور چونکہ ولی کے یہاں پائی جاتی ہیں اس لئے وہ گجراتی ہی ہو سکتے ہیں اور یہ امر خلاف واقعہ تھا اس لئے مرتبِ "ولی گجراتی" ایسا نہ کر سکے۔ آئندہ اگر ضرورت پیش آئے تو ہم یہ واضح کریں گے کہ گجراتی شعراء کی کون کون سی ایسی خصوصیات ہیں جو اس عہد کے شعرائے دکن کے کلام میں مفقود ہیں اور ان میں سے کوئی خصوصیت ولی کی زبان میں بھی موجود نہیں ہے۔

شاید اسی توقع پر ولی کے رسالہ "نور المعرفت" کی اشاعت بھی عمل میں آئی تھی کہ ولی کا گجراتی ہونا ثابت ہو جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ اس رسالے کی اشاعت نے اس پر بھی پانی پھیر دیا۔ "ولی گجراتی" کے مُرتب ڈاکٹر مدنی نے یہ رسالہ بڑی تلاش اور محنت سے مفید حواشی اور مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ لیکن کتاب کے سرورق پر "تصنیف ولی شاعر ہندی" درج کیا ہے نہ کہ تصنیف ولی گجراتی۔ اور خود اصل رسالہ میں کہیں اس امر کی شہادت نہیں ملتی کہ یہ بابائے ریختہ کی تصنیف ہے۔

اس رسالے کی اشاعت کے بعد کئی شبہات نمایاں ہو گئے ہیں پہلا تو یہ کہ اس کا مؤلف سرے سے کوئی شاعر ہی نہ تھا۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ خود شاہ محمد ولی اللہ اس کے مؤلف ہوں، اور چونکہ شاہ گلشن سیر کے لئے نکل کر احمد آباد بھی آئے تھے اور کچھ عرصہ اپنے اس جدی وطن میں قیام کیا تھا (نور المعرفت صفحہ ۲۸ اور ولی گجراتی صفحہ ۷۲) اس لئے اُس وقت شاہ ولی اللہ نے ان سے فیوض علمی و روحانی حاصل کئے ہوں۔

رسالہ نُور المعرفت کے آخر میں صرف اتنا درج ہے۔ کہ

"مصنفِ ایں عبارت کہ ہمیں ثنا پردازی بزرگان بخطاب ولی سرفراز است و از شاگردی زبدۃ العارفین حضرت شاہ گلشن ممتاز۔"

جس سے شبہ ہوتا ہے کہ مؤلف رسالہ کا تخلص ولی نہیں تھا بلکہ اُس کے بزرگوں نے یہ خطاب یا نام اس کو بخشا تھا۔ اور اگر یہ واقعی ولی اورنگ آبادی کی تالیف ہے اور اُنھوں نے تصوف و عرفان کے رنگ میں جو اس کتاب کا موضوع بھی ہے اپنے تخلص کا بطور انکسار اس طرح ذکر کیا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ دیوان ولی کی طرح یہ رسالہ بھی چار و ناچار شاہ محمد ولی اللہ علوی کے سر منڈھ دیا گیا ہے۔ اور نہ صرف دیوان اور رسالہ ان کے سپرد کر دیا گیا بلکہ شاہ صاحب کے مزار میں جو احمد آباد کے مشہور قبرستان نیلی گنبد میں واقع ہے اور "چینی پیر" کے نام سے مشہور ہے، ولی اورنگ آبادی کو بزعم خود اورنگ آباد کی قبر سے نکال کر مدفون کر دیا گیا۔ ایک ایسے شاعر کے مزار کا جو تمام ہندوستان میں بابائے ریختہ مشہور ہوا اور جس پر حضرت شاہ وجیہہ الدین کے تمام افرادِ خاندان اور جملہ

باشندگانِ احمدآباد فخر کرسکتے ہوں۔ "چینی پیر" کے نام سے مشہور ہونا اور کسی کا یہ نہ جاننا کہ یہ شاعر ولی کا مدفن ہے ظاہر کرتا ہے کہ وہ دراصل حضرت شاہ ولی اللہ العلوی کا مزار ہے، نہ کہ ولی اورنگ آبادی کا جو برہانپور۔ سورت۔ دلّی اور گجرات کی سیروسیاحت کے بعد اپنے وطن کو واپس ہوئے اور بعد وفات اورنگ آباد ہی میں سیّد احمد کی درگاہ کے قریب دفن کئے گئے۔

چنانچہ چند سال قبل جب راقم الحروف گرمی کی چھٹیوں میں تبدیل آب وہوا کے لیے اورنگ آباد میں مقیم تھا اور وہاں اُس کو تلاش پر ولّی کی قبر کا پتہ چلا تو یہ یقین اور مستحکم ہوگیا۔ راقم الحروف تقریباً روزانہ اورنگ آباد کے تاریخی آثار اور درگاہوں کی سیروسیاحت کے لیے نکلتا تھا حُسنِ اتفاق سے ان دنوں وہاں اورنگ آباد کے قدیم جاگیردار نوّاب معزالدین بھی مقیم تھے جو نوّاب صاحب بڑودہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اور سال میں کچھ مدّت بڑودہ میں اور کچھ عرصہ اورنگ آباد میں گزارتے ہیں۔ اُن کو قدیم اور نادر اشیاء کا بہت شوق ہے۔ اور اورنگ آباد کے چپّہ چپّہ سے خوب واقف ہیں۔ اُن کے احاطۂ دولت خانہ سے متصل جانب غرب وہ مشہور تکیۂ شاہ چراغ واقع ہے، جس میں شاہ سراج اورنگ آبادی کا گنبد موجود ہے۔ یہ گنبد امتدادِ زمانہ کے باعث بہت کچھ شکستہ اور خستہ ہوگیا تھا اور گرنے کے قریب تھا اس لیے چند سال پیشتر ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے سرکار میں تحریک کرکے اور اس وقت کے صوبہ دار اورنگ آباد کو توجّہ دلاکر بڑی ہی کوششوں کے بعد اس کی مرمّت کرائی تھی اور اب یہ بالکل نیا گنبد نظر آتا ہے۔ اس کے معائنہ کے دوران میں نواب معزالدّین سے راقم الحروف نے خواہش کی کہ وہ بھی ولّی کی آخری آرام گاہ کی نسبت دریافت فرمائیں۔ نوّاب صاحب نے اورنگ آباد کے بڑے بوڑھوں سے اس بارے میں دریافت کرنا شروع کیا۔

کہتے ہیں کہ جوئندہ یابندہ۔ ایک روز درگاہ حضرت سیّد احمد گجراتی کے ایک ضعیف العمر متوسل سید شاہ نصیرالدین صاحب سے ملاقات ہوگئی، اور ان سے معلوم ہوا کہ اس درگاہ سے متصل ہی ولّی اورنگ آبادی دفن ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن ہم بڑے اشتیاق سے وہاں پہنچے۔ ان بزرگ نے ایک بوسیدہ قبر دکھائی جس پر نہ تو کوئی گنبد ہے اور نہ کسی اور طرح کا ثبوت بہم پہنچ سکتا ہے بسوائے اس کے کہ شاہ صاحب کے خاندان میں یہ روایت پشتہا پشت سے چلی آرہی ہے کہ یہ ولّی شاعر اورنگ آبادی کی قبر ہے۔ اس بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ یہ قبر کسی "چینی پیر" یا کسی اور صاحب کے نام سے موسوم نہ تھی یوں بھی اورنگ آباد میں قبروں پر شاذونادر ہی تاریخی کتبے نظر آتے ہیں اور خود شاہ سراج کی قبر اور گنبد میں بھی کوئی کتبہ موجود نہ تھا۔ گنبد کی مرمت کے بعد لگایا گیا ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے اسی طرح متعدد مشاہیر شعراء کی قبروں پر سنگ مرمر کے کتبے نصب کرائے ہیں۔ چنانچہ شاہ نصیر دہلوی کی قبر پر بھی جو بغیر کسی نشان یا کتبہ کے کس مپرسی کے عالم میں تھی ادارے کی طرف سے کتبہ نصب کردیا گیا ہے۔ اسی طرح ولّی اورنگ آبادی کی قبر کے لئے بھی کتبہ تیار کراکے روانہ کرلے اور ادارے کی جانب سے نصب کرانے کا راقم الحروف نے شاہ صاحب سے وعدہ کرلیا۔

کتاب "ولی گجراتی" کی اشاعت کی وجہ سے جہاں ولّی اورنگ آبادی سے متعلق اُردو ادب کی تاریخ میں بعض مفید معلومات کا اضافہ ہوا یہ مسئلہ بھی طے پاگیا کہ اُردو کے بعض تذکرہ نگاروں نے ولّی کی سیروسیاحت گجرات اور اس سیر کی دلچسپیوں اور گجراتی دوستوں کی محبّت وجاں نثاری کی یاد، نیز مدرسۂ ہدایت بخش کی فیض پاشی اور مولانا نورالدین اور اُن کے فرزند شیخ محمد صالح کی مدح سرائی کی وجہ سے جو خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ گجراتی ہی تھے دراصل غلط فہمی پر مبنی تھا۔ اور یہ کہ ولی کے ہم عصروں میں احمدآباد میں حضرت شاہ وجیہہ الدین کی اولاد میں ایک بزرگ حضرت شاہ محمد ولی اللہ العلوی موجود تھے۔ چنانچہ بعض نسب ناموں، دستاویزوں اور تمسک ناموں میں اُن کے دستخط یا اُن کا نام ملتا ہے۔ لیکن وہ شاعر نہ تھے۔ بلکہ ایک صاحبِ سلسلہ صوفی بزرگ تھے جس کی وجہ سے اُن کا مزار بھی "چینی پیر" کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ لفظ "ولی" نے بعض اصحاب کو اس غلط فہمی میں مبتلا کردیا، جسے اب رفع ہوجانا چاہیئے۔

پہلے ہی چار ولّی کے عنوان سے "یوم ولّی" کے موقع پر ایک مضمون لکھا جاچکا ہے۔ اب "ولی گجراتی" کی اشاعت سے اتنا تو ضرور ہوا کہ ان میں ایک پانچویں ولی بھی شامل ہوگئے۔ لیکن ایسے جتنے ولی بھی چاہیں منصۂ شہود پر آئیں، ولّی اورنگ آبادی، اورنگ آبادی ہی رہیں گے۔

تاجور سامری

سحرِ سامری

(۱)

اب بیٹھ بھی ٹوٹتے کنارے آ پہنچے ہیں سر پہ تُند دھارے

غافل نہ رہیں تری نگاہیں تیور ہیں گھڑی گھڑی کے نیارے

کہنا ہے جو صاف صاف کہہ جا اس دور میں عیب ہیں اشارے

پائی ہے الم کی تھاہ میں نے موجوں نے چھڑائے کیا کنارے

اے موجِ طرب! ذرا ادھر بھی خوابیدہ ہیں رُوح کے ستارے

انسان ہے یا کوئی قیامت لرزاں ہیں پہاڑ چاند تارے

ان کا بھی اُتر گیا ملمع اوہام حقیقتوں سے ہارے

بنجارہ تو لاد ہی چلا ہے اب ٹھاٹ پڑا کسے پکارے

لا آگ کہ منجمد ہوئے ہیں حالات کی سختیوں کے مارے

حیرت سے نہ دیکھ تاجور کو

حالات کا معجزہ ہے پیارے

(۲)

نقصان کرے گا میرے جی کا سودا جو ہوا ہے عاشقی کا

افلاک نشیں سہی فرشتے اُونچا ہے مقام آدمی کا

ظلمات میں لاکھ ظلمتیں ہوں سرچشمہ یہیں ہے زندگی کا

احساس دہک رہا ہے جب تک ڈھلتا نہیں رُوپ زندگی کا

آنچوں سے جو تپ تپا کے نکلے بنتا ہے مقام بھی اُسی کا

انسان کو ڈھونڈتی ہیں آنکھیں کیا کام یہاں کسی ولی کا

کیا بھیس بدل لیا ہے غم نے ہوتا ہے گمان سرخوشی کا

اب ہار گلے کا ہو گیا عشق انجام تو دیکھ دِل لگی کا

کوندے کی لپک شرار کا سوز ان سے ہے خمیر زندگی کا

کچھ کہہ کہ زمانہ منتظر ہے

یہ وقت نہیں ہے خامشی کا

برجموہن دتاتریہ کیفی

غالب اور اُردو خطوط نویسی

تحقیق کچھ عجیب چیز ہے۔ وہ بت ساز بھی ہے اور بت شکن بھی۔ دنیائے فکر و عمل میں کتنے سالمات تھے جو سالبات ہو کر رہ گئے اور اسی طرح سالبات سے سالمات وجود پذیر ہوئے۔ دنیا میں جتنی چیزیں اننت ہیں اُن میں تحقیق بھی شامل ہے۔ اگر کوئی انسان واقعی محقّق ہے یعنی تعصّبِ نفس سے مُبرّا ہے تو وہ تحقیق کے کسی نتیجے کو آخری نقطہ ہرگز نہیں کہے گا۔

تحقیق یا ریسرچ کے طریقوں کی پرداز انسانوں کی شخصی کیفیتِ نفسی سے رنگ تو لیتی ہی ہے مگر ملکی اور کلچرل خطائص سے بھی بہت کچھ متاثّر ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں یعنی مشرقی ملکوں میں اخلاقِ عامّہ کی تحلیلِ نفسی کی جائے تو ثابت ہوگا کہ قدامت پرستی کا عنصر ہماری رائے اور تحقیق پر بے حد حاوی اور عامل ہے۔ کبھی اسے پاس وضع اور نباہ کا نام دیا جاتا ہے اور کبھی اعتقادی استقامت کا سہرا اس کے سر باندھا جاتا ہے۔ اور جگہ یہ حالت نہیں ہے۔ اور اسی لئے وہ نئی نئی حقیقتیں اور قوانینِ قدرت دریافت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

آج میں نیرِ زمیں یا عالمِ بالا سے متعلق کوئی فلسفیانہ یا علمی مسئلہ پیش کرنے کو نہیں ہوں بلکہ اُردو ادبیات کی ایک شِق "غالبیات" سے متعلق صرف ایک امر کا ذکر کروں گا جو اپنی تحقیقات کے سلسلے میں میرے علم میں آیا ہے۔

عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرزا غالب خطوط کے نئے طرزِ تحریر کے مُوجد ہیں۔ اُنھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ مرزا خود اس ایجاد کا دعوےٰ کرتے ہیں اور اسی دعوے پر انتقادی نظر ڈالنا مقصود ہے۔ مرزا کا وہ خط جس میں یہ دعوےٰ کیا گیا ہے اُن کے خطوط کے تمام مجموعوں میں موجود ہے۔ اس پر تاریخِ تحریر درج نہیں ہے۔ مگر خط کے مضمون سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے۔ پہلے اُس خط کی پوری نقل دی جاتی ہے جو مرزا حاتم علی مہر کے نام ہے:

نقلِ خط

"مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے اتنا تو کہو یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی۔ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا نہ اپنی خیر و عافیت لکھی نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا ہاں مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے اُن کو دے آیا ہوں اور انہوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتّب ہو گئی ہے۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے۔ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی۔ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دُور ہو۔ خدا کرے اُن تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایت بھی آئیں تا خاص و عام جا بجا بھیجی جائیں میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا ضیا الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیا کرتے تھے۔ جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا۔ اُن دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ خوش آوازہ بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اُس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا غزل تم کو بھیجتا ہوں

دردِ منت کشِ دوا نہ ہُوا
میں نہ اچھا ہُوا بُرا نہ ہُوا "

. . . .

غزل کے مقطع کے ساتھ یہ خط ختم ہوتا ہے۔ تاریخ تحریر درج نہیں۔ مگر اِس کی تعیین بالجملہ بہت آسان ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ختم ہو چکا ہے مرزا غالب دستنبو لکھ چکے ہیں اور آگرے میں چھپوانے کے لئے منشی شونرائن کے پاس بھیج چکے ہیں۔ کتاب یا کتابوں سے مُراد دستنبو ہی ہے جس کی لوح وغیرہ سے متعلق مرزا کے متعدد خط منشی نبی بخش حقیر وغیرہ کے نام ہیں۔ اُن دنوں مرزا کے یہ چاروں دوست اور شاگرد آگرے میں تھے۔ منشی شیونرائن تو وہاں کے رئیس ہی تھے۔ مرزا حاتم علی مہر وہاں وکالت کرتے تھے اور منشی نبی بخش کسی عدالت میں سررشتہ پر مامور تھے۔ مرزا تفتہ بھی اُن دنوں آگرے گئے ہوئے تھے۔ مرزا غالب نے دستنبو کی تیاری کے سلسلے میں اِن چاروں کو فرداً فرداً اور کبھی مشترکہ طور پر کئی خط لکھے ہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ وہ خط جس کی نقل اوپر کی گئی ۱۸۵۸ء کا لکھا ہُوا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خطوط نویسی میں مرزا کی ایجاد کی تاریخ اس خط کی تحریر سے قائم کی جائے یا اُسے کچھ پہلے کے زمانے سے وابستہ کیا جائے۔ اس کے لئے مرزا کے اُردو خطوں کا توقیتی جائزہ ضروری ہے۔ اس بارے میں راقم نے اپنے دوستوں مثلاً ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی اور مسٹر مالک رام سے مشورہ کیا مگر کچھ حاصل نہ ہُوا۔ یہ امر کہ مرزا نے پہلا اُردو خط کس تاریخ کو لکھا یا یوں کہیئے کہ مستقل طور پر اُردو میں خط لکھنا کب سے شروع کیا ایک مسئلہ ہے جو کافی طور پر حل نہ ہو سکا۔ حالی لکھتے ہیں "کہ جب مرزا مہر نیمروز لکھنے میں مصروف ہوئے تو انہوں نے اُردو میں خط لکھنے شروع کئے اور مہر نیم روز کی تصنیف ۱۸۵۰ء میں شروع ہوئی۔ غالب خود ایک خط میں لکھتے ہیں۔ کہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ زیادہ محنت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اُردو میں خط لکھنے لگا ہوں۔ خطوط کے مجموعوں کے جائزے سے جہاں تک پتہ چلا یہ معلوم ہُوا کہ غالب کے اُردو خطوط مسلسل طور پر ۱۸۵۲ء تک پہنچتے ہیں۔ اس سے آگے منظر تاریک ہے۔ ممکن ہے مزید تحقیق اس پر اور روشنی ڈال سکے۔

مرزا کی فہم و ذکا ذہانت اور فطانت بے شک تعریف کے قابل ہے۔ اکثر انسانوں کے ذہن ان اوصاف سے مزین نہیں ہُوا کرتے۔ ماننا پڑے گا کہ مرزا کا ادبی شعور ایک خاص قسم کا تھا۔ خود نظری یا خود اصلاحی کا جوہر اُن میں موجود تھا۔ اُردو شاعری انہوں نے مرزا بیدل کو سامنے رکھ کر شروع کی۔ مگر اُن کے آخری زمانے کا کلام اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ اسی طرح فارسی شاعری ایرانی اُستادوں کے کٹکھنوں سے شروع ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ کسب۔ اخذ اور ترقی کی غیر معمولی استعداد غالب کی طبیعت میں موجود تھی۔ مگر ایجاد کوئی اور چیز ہے۔ کامیاب تقلید یا ترقی کو ایجاد نہیں کہہ سکتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۳۶ء سے دہلی میں اُردو کا یعقوب پریس قائم ہو گیا ہے صرف دہلی سے کم سے کم دو اخبار نکلنے شروع ہو گئے ہیں۔ کتابیں چھپتی ہیں رسالے شائع ہوتے ہیں۔ اُدھر دوسری طرف مغربی ادب اور علوم کی تعلیم نئی روشنی ملک میں پھیلا رہی ہے لوگوں کی رغبت نئی باتوں اور نئے نظریوں کی طرف ہوتی جاتی ہے اور پُرانی روایات نئی کسوٹی پر کسی جانے لگی ہیں۔ اس ماحول کو ادبی پہلو تک محدود رکھنا مقصود ہے۔ لوگ جو مغربی تعلیم سے حاصل کرتے تھے اس کو تبرک سمجھ کر ابنائے وطن تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔

مرحوم دلّی کالج کے متعلم اور معلّم ماسٹر رامچندر اُن لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اُس قدیم زمانے میں اُردو کے تمول کی ترقی میں اور لوگوں کو اصلاح و ترمیم کی طرف توجہ دلانے میں نمایاں کام کیا ہے۔ ماسٹر رامچندر انگریزی کے ماہر اور ریاضیات کے جیّد عالم ہوتے ہوئے اُردو کی خدمت کا پُرجوش جذبہ اپنے دل میں رکھتے تھے۔ وہ برسوں تک کئی رسالے اُردو میں نکالتے رہے یہاں صرف اُن کے ایک رسالے "محبِ ہند" سے استفادہ کیا جائے گا۔ اس رسالے کی جلد ۲ ۹ بابت دسمبر ۱۸۴۹ء و جنوری ۱۸۵۰ء اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس نمبر کے صفحہ ۴۶ سے جو عبارت نیچے نقل کی جاتی ہے۔ ہر مفکّر اور بے تعصب ادیب کے غور و فکر کی مستحق ہے۔

" تتمہ علوم درباب توہّمات و رسوم
طریقۂ خط و کتابت "

" یہ ظاہر ہے کہ جب دو آدمی آپس میں باتیں کرتے ہیں اور اپنا مطلب ایک دوسرے سے بیان کرتے ہیں اُس میں سوا مطلب کی باتوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ کسی کو یہ کہتے نہیں دیکھا کہ۔ 'بعد گزارش تسلیماتِ فراواں و کورنشات بے پایاں و استحصال ملازمت کثیر المباہجت و ملاقات مسرّت ساعت فلاں کتاب مجھ کو عنایت کرو' بلکہ وقت خطاب کے نفسِ مطلب پر اکتفا کرتے ہیں — چونکہ دو شخص کہ تعارف رکھتے ہیں ہمیشہ ایک جا نہیں رہتے اسی واسطے ضرور پڑا کہ کوئی طریقۂ مخاطبت و اظہار

مافی الضمیر کا جاری کیا چاہیئے۔ لکھنے سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا اسی لیے تحریر قائم مقامِ تقریر ہے۔ صرف مضمون جو وقت مخاطب کے کہا جاتا ہے اُسی کو لکھنا بھی چاہیئے۔ چنانچہ دستورِ اہلِ عرب کا یہی ہے کہ کاغذ پر صرف سلام و مطلب لکھ دیتے ہیں۔ من فلاں الی فلاں وکذا وکذا والسلام۔ ناگری میں بھی اہلِ ہند صرف مطلب سیدھی سیدھی طرح صاف صاف لکھ دیتے ہیں مع سمت و تاریخ۔ انگریزی میں بھی یہی دستور ہے کہ ضرورت سے زیادہ خط میں اور واہیات و منشآت داخل نہیں کرتے۔ سوائے حضرات فارسی بازوں کے جنہوں نے موافق اپنی عادت کے سب چیزوں کو بگاڑتا تھا خط کو خراب کیا۔ اول میں خط کے لمبے چوڑے القاب بعد اُس کے آداب تسلیمات و شرحِ اشتیاق پانچ چار دس بیس سطروں میں بعد اُس کے حال خیریت و عافیت چار سطروں میں پھر شکایت نہ پہنچنے خط کی طرح طرح سے اور بیقرار و مضطر ہونا جس کا بالکل اثر نہیں ہوتا یا حال پہنچنے خط کا اور سرفراز و ممتاز ہونا پھر کچھ تھوڑا مطلب بڑی عبارت میں یا بعضے خطوں میں سوائے امورِ مذکور اور کچھ بیان نہیں ہوتا بعد اُس کے سب آشنایوں کو اسامی وار سلام کہتے ہیں۔ اکثر اُمرا بلکہ عوام میں دستور ہے کہ مبادا دُوسرا آدمی شکایت کرے کچھ نہ کچھ لکھ کر جس میں مطلب کی ایک بات نہیں ہوتی۔ البتہ انشا پردازی اور عبارت آرائی میں حتے الوسع دریغ نہیں ہوتا بھیج دیتے ہیں۔ خطوط تہنیت و تعزیت کے دفتر کے دفتر ہوتے ہیں۔ بعضے خطوں میں دیکھا کہ مضمون نہایت عتاب کا ہے لیکن القاب و آداب سے شرف و عظمت و اخلاق و محبّت ٹپکتا ہے۔ عبارت مضمون کی یہ ہے کہ آں صادق الوداد فلاں امر نہایت قبیح کردند آیندہ چنان نکنند۔ و از صدورِ چنیں امر معلوم شد کہ آں مہربان را با ما عداوتے تمام است۔ لیکن القاب میں مشفق مہربان کرم فرمائے مخلصان۔ مخلصِ اخلاص پرستان وغیرہ اور آداب میں بعد تمنّائے حصولِ مواصلت کہ حد سے و پایانے ندارد و اظہارِ لوازم تسلیم و عبودیت وغیرہ مندرج ہے۔ علاوہ یہ کہ عربی و ناگری و انگریزی میں ہر ایک چیز کا جو نام ہے وہ خط میں لکھا جاتا ہے۔ بخلافِ فارسی کہ اُس میں خط کو عنایت نامہ و چنیں و چناں صدہا طرح کے نام و عبارات صرف خط کے واسطے لکھے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک جا تین خط سات روز کے عرصے میں آئے۔ تینوں میں دو دو چار چار سطریں خیر و عافیت کے مندرج تھیں۔ بار بار خیریت کے لکھنے کی کیا حاجت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خط کو نائب و خلیفہ تقریر کا اختیار کیا تھا۔ نہ دفتر واسطے انشا پردازی و اغلاق عبارات و صناعات و استعارات کے جس کا فارسی والوں کو نہایت مرتبے میں خبط ہو گیا ہے۔ نفسِ انشاء میں کچھ بُرائی نہیں بلکہ ایک فنِّ شریف ہے لیکن اپنے مقام مناسب میں نہ ہر جگہ۔ تقریر و تحریرِ سلام و کلام میں دس سطریں لکھنی جس میں نفسِ مطلب ایک سطر میں ہو تضیع اوقات ہے۔ ایک خط ۲۳ سطر کا میں نے دیکھا جس میں مضمون صرف اتنا تھا کہ قریب چار ساعت نواختہ بر غریب خانہ تشریف آوردند۔ ہر چہ کہ اس مضمون کو بھی بڑی دھوم دھام سے لکھا تھا۔"

اس امر میں شبہ کی گنجائش کہ یہ رسالہ یعنی "محبِّ ہند" قلعہ میں ضرور جاتا ہوگا۔ کیونکہ اس کے قریباً ہر نمبر میں بادشاہ ظفر کی دو تین تازہ غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ چنانچہ اسی اشاعت میں جس میں سے خطوط نویسی کے متعلق مضمون ابھی نقل کیا گیا ہے۔ بادشاہ کی دو غزلیں عین مضمونِ مذکورہ کے بعد درج ہیں۔ عنوان ہے "غزلیاتِ شاہِ جمجاہ دہلی"۔ ظاہر ہے کہ قلعے سے تعلق رکھنے والے اس رسالے اور اِن غزلوں کو ضرور پڑھا کرتے تھے۔ ظنِ غالب یہ ہے کہ ماسٹر رامچندر کا یہ مضمون مرزا غالب کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ اور اُن کی طبع وقاد نے اس سے ضرور اثر لیا ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ ۱۸۵۸ء میں وہ خطوط نویسی میں اپنے مُوجد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جیسا کہ انہوں نے مرزا مہر کے خط میں لکھا۔ اس کو محض اُن کی انانیت اور خود بینی کہنا چاہیئے۔ مرزا غالب ابن الوقت تھے۔ جب جیسا موقع دیکھا ویسی بات کہہ دی۔ سہرے کے وقت میدان صاف دیکھا تو بے تأمّل پکار اُٹھے

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

کیا دُنیا اندھی تھی۔ سب نے جانا کہ یہ اُستاد ذوق کو چیلنج ہے۔ غالبؔ ذوق دونوں کے سہروں کا موازنہ حالی نے یادگارِ غالب نے صحیح ناقدانہ طور پر کیا ہے۔ مرزا کا معذرت کا قطعہ جو اس قضیے کے سلسلے میں ہے سب کے سامنے ہے۔ یعنی اگر شاعری ذریعۂ عزت نہیں ہے تو اُسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اور اپنے آباء کے صد سالہ پیشے کو کیوں نہیں اختیار کر لیتے۔ اُردو میں بات بنتی نہ دیکھی تو فارسی سے پناہ کے طالب ہوئے اور فرمایا کہ ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

دوسرے موقعہ پر عارف کے لئے لکھتے ہیں ؎

آں پسندیدہ خوئے عارف نام
کہ رُخش شمعِ دودمانِ من است
جائے دارد کہ خویش را نازم
کہ فلانی زبیرۂ دانِ من است
جاوداں باش اے کہ در گیتی
سخنت عمرِ جاودانِ من است
اے کہ میراث خوارِ من باشی
اندر اُردو کہ آں زبانِ من است

اس موقعہ پر مرزا اپنی اُردو کو میراث کے طور پر عارف کو دے رہے ہیں ظاہر ہے کہ پیاروں کو اچھی اور پیاری چیزیں ہی دی جاتی ہیں۔ بے رنگ و بے مزہ چیزیں نہیں دی جاتیں۔ اُردو دیوان میں ایک جگہ فرمایا ہے ؎

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخ   آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

مگر منشی نبی بخش حقیر کو ۱۸۵۲ء میں خط میں ایک اردو غزل بھیجتے ہیں اور اپنی میر صاحب موصوف کی بابت لکھتے ہیں

" بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے "

میرے خیال میں جس طرح مرزا غالب نے اپنی شاعری کی بابت دعوے کئے ہیں اُسی طرح خطوط نویسی کے متعلق سمجھنا چاہیئے ❖

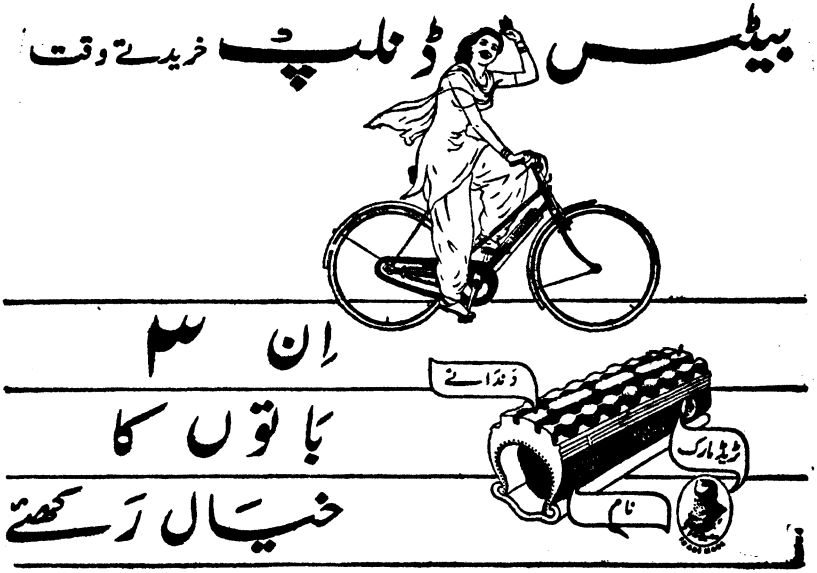

صالحہ عابد حسین

ماں

وہ مخمل سے زیادہ نرم گدے پر محوِ خواب ہے، اس کا حسین سر پروں کے تکیے میں دھنسا ہے اور رگ رگ میں میٹھی نیند کا لطف سمایا ہوا ہے۔ ایک فردوس گوش آواز اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی ہے "امّی جان ــــ میں آگیا"۔ مسہری کے سامنے ایک پندرہ سولہ برس کا حسین نوجوان کھڑا ہے جس کے عضو عضو سے تندرستی پھوٹی پڑ رہی ہے اور کافی چمک دار آنکھوں سے ذہانت جھانک رہی ہے۔ "امی جان" اُف اس آواز میں کتنی مٹھاس، کتنا پیار، کتنی دلکشی بھری ہوئی ہے "بیٹا" اس کے نیم وا ہونٹوں سے نکلتا ہے اور وہ اپنی دونوں گداز باہیں حسن و تندرستی کے اس مجسمہ کی طرف بڑھاتی ہے جو اس کی چھاتی سے چمٹ جاتا ہے اور شبری کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی فردوسی جھولے میں ہلکورے لے رہی ہو ....

"اماں ــ آماں ــــ پیّا ــ پیّا"

اُف یہ کیسی آواز ہے ــ یہ کیسے روح فرسا الفاظ ہیں، یہ کون ہے جو اس کی جنّت کو ڈھا دینا چاہتا ہے .... وہ اور زور سے اپنے لال کو لپٹا لیتی ہے ۔

"پیّا پیّا ــــ آماں ــــ ہائے ــــ ہائے"

ایک جھٹکے سے شبری کا سر پلنگ کے پائے سے لڑھک جاتا ہے اور وہ چونک کر آنکھیں کھول دیتی ہے۔ رات کی تاریکی چھائی ہوئی ہے اور سامنے کی کھڑکی سے کالے آسمان پر لاکھوں ننھے ننھے چمکتے ہوئے تارے ٹمٹماتے نظر آرہے ہیں اور پاس ہی کہیں دو کتّے زور شور سے بھونک رہے ہیں ۔

یہ ایک اسپتال کا خیراتی وارڈ تھا جس میں یہاں سے وہاں تک چارپائیوں پر مریض پڑے ہوئے تھے۔ کوئی ان میں سے ہائے ہائے کر رہا تھا۔ کوئی کچھ دیر کے لیے سب تکلیفوں کو بھول کر نیند کے مزے لے رہا تھا اور کوئی نیند میں درد کے احساس سے غافل نہ ہوسکا تھا اور بار بار کراہ کی آواز اس کے منہ سے نکل جاتی تھی ۔

شبری نے گھبرا کر اپنا سر ادھر اُدھر گھمایا۔ اُف وہ کس سورگ سے اس نرک میں آپڑی ــ اس کا پیارا حسین بیٹا، اس کا آرام دہ کمرہ خواب ــــ یہ سب کیا ہوا ــ ایک پل کے لیے اس کے دماغ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس نے پھر زمین پر اپنی ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں بند کرلیں تاکہ وہ خواب کی دنیا سے پھر اپنی "حقیقت" کی دنیا میں پہنچ جائے۔

"ہائے ہائے ــــ آماں ــ پیّا"

شبری نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کا دماغ اب پوری طرح بیدار ہوچکا تھا۔ اس نے پانی کا گلاس اٹھایا اور دھیرے سے مریض کے سر کو اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر اس کے نیلے، موٹے لٹکے ہوئے ہونٹوں کو لگا دیا ــــ بچے نے ایک بار تجار سے سُرخ سُرخ آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا اور پھر چپ چاپ آنکھیں بند کرلیں ــ ماں نے آہستہ سے بچے کو لٹا دیا اور خود اسی طرح ٹانگیں زمین پر پھیلا کر اور سر مریض کے پلنگ کی پٹی پر لٹکا کر بیٹھ گئی ۔

اس کی نظریں مریض کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو دھیمی زرد روشنی میں بھی صاف نظر آرہا تھا۔ یہ ایک گیارہ بارہ برس کے نوعمر لڑکے کی شکل تھی ۔ اس کا سر غیر معمولی طور پر بڑا، گول اور خوبصورت تھا جس کے نیچے ابھری ہوئی چوڑی پیشانی نظر آتی تھی۔ اور اس حسین سر اور پیشانی کے نیچے ایک بدصورت، بے رونق چہرہ اور بے ڈول جسم نظر آرہا تھا۔ جس میں جڑی ہوئی دو سوکھی، پتلی بد نما ٹانگیں اس بھیانک تصویر کو مکمل کرتی تھیں ــــ ہاں یہ تھا شبری کی امیدوں کا مرکز، اس کی زندگی کی

کل کائنات اس کے خوابوں کی تعبیر اس کی مسرتوں کا منبع — اس کا اکلوتا بیٹا

شبراتی اپنا زرد ہاتھ اپنی بے رنگ پیشانی پر بے قراری سے پھیرنے لگی — "میرا لال — میرا بچہ — اُف کتنا کمزور ہو گیا ہے — بخار سے اس کا بدن کیسا جل رہا — اے اللہ میرے بچے کو اچھا کر دے نہیں تو، نہیں تو یہ دُکھیا کس کے سہارے دنیا میں رہے گی — کس کے سہارے؟ مگر — مگر اُسے اس بچے کا سہارا ہی کیا — یہ اپاہج لڑکا جس کی ٹانگیں بے کار ہیں، دماغ ماؤف ہے اور زبان و حواس کام نہیں کرتے — یہ اس کا سہارا ہے؟

شبراتی کی آگے کو اُبلی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں سے جو کبھی بڑی ہی حسین ہوں گی اور اب اس کے زرد نیلے چہرے پر بہت ہی بے جوڑ معلوم ہوتی تھیں آنسوؤں کے دو قطرے گر کر اس کے پھٹے دوپٹے میں جذب ہو گئے اس کے کانوں میں اپنے ہمدردوں کی آوازیں ایسے گونجنے لگیں جیسے ٹوٹا ہوا گراموفون ریکارڈ بج رہا ہو —

"بچاری شبراتی — یہ بچہ تو اُس کی جان کا عذاب بن گیا ہے"

"دیکھو تو اتنے بڑے ڈھونگ کو گود میں لادے لادے پھرتی ہے — زمین پر چھوڑ دے تو آپ ہی جھک مار کر چلنے لگا"

اے بوا ان کی مامتا دنیا سے نرالی ہے — کوئی اپنے حسین تندرست بچوں کو اتنا نہ چاہتا ہو گا جتنا یہ اس پاگل اپاہج کو چاہتی ہیں" —

"اے شبراتی کی اکیلی جان اس کی دو روٹیاں کس کو بھاری ہیں پر یہ ان کا بوبر کا بوبر لڑکا اُسے کون بھگتے؟"

"بھلا کیا اس بچے کی زندگی — کون ماں کو اس سے کوئی سہارا ہے — مر جائے تو بچاری کا پنڈ تو چھوٹے" —

"جب شبراتی نہ ہو گی تو اس نامراد کا کیا ہو گا — شبراتی کے سامنے ہی مر جائے تو سمجھو اس کی مٹی سوارت ہو گئی" —

"اے بہن اتنے لاڈ تو نہ کیا کرو — تمہیں پیار آتا کیسے ہے اس پر" —

"بچاری کے خوبصورت تندرست بچے مر گئے اور زندہ رہا تو یہ بے نصیب" —

شبراتی نے گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے — اُف ان ہمدردوں کی یہ روح فرسا آوازیں کہاں سے اُسے سنائی دے رہی ہیں — انہوں نے کوس کوس کر میرے بچے کو بیمار ڈال دیا — یہ چاہتے ہیں کہ یہ اپاہج بچہ مر جائے تو شبراتی کی جان چھوٹے — بے سمجھ، بے حس — بے درد — وہ کیا جانیں کہ یہی بچہ تو میری جان ہے — میری زندگی کا سہارا ہے — میرا ہے — میرا اپنا ہے — اس کے سوا دنیا میں کون تھا، کون ہو گا؟ کوئی نہیں — کوئی نہیں — یہی تو ہے جس نے اس بے رنگ اجاڑ زندگی میں مٹھاس اور محبت کا رنگ پیدا کیا ہے — میرا بچہ، میرا چاند" — اور ایک بار پھر شبراتی نے بچے کی پیشانی کو بے قراری سے کئی بوسے دئے اور بخار سے تپتے ہوئے جسم کو زور سے سینے سے چمٹا لیا — درد و مصیبت اور بے غرض سچی محبت کا یہ ایک ایسا دردانگیز اور سبق آموز مرقع تھا جس کو دیکھ کر پتھر کا دل بھی پانی ہو جائے —

ایک پاگل اپاہج بچہ اور اس کی نادار محتاج ماں — ہڈیوں کا ڈھانچہ مفلسی اور بے چارگی کی جیتی جاگتی تصویر — جو بارہ سال سے اس بچے کی خدمت میں اس طرح لگی ہوئی تھی کہ اُسے اپنے سونے کھانے کسی بات کا بھی ہوش نہ رہا تھا — عزت، ذلت، ہوت نہوت، آرام تکلیف، محبت نفرت، اپنی ذات کے لئے برسوں پہلے وہ ہر جذبے سے خالی ہو چکی تھی — وہ جس کی زندگی چار سال کی عمر سے لے کر اب چالیس سال تک درد و مصیبت محرومی و ناکامی کی ایک ایسی مسلسل کہانی تھی جس کا کوئی اختتام نہ ہو — اب اس کے سارے جذبات و احساسات کا مرکز اس کا بچہ تھا — جو اس سے محبت کرتا، ذرا میٹھا بول بول لیتا — شبراتی اس کا احسان کبھی نہ بھولتی اور جو اس پر حقارت اور نفرت کی نظریں ڈالتا یا شبراتی کی ہمدردی میں اُسے بُرا بھلا کہتا اُسے اس ہمدرد کی صورت سے نفرت ہو جاتی — یہ بے درد بے حس لوگ — آہ وہ اس کی ذرا سی مسرت بھی نہیں دیکھ سکتے — وہ کیا جانیں کہ شبراتی کو اس اپاہج بد صورت بچے سے کتنا پریم ہے اُس کی سیوا میں اُسے کیسی شانتی، کیسا رس، کتنا سکون نصیب ہوتا ہے —

شبراتی کی سوکھی ہڈیوں سے چمٹے ہوئے بچے نے آنکھیں کھول دیں — بے حس، بے رنگ آنکھیں جن میں کوئی جذبہ نہ تھا کوئی خواہش نہ تھی — "اماں اور پپا" — یہی دو بامعنی لفظ وہ اُسے بارہ سال کی کوشش میں سکھا پائی تھی — ماں اور پانی — زندگی کی دو اٹل ضرورتیں — حقیقتیں —

ان کا احساس اس بچے تک کو تھا جس کے لئے ڈاکٹروں نے تشخیص کر دیا
تھا کہ اس کے دماغ میں حرام مغز نہیں بن سکا ہے ۔
شبری نے بچے کو لٹا دیا اور خود بھی پائے پر سر جھکا کر سونے کی کوشش کرنے لگی — مگر نیند — آہ دنیا کی شیریں ترین چیز — نیند اس سے کوسوں دور تھی ۔ اور بیتی زندگی کے کچھ گڈمڈ سے، اُلجھے ہوئے سے نقشے اس کے ذہن میں اُبھر اور مٹ رہے تھے ۔ بیتی زندگی بیتی زندگی ۔

بچپن کا سُنہرا زمانہ، جب ماں کی پُرمحبت آغوش اس کا گہوارہ تھی اور باپ اپنی ساری پونجی اس اکلوتی بچی پر نچھاور کرنے کو ہر وقت تیار رہتا تھا اور سارا خاندان اس پر صدقے واری رہا کرتا تھا — آہ... یہ مبارک زمانہ شبری کو ذرا بھی یاد نہ تھا — اور اگر اس نے لوگوں سے بار بار اس کا ذکر نہ سنا ہوتا تو وہ تصوّر بھی نہ کر سکتی تھی کہ اس کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہوگا جس میں محبّت تھی، راحت تھی، عیش تھا، آرام تھا — اُس کی تو سب سے پہلی یاد ہی اتنی روح فرسا تھی جس کے خیال ہی سے وہ کانپ جاتی مگر چار سال کی عمر میں اس کے ننھے سے دماغ پر جو بھیانک تصویر نقش ہو گئی تھی وہ آج تک نہ مٹ سکی تھی — اس کے ماں اور باپ دونوں لکڑی کی طرح اکڑے ہوئے اور برف کی طرح سرد اور پتھر کی طرح سخت گندگی میں لت پت پڑے ہوئے ہیں اور وہ کبھی ایک کی چھاتی سے لپٹ کر روتی ہے کبھی دوسرے کی مگر ان میں سے کوئی نہیں جاگتا، کوئی اُسے نہیں چمکارتا یہاں تک کہ وہ بے خبر ہو جاتی ہے — پھر اس کے آگے اسے کچھ بھی یاد نہ تھا ۔ ہاں جب اس کو ہوش آیا تو اس نے اپنے کو ایک بوڑھی عورت کی گود میں پایا جو اسے لپٹا لپٹا کر رو رہی تھیں — یہ تھیں اس کی خالہ اماں جن کے سائے میں اُس کو اپنی باقی عمر گزارنی پڑی ۔

اُف کتنی تیز مزاج اور بدگمان تھیں یہ خالہ اماں — خالہ اماں جن کا قول تھا کہ لڑکی کو کھلائے سونے کا نوالہ اور دیکھے شیر کی نگاہ اُسے یہ تو یاد نہ تھا کہ انہوں نے اُسے سونے کے نوالے کھلائے تھے یا نہیں البتہ یہ اس کے ذہن میں خوب نقش تھا کہ ان کی نگاہ شیر کی نظر جیسی خوفناک اور آواز بھی ویسی گرج دار تھی — وہ ہنسی کیوں روئی کیوں؟ فلاں سے بات کیوں کی؟ صبح کو دیر سے کیوں اٹھی؟ رات کو سویرے کس لئے نہیں سوئی، دروازے کے قریب کیوں گئی، نماز پڑھی یا نہیں، تلاوت کی یا نہیں — احکام و سوالات کا ایک سلسلہ تھا جو کبھی ختم نہ ہوتا تھا اور جس نے اُس کی روح کو مسل اور جسم کو کچل دیا تھا ۔ نہ اس کا قد و قامت بڑھ سکا، نہ چہرے پر سرخی اور شگفتگی آئی ۔ نہ اونچی آواز میں بولنے یا کسی بات میں اختلاف کرنے کی جرأت اس میں پیدا ہو سکی ۔ وہ تو ایک مشین تھی جو خالہ اماں کے اشاروں پر چلا کرتی — بظاہر بے زبان بے حس مشین — مگر اس خاموش کل کے اندر خیالات اور احساسات کا جوالا مکھی پھوٹتا رہتا، جذبات کا جو طوفان اٹھا کرتا تھا، اسے کسی نے محسوس نہ کیا ۔ کسی نے یہ نہ دیکھا کہ بے ماں باپ کی اس لڑکی کے دل میں کیا ہے؟ وہ کیا چاہتی ہے؟ کیا سوچتی ہے — اُسے کوئی بھی ہمدم و ہم راز نہ ملا اور اندر ہی اندر گھٹتی رہی، جلتی رہی اور ان سب کا اثر اس کی صحت پر پڑتا رہا ۔ جوانی کی پربہار عمر میں بھی وہ ایسی ہی زرد رو، افسردہ اور خاموش رہی ۔ نہ اس کی گالوں پر سرخی نظر آئی نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچی اور نہ جسم میں گداز اور لچک پیدا ہوئی ۔ ہاں اگر کوئی غور سے دیکھتا تو اس کی بڑی بڑی افسردہ آنکھوں میں کبھی کبھی ایک بھوک ایک چمک نظر آ سکتی تھی ۔ ایک ایسی چمک جس میں بغاوت کی آگ تھی، انقلاب کا طوفان تھا، اس سماج کو بدلنے، اس ماحول کو کچلنے کی آرزو — یہی ایک واحد نشانی تھی اس کی جوانی کی — جو ایک لمحے کے لئے پیدا ہوتی اور پھر جانے دل کی کس گہرائی میں جا کر چھپ جاتی — اور جب لوگوں نے اس کے جوان ہونے کے چرچے اور اس کے بیاہ کا ذکر فکر شروع کر دیا، گویا اُس کی سوئی ہوئی جوانی کے احساس کو جگا دیا تو یہ مخصوص چمک کچھ اور زیادہ بڑھ گئی — ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی چیز کی تلاش میں ہے — کوئی شے جسے پا کر وہ ان سب بندشوں کو توڑ ڈالے گی، اور اپنے کو آزاد کرا لے گی — جہاں یہ روک ٹوک نہ ہوگی، پڑھنے لکھنے، اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے پر پابندی نہ ہوگی — وہ دنیا کو دیکھے گی، سمجھے گی، جانے گی کہ وہ کیا ہے اور اس میں کیا کچھ ہوتا ہے لیکن پھر — پھر خالہ اماں اور دوسرے شفیق بزرگوں نے بڑے

چاؤ کے ساتھ اس کے ہاتھ پیلے کر دئے۔ اس کا رشتہ کا بھائی نذیر اس سے زیادہ زرد رو، مریض، دبّو اور خاموش ——— اس کی جیون نیّا کا کھویّا بنایا گیا ——— نذیر جو اسے ذرا بھی پسند نہ تھا۔ اس کمزور دُبلی پتلی مرجھائی ہوئی لڑکی کے دل میں ایک ایسے ساتھی کی تمنّا پروان چڑھ رہی تھی جو حسن و تندرستی، طاقت و قوّت، بہادری اور بے خوفی کا ایک ایسا مجسّمہ ہو جس کے اندر کھو کر وہ اپنی کمیوں کو بھول جائے، جس کا سہارا پا کر وہ دنیا میں وہ سب کچھ کر سکے جس کا اٹھارہ بیس برس تک وہ خواب دیکھتی رہی ہے۔ وہ دنیا میں عزّت، طاقت، دولت اور شہرت پا سکے، علم حاصل کر سکے، سیر و سفر کر سکے۔ آہ ——— وہ سب کچھ کر سکے جو نہیں کر پائی ——— مگر نذیر ——— نذیر کے پلّے بندھنے کے بعد وہ کیا کرے گی۔ وہ تو وہی پہلی جیسی بے بس کمزور شبری رہے گی۔ اس نے بار بار چاہا کہ خالہ امّاں سے کہہ دے کہ وہ نذیر سے شادی نہ کرے گی ——— ہرگز نہ کرے گی۔ اگر وہ اس کے لئے کوئی اچھا بر تلاش نہیں کر سکتیں تو وہ خود انتخاب کرے گی ——— اور اس کی نظروں میں ایک وجیہہ اور ہنس مکھ چہرہ گھومنے لگتا۔ اور اس وقت اس کی آنکھوں کی مخصوص چمک اتنی تیز ہو جاتی جیسے اس آگ میں سب کچھ بھسم کر دے گی ——— مگر ——— مگر خالہ امّاں کی سرخ سرخ آنکھیں اور چچا جان کا پر خشونت چہرہ دیکھتے ہی یہ آگ برف کی طرح سرد ہو جاتی، اور وہاں سوا حسرت و یاس کے اور کچھ باقی نہ رہتا ———

اور آخر وہ نذیر سے بیاہ دی گئی۔ مریض و مدقوق شوہر نے اُس کی پوری پوری "قدر" کی۔ اس کے پاس دولت نہ تھی جو وہ شبری کو عیش کرا سکتا۔ البتہ "محبّت" کی فراوانی تھی جس کی وہ شبری پر مسلسل بارش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شبری کا نس نس کا خون، دل کی گرمی، آنکھوں کی چمک سب اُس کی وحشیانہ محبّت کی بھینٹ چڑھ گئی اور سال بھر کے اندر اندر وہ جانے کتنے نسوانی امراض میں مبتلا ہو کر چھ مہینے تک زنانہ اسپتال میں پڑی ایڑیاں رگڑتی رہی۔ اس کا بغاوت کا جذبہ خاک ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک بے بس نفرت ایک مجبور غم نے چھین لی تھی ——— اور نذیر دن رات دوڑ دھوپ کر کے اس کا علاج اور دوا کرا رہا تھا۔ شبری ایک طرح بیٹھے بیٹھے شل ہو گئی تھی۔ اسپتال کی زمین اب اتنی سرد ہو چکی تھی کہ اس کے نیچے بچھا ہوا دری کا ٹکڑا اس کی خنکی کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا اور یہ سردی شبری کی ٹانگوں سے ہوتی ہوئی اس کے سر تک پہنچ رہی تھی۔

اُف اتنی ہی سرد اور بے کیف تھی اس کی یہ بیس سالہ زندگی بھی۔ جس میں اُسے شوہر کی "قسمت" کو گوارا کرنا پڑا، ساس نندوں کی تربیت کو سہنا پڑا۔ مالی مشکلات کا مقابلہ کرنا اور بیماری سے مسلسل لڑنا پڑا اپنی بھی اور نذیر کی بھی۔ سال میں ایک دو مہینے وہ خود خیراتی اسپتال میں رہ آتی اور دو تین مہینے نذیر وہاں کاٹ آتا ——— وہ دق کا مریض تھا لیکن اس کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ باقاعدہ علاج کرا سکے، اچھا کھانے پینے کو نہ تھا جس سے صحت بحال ہو جائے اور وقت نہ تھا جس میں آرام کر سکے۔ وہ میٹرک تک پڑھا تھا مگر اسے آج تک کوئی باقاعدہ نوکری نہ ملی تھی۔ وہ پرائیویٹ ٹیوشن کرتا، دکانوں پر حساب کتاب لکھا کرتا اور اس طرح اپنا، اپنی بیوی اور اپنی ماں بہن کا پیٹ کسی نہ کسی طرح پالتا رہا ... مگر جب وہ زیادہ بیمار ہو جاتا تو مجبوراً اسے اسپتال میں داخل ہونا پڑتا اور یہ زمانہ اس کے گھر والوں پر بڑی ہی مشکل سے کٹتا تھا۔

یہ سب تھا مگر اس حال میں بھی سارے خاندان کو نذیر کے بچے کی تمنّا نے بے قرار کر رکھا تھا۔ بلا سے ماں کمزور اور بیمار ہے مگر بچہ تو ہونا ہی چاہیے۔ بھلا وہ عورت ہی کیا جو اپنا مقصدِ حیات پورا نہ کر سکے اور شوہر کی گود بچّوں سے نہ بھر دے ——— باپ مدقوق ہے تو ہوا کرے پر اس کا نام تو باقی رہنا ہی چاہیئے۔

اور آخر برسوں کی منتوں مرادوں کے بعد شبری امید سے ہوئی۔ اب شبری کا دل بھی امید و آرزو کے ہلکے ہلکے جھکورے لے رہا تھا۔ وہ آ رہا ہے۔ اس کا بچّہ، اس کی خوشی اور امید، اس کی زندگی کا سہارا۔ کبھی کبھی مسرّت کی ہلکی سی لہر اس کی یاس میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں ایسے نظر آنے لگتی جیسے تاریک سمندر میں روشنی کا مینارہ چمک اُٹھتا ہے۔

ہاں شبری کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، خوبصورت، موٹا تازہ ——— مگر مُردہ ——— ماں اتنی کمزور تھی کہ باوجود انتہائی کوشش کے وہ زندہ بچہ پیدا نہ کر سکی۔ اور پھر دو سال بعد ایک بچّی پیدا ہوئی۔ اتنی دُبلی اور

چھوٹی جس پر آدمی کے بچہ ہونے کا گمان ہی مشکل سے ہوتا تھا — اس ننھی سی جان نے دو مہینے جوں توں اس دنیا میں کاٹے اور پھر بیزار ہو کر جہاں سے آئی تھی وہیں واپس چلی گئی — شاید وہ دنیا زیادہ دلکش اور حسین تھی — اور شبری پھر رنج و حسرت، یاس و ناکامی کے سمندر میں ڈوبنے لگی۔

نذیر کی صحت اور زیادہ گرتی جا رہی تھی اور اسی مناسبت سے افلاس و فلاکت اپنا سایہ گہرا کرتی جاتی تھی۔ مگر وہ کھانس کھانس کر اور خون تھوک تھوک کر پیٹ بھرنے کے قابل روزی کماتا رہا اور اسی زمانے میں پھر شبری کو یہ امید پیدا ہوئی کہ وہ اپنے مریض شوہر کی سب سے بڑی تمنا پوری کر دے گی۔ وہ نو مہینے مسلسل بیمار رہی۔ اس کے جسم میں خون نہ تھا، ہڈیوں میں طاقت نہ تھی مگر تخلیق کا بے پایاں جذبہ اسے گھسیٹ رہا تھا۔

اور آخر ایک دن موت سے زبردست جنگ کرنے کے بعد شبری نے اس — اس عجیب الخلقت بچے کو جنم دیا — سارا خاندان خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا — وہ آ گیا — باپ دادا کا نام چلانے والا، نسل قائم رکھنے والا فرشتہ — بلا سے اگر اس کی صورت بُری ہے، جسم بے ڈول ہے، ٹانگیں بے حد پتلی اور سر بے انتہا بڑا ہے — کیا ہوا — جیتا بچ جائے یہی نام روشن کرے گا۔ شبری نے جب اس پر نظر ڈالی تو بیک وقت اس کے ہونٹوں پر مسرت کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں غم کے آنسو تیرنے لگے — اوہ خالق — کیا تجھے میری تمنا اس طرح پوری کرنی تھی۔ تیرے ہاتھ میں تو یہ بھی تھا کہ اُسے تندرست اور خوبصورت بنا دیتا — شبری، انجان، بے خبر شبری وہ یہ نہ جانتی تھی کہ یہ بچہ جو اس جیسی کمزور ماں اور نذیر جیسے مریض باپ کی اولاد ہے جن کو دو وقت پیٹ بھر کھانے کو بھی نہیں ملا ہے، جنہیں دوا کے نام پر سرکاری اسپتالوں کا صرف کڑوا پانی پینے کو ملتا رہا ہے، جن کو اپنی ساری طاقت اور قوت دو وقت کی روکھی روٹی فراہم کرنے میں صرف کر دینی پڑی ہے — اور جن کے جسم تخلیق کے مقصد سے بہت دُور وہ طاقت کھو چکے ہیں جس کے بل پر تندرست اور ذہین بچے وجود میں آتے ہیں — شبری تو یہ کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ وہ صرف اتنا سمجھ پائی کہ اس کی زندگی کی پہلی اور آخری تمنا ایک اپاہج بچے کی صورت میں پوری ہوئی ہے۔ بجلی کی لہر کی طرح اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اور بچوں کی طرح یہ بھی ختم ہو جائے تو کتنا اچھا ہو — مگر — مگر جانے کہاں سے سوئی ہوئی مامتا نے انگڑائی لی — وہ کانپ گئی — اور اس نے ننھے کو چھاتی سے لگا لیا۔

اور یہ بچہ پلتا رہا بڑھتا رہا۔ مگر نہ اس کے منہ سے بے معنی خوں خاں کے سوا کوئی لفظ ادا ہو سکا اور نہ وہ پیروں پر کھڑا ہو سکا.... اس سے خاندان کے لوگوں کی محبت اور توجہ جس تیزی سے کم ہو رہی تھی ماں کی محبت اُسی رفتار سے بڑھ رہی تھی — یہاں تک کہ مریض باپ بھی اب اپنے اس نام چلانے والے سے بیزار سا نظر آتا تھا — وہ سوچتا یہ اپاہج گونگا بچہ بھلا کیا میرا اور میرے باپ دادا کا نام چلائے گا — کاش — کاش — اور سینکڑوں کاش اس کے دماغ میں کیڑوں کی طرح رینگنے لگتے — کاش — جو ہماری زندگی کا ایک اہم جز ہو کر رہ گئے ہیں۔

شبری کو نذیر کی بے رُخی بہت ہی ناگوار گزرتی۔ وہ سوچتی اس معصوم کا کیا قصور ہے جو ہم اس سے بے اعتنائی برتیں۔ اس کو وجود میں لانے کی ذمہ داری ہم پر ہے اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچائیں... بار بار یہ خیال اس کے دل میں پیدا ہوتا کہ نذیر ہی کی وجہ سے یہ بچہ ایسا پیدا ہوا ہے — وہ خود سدا کے بیمار روگی۔ اگر ان سے میری شادی نہ ہوتی تو یوں میری زندگی برباد نہ ہوتی۔ نہ یہ بچہ یوں بے علاج دوا کے پڑا رہتا...

مگر جب نذیر بالکل صاحب فراش ہو گیا تو شبری کی آنکھوں میں دین دنیا دونوں سیاہ نظر آنے لگے — اب کیا ہوگا؟ کیا؟ بیوگی کا خوفناک بھوت اب اس کو اپنے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا نظر آتا تھا۔ اب وہ کہاں جائے گی، کس کے سہارے وہ اور اس کا بچہ زندگی گزاریں گے؟ اور پھر بارہ پندرہ برس تو آدمی جانور کے ساتھ رہے تو اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے اور یہ تو بہرحال اس کا شوہر تھا — اس کی جدائی کا خیال ہی شبری کے لئے ہولناک تھا — مگر قدرت کا قانون تو کسی بات کی پروا نہیں کرتا — جو ہونا تھا ہو کر رہا اور نذیر چھ برس کے معذور بچے اور جوان بیوی کو بے سہارا چھوڑ کر دنیا سے چل بسا — اور شبری ایسا تڑپی ایسی بلکی کہ کیا کوئی عورت اپنے محبوب کے لئے بے قرار ہوتی — اس میں

بھی ہندی عورت کی وہی فطرت کارفرما تھی جو خاوندوں کے ساتھ جل مرنا خوش نصیبی سمجھا کرتی تھیں — مجبور بے بس انجان ہندی عورت — کا ایک روپ شبری بھی تھی — جو نہیں جانتی تھی کہ اگر حالات سازگار رہتے، اگر ماحول اور سماج نے اُسے اس طرح نہ کچل دیا ہوتا تو وہ اس سے بہتر زندگی بھی گزار سکتی تھی — ایک پُرمسرت اور خوش باش زندگی جس میں اس کے سفرِ زندگی کا ساتھی اس کا سچ مچ کا رفیق، اس کا محبوب اور عاشق ہوتا، اس کا سچا سہارا — اس کے گلشنِ حیات میں تازہ بتازہ پھول کھل سکتے تھے جن کے ساتھ وہ بھی ہنستی — وہ یہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اُسے تو صرف یہ احساس تھا کہ قسمت نے جو اُسے دیا تھا وہ بھی اس سے چھین لیا اب اس کے پاس سوا ایک مُرجھائے پھول کے اور کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اور اس سوکھے ہوئے پھول کو اس نے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اس پر تُل گئی کہ مرنے والی کی اس نشانی کو خونِ جگر سے سینچے گی اور اُسے ہرگز مرجھانے نہ دے گی۔

عدت کا زمانہ جیسے تیسے بیت گیا تو شبری کی خالہ اماں اُسے پھر اپنے گھر لے آئیں۔ شبری آنا نہ چاہتی تھی مگر اور کوئی ٹھکانا بھی نظر نہ آیا۔۔۔ اس بار خالہ کا طرزِ عمل اسے پہلے سے زیادہ ناگوار گزرا خاص طور پر اس کے بچے سے سب لوگ جیسی حقارت کا سلوک کرتے تھے ۔۔۔ مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے کہاں جائے ۔۔۔

شبری کی سوکھی ٹانگوں نے اب چلنے سے انکار کر دیا تھا وہ گھٹنے پیٹ میں دئے دونوں بازو چھاتی پر لپیٹے سردی سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی مگر نہ سردی اس کا پیچھا چھوڑتی تھی اور نہ ماضی کی دُکھ بھری یادیں ۔۔۔

اور آخر دو سال بعد خالہ اماں بھی مر گئیں۔ کچھ دن شبری اپنے نند اور دیور کے ساتھ رہی مگر یہاں بھی اس کو وہ عزت اور آرام نہ ملا جس کی وہ بھوکی تھی اور آخرکار اس نے اپنے شوہر کے ٹوٹے پھوٹے مکان میں تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا اور وہیں اُٹھ آئی۔ عزیزوں نے منع بھی کیا مگر وہ مانی نہیں۔ اب اُس کے سامنے بڑا اہم اور کٹھن سوال یہ تھا کہ وہ کیا کھائے — عزیز اول تو خود تنگ دست تھے دوسرے مدد کے لئے اس شرط پر آمادہ تھے کہ وہ ان کے پاس رہے اور دو روٹیاں کھاتی رہے۔ اسے کوئی ایسا ادارہ یا محتاج خانہ نظر نہ آتا تھا جہاں اپاہج بچے کی سیورا یا بیوہ عورت کی سہائتا کا کوئی انتظام ہو۔ کوئی صورت گزارے کی شبری کو نظر نہ آئی تو اس نے محنت مزدوری کی ٹھانی اور ایک کارخانے میں جہاں بیڑی بنانے کا کام عورتوں سے لیا جاتا تھا وہ کام کرنے لگی۔ اس طرح جو کچھ اسے ملتا اس سے کسی نہ کسی طرح دونوں ماں بیٹے کا پیٹ پلنے لگا — لیکن عزیزوں نے جب یہ سنا کہ وہ ان جیسے عالی خاندان کی فرد ہوتے ہوئے مزدوری کرتی ہے اور اس طرح سب کی ناکیں خطرے میں پڑ گئی ہیں، تو وہ بہت برہم ہوئے۔ لیکن شبری کو تو دو جانوں کا پیٹ پالنا تھا، وہ اب کنواری کم عمر لڑکی تو نہ تھی جو خالہ اماں کی دھمکیوں سے ڈر جاتی — وہ کام کرتی رہی اور سب نے اس سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ شبری روز اپنے آٹھ نو برس کے بچے کو گود میں لٹکا کر کسی نہ کسی طرح گھسیٹتی ہوئی کام پر پہنچ جاتی ۔۔۔۔ راستے میں جب لوگ اسے اس ہئیت میں دیکھ کر ہنستے تو شبری کا کمزور جسم غصّے سے کانپنے لگتا — اُف یہ بے درد انسان — دوسروں کی مصیبت پر جنہیں صرف ہنسنا آتا ہے۔ یہ اتنے سب مل کر کوئی مدد نہیں کر سکتے، علاج دوا نہیں کرا سکتے تو کم سے کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اس کا مذاق نہ اُڑائیں ۔۔۔۔ وہ اسی طرح غصّے سے کھولتی رنج میں ڈوبی کام پر پہنچ جاتی اور دن بھر بیٹھی بیڑیاں بنایا کرتی۔ مگر شبری کی مصیبت ختم نہ ہوئی تھی بچہ جو دنیا کی کوئی بات نہ سمجھتا تھا کوئی کام نہ کر سکتا تھا اس نے بڑی آسانی سے بیڑی پینا سیکھ لیا اور اس جرم پر شبری کو اس کام سے الگ کر دیا گیا۔ لیکن پیٹ کو روٹی تو اب بھی چاہیے تھی۔ دو چار ہمدردوں کی مدد سے اب شبری کو کچھ شریف خاندانوں کی لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھانے کی نوکری مل گئی۔ مگر یہ سب شرفا اس بات پر مُصر تھے کہ وہ اپنے بچے کو ساتھ نہ لایا کرے — شاید اس کو دیکھ کر اُن کا ضمیر کچھ ملامت کرتا تھا یا ان کے "ذوقِ سلیم" پر بار پڑتا تھا۔ شبری کو بچے کو گھر میں بند کر کے پڑھانے کے لئے جانا پڑتا اور جب وہ تھکی ہاری واپس آتی تو دیکھتی کہ بچے نے گھر کے مٹکے لوٹے اور سب سامان خراب کر رکھا ہے اور خود گندگی میں لت پت ہے۔ تو ایک دل خراش آہ اس کے منہ سے نکل جاتی۔ "اے اللہ" کب تک آخر کب تک میں یہ سب سہوں گی — اور اسی طرح اُس کے یہ دُکھ بھرے دن گزرتے گئے اور شبری مصیبتیں سہتے سہتے، دکھ اٹھاتے اٹھاتے بہت بوڑھی لگنے لگی۔ اس کے منہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں، بال سفید ہو چکے تھے اور چالیس سال کی عمر میں وہ ساٹھ سال سے زیادہ کی معلوم ہوتی تھی ۔۔۔۔ شبری کا بچہ اب دو چار لفظ بولنے اور چاروں ہاتھ پاؤں

پر چلنے لگا تھا اور اسے یہ امید بندھ گئی تھی کہ شاید دو چار برس میں وہ سیدھا چلنے اور کچھ اور زیادہ باتیں کرنے لگے۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر بھی بچے ہی کو کھلاتی تھی۔ وہ سمجھتی کہ یہ جتنا کھائے گا اس میں طاقت آئے گی اور پھر تندرست ہو جائے گا۔ جب تک وہ مایوس نہ ہوئی تھی' وہ شہر بھر کے ڈاکٹر حکیموں کی جا جا خوشامد کرتی اور جو دوا وہ بتلاتے اس کے کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ چند مہینے پہلے اسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر صاحب کو اس نے ہاتھ جوڑ کر اس پر راضی کیا کہ وہ اس کے بچے کا معائنہ کرکے بتائیں کہ وہ کیسے اچھا ہو سکتا ہے .... ڈاکٹر صاحب نے بڑے غور سے بچے کا معائنہ کیا۔ دماغ کا ایکسرے لیا اور شبری کو ہمیشہ کے لئے مایوس کر دیا۔ انہوں نے کہا اس بچے کے دماغ میں پیدائشی نقص ہے جو کسی طرح دور نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کی ٹانگوں کا علاج جنوبی ہند میں جا کر ہو سکتا ہے جس میں کم سے کم پانسو روپے کا خرچ ہے — پانسو روپے — پانسو روپے! شبری کے لئے پانسو روپے قارون کے خزانے سے بڑھ کر تھے۔ وہ اپنی جان تو اپنے بچے کے لئے آسانی سے دے سکتی تھی لیکن روپیہ اور وہ بھی پانسو — وہ آسمان سے تارے توڑ کر لانے سے بھی زیادہ ناممکن تھا — اور آج امید کا یہ آخری تار بھی ٹوٹ گیا اور اُس نے بچے کے ٹھیک ہونے کی امید کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ اور اب اس نے اپنے اور بچے کے مستقبل کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ وہ بارہ سال تک سوچ سوچ کر بالکل تھک چکی تھی اور مایوسی کے اس آخری درجے پر پہنچ گئی تھی جہاں انسان اپنے کو یہ سمجھ کر تسلی دے لیتا ہے کہ ع

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

وہ دن رات محنت مزدوری میں مصروف رہتی اور رات کو اپنے لال کو چھاتی سے چمٹا کر سو جاتی — لیکن آہ یہ اس کے ہمدرد و غم گسار جو اس کے زخم کو مندمل نہ ہونے دیتے تھے اور یہ کہہ کہہ کر اُسے کریدتے رہتے تھے کہ آخر اس "بچارے بچے" کا کیا بنے گا؟ کیا ہوگا تمہارے بعد؟ ان کی یہ زبانی ہمدردیاں شبری کے زخم پہ نمک کا کام دیتیں لیکن وہ سوا ایک حزیں مسکراہٹ کے اور کوئی جواب نہ دے سکتی۔ لیکن اور زیادہ حوصلے سے بچے کے آرام کی خاطر کام میں جُت جاتی — ایک ان تھک عزم' ایک اٹل قوتِ ارادی کے تحت وہ مسلسل کام کئے جاتی تھی — کام — کام — کام

اب شبری کا جسم بالکل اکڑ چکا تھا — اس نے بڑی کوشش سے گردن موڑ کر پلنگ پر لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھا جو پچھلے آٹھ دن سے نمونیہ میں مبتلا موت اور زیست کی مسلسل کشمکش سے دوچار ہو رہا تھا۔ بچے کو جسمانی تکلیف کا تھوڑا سا احساس تھا۔ مگر ماں پر جسمانی' روحانی اور ذہنی کرب کا یہ ایک ایسا دور گزر گیا جس کا تجربہ خود اُس کی دُکھ بھری زندگی میں بھی پہلے نہ ہوا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے یہ آٹھ دن نہیں' آٹھ سال یا آٹھ صدیاں یونہی بیٹھے بیٹھے' سوچتے سوچتے بیت گئی ہوں — اس حالت میں اُسے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ اُسے اپنے بدصورت' اپاہج' دیوانہ بچے سے کس قدر محبت ہے' وہ اس کی جان ہے' جگر ہے — اس کی زندگی کا واحد سہارا ہے — وہ نہ ہوگا تو اس کے لئے یہ دنیا ایک ویران صحرا بن جائے گی . . . .

اور آج کی رات فیصلہ کن رات تھی کہ یا بچہ بچ گیا اور یا... اس "یا" کو شبری لاکھ ٹالنا چاہتی' بھلانا چاہتی مگر بار بار یہ "یا" اس کے دماغ میں برمے کی طرح سوراخ کرنے لگتا تھا —

اور پھر جانے کب شبری کو نیند آ گئی یا وہ بے ہوش ہو گئی — جب اُس کی آنکھ کھلی تو اسپتال کی کھڑکیوں سے دھوپ کی کرنیں خیراتی وارڈ کو روشن کر رہی تھیں اور جہاں تہاں مریض کھانس اور تھوک رہے تھے — اور بڑے ڈاکٹر صاحب جھکے ہوئے اُس کے بچے کی نبض دیکھ رہے تھے۔

شبری کا پورا جسم برف کی طرح سرد ہو چکا تھا' ہاتھ پاؤں کی انگلیاں نیلی پڑ گئی تھیں... لیکن بچے پر نظر پڑتے ہی ایک برقی لہر اُس کے رگ رگ میں دوڑ گئی اور وہ ایک دم پلنگ کی طرف جھپٹی — ڈاکٹر صاحب — ڈاک — ٹر — صاب میرا بچہ — میرا لال — میرا — میرا —" بچے کا پرسکون چہرہ اور میٹھی نیند دیکھ کر شبری کا دل اس بُری طرح سینے میں پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے اب منہ کے رستے نکل پڑے گا۔

بوڑھا ڈاکٹر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ آلہ اپنے گلے میں ڈالا اور شبری کے سر پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا مسکرایا۔ "بہن گھبراؤ نہیں — تمہارا بچہ بچ گیا —"

شبری کے ہاتھ اور نظریں ایک بار بے اختیار آسمان کی طرف اٹھیں اور پھر وہ پلنگ پر بچے کے اوپر گر پڑی اور اُسے اپنے کلیجے سے لپٹا لیا۔ دھیرے دھیرے اس کے منہ سے کچھ نکل رہا تھا — "میرا لال — میرا بچہ" ذرا دیر بعد یہ آواز آنی بھی بند ہو گئی — اور جب ڈاکٹر نے مامتا کی ماری دُکھیا ماں کو بچے سے الگ کرنا چاہا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ اب دُنیا کے سب جھنجھٹوں سے آزاد ہو چکی ہے —

شہاب ملیح آبادی

دوستی

ایک دن ہوگا شہاب اُس کا شیاطیں میں شمار
اوّل اوّل دوستی کا جس نے کھینچا تھا حصار

اُس کو جکڑے گا جہنّم آتشیں زنجیر میں
جس نے لفظِ "دوستی" جاری کیا تحریر میں

جُرم کے ہنگامہ و شورش میں مارِ آستیں
دوستی کے موجدِ اعلیٰ کا کارِ اوّلیں

دُشمنی میں فرد تھا، آدم کُشی میں طاق تھا
دوستی کا پیشوا، ہر جُرم میں مشّاق تھا

اور کرے گا پیروی اُس بد گُہر کی جو غریب
حشر میں پائے گا وہ مسکن شیاطیں کے قریب

دوستی کی رُو سے جب ہوگی کسی کی مَس، جبیں
آسماں مارے گا ٹھوکر، اس پہ تھوکے گی زمیں

جو کہے گا جذبۂ اخلاص ہے خلقِ عظیم
اُس کا مسکن ایک دن ہوگا فقط نارِ جحیم

غرقِ نکبت کر دیا جائے گا مردِ نابکار
جس کے لب پر ہوں گی آیاتِ خلوص و اعتبار

دوستوں کی سانس سے آتی ہے خود کامی کی بُو
دوستی اپنی ہی بشکستہ عبا پر ہے رفو

ڈھونڈتی ہے تلخیٔ غم ہائے دوراں کا علاج
دائرے میں دوستی کے انفرادی احتیاج

دوستی اک آرزو ہے غیر سے خدمات کی
دوستی سِیلی ہوئی آتش ہے حُبِّ ذات کی

جب بھڑکتے ہیں شرارے دل میں حُبِّ ذات کے
آگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں گُل جذبات کے

شعلۂ اخلاص میں ویسی لپک رہتی نہیں
گفتگو میں نرم سینے کی مہک رہتی نہیں

خود پرستی کا فقط چربہ ہے اور کچھ بھی نہیں
دوستی اغراض کا حربہ ہے اور کچھ بھی نہیں

ابر احسنی گنوری

غزل

چارہ گر تو سبز باغ اس کو دکھا سکتا نہیں
درد چالوں میں کبھی درماں کی آ سکتا نہیں

ہر ستم پر شکر کے سجدے لُٹا سکتا نہیں
اک غزل میں مختلف سازوں پہ گا سکتا نہیں

طُور پر تم آؤ غش اب مجھ کو آ سکتا نہیں
ایک ٹھوکر بار بار انسان کھا سکتا نہیں

اُن کے در سے اب مجھے کوئی اُٹھا سکتا نہیں
آ گیا ہوں مرکزِ اصلی پہ جا سکتا نہیں

جو سفینہ تُو نے چھوڑا نا خُدا منجدھار میں
کیا خدا بھی اُس کو ساحل پر لگا سکتا نہیں؟

وہ چمن میں آئے پھُولوں پر ہنسے اور چل دیے
غالباً اب کوئی غنچہ مُسکرا سکتا نہیں

عرش سے ضو ریزیاں تو ہو چکیں نزدیک آ
دُور کے جلوؤں میں لطفِ دید آ سکتا نہیں

دے دُعا دل کو خبر بھی ہے جو میرا دل نہ ہو
تیرا جلوہ دونوں عالم میں سما سکتا نہیں

سجدۂ رسمی، مرا سجدہ بھی کیا سمجھا گیا؟
دیکھ لوں جب تک نہ تم کو سر اُٹھا سکتا نہیں

پہلے تو ملنا ہی اُن کا ابرؔ ہے امرِ محال
مل بھی جائیں وہ تو پھر میں خود کو پا سکتا نہیں

شمیم کرہانی

غزل

یہ تقاضائے تبسّم، یہ تبسّم سے گُریز
کون سمجھائے کہ ہوتی ہے خلش اور بھی تیز

عہدِ نو جب کوئی آتا ہے تسلّی آمیز
اپنے قالب کو بدل دیتی ہے رُوحِ چنگیز

چاندنی رات ہے، پھُولوں سے ٹپکتی ہے شراب
دل کا ساغر ہے تری یاد کی مے سے لبریز

دلِ دریا میں نہ بیدار رہو احساسِ حیات
موجِ دریا سے جو چھِن جائے مذاقِ مہمیز

دل کو اک آس دلا کر نہ پلٹنے والے
زندگی، موت سے اب تک تو ہے سرگرمِ ستیز

کیا حقیقت ہے زمانے کے دُکھوں کی اے دوست
دل نے جب دردِ محبّت کو کیا ہے انگیز

دل کو آلام کے جھونکوں سے بچاتا کیوں ہے
شمع کی لَو تو انھیں تُند ہواؤں سے ہے تیز

چھُپ کے پینا کوئی پینا ہے مگر کیا کہیے
محتسب دشمنِ جاں ہے تو زمانہ خوں ریز

جوئے خوں کو ہکنوں نے جو بہائی بھی تو کیا
اور رنگین ہوا شیشۂ خوابِ پرویز

راہ کا خوف بھی منزل کی تمنّا بھی شمیمؔ!
گُل کا طالب ہے تو کیوں خار سے کرتا ہے گُریز

وساکھاپٹنم میں جل پشپا کا افتتاح

منصوبہ بندی، آب پاشی اور بجلی کے وزیر شری گلزاری لال نندہ سے ہندوستان شپ یارڈ لمیٹڈ کے پہلے بحری جہاز "جل پشپا" کا افتتاح کرنے کی درخواست کرتے ہوئے ادارہ کے منیجنگ ڈائرکٹر شری آر۔ ایل گپتا نے کہا کہ جہاز سازی ایک ایسا ہنر ہے جس میں اعلیٰ درجے کی سائنس کی واقفیت درکار ہے۔ چنانچہ اس صنعت کو جلد از جلد ترقی دینے اور اسے کم خرچ و لائق مقابلہ بنانے کے لئے دیگر جہاز ساز ملکوں کے طویل تجربہ سے فائدہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا جہاز سازی کے ایک مشہور اور پرانے فرانسیسی ادارے سے ایک معاہدہ کیا گیا ہے جس کے تحت مذکور ادارے کے اعلیٰ ہنرمند اور ماہر بھارتی ادارے کی توسیع و ترقی کے لئے کام کریں گے۔ یہ فرانسیسی وساکھاپٹنم اور اگر ضرورت ہوئی تو فرانس میں اپنے کارخانوں میں بھارتی افسروں کو جہاز سازی کے ہر شعبے کی تربیت دیں گے تاکہ یہ بھارتی افسر ہندوستان شپ یارڈ لمیٹڈ میں اعلیٰ سے اعلیٰ ذمہ داری کو سنبھال سکیں۔

صاحب موصوف نے کہا کہ اُن کے ادارے کا مقصد زیادہ مال تیار کرتے ہوئے اور قیمتوں میں کمی کرتے ہوئے حتی الوسع ایسے جہاز تیار کرنا ہے جو قیمتوں کے لحاظ سے لائقِ مقابلہ ہوں۔

شپ یارڈ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سندھیا سٹیم نیوی گیشن کی مالی دشواری کے باعث بھارت سرکار نے پچھلے سال کے آخر میں اس ادارے میں شرکت کی اور اب ہندوستان شپ یارڈ نامی پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی میں دو حصّے بھارت سرکار کا اور ایک حصہ سندھیا کا ہے۔

بھارت سرکار نے جل ادشا نامی پہلا بحری جہاز تیار کرنے والی سیندھیا سٹیم نیوی گیشن کمپنی کی امداد کے لئے اُسے آٹھ آٹھ ہزار ٹن کے چھ جہاز تیار کرنے کے لئے کہا۔ جل پشپا اس سلسلے کا آخری اور مذکورہ یارڈ کا دسواں جہاز ہے۔ ان تمام جہازوں کو لائیڈز کی طرف سے اعلیٰ ترین درجہ ملا ہے اور یہ سب بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔

ملک میں جہاز سازی کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے شری گپتا نے بتایا کہ زیادہ مال تیار کرنے اور قیمتوں میں کمی کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یارڈ کی توسیع و ترقی کے لئے کثیر سرمایہ لگایا جائے۔ گودیوں کے لئے مزید جگہ مہیا کی جائے۔ جہاز کے ڈھانچوں اور لکڑی کے کام کے لئے اور کارخانے مہیا کئے جائیں۔ بندرگاہ کی حفاظت کرنے والے پُل کی توسیع کی جائے۔ کرین کی صلاحیت کو جدید ترین بنایا جائے اور وساکھاپٹنم میں تعمیر و مرمت کے کارخانے کے لئے ایک وسیع خشک گودی تیار کی جائے۔

شری گپتا نے کہا پلاننگ کمیشن کے ابتدائی منصوبہ میں جہاز سازی کی صنعت کی ترقی کے لئے گیارہ کروڑ بچانوے لاکھ کی جو رقم رکھی گئی ہے، اس کے کافی ہونے کا امکان نہیں۔ انھوں نے شری گلزاری لال نندہ کو اپنے ادارے کی ضرورتوں کے اندازوں کے متعلق ایک گوشوارہ پیش کیا۔ اور کہا کہ اگر حالات سازگار رہے تو منصوبہ کی پانچ سال کی معیّنہ مدت سے قبل ہی ہندوستان شپ یارڈ لمیٹڈ میں ہر سال پینتالیس سے پچاس ہزار ٹن تک جہاز تیار ہوا کریں گے۔

انھوں نے مزید بتایا کہ ان کے یارڈ کے صنعتی قضیے کا تصفیہ ہو چکا ہے۔ اس باب میں ادارے کے ڈائرکٹروں نے اربابِ انتظام اور ملازمین میں بہتر تعلقات بڑھانے کے لئے ادارے کے عملے اور محنت کشوں کے مہنگائی بھتّہ کی ساڑھے سینتیس فیصد کٹوتی کو بحال کر دیا۔ یہ اقدام متعلّقہ عدالت کے فیصلے کی توقعات سے کہیں زیادہ تھا۔ انھوں نے یہ اُمیّد ظاہر کی کہ ملازمین آئندہ دل و جان سے کام کریں گے اور اپنے اور اربابِ انتظام کے موجودہ دوستانہ تعلقات کو برقرار رکھیں گے۔

RASHTRAPATI BHAVAN,
NEW DELHI

مکرمی پیر ضامن نظامی صاحب

تسلیم - مجھے افسوس ہے کہ میں اس متبرک موقع پر حاضر نہیں ہو سکا - حکمرانوں کی یاد
رکھنے کیلئے بڑے بڑے قلعوں اور عالیشان عمارتوں اور تخت و سلطانی کی شکل میں جو کہ
عام لوگوں کی محنت ہوا کرتی ہے تمام ملا کرتی ہیں - مگر یہ سب چیزیں ناپائدار ہیں
قلعے اور عمارت کی ناپائداری کا بہترین ثبوت دہلی کے ارد گرد کے مسمار شدہ عمارات
دے رہی ہیں - ایک انسان کا تعلق جن مادی اور جسمانی چیزوں کا ساتھ ہوتا ہے وہ سب بھی
ناپائدار ہوتی ہیں - ادیبا اور رشیوں سنتوں اور فقیروں کی یادگار بے شمار انسانوں کے دلوں
اور روحوں پر قائم ہوتی ہے اور اس ناپائدار دنیا میں وہی ایک پائدار چیز ہوتی ہے
حضرت اور خواجہ نظام الدین کی ہستی ایسے بزرگ خدا شناس کی ہے جن کو ہو چکا قریب
سات سو برس کے بعد بھی بے شمار عقیدتمندوں اور روحوں پر پڑ رہا ہے اور ہمیشہ پڑتا رہیگا
جبکہ اس زمانہ میں کتنی ہی سلطنتیں قائم ہوئیں اور برباد ہو گئیں اور کتنے ہی شہنشاہ جو
اس زمانہ میں یہاں حکمرانی کرتے تھے گذر گئے - میری یہی دلی خواہش اور دعا ہے کہ ان حضرت کی
پیروی کر کے ہم ہندوستان کے باشندگان اپنی روحانیت کی ترقی کر سکیں -

خادم
راجندر پرشاد
۱۵ دسمبر [illegible]

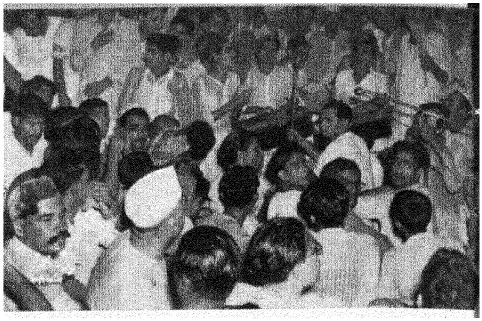

حضرة امیر خسرو کا عرس

اس سال بھی حسب دستور دھلی میں حضرة امیر خسرو کا
عرس منایا گیا جس کا انتظام حضرت پیر ضامن نظامی نے کیا
اس موقع پر مشاعرے اور قوالی کے پروگرام اپنی اپنی جگہ پر
بہت اھم تھے اوپر کی تصویر مشاعرہ کے موقع پر لی گئی -
نیچے کی تصویر قوالی کا ایک منظر پیش کر رھی ھے - سامنے
ا خط ریپبلک کے پردھان ڈاکٹر راجندر پرشاد کا ھے جو اس
موقع پر تشریف نہ لا سکے -

رضا لائبریری رام پور چند لمحے

رضا لائبریري رام پور بھارت کا ایک ادبي تہذیبي تاریخي سرمایہ ھے -
یہ چند تصویریں اسي لائبریري کے مختلف گوشے بے نقاب کرتي ھیں

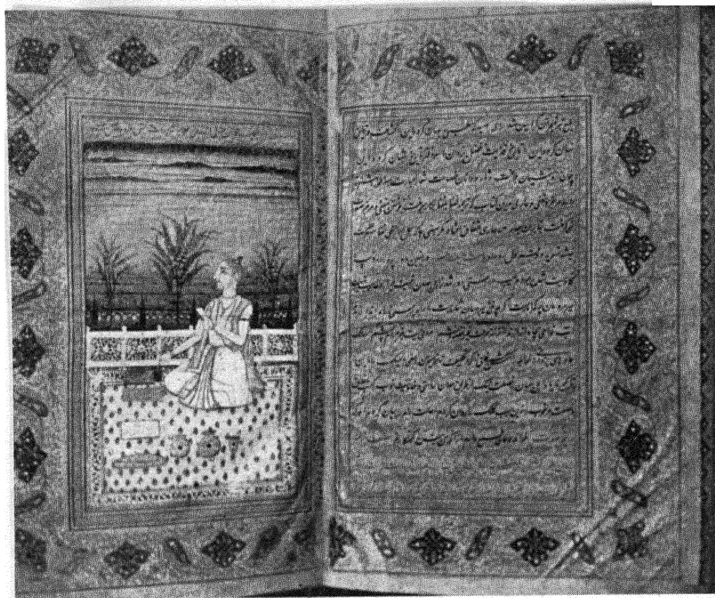

رامائن فارسي میں
یہ ترجمہ ۱۷۱۵ء میں ھوا. ساري کتاب سہ رنگي
تصاویر سے مزین ھے

جناب امتیاز علي عرشي
لائبریرئین رضا لائبریري رام پور

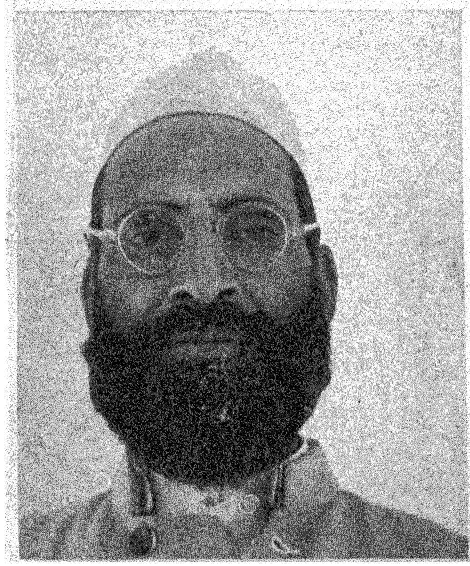

کلام پاک کا ایک نسخہ جو صفوي شہزادے
مراد نے اپني والدہ کے لئے لکھا

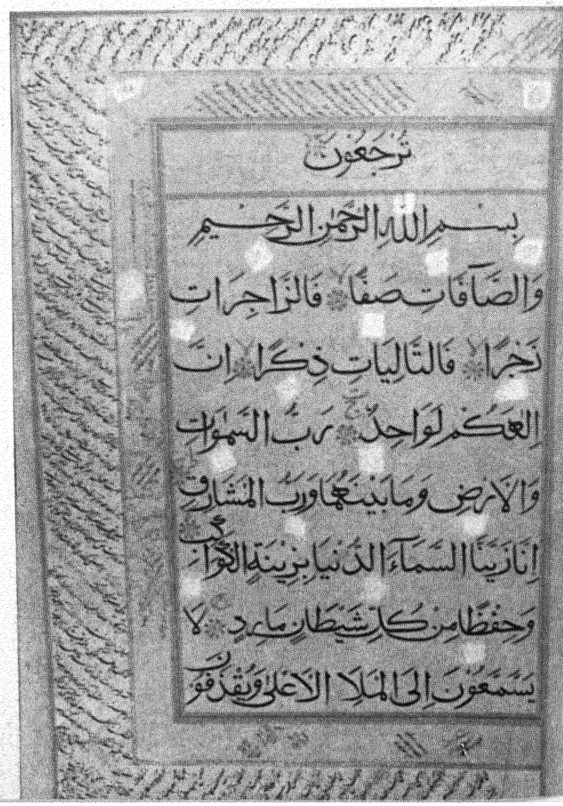

قرآن شریف کا ایک نسخہ جس پر شاھجہان کي مہر ثبت ھے

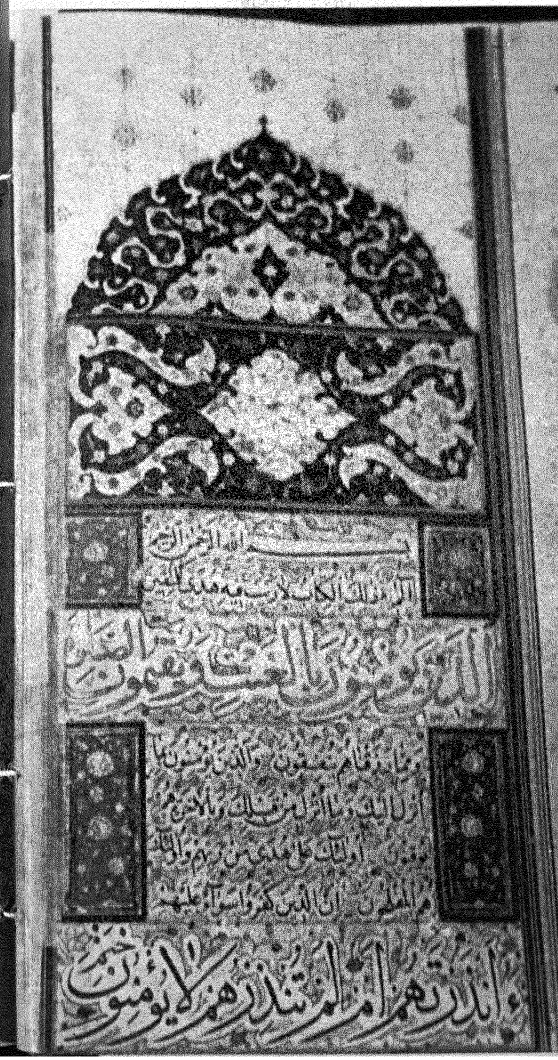

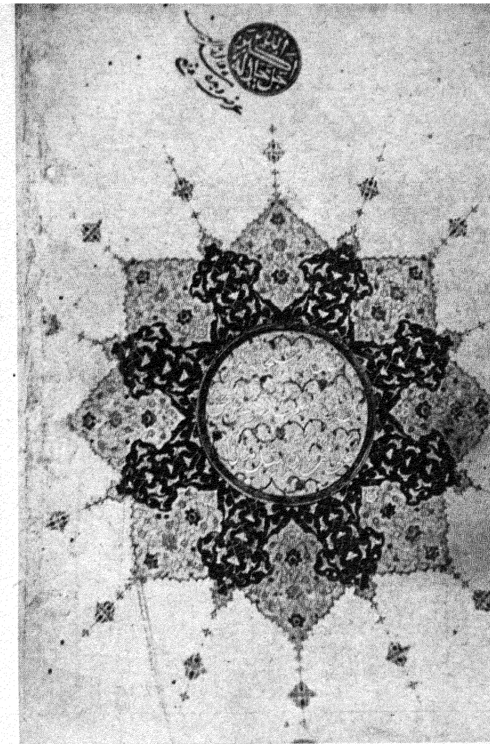

قرآن شریف کے ایک نسخے پر بادشاہ اکبر کي مہر -
اوپر فیضي کے قلم سے چند الفاظ لکھے ھیں

نفحات العرس کا ایک صفحہ - یہ تحریر
داراشکوہ کے قلم سے ھے

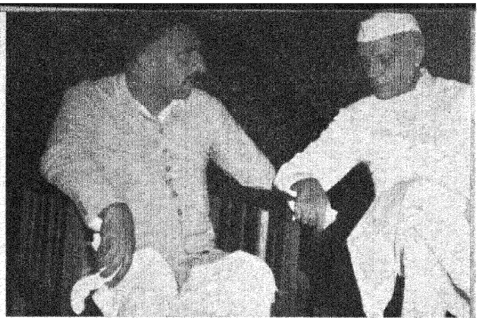

شری جواہر لال نہرو اور بخشی غلام محمد کشمیر کے
مسئلے پر بات چیت کر رہے ہیں۔

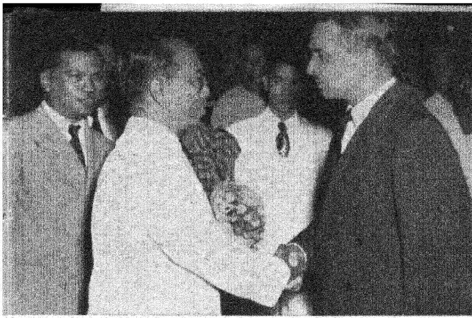

تھائی لینڈ کے نئے سفیر ہز ایکسیلینسی لانگ
وشت وداھان کا دہلی ریلوے اسٹیشن پر استقبال

پاکستان کا تجارتی ڈیلیگیشن بھارت میں۔ (بائیں طرف سے چھٹے) مسٹر کرامت اللہ لیڈر ڈیلیگیشن

بھارت اور پاکستان کے درمیان تجارتی گفتگو (دائیں طرف سے چوتھے نمبر پر) مسٹر کرامت اللہ اور (بائیں طرف سے دوسرے نمبر پر) شری بھوتھا لنگم تشریف فرما ہیں۔ یہ اجلاس ۲۳ جولائی کو نئی دہلی میں منعقد ہوا۔

خلیل الرحمن اعظمی

فن کے دائرے

نئی تنقید نے اصطلاحات کے جو بڑے بڑے جال بچھائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ حقیقت نگاری کو بھی ایک تحریک سمجھتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ تو اظہارِ بیان کے نامیاتی وسائل میں سے محض ایک وسیلہ ہے اور اس کی حیثیت محض ایک رجحان کی ہے تو شاید آپ میری بات ماننے کے لئے طیّار نہ ہوں کیونکہ آپ نے تنقید کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپ کے اندر جب سائنس نے یکایک چھاپا مارا تو لوگ چونک کر ایک خاص راستے پر چل پڑے اور حقیقت نگاری جو اب تک فلسفہ کی اصطلاح تھی اسے ادب میں ایک اصول کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کا جھگڑا بھی اسی وقت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اصول کے بعض پرستاروں نے اسے اس طرح پیش کیا گویا ان کو کوئی ایسا چھپا ہوا خزانہ ہاتھ آگیا ہو جہاں اگلے وقتوں کے لوگ پہنچنے سے قاصر تھے۔ اصل میں یہ سب باتیں اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے ہیں۔ آخر بحث کا دروازہ کھولنے کے لئے کسی کنجی کی تلاش میں ہمیشہ سے ہمارے نقّاد رہے ہیں۔ یہ لوگ ادب میں اس طرح لکیر کھینچتے ہیں جیسے ۱۸۵۰ء ایک دیوار ہے جس کے ایک طرف جھوٹ، مکر، فریب اور خوابوں کے جال ہیں اور دوسری طرف سچائی ایمانداری اور روشنی کا منارہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شیکسپیر یا ولی دکنی اور ملا وجہی سے یہ کہتا کہ جناب آپ جو ادب پیدا کر رہے ہیں وہ ادب برائے ادب ہے تو شاید ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کیونکہ انہوں نے جن جذبات و محرکات سے مجبور ہو کر اور جس آگ میں تپ کر ادب کی تخلیق کی تھی اس کا تعلق یقیناً زندگی ہی سے تھا میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ہمارے صوفیوں نے اس زمین کو چھوڑ کر اگر آسمان کی طرف پرواز کرنی چاہی تو ان کی یہ ادا بھی زندگی ہی کے ایک پہلو کی عکاسی کرتی ہے، جہاں تک زندگی انسان کی گرفت میں اس وقت آسکتی تھی ہمارے فنکاروں نے اس کی تصویریں ادب میں پیش کیں۔ انہیں بے ایمان سمجھنا خود اپنی کج روی کا ثبوت دینا ہے۔ زندگی اور ادب کا ناتہ کسی زمانے میں بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ البتہ ہر زمانے کی زندگی اپنا رنگ بدلتی رہی ہے اور جوں جوں یہ رنگ بدلا ادب نے بھی کروٹ لی۔ جس طرح فلسفی یہ سمجھتا ہے کہ مادہ وہی ہے صورت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اسی طرح ہر زمانے کا ادب بھی اپنے لئے اظہار و تشکیل بیان کے طریقے ساتھ لاتا ہے۔ یہ فارم ہیئت، نقطۂ نظر موضوعات کی نوعیت سب حالات زمانہ اور ضرورت کی پیداوار ہیں اور جوں جوں زمانے میں الٹ پلٹ ہوگی یہ دائرے بھی گردش کریں گے۔ ان دائروں کو ایک جگہ پر روک دینے والے بھی نادان ہیں اور وہ لوگ بھی جو یہ سمجھتے ہیں کہ پرانا ادب سراسر "ادب برائے ادب" تھا اور آج کے لکھنے والے "ادب برائے زندگی" کے علمبردار ہیں۔ پہلے لوگ حقیقت کو جھٹلاتے تھے آج سے حقیقت کو اپناتے ہیں۔ ہر زمانے میں بجز تیسرے درجے کے ادیبوں کے سب نے کم و بیش زندگی ہی کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اگر خواب بھی دیکھے ہیں تو اسی کو بدلنے اور سنوارنے کی خاطر اور اگر آبگینۂ تندیٔ صہبا سے پگھل گیا ہے تو وہ بھی حقیقت ہی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے۔ ہیئت کا مطلب یہ ہے کہ مواد سے اس طرح ہم آہنگ ہو جائے کہ روح اور جسم میں کوئی جھگڑا باقی نہ رہے۔ کلیم الدین نے ٹھیک کہا ہے کہ ان دونوں کو لباس اور جسم سے تشبیہ دینے والے غلطی کرتے ہیں۔ اچھا ادب ہمیشہ جسم اور روح کے امتزاج ہی سے پیدا ہوتا ہے اس لئے ۱۸۵۰ء کے بعد ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں زندگی کو پیش کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا اس کا چاہے آپ جو نام رکھ لیجئے حقیقت نگاری کہئے، سائنٹفک نقطۂ نظر کہئے لیکن یہ سب محض اظہار و تشکیل

بیان کے جلوے ہیں، اپنی روح کو بے نقاب کرنے کے لئے آرٹسٹ کا یہ پردہ ہے اور اسے آپ فلسفہ یا اصول کہہ کر کیوں بدنام کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس کی پیدائش کا سبب زمانے کی گردشوں میں تلاش کیجئے۔ یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ ماضی کے اندر بھی کوئی ایسی چیز ہے یا نہیں جو آج ہمارے اندر موجود ہو اور اس بات کا بھی تجزیہ کرنے کی کوشش کیجئے کہ کل ہم بیکار تو نہیں ہو جائیں گے۔ آج جو ہم شعر و ادب، ناول و افسانہ تصویر و بُت تراشی کے نمونے پیش کر رہے ہیں انہیں آنے والا انسان ماضی کی چیز سمجھ کر کسی گہرے غار میں دفن کر دے گا؟ میں تو جب اپنے ادب پر نظر ڈالتا ہوں تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ الف لیلیٰ اور طلسم ہوش رُبا کے زمانے سے لے کر پریم چند کے گئودان، عصمت چغتائی کے لحاف، منٹو کی بو یا حسن عسکری کی حرام جادی یا قدرت اللہ شہاب کے "یا خدا" تک خواب اور حقیقت کے مختلف دائرے ہیں لیکن یہ سب رفتارِ انقلاب کے مظہر ہیں ان کے درمیان تضاد کی دیواریں نہیں ہیں فراق کا شعر تو آپ نے سنا ہی ہوگا

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

اس "آہستہ اور تیز" میں اختلاف ہونے کے باوجود جو مناسبت ہے اسے سمجھنا ہی دراصل ادب کی تخلیق کے راز کو سمجھنا ہے

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ میں حقیقت نگاری کا دور انیسویں صدی کا نصف آخر ہے اور ہمارے یہاں بہت بعد میں اس کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ میں اس کا ہمنوا نہیں ہوں۔ ہمارے یہاں بھی ۱۸۵۷ء کی سعیِ انقلاب کے بعد جب حقیقت اور خواب کی فکر میں خواب کا آبگینہ چکنا چور ہو گیا تو یہاں بھی بعض لوگوں نے نئی چیزوں کو کرید کرید کر دیکھنا شروع کیا اور دوسروں کو بھی دکھانے لگے کہ "ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا"۔ غالب نے اپنے خطوط میں نئے زمانے کی حقیقتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ سرسید نے سائینٹفک سوسائٹی قائم کی، حالی اور آزاد نے "شعر و قصائد کے ناپاک دفتر" پر یلغار کر دی اور اسے مسمار کر کے نئی شاعری کی بنیاد رکھی، نئے اسالیبِ نظم کی تلاش شروع کی اور اسے خود برت کر زمین ہموار کی۔ یہاں سے تو ہم ایک لکیر کھینچ سکتے ہیں لیکن یہ لکیر بھی محض اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے ہے ورنہ اس حقیقت نگاری کی نئی رو کے خلاف بھی ایک دھارا بہہ رہا تھا۔ سرسید، محسن الملک اور حالی "عقلیت" اور سائنٹفک رجحان کی نمائندگی کر رہے تھے لیکن بعض ایسے لوگ بھی تھے جو ابھی تک "رگِ گل" سے بلبل کے پر باندھ کر ہی اس دنیا میں مگن ہو جاتے تھے۔ آخر حالی ہی کے ہمعصر داغ اور امیر مینائی بھی تو ہیں۔ داغ اور امیر مینائی کے ہزاروں شاگرد بھی ہیں جو سنہ ۲۰ء اور سنہ ۳۰ء تک اس شاعری کے مزار پر چراغ جلاتے رہے اب بھی کچھ ٹمٹماتی ہوئی شمعیں باقی ہیں۔ حالی سنہ ۱۹۱۴ء میں اپنا نیا پیغام سُنا کر رخصت ہو جاتے ہیں اور نوح ناروی سنہ ۱۹۵۲ء میں بھی اپنا پرانا پیغام سنانے کے لئے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ سرسید اور محسن الملک کے زمانے میں شبلی اور شرر نے تاریخ کے اوراق الٹنے شروع کئے اور پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھنا اور لوگوں کو دکھانا شروع کیا۔ خود محمد حسین آزاد کا عجیب معاملہ ہے ایک طرف وہ نئی شاعری کی تحریک کے بانیوں میں سے ہیں لیکن نثر میں ان کا قلم زمین پر پاؤں رکھنے کا نام نہیں لیتا۔ اودھ پنچ گروپ والوں نے کارٹون بنانے شروع کئے وہ بھی حقیقت کی تلاش کا ایک روپ تھا لیکن ابھی بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ آگے چل کر ایک طرف پریم چند کا ادب جنم لیتا ہے۔ دوسری طرف ابوالکلام آزاد، مہدی افادی عبدالماجد دریابادی، سجاد انصاری، نیاز فتحپوری اور سجاد حیدر کے خامۂ رنگین نگاری کی جنبش بھی ادب میں نئے نئے گل کھلاتی ہے۔ اقبال کے زمانے میں ہی جوش کی شبابیات اور اختر شیرانی کی "سلمائی نظمیں" جنم لیتی ہیں۔ کبھی ہمارا ادب تصوریت کے تانے بانے بنتا ہے کبھی حسن و جمال کے سر اولیت کا سہرا باندھ کر بقیہ چیزوں کو ثانوی حیثیت دے دیتا ہے۔ کبھی ضد میں آ کر پرانی اخلاقی قدروں پر بے تحاشا اپنا تیر چلاتا ہے اور کبھی عنفوانِ شباب کے ہیجان، ٹیگوریت اور یونانی علم الاصنام کی مرکب دنیا میں "تجلیات کاوش" اور "ہستی سالم" کے خواب دیکھتا ہے یہ خواب کبھی کبھی دلفریب ہوتا ہے اور کبھی کبھی کابوس اور ہذیان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

لیکن اس زمانے تک یہ سب کوششیں انفرادی یا غیر شعوری تھیں۔ بعض لوگ سنگین حقیقتوں کے اندر اپنا پنجہ گاڑ چکے تھے بعض

اسے دور سے دیکھ کر ڈرتے تھے کہ کہیں یہ پردہ ہٹا تو زندگی اور بھی تلخ کامیوں میں نہ ڈوب جائے ۔ ۳۵ء کے قریب آخر اس تھی اور گھٹی ہوئی فضا کا ایک فوری اور جذباتی ردِعمل ہوتا ہے اور "انگارے" کی اشاعت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدتوں کا کوئی بند ٹوٹ گیا ہو ۔ انگارے کے مصنفین سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی، محمود الظفر سب نوجوان تھے ۔ ایک طرف تو یورپ کی حقیقت نگاری اور نئے ادب کی تحریک کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں دوسری طرف اپنے ملک کی روایات کی ناقابلِ تغیر اور مضبوط گرفت نے ان کے جوشِ جنوں کو اس طرح واعظانہ طریقے پر دبانے کی کوشش کی کہ اس کشاکش میں وہ آتش فشاں پھوٹ پڑا جو مہدی سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار وغیرہ کے دلوں میں پرورش پا رہا تھا ۔ یہاں ایک دلچسپ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک ہمارے ادب میں اگر سرسید، حالی، اقبال اور پریم چند حقیقت نگاری کے علمبردار تھے تو دوسری طرف جمالیاتی اسکول اور ادبِ لطیف کے گروہ والوں میں بھی یہی چیز ایک اور ڈھنگ سے پنپ رہی تھی ۔ جتنا ہی انہوں نے خوابوں کی طرف ہاتھ بڑھایا غیر شعوری طور پر بغاوت کے دیوتا سے قریب ہوتے گئے اور یہی وجہ تھی کہ جب ترقی پسند ادب کا آغاز ہوا تو اس میں توازن قائم نہ رہ سکا ۔ "انگارے" کے مصنفین میں کلبیت، جھلاہٹ مسخرگی اور وہ تمام رجحانات موجود ہیں جو تخریب کے دیوتا نے انہیں دئے تھے ۔ اور حقیقت نگاری کو اصولی حیثیت سے اگر کوئی نقاد ان کی طرف منسوب کر دیتا ہے تو یہ ترقی پسندی منفی قسم کی ترقی پسندی ہو گی لیکن اگر اس عمل میں زمانے کے دل کی تیز دھڑکن کارفرما تھی تو اسے ایک فطری شے سمجھ کر اسے بھی تاریخ کے چوکھٹے میں مناسب مقام پر رکھئے ۔ جیسے کبھی کبھی انسان کے اعضا اپنی اصلی حالت سے ہٹ کر غلط روش اختیار کر لیتے ہیں اور کسی خاص مادی سبب کی بنا پر اختلاج، جنوں یا سرسام کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو انسان ہاتھ پاؤں ٹپکتا ہے اور نہ جانے کن حرکات کا اظہار کرتا ہے لیکن اگر اس مریض کا معقول علاج کیا جائے تو وہ پھر نارمل حالت میں آ سکتا ہے ۔ ہمارے یہاں بھی ابتدا میں حقیقت نگاری کا یہ رجحان بجائے کسی منظم اصول پر مبنی ہونے کے اسی ہیجان و اختلاج اور بے راہ روی کا شکار تھا ۔ اسی لئے تو اسے رجحان کہا جاتا ہے اور رجحان کی یہ کیفیت ہے کہ اگر ایک طرف ہمارے یہاں راشد، میراجی، یوسف ظفر اور دوسرے شاعروں کو جو جنس اور تعصب دوسرے مسائل میں بے باکی چاہتے تھے ترقی پسند قرار دیا گیا تو خود ترقی پسند ادیبوں میں بھی ایک ہی شخص کے اندر مختلف رجحانات پرورش پاتے رہے ہیں اور خود زمانے کی ضروریات اور تقاضوں نے اسے ختم کیا اور نہ صرف اس کے شعور کو جلا بخشی بلکہ ادب کی راہ بھی صاف کی ۔ سردار جعفری ۱۹۳۶ء میں آزاد نظم کو اردو شاعری پر ایک بدنما داغ سمجھتے تھے لیکن ۱۹۴۵ء میں "نئی دنیا کو سلام" کی اشاعت کے بعد ہم نے دیکھا کہ وہ آزاد نظم کے بڑے علم برداروں میں ہو گئے ۔ ایک زمانے میں رسالہ "نیا ادب" میں غزل شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی یہاں تک کہ نئی تحریک میں بھی جذبی اور بعض دوسرے غزل گو موجود تھے ان کی غزلیں "نظم" کے عنوان سے "نیا ادب" میں چھپتی تھیں ۔ آج یہ حال ہے کہ سردار جعفری بھی غزل کہنے لگے ہیں اور نئی شاعری میں غزل نے پھر اپنا مقام حاصل کر لیا ہے ۔ ادب کے رجحانات وقت کی رَو کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، ایک صورت مٹتی ہے اور اس کی راکھ سے دوسری صورت جنم لیتی ہے اسی کو ادب کی جدلیات کہئے یا کچھ اور ۔

۱۹۳۵ء کے بعد اردو نثر میں جو کچھ تخلیق کیا گیا ہے اس میں افسانے اور ناول کا پلہ بھاری ہے ۔ افسانہ اور ناول یوں بھی ادب کی ایسی اصناف ہیں ۔ جہاں خواب اور حقیقت کے بہترین امتزاج سے ہی کامیاب فن پارے کی تخلیق ہو سکتی ہے ۔ "الف لیلیٰ" "طلسم ہوشربا" اور قصہ حاتم طائی میں اگر خواب کا پلہ بھاری تھا یا بعض اوقات خوابوں کے ہجوم میں حقیقت کا چہرہ غائب ہو جاتا تھا تو موجودہ افسانے اور ناول میں حقیقت کو کچھ اس طرح عریاں کر دیا گیا ہے کہ ہمارا فنکار نارمل زندگی سے ہٹ کر گلے سڑے مواد کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے ۔ وہ حقیقت نگاری جو صرف خارجی حقیقت ہی پر مبنی ہو یقیناً ایک بے ڈھنگی چیز ہے ۔ یہ حقیقت نگاری آگے چل کر حقیقت نگاری بھی نہیں رہ جاتی ۔ اس کے اندر خود بخود تضاد کے عناصر ابھرنے لگتے ہیں ۔ انسانی زندگی داخلی اور خارجی دونوں حقیقتوں پر مبنی ہے ۔ اس کی معاشی اور غیر معاشی، جدلیاتی اور جسمانی، روحانی اور نفسیاتی محسوس اور غیر محسوس مختلف حدیں اور مختلف دائرے ہیں ان سب کو

اپنا کر ہی اصل حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے اور اگر اس مقصد میں کامیاب ہونا ہے تو حقیقت کے اظہار میں رمزیت اور ایمائیت کے حربے کو کبھی نہ بھولیئے ۔ اس طرح بیرونی حقیقت کے ساتھ اندرونی حقیقت بھی بے نقاب ہوگی ۔

آپ کو یہ اختیار ہے کہ بُرے سے بُرے فعل کی عکاسی کے لئے اپنے موقلم کو جنبش دیں لیکن اگر آپ اچھے فنکار اور اچھے پرکھیا ہیں تو آپ کا دامن ان نجاستوں میں الجھ کر نہیں رہ جائے گا بلکہ آپ اس سے باہر بھی نکل آئیں گے اور اسے سماج سے دور کرنے کی تدبیر بھی سوچ سکیں گے آپ اس کا نقشہ اس طرح کھینچیں کہ بُرے فعل کی ترغیب نہ ہو بلکہ اس سے نفرت ہو۔ خالی خولی حقیقت نگاری تو لوگوں کو اور کیچڑ کی طرف دھکیل دے گی اور جس طرح لوگ کوک شاستر یا عریاں تصویریں دیکھ کر اپنے اعصاب کے لئے بیماریوں کو دعوت دیتے ہیں وہی حال آپ کا اور آپ کے ادب کا بھی ہوگا ۔ عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو ممتاز مفتی اور حسن عسکری اور بعض دوسرے ادیبوں کی ادبی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی یہ لوگ حقیقت نگاری کے اسی منفی رخ کی طرف زیادہ جھکے ہوئے ہیں ۔ کرشن چندر، بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، اپندر ناتھ اشک اور دوسرے افسانہ نگاروں نے جنس سے ہٹ کر دوسرے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے ۔ ان کے یہاں بھی افراط و تفریط ہے لیکن حقیقت کی تلاش میں اگر انہیں بعض اوقات ٹھوکر لگی ہے تو اکثر بیش بہا موتی بھی نکال لائے ہیں ۔ مجموعی حیثیت سے ہمارا ادب ابھی تک مختلف تجربوں سے گزر رہا ہے، بہت سی نئی چیزوں کو چھو کر دیکھنے اور اس کا تھوڑا بہت مزہ چکھ لینے کی عادت نئے ادیبوں میں عام ہے ۔ ابھی تک تو یہ حال ہے کہ اگر آزاد نظم کا رواج ہوا تو پنجاب کے سارے شاعروں نے صرف آزاد نظم ہی کو شاعری سمجھا باقی سب سانچوں کو توڑ کر رکھ دیا ۔ جب آزاد نظم کی مٹی ان کے ہاتھوں برباد ہوئی اور دیکھا کہ یہاں انہیں کوئی خاص کامیابی نہیں حاصل ہو رہی ہے تو غزل کی طرف بے تحاشا ٹوٹ پڑے اور اب یہ حال ہے کہ میں ڈرنے لگا ہوں کہ یہ لوگ کہیں غزل کا منہ بھی کالا کر کے نہ چھوڑیں ہیئت کی طرف اس طرح بے سوچے سمجھے دوڑنا بڑی غیر ادبی حرکت ہے ۔ اس سے سطحیت، کم علمی اور ادب و فن کی طرف سے عدم خلوص کا پتہ چلتا ہے ۴۷ء کے فسادات میں بھی ہمارے ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے حقیقت کی تلاش میں بہت ہاتھ پیر مارا ہے ۔ بعض اس میں کامیاب ہوئے ہیں بعضوں نے واعظ اور ناصح کی جگہ سنبھال لی ہے ۔ بعض اجنتا اور ایلورا کا نام لے کر چیخنے لگے ہیں، بعض یہ کہنے لگے کہ انسان ختم ہوگیا، انسان مرگیا اور انسان وحشی ہوگیا اور بعضوں نے سیاہ حاشیوں کی سیر ہی میں اپنا نفسیاتی علاج ڈھونڈھ لیا ۔ ابھی بہت دنوں میں جا کر ہمارے یہاں ادب و فن کے اندر توازن قائم ہوگا ۔ جب حقیقت اور خواب، وضاحت اور رمزیت سب ایک جسم و جان ہو کر فنکار کے شعور کو جلا دیں گے اور اس کی نظر کو وہ وسعت بخشیں گے جو کیچڑ میں رہتے ہوئے بھی فنکار کا ہاتھ ستاروں تک پہنچا دیتی ہے اور صحیح معنوں میں اسی ادب کو بقائے دوام کی سند ملتی ہے

آج کل

(اردو ماہ نامہ)

ذیل کے پتے پر چھ روپیہ سالانہ چندہ بھیج کر آپ سال بھر کے لئے ہندوستان و پاکستان کے بہترین ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے نتائج افکار سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں ۔

ڈسٹری بیوشن آفیسر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

گلاب داس بروکر

بلینک چیک

قبل اس کے کہ ایک گھنٹہ پہلے والے واقعہ کی وجہ سے اس غیر معمولی شہرت سے پیدا ہونے والی مسترت اور حیرانی میں کوئی کمی واقع ہو، اس دن کی ڈاک میں آئے ہوئے ایک رجسٹرڈ خط نے نریندر بھٹ کی اس مسترت اور حیرانی میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

ڈاک کا تو ایک انبار کا انبار لگ گیا تھا۔ اس میں سے بیشتر خطوں میں اس کی تعریفوں کے پُل باندھے گئے ہوں گے۔ اس خیال سے اُسے خط پڑھنے کی کوئی بے چینی نہ تھی۔ پھر ایکا ایک اس کی نظر اس رجسٹرڈ لفافے پر پڑی اور وہ کتنی ہی دیر تک لفافے کے خوبصورت کاغذ کو اس پر مندرج آن جانی لیکن پُراثر تحریر کو، خط ارسال کرنے والے کی خوش ذوقی کی دلیل لفافے پر چھپی ہنس کی تصویر کو اور اس کے نیچے چھپے ہوئے خط بھیجنے والے کے اس مشہور نام کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔

کافی دیر کے بعد اس نے لفافہ کھولا۔

لفافہ کھول کر خط دیکھا تو وہ ایک دم ششدر رہ گیا۔ لفافے ہی کی طرح کے خوبصورت کاغذ پر اسی تحریر میں لکھا ہوا یہ مختصر سا مضمون کسی کو بھی چونکا سکتا تھا۔ لکھا تھا:۔

آپ کا خوبصورت اور عظیم جذبات سے بھرپور ناول پڑھنے سے مجھے اور مجھ ایسے کئی لوگوں کو جو مسرّت حاصل ہوئی ہے اُس کا بیان ناممکن ہے۔ اس کا مناسب حق تو عوام کی تہذیب کی تاریخ ہی ادا کر سکتی ہے۔ پھر میں اس کی قیمت ڈالنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔ لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت سے آپ نے ہمیں جو بیش بہا تحفہ دیا ہے، اگر اس کا کچھ بھی بدلہ نہ دیا گیا تو، ہم احسان فراموش کہلائیں گے۔

اس خط کے ساتھ منسلک دستخط شدہ چیک کو بغیر کسی جھجک یا رکاوٹ کے اپنی خواہش کے مطابق استعمال میں لا کر ممنون فرمائیے۔ آپ کا۔ رائے چند ایشور داس

نریندر پھٹی پھٹی نظروں سے خط کی طرف اور اُس کے ساتھ آئے ہوئے امپیریل بینک کے دستخط شدہ کورے چیک کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ بمبئی کے اس چھوٹے سے پرزے میں سے گجرات کے کروڑ پتی سوداگر رائے چند ایشور داس کا منحنی لیکن بارعب سخت لیکن پُرکشش چہرہ جھانک رہا تھا۔ اور بڑی لاپرواہی سے کئے گئے دستخطوں کے درمیان سے کروڑوں کی ملکیت سرکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

کافی دیر تک وہ کاغذ کے ان دونوں پرزوں کو ہاتھ میں لئے بیوقوفوں کی طرح بیٹھا رہا۔ وہ بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا اور اُسے کچھ بھی سمجھ نہ آ رہی تھی کہ یکایک یہ سب کیا ہو گیا ہے؟

پھر آہستہ آہستہ اس کے خیالات میں تسلسل قائم ہونے لگا، اور اس نے اپنے آپ سے کہا، ابھی ایک گھنٹہ پہلے میرے فن کا کوئی قدر دان نہ تھا ـــــ" اور پھر وہ چیک بھیجنے والے کی قدر شناسی اور فراخ دلی کے متعلق سوچنے لگا ـــــ میں چند لوگوں کی بھول کی وجہ سے ساری دنیا کو سزا دینے کے متعلق سوچ رہا تھا اور یہ دنیا تو آدمی کے دل کا راز جاننے والے کی طرح ہمیشہ میری عزت کرتی ہے۔ لیکن اس وقت مجھے اس کی وجہ نظر نہ آئی تھی ـــــ اُس نے اپنے دل سے پوچھا اور گھنٹہ بھر پہلے کے واقعے کو اس کے دل نے اُس کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔

جس اسکول میں وہ پڑھتا تھا، اُس کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی دعوت پر وہ ان کے ہاں گیا تھا۔ اس ناول کو حاصل ہونے والی شہرت اور تعریف میں ہیڈ ماسٹر صاحب بھی اپنا سُر ملانا چاہتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت نہ ہونے پر بھی نریندر یہی سوچ رہا تھا، اور اس بات سے وہ ایک عجیب قسم کا خمار سا محسوس کر رہا تھا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ نریندر کے پہنچنے پر وہ

اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور بہت پُر جوش خیر مقدم کیا۔ اپنے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ لے کر اپنے پاس صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولے —— "آج آپ کو اسکول کے ایک ساتھی کی حیثیت سے نہیں، ایک مشہور ادیب کی حیثیت سے میں نے بُلایا ہے۔ ایسی انمول تخلیق پر میری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے"۔

نرنیدر کا دل۔ دماغ۔ چہرہ ہنس اٹھا۔ بولا "اس میں کیا ہے! میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا" وغیرہ عام سی باتیں اُس نے بڑے مبہم طور پر کہیں۔ کئی تعریفی تنقیدیں دیکھنے کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے نرنیدر کے ناول کو پورا پڑھ ڈالا تھا۔ اسکول کی ایسی سخت نوکری اور اس پر ٹیوشن کرتے ہوئے بھی نرنیدر کی تخلیقی قوت جتنا کام دے رہی تھی، اس پر انھیں تعجب ہو رہا تھا۔ ایسا عظیم اور عالم فن کار اُن کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اِس پر وہ جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ اِنھیں از حد مسرت محسوس ہوئی ہے وغیرہ۔ کئی باتیں وہ چائے ناشتہ کے وقت نرنیدر سے کہتے رہے۔

ہنستے چہرے اور اُچھلتے ہوئے دل سے نرنیدر یہ سب کچھ سنتا رہا۔ اور اُس کی آنکھوں میں خود اعتمادی کی چمک پیدا ہو گئی۔

باتوں ہی باتوں میں ہیڈ ماسٹر صاحب کہہ گئے "اسکول کے چیرمین صاحب سے بھی میں نے آپ کی شہرت کا ذکر کیا تھا"۔

"اچھا، تو انھوں نے کیا کہا"؟ نرنیدر جیسے مجسّم اشتیاق بن گیا۔

"اپنی طرف سے انھوں نے آپ کو مبارکباد دینے کو کہا...... اور ......" بات روک کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے دروازے میں کھڑے ملازم سے کہا —— "ارے، ذرا پانی تو لانا"۔

نرنیدر سمجھ گیا کہ ماسٹر صاحب کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔ لیکن رُک گئے ہیں۔ آج کا دن اُس کی زندگی کا سب سے حسین دن ہے —— اُسے اس مہنگائی کے زمانے میں ترقی اور زیادہ پیسوں کی کتنی ضرورت ہے اور شاید ترقی مل رہی ہے غالباً اس لئے آج ہیڈ ماسٹر صاحب بڑے نمک مرچ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اسی لئے اُنھوں نے اس عزّت کے ساتھ اُسے اپنے گھر بلایا ہے —— کیا اُسے وائس پرنسپل بنایا جائےگا؟ مسرّت بھری نظروں سے اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا، "آپ کچھ کہنے جا رہے تھے!"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "نہیں نہیں، کچھ بھی تو نہیں"۔ پھر ذرا رُک کر بولے "کوئی بات نہیں۔ بڑے آدمیوں کی باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں"۔

نرنیدر کی بے چینی بڑھی۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا "آپ نے کس وجہ سے یہ کہا ہے"؟

"نہیں جی، کچھ بھی نہیں۔ یونہی" ماسٹر صاحب نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد آواز میں ذرا سختی لا کر بولے "خیر، آپ کو بتا ہی دیتا ہوں۔ ان پیسوں والے لوگوں کا سلوک ہی عجیب ہوتا ہے۔ میں نے تمہاری شہرت کی بات کی تو وہ خوش ہو گئے۔ اپنی طرف سے مبارک باد دینے کو کہا۔ پھر بولے، ہیڈ ماسٹر صاحب، جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ میں نے کہا، جی، بولے، تم اس بجٹ کو دو تین اور ہیڈ نہیں دے سکتے؟ ایسے قابل اور عالم فاضل شخص کا پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ مجھے بہت برا محسوس ہوا لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خیال آیا کہ آخر سوداگر بنیا ہی تو ہے۔

نرنیدر خاموش رہا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ یہ ہے انعام! اور وہ کیا کیا سوچ بیٹھا تھا: عالم، ہوا ہی کیوں؟ یہی تو گناہ ہے؟ ہفتے میں دو چار گھنٹے آرام کرنا عالم کے لئے قطعی غیر ضروری ہے —— اتنے دنوں کی تعریفوں اور چاروں طرف پھیلنے والی شہرت سے پیدا شدہ مسرّت نرنیدر کے دل سے شبنم کے قطرے کی طرح جھڑ گئی۔

"اچھا اب اجازت دیجئے"۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اسکول کا وقت ہو گیا ہے نا؟" ہیڈ ماسٹر صاحب بھی کھڑے ہو گئے۔ نرنیدر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ سیڑھیوں تک اس کے ساتھ گئے اور جیسے اُسے ڈھارس بندھانا چاہتے ہوں۔ کہنے لگے: "آپ بُرا نہ مانئے گا۔ آپ تو انسان کے دل کو ہم سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں —— یہ سیٹھوں کی ایک دُھن ہی تو ہے"۔

نرنیدر جو سب میں ایک پھیکی سی ہنسی ہنس کر سیڑھیاں اُتر گیا۔ غم و غصے کی حالت میں وہ گھر پہنچا۔ دل اسی طرح جوش کھاتا رہا۔ صبح سے شام تک کام۔ کام اور پھر کام، ٹیوشن اور اس کے بعد اسکول اور پھر ٹیوشن۔ تخلیقی کام اور مطالعے کے لئے تو چوری چھپے وقت نکالنا پڑتا ہے کتنی رات تک رتجگا کرنا پڑتا ہے اور اس کے بدلے میں، عزّت افزائی کے طور پر —— کچھ اور ہیڈ! کچھ تعریف بھی، جیسے اس کے پیٹ بھر جائے گا۔ اور یہ تعریف کرنے والے بھی کون؟ اخبار نویس، ماہناموں کے ایڈیٹر —— جو بلا معاوضہ

مضامین منگوا کر اپنا کام چلا لیتے ہیں۔ نریندر کو اپنی اس توہین کا شدید احساس ہوا۔ اور فن کی اس توہین سے اس کے دل میں تلخی بھر گئی ——" میں اتنے عظیم کرداروں اور اُن کے دلی جذبات کو اپنے تخیل کی گرفت میں لانے والا، ایسی کھوکھلی تعریف سے کیسے پھولا پھولا پھرتا رہا۔"

اور اسی عالم میں اس نے ڈاکئے سے ڈاک کا بنڈل لے لیا ——

" ایسا ہی کھوکھلا پن اس میں بھرا ہوگا۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنے لگا کہ ڈاکئے نے لوٹ کر ایک رجسٹرڈ لفافہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اور یہ خط، ہر روز آنے والے خطوط اور ان میں لکھی ہوئی تعریف سے کس قدر جداگانہ تھا، گجرات، بے قدر نہیں ہے، اس نے سوچا، لیکن فن کی اسے دوسری چیزوں سے کہیں کم ضرورت ہے، اور پھر وہ سوچنے لگا کہ سرمائے چند ایشور داس کا شکریہ وہ کن الفاظ میں ادا کرے گا —— اپنے ذہن میں وہ طرح طرح کے خطوط کا مسودہ تیار کرنے لگا۔

جوں جوں وہ اپنی شاعرانہ زبان میں فقروں کی تخلیق کرتا گیا اس کی مسرت اور اشتیاق میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ذہن میں مکمل خط کی تخلیق ہوگئی۔ اس نے میز پر سے کاغذ اور قلم بھی اُٹھا لیا، اور لکھنا شروع کیا۔ "جناب"!

نہیں "جناب" نہیں، "محترمی"!

آگے لکھنے ہی کو تھا کہ، خیال آیا، یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس چیک کا کیا بنے گا؟

ارے! خط کی شاعری میں اُس نے چیک کی حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ اس کے دل میں مسرت کا ایک طوفان اُمڈ آیا اور اسی طوفان میں بہتے بہتے ایک ہی لمحے میں اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چیک کو جوں کا توں واپس بھیج دے گا۔ سرمائے چند کی فراخدلی کے مقابلے میں اپنے بے غرض اور نیک جذبات اور اپنی بے نیاز فطرت کو پیش کر کے انھیں تعجب میں ڈال دے گا۔

تخلیق تو خالص کی مسرت اور تسکین کے لئے ہوتی ہے۔ داخلی اور خارجی کسی سبب کی بھی اس میں گنجائش نہیں۔ شہرت اور اس سے دولت پیدا کرنے کا خیال حقیقی خالق کو چھو تک نہیں سکتا۔ ان جذبات کے بہاؤ میں اُس نے قلم کو پھر ہاتھ میں لے لیا۔

"محترمی" —— وہ پھر رُک گیا۔

جوں کا توں کر کے چیک لوٹانے پر سرمائے چند ایشور داس بُرا محسوس نہ کریں؟ کہیں وہ یہ نہ سوچنے لگیں کہ اِتنی قدر کی لیکن اس شخص کو اس کی کچھ پروا نہیں اور اس خیال کے زیرِ اثر اُس نے سوچا کہ وہ چیک میں پانچ یا دس روپے کی رقم بھرے گا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کیا ایسا کرنا درست ہوگا!

کیا کرے؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اُسے خیال آیا کہ اگر وہ اسی طرح خیالات میں اُلجھا رہا تو وہ کس وقت ہوٹل میں جا کر کھانا کھائے گا اور کب اسکول پہنچے گا؟

اسکول کا خیال آتے ہی نریندر کو صبح والے واقعہ کی یاد پھر آ گئی۔ اسکول جانے کو آج اُس کا جی نہ چاہا۔ ترقی کی اُمید میں وہ کس اشتیاق سے ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا کہ انھوں نے چیرمین کے الفاظ میں پیریڈ بڑھا دینے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ یہ لوگ کس قدر سنگ دل ہوتے ہیں؟ اور اس کے سامنے ترقی کی، زیادہ پیسوں کی اور زیادہ سے زیادہ پیسوں کی کتنی بڑی ضرورت کھڑی تھی۔

پیسے کی تو ضرورت پڑے گی ہی۔ کافی محنت مشقت کے بعد اس مہنگائی کے زمانے میں وہ اپنا، گاؤں میں رہنے والی اپنی بوڑھی ماں کا اور شادی کے قابل اپنی چھوٹی بہن کا پیٹ پال رہا تھا، اور کسے معلوم تھا کہ پہلی بیوی کی موت کے بعد دوسری شادی کا موقع نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اور ابھی برسوں اسے ہوٹل کے پتھر چبا چبا کر زندگی کے دن پورے کرنا ہیں۔

اس کا دل شدید نا اُمیدی کے نفرت انگیز جذبات سے بھر گیا۔ آج وہ اسکول نہیں جائے گا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا اور خیالات کے تھپیڑوں سے بچنے کے لئے اُس نے ڈاک کا بنڈل اُٹھا لیا۔

قارئین کے تعریفی خطوط، ایڈیٹروں اور پبلشروں کے دعوت نامے، دوستوں کی مبارک باد —— یکے بعد دیگرے ہر خط کو پڑھتے پڑھتے نریندر کی آنکھوں میں خوشی اُمنڈ آئی۔ پھر ان میں سے ایک اور خط ملا۔ جسے پڑھتے ہوئے پہلے تو نریندر کی آنکھیں چمک اُٹھیں لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ چمک ماند پڑتی چلی گئی، اور اُس کی بجائے ایک غمناک جذبہ آنکھوں میں تیرنے لگا۔ یہ خط اس کی ماں کا خط تھا، جسے اس کی بہن نے لکھا تھا۔

بیٹا نریندر! ابھی تمہاری بہن نے اخبار میں چھپی ہوئی تمہاری

تصویر دکھائی جس کے نیچے تمہاری تعریف چھپی ہوئی ہے۔ بھائی کی ایسی تعریف سے بہن کا دل تو خوشی سے پھولا نہیں سما رہا اور مجھے بھی بہت مسرت ہوئی ہے۔

لیکن بیٹا، ایسے مضامین لکھنے میں تمہیں کتنی راتیں جاگ کر کاٹنا پڑتی ہیں — یہ سب مجھے بہو بتایا کرتی تھی۔ تمہاری صحت بھی تو کچھ ایسی اچھی نہیں ہے۔ راتوں کو جاگ جاگ کر اور اتنی محنت کرکے اُسے بگاڑ مت لینا . . . .

اور پھر اس خط میں گھر کی عام باتوں کا ذکر تھا۔ اس مہنگائی میں لشتم پشتم دن پورے کرنے والی زندگی کا ذکر! اتنی راتیں جاگنے کے بعد ایک کتاب لکھ کر سال دو سال میں ملنے والے دو ڈھائی سو روپے سے تو کہیں اچھا تھا کہ کوئی اور کام کیا جاتا جس سے چار پانچ سو روپے ایک ساتھ مل جاتے۔ محنت بھی کچھ کم کرنا پڑتی اور آخر میں لکھا تھا کہ جتنے روپے ممکن ہو سکیں بھیج دو ———

کچھ دیر تک وہ بالکل "گم صُم" سا بیٹھا رہا۔ پھر اس خط کو پرے رکھ کر اس نے سرائے چند کو لکھے جانے والے خط پر توجہ دینے کا ارادہ کیا۔ کاغذ اور قلم کو قریب رکھا اور سرائے چند کا خط ہاتھ میں لے لیا۔ خط کے ساتھ چپکا ہوا کورا چیک، خط کو ذرا اِدھر اُدھر کرتے ہی اس کی نظر اپنی طرف کھینچنے لگا۔

چیک کو خط سے الگ کرکے اس نے میز پر اپنے سامنے رکھ لیا — کتنی چیزوں کا مظہر تھا وہ کاغذ کا چھوٹا سا پُرزہ ——— کاغذ کے سوا سو ڈیڑھ سو صفحات کا پلندہ، کچھ کالی روشنائی اور کچھ ٹیڑھے ترچھے رکھے ہوئے ٹائپ کا ڈھیر کہ اتنے میں آپ کے روبرو شکنتلا یا ہملیٹ، پلیٹو یا گیتانجلی کھڑی ہو جاتی ہے۔ بنی نوع انسان کی مہنگی سے مہنگی دولت کاغذ کے اس چھوٹے سے پلندے میں سما جاتی ہے کتنے خیالات، جذبات اور روایات کا مظہر بن جاتا ہے۔ یہ پلندہ! اور اسی طرح ایک ہاتھ سے لکھے ہوئے ٹیڑھے میڑھے الفاظ والے کاغذ کا یہ چھوٹا سا پرزہ کتنی چیزوں کا مظہر بن جاتا ہے۔ دھان کے بھنڈار۔ موٹر گاڑی، بنگلے باغیچے عیش و عشرت — کارخانے۔ کاروبار، مزدوروں کی روٹی۔ روزی اور ان کی زندگی کے مسائل کا حل۔

ایک ایسے جذبے کے زیر اثر جس کا اُسے پہلے کبھی احساس نہ ہوا تھا۔ نریندر میز پر رکھے ہوئے چیک کی طرف دیکھتا رہا۔ چیک کو جوں کا توں کو ما لوٹا دینا اُسے ٹھیک نہ لگا۔ شاید اس طرح سرائے چند اسے اپنی توہین سمجھیں۔ اس میں کچھ نہ کچھ تو بھرنا ہی چاہیئے۔ کم سے کم رقم تاکہ رائے چند کو یہ محسوس نہ ہو کہ اس ٹٹ پونجیئے ادیب نے ان کی فراخ دلی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے۔

اس نے پانچ روپے بھرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن دل اس رقم پر قائم نہ رہ سکا۔ اس نے سوچا اگر اسی طرح خیالات آتے رہے تو وہ کسی بات پر بھی قائم نہ رہ سکے گا۔ چنانچہ اس نے قلم کو ہاتھ میں لے لیا۔ تاکہ جلد از جلد پانچ روپے کی رقم چیک میں بھر دے۔

لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میں اُسے خیال آیا ——" صرف پانچ روپے! کیا یہ مذاق معلوم نہ ہوگا۔ کہیں گے کہ لو ان ادیبوں کی تعریفوں کے پل باندھو اور یہ ہمیں ہی بنانے لگے"! یہ تو بہت ہی کم رقم ہے ——— تو پھر پچیس!

پچیس کی رقم کچھ ٹھیک، کچھ واجب معلوم ہوئی۔ اُسے چیک میں بھرنے ہی کو تھا کہ پھر رُک گیا۔ اگر رقم بھرنا ہی ہے اور پیسے لینا ہی ہیں تو پچیس ہی کیوں؟ پچیس لوں یا سو۔ اُن کے لئے ایک ہی بات ہے اور اور میرے لئے کتنا بڑا فرق پڑ جائے گا۔

تشنگی کو شدّت حاصل ہوئی۔ اپنی تشفّی کے لئے وجوہ بھی ملنے لگے — اس ایسے ادیب کے لئے سو روپوں کو زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ یورپ اور امریکہ میں تو ادیب ایک ہی تخلیق کے ہزار دو ہزار لے لیتے ہیں۔ اور یہ تو صرف سو روپے ہیں، اور وہ بھی ایسے کروڑپتی ادب نواز شخص سے۔

سو روپے! یعنی پچاس روپے کی ایک آدھ ٹیوشن ——— وہ بھی اگر مل گئی تو، دو ماہ کی فیس ہوگئی۔ اگر یہ ساٹھ گھنٹے بچ گئے تو ان سے چار خوبصورت کہانیاں جنم لے سکتی ہیں اور اس طرح اگر وہ چار خوبصورت کہانیوں پر چار ہزار روپے کا حساب لگائے تو ملک کی پونجی کا اتنا بڑا ہیر پھیر وہ صرف سو روپے کی آمدنی سے کرنے جا رہا تھا۔ اور وہ چیک جس کی مظہر تھیں موٹریں اور عیش، بنگلہ اور کارخانے، دھان کا بھنڈار اور مزدوروں کی زندگی — اس میں تو خاک بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔

یہ سو روپے تو سیدھے ماں کو بھیج دیتا ہوں گے — لکھوں گا — اس رت جگے اور محنت سے صرف اخباروں میں تصاویر ہی نہیں چھپتیں —

یا برس دو برس کے بعد سو پچاس روپے ہی نہیں آجاتے، بلکہ اس طرح انعامات بھی ملتے ہیں!"

ماں کتنی خوش ہو جائے گی۔ خیالات میں ڈوبے ہوئے نریندر کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ وہ تو اس پیسے سے گھر میں دھان بھر لے گی۔

لیکن سو روپے میں کتنا اناج آجائے گا؟

راحت ضرور ملے گی۔ لیکن بہن کی شادی کے لئے جلد ہی قرض لینا پڑے گا۔ شادی! ہاں، وہ خود چاہے تنہا رہے لیکن بہن کی شادی تو کرنا ہی پڑے گی۔ صرف ہاتھ پیلے ہی کئے جائیں تو بھی اس مہنگائی کے زمانے میں پانچ چھ سو سے کم کا خرچ نہیں۔ اس قرض کو اُتارتے اُتارتے ناک میں دم آجائے گا۔ اور اس چیک میں تو صرف ایک نقطہ بڑھا دینے سے سارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے جس طرح کنکھجورے کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے ہزار پاؤں میں سے ایک پاؤں کو کیا ہوا ہے اسی طرح سر صاحب کے لئے ہزار روپے کا خرچ معمولی بات ہے اور میں ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ جاؤں گا۔

پھر صرف اس کا ذاتی مسئلہ ہی تو رہ جائے گا۔ بتیس کی عمر اور دو برس سے وہ رنڈوا ہے جس طرح دو برس نکل گئے ہیں اسی طرح دو چار برس اور سہی!

تصور نے چار برس پلک جھپکنے کی دیر میں لٹا ڈالے۔ ایک نازک بدن حسین بیوی اُس کی آنکھوں میں تیرنے لگی، جو شادی کے لباس میں ملبوس ایسا نامور شوہر پا کر خود کو خوش قسمت سمجھ رہی ہے —— نئی زندگی کی نئی تحریک سے نئی تخلیقات اس کے ذہن میں پیدا ہونے لگیں۔

لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ عرش سے ایک دم فرش پر آگرا۔ کہاں بیوی، کہاں گھر، کہاں محبت اور کہاں اس کی تحریک۔ ابھی تو سامنے ہوٹل ہے۔ اور ٹیوشن اور زندگی کے رس کو نچوڑنے والا اور زیادہ پیسہ پیدا کرنے کے خواہش مند اس سیٹھ کا اسکول! کتنی کم دولت ہوتے ہوئے بھی اس سیٹھ کا کتنے آدمیوں پر قبضہ ہے۔ صرف دولت ہی نا! چاہے اسے تعلیم نہ ملے۔ تربیت کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ اور ادھر گجرات کو تہذیب و تمدن کا درس دینے والا۔ فن کے روح کو جگانے والا رنڈوا ادیب مستقل اور مسلسل زندگی کا گراں بار بوجھ ڈھوئے جا رہا ہے۔

نریندر کی نظر سامنے رکھے ہوئے چیک پر پڑی — گہری گلابی سطح تھی اس چیک کی۔ اسے اس میں سے ایک خوبصورت عورت کا چہرا اُبھرتا ہوا نظر آیا۔ جوانی کی سرمستی، حسین چمکتی ہوئی آنکھیں، مسکراتے ہنستے ہوئے ہونٹ اور سیاہ بھونرے ایسی زلفیں......

نریندر اُس حُسن کی مورت کی دعوت کو نامنظور نہ کر سکا۔ مسکراہٹ کی اس دیوی کو یہ کہنا کہ ابھی وہ تین چار برس تک اور انتظار کرے۔ بالکل غیر واجب معلوم ہوا —— جہاں پانچ وہاں سات سہی۔ اتنی رقم لینا طے کیا ہے تو دو چار ہزار کا لفظ جماتے جماتے اس کے ذہن میں دس ہزار کی رقم بیٹھ گئی۔

اِتنی رقم ہو تب ہی بہن کی شادی ٹھیک طرح سے ہو سکے گی۔ پورا اناج لیا جا سکتا ہے اور خود بھی شادی کر کے کچھ عرصے تک ٹیوشن کی لعنت سے دُور سُکھ چین سے رہا جا سکتا ہے۔ اور اپنے ذہن میں اُبھرتے ہوئے ناول کو۔ ایسا کہ جو پچھلے ناول کو کہیں پیچھے چھوڑ دے۔ بغیر کسی رُکاوٹ کے پیاری بیوی سے تحریک حاصل کر کے لکھا جا سکتا ہے۔

یہ بات نریندر کو مناسب معلوم ہوئی۔ رقم زیادہ مانگ بیٹھا ہے، یہ تو محسوس ہو گا لیکن کاروباری لوگ تو اپنے منیجروں کو ہی چار چار پانچ پانچ ہزار روپے بطور تنخواہ دے دیتے ہیں۔ بھلا یک مشت دی ہوئی دس ہزار کی رقم ان کے لئے کیا معنی رکھتی ہے؟ اور وہ بھی ایک عظیم فن کار کو دی گئی رقم!

فن کار نریندر کو یورپ اور امریکہ کے فن کار، ناول نگار، ڈرامہ نگار فلسفی اور علماء یاد آئے۔ سماج ان کی زندگی میں انھیں اس قدر آسائش بہم پہنچاتا ہے کہ وہ بڑے آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اور ادھر وہ صرف دس ہزار کے تصور سے پھولا نہیں سما رہا۔ اور یوں دیکھا جائے تو یہ رقم بھی کتنے دن تک سُکھ پہنچا سکتی ہے۔ بیوی آئے گی تو بعد میں بچے ضرور آئیں گے۔ دس میں سے تین چار ہزار تو بہن کی شادی اور اناج خریدنے اور اپنی شادی میں اُٹھ جائے گا اور اگر اس نے کچھ عرصے تک ٹیوشن نہ کی اور بیوی کو لے کر مہینہ دو مہینہ کے لئے رخصت لے کر کسی اچھے مقام پر چلا گیا تو اس میں بھی ہزار دو ہزار خرچ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد تین چار ہزار روپیہ بچا تو وہ کے دن چلے گا؟ بیوی کو تو گھر کا کام کاج اپنے ہاتھوں ہی کرنا پڑے گا اور بچے ہونے کی صورت میں کام میں اور اضافہ ہو جائے گا، اور پھر اس کے لئے

اینیما اور پورا ایکسٹریٹ کے انجکشن، ہنگی ہنگی دوائیں لینے کا مطلب ہے کہ سب کچھ بھسم ہو گیا! اور وہ خود جہاں پہلے تھا وہیں کا وہیں رہا۔ بیمار بیوی اور دو تین بچوں کا بوجھ الگ اُٹھانا پڑے گا۔

اس تصور سے نریندر کا ذہن مضمحل ہو گیا۔ وہ جو شیریں مسکراہٹ والا چہرہ سامنے جھلک رہا تھا۔ پریشان اور بیمار جسم میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک مر گئی اور اُس کی زُلفیں جھڑ گئیں اور ایک مکروہ صورت نکل آئی۔

پھر نریندر کے خیالات کا دھارا دوسری طرف مُڑ گیا۔ سول لائنز میں ایک چھوٹا سا خوبصورت اور صاف ستھرا مکان ہے۔ صاف ستھرا لباس زیب تن کئے خوبصورت بیوی گھر کے کام میں مصروف ہے۔ خوبصورت اور صحت مند بچے اس کے کمرے میں اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے ہیں۔ اونچے چھوٹے سے کمرے میں کتابوں سے بھری ہوئی دو تین الماریاں ہیں۔ بیچ میں میز ہے جس کے دونوں طرف دو کرسیاں رکھی ہیں۔ میز پر کاغذوں کا ڈھیر بڑی ترتیب سے رکھا ہوا ہے۔ پاس ہی سیاہی بھرا ہوا قلم سجا کر ملازم رکھ جاتا ہے۔ کاغذوں پر سبز روشنی بکھیرتا ہوا چھوٹا سا لیمپ ــــ نظر پر زور نہیں پڑنے دیتا، اور کافی رات تک لکھنے میں مدد دیتا ہے۔

"ہر ادیب، فن کار، فلسفی اور عالم کے لئے کم از کم یہ سہولتیں تو ہونا ہی چاہئیں" نریندر میز پر ہاتھ پٹک کر بولا۔ پھر کرسی سے اُٹھ کر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ چند لمحے پہلے اُس نے جس خوبصورت بنگلے کا تصور کیا تھا اُس کے بعد یہ چھوٹی سی کوٹھری اسے بالکل بے ڈھب نظر آئی اور اس میں اُسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔

تخیل میں پھر رکاوٹ پڑ گئی۔ سارا دن اور ساری رات تخلیقی کام کرنے کیلئے کم سے کم ایک لاکھ روپیہ ہونا چاہئیے۔ پھر کوئی فکر نہیں۔ لیکن یہ لاکھ روپے آئیں گے کہاں سے؟

پھر وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بالکل سامنے اس کی ہر حرکت کا جائزہ لیتا ہوا بے جان چیک پڑا تھا۔ یہ رہا ایک لاکھ روپیہ! وہ پھیکی ہنسی ہنس دیا۔ صرف ہاتھ میں قلم لے کر اس چھوٹے سے پُرزے پر ایک کے ہندسے کے ساتھ پانچ نقطے لگانے کی دیر ہے۔ ایسا کرتے ہی خوبصورت بیوی۔ صحت مند بچے۔ مضامین کا ڈھیر۔۔۔۔ ہمیشہ کے لئے۔۔۔۔

لیکن یہ تو چیک بھیجنے والے کے تئیں بے انصافی ہوگی۔ جوں جوں تصور میں رقم کا ہندسہ بڑھتا جاتا تھا توں توں یہ خیال نریندر کو کسی گہرے گڑھے میں گراتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے بھی اسباب تھے۔ لیکن ان کے لئے یہ کونسی اہم بات ہے؟ اتنا بڑا آدمی ہے، ایک ہی سودا پٹا کہ چار چھ لاکھ کے وارے نیارے ہو گئے ــــ پھر ایسا کورا چیک بھیجا ہے تو کسی بڑی رقم کے لئے ہی بھیجا ہوگا، ورنہ کیا وہ نہیں جانتے کہ کہاں کیا بھیجنا ہے؟

اس طرح کے خیالات ذہن میں آنے پر اسے اپنی یہ بات بالکل واجب معلوم ہوئی۔ پھر اس اسکول کے سیٹھوں جیسے سیٹھ تو سر پر سوار رہیں گے جو کہتے ہیں ــــ کیا اس ماسٹر کو کچھ اور پیسے نہیں دے سکتے؟"

ایک طرح کے نشے کے عالم میں اس نے چیک پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک لاکھ کی رقم بھر دی۔ لیکن ابھی پانچ نقطوں میں سے آخری نقطہ لکھا جا رہا تھا کہ پہلے والا خیال ہزار گُنا زور سے پھر اچھل پڑا ــــ نریندر کے حواس ٹھکانے پر آئے ــــ یہ میں نے کیا کیا؟ شرمندہ سا ہو کر وہ چیک کی طرف دیکھنے لگا۔

«لُوٹ»، اس کے ذہن میں فوراً یہ لفظ اُٹھ کھڑا ہوا۔

اِس چھوٹی سی کوٹھری میں تو کیا، کہیں بھی اپنا اثر ڈالنے والی اس رقم کے ہندسے اپنے نام کے ساتھ جڑے ہوئے دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے نریندر کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

کاغذ کے پُرزے پر نظر جمتے ہی کچھ دیر پہلے دکھائی دینے والی خوبصورت بیوی کے بجائے اُسے سر رائے چند کی طنز بھری ہنستی ہوئی شکل دکھائی دینے لگی۔ فلم کے ایک منظر کی طرح لمحہ بھر میں ہی وہ صورت وہاں سے غائب ہو گئی، اور اس کی جگہ نریندر کے ناول کے بلند اخلاق کردار ــــ مرد عورتیں ہنسنے لگیں ــــ نریندر اُنھیں دیکھتا رہا اور جیسے وہ کہتے رہے "تم تو ہمارا بھی مذاق اُڑانا چاہتے ہو؟"

اس کا دل درد سے بھر گیا۔

صرف اتنا ہونے سے ہی میں تھم گیا، رُک گیا، جھک گیا، سر رائے چند۔ الیشور داس کی ساری دولت بھی اگر میں اس چیک سے بھر لوں تو بھی بہت کچھ باقی رہ جائے گا۔ اور وہ ہنس پڑا "ٹھیک ہے سر رائے چند کو بھی ایک عظیم فن کار کے اندر سویا ہوا ذلیل انسان دیکھنے

کو ملے گا۔"

پھر آہستہ سے اس نے چیک کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا، اور اس پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ کچھ دیر تک اسی طرح نظریں جمائے دیکھتے رہنے کے بعد جس جگہ اسے اتنی بڑی دولت کا مالک بنانے والے سر رائے چند کے دستخط تھے۔ ٹھیک اسی جگہ سے اس نے چیک کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ ان دونوں ٹکڑوں کو اس نے ایک لفافے میں بند کیا اور اس پر سر رائے چند ایشور داس کا پتہ لکھ دیا۔

یہ سب کر چکنے کے بعد اس نے جلدی سے کوٹ پہنا۔ گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج چکا تھا۔

دو بجے تک میں کھانا کھا کر اسکول پہنچ جاؤں گا" گھر کا دروازہ بند کرتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ راستے میں لیٹر بکس میں وہ لفافہ پھینک کر نریندر ہوٹل کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ (گجراتی سے)

بمبئی یونی ورسٹی میں نئے تجربات

سائنسی اور صنعتی تحقیقات کے مئی ۵۲ء کے رسالہ میں بمبئی کے شعبۂ کیمیاوی ٹیکنالوجی کے ان تجربات کے نتائج کی تفصیل پیش کی گئی ہے جو کپڑا چھاپنے کے ان رنگوں کے متعلق کئے گئے ہیں جو سیال کی صورت میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے کپڑے گزشتہ ۴ سال میں بہت پسند کئے گئے ہیں۔

سستے اور آسانی سے دستیاب ہونے والے اجزا معلوم کرنے کی غرض سے کاجو کے چھلکے سے حاصل کردہ اور الکحل کیسلین کی بھی آزمائش کی جا رہی ہے۔ ان نئے اجزاء سے تیار کردہ مرکبات کی بدولت چھپائی میں جو چمک اور رنگ کی پختگی حاصل ہوئی ہے وہ اُن مرکبات سے حاصل کردہ چمک اور رنگ کی پختگی کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے جو پیٹنٹ کے قوانین کے تحت بیچے جاتے ہیں۔ مرکب میں الکحل کیسلین ملانے سے چھاپے کے رنگ کی پختگی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

پوربی بھارت میں کھال کمانے کا طریقہ

آج کل بھارت میں نیم کمائے ہوئے چمڑے کی تیاری کے لئے پوربی بھارت کا کھال کمانے کا جو طریقہ رائج ہے وہ نہ تو سستا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی خوبی ہے۔ اس طریقہ کی وجہ سے رنگنے کا بہت سا قیمتی مادہ ضائع ہو جاتا ہے اور ناکارہ عمل تقطیر کے باعث چھال میں سے رنگنے والے مادہ کا صرف تھوڑا سا حصہ چمڑا رنگنے والے سیال میں کھنچ کر آتا ہے۔ مزید برآں سیال میں ملے ہوئے رنگنے والے مادے کی تھوڑی ہی مقدار چمڑے میں جذب ہوتی ہے۔ لہٰذا چمڑے میں خوبی پیدا کرنے کے پیش نظر مذکورہ طریقہ عمل پر سنٹرل لیسدار ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس میں تحقیقات بھی کی گئی ہے۔ پوربی بھارت میں کھال کمانے کے طریقے کے سلسلے میں تحقیقات کا جو کام سر انجام پایا ہے اُس کے نتائج کے سلسلے کا پہلا مقابلہ "سائنس اور صنعتی تحقیقات" کے رسالے کے موجودہ شمارے میں شائع ہوا ہے۔

نمک ملی ہوئی خوراک سے متعلق تجربے

سائنسی اور صنعتی تحقیقاتی کونسل کی زیر نگرانی غذائی تحقیقاتی تجربہ گاہ کونور میں نمک آمیز خوراک کے انسانی رگ و ریشہ پر اثرات کے متعلق تحقیقات کی گئی ہے جو اب مکمل ہو گئی ہے۔ چنانچہ چوہوں کو نمک ملی ہوئی خوراک سولہ مہینے تک کھلائی گئی ان کی عام حالت اور نشوونما کی نگرانی کی گئی اور بغیر نمک والی خوراک کھانے والے چوہوں سے اُن کا مقابلہ کیا گیا۔ ۶ء۸ فی صدی پروٹین والی خوراک سے (یہ اوسط بھارت کے غریب لوگوں کی خوراک کے برابر ہے) کا نمک رگ و پٹھوں میں بہت قلیل مقدار میں جمع ہوا (لیکن آنتیں اس مقدار سے مستثنیٰ ہیں) اور جب خوراک میں پروٹین کی مقدار ۱۶ء۴ فی صدی تھی اس وقت نمک زیادہ مقدار میں جمع ہوا۔ خوراک سے نمک علیحدہ کرنے کی صورت یہ ہے کہ نمک پیشاب خانے کے اخراج کے ذریعے نکال دیا جاتا ہے۔ نمک آمیز خوراک ترک کرنے کے بعد ۴۰ روز میں پیشاب میں سے اور ۲۰ روز میں پاخانے میں سے نمک خارج ہو جاتا ہے۔

اخلاق احمد اعظمی

بچّوں کا شاعر

بچّے تو شاعری کر سکتے ہیں لیکن بچّوں کی شاعری کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ انسان کی ذہنی کاوش ارتقائی مرکز کی طرف مائل ہوتی ہے۔ یا ان چیزوں کو عقل سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتی ہے جو انسانی زندگی کے لئے ضروری اور اہم ہوتی ہے کہا جاتا ہے کہ لکھائی اور پڑھائی سب سے پہلے مصر کے تاجروں نے حضرت عیسےٰ کی پیدائش سے ہزاروں سال قبل ایجاد کی۔ یہ کام ان لوگوں نے اس وجہ سے کیا تھا کہ ان کے کام میں ایک طرح کی آسانی ہو جائے اور ہوتی بھی ہے۔ اس کے بعد چار ہزار دو سو چھبیس ۴۲۲۶ قبل مسیح میں وقت کی پیمائش کی۔ یونان والوں نے زبان اور ادب کو جو کہ مصریوں کے ہاتھوں میں ایک اکھڑ سی چیز تھی کاٹ چھانٹ کر اور کچھ اپنی طرف سے بڑھا کر ایک سبک چیز بنا دیا۔ انسان اب اپنے خیالات بت تراشی کے علاوہ شعر اور نثر میں بھی ظاہر کرنے لگا۔ شاعری کے اندر ہمیں پہلے وہی چیزیں ملتی ہیں جن کا روح پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً مذہبی چیزیں۔ خوشنما منظر خوبصورت چیزیں وغیرہ۔ یہ سب چیزیں کچھ ایسے انداز سے بیان کی جاتی تھیں کہ ایک بچے کی سمجھ سے بالاتر ہوا کرتی تھیں۔ مذہبی چیزیں بیان کرنے کے لئے شاعر ادب اور احترام کی خاطر خاص خاص وزنی اور بوجھل الفاظ استعمال کرتا تھا۔ منظر نگاری کے لئے تشبیہہ اور استعارے استعمال ہوتے تھے۔ خوبصورت چیزوں کے لئے اس قسم کے محاورے اور اشارے کام میں لائے جاتے تھے کہ ایک بچے کا ذہن اس بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا تھا۔ بچّوں کو جو تعلیم دی جاتی تھی وہ عموماً نثر کے ذریعے سے ہوتی تھی۔

ہندوستان میں اٹھارویں صدی سے پہلے اور بعد میں کچھ دنوں تک متوازی طریقے پر جو شاعری ہوتی رہی اس کے اندر بھی ہم وہی چیزیں پاتے ہیں۔ کہیں مذہب کا رنگ گہرا ہے کہیں قصّے کہانی کی چیزیں۔ کہیں قصیدے کی شکل کہیں غزلوں کی جلوہ گاہیں ہوتی تھیں۔ ان چیزوں میں اتنی وزنی چیزیں ہوتی تھیں جیسے ایک بچے کا ذہن اپنے لئے ایک پہاڑ کی سی چیز سمجھتا تھا۔ دوسری جانب اگر ایک بچہ غزل کا وہ شعر یاد کر لیتا جس کے اندر وصل اور ہجر کا ذکر ہوتا اور اس کے والدین اور گھر کے دوسرے بزرگ بد اخلاق اور بدتمیز کہہ کر اس کے کان گرم کرتے۔ مذہب کی خشک چیزیں اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ منظر نگاری اس کی کم سنی کو گرما نہیں سکتی تھی کیونکہ یہ تو جوانی کے احساسات میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف کے بعد ہندوستان نے مغرب کی دوسری نئی چیزوں کو قبول کرنا شروع کر دیا۔ بچّوں کی شاعری بھی انہیں نئی چیزوں میں سے ہے۔ حالی اقبال اور چکبست نے جدید شاعری کو جنم دیا صفِ اول میں مولوی اسمٰعیل صاحب بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے دو حصے کر دئے۔ ایک حصہ تو ان کا وہی رہا جو اور لوگوں کا تھا۔ دوسرا بچّوں کی شاعری۔ دوسرے حصے پر ان کی خاص نظر رہتی تھی۔ اس لئے اس حصے کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔

غزل اور قصیدے کی سی شاعری میں ہمیشہ یہی کوشش ہوتی رہتی تھی کہ کوئی چیز کہی جائے جو جلدی سمجھ میں نہ آئے یعنی وہ ایک معمہ ہو۔ فلسفے اور جمالیات کی چیزیں بھاری بھرکم الفاظ میں پیش کی جاتی تھیں۔ ایک بچہ ممکن ہے کڑوی دوا کی طرح پی جاتا رہا ہو لیکن اس میں اس کو کسی قسم کا لطف اور کیفیت کا پانا ناممکن تھا۔ افلاطون کے زمانے میں بچّوں کو تعلیم دو طریقوں سے دی جاتی تھی۔ ایک تو لوگ خود پرائیویٹ طریقے پر انتظام کرتے تھے جس کے اندر کتابت کے علاوہ شعر اور موسیقی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن سترہ اٹھارہ سال کے بعد دو سال تک گورنمنٹ کی طرف سے فوجی تعلیم ہوتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ گورنمنٹ خود بچوں کو ایک علیحدہ مکان میں تعلیم دیتی تھی۔ جس کے اندر سیاست اور فن

سپاہ گری پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور آگے چل کر یہی لڑکے حکومتِ جمہوریہ کے بہترین شہری بنتے تھے۔ ہندوستان میں مسلم بچوں کی تعلیم مکتبوں میں ہوتی تھی۔ فارسی۔ عربی اور اردو زبان میں مذہبی باتیں بتائی جاتی تھیں۔ فارسی زبان عشقیہ شاعری کے خزانے کا منہ کھول دیتی تھی۔

مولوی اسمٰعیل صاحب نے جدید شاعری کی طرف اپنا قدم اٹھایا یہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے آثار باقی تھے۔ مذہب کا رنگ گہرا تھا۔ دوسری جانب مغرب میں جو نئی تہذیب اور تمدن کا سورج نکلا تھا اس کی کرنیں مشرق کی سرزمین پر بھی پڑنے لگی تھیں۔ کچھ لوگ کلبلانے لگے تھے۔ اپنے وقت کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے شاعری شروع کی سب سے بڑا ان کا احسان اور کمال یہ تھا کہ نئے اونچے خیالات کو انہوں نے اپنی شاعری کے اندر بچوں کی زبان اور خیال میں ڈھال دیا۔ یہ چیز انہوں نے میرے خیال میں انگریزی نظموں سے حاصل کی جو کہ بچوں کے بارے میں لکھی گئی تھیں۔ کیونکہ بیشتر انگریزی نظموں کا ترجمہ ہمیں ان نظموں میں ملتا ہے مثلاً "ایک قانع مفلس" "موت کی گھڑی" "فادر ولیم" "حب وطن" "انسان کی خام خیالی" وغیرہ۔

گویا مولوی صاحب یہ چاہتے تھے کہ بچوں کو شروع ہی سے پرانے ماحول سے نکال کر نئے ماحول کی طرف لے جائیں۔ یہ کم سن اور اچھوتی نظمیں بچوں کو بخوبی یاد ہو جاتی تھیں بچوں کی ابتدائی نصاب کی کتابوں میں یہ نظمیں رکھی جانے لگیں۔ بچوں کو ان نظموں میں اتنا ہی لطف اور مزہ ملنے لگا جتنا کہ کھیل اور تماشے میں۔ آج بھی جو لوگ ان کی نظموں کو پڑھ کر بڈھے ہو گئے ہیں پوری نظم کی نظم یاد رکھتے ہیں۔ نیچے میں چند اشعار پیش کرتا ہوں جس نے چند روز بھی اردو کی تعلیم آج سے کچھ دن پہلے حاصل کی ہوگی ان کو یاد ہوں گے یا اُنہوں نے سُنے ضرور ہوں گے۔

وقت میں تنگی فراخی دونوں ہیں جیسے ربڑ   کھینچنے سے بڑھتا ہے چھوڑے سے جاتا ہے سکڑ
بد کی صحبت میں مت بیٹھو اس کا ہے انجام بُرا   بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھا بدنام بُرا
راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں   کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں
گلستانِ جہاں میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی   مگر جو گل کے جویا ہیں نہیں کیا خار کا کھٹکا

مجھے خوب یاد ہے کہ جب ہم لوگ مکتب میں پڑھتے تھے تو اکثر آپس میں بیت بازی ہوتی تھی۔ جب کسی کا شعر "ج" پر ٹوٹتا تھا تو دوسرا اکڑ کر بیٹھ جاتا تھا کہ اچھا میں اس کا جواب دیتے ہوئے "ٹ" پر توڑوں گا جس کا جواب مشکل ہو جائیگا اور بات کر دونگا فوراً ہی یہ شعر پڑھتا ؎

جبکہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ   اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

اگر کوئی شعر "ن" پر ٹوٹتا تو شعر پورا ہونے سے پہلے ہی یہ شعر منہ سے نکل پڑتا ؎

نہر پہ چل رہی ہے پن چکی   دھن کی پوری ہے کام کی پکی

بیت بازی شروع میرے خیال میں زیادہ تر ان چند اشعار سے ہوتی تھی ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی   جس نے ہماری گائے بنائی
ایک لڑکی بگھارتی ہے دال   دال کرتی ہے عرض یوں احوال

جواب میں یہ شعر ضرور پڑھا جاتا تھا۔

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا   کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

چونکہ "چ" سے شروع ہونے والے اشعار بہت کم ہوتے ہیں اس لئے بیت بازی کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر ایک کی زبان پر یہ اشعار ضرور چڑھے رہتے ہیں ؎

چمکنے سے جگنو کے تھا اک سماں   ہوا پر اڑیں جیسے چنگاریاں
چمک دار کیڑا جو بھایا اسے   تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اُسے
چمک میری دن میں نہ دیکھو گے تم   اجالے میں ہو جائے گی وہ تو گم
چاندی کی انگوٹھی یہ جو سننے کا پڑا تھا جھول   اوچھی تھی لگی بولنے اترا کے بڑا بول
چاندی کی انگوٹھی کے نہیں ساتھ رہوں گی   وہ اور ہے میں اور یہ ذلت نہ سہوں گی
چمن سرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے   مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے

ان اشعار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا بچوں کو آسمان کی باتیں نہیں بتلاتے بلکہ اسی سرزمین پر سیر کراتے ہیں جس پر وہ پیدا ہوئے اور بڑے ہو رہے ہیں۔ ایسی چیزیں پیش کرتے ہیں جو ان کی دیکھی بھالی اور پسندیدہ ہیں۔ ان چیزوں سے بچوں کو کسی قسم کی الجھن نہیں ہوتی بلکہ وہی چیزیں ان کی نظموں میں پلتے ہیں جو ان کے دل میں ہوتی ہے ان خیالات سے بچوں کا بچپنا بغاوت اور نفرت کے عوض دوستی پیدا

کرتا ہے - بچوں کو دو چیزوں سے بڑی الفت ہوتی ہے - شوخ رنگ اور زیادہ مٹھاس - ان دو چیزوں کا مرکب مولانا کی نظموں میں پایا جاتا ہے یعنی موسیقی - ان نظموں کو ایک بچہ بڑی آسانی کے ساتھ مہین راگ سے اُچھلتا کودتا گا کر بھی پڑھ سکتا ہے - بچوں کو موسیقی پسند ہو یا نہ ہو لیکن ان کو اس پر عبور کافی ہوتا ہے - یہ چیز ان کی کمسنی کے ساتھ ہے - اگر روتا ہے تو بھی ایک قسم کا راگ پیدا کرتا ہے اگر ہنستا ہے تو ترنم پیدا کرتا ہے - اگر وہ چاہتا ہے کہ گلا پھاڑ کر کوئی چیز کہے تو اس کا گلا پھٹتا ہی نہیں - نثر کے اس ٹکڑے کو ایک بچہ اس انداز سے پڑھتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نظم کا ایک شعر ہے "یا رب دل دے - سچ کہہ مت ڈر" یا "تم کب آئے - ناخون کا ٹو - آلو کھاؤ" "یہ منّا کا گھوڑا ہے"۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بچے انہیں چیزوں کو پسند اور یاد کرتے ہیں جو آسانی کے ساتھ ان کی سمجھ میں آجائے - ان کی عمر کی طرح سے سادے ہوں - عقل و ہوش سے اونچی چیزوں کو سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے - اگر کسی بچے کو نثر کے اس ٹکڑے کو یاد کرایا جائے تو کبھی نہیں یاد ہو سکتا "ہمارے ماہرین وہ ہیں جو حسن و جمال کو اچھی طرح دیکھ سکیں - اگر دیکھیں تو جمال اور سنیں تو حسن کا ترانہ" نہ تو یہ شعر ہی یاد ہو سکتا ہے -

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کسی بچے کو ان چیزوں کو رٹایا جائے تو اس کو یاد نہیں ہو سکتیں - جہاں تک ان کی قوت حافظہ کا تعلق ہے وہ زیادہ سے زیادہ مشکل اور بڑی سے بڑی چیز کو یاد کر سکتا ہے لیکن اس میں اس کے ذہن - شوق - حوصلے کا کوئی بھی حصہ نہیں پایا جائے گا وہ ان چیزوں کو ایسے ہی سنا دے گا جیسے گراموفون - نہ اس کے چہرے پر کسی قسم کا آثار نمایاں ہوگا - نہ وہ ہنسے گا نہ غمگین ہوگا - بلکہ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ آنکھیں بند کر کے سنا رہا ہے - اس سے صاف ظاہر ہوگا کہ ان کے سنانے اور یاد کرنے میں اس کو کسی قسم کا لطف نہیں ملا - جہاں تک یاد کرنے کا تعلق ہے اس کے قوت حافظہ کا کرشمہ ہے مولانا اسمٰعیل صاحب کی نظموں میں بلندی ہمواری میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اونچائی نیچائی ایک سطح پر ہو جاتی ہے - فلسفہ - سیاست نئی نئی چیزیں بچوں کے سامنے اپنی نظموں کے ذریعے سے اس طرح پیش کرتے ہیں جس طرح مختلف رنگ کی مٹھائیاں جس کو اگر ایک بچہ نہ لینا چاہتا ہو تو بھی اس کی فطرت لینے پر مجبور کر دے - پانی کی سی سادی چیز کو مولانا اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے ایک کھلونہ -

اسے چھیڑو - اچھالو یا گھنگولو — اسے بھینچو، دباؤ یا ٹٹولو
جھکولے دو - مسل ڈالو، دباؤ — اسے رگڑو - گھسو - پیسو - بہاؤ
وہی پانی کا پانی دودھ کا دودھ — کسی عنوان سے ہوگا نہ نابود

ایک جگنو کو جب کوئی بچہ رات کے وقت پکڑتا ہے تو اس کا تجسس اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا پہلے تو اس کو اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ اس نے چمک دار کیڑے کو پکڑ لیا - اس کو وہ اپنے کرتے کے دامن میں یا ٹوپی میں چھپا کر رکھتا ہے تاکہ اُڑ نہ جائے اور اس کی چمک سے دل بہلاتا رہے - دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی کے اندر اور زیادہ تر بچے کے اندر کسی چیز کے معلوم کرنے کی خواہش زیادہ ہوتی ہے - ایک بچہ جب زیادہ کم عمر ہوتا ہے اگر وہ کسی نئی چیز کو دیکھتا ہے تو اپنی ماں سے اس کے بارے میں پوچھتا ہے کہ یہ کیا ہے ؟ کہاں سے آئی ؟ کیوں آئی ؟ کس کی ہے ؟ کہاں رہتی ہے ؟ اور اخیر میں کہتا ہے کہ یہ ہماری ہے ناماں ؟ ماں کہہ دیتی ہے ہاں بیٹا - لیکن جب بچہ ہوشیار ہوتا ہے تو خود ہی اس کے جاننے کی کوشش کرتا ہے - اگر ایک بچے کو فرض کیا کہیں سے گھڑی ہاتھ لگ گئی تو وہ تنہائی میں لے جا کر اس کو توڑے گا اور اس کے پرزے پرزے کو الگ کر دے گا - اس طرح سے اس کا تجسس ختم ہو جاتا ہے - نقصان وغیرہ کا بالکل خیال نہیں کرتا بلکہ اپنی خواہش کے مطابق ایسا کر جاتا ہے - ایسا کرنے پر وہ مجبور ہے کیونکہ یہ چیز اس کی فطرت میں داخل ہے - جگنو کو جب ایک بچہ رات میں پاتا ہے تو اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس کو پکڑ کر وہ رکھ دے اور صبح کو دیکھے کہ یہ وہ کون سی چیز ہے جو رات میں چمکتی ہے - اس خیال کے تحت میں ان اشعار کو نیچے لکھوں گا جو بچے کی طرف سے لکھے گئے ہیں نہ کہ جگنو کی طرف سے ؎

چمک دار کیڑا جو بھایا اُسے ـــ تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اسے
کروں گا نہ آزاد اس وقت تک ـــ کہ میں دیکھ لوں دن میں تیری چمک
ارے چھوٹے کیڑے نہ دے دم مجھے ـــ کہ ہے واقفیت ابھی کم مجھے
اجالے میں دن کے کھلے گا یہ حال ـــ کہ اتنے سے کیڑے میں ہے کیا کمال
دھواں ہے نہ شعلہ نہ گرمی نہ آنچ ـــ چمکنے کی تیرے کروں گا میں جانچ

میں کہتا ہوں اگر ڈاکٹر اقبال والا جگنو اس کو پکڑ کر دے دیا جائے تو اس کا کیا مزہ آئے گا۔ "صبح کی آمد" ایک بچّے کے سامنے ایسی ہی ہے جیسے ماں کا آنا اور جگانا ؎

لو ہشیار ہو جاؤ اور آنکھ کھولو ـــ نہ لو کروٹیں اور نہ بستر ٹٹولو
خدا کو کرو یاد اور منہ سے بولو ـــ بس اب خیر سے اٹھ کے منہ ہاتھ دھولو
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

مولانا نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ہندوستان کے نوّے فیصدی والے بچّوں کے لئے ہے نہ کہ دس فیصدی والوں کے لئے۔ اس لئے مولانا نے انہی چیزوں کو اپنی نظموں میں لانے کی کوشش کی جو ہندوستان کی دیہاتی زندگی سے وابستہ ہوں جس سے کہ ایک دیہات کا بچّہ واقف ہو اور لطف بھی لے۔ اس کا اندازہ آپ ان اشعار سے کر سکتے ہیں۔ مجھے تو ان میں ہندوستان نظر آتا ہے۔

سرسوں پھولی بسنت آئی ـــ ہولی پھاگن میں رنگ لائی
ہم کھیلتے ہیں وہاں کبڈّی ـــ ہیری ہے کوئی۔ کوئی بھڈّی
لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہیں بالیاں ـــ پودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں
دودھ دہی اور میٹھا مسکا ـــ دے نہ خدا تو کس کے بس کا
دانہ دنکا بھوسی چوکر ـــ کھا لیتی ہے سب خوش ہو کر
پکنے کو جب مکا آئی ـــ کوؤں نے جا لوٹ مچائی
ڈُودھیا بھٹیا چونچ سے چیرا ـــ سچ مچ کا ہے اٹھائی گیرا
رکھوالے نے پائی آہٹ ـــ گوپھن لے کر اٹھا جھٹ پٹ
ہریا ہریا شور مچا کر ـــ ڈھیلا مارا تڑ سے گھما کر
نہ پوچھو کچھ غریبوں کے مکاں کی ـــ زمیں کا فرش ہے چھت آسماں کی
ہوئے روشن آبادیوں میں چراغ ـــ ہوا سب کو محنت سے حاصل فراغ

زمانے کی نئی تحریکوں سے بڑے بڑے لوگ گھبراتے تھے۔ بچّوں کا تو سوال ہی نہ تھا۔ مولانا اپنے ماحول سے بغاوت کرتے ہوئے بچّوں کو اس بات کی خوشخبری دیتے ہیں کہ

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ ـــ بجے گا محبّت کا نقّار خانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ ـــ کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ
عقیدوں کی مٹ جائے گی سب رقابت ـــ مذاہب کو ہو گی تعصب سے فرصت
لگے ہاتھ سب کا تو اٹھ جائے چھپر ـــ کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ
رہو گے اگر تم یونہیں مستقل ـــ تو اک دن نتیجہ بھی جائے گا مل

بڑے تعجّب کی بات ہے کہ آج آزاد شاعری پر شور اٹھتا ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کی شاعری ہے۔ اس کے اندر کیا کہا جاتا ہے۔ اور کیسے کہا جاتا ہے۔ آخر مولانا نے بچّوں کے لئے کیسے یہ نسخہ تجویز کیا تھا۔ ایک نظم ہے "چڑیا کے بچّے" اسے ایک بچّہ بڑے شوق سے پڑھتا ہے اور یاد کر سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر آپ بھی پڑھ لیجئے۔

اونچے نہ اڑ سکو گے ہاں جب تمہارے بازو
اور پر درست ہوں گے تو دن کی روشنی میں
سیکھو گے تم بھی اڑنا کرتے پھرو گے چیں چیں
اڑتے پھرو گے پھر پھر اے چھوٹے بچو لیکن
کوّا بُری بلا ہے اس سے خدا بچائے

مولانا کی نظموں کو اگر ایک بڈھا آدمی بھی پڑھتا ہے تو اس کو اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے بڑھاپے سے جان چھڑا کر پھر وہیں جا بھاگتا ہے جہاں برسوں ہوئے وہ کھیلتا تھا لوگوں کو اکثر مزا ملتا ہے اپنے بچپن کی چیزوں کے دہراتے ہیں۔ کہتے ہیں جب ہم بچّے تھے تو یہ کرتے تھے۔ یہ کھیلتے تھے اور یہ کھاتے تھے۔ ایسی ایسی آرزوئیں دل میں ہوتی تھیں۔ کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہی کا زمانہ تھا۔ جب مولانا کی نظموں کو کوئی پڑھتا ہے تو اس کو اپنے ماضی کی اصلی اور خوبصورت تصویر نظر آتی ہے جس کو وہ دیکھ سکتا ہے لیکن نہ تو اس کو چھو سکتا ہے نہ اس تک پہنچ سکتا ہے۔ بچے پڑھ کر مگن ہوتے ہیں کہ ان کی چیز ہے۔ بڈھے اس لئے سینے سے لگاتے ہیں کہ ان کے

گزرے ہوئے زمانے کی تاریخ ہے۔

سب سے بڑی تعریف کی چیز یہ ہے کہ مولانا نے کبھی من گھڑت چیزوں کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ اگر ایسا کرتے تو وقتی چراغ ٹمٹما کر کبھی کا بجھ گیا ہوتا۔ ان کو اپنے دیس کی چیزوں سے محبت تھی۔ اپنی روزمرّہ زندگی کی چیزوں سے مانوس تھے۔ اپنی روز کی بولی چال پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے نظمیں ان عنوانات سے لکھی ہیں۔

"دال چپاتی" "برسات" "گرمی کا موسم" "ہماری گائے" "عجیب چڑیا" "اونٹ" "بکرا" "کچھوا اور خرگوش" "کوہ ہمالیہ" "چھوٹی چیونٹی" وغیرہ دوسری جانب نئے موضوعات کو بھی اپنانتے تھے۔ مولانا کے بعد ہر ایک نظم لکھنے والے شاعر نے کچھ نہ کچھ ضرور بچوں کے لئے لکھا لیکن جو کامیابی مولانا کو ہوئی کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ چند نظمیں جو ڈاکٹر اقبال نے بچوں کے لئے لکھی ہیں ان کو بھی بڑا مزہ لے کر پڑھتے ہیں مثلاً "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" "بچے کی دعا" "پرندے کی فریاد" "پہاڑ اور گلہری" "دعا" وغیرہ یہ نظمیں بچے اس لئے پسند کرتے ہیں کہ ان کی زبان آسان ہے اور شعریت کا ایک قسم کا بہت میٹھا رس پایا جاتا ہے لیکن جہاں تک اندازِ بیان کی معصومیت کا تعلق ہے یہ نظمیں مولانا کی نظموں سے پیچھے ہیں۔ ان نظموں کے اندر خیالات بچوں کی سمجھ سے اونچے ہیں۔ بچے ان نظموں میں اتنی دلچسپی رکھتے ہیں جتنی اپنے باپ سے۔ مولانا کی نظموں سے اتنی ان کو راحت ملتی ہے جتنی اپنی ماں سے لپٹ کر۔ ظاہر ہے کہ ماں اور باپ کی محبت میں کتنا فرق ہے لیکن باوجود اس کے بچہ دونوں کے لئے آنسو بہاتے اور مسکرانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس کا فرق ایک بچہ نہ سمجھ سکتا ہے نہ بتلا سکتا ہے۔

کچھ لوگوں نے بچوں کے لئے ترانہ لکھنا شروع کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی کتابوں کی شکل میں یہ ترانے نصاب میں داخل کر دئے گئے۔

ایسے موقعوں پر چند لوگوں کا نام ضرور یاد آجاتا ہے۔ سرور جہاں آبادی۔ حامد اللہ افسر۔ منشی تلوک چند محروم۔ برج نارائن چکبست وغیرہ۔ اس کے بعد بچوں کے لئے رسالے بھی نکلنے لگے۔ "غنچہ" مدینہ اخبار کے دفتر سے نکلنے لگا۔ "پیام تعلیم" جامعہ ملیہ دلی سے اور "نونہال" "آجکل" کے دفتر سے جاری ہوا۔ آج بھی "پیام تعلیم" "پھول" "نونہال" اور "کھلونا" وغیرہ نکلتے ہیں۔ ان رسالوں میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں۔ قصے اور نظمیں ہوتی ہیں۔ ان کے مذاق کے مطابق خاص طور سے نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ اس موقعہ پر دو آدمیوں کا خاص طور پر نام لینا چاہتا ہوں۔ شفیق الدین نیر اور خلیل الرحمن اعظمی ان دونوں آدمیوں نے بچوں کی شاعری کو جنم تو نہیں دیا لیکن خاص حد تک نکھار دیا اور اہم سے اہم چیز کو بچوں کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے بنی لگا ہوا کھلونا۔ بنی ٹکے ہوئے کھلونوں میں اندر کچھ نہیں ہوتا لیکن ان لوگوں کی نظموں کو پڑھ کر ایک بچہ حقیقت۔ سچائی اور وجہ پاتا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کی نظم "نیا کھیل" اپنی مثال آپ ہے۔ ایک طرف تو یہ نظم ہندوستان کا نقشہ پیش کرتی ہے دوسری جانب بچے کے اندر اپنا لینے کا جذبہ پیدا کرتی ہے کیونکہ بیک وقت اس کو بہتی ہوئی گنگا جمنا برف سے ڈھکی ہوئی ہمالیہ کی چوٹیاں۔ لہریں مارتے ہوئے سمندر اور ہندوستان کی ہری ہری وادیاں نظر آتی ہیں۔ شاغل فخری مرحوم کے زمانے میں یہ نظم "غنچہ" میں نکلی تھی۔ ایڈیٹر بچارے نے تاب نہ لا کر انعام کا اعلان کیا۔ مولانا کے بعد زیادہ لوگوں نے بچوں کے لئے لکھنا شروع کیا لیکن ایک حد تک اور ایک وقت تک بہت سے تو زبردستی اور رسم کے طور پر لکھتے رہے۔ مولانا کی بہت بعد کی لکھی ہوئی نظم "کوا" ہے۔ بچوں کی شاعری مولانا کی زندگی کا شاہکار ہے۔ آخری عمر تک اس میں لگے رہے۔ انہوں نے بچوں کی زندگی کے ہر پہلو پر نظر دوڑائی اور ساری چیزوں کو اپنی نظموں میں پیش کیا۔ مولانا جدید شاعری کی صفِ اوّل میں تھے لیکن بچوں کی شاعری نے ان کو ابدی زندگی بخش دی۔

بچّوں کا آج کل

آٹھ صفحے کا یہ رسالہ علیحدہ بھی شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ ایک روپیہ۔ ذیل کے پتے سے طلب فرمائیے

ڈسٹری بیوشن آفیسر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

سلیم الرحمٰن

مریخیات

۱۸۷۷ء کی ایک رات کو اطالوی اسطرانومر شیا پہ یلی (Schiaparelli) نے دوربین کی مدد سے مریخ کی سطح پر لمبی متوازی لکیریں مشاہدہ کیں جو بظاہر نہریں معلوم ہوتی تھیں، اور ایک نئی سائنس وجود میں آگئی مریخیات۔

ستتر سال کی مدت دراز گزر چکی ہے۔ مگر لوگ اسی شدومد اور اشتیاق کے ساتھ مریخ پر حیات کے امکانات۔ اس کی آب و ہوا، نباتات اور اسی قسم کے متفرق مسائل پر بحث کرتے رہے ہیں۔ اس زمانے میں اس روایت سے جو اضطراب پھیلا تھا اس کا اثر اب تک دور نہیں ہوا ہے۔ لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب مریخ کی سطح پر نہروں کا وجود ہے تو ان کو تعبیر کرنے والے فرہادیا بالفاظِ دیگر مریخی بھی موجود ہوں گے۔ چنانچہ عام اکثریت ابتک اس بات کی قائل ہے کہ مریخ پر کسی نہ کسی قسم کی زندگی موجود ہے۔ صرف سنجیدہ مزاج سائنس داں اس کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ اس لئے کہ مندرجہ بالا نظریئے کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں۔ نہ کوئی معقول ثبوت دیا جا سکتا ہے۔

بہرحال نئے نئے نظریئے پیش ہوتے رہے۔ افسانہ نگار مریخ سے متعلق پُراسرار اور سحر آمیز افسانے لکھتے رہے۔ خیالات کی رو بہتی رہی۔ سائنسی ادب (Science Fiction) کہتا تھا اور کہتا ہے کہ مریخی باشندے موجود ہیں۔ سائنس داں کی نظر میں یہ حقیقت قابلِ قبول نہیں۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی تصنیف War of the Worlds میں کرۂ ارض پر مریخیوں کی یورش کا منظر کھینچا ہے، جو اپنی آتشی شعاع کی مدد سے دنیا کو تاخت و تاراج کرکے محکوم کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے حملے کے امکانات کو عقل باور تو نہیں کرتی۔ لیکن یہ بات اتنی ناممکن نہیں جتنی کہ کچھ تنگ نظر لوگ اسے سمجھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ تگ و دو اور یہ مباحثے مریخ تک ہی کیوں محدود ہیں؟ نظام شمسی میں دوسرے سیارے بھی تو ہیں۔ کیا ان میں کسی پر حیات ممکن نہیں؟

عطارد سورج کے قرب میں واقع ہے اور اس کی سطح کا مطالعہ کرنے کا موقعہ شاذونادر ہی ملتا ہے۔ زہرہ ہمیشہ ابخارات کے ایک کثیف پردے میں اپنی طبعی کیفیت کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ یونانی خرافات Mythology کی حُسن کی دیوی کی یہ شرم تعجب خیز ہے۔ باقی سیارے مشتری، زحل وغیرہ تو بے حد سرد غیر مہمان نواز اور دور افتادہ واقع ہوئے ہیں۔ ان پر کسی قسم کی حیات کی امید کرنا ہی عبث ہے۔ اگر حسنِ اتفاق سے نیچر نے کوئی ایسی دل لگی کی بھی تو وہ حیات اس قدر غیر مانوس ثابت ہوگی، کہ فی الحال اس کے متعلق خیال آرائی کرنا ممکن نہیں۔ صرف مریخ ہی ایک سیارہ ایسا رہ جاتا ہے جو انسان کے لئے ایک کشش رکھتا ہے۔ مریخ سورج سے دوری کے لحاظ سے سیارۂ چہارم ہے۔ اس کا قطر ۴۲۰۰ میل ہے۔ اسے اپنے محور پر گردش پوری کرنے میں چوبیس گھنٹے سینتیس منٹ لگتے ہیں۔ گویا مریخ کے شب و روز دنیا کے مقابلے میں ذرا بڑے ہوتے ہیں۔

چونکہ مریخ کا محور ایک مکمل دائرہ نہیں ہے۔ اس لئے لامحالہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سال کے ایک حصے میں وہ سورج کے قریب آجاتا ہے۔ یعنی زمین سے بھی غیر معمولی طور پر نزدیک ہو جاتا ہے۔ عموماً پندرہ یا سترہ سال کے وقفے سے ایسا ہوتا ہے کہ مریخ زمین سے صرف تین کروڑ چالیس لاکھ میل رہ جاتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۵۴ء میں مریخ زمین سے کافی قریب ہوگا اور اگر موسم نے ساتھ دیا تو بہت سے اختلافات کا مکمل اور قطعی فیصلہ ہو جائے گا۔ پالومر کی دوسو انچ کی دوربین سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ صرف موسم کے خوش گوار ہونے کی امید رکھنی چاہیئے۔ کیونکہ ابر و باد

عموماً اسطرانومر کے لئے قاتل ثابت ہوتے ہیں۔

ایک ایسے ہی موقعہ پر ۱۸۷۷ء میں مریخ کے دونوں توابع معلوم کئے گئے تھے۔ مریخ کو یونانی جنگ کا دیوتا اور اہلِ فارس جلادِ فلک کہتے تھے۔ یہ خونریز نام بلاشبہ مریخ کے سُرخ رنگ کی وجہ سے رکھے گئے تھے۔ ان ناموں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مریخ کے توابعین کے نام بھی جنگ اور خونریزی سے متعلق رکھے گئے ہیں۔ فوبوس (خوف) اور ڈیموس (اضطراب)

ڈیموس تو مریخ کا ایک چکر تیس گھنٹے میں پورا کرتا ہے۔ مگر فوبوس قریب تر توابع کی رفتار حیرت انگیز ہے۔ صرف سات گھنٹے اور انتالیس منٹ میں وہ مریخ کی ایک مکمل گردش کرلیتا ہے۔ مریخ کی سطح سے اگر کوئی فوبوس کا مشاہدہ کرے تو وہ اس انوکھے چاند کو ایک ہی رات میں دوبارہ طلوع ہوتے دیکھ سکے گا۔ نظامِ شمسی میں کوئی توابع فوبوس سے زیادہ رفتار نہیں رکھتا۔

دوربین سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مریخ کا شمالی نصف کرہ وسیع خاکستری مائل میدانوں پر مشتمل ہے۔ جنوبی کرّے میں ازرقی، سرمئی رنگ کی آمیزش کے کئی بڑے بڑے دھبّے نظر آتے ہیں۔ جو کسی زمانے میں سمندر خیال کئے جاتے تھے۔ مگر ان میں سورج کا پانی بالکل معدوم ہے۔ اس لئے یہ عیاں ہے کہ وہ پانی سے محروم ہیں۔ شاید کسی زمانے میں وہ درحقیقت مریخی سمندر ہوں جو اب خشک ہوگئے ہیں۔

مریخ کے دونوں قطبین سال کے بیشتر حصّے میں برف سے ڈھکے رہتے ہیں اور موسم کے تغیّرات کے ساتھ ساتھ ان میں کبھی کمی بیشی واقع ہوتی رہتی ہے۔ مریخ پر پہاڑ عنقا ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل عریاں پذیری نے اس کی سطح کو بالکل پست کردیا ہے۔

مریخ کا کرۂ ہوا بہت ہی قلیل ہے۔ لیکن تقریباً تقریباً دنیا کے کرۂ ہوا سے مشابہ ہے۔ طیف پیما سے جب مریخ سے منعکس کئے ہوئے نور کا تجزیہ کیا گیا تو اس کی یکسانیت کا احساس ہوا۔

مریخ کی کشش دنیا سے بہت کم ہے۔ جو شے سطحِ ارضی پر سات سیر کا وزن رکھتی ہو وہ مریخ پر صرف تین سیر کی رہ جائے گی۔

موسم گرما میں تو استوائی علاقوں میں کافی گرمی ہوجاتی ہے جیسا کہ ہندوستان میں جنوری کا مہینہ۔ مگر سردی میں مریخ کا کوئی حصّہ ایسا نہیں ہوتا جس پر کہ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہو۔

کم قوت کی دُوربین سے اگر مریخ کو دیکھا جائے تو اس پر لمبی متوازی لکیریں دکھائی دیتی ہیں۔ جن کا جال تمام مریخ پر پھیلا ہوا ہے اور بعض تو اتنی لمبی ہیں کہ ایک قطب سے دوسرے قطب تک چلی گئی ہیں۔ ان ہی لکیروں کا نام کینالز (Canals) رکھا گیا ہے۔ جن کے اردگرد ایک عرصۂ دراز تک "رومانی فضا" طاری رہی۔ جب مریخ پر موسم گرما آتا ہے اور قطبین کی برف پگھلنے لگتی ہے تو یہ لائنیں نمایاں ہوجاتی ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد چار سو سے اوپر ہے۔

آج سے دس پندرہ سال پہلے تک لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مریخیوں نے آبپاشی کے لئے یہ عظیم الشان جال بچھایا ہے۔ مگر اب نہروں کو واہمہ اور محض واہمہ قرار دے دیا گیا ہے۔ ان کے خلاف اتنے مؤثر دلائل ہیں کہ ان کو واہمہ تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نہروں کی تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ موسمِ گرما میں ان کی تعداد سردی کے مقابلے میں دوگنی ہوجاتی ہے۔ اگر نہریں مریخی دماغوں کی معماری ہیں تو اُن کی تعداد کو ہمیشہ یکساں رہنا چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ وہ مریخ کی سطح پر بالکل سیدھی لائنوں کی طرح پھیلی ہیں۔ مریخ اس قدر ہموار بھی نہیں کہ ہزاروں میل تک ایک بالکل سیدھی نہر تعمیر کردی جائے۔ اگر ایسا ہو بھی تو مسلسل نشیب و فراز کی وجہ سے وہ آبپاشی کا کام تو انجام دے نہیں سکتی۔ کوئی اور مقصد ہو سکتا ہے۔ پھر بھی ان خیالی نہروں کے متعلق کوئی نہ کوئی شاخسانہ نکل ہی آتا ہے۔ حال ہی میں انگلستان میں ایک نظریہ پیش کیا گیا تھا، کہ مریخی نہریں جوہری طاقت کو گذارنے کا راستہ ہیں۔ جن سے عظیم الشان زمین دوز مریخی شہروں کو روشنی اور حرارت پہنچائی جاتی ہے۔ خیر یہ تو سب فینٹاسی (Fantacy) ہے۔

مریخ کے سرخ رنگ کی جو جدید ترین تشریح کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی سطح زیادہ تر رہولٹک (Rhyolitic) قسم کی چٹانوں پر مشتمل ہے۔ اور کرۂ ہوا کے دبیز نہ ہونے کی وجہ سے اُن کا سرخ رنگ منعکس ہوتا رہتا ہے۔ کچھ چھوٹے چھوٹے غار بھی اس کی سطح پر دیکھے گئے ہیں جو یقیناً سنگِ شہابی کے گرنے کا نتیجہ ہیں۔ کچھ ہیئت والوں کا خیال ہے کہ مریخ کے خشک سمندر اور ریگستانی علاقے جیالوجیکل Geological

تبدیلیوں کے بالکل مطابق ہیں اور یہ کہ نہریں تو موجود نہیں البتہ مریخ پر بہت ساری دلدلیں موجود ہیں۔

مریخی قطبین پر جو سفید برف نظر آتی ہے وہ درحقیقت ان معنوں میں برف کی چادر نہیں جیسی کہ ہم دنیا کے اکثر حصوں میں پاتے ہیں۔ بلکہ وہ برف کے بلوریں ٹکڑوں کی ایک بہت ہی باریک چادر ہے جس کی دبازت ایک انچ سے بھی زیادہ نہیں۔ چونکہ برف سورج کی شعاعوں کو بخوبی منعکس کر سکتا ہے۔ اس لئے ہم اس چادر کو بڑی آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ جب موسم گرما آتا ہے تو قطبین کے یہ منجمد ورق ٹھوس حالت سے یکایک کہرے اور دھوئیں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

مریخ اور حیات۔ ارد گرد نظر ڈالیے۔ حیات ہر جگہ موجود ہے۔ قطبین کے سرد ترین خطے تپتے ہوئے ریگستان اور صحرا ہوا اور سمندر کی عمیق ترین گہرائیاں اس کے لئے غیر نہیں۔ تو پھر کیا عجب ہے کہ کسی قسم کی حیات مریخ پر بھی آباد ہو۔ چاہے وہ ان جرثوموں کی مانند ہو جن کو صرف خوردبین کی مدد سے دیکھ سکتے ہیں۔ چاہے وہ کسی اور شکل کو اختیار کئے ہوں۔ اس سے ہمیں فی الحال کوئی غرض نہیں۔

نباتات کا وجود اس سیارے پر ضرور ہے۔ مگر اس افراط سے نہیں جس طرح کہ کرۂ ارض پر۔ نباتات بھی کائی پھپھوندی ماس(Moss) اور شاید فرن(Fern) جیسے ادنیٰ پودوں پر مشتمل ہے۔ اسی سلسلے میں ایک نئی سائنس وجود میں آگئی ہے (Astro Botany) یعنی خلائی نباتات۔

جراثیم نما ذی حیات کا مریخ پر آباد ہونا ایک ایسی بات ہے جو قابل اعتبار ہے۔ سائنسی ادب میں ہمیشہ بہتر مصنفین نے اسی قسم کی حیات کو پیش کیا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے حملہ آور مریخیوں کو مکروہ شکل کے جرثومے دکھایا ہے۔ اولاف اسٹیپلیڈن نے بھی انھیں جراثیم ہی دکھایا ہے۔ مگر خوردبینی جو سبز دھند کی طرح چھائے رہتے ہیں اور گروہوں پر مشتمل ہیں، اور ہر گروہ کا دماغ ایک دوسرے سے (Telepathy) کے ذریعے ملحق ہے۔ ایک اور مصنف نے مریخ کو غیر مرئی اجسام سے آباد دکھایا تھا۔

اور یہ بالکل ممکن ہے کہ مریخ پر مندرجہ بالا اقسام میں سے کوئی سی قسم حکمراں ہو۔ کچھ لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ پانی کی عدم موجودگی اور ہوا کی کمی میں حیات کیوں کر زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ اعتراض بالکل غلط ہے۔ کیا مریخی حیات اس قسم کی نہیں ہو سکتی جس کو پانی کی ضرورت نہ ہو۔ ماضی بعید میں شاید مریخ پر سمندروں کا وجود ہو۔ اگر اس زمانے میں حیات موجود تھی تو اس کی زندگی کا ایک اہم تغذیہ پانی ضرور رہا ہوگا۔ آہستہ آہستہ جیسے جیسے پانی کی قلت ہوتی گئی سمندر خشک ہونے لگے (اس تبدیلی میں کم از کم لاکھوں ہی سال لگے ہوں گے) اسی طرح حیات نے اپنے عضویاتی ساخت (Organism) کو ایسا بنا لیا ہوگا کہ آخر میں اس کو پانی کی ضرورت نہیں رہی۔

جب ماحول میں تبدیلی ہوتی ہے تو اس ماحول سے متعلقہ حیات اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ کچھ اعضا کا استعمال بڑھ جاتا ہے اور کچھ اعضا بیکار ہو کر معدوم ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی گذشتہ تاریخ (Geology) اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ گویا ماحول کی تبدیلیاں زندگی پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ نئے اعضاء کی تشکیل شروع ہو جاتی ہے۔ ضروریاتِ زندگی میں بھی تغیر آ جاتا ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پانی کی بتدریج کمی کے ساتھ ساتھ مریخیوں کے اعضا اور ضروریاتِ زندگی بھی تبدیل ہوتی رہیں، اور موجودہ اسٹیج پر پہنچ کر ان کو پانی کی قطعی ضرورت نہیں رہی۔

سائنس چاہے بیان کردہ نظریوں کے متعلق کوئی بھی رائے قائم کرے مگر اسے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ مریخ پر زندگی کا وجود نہیں۔ کیونکہ سائنس خود اب تک رازِ حیات کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ دنیا پر حیات کیوں اور کیسے وجود میں آئی۔ اس کا کوئی تشفی بخش جواب سائنس کے پاس موجود نہیں۔

مریخ کے اسرار ابھی ختم نہیں ہوئے۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں ایک جاپانی اسطرالومر نے مریخ کی سطح پر ایک خاکستری غبار دیکھا۔ غبار یکایک مریخ کی سطح سے بلند ہونا شروع ہوا۔ اسطرالومر کے اندازے کے مطابق ساٹھ میل بلند ہو گیا، اور نو سو میل کے رقبے پر طاری تھا۔ لیکن وہ اس منظر سے زیادہ دیر مستفیض نہ ہو سکا۔ جب بادل چھٹے تو وہ بعید الفہم خاکی غبار غائب ہو چکا تھا۔ کیا مریخی جوہری بم استعمال کر رہے تھے؟ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنے ناول War of the Worlds

کو بھی اسی طرح شروع کیا ہے۔ مریخ کی سطح پر دھماکے ہوتے ہیں جن کے کچھ ہی مدّت بعد نفس نفیس دنیا پر آدارد ہوتے ہیں۔

اسی کتاب سے متعلق ایک مضحکہ خیز واقعہ تیرہ سال ہوئے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پیش آیا تھا اورسن ویلز، ایچ۔ جی۔ ویلز کے ہم نام ایکٹر نے وار آف دی ورلڈس کا ریڈیائی ڈرامہ پیش کیا۔ سننے والوں کی غلطی تھی کہ انھوں نے ڈرامے کے اعلان کو نہیں سنا۔ تمام ملک میں ہیجان و اضطراب پھیل گیا۔ لوگ مکانات چھوڑ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ان کا خیال تھا کہ واقعی مریخیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ کافی مشکل کے بعد حالت قابو میں آسکی۔ لیکن پھر بھی مالی نقصان کافی ہوا۔

مریخ کے گرد و پیش بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ٹیکنیکل اور سائنٹیفک مقالات کے لئے پکرنگ اور لاول کی تصنیفات بہترین ہیں The Planet Mars جسے کچھ عرصہ ہوا فیبر اینڈ فیبر نے شائع کیا تھا۔ اس سے کم درجہ پر Wiley Ley کی Conquest of Space اے۔ سی۔ کلارک کی Interplanetary Travels. اولاف اسٹیپلیڈن Olaf Stapledon کی The Last and First Man مریخ کے متعلق چند بہترین افسانے یا ناول مندرجہ ذیل ہیں۔ ہیوگو گرنسباک کا ناول دی سائنٹیفک ایڈوینچرز آف بیریون مونچہاوزن۔ ویلز کی War of The Worlds سیسل۔ بی۔ وائٹ کے دو افسانے The Return of Martians اور The Retreat of Martians یہ ایک بہت مختصر سی فہرست ہے۔ Raybradbury کا ابھی ایک بہت اچھا ناول شائع ہوا ہے۔ The Silver Locusts اسی مصنف نے Martian Chronicles کے نام سے اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ جو اپنی نظیر آپ ہیں۔

مریخ پر سورج طلوع ہو چکا ہے۔ ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ سورج زردی مائل نظر آرہا ہے۔ آسمان اس قدر تیز نیلا ہے کہ اس پر سیاہی کا دھوکا ہوتا ہے۔ ستارے جگمگا رہے ہیں۔ چاروں طرف ہموار زمین پھیلی ہوئی ہے۔ ہوا بالکل ساکن ہے۔ سُرخ چٹانیں چمک رہی ہیں۔ ان کو زمانہ دراز ہوئے ہوایاں پذیری کے عمل نے تقریباً پست کر دیا تھا۔ بے برگ گیاہ چٹیل میدان پھیلے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ کائی سے گھری ہوئی دلدلیں ایک ابدی موت کا منظر پیش کرتی ہیں۔

شام آجاتی ہے تو پارہ مقیاس الحرارت نیچے گرنے لگتا ہے۔ سردی بڑھ جاتی ہے۔ فوبوس اور ڈیموس آسمان میں طلوع ہو جاتے ہیں۔ ہلکی زرد روشنی پھیل جاتی ہے۔ فوبوس ابن مقتنع کے بنائے ہوئے مصنوعی چاند کی مانند ہے۔ اور تاریک مریخی آسمان میں کسی سحر زدہ کرُے کی مانند اس تیزی سے گھومتا ہے کہ صبح ہونے سے پہلے ایک بار پھر طلوع ہو جاتا ہے۔

یونہی وہ اس پُراسرار سیاّرے کے گرد گھومتا رہے گا۔ اس کی خاموش اور ویران سرزمین کو رات کے وقت روشن رکھے گا۔ خدا جانے مریخ کا طلسم کب ٹوٹے گا۔ اگر نوع انسانی اسی طرح تخریبی عمل میں مبتلا رہی تو اُسے مدّت دراز تک ایسے راکٹ بنانے کی فرصت نہ مل سکے گی جو اس دنیا سے اُڑا کر کسی ماورائی جہان پر پہنچا دیں۔

❖

نادرن ریلوے

قیمتی اشیا ءکا بیمہ

کیا آپ کو معلوم ہے

کہ نادرن ریلوے کے تازہ ٹائم اینڈ فیئر ٹیبل میں۔ جن قیمتی اشیاء کی فہرست درج کی گئی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز ریل کے ذریعے سے دوسری جگہ بھیجنا مطلوب ہو۔ اور اُس کی قیمت تین سو روپے سے زیادہ ہو تو ریلوے اُس وقت تک اُس چیز کے نقصان، ضائع ہو جانے یا پیکیج کے خراب ہونے کی ذمہ دار نہیں ہوگی جب تک کہ بھیجنے والا کرایہ کے علاوہ زرِ انشورنس ادا نہیں کرے گا۔

جنرل منیجر دہلی

شری رام سرنا

افغانستان کی بھیڑیں

بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ کئی ممالک کی مجلسی اور اقتصادی زندگی میں کسی ایک مخصوص ہستی یا شے کو کماحقہ کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے - اس کلیدی حیثیت کے باعث اس مخصوص ہستی یا شے کو کہیں کہیں تو قومی نشان تسلیم کر لیا جاتا ہے - اور کہیں کہیں قومی نشان نہ بن سکنے کے باوجود بھی وہ ایک ایسا محور بن جاتی ہے جس سے قومی زندگی کی کئی شاہراہیں وابستہ ہو جاتی ہیں - یہ کلیدی حیثیت کئی ایک ممالک میں کسی دریا کو حاصل ہوتی ہے جیسے ہندوستان میں گنگا کو - برما میں ایراوتی کو - عرب میں فرات کو - مصر میں نیل کو - مرکزی یورپ میں ڈنیوب کو - اور برطانیہ میں ٹیمز کو - کئی ایک ممالک میں کوہستان بھی اس امتیاز کے مالک ہوتے ہیں - جیسے ہندوستان میں کوہ ہمالیہ اور سوئیٹزرلینڈ میں کوہ ایلپس - کہیں کہیں یہ اہمیت جانوروں کو بھی نصیب ہوتی ہے جیسے آسٹریلیا میں کانگرو - عرب میں اونٹ، ہندوستان میں گائے - اس سے آگے بڑھیں تو جاپان میں ریشم کے کیڑے اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں عقاب اس درجۂ سرفراز پر متمکن نظر آئینگے - اس نظریہ سے دیکھا جائے تو افغانستان کی قومی زندگی میں بھیڑ کو بھی کلیدی حیثیت حاصل ہے - بھیڑ جیسے حقیر مویشی کو یہ بلند مرتبہ جن خصوصیات کے باعث نصیب ہو سکا ان کا بیان ہی یہاں مطلوب ہے -

یہ بتانا تو شاید ضروری نہ ہوگا کہ دیگر ممالک کی مانند افغانستان کو بھی بھیڑوں سے اون حاصل ہوتی ہے - اس اون سے گرم کپڑے، کمبل، چغے (کوٹ جیسی ایک پوشاک) نمدے، جرابیں اور دیگر اشیاء تیار کی جاتی ہیں جو افغانستان جیسے سرد ملک میں اشد ضروری لوازمات ہیں - مزید برآں اندرونی ضروریات پوری ہونے کے بعد فاضلہ اون دیساور کو بھیجی جاتی ہے اور اس تجارت برآمد سے کافی منافع حاصل ہوتا ہے - اون کے علاوہ ان بھیڑوں سے کثیر مقدار میں دودھ بھی حاصل ہوتا ہے - اس دودھ سے گھی، پنیر اور کروت (خشک چھاچھ) طیار کی جاتی ہے - بھیڑ کی چربی کو خوردنی تیل یا گھی کی جگہ کام میں لایا جاتا ہے - بھیڑوں سے حاصل ہونے والے یہ فوائد تو شاید دیگر ملکوں میں بھی حاصل ہوتے ہوں گے - لیکن افغانستان کا امتیاز یہیں ختم نہیں ہو جاتا - وہاں اون سے نمدے شال، قالین اور غالیچے تیار کئے جاتے ہیں - یہ اشیا بہت بیش قیمت ہوتی ہیں اور غیر ممالک میں بھیجی جاتی ہیں - افغانستان کی بدیشی تجارت کافی حد تک ان اونی مصنوعات کی رہین منت ہے - لیکن شال اور قالین تو ہندوستان، پاکستان، ایران، وسطی ایشیا کے ممالک اور ٹرکی میں بھی تیار کئے جاتے ہیں - اس میں افغانستان کی واحد اجارہ داری نہیں - لیکن ٹھہریے - افغانستان کو شہرہ آفاق پوستین کی تجارت میں تو واحد اجارہ داری حاصل ہے - وہاں بھیڑوں کی کھال، میموں کی کھال اور پوستین حاصل ہوتی ہے جس سے ٹوپیاں، دستانے، کوٹ وغیرہ طیار کئے جاتے ہیں - ان حقائق کی روشنی میں یہ تسلیم کئے بغیر چارہ ہی نہیں کہ افغانستان کے مجلسی اور اقتصادی نظام میں بھیڑوں کو کلیدی حیثیت حاصل ہے -

افغانستان کا کل رقبہ ۲۵۰و۰۰۰ مربع میل ہوگا یعنی برطانیہ سے قریباً دوگنا اور فرانس سے کچھ زیادہ - اس رقبہ میں سے صرف ۲۴و۷۰و۰۰۰ ایکڑ ہی قابل کاشت ہیں - دوسرے لفظوں میں سارے ملک کا ۵ء۱ حصہ ہی کارآمد کہا جا سکتا ہے - باقی علاقہ یا تو کوہستان ہے یا صحرائے لق و دق - کاشتکاری صرف شمالی افغانستان میں ہی مرکوز ہے - یہاں بھی قابل کاشت رقبہ کے صرف ۷۰ فیصدی حصہ میں ہی کاشتکاری عمل میں لائی جاتی ہے - اندریں حالات باقی ملک میں زراعت کی جگہ دیگر مشاغل کی طرف زیادہ رجوع کیا جاتا ہے - ان مشاغل میں سے مویشی پالنا بالخصوص بھیڑیں پالنا مقبول ترین مشغلہ ہے - اس کام

ہیں افغانستان کے خانہ بدوش قبائل کی آبادی کا بیشتر حصہ مصروف کار ہے -

افغانستان میں بھیڑوں کی کل تعداد کتنی ہوگی اس کے متعلق کوئی باوثوق اور معتبر اندازہ پیش نہیں کیا جا سکتا - برطانیہ کی کامن ویلتھ اقتصادی انجمن Commonwealth Economics نے ایک غیر سرکاری اندازہ طیار کیا ہے جس میں بھیڑوں کی کل تعداد ۶۰ لاکھ ثابت کی گئی ہے لیکن حال ہی میں ایک اور اندازہ پیش کیا گیا ہے جس میں بھیڑوں کی کل تعداد ۱۹۰ لاکھ اور ۲۰۰ لاکھ کے درمیان بتائی گئی ہے ان میں سے استراخانی یا قراقلی نسل کی بھیڑوں کی تعداد ۳۰ اور ۴۰ لاکھ کے درمیان ہوگی - اسی طرح اون کی کل پیداوار کے شماروں میں بھی تفاوت پائی جاتی ہے - اقتصادی انجمن کے اندازوں میں اون کی کل پیداوار ۱۵۰ لاکھ پونڈ بتائی گئی ہے - لیکن حال ہی میں افغانستان کے سرکاری حلقوں میں یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اون کی کل پیداوار جس میں قراقلی اون شامل نہیں ۷۵۰ لاکھ پونڈ کے قریب ہوتی ہے جس میں سے ۶۰۰ لاکھ پونڈ کمبل اور قالین وغیرہ تیار کرنے کے لئے اندرونی کھپت کے زیر تحت آتے ہیں -

افغانستان میں بھیڑوں کی اس قدر وسیع پرورش سے افغانستان کے جغرافیہ کا بھی گہرا تعلق ہے - اس لئے افغانستان کے جغرافیہ کا تذکرہ بھی یہاں بے جا نہ ہوگا - یہ ملک شمال مشرق اور جنوب میں پہاڑوں کے دراز سلسلوں سے گھرا ہوا ہے اور جنوب مغرب میں صحرائے لق و دق ہے - شمال میں ایشیائی روس واقع ہے - مغرب میں ایران مشرق میں پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ - جنوب اور جنوب مغرب میں پاکستان کا صوبہ بلوچستان - وسطی افغانستان میں بھی چھوٹی چھوٹی بکثرت پھیلی ہوئی ہیں - یہ پہاڑیاں قندھار تک بڑھتی چلی جاتی ہیں - افغانستان اور اس کے پڑوسی ممالک پاکستان (بالخصوص بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ) ایران، روسی ترکستان اور ترکی ایک ایسا خطہ شمار کئے جا سکتے ہیں جو وسط مشرق میں آب و ہوا، جغرافیائی خصوصیات اور دیگر وجوہ سے بھیڑوں کی پرورش اور اونی دستکاریوں کے لئے قدرتاً موزوں ہیں - افغانستان کے تمام پہاڑی سلسلے کوہ ہندوکش سے تعلق رکھتے ہیں - کوہستان ہندوکش کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سراسر خشک ہے برگ و باراں سے خالی - بارش بہت کم ہوتی ہے اس لئے جنگلات بہت کم ہیں - چراگاہیں بھی بکثرت نہیں - گرمیوں میں پہاڑوں کی بلندیوں کو چھوڑ کر باقی ملک میں خوب گرمی پڑتی ہے اور سردیوں میں سارے ملک میں خوب سردی پڑتی ہے - آب و ہوا خشک ہے اس لئے ملک میں پہاڑوں کے ساتھ ریگستان بھی پائے جاتے ہیں - ایسی آب و ہوا میں اور ایسے ملک میں وہی مویشی ٹھہر سکتے ہیں جو جفاکش ہوں - اور بھیڑ کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ ہر قسم کی آب و ہوا میں رہ سکتی ہے - شاید یہی باعث ہے کہ افغانستان میں لوگوں نے وسیع پیمانہ پر بھیڑیں پالنا اختیار کر رکھا ہے - اور بھیڑیں ہیں کہ برفانی علاقوں میں - ریگستانوں میں - پہاڑوں پر اور میدانوں میں یکساں پائی جاتی ہیں -

بھیڑوں کا افغانستان کے اقتصادی نظام میں بھی دور رس دخل ہے - افغانستان کی اقتصادیات کا اگر گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ افغانستان میں بھی دیگر ایشیائی ممالک کی طرح زراعت کا دور دورہ ہے - اور وہ دیگر زراعتی ممالک کی طرح صنعتوں کے معاملے میں ترقی پذیر نہیں بلکہ پسماندہ ہے - اس لئے ضروریات زندگی اور دیگر لوازمات کو اندرونی پیداوار سے پورا کرنے کا ابھی تک کفیل نہیں ہو سکا اور ان لوازم کو حاصل کرنے کے لئے تجارت درآمد کا محتاج ہے تجارت درآمد میں سوتی کپڑا - نیل، رنگ، کھانڈ، چائے، لوہا، دیگر دھاتیں، دھاتوں سے تیار کی گئی اشیاء - تیل، پٹرول، موٹر گاڑیاں، مشینری، اسلحہ، بجلی کا سامان، شیشے کا سامان، سوتی دھاگا، کیمیاوی اشیاء، ادویہ اور بہت سی دیگر اشیا آتی ہیں - ان اشیا میں سے زیادہ تر ہندوستان برطانیہ، ریاستہائے متحدہ امریکہ وغیرہ سے منگوائی جاتی ہیں - دوسری عالمگیر جنگ کے بعد بدیشی تجارت میں برطانیہ کی جگہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دخل زیادہ نمایاں ہو گیا ہے - بدیشی تجارت کے سرکاری اعداد بتاتے ہیں کہ افغانستان کی تمام اندرونی ضروریات کا جو درآمد کی محتاج ہیں ۷۵ فیصدی حصہ امریکہ سے اور باقی ہندوستان (اور آج کل پاکستان کو شامل کرنے کے بعد) سے فراہم کیا جاتا ہے -

یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اس ہمہ گیر تجارت درآمد کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے - اس سوال کا جواب تجارت برآمد کے وسیلے سے ملتا ہے - سرکاری اعداد ظاہر کرتے ہیں کہ افغانستان کو بھیڑ اور بھیڑ سے

حاصل ہونے والی اشیاء اور میوہ جات کی وسیع برآمد سے اتنا سرمایہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی اندرونی ضروریات پورا کرنے کے لئے تجارت درآمد کا کمر توڑ بوجھ بخوبی برداشت کر رہا ہے ۔ حتےٰ کہ بدلیشی تجارت کا میزان لگاتار افغانستان کے حق میں منافع بخش ہوتا ہے ۔ خیال رہے کہ بھیڑ کی وساطت سے بھیڑ کی کھالیں ۔ پوستین ۔ اون، پشم، قالین، غالیچے، شال، نمدے چھینٹے، کمبل اور دیگر کئی اشیا غیر ممالک کو بھیجی جاتی ہیں ۔ بتایا جاتا ہے کہ افغانستان سے اون کی کل برآمد ۴۷-۱۹۴۶ء ۲۳ ۱ لاکھ پونڈ تک ہوتی تھی ۔ اور ۴۹-۱۹۴۸ء میں ۱۰۲ لاکھ پونڈ ۔ ۵۰-۱۹۴۹ء میں یہ دہ مقدار بڑھ کر ۱۵۰ لاکھ پونڈ تک پہنچ گئی تھی اور اس میں سے کثیر تعداد روس کے حصہ میں آئی تھی ۔ اس مرحلہ پر افغانستان کی تجارت درآمد و برآمد کے کے تخمینہ کا مطالعہ بھی موجب دلچسپی ہوگا ۔

افغانستان کی بدلیشی تجارت

(امریکن ڈالروں میں)

سال	تجارت درآمد	تجارت برآمد	میزان
۱۹۳۹	۲۴۳ لاکھ	۲۷۷ لاکھ	+۶۵ لاکھ
۱۹۴۰	۴۱۰ ″	۳۲۸ ″	+ ۸۲ ″
۱۹۴۱	۳۷۰ ″	۴۲۷ ″	− ۵۷ ″
۱۹۴۲	۱۷۴ ″	۲۶۵ ″	− ۹۱ ″
۱۹۴۳	۳۵۵ ″	۲۳۷ ″	+ ۱۱۸ ″
۱۹۴۴	۴۴۲ ″	۲۵۶ ″	+ ۱۸۶ ″
۱۹۴۵	۵۶۵ ″	۴۸۲ ″	+ ۸۳ ″
۱۹۴۶	۶۰۰ ″	۵۳۰ ″	+ ۷۰ ″
۱۹۴۷	۵۴۲ ″	۵۰۰ ″	+ ۴۲ ″
۱۹۴۸	۵۵۰ ″	۵۳۰ ″	+ ۲۰ ″

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان کی بدلیشی تجارت ۱۹۴۱ اور ۱۹۴۲ کو چھوڑ کر لگاتار افغانستان کے لئے منافع بخش ہوتی رہی ہے ۔ یہ منافع ہی افغانستان کے اقتصادی نظام کا روح رواں ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ بدلیشی تجارت سے حاصل ہونے والے منافع کی رقم جمع ہوتے ہوتے ۱۹۴۶ء کے خاتمہ پر اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ۱۹۳۹ء سے پہلے جمع شدہ اندوختہ سے ۵۰۰ کروڑ ڈالر تجاوز کر گئی تھی ۔

افغانستان کی اس تجارت میں ہندوستان کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ اس کا ذکر کئے بغیر یہ مضمون تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا ۔ افغانستان چاروں طرف سے دیگر ممالک سے گھرا ہوا ہے اور اسے سمندر تک پہنچنے کے لئے کوئی راہ جس پر اس کا اپنا اقتدار ہو حاصل نہیں ۔ اس لئے بدلیشی تجارت کے لئے اس کے سامنے دو ہی راہیں کھلی ہیں ۔ ایک ایران سے ہو کر اور دوسری ہندوستان سے ہو کر ۔ تاریخ شاہد ہے کہ افغانستان نے شروع سے ہی تجارت درآمد اور برآمد کے لئے ہندوستان کو وسیلہ بنا رکھا ہے ۔ لہذا افغانستان کا باہر کی دنیا سے جو بھی لین دین ہوتا ہے وہ ہندوستان کی معرفت ہوتا ہے ۔ ایک لحاظ سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان کو بھیڑ سے ہونے والی آمدن کا بالتفصیل اندازہ لگانے کے لئے ایک ترکیب یہ بھی ہے کہ افغانستان اور ہندوستان کے مابین ہونے والی تجارت کے اعداد کا گہرا مطالعہ کیا جائے ۔ ایک سرکاری اندازہ کے مطابق افغانستان سے بھیڑ کی کھالوں اور اونی اشیا کی ہندوستان میں درآمد کی تفصیل یوں ہے

افغانستان سے ہندوستان میں درآمد

رقم سیکڑوں میں

	۴۲-۱۹۴۱	۴۳-۱۹۴۲	۴۴-۱۹۴۳	۴۵-۱۹۴۴	۴۶-۱۹۴۵	۴۷-۱۹۴۶
۱- بھیڑوں کی کھالیں	۴۲۹	۶۴۰	۴۰۵	۴۰۵	۵۱۴	۱۲۲۰
۲- قراقلی بھیڑ کی کھالیں	۴۰۰۶۹	۳۶۸۹	۲۸۱۳	۸۴۹۲۹	۵۶۸۷۸	۲۲۳۹۵
۳- پوستین	۲۰	۱۴	۱۷۴	۵۱	۶۳	۰۰
۴- دیگر کھالیں اور پوستین	۳۵	۲۹	۰۰	۲۹	۱۸۲	۷۷
۵- چمڑے کا سامان	۵۴	۳۶۴	۶۰	۲۸۵	۱۴۸	۱۳۱
۶- اون	۳۱۰۴	۱۹۳۶	۸۲۶	۱۱۳۴	۱۷۷۴	۱۸۳۹
۷- کمبل اور شال	۸	۱	۴	۵	۳	۳
۸- قالین	۲۱۳	۳۶۴	۵۴۲	۴۶۹	۵۰۶۹	۱۷۶۰

اخیر میں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ وہ اقتصادی نظام جو صرف بھیڑ اور بھیڑ سے حاصل ہونے والی اشیاء پر ہی انحصار رکھتا ہو ترقی کا ضامن کہاں تک ہو سکتا ہے ۔ تصویر کا یہ پہلو اگر تاریک نہیں تو مقابلتاً کمزور ضرور ہے ۔ مقام غور ہے کہ افغانستان میں اون کے صرف دو کارخانے ہیں ۔ اتنا ہی

نہیں۔ افغانستان سے برآمد کی جانے والی اشیاء چاہے وہ میوہ جات ہوں اور چاہے اونی لوازم ہوں سامان تعیش سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کی مانگ اور ان کی کھپت کمی بیشی کی روادار ہے۔ اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کے ترقی یافتہ اور امیر ممالک میں سامان تعیش کی کھپت بحیثیت مجموعی ابھی تک مائل بہ تنزل نہیں ہو سکی۔ کبھی برطانیہ کبھی فرانس اور دیگر یورپین ممالک اور کبھی امریکن ممالک ان اشیا کے گاہک بنے ہی رہتے ہیں۔ لیکن دوسری عالمگیر جنگ سے تحریک پاکر افغانستان کی تجارت برآمد کو بیشتر تغیر و تبدّل دیکھنے پڑے ہیں۔ اس صورت حال سے متاثر ہوکر حکومت افغانستان اس فکر میں ہے کہ افغانستان کے اقتصادی نظام کو مضبوط اور ترقی پذیر بنیادوں پر کھڑا کیا جائے۔ یہ ارادہ کامیابی کا روادار صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب صنعتی ترقی کا بندوبست کیا جائے اور بھیڑیں پالنے کے ساتھ ساتھ صنعتی شاہراہوں پر بھی گامزن ہونے کی سعی کی جائے۔ اس مقصد کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے ایک پانچسالہ پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس پروگرام پر ۷۰۰ لاکھ ڈالر خرچ ہوں گے اس گرانقدر رقم کو مہیا کرنے کے لئے اونی سامان، پوستین، اور خشک میوہ جات کی تجارت برآمد سے ۲۷۰ لاکھ ڈالر اور ۲۹۰ لاکھ ڈالر کے درمیان سرمایہ حاصل ہوگا۔ اور باقی رقم جو تقریباً ۵۰۰ لاکھ ہوگی بدیشی ممالک سے قرضہ کی شکل میں حاصل کی جائیگی۔ بتایا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں حکومت افغانستان نے امریکہ کے امپورٹ ایکسپورٹ بنک سے ۲۱۰ لاکھ ڈالر بطور قرضہ حاصل کرنے کا انتظام کر لیا ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ اس پانچسالہ پروگرام کی تکمیل کے بعد افغانستان پسماندگی کی سطح سے بہت اوپر اٹھ جائے گا۔

جواہر لال نہرو

عصر حاضر میں امن کی واحد امید

"قاہرہ کا روزانہ اخبار "الزمان" اپنے افتتاحیہ مقالے میں "سیاست کے جھنڈے" کے عنوان کے تحت پردھان منتری مسٹر نہرو کی شخصیت "امن عالم کی واحد امید" اور "زمانہ حاضرہ کا عظیم ترین انسان" قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ مسٹر نہرو کا نام سنتے ہی انسان کا خیال امن عالم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور یہ کوئی حیرت انگیز بات بھی نہیں ہے کیونکہ وہ نہ صرف ایشیا کے لئے امن کا خواہاں ہے بلکہ اس کا مطمع نظر ہی امن عالم ہے۔ وہ ہمیشہ سے مہاتما گاندھی کے اصولوں پر کاربند رہ کر دنیا میں امن و امان قائم کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہا ہے۔

"الزمان" اخبار نے مزید بیان کیا ہے کہ بھارت برطانوی کامن ویلتھ میں شامل ہونے کے باوجود روس کا بھی دوست ہے اور حکومت چین کو تسلیم کرنے سے اس امر کا ثبوت پیش کیا ہے کہ وہ مغرب اور مشرق دونوں کا رفیق ہے۔ بھارت کے سفیر مقیم چین سردار پانیکار نے کوریا کے قضیہ کو ختم کرنے کے لئے گفت و شنید کا جو آغاز کیا ہے وہ بھی باعث تحسین و آفرین ہے بلاشبہ امن کی ایسی تمام تحریکوں کی تہ میں ایشیا کے عظیم المرتبت انسان مسٹر نہرو کے جذبات کارفرما ہیں۔ مسٹر نہرو ہی کی قیادت میں بھارت نے محکوم اور مظلوم قوموں کی حمایت میں آواز اٹھائی ہے اور اسے سامراجی حکومتوں کے مقابلے میں کھڑا کیا ہے چنانچہ مصر۔ انڈونیشیا۔ لیبیا۔ ٹیونس اور مراکو اس کا بین ثبوت ہیں۔ عالمی امن کے لئے دوسری جنگ کے بعد سے مسٹر نہرو ایک بے نظیر طاقت ہے

اخبار مزید لکھتا ہے کہ یہی وہ باتیں ہیں جو ہمیں کم از کم اس کی زندگی کے کچھ پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ اس نے برطانیہ کی سامراجی حکومت سے جنگ کی اور عیش و عشرت کی زندگی ترک کر کے چودہ سال جیل خانے کی تاریک کوٹھڑیوں میں گزارے۔ فاشیت اور ظلم و ستم سے اسے سخت نفرت ہے اور وفاق عالم کا حامی ہے بھارت کے لوگوں کو اس سے بے انتہا عقیدت ہے اور اس جذبہ کے تحت وہ چار مرتبہ نیشنل کانگرس کا صدر بنا اور حالیہ عام انتخابات میں وزیر اعظم منتخب ہوا۔ مہاتما گاندھی نے اپنے عقیدت مندوں پر واضح کر دیا تھا کہ نہرو ان کا روحانی وارث ہوگا اور درحقیقت نہرو ہی موصوف کا سچا پیرو ہے وہ بھارت کی اقلیتوں کا نگہبان ہے اس کی کابینہ میں دو مسلمان، دو عیسائی اور ایک سکھ وزیر بھی شامل ہیں اور سات مسلمان دیگر ملکوں میں بھارت کے سفیر ہیں۔

ع - م

نئی کتابیں اور رسالے

قطعات و رباعیات اکبر الہ آبادی حصّہ اوّل ۔ تشریح، تبویب و ترتیب بھیّا احسان الحق صاحب، قیمت پانچ روپے آٹھ آنے شائع کردہ بزمِ اکبر کراچی، جلد، جلد پوش، کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ ۔ تقطیع ۱۷×۲۷/۸ ضخامت ۴۰۰ صفحات

بزمِ اکبر کراچی نے اکبر سے متعلق مفید عام لٹریچر شائع کرنے میں جس ہمّت اور حوصلے کا ثبوت دیا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی ۔ اردو کے مصنف اس زمانے میں کس مپرسی کے عالم میں ہیں لیکن اکبر بڑے خوش نصیب واقع ہوئے ہیں کہ بزمِ اکبر کراچی ان کی عقیدت مند بھی ہے اور طرفدار بھی ۔ (ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں) ۔ یہ حسین و جمیل مجموعہ بھی خیر مقدم کا مستحق ہے ۔

اقبال کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی ۔ مرتب ڈاکٹر ظہیر الدین احمد الجامعی ۔ کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، جلد پوش عمدہ قیمت تین روپے فی جلد ملنے کا پتہ ۔ اشاعت محل دار السلام کوچہ مسجد قطب شاہی قدیم ملک پیٹ حیدر آباد دکن، تقطیع ۱۷×۲۷/۸ ضخامت ۱۳۲ صفحات، مرتّب کے طرزِ انشا میں ایک خاص صلاحیت و استواری ہے ۔ وہ اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں خانقاہی جمود اور فکری کساد کے مخالف ہیں ۔ ایک عقیدت مند ہم عصر تنقید کا پورا حق کہاں تک ادا کر سکتا ہے اسے اہلِ نظر جانتے ہیں ۔

اس کتاب میں اقبال کے وہ اقوال جس میں اس کی شخصیت کی بلندی کا عکس ہے جگہ جگہ مرتب کے محاکمے کے ساتھ نظر آئیں گے ۔

ادب اور نفسیات ۔ مصنف شکیل الرحمٰن، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۲۴۰ صفحات ۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد پوش عمدہ، جلد گوارا، قیمت دو روپے تیرہ آنے ۔ ملنے کا پتہ ۔ اشاعت گھر پٹنہ نمبر ۴

یہ کتاب شکیل الرحمٰن کے انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے شکیل الرحمٰن کے مضامین پڑھ کر یہ اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کو ایک اچھا تنقید نگار اور ادیب مل رہا ہے ۔ اس نوجوان نے ترقی پسند تنقید میں بہت مفید اور قابلِ قدر اضافہ کیا ہے ۔ یہ خود غور و فکر سے ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے خوگر ہیں اور اپنی تنقیدوں میں دوسروں کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں ۔ نیاز فتحپوری، سید احتشام حسین اور فراق گورکھپوری نے اس کے مقالات کو سراہا ہے ۔ ادب اور نفسیات، اردو ادب اور فسادات، ترقی پسند ادب اور غزل اچھے مقالات ہیں اور سلجھے ہوئے مذاق کا ثبوت دیتے ہیں ۔

صفینے ۔ ابر احسنی گنوری کی نظموں کا مجموعہ، قیمت دو روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ ۔ دفتر ماہنامہ احسن رام پور (یو ۔ پی) کاغذ، کتابت، طباعت، جلد اوسط تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۷۶ صفحات ۔

ابر احسنی صاحب حضرت احسن مرحوم کے شاگرد رشید اور خاندانِ داغ کے چشم و چراغ ہیں ۔ اب تو بفضلہٗ خود بھی اُستاد ہیں اور ہندوستان کے ہر گوشے میں آپ کے شاگرد موجود ہیں ۔ ابر صاحب بڑے خوش گو اور اصولِ فن کی سختی سے پابندی کرنے والے شاعر ہیں ۔ آپ کا کلام بتدیوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گا ۔ آپ نثر بھی بڑی شگفتہ لکھتے ہیں ۔ کتاب کے آخر میں آپنے اپنے حالات اپنے قلم سے لکھے ہیں ۔ یہ شگفتہ نثر کا ایک نادر نمونہ ہے ۔ ہر صاحب ذوق سے ہم اس کتاب کے مطالعے کی سفارش کریں گے ۔

موصولات ۔ چھوئی موئی (افسانے) نوشتہ عصمت چغتائی، قیمت پونے چار روپے ملنے کا پتہ ۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ اپالو بندر ۔ بمبئی ۱

گیت اور انگارے (افسانے) مصنف دیویندر اسر قیمت دو روپے ملنے کا پتہ ۔ آزاد کتاب گھر ۔ کلاں محل ۔ دہلی ۔

عورتیں مُرا نہ مانیں (ناول) مصنفہ علی مطاہر جعفری قیمت پونے تین روپے ملنے کا پتہ ۔ کتاب منزل لاہور

رسالے

ماہنامہ ناول نمبر ۱ ۔ بازاری مصنف قیسی رام پوری قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے نمبر ۲ ۔ خونی مصنف مرزا رسوا ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ ۔ منیجر "ناول" ہال اسٹریٹ صدر کراچی ۳

خاور ۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ادارت میں صالح ادب کا حامل یہ رسالہ ڈھاکہ سے شائع ہو رہا ہے ۔ چندہ سالانہ چھ روپے ملنے کا پتہ ۔ رمنا ۔ ڈھاکہ مشرقی بنگال ۔

رفتارِ زمانہ

کوریا کے متعلق بھارت کا رویّہ

بھارت پارلیمنٹ میں شری کے وینکٹا رمن کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے اعلان کیا کہ کوریا میں فوجی کارروائیوں سے بھارت سرکار کا کوئی تعلق نہیں۔ بھارت امن کا علمبردار ہے۔ اس لئے وہ کسی حالت میں بھی جنگ کی حمایت نہیں کر سکتا اور وہ تمام مسائل کو باہمی بات چیت سے حل کرنے کا خواہشمند ہے۔ پردھان منتری نے یالو کے کارخانوں پر متحدہ اقوام کے ہوائی حملوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی کارروائیوں سے دنیا کا امن خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ کوریا کے بارے میں جو بات چیت ہو رہی ہے اس کے نتیجے کے طور پر بیشتر مسائل تو حل ہو چکے ہیں۔ لیکن کچھ باتیں ابھی تک طے نہیں ہو سکیں۔ ان مسائل کے حل ہونے کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی تو یہ امر دنیا کے لئے نہایت افسوسناک ہوگا۔

چین میں بھارت کے سفیر کی تقریر

چین میں بھارت کے سابق سفیر سردار کے ایم پانیکار نے بھارت سرکار کی خارجی پالیسی سے متعلقہ اپنی ایک نشری تقریر میں کہا کہ چین کے تئیں بھارت کی پالیسی میں دو باتیں بہت اہم رہی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی سپرٹ کو بڑھائیں اور دوسری بات یہ کہ چین اور دوسرے ممالک کے درمیان اچھے تعلقات پیدا ہوں۔ یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ کوریا کی کئی خطرناک منزلوں میں بھارت کی مداخلت سے نتائج نہایت اچھے برآمد ہوئے اور جنگ کا خطرہ کم ہو جانے میں مدد ملی۔ سردار صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جنگ زدہ ممالک میں کسی ایک پارٹی کی حکومت تسلیم کرنے سے پہلے بھارت سرکار نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اس پارٹی کو عوام کی حمایت حاصل ہو۔ کوریا اور ہند چین میں کسی ایک پارٹی کو تسلیم کرنے کی ہم نے جلدبازی نہیں کی۔ جہاں تک جاپان کا تعلق ہے بھارت سرکار کی شروع ہی سے یہ رائے تھی کہ چین کو الگ رکھ کر جاپان کے ساتھ کیا ہوا کوئی بھی سمجھوتہ نہ صرف دیرپا نہ ہوگا بلکہ نقصان دہ بھی رہے گا۔ ہماری خارجی پالیسی کی کامیابی کا ایک اچھا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ برما۔ انڈونیشیا اور دیگر ایشیائی ممالک کے ساتھ بھارت کے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں۔

ایرانی وزارت میں تبدیلی سے شورش

ایران میں وزارتی تعطل سے ملک میں بدامنی کا دور دورہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر مصدق کی طرف سے وزارتِ عظمیٰ کی مشروط پیشکش کو نامنظور کرنے کے بعد ایم قوام السلطنتہ وزیر اعظم مقرر ہوئے لیکن ان کے تقرر کے ساتھ ہی ملک میں گڑبڑ شروع ہو گئی، جس سے کئی اشخاص ہلاک و زخمی ہوئے۔ اب سرکاری طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ ایم قوام السلطنتہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ اور ڈاکٹر مصدق نے وزیر اعظم بننا منظور کر لیا ہے۔

پیٹرول کے جھگڑے کے سلسلے میں برطانیہ نے بین الاقوامی عدالت میں ایران کے خلاف جو مقدمہ دائر کر رکھا تھا، اس سلسلے میں بین الاقوامی عدالت نے کہا ہے کہ وہ اس بات میں دخل دینے کی مجاز نہیں۔

مصر میں وزارتی تبدیلیاں

مصر کے سابق وزیر اعظم مسٹر ہلالی پاشا نے نئی وزارت بنانا منظور کر کے نئی وزارت کا اعلان کر دیا ہے۔ سابق وزیر اعظم حسین سرّی پاشا یورپ روانہ ہو گئے ہیں۔ تھوڑی ہی مدت میں مصر میں کئی وزارتیں بنی اور ٹوٹی ہیں۔ کچھ دن پہلے جب ہلالی پاشا نے وزارت مرتب کی تو وفد پارٹی کی سخت مخالفت کی وجہ سے وہ وزارت زیادہ دن نہ چل سکی۔ اب نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نئی وزارت بھی دیرپا رہے گی یا نہیں۔

مزدوروں کے مکانوں کے لئے بھارت سرکار کی مالی امداد

مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے بھارت سرکار کافی کوشش کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں نئے قوانین اور تدبیریں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ یو۔پی میں مزدوروں کی ایک خاص شکایت یہ تھی کہ ان کو رہائش کے لئے نہایت ناقص قسم کے مکان ملے ہوئے ہیں۔ اب بھارت سرکار نے مزدوروں کو اچھے مکان مہیا کرنے کے لئے یو۔پی سرکار کو ۵۰ لاکھ روپیہ دینا منظور کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس رقم سے مکان بہتر بنانے میں کافی مدد ملے گی۔

زندگی بھر کے لئے

پنشن

کیا آپ ایسی ملازمت، تجارت یا کاروبار میں ہیں جہاں پنشن کا انتظام نہیں ؟

آپ بھی اِس آسان اور اپنی مدد آپ کرنے کی روپیہ لگانے والی اسکیم کے ذریعے زندگی بھر کے لئے پنشن حاصل کر سکتے ہیں

ابھی شروع کر دیجئے۔ آپ اگلے بارہ سال کے لئے ہر ماہ اگر ۱۵۰ روپے کے بارہ سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ خریدتے رہیں تو ۱۹۶۴ء کے بعد ہر ماہ ایک سرٹیفکیٹ کی میعاد پوری ہوتی رہے گی۔ اس کے بعد ہر ماہ ایک سرٹیفکیٹ کو بھناتے رہیئے اور ۷۵ روپے کا بیاج بطور پنشن حاصل کرتے رہیئے اور ۱۵۰ روپے کے زرِ اصل سے پھر سرٹیفکیٹ خریدیئے۔ اس طرح ۱۹۶۴ء کے بعد آپ کو ۷۵ روپے ماہوار کی متواتر آمدنی ہوتی رہے گی اور اس کے علاوہ آپ کے قبیلے کے لئے آپ کے پاس ۲۱۶۰۰ روپے کی رقم جمع ہو جائے گی۔ آج ہی شروع کر دیجئے اور بارہ سال تک ہر ماہ ایک سرٹیفکیٹ خریدتے رہیئے

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹس

دُور اندیش لوگوں کا مستقبل محفوظ ہے

یہ سرٹیفکیٹس بموجب نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ قواعد ۱۹۴۴ء (معہ اصلاحات) جاری ہیں
مزید تفصیلات کے لئے نیشنل سیونگز کمشنر، شملہ - ۳ - کو لکھیں۔

AC 399

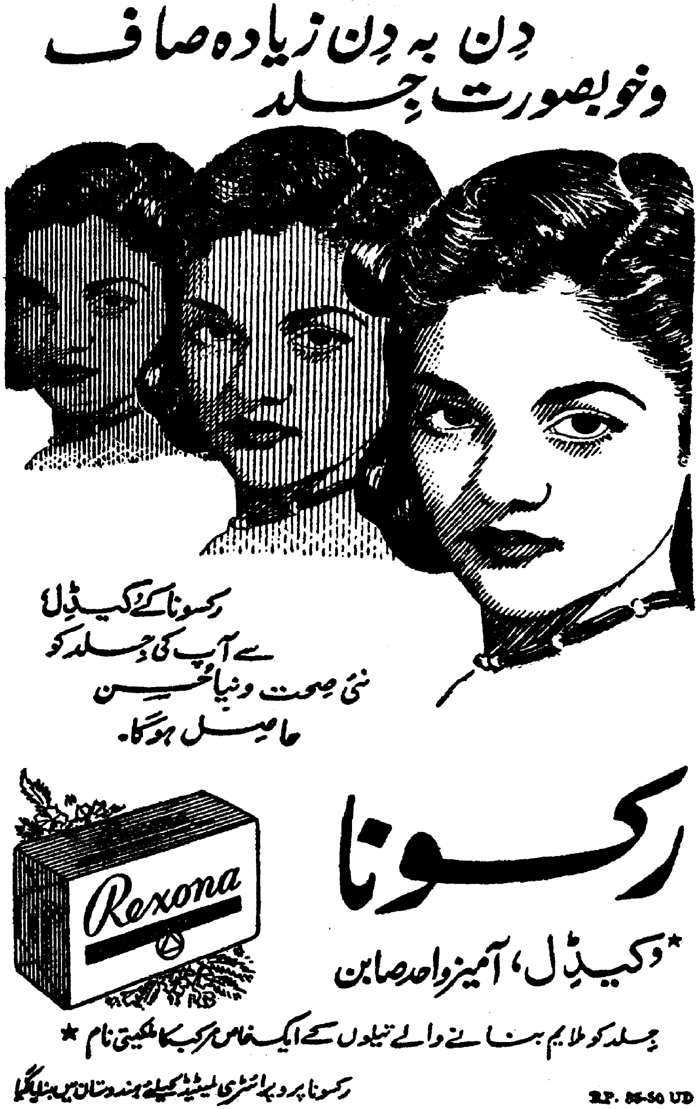
دِن بہ دِن زیادہ صاف
وخوبصورت جِلد
رکسونا کے کیڈِل
سے آپ کی جِلد کو
نئی صِحت ونیا حُسن
حاصِل ہوگا۔
Rexona
رکسونا
*وکیڈِل، آمیز واحد صابن
جِلد کو ملایم بنانے والے تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام *
رکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا
R.P. 86-50 UD

Regd. No. E P - 689

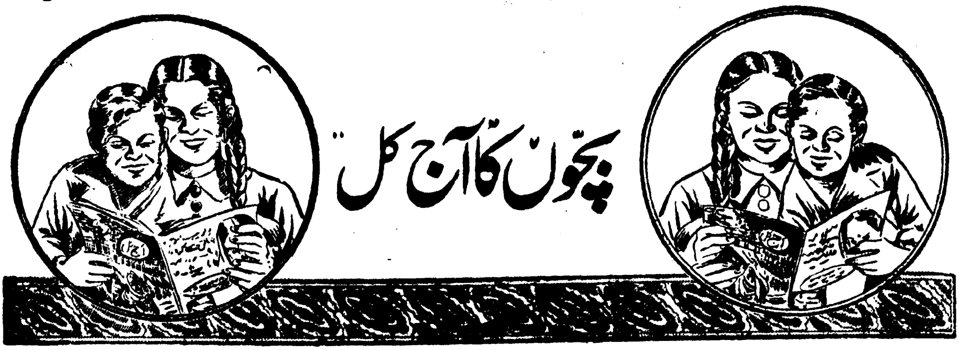

وشوا ناتھ درد

راشٹریہ گیت

بھارت میں رُت آئی سُہانی

بھور بھئی اندھیارا بھاگا   گہری نیند سے مانو جاگا
بول رہے ہیں پنکھ پکھیرو   میٹھی میٹھی امرت بانی

بھارت میں رُت آئی سُہانی

پھیل گئی اوشا کی لالی   جاگ اُٹھے دھرتی کے والی
آؤ گائیں گیت خوشی کے   جیون پر ہے نئی جوانی

بھارت میں رُت آئی سُہانی

بُھول کے پچھلی سب گھٹنائیں   اس جیون کو مدھر بنائیں
کرودھ کپٹ کے پتھ کو تیاگیں   پریت ہے اپنی ریت پُرانی

بھارت میں رُت آئی سُہانی

شارق علوی پھلواروی

نینی تال

ہندوستان کے پہاڑی مقاموں میں نینی تال بلحاظ آب وہوا اور خوبصورتی کے خاص حیثیت رکھتا ہے اور ہم اس کو دنیا کے پہاڑی مقامات کے مقابلے میں لا سکتے ہیں۔ انگلستان کا ونڈرمیر، آئرلینڈ کا کلارنی، سوئٹزرلینڈ لیکرن اور امریکہ کی بہترین جھیلیں اس کے سامنے مات ہیں۔ یہاں کی بہترین صحت بخش و خوشگوار آب وہوا حیرت انگیز مناظر وفضا اور آمد و رفت کی سہولتیں لوگوں کو کشاں کشاں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

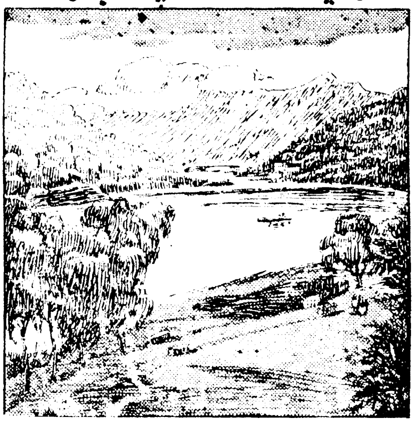

نینی تال کاٹھ گودام اسٹیشن سے بائیس میل کے فاصلے پر واقع ہے جہاں لکھنو، بریلی اور آگرہ سے سیدھی ٹرینیں آتی ہیں۔ کاٹھ گودام سے نینی تال جانے کے لئے موٹر بس ملتی ہے جو کہ پہاڑی راستے کو پار کرتی ہوئی نینی تال پہنچتی ہے اس سڑک کا شمار دنیا کی بہترین سڑکوں میں ہوتا ہے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر اس طرح بنائی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک سانپ لہراتا ہوا نیچے سے اوپر چڑھتا چلا جاتا ہے

نینی تال کی دریافت ۱۸۴۱ء میں پی بیرون نامی ایک تاجر نے کی تھی جو یو پی کے شاہجہان پور ضلع میں تجارت کرتے تھے یہ کمایوں میں واقع ہے۔ کمایوں تین اضلاع نینی تال، الموڑہ اور گڑھوال پر مشتمل ہے زمانہ قدیم میں کمایوں چھوٹے چھوٹے حصّوں میں بٹا ہوا تھا۔ برسوں کی لڑائی اور جد و جہد کے بعد یہ "چاند راجاؤں" کے اقتدار میں آگیا جن سے بعد میں انگریزوں نے چھین کر اپنا قبضہ کر لیا شروع میں نینی تال پہاڑوں پر جھیل کے ارد گرد درختوں کا ایک وسیع جنگل تھا۔ ۱۸۴۳ء سے یہاں لوگ آکر رہنے لگے اور رفتہ رفتہ مکانوں کی تعمیر شروع ہوئی۔ غدر ۱۸۵۷ء میں نینی تال انگریزوں کی جائے پناہ تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے مکمل اقتدار کے بعد یہ یو پی کا سرمائی دارالحکومت بنا دیا گیا۔

ہندوستان کا کوئی بھی پہاڑی مقام اتنی محدود سی جگہ میں ناقابل بیان خوبصورتی کا مرکز نہیں ہے جیسا کہ نینی تال۔

یہاں دو پہاڑ ہیں جن کے درمیان خوبصورت سا تالاب ہے جس کو ایک میل لمبی ایک چوڑی سڑک (مال روڈ) چاروں طرف

سے گھیرے ہوئے ہے تالاب کے جنوب کی جانب کے پہاڑ کا نام 'ایار پاٹھا' ہے اور اتری سمت کے پہاڑ کو 'چینا' کہتے ہیں ۔ ایار پاٹھا پر گورنمنٹ ہاؤس ٹفن ٹاپ وغیرہ اور چینا پر 'چینا پیک' پرانا گورنمنٹ ہاؤس پولیس لین ۔ بھوالی بھیم تال اور ستتال وغیرہ ہیں ۔

چینا پیک تفریح کی خاص جگہ ہے یہاں سے مطلع صاف ہونے پر ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں صاف نظر آتی ہیں۔

نینی تال سے صرف سات میل کی دوری پر بھوالی واقع ہے جس کی اونچائی سطح سمندر سے ۵۶۰۰ فیٹ ہے ۔ بھوالی تپ دق کے سینیٹوریم کے لئے مشہور ہے اور پورے شمالی ہندوستان میں تپ دق کے علاج کی سب سے موزوں جگہ ہے یہاں سے ہمالیہ کے بہترین اور مشہور پھلوں کی بھی برآمد ہوتی ہے ۔

کاٹھ گودام سے تیس میل اور نینی تال سے چودہ میل کے فاصلے پر خوبصورت جھیل بھیم تال ہے جو کہ نینی تال کی پہاڑی جھیلوں میں خوبصورتی میں دوسرے نمبر پر ہے ۔ بھیم تال میں بھمیشر مہادیو کا ایک پرانا مندر واقع ہے جسے راجہ برج بہادر چند نے تعمیر کرایا تھا ۔ یہاں سے ڈھائی میل کی دوری پر نوکونوں کا نوکچیا تال ہے جو کہ لوٹس اور سرخ آبی للی کے پھولوں سے گھرا رہتا ہے اور مچھلی کے شکار کی بہترین جگہ ہے ۔

نینی تال سے گیارہ میل اور بھیم تال سے دو میل کی دوری پر سات خوبصورت جھیلیں ہیں جن کو عموماً 'ست تال' کہتے ہیں ان میں سے نل دمیانتی تال' 'رام تال' 'لکشمن تال' اور 'سکھ تال' زیادہ مشہور ہیں۔

نینی تال جون، ستمبر اور اکتوبر میں آدمیوں سے بھر جاتا ہے اس کے بعد یہاں سے لوگوں کے چلے جانے پر ایک دم اُجاڑ سا ہو جاتا ہے ۔

یہاں دو بازار بھی ہیں ملّی تال اور تلّی تال ۔ ملّی تال نمبر ا ہے اور یہاں کی دوکانیں انگریزی وضع کی ہیں اور تلّی تال جو لاری اسٹینڈ کے کے پاس ہے چھوٹا ہے اور یہاں ترکاری گوشت واجناس کی دوکانیں ہیں۔

اگر آپ نینی تال محض تفریحاً جائیے تو یقیناً آپ کی تفریح کا کافی سامان وہاں موجود ہے ۔ جھیل کے کنارے میونسپل لائبریری آپ کو عمدہ سے عمدہ کتابیں فراہم کرتی ہے جھیل کی کشتیوں پر بیٹھ کر ان کو اُدھر اُدھر دوڑانا اور جھیل میں تیرنا ایک خاص تفریح ہے ۔ جھیل کے چاروں طرف روش پر گھوڑے کی سواری ایک خاص لطف دیتی ہے جھیل ہی سے متصل 'فلیٹ' ایک چھوٹا سا میدان ہے ۔ نینی تال کا ایک خاص مقام ہے جہاں شام کو لوگ اکٹھا ہوتے ہیں اسی کے قریب اسکیٹنگ ہال ہے جو کہ نوجوانوں کے لیے باعث تفریح بنا رہتا ہے اس کے ایک طرف گھوڑا اسٹینڈ اور دوسری طرف سینما ہال بھی ہے ۔ فلیٹ کھیل کود سے دلچسپی رکھنے والوں کا مرکز ہے ۔ یہاں ہر روز ہاکی، فٹ بال وغیرہ کے میچ ہوا کرتے ہیں ۔ ٹینس نینی تال میں کھیلنا لوگ پسند کرتے ہیں ۔

مختصر یہ کہ گو عام طور سے ہندوستان کے ہر پہاڑی علاقے کو "پہاڑوں کی ملکہ" ہونے کا دعویٰ ہے لیکن نینی تال کو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے ۔

واحد اور جمع

اُستاد ۔ پانی کی جمع کیا ہے ؟
شاگرد ۔ جناب برف ۔

اُستاد ۔ 'بچے' واحد ہے یا جمع ۔
شاگرد ۔ کھیل تماشے کے وقت جمع ہو جاتے ہیں ۔

صفدر عباس نقوی

آلو کی قتلی

ایک لڑکے کو پڑھنے لکھنے کا شوق بالکل نہیں تھا۔ گھر سے بستہ لے کر جاتا تھا۔ لیکن راستے میں کھیلنے لگتا تھا۔ اسکول نہیں جاتا تھا۔ گھر والے سمجھتے تھے کہ بچّہ اسکول گیا ہے۔ شام کے ناشتے کے لئے اچھی اچھی چیزیں پکتی تھیں اور اس بچّے کے لئے رکھی جاتی تھیں۔ پڑھنے والا بچہ جو تھا۔

ایک دن اس کی ماں نے آلو کی قتلیاں تلی تھیں۔ اور انہیں لڑکے کے لئے رکھ لیا تھا۔ کہ اسکول سے آئے گا تو کھائے گا۔ لڑکا اسکول نہیں گیا تھا۔ اِدھر اُدھر کھیل کود کر گھر آ گیا تھا۔ امّاں نے کہا "بیٹا لو یہ آلو تلے ہیں کھاؤ"۔ بہن رونے لگی "میں کھاؤں گی"۔ امّاں نے اسے مارا اور کہا "بھیّا کو کھانے دے وہ پڑھ کر آیا ہے"۔

لڑکے نے آلو کی ایک قتلی اٹھائی۔ اسے مُنہ میں رکھنا چاہا۔ قتلی تڑپ اٹھی۔ کہنے لگی "پہلے میری کہانی سُن لو۔ پھر جی چاہے تو کھا لینا"۔ لڑکے نے کہا۔ "سُناؤ"۔

آلو کی قتلی کہنے لگی۔ "میری کہانی بہت بڑی ہے۔ سنو گے کیا؟" لڑکے کو کہانیاں سُننے کا بہت شوق تھا۔ کہنے لگا "سناؤ"۔

آلو کی قتلی نے کہنا شروع کیا۔

"جنوری کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ایک کسان میرے باپ کو اور اس کے ساتھ بہت سے بھائی بندوں کو خرید کر لایا۔ وہ سب بوری میں بند تھے۔ پھر انہیں کڑاکے کی سردی میں ایک پہاڑی کھیت میں لے گیا۔ وہاں ان کو کاٹ کاٹ کر کئی کئی ٹکڑے کئے۔ پھر ان کو خُوب کھُدی ہوئی زمین میں مینڈھیں بنا کر دبا دیا۔ بہت دن دبے رہے۔ کسان ان مینڈھوں کے بیچ کی نالیوں میں پانی بھر دیتا۔ پھر ہماری اماں باہر نکل آئیں۔ کسان نے اسے پودا کہا۔ جاڑا کم ہو رہا تھا۔ امّاں نالیوں کا پانی پی پی کر خوب موٹی ہو گئیں۔ ابّا تو مر گئے تھے۔ زمین میں دبے دبے گل سڑ گئے تھے۔ ابّا کا یہ حال مجھے امّاں نے ہی بتایا تھا"۔

پھر میں پیدا ہوا۔ میرے ساتھ اور بھی بہت سے بھائی تھے۔ ہم سب زمین کے اندر ہی دبے رہے۔ ایک دن میں نے سوچا اس کوٹھڑی سے باہر نکلوں۔ دیکھوں تو باہر کی دنیا میں کیا ہے۔

میں نے سر باہر نکالا ہی تھا کہ کسان نے دیکھ لیا۔ اور بہت سی مٹی میرے اوپر ڈال دی۔ میرے ساتھ اماں کو بھی آدھا زمین میں گاڑ دیا۔ ہم لوگ کئی مہینے تک یونہیں مٹی میں دبے پڑے رہے۔ میں پھر باہر نکلنے کو ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ کہ ایک تیز سی چیز میرے سر پر سے گزر گئی۔ یہ ظالم کسان کی کھرپی تھی۔ اس نے ہم سب کو باہر نکالنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے اس اندھیرے اور مٹی کے بوجھ سے تو چھٹکارا ملا۔ لیکن میری پیاری اماں مجھ سے چھوٹ گئیں۔ سنا ہے کہ ظالم کسان نے انہیں اپنے بیلوں کے سامنے ڈال دیا اور وہ بیل انہیں چبا کر کھا گئے"۔

اب میرے ماں باپ دونوں مر گئے۔ اور مصیبتوں کا پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ ظالم کسان نے مجھے اور میرے بھائیوں کو ایک ساتھ ڈھیر میں ڈال دیا۔ بہت بوجھ تھا۔ اب ہم لوگوں کو بوروں میں بھرا گیا۔ اور گاڑی میں لاد کر لے چلے۔ معلوم ہوا کہ کسان نے ہمیں کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ پھر ہمیں ریل گاڑی میں لادا گیا۔ جس بورے میں میں تھا وہ سب سے نیچے تھا۔ میں بوجھ سے دبا جاتا تھا۔ سارا جسم دکھنے لگا۔ پھر دہلی کا اسٹیشن آیا۔ ہمیں اتارا گیا۔ اور سبزی منڈی لایا گیا۔ وہاں پھر سب بورے کھولے گئے۔ اس مرتبہ میں سب سے اوپر تھا۔ میں بہت خوش تھا۔ کھلی ہوا اور آزاد۔ خوب اچھل کود مچائی۔ دو تین مرتبہ ڈھیر پر سے نیچے گر گیا۔ اتنے میں ایک آدمی آیا۔ میری طرف اشارہ کر کے ہمارے مالک سے باتیں کرنے لگا۔ میں ڈر گیا کہ کہیں ہمارا مالک ناراض ہو کر اس کے ہاتھ نہ بیچ دے۔ وہی ہوا۔ ہمارے مالک نے کچھ اور بھائی بندوں کے ساتھ مجھے بھی اس آدمی کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ آدمی ایک دوکاندار تھا۔ اس نے ہم لوگوں کو اپنی دوکان پر لا کر رکھ لیا۔ وہاں سے آج صبح تمہارے ابا مجھے خرید لائے"۔

اتنا سن کر اس لڑکے نے اس قتلی کو کھانا چاہا۔ لیکن وہ قتلی چلائی "میاں لڑکے تم بہت اچھے ہو۔ جہاں تم نے میری اتنی بڑی کہانی سنی ہے تھوڑی سی اور سن لو۔ ابھی میری تکلیفیں ختم نہیں ہوئی ہیں"۔

لڑکے نے کہا۔ "جلدی کہو۔ مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے"۔

قتلی نے کہا۔ "شکریہ میاں لڑکے لو سنو"۔

"تمہاری اماں نے بھی میرے اوپر بہت ظلم کیا ہے۔ انہوں نے چاقو سے میری کھال اتار ڈالی۔ پھر میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ اتنی تکلیف میں نے کبھی نہیں اٹھائی تھی۔ میں نے سمجھا اب سے بھی زیادہ اور کیا تکلیف ہوگی۔ لیکن انہوں نے میرے کٹے ہوئے جسم پر نمک مرچ لگایا۔ اور پھر کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا۔

میرا تمام جسم جل گیا۔ اور پھول گیا۔ اب میں تمہارے ہاتھ میں ہوں۔ اتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں میں نے۔ اب میں تمہارے پیٹ میں چلی جاؤنگی اس کمرے میں ٹھاٹھ سے آرام کروں گی۔ بس اتنی درخواست ہے کہ ذرا زور سے اور جلدی جلدی نہ چبانا۔ آہستہ چبانا۔ تم بہت اچھے لڑکے ہو"۔

آلو کی قتلی نے اپنی کہانی ختم کر دی تو لڑکا سوچنے لگا کہ سچ ہے۔ تکلیفیں اٹھانے کے بعد آرام ملتا ہے۔ میں بھی روز مدرسے جاؤں گا چاہے وہاں تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ پھر پڑھ کر بڑا آدمی بنوں گا۔ پھر وہ لڑکا روز مدرسے جانے لگا۔ اس نے پڑھنے لکھنے میں خوب محنت کی۔ اب وہ اپنے اسکول کا سب سے اچھا لڑکا ہے۔

وی رام چندرا ریڈی

گورکھوں کا گھر

ہندوستان کے نقشے میں ہمالہ کی جنوبی ڈھلانوں پر ہمیں ایک چھوٹا سا ملک نیپال نظر آئے گا۔ یہی بہادر گورکھوں کا گھر ہے۔

گورکھوں کو تو تم نے دیکھا ہی ہوگا۔ ہاں! وہی چوڑے چکلے بلوان دیسے آدمی جو ہماری فوج میں نظر آتے ہیں۔

نیپال ہند کا پڑوسی ہونے کے علاوہ ایک پرانا دوست بھی ہے۔ اس کے متعلق کئی ایک کہانیاں مشہور ہیں۔ مہابھارت اور تنتر شاستروں میں اس کا ذکر کئی جگہ آتا ہے۔ ہندو گرنتھوں کے مطابق اس جگہ ایک بڑا سمندر تھا جسے وشنو نے خشکی میں تبدیل کر دیا۔ بودھ گرنتھوں میں بھی لگ بھگ اسی طرح کی روایتیں ہیں۔ مہاتما گوتم بدھ نے نیپال ہی میں جنم لیا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ مرے بھی یہیں۔ اس لئے یہ بودھوں کا بڑا پوتر استھان ہے۔ سارا ملک مندروں اور تیرتھ گاہوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق نیپال میں کوئی ۲۷۰۰ مندر اور تیرتھ گاہیں ہیں۔

نیپال پہنچنے کے لئے ہمیں راکزال (راتری بہار) سے نیپالی سرکار کی ریل میں سوار ہونا پڑتا ہے۔ یہ ریل ہمیں پہلے بیر گنج پہنچاتی ہے جو نیپال کی سرحد پر ایک چھوٹا سا شہر ہے پھر یہاں سے ۳ گھنٹے کے عرصہ میں ترائی کے جنگلوں میں سے گزر کر املیکھ گنج پہنچتے ہیں جو راکزال سے ۲۴ میل پر واقع ہے۔ املیکھ گنج ریلوے سڑک کی انتہا ہے۔ یہاں سے موٹر لاری کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ۲۵ میل سفر کرنے کے بعد ہم بھیم پھیڑی ملتا ہے۔ یہاں سے ہمیں بالکل پیدل یا کسی گھوڑے پر سفر کرنا پڑتا ہے۔ ۲۰ میل چلنے کے بعد ہم کھٹمنڈو پہنچتے ہیں جو نیپال کی راجدھانی ہے۔

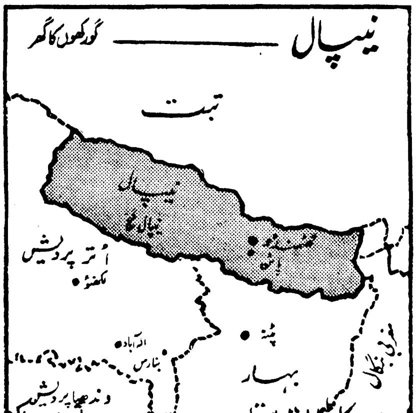

شمال میں نیپال کی سرحدیں تبت سے ملتی ہیں تو جنوب میں گنگا کے میدان سے۔ اس کا رقبہ ۵۴ ہزار مربع میل۔ لمبائی ۵۰۰ میل اور چوڑائی ۱۰۰ میل ہے۔ اس کی آبادی کوئی ۵۰ لاکھ ۶۰ ہزار ہے۔ پہاڑیوں اور گھاٹیوں سے بھرے ہوئے اس دلکش ملک میں ہر قسم کی آب و ہوا اور ہر قسم کے قدرتی نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

گوری شنکر یا ماؤنٹ ایورسٹ جو تمام دنیا میں سب سے بلند چوٹی مانی گئی ہے کچھ نیپال میں ہے اور کچھ تبت میں۔ اس کے علاوہ کنچن جنگا اور دھول گری کی مشہور چوٹیاں نیپال ہی میں ہیں۔ گھاگرا

گنڈک، کوسی اور کرنالی نیپال کے مشہور دریا ہیں جو گھاٹیوں میں سے بہتے ہوئے دریائے گنگا سے جا ملتے ہیں ـــــ ترائی کے علاقے میں چونکہ بارش اور دریا خوب سیراب کرتے ہیں اس لئے چاول، جوار، گیہوں، باجرا نیشکر، کپاس، تمباکو، دالوں اور تیلوں کے بیجوں کی پیداوار ہوتی ہے اور جنگلوں میں سال اور شیشم وغیرہ کی قیمتی لکڑی ملتی ہے ۔

نیپال کی تاریخ اس کے اونچے اونچے پہاڑوں کی طرح بہت پرانی ہے ۔ کوئی ۲ ہزار برس پہلے لم بنی باغ میں مہاتما بدھ نے جنم لیا تھا ۔ یہ جگہ نیپال میں رمندئی کے مقام پر واقع ہے ۔ مہاتما بدھ کے زمانہ میں یہ نیپال کا حصہ نہیں تھا مگر اب ہے ۔ اس جگہ سمراٹ اشوک نے ایک لاٹ بنوائی جس پر "بدھا سکیا منی یہاں پیدا ہوئے" کی عبارت لکھی ہوئی ہے

کوئی سو برس تک نیپال پوری طرح راناؤں کے پنجہ میں رہا مگر اب حالات نے پلٹا کھایا ہے پڑوسی ہندوستانیوں کو دیکھ کر نیپالیوں کا حوصلہ بڑھ رہا ہے اور وہ بھی سچی آزادی اور جمہوریت کی منزل کی جانب قدم بڑھا چکے ہیں ۔

نیپال کی راجدھانی کھٹمنڈو جو بھاگ متی ندی کے کنارے آباد ہے بڑی چہل پہل آبادی کا شہر ہے ۔ جدھر دیکھو ادھر عالیشان محل، مندر اور تیرتھ گاہیں نظر آتی ہیں ۔ بڑے بڑے راستوں پر بہادر راناؤں کی مورتیاں کھڑی ہیں ۔ سارے شہر میں بجلی کا بھی انتظام ہے یہاں کے گھر اور مندر چینی ڈھنگ پر بنائے گئے ہیں ۔ راجہ کا محل جدید طرز کا ہے ۔ راناؤں کے محل جو ایک ہزار مربع میل پر پھیلے ہوئے ہیں بڑے شاندار ہیں ۔ "سنگھار دربار" جو وزیر اعظم کا محل ہے دیکھنے کے قابل ہے ۔

کھٹمنڈو میں "ٹنڈی کھیل" کے نام سے ایک پریڈ گراؤنڈ ہے جہاں ساٹھ ہزار گورکھا سپاہی پریڈ کرتے ہیں "ٹنڈی کھیل" کے شمال میں "رانی پوکھری" یا رانی تالاب ہے جس کے بیچ میں ایک خوبصورت مندر ہے ۔ تالاب کے مغربی جانب ایک راستہ ہے جہاں سے ہوکر مندر تک پہنچ سکتے ہیں ۔

شہر کے جنوبی حصہ میں "سوئمبھو ناتھ" کا مندر بڑا مشہور ہے جس کی یاترا کے لئے تبت اور چین سے بھی یاتری آتے ہیں ـــــ نیپال میں ہمارے راج دوت بھی کھٹمنڈو ہی میں رہتے ہیں ۔

پٹن کا "مچھندرا مندر" بھی باہر سے آنے والوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے ۔ یہ مندر سنہ ۱۴۰۸ء میں بنایا گیا ۔ یہاں ہر سال مچھندرا یاترا کے نام سے ایک بڑا تہوار منایا جاتا ہے ۔ اس تہوار کی کہانی بڑی دلچسپ ہے ۔ کہتے ہیں ہندوستان میں ایک بڑے رشی رہتے تھے جن کا نام "مچھندرا" تھا ۔ ان کا ایک چیلا "گورکھ ناتھ" ایک بار نیپال گیا ۔ مگر

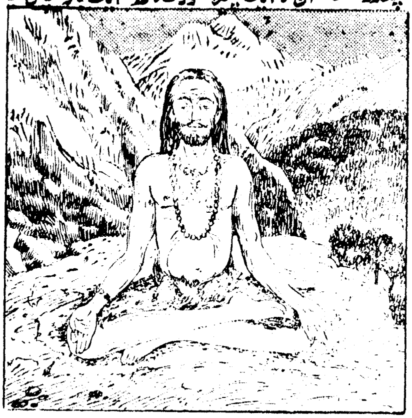

اس کا خیال تھا وہاں اس کا پرتپاک سواگت نہیں کیا گیا ۔ اس لئے وہ پٹن سے باہر ہی ایک پہاڑی پر بیٹھ گیا ۔ اور وہاں سے ہلا نہیں ۔ اس کے نتیجہ کے طور پر نیپال میں ایک بڑے عرصہ تک بارش نہیں ہوئی ۔ لوگوں نے خیال کیا کہ جب تک گورکھ ناتھ اپنے

مقام سے نہیں ہٹے گا تب تک بارش نہیں ہوگی - لوگوں کے کہنے پر راجہ فوراً ہی مچھندرا کے پاس پہنچا اور اس سے نیپال آنے کی پرارتھنا کی جب مچھندرا آیا تو اس کا چیلا گرو کو دیکھ کر سواگت کے لئے پہاڑی سے اتر آیا - جیسے ہی گورکھ ناتھ کا پاؤں زمین پر پڑا بارش برسنی شروع ہوئی اور نیپال اکال سے بچ گیا - اس سے راجہ بڑا خوش ہوا اور حکم دیا کہ ہر سال مچھندرا کی شان میں ایک تہوار منایا جائے - اس تہوار کے موقع پر مچھندرا کی مورتی کو قیمتی پوشاک پہنا کر ایک سجائے ہوئے رتھ میں رکھتے ہیں اور اس کو سارے شہر میں پھراتے ہیں -

نیپال کے باشندے جنہیں گورکھا کہا جاتا ہے - دنیا کی بہادر نسلوں میں سے ایک ہیں - ہر گورکھا اپنے پاس چاقو کی سی شکل کا ہتھیار جسے "کھوکھری" کہتے ہیں رکھتا ہے - ان کی عورتیں زیور بڑے شوق سے پہنتی ہیں - مختلف قومیں مختلف زبانیں بولتی ہیں مگر نیپال کی سرکاری زبان "نیپالی" ہے -

کسی وقت نیپال کے لوگ زیادہ تر بودھ ہوتے تھے مگر اب اکثریت ہندوؤں کی ہے - نیپالی ہندو بودھ دیوتاؤں کی بھی پوجا کرتے ہیں اسی طرح یہاں کے بودھ مندروں میں ہندو دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں پائی جاتی ہیں - نیپالی راجہ کا خاندان ہندو ہے - یہاں درگا پوجا، دسہرہ، دیوالی، ہولی اور دوسرے ہندو تہوار بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں - ان تہواروں کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بودھ بھی حصہ لیتے ہیں - دیوالی کی رات جب دیپکوں سے گھروں کو سجایا جاتا ہے تو کھٹمنڈو پریوں کا جگمگاتا ہوا شہر معلوم ہوتا ہے -

---

ایس - این سادھو

لطیفے

موٹا تازہ آدمی (اپنے دبلے پتلے دوست سے) واہ یار - تمہیں کوئی دیکھے گا تو یہی سمجھے گا کہ اس ملک میں قحط پڑا ہے -
دبلا پتلا آدمی - جی ہاں! اور جب آپ کو دیکھے گا تو سمجھے گا کہ ملک میں قحط کیوں پڑا ہے

ایک آدمی شہر سے گاؤں میں نیا نیا آیا - اس نے ایک دیہاتی سے پوچھا - کیوں بھائی یہاں بجلی کی روشنی ہے -
دیہاتی نے جواب دیا - جی ہاں! بادل گرجنے کے بعد بجلی بڑے زور سے چمکتی ہے -

---

استاد - بتاؤ لڑکو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کیا ہوا تھا -
ایک لڑکا - ہندوستان آزاد ہوا تھا -
استاد - بالکل ٹھیک اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو کیا ہوا تھا -
وہی لڑکا - (تھوڑی دیر سوچنے کے بعد) آزادی حاصل کئے ہوئے دو سال ۵ مہینے دس دن ہو گئے تھے -

---

استاد - کل سے مجھے پنشن ملے گی - مجھے یاد نہیں کہ میں نے آج تک کسی لڑکے کو پیٹا بھی تھا یا نہیں -
ایک لڑکا - تعجب کی کیا بات ہے - اس عمر میں حافظے کا یہی حال ہوتا ہے - اسی لئے آپ کو پنشن مل رہی ہے -

---

"روزانہ قوّت کے لئے
اس کا کھانا ہمیشہ ڈالڈا
سے پکایا جاتا ہے"
ڈالڈا موزوں غذا میں
آپ کے لئے ضروری قوّت بخش
چکنائی مہیا کرتا ہے
DALDA
HYDROGENATED GROUNDNUT AND TIL OIL

HVM. 167-50 UD

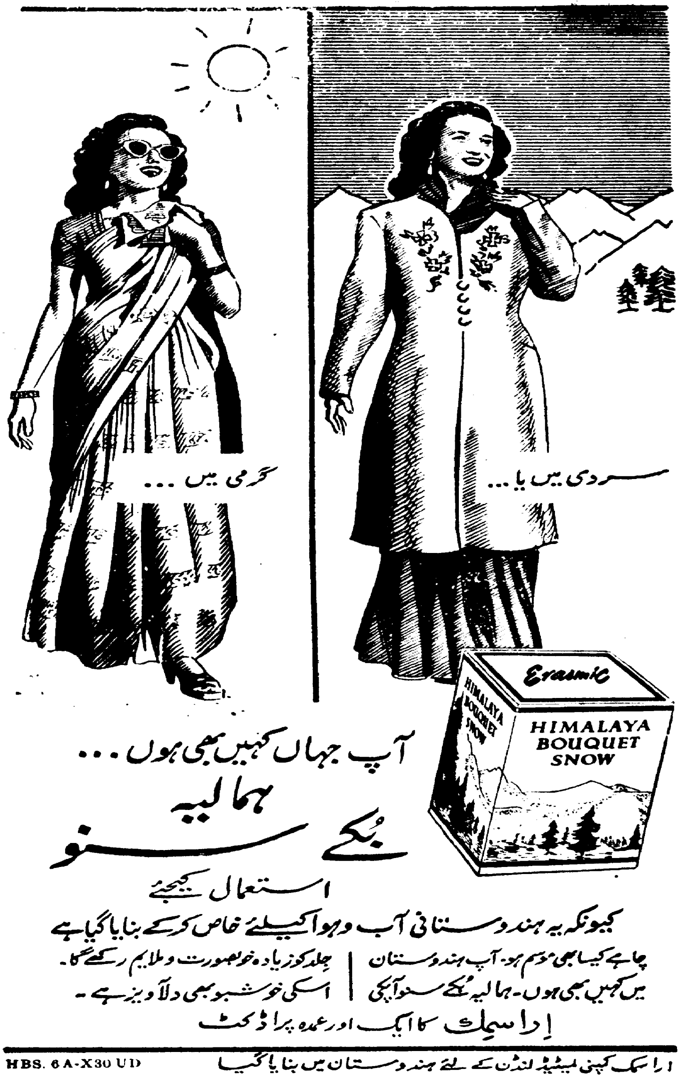

Printed at the United Press, Delhi and published by the Director, Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting, Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—21

آج کل

دسمبر ۱۹۵۲

آٹھ آنے

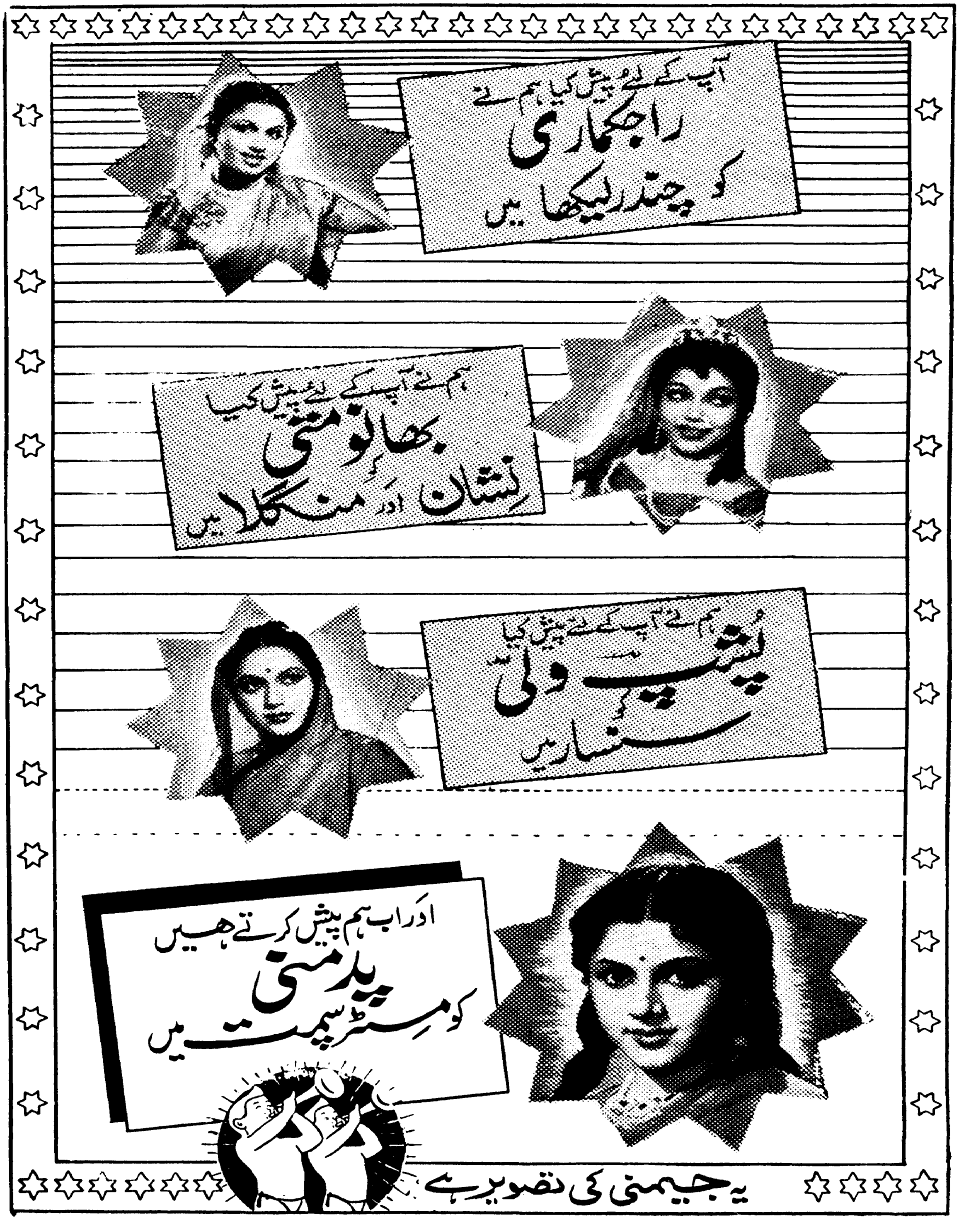
آپ کے لیے پیش کیا ہم نے
راجکماری
کو چندریکھا میں
ہم نے آپ کے لیے پیش کیا
بھانومتی
نشان اور منگلا میں
ہم نے آپ کے لیے پیش کیا
پشپ ولی
کو سنسار میں
اور اب ہم پیش کرتے ھیں
پدمنی
کو مسٹر سمپت میں
یہ جیمنی کی تصویر ہے

"لکس ٹائلیٹ صابن سے مَیں اپنی جلد کی
حفاظت کرتی ہوں" اشوا گپتا کہتی ہے
LUX
یہ سفید اور خالص صابن،
جس کی خوشبو دلکش ہے، آپ کی
جلد کو بھی دلکش بنائے گا!
فلمی ستاروں کا حُسن بخش صابن

دن بہ دن
ایک نئی دلکشی،
ایک نئی رونق
Rexona
Rexona
ریکسونا صابن کا 'کیڈول'
ہی آپ کی جلد کو زیادہ صاف
اور نرم و نازک رکھے گا۔ ریکسونا
ہر روز استعمال کیجئے۔
ریکسونا
'کیڈول' آمیز واحد صابن
جلد کو ملائم بنانے والے تیلوں کے ایک خاص مرکب کا تکنیکی نام
ریکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا

ترتیب

عشق	فضا ابن فیضی	۴
سہیل عظیم آبادی کی کہانیاں	شکیل الرحمٰن	۶
آدھا کمرہ	چندر کرن سون رکسا	۹
غزلیات	عطا الرحمٰن کاکوی۔ یعقوب عثمانی توک چند محروم۔ نریش کمار شاد	۱۶
غالب کا اردو دیوان	خواجہ احمد فاروقی	۱۷
مُصدّق	محمد مصلح الدین احمد	۲۰
ملا رموزی	مبشر علی صدیقی	۲۶
مشعل	رضا نقوی	۲۸
اقبال کی فارسی شاعری کا ترجمہ	سردار جعفری	۳۳
ہندوستان کا مسئلۂ آبادی	سی۔پی۔ میموریہ	۳۴
سنگم	زکی انور	۳۹
نادر شاہ کی عمان پر فوج کشی	محوی صدیقی لکھنوی	۴۵
کمیونٹی پراجیکٹ	——	۵۰
نئی کتابیں اور رسالے	ع۔م	۵۶
رفتارِ زمانہ	——	۵۹

بچوں کا آج کل

احمقانہ کھیل کود	فیض لدھیانوی	۶۱
سانپ سے شہزادہ	سعیدہ بانو	۶۲
مہاتما بدھ اور ایک بڑھیا	رادھا کرشن ہنس	۶۴
خبریں بھیجنے کے نئے اور پرانے طریقے	شمیم شیریں	۶۵
جان بچی لاکھوں پائے	اطہر پرویز	۶۶
سونے کی تھالی	رام لبھایا سوز	۶۸
ندی کا سفر	حامد اللہ افسر	۶۸

اردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر۔ جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ بال مکند عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ —— نمبر ۵

سالانہ چندہ۔ ہندوستان میں۔ چھ روپے
پاکستان میں۔ چھ روپے

غیر ممالک سے —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ۔ ہندوستان میں۔ آٹھ آنے
پاکستان میں۔ آٹھ آنے

دسمبر ۱۹۵۲ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ دہلی

فضا ابنِ فیضی

حُسن

حُسن کیا! نورِ ذاتِ صفات ایک منظر نظر فریب حیات
حُسن، گلگوں، گداز، مہ پارا دن کا خورشید، رات کا تارا

حُسن، فطرت کی ایک انگڑائی کسی آذر کدے کی برنائی
حُسن مکھڑے کا چاند، زلف کی رات حُسن ہم آفتاب ہم ظلمات

حُسن، موجِ نسیم، کیفِ شراب حُسن، لطفِ حیات، جوشِ شباب
حُسن کیا! سروِ قامتِ زیبا لبِ تسنیم و سایۂ طوبا

حُسن، ظلمت بدوش و آئینہ فام صبح کاشی کی ہے اودھ کی شام
حُسن، گلفام، یاسمیں تمثال حُسن، بادِ سحر، نسیمِ شمال

حُسن، نغمہ، سرود، زمزمہ، راگ کمسنی صبح کی ہے شب کا سہاگ
حُسن، نورس کلی، شگفتہ پھول زلفِ پُرپیچ و طُرّۂ مفتول

حُسن کیا! سیرگاہِ اہلِ نظر آشیانے میں بجلیوں کا گزر
حُسن، بنتِ سحاب و دخترِ ماہ ایک فتنہ شباب کے ہمراہ

حُسن کیا! آبِ زلف و تابشِ رو لب کا اعجاز، آنکھ کا جادو
حُسن، سحرِ حلال و مجسمِ طلسم روح بجلی کی پھول کا سا جسم

حُسن کیا! شوخیٔ نظر کا کرم آگ عارض کی، گیسوؤں کا خم
حُسن، عارض کا "آتشیں پندار" فاتحِ غزنوی و سنجر و زار

حُسن! جوشِ نشاطِ رامش و رنگ نغمۂ ساز و دلنشیں آہنگ
حُسن، آذر کے تپکدے کا خلیل بزمِ فطرت کا شاہکارِ جلیل

حُسن، تجلی سوادِ سینا کی چھاؤں گرمی کی دھوپ سرما کی
حُسن، یزداں شکار، قدس فریب خالقِ غمزۂ فراز و نشیب

حُسن، خوش وضعی و خوش آہنگی روح کا سازِ دل کی سارنگی
حُسن، انسان کا خدا ہونا سیمِ طفلی، شباب کا سونا

حُسن، کمسن، سبک، ملائم، نرم شوخیوں کا حریم، شعلۂ شرم
حُسن، معراج ہے عناصر کی ایک فردوس ہے مناظر کی

حسن، عکسِ جمالِ ساغر و مل
زعفران و بنفشہ و سنبل

حسن، برسات کا سہانا پن
پھول کی پنکھڑی کا ہلکا پن

حسن، شعر و فسانہ و افسوں
حسن، چشمِ سیہ، لبِ گلگوں

حسن، پازیب، گھونگھرو، خلخال
دامِ زلفِ دراز و دانۂ خال

حسن، محرابِ سینہ و ابرو
ساعدِ مرمریں، درازِ گلو

حسن، فردوسِ اختلاطِ کرم
حسن، زخمِ حیات کا مرہم

حسن، ارمان و آرزو کی اساس
زندگی کا لطیف تر احساس

حسن، دنیا کی نعمتِ ثابت
شہد ہونٹوں کا، آنکھ کا امرت

حسن، طاؤس، تیتری، جگنو
کبک، دراج، فاختہ، آہو

حسن، نارنج و فندق و عناب
غنچۂ انجم و گلِ مہتاب

حسن، مشکیں، ملیح، مہ پارا
شہد، شکر، شراب، شہ پارا

حسن، خوشبو، خمارِ مے آشام
اوس، بجلی، سحاب، گردشِ جام

حسن، سیماب، سبزہ، سیم بدن
بانکپن، چھب، جھلک، ادائیں، پھبن

حسن، سوز و سرو و ساز و سرود
حسن، عطر و عبیر و عنبر و عود

حسن، نشۂ نشاط، نوش، نشید
بچپنے کی ادا، شباب کی نیند

حسن، سرمست و سرکش و مخمور
کاجل، افشاں، مسی، حنا، سیندور

حسن، شیشہ، شراب، شمع، شعاع
عربدہ، امن، صلح، جنگ، نزاع

حسن، انگشتری، آئینہ، الماس
اک نئی صبح آفتاب کے پاس

حسن، قطعہ، رباعی، بیت، غزل
مشک، شیراز کی شراب میں حل

حسن، نہرِ زبیدہ، گنگا جل
ثمرِ قدِ حور، سیتا پھل

حسن، انجیلِ تازگیِ جمال
مصحفِ رخ، صحیفۂ خد و خال

حسن، قرآنِ پاک کا پارا
آیتِ روی و سطرِ زلفِ دوتا

حسن، طلعت میں عرش کا تارا
یا زمیں پر نزول سورج کا

حسن، مہرِ رسالتِ صوری
حسن، نقشِ بلاغتِ نظری

حسن، رازِ درونِ ذات و صفات
شاہدِ زندگی، نگارِ حیات

حسن ہے نورِ قلبِ شاعر کا
چاند ہے مطلعِ مناظر کا

حسن، اک چاشنی حیات کی ہے
چاندنی صحنِ کائنات کی ہے

شکیل الرحمٰن

سُہیل عظیم آبادی کی کہانیاں

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک اُردو کے جو ادیب بہت تیز لکھتے رہے ہیں اور اپنے سماجی ماحول کے ہر لمحہ سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اُن میں سہیل عظیم آبادی کا بھی نام لیا جا سکتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے اس مدت میں جو کہانیاں لکھی ہیں وہ اس لئے بھی اہم ہیں کہ وہ ماحول کی حقیقی تصویریں ہیں اور ان تصویروں میں حقیقی زندگی کے جو راز کھولے گئے ہیں اُن کا احساس پڑھنے والے کو فوراً ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان رازوں سے جو تخلیق ہوتی ہے، پڑھنے والا اسے بھی اسی لمحہ محسوس کرتا ہے۔ اس طرح تخلیق میں ماحول کی جو حقیقتیں عیاں کی گئی ہیں انھیں بھی ہم محسوس کرتے ہیں اور ان کھلی ہوئی اور صاف صاف نظر آنے والی حقیقتوں میں جو تخلیق ہوتی ہے اُس کا بھی ہمیں اسی وقت اور اسی لمحہ احساس ہوتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک سہیل عظیم آبادی نے جو کہانیاں لکھی ہیں اُن میں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مظلوم انسانوں کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب چاہتے ہیں۔ ان کہانیوں میں بڑی وسعت ہے اور انھیں پڑھتے ہوئے ہماری افسانہ نگار سے بہت ساری تمنائیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔

سہیل عظیم آبادی نے صوبہ بہار کے کسانوں اور اونچے طبقے کی کہانیاں لکھی ہیں کشمیر کے بہادر انسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں اور حیدرآباد کے اونچے طبقے کی کمزوریوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ اور ان ساری کہانیوں میں جو پھیلاؤ اور زبان کا حسن نظر آتا ہے اور جانے پہچانے ہوئے ماحول کی جو تصویریں نظر آتی ہیں وہ بڑی غنیمت ہیں۔

سہیل صوبہ بہار کے ایک متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جولائی ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے اور بہت عرصے تک اپنے خاص ماحول یعنی درمیانی طبقہ کے ماحول میں زندہ رہے۔ چونکہ صوبہ بہار میں یہ طبقہ اپنے خاص رنگ میں بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکا ہے اور سہیل کا شعور زندگی کی رفتار اور حیات کی انگڑائیوں سے برابر متاثر ہو کر بالیدہ بنتا رہا ہے۔ اس لئے وہ اونچے اور نیچے طبقوں کی کشمکش کا اچھی طرح مطالعہ کر سکتے ہیں اور گہری طنز پیدا کر کے حقیقتوں کو عریاں کرتے رہے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے دو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ "الاؤ" مکتبۂ اردو نے شائع کیا تھا اور "نئے پرانے" عبدالحق اکادمی نے چھاپا تھا۔ کچھ کتابیں زیرِ طبع ہیں۔ "نئے پرانے" میں تقریباً تیرہ کہانیاں ہیں جس میں ان کی وہ کہانی شریک نہیں ہے جس کا نام "نئے پرانے" ہے ان کہانیوں میں "روشنی" "دل کا روگ" "سادھو" "سرملا کا بیاہ" اور "مصنف کی زندگی" کا نام لینا ضروری ہے۔ اور "الاؤ" کی کہانیوں میں "الاؤ" "اندھیرے اور اُجالے میں" "دو مزدور" "جوار بھاٹا" "چوکیدار" "بے چارہ جوانی" "پیٹ کی آگ" اور "بھوک" سہیل کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اور ان کے علاوہ ان کہانیوں کا بھی ذکر ضروری ہے جو رسالوں میں شائع ہوئی ہیں اور اب تک کسی مجموعے کی شکل میں نہیں آئی ہیں۔ مثلاً "اندھیارے میں ایک کرن" "ایک سفر" "غیر آسودہ" "دل کا بوجھ" "زندگیاں" "رانی" "احمد" "دل کی لہریں" اور "ندون" ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد سہیل کے متعلق رائے قائم کرنے میں دشواری نہیں ہوتی ہے۔ یہ ساری کہانیاں ایک سی نہیں ہیں۔ ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان کی کہانیوں میں ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو بے ترتیب نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان افسانوں میں بعض جگہ اونچے طبقے کے مظالم کی داستانیں ہیں اور مزدوروں اور کسانوں کی کمزوریاں اور ان کی دلیری اور محبت ہے۔ بعض افسانوں میں محبت کا پرانا تصور رینگ رہا ہے اور محبت کا نتیجہ موت بنایا گیا ہے۔ بعض افسانوں میں محبت میں ناکامی کا نتیجہ زندگی سے فرار قرار دیا گیا ہے۔ اگر ایک افسانے میں گاندھی جی کے اصولوں کی

تائید کی گئی ہے تو دوسرے افسانے میں کسی جوان کی ہمت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جو کسی طرح پرانی روایات کو ٹھکرا کر نئی باتوں اور نئے اصولوں کو سلام کرتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تضاد پیدا ہو جانے کا بڑا خطرہ رہتا ہے۔ سہیل کی کہانیوں میں جو بعض جگہوں پر تضاد نظر آتا ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے، چونکہ سہیل زیادہ کھل کر باتیں نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا تضاد بھی بہت کچھ چھپا ہی رہتا ہے۔ "الاؤ" کی ایک کہانی ہے "قیدی" جس میں ایک قیدی اپنی آنکھوں کے سامنے اتیاچار دیکھ کر سر پیٹ کر مر جاتا ہے "نئے پرانے" کی کہانیوں میں ایک کہانی ہے "روشنی" جس میں کسی بھی جاندار کی زندگی تباہ کرنے کو گناہ اور پاپ بتایا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ انسان آخر وقت میں بھگتتا ہے، بندوق سے چڑیا کے شکار کو بھی غلط بتایا گیا ہے۔ اسی مجموعے کی ایک دوسری کہانی "سادھو" میں فراریت کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک آدمی ایک عورت سے محبت کرتا ہے، جب اس عورت کے پیٹ میں بچہ رہ جاتا ہے تو وہ اس سے نفرت کرنے لگتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے۔ بنارس میں کچھ عرصے کے بعد اسی عورت سے ملاقات ہوتی ہے جو اس وقت تک طوائف بن چکی ہوتی ہے، اسے دیکھ کر وہ آدمی گھبرا جاتا ہے اور نجات کی خاطر سادھو بن جاتا ہے۔ اس کہانی میں قدم قدم پر فراریت کی تعلیم ہے، اسی مجموعے میں سہیل کی ایک اور کہانی "دل کا روگ" ہے جس میں دو محبت کے دیوانے شادی نہ ہونے کی وجہ سے تپ دق کے مریض بن جاتے ہیں اور دونوں ایک ساتھ دم توڑ دیتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نے فساد کے دوران میں صرف ایک کہانی "اندھیارے میں ایک کرن" لکھی تھی۔ اس کہانی میں مجھے محسوس ہوا کہ وہ جسے کرن سمجھے ہوئے ہیں دراصل ایک تصوراتی کرن ہے اور ایک تاریک لہر ہے۔ سہیل نے اسے کیوں ایک کرن سمجھ لیا یہ کچھ زیادہ غور کرنے کی بات نہیں ہے، اس میں سہیل سے زیادہ ان کے ماحول کا قصور ہے۔

سہیل عظیم آبادی اپنے جن افسانوں میں پرانے سماج کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، اور تاریک گوشوں کی بہت ساری ننھی ننھی تصویریں جمع کر دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہمیں یہ پتہ کہیں نہیں چلتا کہ وہ صرف پرانے سماج کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتے ہیں یا ایک دوسرے سماج کی تعمیر بھی چاہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ پرانی اور گندی روایت کو جھنجھوڑتے ہیں اور کچھ اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا نقطۂ نظر نہ تو ہمیشہ اصلاحی رہا ہے اور نہ انقلابی۔ سہیل کی کہانیوں میں انقلابی خیالوں کی ہمیشہ کمی محسوس ہوتی ہے۔ انقلابی خیالوں کو لانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار کہانیوں میں تقریر کرنے لگیں۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ کہانیوں میں جو افسانہ نگار تقریر کرنے لگتے ہیں وہ کچھ نہ کچھ انقلابی ضرور ہوتے ہیں۔ خود سہیل کی مشہور کہانی "دل کا بوجھ" دیکھی جا سکتی ہے جو کسی صورت میں بھی انقلابی نہیں ہے۔ لیکن افسانہ نگار ہر جگہ تقریر کرتا ہوا نظر آتا ہے حالانکہ ان کی دوسری کہانیوں میں یہ عیب بالکل نہیں ہے۔ اپنی دوسری کہانیوں میں وہ کبھی تقریر نہیں کرتے۔ حقیقت کو جوں توں پیش کر دیتے ہیں۔ جذبات کی لہروں میں کبھی بہتے نہیں ہیں۔ سہیل کے فن میں پرانی عمارت کو توڑ کر نئی عمارت بنانے کا کوئی نقشہ نہیں ملتا ہے۔ ان کی کہانیاں بعض تلخ حقیقتوں کی تصویریں ضرور پیش کر دیتی ہیں۔ لیکن ان میں حیات کو آگے بڑھانے کا کوئی حوصلہ نظر نہیں آتا۔ فن تصویر کشی ضرور کرتا ہے لیکن حیات کو خوبصورت بنا کر آگے بھی بڑھاتا ہے —— سہیل عظیم آبادی کی کہانیوں میں حیات کی بڑی سچی تصویریں ہوتی ہیں، وہ خلوص اور دیانت داری کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے لیکن فن صرف تصویر کشی کا نام نہیں ہے، فن ماحول کے لئے خوبصورت راستے بھی تراشتا ہے اور انسان کو سنوار کر آگے بھی بڑھاتا ہے۔ سہیل کے یہاں ابھی تک یہ بات پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ یہ بات صرف سہیل کے یہاں نہیں بلکہ ہندوستان کے چند افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر باقی سارے افسانہ نگاروں کے یہاں پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ فسادات کے دور میں حال ہی میں اس کا امتحان ہو چکا ہے، اس امتحان میں چند افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر باقی سارے ناکامیاب رہے ہیں۔ اسلوب اور زبان کی مدد سے بعض افسانہ نگاروں نے ایسی ایسی باتیں لکھ ڈالی ہیں جو بہت حیرت انگیز ہیں اور خود وہ افسانہ نگار ایسی باتیں اور ایسی تصویریں نہیں بنا سکتے ہیں جو اس ماحول میں تصویر کشی کے علاوہ حیات کو سنوارنا بھی چاہتے تھے، لیکن صرف ہنگاموں اور طوفانوں کی تصویریں پیش کر دینا بڑی بات نہیں ہے۔ ان تصویروں میں ایسے اشارے پیدا کرنا بڑی بات ہے۔ جن اشاروں سے انسان کو نئی شاہراہ نظر آنے لگے۔

سہیل عظیم آبادی کی کہانی "دو مزدور" ایک موڑ ہے، جہاں سے ان کا آرٹ ایک نئے راستے کی طرف گھوم جاتا ہے۔ اگرچہ اس نئے راستے پر ان کا فن اس طرح نہیں دوڑتا ہے جس طرح وہ اپنے پہلے راستے پر دوڑتا رہا ہے۔ صرف ایک موڑ پر آکر گھوم جاتا ہے اور بس —— یہیں پر چند اچھی کہانیاں سامنے آتی ہیں۔ "الاؤ" "بھوک" "جوار بھاٹا" "سڑک بنتی ہے" اور "زون" وغیرہ —— "دو مزدور" میں بلاقی جبرو بھائی سے مزدور یونین کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتا ہے۔ لیکن اس کی انسان دوستی اور محبت اس سے دور نہیں ہوتی۔ اور وہ ہوٹل والے سے یہ کہتا ہوا چلا جاتا ہے

بڑے میاں! جمرو بھائی کا ناشتہ چائے میرا حساب میں لکھیو"۔ سہیل کی کہانیوں کا اختتامی لمس Finishing touch غضب کا اثر رکھتا ہے۔ "دو مزدور" "بھوک" اور "الاؤ" جیسی کہانیاں مثال کے لئے پیش کی جا سکتی ہیں۔ "ذون" "احمد" اور "ڈل کی لہریں" میں بھی یہ اثر موجود ہے لیکن اتنی خوبصورتی کے ساتھ نہیں ہے جتنی خوبصورتی کے ساتھ سہیل عظیم آبادی نے اپنی پہلی کہانیوں میں پیدا کیا ہے۔ "بھوک" میں انھوں نے راموکی بھوک کی اچھی تصویر پیش کی ہے۔ راموں لڈو کھا لیتا ہے اور جوان لڑکی کو چھوڑ دیتا ہے۔ "جوار بھاٹا" کو ایک اچھا نفسیاتی تجزیہ کہا جا سکتا ہے۔ "کھوسٹ" بھی ایک اچھی تصویر ہے۔ کشمیر پر ادھر سہیل نے تین کہانیاں لکھی ہیں۔ جن میں "ذون" اور "احمد" بڑی اہم کہانیاں ہیں "ذون" میں ایک بیوہ لڑکی مر جانا چاہتی ہے۔ لیکن جب اُسے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُس کے پیٹ میں بچّہ ہے اور یہ بچّہ اُس کے مرنے والے شوہر کا ہے تو خوشی سے ناچنے لگتی ہے اور پھر مرنا نہیں چاہتی ہے۔ "احمد" میں تلخ حقیقتوں کے تجزیے میں سہیل عظیم آبادی نے وہ سب کچھ پیش کر دیا ہے جو انھوں نے محسوس کیا ہے' اس طرح بہت سی اچھی باتیں بھی آگئی ہیں اور بہت ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ تصویر کشی میں فن کار ذرہ ذرہ کا حساب نہیں کرتا ہے' وہ اپنے ماحول کو اپنی تخلیق کے قبل پرکھتا ہے۔ تصویر کو کھینچتا ہے لیکن اُس میں ایسی باتیں نہیں آجاتیں جن سے اس کی تصویر دُھندلی پڑ جائے۔ سہیل کی کہانی "احمد" شروع میں بڑے مزے میں چلتی ہے لیکن راستے میں بہت بار جھٹکے لگتے ہیں۔ اگرچہ کہانی بڑے اچھے طریقے سے ختم ہو جاتی ہے۔ پھر بھی اختتام پر ہمیں راستے کے جھٹکے یاد رہتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی نے عریاں نگاری سے ہمیشہ دامن بچایا ہے۔ وہ گندی باتوں کے بیان سے بہت پرہیز کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ ہندوستان کے کم وبیش سارے افسانہ نگار عریاں نگاری کی مشق فرما رہے تھے' سہیل کا قلم بہت سنبھل کر آگے بڑھتا رہا اور یہ بڑی بات ہے۔

سہیل عظیم آبادی کبھی اسلوب پرستی اور ابہام پرستی میں گرفتار نہیں رہے اور وہ رہنا بھی نہیں چاہتے ہیں، ان کی پیاری اور خوبصورت زبان سے ان کے فن کو بڑی زندگی ملتی ہے۔ زبان بھی سادہ اور مواد بھی سادہ اور فطری ہوتا ہے۔ سہیل کے یہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ وہ غیر ضروری تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ صاف صاف اپنی زبان میں پیش کر دیتے ہیں۔ صاف صاف پیش کر دینے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ حقیقت نگاری میں جن باتوں کو چھپانا چاہتے ہیں وہ باتیں بھی صاف طور پہ سامنے آجاتی ہیں' سہیل چونکہ بعض وقت اپنی سادہ زبان کی مدد سے بہت سی چیزیں چھپا لیتے ہیں۔ اس لئے ان کے فن میں بہت ساری باتیں کھل کر سامنے نہیں آتی ہیں۔ پھر بھی سہیل کے فن میں خلوص اور انسانی ہمدردی کا جو جذبہ ملتا ہے۔ وہ بہت غنیمت ہے۔ "ذون" اور اُن کی دوسری نئی کہانیاں پڑھتے ہوئے ہم محسوس کر رہے ہیں کہ سہیل نے اپنی طویل خموشی کے بعد پھر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اور آج جو بھی اُن کی نئی کہانیوں میں خوبصورت اور نکھرے ہوئے اشارے نظر آرہے ہیں وہ ان کا عام رنگ بن جائیں گے۔

بھارت اور ترکی کے درمیان تہذیبی معاہدہ

بھارت اور ترکی کی حکومتوں نے دونوں ملکوں کے درمیان تہذیبی معاہدے کی تصدیق کر دی ہے۔ ۹۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو نئی دہلی میں اس معاہدے کی تصدیق سے متعلقہ کاغذات کے تبادلے کی رسم ادا کی گئی۔ بھارت کی طرف سے پروفیسر ہمایوں کبیر اور ترکی کی طرف سے ایم۔ اقدولو نے اپنے اپنے ملک کی نمائندگی کے فرائض انجام دئے اس معاہدے پر ۲۹ جون ۱۹۵۱ء کو انقرہ میں ترکی کے وزیر خارجہ ڈاکٹر فاؤد کپرو لو اور بھارت کے وزیر تعلیم مولانا آزاد نے دستخط کئے تھے۔

بھارت اور ترکی کے درمیان صدیوں سے تمدنی تعلقات چلے آرہے ہیں۔ اس معاہدے کے ذریعے سے ان تعلقات کو مستقبل میں قائم رکھنے اور انھیں ہر ممکن طریقے سے زیادہ مضبوط بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ دونوں حکومتوں نے یونیورسٹی کے اُستادوں اور سائنسی و تہذیبی اداروں کے ممبروں کے باہمی تبادلہ اور ایک ملک کے طالب علموں کو دوسرے ملک میں حصولِ تعلیم کے لئے وظائف دینے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ معاہدے میں اس بات کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ ایک ملک کے سرکاری ملازموں کو دوسرے ملک کے سرکاری' سائنسی' ٹیکنیکل اور صنعتی اداروں میں تربیت دینے کا انتظام کیا جائے گا۔

چندر کرن سونرکسا

آدھا کمرہ

ایک بجتے ہی آفس کے سبھی بابو اور کالے گورے صاحب کرسیاں چھوڑ کر ٹفن روم کے ارد گرد چکر کاٹنے لگے۔ کسی نے ایک چائے منگائی۔ کسی نے چاہیں اور ٹوسٹ لیئے۔ سوال خواہش کا نہیں جیب کے پیسوں کا تھا۔ گھر گرہستی والے کئی لوگ گوشۂ تنہائی میں اپنے ٹفن کیریر سنبھالے اِدھر اُدھر جا بیٹھے۔ مدھو سودن یوں تو اکیلا ہی تھا اور خوش قسمتی سے اُسے ایسا ہوٹل مل گیا تھا جس کا مالک اُس کے لیئے دو پیسے کا ناشتہ رکھ دیتا تھا۔ کمرہ خالی ہوتے ہی اُس نے میز پر اپنا ڈبہ کھول کر رکھ لیا۔ کھانا ٹھنڈا تھا اور اُسے بدمزہ سا لگ رہا تھا۔ آلو کے پراٹھے کا پہلا لقمہ ابھی اُس نے مُنہ میں رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا "بھائی صاحب"

آواز نسوانی تھی۔ مدھو سودن نے چونک کر سر اُٹھایا۔ یہ آفس کی نئی ٹائپسٹ مس گوری تھی۔ اِن "بھائی صاحب والیوں" سے مدھو سودن کو بڑی چڑ تھی۔ کالج کی زندگی کے پانچ چھ سالوں میں وہ ایسی کئی بہنوں سے تعارف حاصل کر چکا تھا۔ جو اپنے محبوب کو تا زندگی بھائی صاحب کہتی رہیں۔ ایک ایسی ہی بہن کے پیچھے اُس کا کالج چھوٹا۔ خوآخر کار اُسے انگوٹھا دکھا کر کسی موٹے سیٹھ کی گھر والی بن بیٹھی۔ اور مدھو سودن آج بھی اکیلا تھا۔ اُس نے ایک ترچھی نظر سے مس گوری شرما کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر روکھے لہجے میں کہا "مس شرما! میرا نام مدھو سودن ہے۔ آپ شوق سے مجھے اسی نام سے پکار سکتی ہیں۔"

"معاف کیجئے گا۔" مس شرما نے ذرا ملائم لہجے میں جواب دیا۔ "بھائی صاحب کہنے سے اگر آپ کے جذبات کو میں نے ان جانے ہی ٹھیس پہنچائی ہو تو اِس کے لئے معافی چاہتی ہوں"۔ . . . . . اور جملے کو ادھورا ہی چھوڑ کر وہ اپنی اُنگلیاں چٹخانے لگی۔ اُس کا چھوٹا سا دُبلا پتلا اور کچھ محبوبہ چہرہ جو گھنے بالوں سے دب کر اور بھی ننھا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے پھڑپھڑاتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ بہت ہی پریشان معلوم ہوتا تھا۔ ایک دوبار اُس کے ہونٹ پھڑکے۔ لیکن پھر بھی وہ "کچھ کہنے" کی تعریف کو پورا نہ کر سکے۔ مدھو سودن نے اُسے بیٹھنے تک کے لئے نہیں کہا اور جھٹ پٹ اپنا کھانا ختم کرنے لگا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر اُس نے کہا۔ "بھائی . . . . نہیں مسٹر شرما! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے شریکِ کمرہ Partner چلے گئے ہیں اور آج کل آپ اپنے کمرے کے پورے پورے مالک ہیں۔"

"جی۔ سُنا تو میں نے بھی ہے۔" مدھو سودن نے طنزیہ دریافت کیا۔ کسی نئے پارٹنر کی درخواست لائی ہیں کیا ؟"

گوری کچھ جھجکی۔ پھر جیسے اپنا پورا زور لگا کر بولی۔ "بات کچھ ایسی ہی ہے مسٹر شرما! آپ کے سوا آفس بھر میں کسی کنوارے کے پاس اپنا کمرہ نہیں ہے۔ تقریباً سبھی لوگ یا تو کسی مکان والے کنبے کے سہارے رہتے ہیں یا ہوٹل دکان وغیرہ میں سوتے ہیں۔ دہلی میں اپنی چھت کا ہونا بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ اپنا کمرہ صرف اپنا ہی ہو یہ بھی کسی جنّت سے کم نہیں ہے۔ لیکن میرے خیال میں ہم ایسے سو روپے کی تنخواہ والوں کے لئے پینتیس روپے کرایہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اگر آپ کو کوئی ایسا حصّہ دار ملے جو ہفتے میں ساڑھے پانچ دن ہی ساتھ رہے اور حتی المقدور کوئی تکلیف نہ ہونے دے اور آدھا کرایہ مع بجلی پانی کے پیشگی دے دے تو شاید آپ اُسے اپنے کمرے کے کسی کونے میں جگہ دینے کو تیار ہو ہی جائیں گے۔"

لڑکی کی بات میں مدھو سودن کو کہیں بھی طنز کا پہلو محسوس نہیں ہُوا۔ اس لیئے اُس کا مزاج بھی کچھ نرم ہُوا۔ لہجہ بدل کر بولا۔ "ہاں، ایسا ہو تو اُس معاملے پر سوچا جا سکتا ہے۔"

گوری نے جلد ہی جواب دیا۔ "نہیں نہیں مسٹر شرما! مہربانی فرما کر آپ میری یہ بات مان ہی لیجئے۔ دیکھیئے وہ حصّہ دار میں ہی ہوں اور مجھے غازی آباد سے روز آنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر دہلی میں مجھے جگہ نہ ملی تو شاید مجھے نوکری ہی چھوڑنی پڑے۔ اور نوکری چھوڑ کر کھاؤں گی کیا ؟ اور اپنے چھوٹے بھائیوں اور بوڑھی ماں کو کیا کھلاؤنگی ؟ مجھے جگہ دے کر آپ مجھ پر نہیں بلکہ سارے خاندان پر احسان کریں گے۔"

لیکن شرما کچھ جھجکا پایا۔ "میں تو اکیلا ہوں اور آپ ....."

"یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔ دیکھئے مسٹر شرما، ضرورت سب کچھ کرا لیتی ہے۔ آپ تو مرد ہیں۔ ایک اجنبی عورت کے ساتھ جب آپ کو رہنا اتنا عجیب لگے تو عورت کی تو کچھ نہ پوچھئے۔ لیکن اس لوک لاج کی وجہ سے نوکری تو چھوڑ نہیں سکتی اور اگر اتنی بھیڑ والی ٹرینوں سے مجھے گھر جانا پڑا تو نوکری چھوڑنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اچھا تو کیا آپ مہربانی فرما کر اس مسئلے پر غور کریں گے میں آفس میں چھٹی ہونے پر پھر ملوں گی۔ ابھی تو بہت سی فائلیں ٹائپ کے لئے پڑی ہیں۔"

اتنا کہہ کر اپنے گھنے بالوں کے جوڑے کو پھر سے لپیٹتی ہوئی گوری باہر چلی گئی۔ مدھوسودن نے آخری قطرہ نکلتے ہوئے سانس لیا اور اپنے آپ سے کہا "واہ ری ہمت۔ یہ ایک دم ماڈرن رومانس ہے۔ دل سے پہلے مکان پر قبضہ کر لو"۔ گوری کی مانگ نے اُسے بھونچکا بنا دیا تھا۔ اگر وہ گوری کو نہ کر دے گا تو وہ اسے بزدل تصوّر کرے گی۔ نہیں۔ مدھوسودن یہ خاصیت اپنے لئے کبھی بھی منظور نہیں کرے گا"۔ طالب علمی کی زندگی میں مدھوسودن اُن تیز لڑکوں میں سے تھا جنہیں لڑکیوں کو جھٹلانے میں مزا آتا تھا۔ آج وہ اس دُبلی پتلی لڑکی سے ڈر جائے گا جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اکیلا ہے اُس کا کمرہ مانگنے سے بھی نہ ہچکی۔ آفس کے باقی تمام وقت میں گوری کی یہ باتیں اُس کے دماغ میں گھومتی رہیں چھٹی ہوتے ہوئے اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر دوبارہ مس شرما نے کمرے کے لئے مانگ کی تو وہ اسے "ہاں" کہہ دیگا۔ اور اس طرح لڑکے پھنسانے والی لڑکی کو وہ دکھا دے گا کہ سبھی لڑکے اتنے بے وقوف نہیں ہوتے جیسے اُسے اب تک ملتے رہے ہوں گے۔

"مسٹر شرما!" گیٹ پر کھڑی ہوئی گوری نے اُس سے کہا۔ "کیا آپ نے اس بات پر سوچ لیا ہے کہ آپ صرف چار مہینے کے لئے مجھے اپنے کمرے کا ساجھی دار بنائیں گے؟ اتنے دنوں میں میں ضرور ہی کہیں اور انتظام کر لوں گی۔ اور ساتھ رہنے پر آپ دیکھیں گے کہ میں حتی المقدور آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گی۔"

"آپ نے میرا کمرہ دیکھا بھی ہے؟" مدھوسودن نے کچھ کھینچ کر کہا۔ گوری جاتی ہوئی بس کے پیچھے لپکی۔ "بلیاراں کی پچھلی سڑک پر پنواڑی کی دکان کے اوپر ہی تو ہے نا!" وہ بس پر چڑھتے ہوئے بولی۔ "تو میں کل آ جاؤں گی۔"

مدھوسودن کے جواب دینے سے پہلے ہی بس چل دی۔

جاڑے کی صبح کے سات بجے تھے۔ مدھوسودن چارپائی پر لیٹا چائے کا انتظار کر رہا تھا۔ نیچے والا پنواڑی اُسے انگیٹھی پر چائے بنا کر دے جاتا تھا۔

"بابو جی! بابو جی!! کواڑ کھولئے، آپ کی بہن جی آئی ہیں۔"

"بہن جی؟" مدھوسودن نے لحاف پھینک دیا اور کوٹ میں بانہیں ڈالتا ہُوا باہر آ گیا۔ نیچے جھانکا تو دیکھا کہ تانگے پر سے گوری اُتری ہوئی کھڑی تھی۔ پنواڑی اُس کا سوٹ کیس اور لوکری (کنڈی) وغیرہ اُتار رہا تھا۔

"نمستے بھائی صاحب" گوری نے نیچے سے ہی پکارا۔ "ذرا دروازہ تو کھولئے" وہ سینڈل کھٹکھٹاتی زینے پر چڑھ رہی تھی۔

غیر ارادی طور پر مدھوسودن نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ گوری نے دھیمے اور التجا بھرے لہجے میں کہا۔ "اُمید ہے آپ "بھائی" کہنے سے ناراض نہ ہوئے ہوں گے۔ آخر پڑوسیوں کو اور کیا بتاتی۔ آپ میری "چچیری" کیسی بھی بہن بتا دیجئے گا۔" اُس نے اندر آ کر کھونٹی پر تھرماس لٹکا دیا۔ پھر کنڈی میں سے پیالہ اور طشتری نکالنے لگی۔ پنواڑی سوٹ کیس رکھ کر چلا گیا تھا۔ مدھوسودن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گوری سے کن الفاظ میں اور کیا کہے۔ لیکن اُس کے دل میں غصّے کی ایک لہر دَوڑ رہی تھی جسے وہ ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔

"لیجئے، ایک پیالی چائے" گوری نے تھرماس میں سے چائے انڈیل کر کہا۔ "میں تو جلدی میں پی ہی نہ سکی اور ساتھ لیتی آئی۔"

"شکریہ"۔ مدھوسودن نے رُکھائی سے کہا۔ "میری چائے ابھی تیار ہو کر آ جاتی ہے۔ اس تکلیف کے لئے شکریہ۔"

گوری کا بڑھا ہُوا سانولا ہاتھ ذرا سا کانپا۔ پھر رُک گیا۔ مدھوسودن نے دیکھا۔ گوری سہم سی گئی۔ اُسے محسوس ہُوا جیسے اُس نے بہت تیز بات کہہ دی ہو۔ لیکن ان تتلیوں سے بچنے کا راستہ بھی تو یہی ہے کہ کٹنے پر سے ہی کاٹ دیں۔ اُس نے سلیپر پہنے اور لوٹا اُٹھا کر آنگن میں نکل گیا۔ نل کے پانی سے مُنہ ہاتھ دھویا اور نیچے جا کر چائے پی۔ بنا کام ہی دوکان پر کھڑے کھڑے دو سگریٹیں پھونکیں۔ کوئی دو گھنٹے بعد وہ اُوپر گیا۔ آج اپنے ہی کمرے میں وہ پرائے کی مانند گھس رہا تھا نہیں، نہیں۔ اس جذبے کو وہ پاس بھی نہیں پھٹکنے دے گا۔

اوپر گیا تو دیکھا کہ اتنی دیر میں گوری نے کمرہ صاف کر کے ایک کونے میں اپنا سوٹ کیس اور بکس رکھ دیا تھا۔ بکس پر کپڑا بچھا کر اُس پر کتابیں اور گھڑی رکھ دی تھی۔ بکس میں شاید برتن تھے۔ کیونکہ بارجہ کے ایک کونے میں سٹوو اور

دو چار چھوٹے برتن اور پیالے طشتری سجے ہوئے تھے۔ مدھوسودن کے بستر کو بھی اچھی طرح سے جھاڑ کر بچھا دیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر وہ دل ہی دل میں مسکرایا شرنت کی بیروتُو بننے میں کوئی کسر نہیں ہے۔ پر بھائی میں تو شری کانت یا دیوداس ہول نہیں۔ چائے کا پیالہ ویسے ہی میز پر پڑا تھا اور گوری اپنے گھنے لمبے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ آواز کو زیادہ سے زیادہ روکھا بنا کر وہ بولا "بستر جھاڑنے کے لئے شکریہ مس گوری۔ لیکن اس کے بعد آپ یہ تکلیف نہ کیا کریں۔ اگر اس طرح میری آزادی کو آپ محدود کر دیں گی۔ تب میرے لئے اس کمرے میں رہنا دشوار ہو جائے گا۔ اور ہاں یہ چائے آپ نے کیوں نہیں پی؟"

گوری نے آہستہ سے جواب دیا۔ "مسٹر مدھوسودن۔ مصیبت میں جو امداد آپ نے مجھے اس چھت کا سہارا دے کر کی ہے اُس کا شکریہ میں زبان سے ادا نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ احسان کر کے میری اور میرے کنبے کی روٹی کی حفاظت بھی کی ہے۔"

"معاف کیجئے اگر ہے میں رہنگی تو آدھا کرایہ چکانا ہوگا۔ بس بات ختم۔ چائے پیجئے۔ میں تو نیچے پی آیا ہوں۔"

گوری چپ رہ گئی۔ بارجہ میں جا کر منڈیر پہ بیٹھی۔ اُس نے عقر ماس سے نکال کر چائے پی۔ مُنہ صاف کیا۔ بستر میں لپٹی تین چار رنگین چادروں کو پھیلانے لگی۔ چادریں ٹھیک کر کے کرسی پر چڑھ کر کیلیں گاڑیں اور بستر کی رسّی نکال کر بیچ میں اُسے تان دیا۔ قد چھوٹا ہونے سے گوری بڑی مشکل سے اُچک اُچک کر کیلیں گاڑ سکی۔ لیکن مدھوسودن نے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دیا۔ چپ چاپ شیو کرتا رہا۔

"رات کو چادریں ڈال کر کمرے کے دو حصے کر لیں گے۔" گوری نے کہا۔

مدھوسودن نے سر ہلا دیا بولا کچھ نہیں۔ گوری نے آنگن میں جا کر کپڑے بدلے۔ چوٹی کی۔ پھر پرس کھول کر دس کا نوٹ نکالا اور مدھوسودن کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے چپ چاپ ایک روپیہ چھ آنے واپس کر دئے اور نوٹ جیب میں رکھ دیا۔ اُس وقت نو بج رہے تھے۔ مدھوسودن نے تولئے سے مُنہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں کھانا کھانے جا رہا ہوں۔ ادھر سے ہی آفس چلا جاؤں گا۔ یہ چابی لیجئے اور تالا لگا کر آ جائیے۔"

گوری نے سہمی ہوئی آواز سے کہا۔ "اگر بُرا نہ مانیں تو آج کا کھانا یہیں کھا لیجئے۔ ماں نے کافی کھانا ساتھ رکھ دیا ہے۔"

"نہیں، میرا کھانا وہاں بن چکا ہوگا۔ آپ اپنا بچا ہوا کھانا شام کو کام میں لے لیجئے گا۔" یہ کہتا ہوا مدھوسودن نیچے اُتر گیا۔

وہ دل میں بہت خوش تھا۔ اپنی چھبیس برس کی زندگی میں اُس نے اتنی چالاک لڑکی نہ دیکھی تھی جو اس قدر صفائی اور بھولے پن سے نوجوانوں کو پھنسانے کا فن جانتی ہو اور اسے تو اُس نے دکھا ہی دیا کہ سبھی مرد شہد پہ مکھی کی طرح نہیں گرتے۔ پھر کوئی شکل و صورت بھی تو ہو۔ اُس نے چلتے چلتے سوچا۔ کالی چڑیل۔ لکڑی سے ہاتھ پاؤں۔ بس ذرا بال خوبصورت ہیں اور آنکھیں بھی اچھی ہیں۔ آفس میں بھی کہیں اس نے مجھے اپنا بھائی ہی نہ بتایا ہو۔ جی.... ایسی بہنوں کو دور سے سلام جو بن بلائے سر پہ سوار ہو جائیں...... اُس کا ہوٹل آ گیا تھا۔

"آپ نے سب جگہ مجھے اپنا بھائی کیوں بتایا؟"

"مسٹر شرما! آپ اتنے غصے نہ ہوں" گوری نے کہا۔ "یوں تو آپ اور ہم ایک ہی ذات کے ہیں۔ پھر اپنے ملک میں عورت مرد یا تو میاں بیوی ہوتے ہیں یا بھائی بہن....... دوستی کا تعلق ہمارے سماج میں ابھی اتنا آسان کہاں ہے"؟ لیکن اگر آپ کو اس سے دُکھ پہنچا ہو تو مجھے معاف فرمائیے۔ اور آپ کہیں تو مکان بھی چھوڑ دوں۔ بھگوان کوئی سہارا تو دیں گے ہی۔ آپ کو بھلا آدمی.......

اور کہتے کہتے گوری رو پڑی۔

مدھوسودن آنسوؤں کو دیکھ کر پسیج تو گیا۔ لیکن اوپر سے سخت بن کر بولا "میں سماج کی جھوٹی روایات کو نہیں مانتا۔ ہم اور آپ ایک ہی مکان میں کرایہ دار ہیں بس۔ خیر جانے دیجئے جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اصل میں اس ہفتے کے کرایے کے پیسے جو گوری نے صبح دئے تھے۔ خرچ ہو چکے تھے۔ کیونکہ وہ مہینے کے آخری دن تھے۔

گوری مُنہ دھونے چلی گئی۔ لوٹ کر اُس نے سٹوو جلایا۔ چائے بنائی اور بارجہ میں بیٹھ کر چپ چاپ پی۔ پھر وہیں بیٹھی بیٹھی سوئیٹر بننے لگی۔ سٹوو پہ کھچڑی بن رہی تھی۔

دہلی میں ایک چھت کا سہارا۔ اگرچہ وہ ایک نوجوان کے ساجھے میں ملا تھا۔ پا کر گوری نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب سے ایک سال پہلے جب اُس کے والد زندہ تھے، وہ الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ اُس نے خواب میں بھی

یہ نہ سوچا تھا کہ اس طرح اُسے ایک غیر جانے پہچانے نوجوان کے ساتھ بھی رہنا پڑ جائے گا۔ اور وہ بی اے پاس کرنے سے پہلے ہی پڑھائی چھوڑ کر سو روپے کی کلرکی کرے گی۔ لیکن آٹھ مہینے تپ دق کا مریض رہ کر گھر کی کل جمع پونجی ڈاکٹروں اور پہاڑی مقامات کی نذر کر کے اُس کا باپ، اُس کی نیم مردہ ماں اور ساتویں اور نویں میں پڑھتے دو لڑکوں کے ساتھ اُسے بھی چھوڑ گئے۔ پہلے کچھ دن تو وہ ایک دم سکتہ کی حالت میں رہ گئی۔ لیکن باپ کی موت کا گہرا صدمہ جب کچھ کم ہوا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی پڑھائی تو اب بالکل چل ہی نہیں سکتی۔ اور ساتھ ہی اگر وہ کوئی روٹی کمانے لائق کام نہیں کرتی تو بھوکوں مرنے کی نوبت آ جائے گی۔ غازی آباد سے بھی تین چار میل دور اُس کا آبائی چھوٹا سا مکان تھا۔ سب لوگ وہیں آ گئے۔

دونوں بھائیوں کو نزدیکی سکول میں داخل کر دیا اور ماں کے غم زدہ دل کو اپنی اعتماد پسندانہ گفتگو سے حوصلہ دے کر گوری نے مرد بننے کی ٹھان لی۔ سگائی اُس کی ہو گئی تھی۔ ماں کا ارادہ تو یہ تھا کہ اپنے دونوں لڑکوں کو قسمت کے حوالے کر کے لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دے۔ لیکن گوری نے ایک دم انکار کر دیا۔ کم از کم جب تک ایک لڑکا میٹرک کر کے کچھ کمانے نہ لگ جائے اُس نے نوکری تلاش کی اور تھوڑی سی محنت سے بھاگ کر کی پچیس پچیس روپے کی دو ٹیوشنیں بھی حاصل کر لیں۔

ہونے والے سسرال والوں اور اپنے منگیتر کو اُس نے سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔ ساس نے تو سمدھن کی عقل پر پتھر پڑ جانے کی دہائی دی۔ لیکن منگیتر نے جو خط گوری کو لکھا۔ اُس سے گوری کا دل پھول اُٹھا۔ خط میں لکھا تھا:-

تمہارا درد بھرا کڑوا میٹھا خط ملا!

رُبنا دیکھے ہی تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تمہارا ساتھی اتنا تنگ دل اور کم ظرف ہے، کہ تمہارے اس کام کو بُرا سمجھ کر تم سے تعلقات منقطع کر لے گا۔ اس کا افسوس تو ہُوا کہ پتا جی کی بے وقت وفات سے تمہاری تعلیم بند ہو گئی۔ لیکن وہ تو میرے ساتھ جب تم چاہو گے شروع ہو جائے گی۔ صرف عورت ہونے سے ہی تم اپنے کنبے کا بوجھ اُٹھانے کے ناقابل رہو، ایسا تو میں خواب میں بھی نہیں چاہتا۔ ایک سال تک تو جب تک میرا کورس ختم نہیں ہوتا، شادی کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ بعد میں اگر تم میرے پیسے کو اس گھر کے لئے اچھوت سمجھو تو خود کما کر ماں کی سیوا کر سکتی ہو۔ میں اس میں دخل نہیں دوں گا۔ لیکن دیوی' بلاوجہ پیشانی پر بل مت ڈالو ہم تو آپ کے ہمیشہ کے "موسٹ اوبیڈینٹ" ہیں اور رہیں گے۔

دیوالی پر اگر آؤں تو ملو گی یا نہیں؟

تمہارا ــــ اجیت

گوری نے اس خط کو ہاتھی دانت کی معطّر ڈبی میں بند کر کے بکس میں رکھ چھوڑا۔

دوسرا مسئلہ گوری کے سامنے تین میل تانگے پر یا پیدل ہر روز سٹیشن آنے اور ٹرین پکڑ کر دہلی جانے کا تھا اور اسی طرح لوٹنے کا بھی۔ کچھ دن اُس نے نوکری کر کے دیکھ لیا کہ چھ میل پیدل چل کر دو ٹیوشنیں تو کیا اکیلی نوکری بھی اُس سے نہیں ہو سکے گی۔ تب مجبور ہو کر کہیں جگہ نہ کر اُس نے مدھو سودن کے ساتھ ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

بارِ احسان سے دبی ہوئی گوری مدھو سودن کے سبھی چھوٹے موٹے کام کر کے اُسے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دے کر اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتی تھی لیکن اُس کے پہلے ہی دن کے روکھے پن سے ڈر گئی۔ اگرچہ اُسے اس فارغ نفس نوجوان کی اس بے رُخی سے اُس کے دل میں اُس کے لئے عزّت و احترام کا احساس ہی بڑھا اپنے مہربان کی نگاہوں میں کوئی بھی نیچا نہیں ہونا چاہتا۔ گوری نے بھی یہ سوچ کر کہ کہیں اُس کی کسی حرکت میں بے اعتنائی پا کر مدھو سودن اُسے نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھنے لگے۔ اپنے افعال پر ایک قسم کا ضابطہ عاید کر دیا۔ وہ مُنہ اندھیرے اُٹھ جاتی۔ مدھو سودن کے جاگنے سے پہلے ہی جاڑے کے دنوں میں ٹھنڈے پانی سے غسل کر لیتی۔ دبے پاؤں چارپائی اُٹھا کر باہر رکھ دیتی۔ چپکے سے جا کر باورچی خانہ میں چائے بنا کر پیتی اور پھر شال لپیٹے وہیں سکڑی سکڑائی بیٹھی رہتی۔ اُس کی نیند نہ کھل جائے اس ڈر سے وہ ٹارچ یا چھوٹی لالٹین کے ذریعے سے ہی اندھیرے کا مسئلہ حل کرتی۔ بجلی نہ جلاتی۔

دِن چڑھے جب مدھو سودن کا چائے والا پنواڑی آ کر آواز دیتا۔ تو وہ دھیرے سے کنڈی کھول دیتی اور پھر باورچی خانہ میں جا کر اپنا مختصر سا کھانا بنانے میں لگ جاتی۔ ایسے با اخلاق نوجوان کی نظر میں جو عورت کو کپڑے کے تھان سے زیادہ وقعت نہ دیتا ہو، اپنی کسی حرکت سے نیچی نہ ہو جائے اس کا ڈر اُسے ہمیشہ لگا رہتا۔ مدھو سودن جب غسل کے لئے جاتا تو اُس مختصر سے وقفے میں کپڑوں اور بالوں کی معمولی سی سجاوٹ ختم کر کے دفتر جانے کے لئے تیار ہو جاتی تھی۔ چوڑی بارڈر کی سفید ساڑھی پہننا اُسے بہت پسند تھا۔ وہ سر میں پھول لگا نے کی بھی شوقین تھی۔ لیکن یہاں آ کر اُس نے موٹے کھدر کی دھوتی پہننی شروع کر

دی۔ اگر کبھی دل کرتا تو پھولوں کے گچھے کو لوٹے یا گلاس میں سجا کر کتابوں کی اوٹ میں بارج کے کونے میں رکھ دیتی۔ دفتر دونوں ساتھ ہی جاتے تھے لیکن گوری سب سے پہلے بس کا ٹکٹ خریدتی۔ شام کو اندھیرا ہوتے ہی وہ دونوں ٹیوشن کر کے جس وقت گھر لوٹتی تب عموماً مدھوسودن چابی بنواڑی کو دے کر ٹہلنے گیا ہوتا۔ جلدی جلدی کچھ کھا کر گوری بارج میں جا کر کشیدہ کاری میں لگ جاتی یا بیٹھی بیٹھی اونگھتی رہتی۔ لیکن کمرے میں تبھی آتی جب مدھوسودن سو جاتا۔

کیتلی میں سے پودے چار پیالے ختم کر اور بنواڑی کے ہاتھوں بنے ہوئے بے ڈول پکوڑوں کی پلیٹ پیٹ میں اُتار کر جب پرکاش نے مُنہ چلانے سے چھٹی پائی تو گھوم گھوم کر کمرے کی نئی سجاوٹ کو دیکھنے لگا۔ "یار یہ کیا معاملہ ہے" اُس نے مدھوسودن کی بغل میں گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ "یہ کناری دار ساڑھی، یہ لیڈیز شال، یہ بارج میں رکھے سینڈل، تیرا پارٹنر کیا کوئی تھیٹر کا ایکٹر ہے؟ یا پھر کوئی...... بھئی یہ بات ہے تو ہم بھی بنا دیکھے نہیں جائیں گے۔ نکال یار کہاں چھپا دیا ہے؟"

مدھوسودن ہنستا رہا۔

پرکاش نے اُس کا لحاف اُتار کر پھینک دیا۔ پھر اُسے اُٹھاتا ہوا بولا "اُٹھ یار کیا اُسے میرے ڈر سے مکھی بنا کر دیوار میں چپکا دیا ہے، سچ بتا کہاں ہے۔ اگر تیری محبوبہ ہے تو قسم ہے ان بڑھائی مونچھوں کی، جو بُری نظر سے دیکھوں"۔

مدھوسودن نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "رام رام! ایسا مت کہو، بڑی اچھی لڑکی ہے۔ بیچاری مصیبت کی ماری ہے۔ اسی لئے کنواری ہوتے ہوئے بھی........"

"ہاں، ہاں۔ اچھی تو ہو گی ہی" پرکاش بات کاٹ کر بولا۔ "اچھی نہ ہوتی تو تجھے کیسے پھانس لیتی۔ پر وہ ہے کہاں؟"

پرکاش کا مذاق نہ سہہ کر مدھوسودن چڑھ کر بولا "اپنی ہی ہانک رہا ہے۔ وہ معاملہ نہیں ہے۔ اپنی ہی ذات کی ایک بے باپ کی لڑکی ہے۔ دو بھائی ہیں اور ماں ہے۔ کمانے والا کوئی نہیں۔ لڑکی انٹر پاس ہے اس لئے وہ ہمارے ہی آفس میں ٹائپسٹ ہو گئی۔ گھر غازی آباد سے بھی دُور ایک گاؤں میں ہے۔ اس لئے بیچاری مجبور ہو کر پندرہ دنوں سے یہاں رہتی ہے۔ مطلب میرا..... کرائے پر رہتی ہے۔ دہلی میں مکان تو آج کل ملتے نہیں۔"

"ملتے کیوں نہیں۔" پرکاش نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ "ذرا سی جوانی ہو منہ پر پانی ہو، ساڑھی آسمانی ہو۔ نظر دل پر جوانی ہو اور آنکھوں میں پانی ہو۔ دیکھوں پھر کمرہ کیسے نہ ملے۔ یار گوری ہے کہ کالی؟"

"دیکھو، مذاق مت کرو۔" مدھوسودن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں بھی پہلے یہی سمجھتا تھا۔ لیکن لڑکی بڑی با اخلاق ہے۔ ان پندرہ دنوں میں میں نے اُسے آفس میں کسی سے بیکار میں ایک لفظ بھی بولتے نہیں دیکھا۔ اپنے کام سے کام۔ لپ سٹک اور پوڈر تو دُور، میں نے کبھی بالوں میں ٹھیک ڈھنگ سے تیل ڈالتے نہیں دیکھا۔ بہت ہی سیدھے سادے ڈھنگ سے رہتی ہے۔ سب لڑکیاں ایسی ہو جائیں تو انگریزی تعلیم کیوں بدنام ہو۔"

"اوہو! اتنی پسند ہے۔ تب پھر شادی کب کرو گے؟" پرکاش مُنہ بناتے ہوئے بولا۔ "ہے میری ہونے والی بھابی، کہاں ہو؟"

"پھر وہی بدتمیزی۔ وہ تو چھٹی کو دفتر سے ہی گھر چلی جاتی ہے۔ اب کل آفس میں ہی ملے گی۔" مدھوسودن نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "تیری طرح میں نے بھی اُسے تتلی سمجھا تھا۔ اور اسی ارادے سے اُس کی سادگی کو بھی بُرا مان کر اُس کا ایک دو بار اپمان بھی کر بیٹھا۔ پر اب تو اُن باتوں کو سوچ کر شرم آتی ہے وہ مجھے کتنا بدتمیز سمجھتی ہو گی۔"

"معافی مانگ لی ہوتی۔ آدھے مہینے سے ساتھ رہتے ہو۔ کیا بیچ کا اتنا تکلف بھی دُور نہیں ہوا؟"

"ارے یار! گھر کے کس کونے میں وہ رہتی ہے اس کا تو پتہ نہیں چلتا۔ کب کھاتی ہے۔ کب سوتی ہے، میں تو جان ہی نہیں پاتا۔ بڑی اچھی اور سیدھی لڑکی ہے۔ دل میں رحم آتا ہے کہ اگر باپ نہ مرا ہوتا تو کیوں بیچاری کو نوکری کرنی پڑتی۔ کبھی بھول کر بھی میں نے اُسے اپنی طرف نظر اُٹھاتے نہیں دیکھا۔ ایسی لڑکی سے معافی بھی کیسے مانگی جائے۔"

"تب تو معاملہ سنجیدہ ہے۔" پرکاش نے ذرا رُک کر کہا۔ "وہ لڑکی تجھ سے دل ہی دل میں نفرت کرتی ہے۔ تم نے شروع ہی میں اُس سے روکھا برتاؤ کر کے اُسے اپنی طرف سے شکی بنا دیا۔ نہیں تو تیرے کہنے کے مطابق اتنی اچھی لڑکی یوں ہاتھ سے نکل جاتی۔ بھلی لڑکیاں ملتی کہاں ہیں؟ تیری ذات کی بھی ہے۔ شادی ہو جاتی تو بیٹا عمر بھر چین کی بنسی بجاتے۔ پر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ (سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے) میں رامیشور سے مل آؤں تب تک تم شیو کر کے طیار ہو جاؤ۔ آج میٹنی شو دیکھیں گے۔ سکنلا

سبھی ناوٹی ہیں۔

پرکاش تو سیٹی بجاتا نیچے اُتر گیا۔ لیکن مدھوسودن کا دل خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ گوری کو وہ بہت اچھی اور سیدھی سادی لڑکی سمجھنے لگا تھا۔ گوری کی نظروں میں کہیں نیچے نہ گر جاؤں اس خیال سے اگر وہ گوری سے کوئی بات کہتا بھی تو بہت ناپ تول کر ——— وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ اس لئے اس کی طرف کبھی نہیں تاکتی۔ یہ خیال اُسے بے چین کرنے لگا۔ اور ساتھ ہی پرکاش کا وہ اشارہ بھی بچھو کے ڈنک کی طرح تڑپانے لگا کہ وہ اسی کی ذات کا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اُسے اپنا زندگی کا ساتھی بنا کر ایک آرام دہ خانگی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن گوری تو اس سے نفرت کرتی ہے۔ گذشتہ واقعات ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ ممکن ہے پرکاش کی بات ٹھیک ہو۔ ابھی پرسوں ہی تو بس کے ٹکٹ کے پیسے نہ ہونے سے اُس نے کنڈکٹر سے دوسرے دن دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن پاس بیٹھے مدھوسودن سے ایک دونی تک اُدھار نہ مانگی۔

موٹے رام بنیاڈی کے ہاتھ اُس نے ٹیوشن پر عرضی بھجوائی۔ میرا ہوٹل ونیچ کیا میرے ہاتھ نہ بھیج سکتی تھی۔ بھلا بھیجتی کیسے۔ میں نے تو پہلے ہی اُجڈ کی طرح اُس کی چائے تک نہ لی۔ میرے گنوارپن کی بھی کوئی حد ہے۔ موٹے رام سے دونوں وقت چائے بنوا کر پیتا ہوں۔ پر ایک دن بھی اُسے چائے پر نہیں بلایا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ گوری اُس کے چائے پیتے وقت کبھی کمرے میں رہتی ہی نہیں۔ اُف، اتنی اچھی لڑکی اُس نے ہاتھ سے کھو دی۔ ایسی سیدھی سادی۔ محنتی۔ شیریں زبان . . . . یہی نہیں۔ وہ دل سے اُس سے نفرت کرتی ہے۔ وہ کیسے اُس کا شبہ دُور کرے کہ وہ بے رنگ و بُو اور بداخلاق نہیں ہے۔ مدھوسودن پریشانی کی وجہ سے لیٹا نہ رہ سکا۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ گذشتہ ایک ایک برتاؤ۔ ایک ایک بات اُسے تکلیف پہنچا رہی تھی۔ کیسے وہ گذشتہ باتوں کو بھلا کر نئی زندگی کا آغاز کرے۔

دہلی کے پتے پر گوری نے اجیت کا خط منگوایا تھا۔ پوسٹ مین کی پکار کی طرف اُس کے کان لگے تھے۔ آفس کو دیر ہو رہی تھی لیکن وہ دروازے پر کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ پہلے سوا نو کے بعد مدھوسودن اکیلا ہی دفتر چلا جاتا تھا۔ لیکن آج بڑی نرمی سے اُس نے پوچھا۔ "مس شرما کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر ٹھیک نہ ہو تو آرام کیجئے میں عرضی دے دوں گا۔" گوری نے سہم کر آہستہ سے جواب دیا۔ "نہیں میری ایک سہیلی آنے والی تھی۔ اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

مدھوسودن نے لہجے کو اور نرم کرتے ہوئے کہا۔ "کہیئے تو رکشا لے آؤں اُن سے ملتے ہوئے پھر آفس چلے چلیں گے۔"

گوری ڈر گئی۔ خط اگرچہ اُس کے منگیتر کا ہی آنا تھا۔ پھر بھی اُس نے سوچا۔ میں شادی سے پہلے ہی خط و کتابت کرتی ہوں۔ یہ جان کر وہ اپنے دل میں مجھے کتنا گرا ہوا تصوّر کریں گے۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "نہیں مسٹر شرما! آپ کیوں لیٹ ہوتے ہیں۔ میں دس بجے تک انتظار کرتی ہوں پھر آفس چلی جاؤں گی۔ صاحب سے میں دیر میں آنے کو کہہ آئی تھی۔"

بادلِ ناخواستہ مدھوسودن سیڑھیاں اُتر گیا۔ شام کو جب ٹیوشن کر کے گوری واپس آئی تو روزمرہ کے خلاف آج مدھوسودن کمرے میں بیٹھا تھا۔ گوری کو دیکھ کر اُس نے ایک ہلکی سی آہ بھری۔ ماتھے کو دبایا اور سر کو کرسی پر ٹیک دیا۔ گوری نے سمجھ لیا کہ سر میں درد ہے۔ لیکن ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہنے کی اُسے ہمت نہ پڑی۔ نہ جانے وہ اسے بھی کہیں عورتوں کی مایا ہی نہ سمجھیں نیچے اُتر کر اُس نے موٹے رام کو بلا کر اسپرین منگائی اور اُسی سے مدھوسودن کو دینے کے لئے کہہ کر آپ چپ چاپ بارچی میں جا کر چائے بنانے لگی۔

"بابوجی، لو، اسپرین کھا لو۔" موٹے رام نے آ کر کہا۔ "آج صبح کو چائے نہیں پی، اسی سے سر میں درد ہو گا۔" مدھوسودن نے آنکھیں کھول کر کہا۔ "تجھے کس نے کہا کہ سر میں درد ہے۔ تیرے ہاتھ کی ردّی چائے پیتے پیتے ہی تو سر میں درد رہنے لگا ہے۔ اتنی مدّت ہو گئی پر چائے بنانا نہ آیا تمہیں۔"

ایک تو وہ دوا لایا۔ روزانہ دونوں وقت چائے بنا کر دیتا ہے۔ اس پر یہ رُعب ——— "رکھے رہیں یہ چار روپے مہینہ۔" موٹے رام نے پڑیا میز پر پٹکی اور بولا ——— "تو بابو آپ کی انگیٹھی اُوپر پہنچا دوں گا۔ خود اچھی بنا کر پی لینا۔"

"ارے بھائی ——— ناراض مت ہو۔ بنیا تو تیرے ہی ہاتھ کی ہے۔ بھلا میں کہاں بناتا پھروں گا۔" پُر امید نگاہوں سے مدھوسودن نے بارچی کی طرف دیکھا۔ گوری چائے بنا کر گھونٹ بھر رہی تھی۔ خود کو سنبھال کر اُس نے بلند آواز میں کہا۔ "میاں مر بھی جاؤں گا تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ جا بنا

ایک پیالہ۔"

گوری کا گھونٹ کڑوا ہو اُٹھا۔ یہ کیسا طنز؟ کیا وہ ایک پیالہ چائے کہنے پر نہ بنا دیتی اور بنا کے وہ کیسے بنا دے؟ اُسے پہلے دن کی چائے کی گفتگو بھولی نہ تھی۔ اُس نے بڑے آرام سے پوچھا۔ "مسٹر شرما۔ ابھی چائے کیتلی میں گرم ہے۔ آپ چاہیں تو ایک پیالہ بنا دوں۔"

"دیجیے نا۔" مدھوسودن جلدی سے بولا۔ "آپ تو پہلے ہی پیئے جا رہی ہیں۔"

گوری نے موتے رام کے ہاتھ چائے بھجوا دی۔ وہی موٹے کھردرے کتھا چونے سے لتے پتے ہاتھ۔ مدھوسودن کو پینے میں لُطف نہ آیا۔

گوری سوئیٹر بن رہی تھی۔ مدھوسودن حیران تھا کہ بھائیوں کے لئے بُن چکی ہے۔ اپنے بھی دو سُئیٹر ہیں۔ اب یہ بڑے سائز کا مردانہ سلیٹی رنگ کا سوئیٹر کس کے لئے؟ اور کیسے سفید ململ میں لپیٹ کر احتیاط سے رکھتی ہے۔ کیا اُس کا کوئی محبوب ہے؟ ضرور ہوگا۔ ایسی سلیقہ شعار محنتی لڑکی سے محبت کرنا کوئی بھی خوش قسمتی سمجھیگا۔ لیکن کیا اب مدھوسودن کو کوئی اُمید نہ رکھنی چاہیئے۔ اپنی بے وقوفی سے اُس نے دیر کر دی۔ لیکن کیا وہ کسی اور سے خوبصورتی میں کم ہے۔ اُس نے گوری سے پوچھا "مس شرما! یہ اپنی نازک اُنگلیوں سے آپ کس خوش قسمت کا پل اوور بُن رہی ہیں؟"

اچانک اس تیز لہجے کو سن کر گوری ششدر ہو گئی۔ بات ٹالنے کو وہ روکھی ہنسی ہنس کر بولی۔ "آپ بنوا لیجئے گا۔ لائیے آپ کو بھی بُن دوں۔"

"ہمیں آپ یہی دے دیں۔" مدھوسودن اُس کے نزدیک آکر بولا۔ "کتنی پیاری بُنائی ہے۔"

گوری نے دھیمے سے کہا۔ "یہی بُنائی ڈال دوں گی۔"

"تو آخر آپ یہی کیوں نہ دے دیں۔ کیا یہ کسی بہت عزیز کے لئے بُن رہی ہیں؟"

شرم، تکلیف اور ہچکچاہٹ سے گوری کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ زمین پر نظریں گاڑ کر بولی۔ "مجھے معاف کریں گے مسٹر شرما..... یہ پُل اوور میرے ہونے والے شوہر کا ہے۔" اور وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ یہ درویش دل نوجوان اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا۔ کہ شادی سے پہلے ہی آنکھیں لڑا بیٹھی ہے۔ اُسے کیسے سمجھاؤں۔

"شوہر کا یا بیوی کا" مدھوسودن کی آواز خشک ہو گئی۔

"بھائی! میری سگائی تو ہو چکی ہے۔" گوری نے نرمی سے جواب دیا۔

"اچھا۔" مدھوسودن کے دل پر جیسے گھونسا لگا۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں آ گیا۔ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ وہ اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی۔ کیسی خلاف تہذیب بات میرے منہ سے نکل گئی۔ میں بھی کتنا بدقسمت ہوں۔ اگر پہلے ہی دیکھ بھال کرتا تو کیا آج یہ میری آنکھوں کے سامنے ہی کسی غیر کی ہو جاتی۔ بےکلی کی گرمی سے مدھوسودن کے آنسو نکل آئے۔ لیکن اُسے پہلے سے بھی زیادہ بے لوث طریقے سے برتاؤ کرنا ہوگا۔ نہیں تو اُس کی نظروں میں میں ایک غنڈے سے زیادہ نہ رہ جاؤں گا۔

مدھوسودن جانے کب سو گیا۔ پر گوری تو اس رات سو ہی نہیں سکی۔ نہیں اب اس کمرے میں وہ اور زیادہ نہیں رہے گی۔ کہیں بھی ہو الگ انتظام کریگی۔ وہ سوچتے ہوں گے۔ صرف دنیا کو دکھانے کے لئے میں کھدر پہنتی ہوں۔ پوڈر لپ سٹک اور کریم استعمال نہیں کرتی اور اندر ہی اندر کسی کو چاہتی ہوں۔ ابھی تو وہ غیر مرد ہی ہیں۔ جب تک شادی نہیں ہو جاتی۔

دوسرے دن دونوں ہی ایک دوسرے کو نظریں اُٹھا کر دیکھ نہ سکے۔ شام کو گوری نے ہمت کر کے کہا۔ "آپ کو ضرورت ہو تو میں یہی پُل اوور دے دُوں۔ کل تک طیار ہو جائے گا۔"

"شکریہ مس گوری۔ میں کسی کا جوٹھا نہیں کھاتا۔" ارے یہ کیا کہہ گیا وہ۔ دوسری ہی سے وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں اُتر گیا۔ اُس دن رات بھر نہ لوٹا۔ قدسیہ باغ کے ایک کونے میں رات کاٹ دی۔ وہ کیسے معافی مانگے، کیسے اُس کے سامنے جائے۔

سورج کی شعاعوں نے جب زمین پر سے اوس کی چادر تک اُتار لی تب وہ جانے کیسے ہمت کر کے گھر کی طرف چلا۔ آفس جانے کے لئے کپڑے بھی بدلنے تھے گھر آ گیا۔ دُور سے ہی اُس نے دیکھا۔ دروازے پر تانگہ کھڑا ہے اور موتے رام اُوپر سے سوٹ کیس اُتار کر اس میں رکھ رہا ہے۔ کیا گوری جا رہی ہے؟ وہ لپک کر پہنچا۔ گوری سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔

پریشانی کی حالت میں مدھوسودن نے پکارا:۔ "گوری۔"

"بھائی..... نہیں نہیں مسٹر شرما۔" گوری نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "مجھے معاف کرنا۔ آپ کو اتنے دن بہت ہی تکلیف دی۔ پریشانیوں کا تو ٹھکانا ہی نہیں رات مجھے ایک جگہ مل ہی گئی۔ یہ لیجئے بجلی اور کرائے کے پیسے۔"

مدھوسودن کے ہاتھ میں آیا ہوا نوٹ وہیں گر پڑا۔

غزلیات

عطاالرحمٰن کاکوی

ساقی کی چشمِ ناز میں مے کی کمی نہ تھی
یہ اپنا ظرف تھا کہ مجھے بے خودی نہ تھی

دل دیکھنے میں خوش تھا مگر کچھ خوشی نہ تھی
اک طنز تھا زمانے پہ لب پر ہنسی نہ تھی

خالی پیالہ منہ سے لگائے ہوئے رہے
پاسِ ادب تھا بزم کا یہ سادگی نہ تھی

ساقی خدا سے خیر منا اپنی بزم کی
مستوں کو چھیڑنا بھی کوئی دل لگی نہ تھی

زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں تھی وقتِ خواب
تھا چاند دیکھنے کو مگر چاندنی نہ تھی

کس طرح بچتا خرمنِ ہستی عطا کا آج
بجلی کی کوند تھی یہ تمہاری ہنسی نہ تھی

یعقوب عثمانی

خوش فہمیوں کو غور کا یارا نہیں رہا
طوفاں کی زد سے دور کنارا نہیں رہا

بڑھ بڑھ کے ڈھونڈتے ہیں پناہیں نئی نئی
فتنوں کو تیرگی کا سہارا نہیں رہا

بیتابیاں بہانۂ تمنا بڑھا گئیں
نقدِ سکوں گنوا کے خسارا نہیں رہا

قائم تھا جس کے دم سے بھرم احتیاج کا
ہمت کو وہ کرم بھی گوارا نہیں رہا

نازاں ہے اپنی فتح پہ اس طرح موت آج
جیسے کوئی حیات کا مارا نہیں رہا

خورشیدِ انقلاب کا آئینہ ہو تو ہو
مژگاں سے گر کے اشک ستارا نہیں رہا

یعقوب لمحے لمحے سے ظاہر ہے بے رخی
ساحل نوازِ وقت کا دھارا نہیں رہا

تلوک چند محروم

ہنسی پھولوں کی ہو کر گلستاں کچھ اور کہتی ہے
مگر بلبل بہ اندازِ فغاں کچھ اور کہتی ہے

مرا دل مجھ کو ضبطِ آہ پر مجبور کرتا ہے
زبانِ شعلۂ سوزِ نہاں کچھ اور کہتی ہے

حبابِ بحر کا دم ٹوٹتا ہے اور ساتھ اس کے
نشاطِ رقص میں موجِ رواں کچھ اور کہتی ہے

مسیحا کو ادھر دعویٰ ہے مُردوں کے جلانے کا
ادھر نبضِ مریضِ ناتواں کچھ اور کہتی ہے

خلوصِ بے ریا کمیاب ہے تہذیبِ حاضر میں
کہ دل میں اور کچھ ہے اور زباں کچھ اور کہتی ہے

مہ و خورشید و انجم کی ضیاباری بجا لیکن
زمیں کی تیرگی اے آسماں! کچھ اور کہتی ہے

مذاقِ عاشقی سے حضرتِ محروم منکر ہیں
مگر رنگینیٔ حسنِ بیاں کچھ اور کہتی ہے

نریش کمار شاد

اک تخیل ہے جو محتاجِ بیاں رہتا ہے
ہائے وہ حسن جو بے نام و نشاں رہتا ہے

رہ گیا ذوقِ تماشہ بھی تماشہ بن کر
ایک عالم مری جانب نگراں رہتا ہے

سب جسے دشمنِ جاں کہتے ہیں وہ درد ترا
خون بن کر مری رگ رگ میں رواں رہتا ہے

زندگی گوش بر آواز ہوئی ہے جب سے
ہر نفس پر تری آہٹ کا گماں رہتا ہے

یاد آجاتی ہے جب تیرے تبسم کی ہمیں
دیر تک دل میں چراغاں کا سماں رہتا ہے

موت بھی زیست ہے اس رزم گہِ ہستی میں
بوالہوس ہیں جنہیں اندیشۂ جاں رہتا ہے

اہلِ احساس کو اس درد بھری دنیا میں
اپنے آلام کا احساس کہاں رہتا ہے

واہ کیا شعبدہ ہے شاہدِ فطرت کا جمال
رُک کے نظروں میں بھی نظروں سے نہاں رہتا ہے

میرا احساس ہے یا کوئی جہنم یا رب
جو بہ ہر لمحہ دل و جاں میں تپاں رہتا ہے

شاد یہ دل کا فسانہ بھی فسانہ ہے عجب
جو بیاں ہو کے بھی محتاجِ بیاں رہتا ہے

خواجہ احمد فاروقی

غالب کا اُردو دیوان

غالب کا تصحیح کیا ہُوا

غالب کی زندگی میں اُن کے اُردو دیوان کے پانچ اڈیشن شائع ہوئے تھے

پہلا اڈیشن ۱۸۴۱ء

(۱) دہلی کے قیام نے غالب کی شاعرانہ زندگی پر بڑا اچھا اثر کیا۔ انھوں نے معترضین کے کہنے سننے سے وہ غلط روش چھوڑ دی۔ جس میں "مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا" اور مولوی فضل حق اور مرزا خانی کے اصرار سے اُردو دیوان کا وہ انتخاب بھی کیا جو اب تک رائج ہے۔ یہی انتخاب پہلی مرتبہ سید المطابع سے جو سر سید احمد خاں مرحوم کے بھائی سید محمد خان بہادر نے قائم کیا تھا۔ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ مرزا نے جس دیوان سے انتخاب کیا تھا۔ وہ بھی نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مرزا کے انتخاب کے شروع میں اُن کا فارسی دیباچہ اور نواب ضیاالدین خاں کی وہ تقریظ شامل ہے جو سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں نقل کی ہے۔

اس کا ایک نسخہ رام پور کی پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ سرورق پر حسب ذیل عبارت ہے۔

دیوان اسد اللہ خاں صاحب غالب تخلص
مرزا نوشہ صاحب مشہور کا دیوان دہلی میں سید محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانہ کے
لیتھو گرافک پریس میں شہر شعبان
۱۲۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء کو سید عبد الغفور کے اہتمام
میں چھاپا ہوا[1]

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو غالب کی شعر گوئی مقالہ امتیاز علی خاں عرشی ص ۱۱۰ - ۱۱۱

دوسرا اڈیشن ۱۸۴۷ء

(۲) غالب کے اُردو دیوان کا دوسرا اڈیشن ۱۸۴۷ء میں منشی نور الدین کے مطبع دار السلام حوض قاضی دہلی سے شائع ہوا، اس میں بھی غالب کا فارسی دیباچہ اور نیر درخشاں کی تقریظ شامل ہے۔

(۳ و ۴) غدر سے چند روز پہلے مرزا غالب نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ خوش خط لکھوا کر نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کو بھیجا تھا:

غالب منشی شیو نرائن اکبر آبادی کو لکھتے ہیں:۔

"اب تم سنو۔ دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیجا تھا[1]"

مرزا نے اُسی کی ایک نقل نواب ضیاء الدین احمد خاں کو بھی دی تھی۔

۱۸۶۰ء میں مرزا رام پور گئے۔ وہاں میرٹھ کے ایک شخص عظیم الدین احمد کا خط ملا کہ میں آپ کا اُردو دیوان شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اجازت دی جائے۔ نواب شیفتہ نے عظیم الدین احمد کی سفارش کی اور کاپیوں کی اصلاح کا ذمہ لیا۔ مرزا غالب عظیم الدین احمد کو نہیں جانتے تھے لیکن شیفتہ کے اصرار سے مجبور ہو کر نواب ضیاء الدین خاں والا قلمی نسخہ میرٹھ بھیج دیا۔

منشی شیو نرائن آرام مالک مطبع مفید خلائق آگرہ کو جب معلوم ہوا کہ مرزا اپنا دیوان میرٹھ میں چھپوا رہے ہیں تو انھوں نے شکایت کا خط لکھا کہ آپ نے گھر کا مطبع چھوڑ کر اپنا دیوان میرٹھ چھپنے کے لئے کیوں بھیجا۔ غالب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میاں، دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سن لو۔ تب کچھ کلام

[1] اُردوئے معلی ص ۱۳۵ نیز خطوط غالب ص ۴۰۳-۴

کرو۔ میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہنچا۔ سرنامے پر لکھا تھا:

"عرضداشت عظیم الدین احمد من مقام میرٹھ" واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہر حال پڑھا۔ معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں خیر، چپ ہو رہا۔ جب میں رام پور سے میرٹھ آیا۔ بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں اترا۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب، میرے قدیم دوست مجھ کو ملے اُنھوں نے کہا کہ اپنا اُردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجئے گا۔ عظیم الدین ایک کتاب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تم سنو۔ دیوان ریختہ اتم واکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں، میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خان بہادر کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلّی سے رام پور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدّین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوانِ اُردو لے کر، اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر، مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدّین خاں کو دلّی بھیج دیا تھا۔ آمدم بر سر مدعائے سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاالدّین خاں سے لے کر بھیج دوں گا مگر کاپی کی تصحیح کا ذمّہ کون کرتا ہے؟ نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ "میں" اب کہو میں کیا کرتا۔ دِلّی آکر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہات نواب مصطفیٰ خان کے پاس بھیج دیا۔ اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا؟ آج اسی وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور ان کو لکھا ہے: اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو، تو نہ چھاپا جائے۔ اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر دیوان آگیا تو فوراً تمہارے پاس، بھیج دوں گا۔ اور اگر وہاں کاپی شروع ہو گئی ہے تو میں ناچار ہوں۔ میرا کچھ قصور نہیں۔ اور اگر (اس) سرگزشت کو بھی سن کر مجھ کو گنہگار ٹھہراؤ تو اچھا، میرا بھائی، میری تقصیر معاف کیجیو۔ رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے۔ یقین ہے کہ کاپی شروع نہ ہوئی ہو اور دیوان میرا میرے پاس آئے اور تم کو پہنچ جائے۔[1]"

غالب کو وہ نسخہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے مل گیا اور انھیں نے اسے

---

[1] خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد ص ۴۰۳-۴۰۴

پارسل سے منشی شیو نرائن کو بھیج دیا۔ ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:-

"صاحب میں تمہارا گنہگار ہوں۔ تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے۔ بڑی کوشش اور محنت سے اُس کو وہاں نہ چھپنے دیا اور منگوا لیا۔ آج پیر کے دن ۲۵ جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہے۔ لو اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھے اطلاع دو۔ یہ کتاب یعنی دیوان ریختہ تم کو میں نے دے ڈالا۔ اب اس کے مالک تم ہو، میں نہیں کہتا کہ چھاپو۔ میں نہیں کہتا کہ نہیں چھاپو۔ جو تمہاری خوشی ہو سو کرو۔ اگر چھاپو تو بیس جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو اور اچھا میرا میاں ذرا تصحیح کا بہت خیال رکھیو۔[1]"

یہ خط اور یہ دیوان پنڈت گوپی ناتھ کنزرو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

یہ دیوان ہر طرح مکمل تھا۔ ۳ جولائی کے خط میں لکھتے ہیں:

"میاں تمہاری باتوں پہ ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان، جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم واکمل ہے۔ وہ اور کون سی دو چار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں۔ اس طرف سے آپ خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں۔[2]"

منشی شیو نرائن غالباً اس دیوان میں تصویر بھی شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس کے متعلق مرزا غالب لکھتے ہیں:

"تصویر میری لے کر کیا کرو گے۔ بے چارہ عزیز کیوں کر کھچوا سکے گا۔ اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مجھ کو لکھو، میں مصور سے کھچوا کر تم کو بھیج دوں، نہ نذر درکار، نہ نیاز، میں تم کو اپنے فرزندوں کے برابر چاہتا ہوں۔ اور شکر کی جگہ ہے کہ تم فرزندِ سعادت مند ہو۔[3]"

لیکن یہ دیوان ابھی منشی شیو نرائن کے یہاں چھپنا بھی شروع نہیں ہوا تھا کہ غالب نے اس کے چھاپنے کی اجازت محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی شاہدرہ دہلی کو دے دی مگر یہ ایڈیشن (۱۸۶۱ء) اتنا غلط چھپا کہ مرزا نے دو دن اور رات کی محنت سے اس کو صحیح کیا اور تصحیح کیا ہوا نسخہ محمد حسین خاں مالک مطبع کو بھیج دیا۔ غالب کے ہاتھ کا درست کیا ہوا یہ نسخہ جو محمد حسین خاں کو بھیجا گیا تھا۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود اور محفوظ ہے۔

---

[1] خطوط غالب۔ مرتبہ مہیش پرشاد۔ ص ۴۰۴

[2] خطوط غالب ص ۴۰۵ [3] ایضاً

اس کے حاشیہ پر غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت درج ہے :-

" جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخہ کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اسی میں درج کر دیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بیکار محض ہو گیا ہے۔ خاتمہ کی عبارت کیا، میرا بیان کیا، میر قمرالدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں۔ کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ مجلد گویا مسوّدہ ہے۔ اسی کو بھیج دیجئے۔ غالب ۱۲ " [1]

آخر دیوان پر مرزا غالب کی مہر بھی ہے۔ یہ دیوان جس کی اصلاح مرزا غالب نے کی ہے ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ کو طبع ہوا ہے۔ لکھا ہے :

" در مطبع احمدی باہتمام امو جان طبع شد "

تقریظ کی عبارت نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر نے لکھی ہے۔ اس نسخہ میں مرزا غالب نے مندرجہ ذیل عبارت کاٹ دی ہے :

تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء

" داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اُردو تیسری بار چھاپا گیا ہے مخلص وداد آئین میر قمرالدین کی کارفرمائی اور خان صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو۔ مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بدلتا۔ ناچار جا بجا یوں ہی چھوڑ دیا۔ یعنی کسو بہ کاف مکسور و سین مضموم و واوٴ معروف۔ میں نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں البتہ فصیح نہیں۔ قافیہ کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں بلکہ ورنہ (کذا) فصیح بلکہ افصح کسی ہے، واؤ کی جگہ یائے تحتانی میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ کسو بہ واؤ ہے اور سب جگہ کسے بہ یائے تحتانی ہے۔ اس کا اظہار ضرور تھا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے۔ اللہ بس ماسوا ہوس "

اس دیوان میں قطعات اور رباعیات بھی ہیں۔ ذیل کا قطعہ اور جگہ بھی دیکھا ہے لیکن اس کا چوتھا شعر دیکھنا اچھی طرح یاد نہیں۔ اس وقت حضرت جوش ملسیانی والا ایڈیشن میرے سامنے موجود ہے۔ اس میں یہ شعر درج نہیں ہے [1]

ہے چار شنبہ آخرِ ماہ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مے مشک بو کی ناند

جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

غالب یہ کیا بیان ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتِ خواند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

محمد حسین خاں نے یہ نسخہ جس پر مرزا غالب نظر ثانی کر چکے تھے محمد عبدالرحمٰن خاں مہتمم مطبع نظامی کانپور کو بھی بھیجا تھا [2]

چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۲ء

اس طرح دیوان اُردو کا تیسرا ایڈیشن جولائی ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی شاہدرہ سے اور چوتھا ایڈیشن جولائی ۱۸۶۲ء میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا

پانچواں ایڈیشن ۱۸۶۳ء

غالب کے دیوان کا پانچواں ایڈیشن وہ ہے جو منشی شیو نرائن نے ۱۸۶۳ء میں بغیر تصویر کے شائع کیا۔

---

[1] دیوانِ غالب تصحیح کردہ غالب مملوکہ کتب خانۂ آصفیہ

[1] دیوانِ غالب (طبع اوّل) مرتبہ جوش ملسیانی ص ۲۴۷ و ۲۴۸ [2] ذکرِ غالب (طبع ثانی) ص ۱۳۳

مُصدّق

محمد مصلح الدین احمد
بی ایس سی (آنرز)
[illegible] کالج حیدرآباد

ایرانی عوام کے ہردلعزیز قائد نے ۱۸۸۱ء میں شاہی خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ابتدا ہی سے انہوں نے شاہی کے خلاف بغاوت کی۔ اس عمومیت پسند ایرانی کے خاندان کا شمار ایران کے متمول ترین خاندان میں کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود غریبوں کے لئے تڑپنے والا دل اس آہنی انسان کے سینے میں دھڑک رہا ہے۔ آپ کے والد مرزا ہدایت ایران کے بڑے زمیندار اور تیس سال تک وزیر مالیہ تھے۔ آپ کے ماموں شہزادے تھے اور آپ کی والدہ محترمہ نجمہ سلطانہ ایک قاچار شہزادی تھیں۔ ڈاکٹر مصدق کی تعلیم تہران اور سوئٹزرلینڈ میں ہوئی۔ آپ نے فارسی اور عربی کے کلاسیکل ادب پر عبور حاصل کیا۔ آپ قومی زبان فارسی کے اتنے شیدائی ہیں۔ کہ فرانسیسی و انگریزی میں ملکہ رکھنے کے باوجود آپ فارسی ہی میں گفتگو کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ آپ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ذہین ترین طالب علموں میں سے ہیں۔ یہیں سے آپنے قانون کی اعلیٰ ترین ڈگری (ایل۔ ایل۔ ڈی) حاصل کی۔ مسٹر ہنری گریڈی سابق امریکی سفیر برائے ایران کے بموجب "مصدق تو غیر معمولی قابلیت کے آدمی ہیں۔ ان کی تعلیم یورپی جامعات میں ہوئی وہ بہت شائستہ آدمی ہیں اور ایک شریف النسل ایرانی ہیں"۔ پیرس کے قیام کے دوران میں تین سال تک آپ نے سیاسیات و مالیات کا عمیق مطالعہ کیا۔

سیاسی زندگی کا آغاز

آپ نے ایرانی مجلس کے ایک رکن کی حیثیت سے وزارتِ عظمیٰ تک ترقی کی۔ آپ پچاس سال سے سیاسیات میں حصہ لے رہے ہیں۔ شاہ نے جب آپ کو مالیاتی ایجنٹ بنا کر خراسان بھیجا اس وقت آپ کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ دس سال بعد آپ واپس ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں وزارتِ مالیات میں آپ کو نائب معتمد بنا دیا گیا۔ آپ نے سینکڑوں افسروں کو مالی اور سیاسی اسباب کی بنا پر برطرف کردیا۔ جس کے باعث کئی لوگ آپ کے دشمن تھے۔ ان کی تنخواہیں زیادہ تھیں اور یہ غیر ملکی ایجنٹ تھے۔ انہیں کم تنخواہوں پر کام کرنا منظور نہ تھا۔ اس لئے برطرف ہونا پڑا۔ آپ کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ آخر کار آپ پر گولی چل ہی گئی۔ لیکن خوش بختی کہ آپ بچ نکلے۔ جب ایران نے بالجبر برطانیہ سے معاہدہ کیا تو اس کی آپ نے سختی سے مخالفت کی۔

۱۹۲۰ء میں آپ کو صوبہ فارس کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں پہلی دفعہ آپ نے مجلس کی نشست کے لئے کوشش کی اور کامیاب ہوئے اس کے بعد آپ اس سے بھی سبکدوش ہوئے کیونکہ انہیں ۱۹۲۲ء میں وزارت مالیہ کی پیشکش کی گئی۔ بعد میں آذربائیجان کے گورنر جنرل بنا دئے گئے ۱۹۲۴ء میں پھر مجلس (ایرانی سنات) کے لئے منتخب ہوئے اور ۱۹۲۸ء تک رہے پھر ۱۹۴۴ء میں تہران کے نائب منتخب ہوئے۔ آپ نے ہر وقت مجلس میں جو شاہ پرستوں سے بھرپور تھی شاہ کی پرزور مخالفت کی۔

کابینی ریکارڈ

۱۹۲۲ء میں جب آپ کو وزیر مال بنا دیا گیا تو آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اعلیٰ عہدیداروں کی تنخواہوں میں کمی کی۔ جس کی وجہ سے تمام اعلیٰ عہدیدار آپ کے مخالف ہوگئے اور دوبارہ آپ پر گولی چلائی گئی۔ آپ کا خیال تھا کہ اس طرح سے عام لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کیا جا سکتا ہے۔ تودہ پارٹی (کمیونسٹ جماعت) نے آپ کے بڑھتے ہوئے اختیارات کے خلاف احتجاج کیا۔ ڈاکٹر مصدق بحث کرتے کرتے بیہوش ہوگئے۔ نتیجتہً احتجاج واپس لے لیا گیا۔ اسی زمانے میں آپ نے برطانیہ کے خلاف جد وجہد کی اور "ایران ایرانیوں کے لئے" کا نعرہ لگایا۔ آپ نے نہ صرف وزیر مالیہ کی حیثیت سے قوم کی خدمت کی بلکہ وزارت خارجہ کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔ چنانچہ بین الاقوامی قانون کے اس ماہر نے ایرانی وزیر خارجہ کی حیثیت میں کئی کارہائے نمایاں انجام دئے۔ آپ محب وطن کی حیثیت سے ایران کو اس کے جائز اور غصب شدہ حقوق واپس دلوانا چاہتے تھے اس لئے برطانوی سفیر سے آپ کے تعلقات کشیدہ

رہے جو ہر طرح سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے ۱۹۴۴ء تک مغربی صحافت پر آپ کا اثر قائم نہ ہو سکا۔

غیر ملکی اثر کے خلاف جد و جہد

ڈاکٹر مصدق کی خصوصیت ہے کہ وہ صحیح قوم پرور رہنما ہیں جن کے نزدیک ایران اور ایرانیوں کی فلاح مقدم ہے اس لئے آپ ہر اس طاقت کے مخالف ہو جاتے ہیں جو ایران کو ترچھی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کرے شاہی کی مخالفت بھی آپ نے کی ہے۔ برطانوی سامراجیت کے تو سب سے بڑے دشمن ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اقوام متحدہ اور امریکہ تک کو آپ پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے کیونکہ ان کے مطابق ان دونوں نے جانبداری سے کام لے کر برطانیہ کی پیٹھ ٹھونکی اور ایران کو دبانا چاہا۔ آپ کے کہنے کے مطابق "ایران کی تباہی کی ساری ذمہ داری اینگلو ایرانین آئل کمپنی پر ہے اور مسٹر حسین مکی کی تشریح کے بموجب 'ایرانی عوام کی تباہ حالی برطانیہ کی استحصال پسندانہ حکمت عملی کا نتیجہ ہے'"۔ واقعتاً برطانوی روپے نے مرے پر سو درے کا کام کیا۔ روس کے آپ اس لئے مخالف ہیں کہ آپ نہیں چاہتے کہ تیل کے چشمے روسیوں کے زیر تصرف آجائیں۔ اس لئے آپ نے روس کو مراعات دینے کی مخالفت کی۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں مجلس میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا اور ایک بصیرت افروز تقریر کے نتیجے کے طور پر ایران نے قرار داد کو باتفاق آرا منظور کر لیا اگرچہ کہ تودہ پارٹی نے سخت مخالفت کی اور ان کو غدار ٹھہرایا۔ شاید اس لئے کہ مصدق نے اپنے وطن کو روس کے ہاتھوں بیچنے سے انکار کر دیا۔ ایرانی تیل کے چشمے ہمیشہ ایران کی آزادی کے لئے ایک آزمائش بنے رہے۔ اور ہر ملک کی للچائی نظریں ان پر پڑتی رہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں روسی و برطانوی فوجوں نے ایران پر قبضہ کر لیا۔ ایسے نازک موقعہ پر اکیلے مصدق نے بے باکی سے غیر قومی اقتدار کے خلاف آواز بلند کی۔ ۱۹۴۴ء میں شمالی ایران میں روس کو تیل کی مراعات دینے کے سلسلے میں محب قوم ڈاکٹر مصدق نے بڑی دانشمندی سے ایرانی پارلیمان میں ایک بل منظوری کے لئے پیش کیا۔ جس کی رو سے کسی بھی ایرانی عہدیدار کو تیل کے متعلق بیرونی ممالک سے گفت و شنید کرنے کا اختیار نہ دینے کی وکالت کی گئی اور اصرار کیا کہ ایسا کرنے کی صورت میں ۸ سال کی سزا دی جائے علاوہ ازیں آپ نے ایران میں ریل بچھانے کے لئے بیرونی کمپنیوں کو ٹھیکہ دینے کی سختی سے مخالفت کی۔ ڈاکٹر مصدق نے روس کی اس وقت بھی مخالفت کی جبکہ اس نے آذربائیجان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جنرل علی رزم آرا کے دور میں کئے ہوئے معاہدے ہی کی مدد سے جس کی رو سے کسی بھی بیرونی حملے کی صورت میں روس کو مسلح فوجی مداخلت کا حق حاصل ہے۔ آپ نے محض اسی معاہدے کی آڑ لے کر برطانیہ کو آبادان سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا۔ اور اب بھی تیل کی صنعت کے پیدا شدہ بحران سے نپٹنے کے لئے جرمنی اور روس کی طرف جانے کا خیال مستحکم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب جنرل علی رزم آرا نے سوویٹ ایرانین کمرشیل ٹریٹی پر دستخط ثبت کئے تھے تو آپ نے اس کی سخت مخالفت کی تھی بہر حال جس کسی کی بھی آپ نے تائید یا مخالفت کی وہ محض قوم کی خاطر کی۔ حتیٰ کہ رضا شاہ پہلوی اول سابق شاہ ایران کے خلاف آپ کی جد و جہد آپ کی حریت نوازی، جمہوریت پسندی اور قوم پروری کا نتیجہ تھی۔ شاہی خاندان میں جنم لینے کے باوجود جمہوری خیالات دماغ پر حاوی ہیں اور عقیدہ ہے کہ ایرانی عوام کا مفاد شاہی کے خاتمے میں مضمر ہے۔ یہی وہی نصب العین ہے جس کی وہ گزشتہ پچاس سال سے علمبرداری کرتے آرہے ہیں اور جس کے حصول کے لئے آپ نے رضا شاہ سے ٹکر لی اور جلا وطن ہوئے اور اس کے بعد موجودہ شاہ سے اختلاف کیا اور مستعفی ہوئے تھے۔ شاہ پرستوں کے ہجوم میں جمہوریت کا نعرہ لگانے والا پہلا فرد یہی تھا۔ اسی کا رد عمل ۱۹۲۸ء میں بادشاہ کا مصدق کے نام جلاوطنی کا حکم تھا۔ عوام کے سوتے ہوئے شعور اور غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شہنشاہ نے من مانی کرنے کے لئے بے لاگ و بے باک نقاد کو دور کرنا چاہا۔ جب ڈاکٹر مصدق نے دیکھا کہ اس طرح وہ قومی خدمت کے موقع سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ تو انہوں نے شاہی کی مخالفت عارضی طور پر موقوف کر دی جس کے منصوبوں سے بچنے کے لئے دو مرتبہ انہیں محل میں پناہ گزین ہونا پڑا تھا۔ دو مرتبہ آپ گرفتار بھی ہوئے پہلی دفعہ جنگ عظیم سے رضا شاہ کے ریل کے ٹھیکے برطانیہ کو دینے کے منصوبے کی مخالفت کے باعث اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۰ء میں من گھڑت الزامات کے تحت شاہ کے حکم پر آپ کو جیل بھیجا گیا۔ جب اس کی اطلاع ان کی سالہ سالہ چہیتی صاحبزادی "خدیجہ" کو ہوئی تو وہ بیہوش ہو گئیں اور اعصاب اتنے متاثر ہوئے کہ وہ اب تک زیر علاج ہیں یہ المناک واقعہ ڈاکٹر مصدق کو یاد آتے ہی اشکبار

بنا دیتا ہے۔ ۴½ ماہ کی قید میں آپ نے اتنی صعوبتیں برداشت کیں کہ اب تک آپ کی صحت سنبھل نہ سکی۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر مصدق کی تمام تر جسمانی کمزوری جیل کے ان مصائب کا نتیجہ ہے جو جمہوریت کی خاطر آپ نے جھیلے۔ بعد ازاں آپ کو رہا کر دیا گیا۔

وزارت عظمیٰ پر انتخاب

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں آپ کی پیش کردہ قرارداد کی بالاتفاق منظوری نے آپ کی مقبولیت و شہرت کو چار چاند لگا دئے اور آپ کا ہم خیال طبقہ پیدا ہو گیا۔ اس طرح آپ نے اپنی جماعت "قومی محاذ" کی تشکیل کی جس کے آپ قائد ہیں۔ جب سے وزیر اعظم منتخب ہونے تک آپ نے اس ادارے کی خاموش خدمت انجام دی۔ اور مظلوم کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔ اگرچہ اس دوران میں آپ کا کابینہ سے تعلق منقطع ہو گیا تاہم آپ مجلس کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ آپ کی جماعت نے ۱۹۵۱ء سے پہلے تک کبھی کوئی نمایاں جماعتی موقف حاصل نہیں کیا حتیٰ کہ جب آپ کو قوم نے وزیر اعظم منتخب کیا تو مجلس میں "قومی محاذ" کے صرف سات نائبین تھے۔ لیکن اقلیت میں ہونے کے باوجود آپ کی جماعت نے قوم کی صحیح نمائندگی کی۔ آپ نے وقت کی رفتار کا اندازہ لگا کر پہلے ہی سے تیل کے قومیانے کا خیال مضبوط کیا۔ اور اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے عزائم کا پردہ چاک کیا۔ اس کی کارگزاریوں اور موجودہ صورت حال کا تجزیہ کیا اور تیل کے قومی ملکیت قرار دینے کی وکالت کی لیکن اس وقت مجلس میں ایرانی عوام کے صحیح نمائندے نہیں تھے اور نہ ہی کابینہ ایرانی مفاد کا کوئی خیال رکھتی تھی۔ ایران کی اس بے اندازہ دولت کو ایران کے سینے سے چرا کر اور ایران کو فاقہ کش بنانے والی کمپنی نے اپنے کٹھ پتلیوں کو کابینہ کی کرسی پر لا بٹھایا تھا اس لئے وہ ذور لہ حق نمک ادا کرتے پڑتے تھے۔ اور ایران کے داخلی امور میں مداخلت کرنے والی اس کمپنی کے تسلط کے خاتمے کے لئے اٹھائی ہوئی آواز کو حکومت دبانے کی کوشش کرتی رہی۔ ہر دفعہ ایسے افراد برسر اقتدار لائے جاتے جو کمپنی کے اندھے مقلد اور قدیم نمک خوار ہوتے۔ چنانچہ ڈاکٹر مصدق سے قبل کی تمام وزارتیں عوام کی ترجمان ہونے کی بجائے کمپنی اور برطانیہ کی ترجمان ہوا کرتی تھیں۔

تیل کی صنعت اور مصدق ۔ آپ کے وزیر اعظم منتخب ہو جانے کے بعد سب سے اہم مسئلہ تیل کی صنعت کو قومیانے کا تھا۔ شاید اسی کارنامے کی انجام دہی کے لئے قوم نے آپ کو منتخب کیا تھا۔ اور شاید اسی مقصد کے لئے آپ کو تاریخ نے جنم دیا تھا۔ اُن کے اس کارنامے نے انہیں تاریخ عالم میں لافانی کر دیا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں اینگلو ایرانین آئل کمپنی اور حکومت ایران کے مابین ایک ۶۰ سالہ معاہدہ ہوا تھا۔ اور جس کی رو سے کمپنی کو ۱۹۹۳ء تک تیل کی مراعات حاصل ہو گئی تھیں جو دو میقات پر مشتمل تھیں۔ پہلی میقات ۲۹ اپریل ۱۹۳۳ء تا ۲۹ اپریل ۱۹۶۳ء اور دوسری میقات اگر ۱۹۶۱ء سے شروع ہو تو ۳۲ سال بعد ۱۹۹۳ء میں ختم ہوتی۔ اس معاہدہ ۱۹۳۳ء کنونشن کے باعث کمپنی کو کساد بازاری جاری رکھنے کی کافی مہلت مل گئی۔ اور ڈاکٹر مصدق اسی کا انفساخ چاہتے تھے۔ کیونکہ اس کنونشن کی توثیق قوم کے صحیح نمائندوں نے نہیں کی۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۰ء کے مجلس کے اجلاس میں ڈاکٹر مصدق قائد قومی محاذ نے قومیانے اور ۱۹۳۳ء کے کنونشن کے فسخ کرنے کے متعلق سترہ ۱۷ صفحات پر مشتمل ایک تقریر کی۔ جس میں کمپنی کے کام کا تفصیلی جائزہ لیا اور حقیقی صورت حال کو بے نقاب کر دیا۔

ایران میں تیل کی سالانہ پیداوار ہر سال بڑھتی رہی مثلاً ۱۹۳۸ء میں ایک کروڑ تیس لاکھ ٹن تھی جو بعد جنگ ۱۹۴۵ء میں ۵ ارب بیرل تک جا پہنچی۔ حتیٰ کہ کمپنی کے آخری ایام میں آبادان سے (دنیا کا سب سے بڑا تیل صاف کرنے والا کارخانہ) ۲ کروڑ پچاس لاکھ ٹن خالص پٹرولیم ہر سال نکلتا تھا۔ تیل کی دوسری ضمنی پیداواروں کا بھی یہی حال تھا۔ ۱۹۴۰ء میں ان کی مقدار ۱۵ ملین ٹن تھی۔ اس طرح تیل پیدا کرنے والے ممالک میں ایران کا چوتھا نمبر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کمپنی کبھی صحیح اعداد و شمار منظر عام پر نہیں لاتی تھی اس کی طرف سے شائع کردہ بیلنس شیٹ کی نہ کوئی چھان بین ہوتی تھی اور نہ حکومت ایران کی سرکاری توثیق۔ یہ سب کچھ ایران کو تیل کی آمدنی کے صحیح اندازے سے محروم رکھنے کے لئے کیا گیا۔ ۲۹ اپریل ۱۹۳۳ء کو ایک کنونشن ہوا اور اس کے بعد ایک ضمیمہ معاہدہ بھی۔ کنونشن کے دفعہ ۱۱ کی رو سے ۴۷-۱۹۳۳ء سالانہ پیداوار میں سے پہلے ۶۰ لاکھ ٹن کے لئے رائلٹی بحساب ۹ پنس فی ٹن اور ہر زائد ٹن کے لئے بحساب ۶ پنس فی ٹن ادا کرتی رہی۔ اس میں منافع و محصول دونوں شامل تھے۔ اس حساب سے کمپنی ۲۲۵۰۰۰ پونڈ سالانہ ادا کرتی رہی اور آئندہ پندرہ سال (۶۲-۱۹۴۸ء) کے لئے کمپنی کو

چھیلے ۶۰ لاکھ ٹن کے لیے بحساب ایک شلنگ فی ٹن اور ۹ پنیس یا ۳/۴ شلنگ فی ٹن کے لیے کے حساب سے جملہ منافع، محصول اور متوقع محاصل ملا کر ۳۰۰،۰۰۰ پونڈ دینے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ایران کو بطور رائلٹی صرف ۷ ملین پونڈ ملے۔ ۱۹۴۸ء میں کمپنی کے بیلنس شیٹ کے بموجب چھ کروڑ ۲ لاکھ پونڈ صرف نفع ہوا۔ جبکہ مسٹر غلام حسین فروہر وزیر مالیہ کے بیان کے مطابق "ایران کو صرف ۱۴ لاکھ پونڈ ملے۔ یہ رقم اس رقم کے ۲۱ ویں حصے سے بھی کم ہے جو کمپنی برطانیہ کو ادا کرتی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں مرحوم کمپنی نے ۵۰۰ یا ۵۵۰ ملین پونڈ کا صرف نفع کمایا۔ اس بھاری رقم سے ایران کو صرف ۴۵ ملین پونڈ بطور رائلٹی کے ملے (۱ ملین = دس لاکھ) سر گلیڈون نے صیانتی مجلس میں کہا کہ کمپنی کا منافع ۱۴ ملین پونڈ سے اونچا رہا اور اتنی ہی رقم کمپنی نے ایران کو اب تک بطور رائلٹی کے ادا کی ہے۔ گویا کمپنی کا صرف ایک سال کا منافع خود برطانیہ کے کہنے کے مطابق (ایران کا حصہ ادا کرنے کے بعد) ایران کو گذشتہ پچاس سال میں ادا کی گئی جملہ رقم کے مساوی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ایران کے قومی موازنہ کا ۶ء ۱۵ فیصد حصہ کمپنی کی جانب سے ادا کی جانے والی رائلٹی (بشمول ٹیکس و حصہ نفع) پر مشتمل تھا جو ۱۹۴۹ء میں گھٹ کر ۹ء ۱۴ فیصد ہو گیا۔ جبکہ اس کے برخلاف کمپنی کا اس سال کا منافع ایران کے کل قومی موازنہ کے دگنے سے بھی زیادہ تھا۔ ایران کی قومی آمدنی میں کمپنی کا حصہ آگے چل کر صرف دس فیصد رہ گیا۔ جبکہ کمپنی نے ایران سے جو کچھ لیا (اس کے اپنے اعداد و شمار کے بموجب) ایران کی قومی آمدنی کا ۳۰ ٪ تھا۔ سابق امریکی سفیر برائے ایران ڈاکٹر ہنری گریڈی نے بھی ایک دفعہ نیویارک میں فرمایا تھا موجودہ قیمتوں کے لحاظ سے ۲ سال قبل جولائی میں رائلٹی ۱۳ تا ۱۵ ملین پونڈ تھی اگر معاہدہ کی توثیق ہو جاتی تو ۲۵ تا ۳۰ ملین پونڈ کی زیادہ سے زیادہ توقع تھی۔ جبکہ خود کمپنی کا منافع ہی دس کروڑ پونڈ سے زائد تھا۔ کمپنی صحیح اعداد و شمار سامنے نہیں لائی۔

ڈاکٹر مصدق نے بجا فرمایا تھا "میرے ملک میں تیل کی صنعت برطانوی کوششوں سے نہیں بلکہ میرے ملک کے عوام کے خون اور پسینہ سے قائم ہوئی ہے" انہوں نے صیانتی مجلس میں "بین الاقوامی ادارۂ عمال" کے سروے کے حوالے سے ثابت کیا کہ مزدوروں کے قیام اور صحت کا معیار بہت گرا ہوا ہے۔ ۱۹۳۳ء کے کنونشن کے دفعہ ۱۶ کے فقرے ۳ کی رو سے طے پایا تھا کہ غیر ایرانی ملازمین کو ہر سال پابندی سے کم کیا جائے گا اور ان کی جگہ ممکنہ عجلت کے ساتھ ایرانیوں کو لیا جائے گا۔ اگر اس کے مطابق عمل ہوتا اور ۲ ہزار کے غیر ملکی عملے سے ہر سال ایک سو کو چھانٹ کر ایرانیوں کو موقع دیا جاتا تو کنونشن کے پندرہ سال بعد یعنی ۱۹۴۷ء تک ان کی تعداد گھٹ کر صرف پانچ سو رہ جاتی۔ لیکن اس کے خلاف اس تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۳۳ء کے ۲ ہزار غیر ایرانی ملازمین ۱۹۴۷ء تک ۴۲۰۰ ہو چکے تھے۔ یعنی ابتدائی تعداد کا چوتھائی ہونے کی بجائے دگنے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ صرف آبادان کے کارخانے میں ستر ہزار ملازمین ہیں جن میں سے پانچ سو سے زائد برطانوی ماہرین ہیں۔ انگریزوں نے ایرانیوں سے صرف مزدوروں کا کام لیا اصل فنی کام سے انہیں دور ہی رکھا۔ اگر کسی ایرانی ماہر کو موقع بھی دیا گیا تو اس کے ساتھ ناگوار سلوک روا رکھا گیا جس پر ان ایرانیوں نے معمولی کاروبار کرنے کو ترجیح دی۔ اس طرح ان کی صلاحیتوں کو کمپنی نے قتل کر دیا جبکہ ایرانی مزدور تلاش تھا ۱۹۴۷ء میں ۴۲۰۰ غیر ایرانی برطانوی ملازمین جن کی تعداد از روئے معاہدہ اس سال تک صرف ۵۰۰ ہونی چاہیئے تھی فی کس ایک سو پونڈ ماہانہ کما رہے تھے اس طرح انہوں نے تقریباً چالیس لاکھ پونڈ کی رقم ہڑپ کر لی جو ایرانیوں کو ملتی تھی۔ سر گلیڈون نے جب صیانتی مجلس میں بڑے فخر سے اس بات کا تذکرہ کیا کہ ہم نے ایرانیوں کو ملازم رکھ کر انہیں بہتر معاشی موقف عطا کیا اور ترقی دی۔ لیکن وہی سر گلیڈون تب ایک لفظ نہ کہہ سکے جب ڈاکٹر مصدق نے پوچھا "اگر یہی صورت حال تھی تو کیا وجہ ہے کہ کمپنی ایک بھی ایرانی ماہر پیدا نہ کر سکی؟" اس مسئلے سے بھی گزر جائیے کمپنی کا دوسرا کارنامہ ملاحظہ فرمائیے کہ کس طرح اس نے ایران کے داخلی سیاسی و سماجی امور میں مداخلت کی کوشش کی۔ ڈاکٹر مصدق نے اس ضمن میں ہیگ اور نیویارک میں دستاویزی ثبوت پیش کر کے برطانوی مندوب کو لاجواب کر دیا۔ برطانیہ نے کمپنی کی آڑ میں پارلیمنٹ کے انتخابات میں دخل اندازی ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اعلیٰ افسروں کو بھی اپنا کٹھ پتلی بنا لیا۔ ۱۹۳۳ء میں تیل کے معاہدے کی توسیع پر غور کرنے کے دوران میں اس نے خلیج فارس میں اپنے جنگی جہاز بھیجے اور ایران کی صیانت کو خطرے میں ڈالا۔ غرض کمپنی نے ایران کا ناک میں دم کر دیا۔ اس نے وہی کھیل ایران میں کھیلا جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے بہانے ہندوستان میں کیا۔ اس لئے ڈاکٹر مصدق نے محسوس کیا کہ "میرے صبر و ضبط کی بھی آخر کوئی انتہا ہے ہمیں اپنے ملک کے غریبوں اور افلاس زدہ لوگوں کو غریبی و افلاس

کے چنگل سے چھڑانے کے لئے اپنے تیل کے ذخائر کو مالدار عیش پسند بیرونی افراد سے نجات دلانا ہوگا۔"

بین الاقوامی عدالت انصاف میں نمائندگی

ڈاکٹر مصدق نے صاف طور پر یہ بات واضح کر دی کہ یہ ایران کا داخلی مسئلہ ہے اور کسی دوسری طاقت کو اس میں مداخلت کرنے یا اقتدار اعلیٰ کے حق کو چھیننے کا کوئی استحقاق نہیں - اور یہ کہ ہم (ایرانی) کمپنی کا معاوضہ جتنا کچھ قانونی طور پر وہ حق رکھتی ہے دینے کو تیار ہیں - لیکن برطانیہ نے اس کو تسلیم نہیں کیا - اس راہ کو اختیار کرنے سے برطانیہ نے انکار کیا -

برطانیہ نے امریکی توسط سے ایران پر دباؤ ڈالنا چاہا - چنانچہ ۱۴ رمئی ۱۹۵۱ء کو امریکہ نے ایران مشورہ دیا کہ ایران اس معاملہ میں جلدی سے کام نہ لے - ڈاکٹر مصدق نے مسٹر ٹرومین کے شخصی پیام کو ایران کے داخلی امور میں مداخلت سے تعبیر کی جس کی معافی مانگتے ہوئے دوسرے ہی دن امریکی وزیر خارجہ مسٹر ایچی سن نے ایران کے پیدائشی حق کو تسلیم کر لیا - اس کے بعد برطانیہ نے ۲۳ رمئی کو بھارت سے مصالحت کے لئے کوشش کرنے کی درخواست کی - پنڈت نہرو نے ایرانیوں کے حق کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا - اس کے بعد برطانیہ نے پھر ہیگ کورٹ کا رُخ کیا - ۵ رجولائی کو بین الاقوامی عدالت انصاف نے مشورہ دیا کہ کمپنی کے کام میں مداخلت نہ کی جائے - تاوقتیکہ بین الاقوامی عدالت اپنے حقِ سماعت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ دے - یہ تنازعہ یاد رہے کہ ایران و برطانیہ کے مابین نہ تھا بلکہ ایران اور کمپنی کا معاملہ تھا - برطانیہ نے اپنے آپ کو فریق کی حیثیت دینے کی کوشش کی - ایرانی حکومت نے ۲۸ رمئی کو عدالت کے حقِ سماعت پر اعتراض کیا - باوجود اس کے جب عدالت نے عارضی فیصلہ ۵ رجولائی کو صادر کیا تو ۹ رجولائی کو ایران نے اعلان کیا کہ وہ اس فیصلے کے تابع نہیں - اس کے بعد دوسری مرتبہ ۱۹۵۲ء میں یہ مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا یعنی عدالت نے اپنے اختیار سماعت پر بحث کی - اس میں مصدق نے شرکت کی اس لئے نہیں کہ بحث میں حصہ لیں بلکہ اس لئے کہ عدالت کے اختیار سماعت کو چیلنج کریں - آپ اپنے ساتھ دستاویزات کے ۲ تھیلے بھی لے گئے - اور ثبوت کے طور پر عدالت کے آگے پیش کئے - ۷ رجولائی ۱۹۵۲ء کو اپنے حقِ سماعت کے بارے میں فیصلہ دیا کہ ایران اپنی تیل کی صنعت کو قومیاتے میں حق بجانب تھا اور یہ کہ اُسے (عدالت کو) اس مسئلہ پر بحث کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں" - عدالت کے پندرہ ججوں میں سے ۹ نے تائید کی پانچ نے مخالفت کی اور ایک جج مسٹر بی - این راؤ غیر حاضر رہے - امریکی، فرانسیسی اور برطانوی ججوں نے خلاف تجویز لکھی بہرحال عدالت نے حقائق کو تسلیم کر لیا ایران نے عدالت کے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا اور اس خوشی میں سارے ایران میں ایک دن کے لئے خصوصی تعطیل دی گئی - اسی دن مصدق بھی دوبارہ برسرِ اقتدار آئے تھے -

عالمی بنک کی تجاویز مصدق کی نظر میں

برطانیہ کے اشارے پر عالمی بنک نے چند تجاویز ایران کے آگے پیش کیں چونکہ یہ منصفانہ اساس پر نہ تھیں اس لئے ڈاکٹر مصدق انہیں قبول نہ کر سکتے تھے - بنک کے نمایندوں سے مصدق نے اس لئے گفتگو کی کہ وہ کوئی معقول حل پیش کریں گے اور اس طرح ایران کے معاشی مسائل کے حل کرنے میں مدد ملے گی - اس کی رو سے ایران کی قومی صنعت میں برطانیہ یا کمپنی کو مساوی شریک تسلیم کرنا پڑتا تھا کیونکہ ۱۷ رفروری ۱۹۵۲ء کو عالمی بنک کے رابرٹ کارنر کے فس نے کہا کہ ایران تیل کی صنعت کا نفع ۵۰ % لے اور عالمی بنک ٹیکنیکل امداد کے ادارہ کی مدد سے صنعت چلائے گا گویا نہ صرف کمپنی کو نفع میں مساوی شریک بنا لیا جائے گا بلکہ برطانوی افراد کو ایک نئے واسطے سے دوبارہ ایران پر ٹھونسا جائے گا اور ایرانیوں کے حق کو پامال کیا جائے گا۔ جب اس سرزمین میں رہنے بسنے والوں کو اس کے سینے سے نکلنے والی دولت پر پورا حق نہیں پہنچتا تو کس طرح اس سے ہزاروں میل دور رہنے والی قوم کا اس پر کوئی حق ہو سکتا ہے ؟ اس لئے ڈاکٹر مصدق نے ۱۷ رمارچ ۱۹۵۲ء کو ان تجاویز کو مسترد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "یہ مفید نہیں ہیں" عالمی بنک اور ادارہ ٹیکنیکل معاونت کا کام ہے کہ پسماندہ ملکوں میں تعمیری کاموں کے لئے مالی و فنی امداد پہنچاتی جائے - لیکن اقوام متحدہ کی ان دو خصوصی ایجنسیوں نے اپنے فریضے کے ادا کرنے کو بالائے طاق رکھ کر ایشیائی اقوام کو اپنے حقیقی موقف اور مقاصد سے آگاہ کر دیا - ایران ایسے پسماندہ ملک کو جس نے اپنی تیل کی صنعت کو قومیا کر حقیقی آزادی کی طرف ایک ٹھوس قدم اٹھایا ہے اپنی آزادی کی تعمیر کے لئے ہر طرح کی مالی و فنی امداد ملنی چاہئے تھی تاکہ وہ اپنے قومی ذرائع سے استفادہ کر سکے - امریکہ نے بھی جمہوریت و آزادی

کے محافظ ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود ایران کی غیر مشروط مالی امداد سے انحراف کیا۔ اس لئے ۲۱ اگست ۱۹۵۲ء کو حسین مکی علی پارسا اور علی مرتضیٰ جرمنی پہنچے تاکہ ۲۰۰ ماہرین فن حاصل کر سکیں اور صنعت کو پورے زور کے ساتھ جاری رکھا جا سکے۔ جرمن ماہر مالیات ڈاکٹر شاخٹ کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں تاکہ مالی دشواریوں پر قابو پا سکیں۔ اسی اثنا میں مسٹر ٹرومین نے ٹرومین چرچل مشترکہ تجاویز ڈاکٹر مصدق کو روانہ کیں جس میں تیل کی تقسیم کمپنی کے ذریعے کروانے کا وعدہ کیا گیا تھا اور ساتھ ہی کمپنی کو اگلا موقف عطا کرنے کی سعی کی گئی تھی۔ ایسی کوئی پیشکش بھی ایران کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی خواہ اس کے ساتھ کتنے ہی کروڑ ڈالر کیوں نہ منسلک ہوں۔ ان میں کہا گیا ہے کہ ان تجاویز کی منظوری کی صورت میں امریکہ ایران کو ایک کروڑ ڈالر کی فوری امداد دے گا تاکہ وہ مالی دشواریوں پر قابو پا سکے۔ ۳۱ اگست ۱۹۵۲ء کو ڈاکٹر مصدق نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ ایک ایرانی افسر کاظم حبیبی نے تبصرہ کیا اگر ایران نے مرحوم کمپنی کی ایک کروڑ پونڈ کی پیشکش کو قبول نہیں کیا تو وہ یقیناً اپنے آپ کو ایک کروڑ ڈالر کے معاوضے میں فروخت نہیں کرے گا۔

وزارتِ جنگ و خصوصی اختیارات

ڈاکٹر مصدق کو اپنے مشن کی تکمیل میں جو امر مانع محسوس ہوتا تھا وہ تھا اختیارات کلی کا اُن کے ہاتھوں میں نہ ہونا اور وزارتِ جنگ کے قلمدان کا ان کے تحت نہ ہونا۔ داخلی سیاسیات پر کنٹرول اور مشن کی تکمیل کے لئے دونوں کو اپنے ہاتھوں میں لینا مصلحت وقت تھی۔ آپ نے مجلس سے خصوصی اختیارات اور شاہ سے وزارتِ جنگ کا قلمدان مانگا۔ جب دونوں نے اس میں ہچکچاہٹ کی تو ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو شاہ کے پاس استعفیٰ روانہ فرمایا اور لکھا کہ میرا استعفیٰ اس بات کی علامت نہیں کہ میری حکومت کام کرنے کے قابل نہیں رہی بلکہ اس کا مقصد عوام کی توجہ ملک کی سیاسی صورت حال کی طرف مبذول کروانا اور فوری کارروائی کی ضرورت محسوس کروانا ہے"۔ شاہِ ایران نے مصدق کو وزیر جنگ بنانا پسند نہ کیا اور قوام السلطنت کو تشکیلِ وزارت کی دعوت دے دی۔

لیکن مصدق کے استعفیٰ کے ساتھ ہی ایران کے طول و عرض میں قوام السلطنت کے خلاف مظاہرے ہونے لگے۔ آخر ۱۶ جولائی ۱۹۵۲ء کو قوام السلطنت نے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۷ جولائی کو ایران کے دونوں ایوانوں نے متفقہ طور پر مصدق کو وزیر اعظم منتخب کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ قوم نے جہاں مصدق کے دوبارہ وزیر اعظم ہونے کی اطلاع سُنی۔ وہیں ۲۲ جولائی کو بین الاقوامی عدالت انصاف کا فیصلہ بھی سنا کہ ایران اپنے رویے میں حق بجانب ہے اور یہ کہ اُسے (عدالت کو) اس ضمن میں اختیار سماعت ہرگز حاصل نہیں۔ اس دل خوش کن خبر نے خوشیوں کو چوگنا کر دیا۔ ڈاکٹر مصدق اب نہ صرف خصوصی اختیارات کے مالک ہیں بلکہ وزیر جنگ بھی۔

آج کل

کا

گاندھی نمبر

یہ نمبر گاندھی جی کے بلیدان کے موقع پر شائع ہوا تھا۔ اس نایاب شمارے کی جلدیں فروخت کے لئے موجود ہیں۔ گاندھی جی کی ذات سے محبت اور عقیدت رکھنے والوں سے ہم اس نمبر کے مطالعے کی سفارش کریں گے۔

ڈسٹری بیوشن آفیسر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

سے طلب فرمائیے   قیمت فی جلد بارہ آنے

بُشّر علی صدیقی

مُلّا رموزی

اردو کے ایک مشہور مزاح نگار اور گلابی اردو کے موجد محمد صدیق صاحب عرف مُلّا رموزی ۔ ۸ر جنوری ۱۹۵۲ء کو اس جہان سے کوچ کر گئے ۔ اور اس طرح اردو ادب اور شعراء کی صف میں ایک اور جگہ مستقل طور پر خالی ہوگئی جو شاید ہی آئندہ پُر ہو سکے ۔ میں نے ملا رموزی کی انشا پردازی کے تمام ادوار بغور دیکھے ہیں ۔ اور اردو مزاح نگاری کی تاریخ میں اُن کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کی انشا پردازی کا پہلا دور تو وہ تھا جب وہ اپنی گلابی اردو میں علی گڑھ کالج پائیر اخبار اور ننھے میاں کی والدہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے تھے ۔ ان کی مزاح نگاری[1] میں بعض اوقات ہمیں ایسی طنز کا پتہ چلتا ہے جو زہرناکی کی حد تک پہنچ جاتی ہے ۔ اس دور میں انھوں نے رسالہ "صوفی" میں مستقل طور پر مضامین لکھے ہیں ۔ بیشتر مضامین میں علامہ سیماب اکبرآبادی کا ذکر خیر ہوتا تھا ۔ ذاتیات کی بنا پر رموزی طرح طرح کے الزامات سیماب اکبرآبادی پر لگاتے تھے ان الزامات کے جوابات سیماب مرحوم کے تلامذہ اپنے اخبارات اور رسائل میں ضرور دیتے تھے لیکن عوام زیادہ تر رموزی کی گلابی اردو کو پڑھتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے ۔ دیکھئے خود رموزی نے مرنے سے چند ماہ پیشتر اس کا اعتراف اپنے ایک مضمون میں کس طرح کیا ہے[2] "اب ذرا سنئے روداد سیماب و رموزی سن لیجئے ۱۹۲۸ء یا اس سے کچھ آگے پیچھے زمانے میں حضرت علامہ مع ساغر نظامی بھوپال تشریف لائے ۔ میں شروع ہی سے شعر و مشاعرہ کا جانی دشمن تھا ۔ اس لئے میں ان کے کسی ایک اجتماع میں شریک نہ ہوا .... بات آئی گئی ہوگئی ۔ حضرت علامہ بھوپال سے چلے بھی گئے ۔ مگر کچھ دن بعد نہایت خفیہ اور سازشی انداز سے ان لوگوں نے مجھ پر کچھ ایسے غیر محسوس اور کہیں محسوس اثرات ڈلوائے کہ میں حضرت ساغر و سیماب کی مخالفت اخباروں میں کروں ۔ ان اثرات میں بعض اثرات میرا اس وقت کی مالی بے بسی کے حق میں اثر انداز ہونے والے تھے ۔ اس لئے میں نے بے وجہ حضرت سیماب و ساغر کی مخالفت میں بے شمار اخبارات اور رسالوں میں لکھنا شروع کر دیا ۔ جس کے جواب میں حضرت سیماب اور تمام سیمابی دنیا نے میرے خلاف بھی کسر نہ اٹھا رکھی ۔ واقعہ یہ تھا ۔ اب ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ کالج میں ایک آل انڈیا ادبی اجتماع ہوتا ہے جس کے محرک مایۂ نازش بزرگ پروفیسر علامہ احسن مارہروی تھے ۔ اس اجتماع میں ہندوستان بھر کے چوٹی کے شعراء ادبا شریک ہوئے اور نظر بد کے نشان کے طور پر مُلّا رموزی صاحب بھی —— میں حضرتِ احسن کی خدمت میں ان کے بنگلے روز جاتا تھا ۔ ایک دن احسن قبلہ نے مجھ سے خدا جانے کن جادو بھرے الفاظ میں فرمایا کہ

"بھائی سیماب میرے ہاں آنے کو ہیں ۔ لیکن تم کو میری اس سفید داڑھی کی لاج رکھنا ہوگی ۔ اس لئے بغیر تامل کے مجھ بڈھے کے کہنے پر سیماب سے گلے مل لو ۔ اور آج سے تم دونوں اپنے مخالفانہ مضامین کو بند کر دو" ۔ میں بالکل ساکت سا ہو کر رہ گیا کہ حضرت سیماب تشریف لائے ۔ احسن قبلہ میرے کمرہ سے باہر گئے اور اُن سے بھی کچھ ایسا ہی کہا ہوگا ۔ چند منٹ بعد حضرت احسن سیماب صاحب کا ہاتھ پکڑے میرے پاس لائے اور فرمایا کہ اٹھو اور اپنے بھائی کے گلے سے لگ جاؤ ۔ میں فوراً اٹھا ۔ سیماب صاحب نے کافی مسکراتے ہوئے مجھے

---

[1] مزاح ایک جامع لفظ ہے ۔ ایک طرف اس میں طنز شامل ہے (بشرطیکہ وہ مزاحیہ پیرائے میں ہو) اور دوسری طرف ہجو بشرطیکہ اس نے گالی گلوچ کی شکل اختیار نہ کرلی ہو اور زبان بالکل عامیانہ نہ ہوگئی ہو

[2] رسالہ سیماب دہلی ۔ جنوری ۵۲ء صفحہ ۴۱ و ۴۲

کافی بھیجا اور فرمایا کہ ـــــ "اللہ تعالیٰ بھی دیکھے ـــ" آجکل کے زمانہ میں غلطی کا اعتراف کر لینا کافی اہمیت رکھتا ہے۔ مُلّا رموزی کی اس صاف گوئی سے سیماب اسکول کے تمام حضرات اب غالباً مطمئن ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سیماب مرحوم کے خلاف مضامین مالی منفعت کے لئے لکھے تھے۔ اور بعد کو شدت کے ساتھ اس کو محسوس بھی کیا تھا۔ رموزی کی زندگی کا دوسرا دور وہ ہے جس میں ننھے میاں کی والدہ نے ننھے میاں کی والدہ نمبر ایک اور نمبر دو کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ان کی مستقل تصانیف زیادہ تر پہلے ہی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسرے دور میں ان کے متفرق مضامین خصوصاً مختلف ایڈیٹر صاحبان کے نام خطوط ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے ان کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے رسالہ "ہمدرد صحت" دہلی کے ایڈیٹر صاحب کو مختلف اوقات میں لکھے تھے۔ یہ خطوط "ہمدرد صحت" میں شائع ہو چکے ہیں۔ مُلّا صاحب بلا تکلیف شربت روح افزا اور مفرح مشکین کی فرمائش کرتے ہیں۔ اور ایڈیٹر صاحب کو اپنی بیوی نمبر ۲ کے گلابی دوپٹے کی قسم دلا کر ان کی دواؤں کی تعریف کرتے ہیں۔ تیسرا دور ان کے آخری زمانہ کی تحریروں کا ہے۔ یہاں ننھے میاں کی والدہ نمبر ایک اور دو کی جگہ بیوی نمبر ایک گلستاں نمبر ۲ زعفران خانم اور پھر اسی طرح بیوی نمبر تین وغیرہ نے لے لی ہے۔ گلابی اُردو کا زور اس دور میں قدرے کم ہو گیا ہے۔ بیویوں کا اپنے مضامین میں اس طرح پروپیگنڈا کرنا دو اور موجودہ مزاح نگاروں پر بھی عائد ہوتا ہے یعنی شوکت تھانوی (جواب صرف قاضی جی بن کر رہ گئے ہیں) اور عظیم بیگ چغتائی مرحوم۔ یہ درست ہے کہ بیوی یا بیگم کا ذکر رشید احمد صدیقی پطرس اور فرحت اللہ بیگ نے بھی کیا ہے لیکن اس بری طرح نہیں جیسا کہ اوّل الذکر مزاح نگاروں نے' اس لئے یہ چیز ان کے یہاں کھٹکتی ہے۔ ایک اور خصوصیت ان کے اس دور کے مضامین کی ملک کی زبوں حالی کا ذکر کرنا بھی ہے ۔

مُلّا رموزی کی ظرافت چونکہ ابتدائی ظرافت ہے۔ لہٰذا ادبیاتِ اردو کی تاریخ میں اس کی اہمیت ہے اور رہے گی۔ ہم اسے اعلیٰ پائے کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ اوّل تو اس لئے کہ ان کا سارا کھیل چند الفاظ کے متبادر معنی پر منحصر ہوتا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ وہ بار بار کی دُہرائی ہُوئی چیزیں پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ مذاق ہی مذاق میں بعض اوقات بڑے کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کے مضامین میں اصلاحی پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے یہاں چند الفاظ اور فقرے مخصوص ہیں جو کہ قریب قریب ہر مضمون میں یکے بعد دیگرے دُہرا دئے جاتے ہیں۔ مثلاً علی گڑھ کالج ننھے میاں کی والدہ۔ بیوی نمبر ایک اور بیوی نمبر دو' کسان۔ ریل وغیرہ رموزی ذاتی چیزیں ضرورت سے زیادہ پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک درجن کتابوں سے زاید کے مصنّف ہیں۔ کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں:۔ شادی زندگی۔ صبح لطافت' عورت ذات' لاٹھی اور بھینس وغیرہ۔ رموزی فطرتاً قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہر نئی چیز کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ نازک اندامان کالج اور علی گڑھ کالج سے کچھ مطمئن نہیں ہیں۔ بلکہ کالج کے طلبا سے بہت خفا معلوم ہوتے ہیں اکبر نے پائنیر اخبار کا مذاق خوب اڑایا تھا۔ وہ وقت کی چیز تھی رموزی اب اگر ایسا کرتے ہیں تو "مشتے بعد از جنگ" کا مصداق ہے۔ اس کا زمانہ گزر گیا۔ ان کی بعض کتابوں میں بھرتی کی چیزیں بہت ہوتی ہیں مثلاً ان کی کتاب "شادی" میں ایک مہمل سہرا کتاب کے آخر میں بغیر کسی خاص وجہ کے درج ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کا خیال ہے کہ مُلّا رموزی کی سوجھ بوجھ اچھی ہے۔ مگر ان کی یہ سوجھ بوجھ مستعار خیالات میں دب کر رہ جاتی ہے۔ مغالطہ بھی ان کو بہت زیادہ ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں "بھلا یہ انٹرنس پاس کیا جانیں ابوالکلام آزاد کی ادبی عظمت کو اور یہ ایف۔ اے پاس کیا پہچانیں مولوی ظفر علی خاں کی بہار آفریں انشا پردازی کو اور یہ بی۔ اے پاس کیا محسوس کریں مُلّا رموزی کی لطافت نگاری کو" بعض اوقات وہ ایک ہی چیز کی مختلف کیفیات بہت اچھی طرح بیان کرتے ہیں۔ "کھانسی" کی مختلف کیفیتیں ملاحظہ ہوں "بعض کے دونوں شانے اُٹھ کر کانوں تک آ جاتے ہیں۔ جب کھانسی پوری ہوتی ہے۔ بعض کی کھانسی اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک انہیں مراد آباد کا اُگالدان پیش نہ کیا جائے۔ بعض کی کھانسی کے درمیان اس قسم کے جھٹکے آتے ہیں جن سے ان کے مرحوم ہو جانے کا خطرہ اٹل ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک وہ کھانسی کھانسی نہیں جس کے ترنّم کا سلسلہ مغرب سے صبح کی اذان تک اس طرح جاری نہ رہے کہ ماں باپ تک دعا کریں کہ اے خدا اسے ہٹا

سے اُٹھا لے یا اس کی کھانسی بند کر" ملّا رموزی حالانکہ مشاعروں کے موافق نہ تھے لیکن انہوں نے غزلیں لکھی ہیں - ان میں مزاحیہ رنگ نمایاں ہے - اپنا تخلص تلاش کرنے کے متعلق وہ اپنے آخری ایام کے ایک مضمون بہ عنوان "مولانا حسرت کے ساتھ تین سال" میں لکھتے ہیں - "پس ایسے مفلس ماحول دماغی میں مجھ فطری نقّاد و موجد کے لیے ممکن نہ تھا کہ میں بھی کسی مشہور شاعر کے تخلص کو اپنالوں - اس لئے جدید تخلص وضع کرنے کی فکر میں دار العلوم کی پندرہ بیس دن کی چھٹیاں تشریف لے آئیں اور میں بھوپال روانہ ہوا کہ مجھے ریل میں خیال کہ میرے فارسی کے استاد حضرت مولوی محمد خاں صاحب مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ تخلص کو سہ حرفی ہونا چاہئے جو ہر بحر میں کھپ سکے مثلاً ذکی وغیرہ - پس اس کے یاد آتے ہی میں نے اپنا تخلص "غشی" رکھا اور تھا بھی بھوپال تک ایک ڈیڑھ آدھی ترچھی غزل بھی عرض کرلی" - اسی مضمون میں مولانا حسرت سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں "خدمات، ناکامیابیوں، حوادث اور مصائب کے برداشت کی جو فولادی ہمّت میں نے مولانا میں پائی اب کسی دوسرے میں پا بھی نہ سکوں گا - خلاصہ یہ کہ اخلاقیات میں وہ اس بلند تر مقام کے انسان تھے جہاں خدا پرستی اور خوفِ خدا کے سوا دنیا کی کوئی تحریک ان کو متاثر نہ کرسکتی تھی - اس کے لیے ان کے کلام کو غور سے ملاحظہ فرمائیے"۔

غرضیکہ رموزی مزاح نگاری میں جس رنگ کے موجد تھے وہ رنگ ان کے ساتھ ختم بھی ہوگیا - ارضِ بھوپال کا یہ گلابی اردو لکھنے والا اپنا نام ہمیشہ کے لئے تاریخ اردو ادب میں چھوڑ گیا ہے -

---

رضا نقوی

مشعل

لو وقت کی سانسیں پھول گئیں، لو سر سے ڈھلا خونیں آنچل
رخسارِ تمدّن زرد ہوا، بازوئے سیاست ہوگئے شل
کیوں! میں نے کہا تھا - یا کہ نہیں اب بجھ نہ سکیگی یہ مشعل

اس کوششِ پیہم کے صدقے ہر پھونک میں لَو کچھ تیز ہوئی
رفتہ رفتہ دھیمے دھیمے مشعل کی ضَو کچھ تیز ہوئی
ہر سانس میں جتنی گرمی تھی اتنے ہی بجھے جذباتِ عمل

کوشش کی اس ناکامی پر آخر حیرت کیوں آتی ہے
چہرہ کیوں اُترا اُترا ہے جنون کیوں میلی میلی ہے
آؤ آؤ ہم سے سُن لو عقدہ یہ نہیں ہے لاینحل

برسوں برسوں صدیوں صدیوں جب دل کو گھلایا جاتا ہے
اور زخمِ جگر کو ہنس ہنس کر ناسور بنایا جاتا ہے
خوں کے آنسو بہتے بہتے ہو جاتی ہیں جب آنکھیں اوجھل

جب دل کے سلگتے چولھے میں شاعر کی تمنا پلتی ہے
سنسار کی اندھی نگری میں تب شمعِ بصیرت جلتی ہے،
شاعر کی زباں بن جاتی ہے اس وقت محبت کی مشعل

مشعل کی شعاعوں کے اندر وہ نورِ حقیقت رقصاں ہے
تاریکیٔ دوراں کے اوپر جو روزِ ازل سے خنداں ہے
وہ نور کہ جس کی ایک کرن ظلمت کے لئے فرمانِ اجل

اس نور کو گل کرنے کے لیے سو راہ نکالی جاتی ہے
طوفاں اُٹھائے جاتے ہیں تاریکی پالی جاتی ہے
سازش کے مگر سارے بازو ہوجاتے ہیں آخر خود ہی شل

اک روز اسی مشعل کی ضیا دہر دل میں اُجالا کردے گی
رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے دنیا میں سویرا کردے گی
کروٹ لے کر اُٹھ بیٹھے گی تقدیرِ امم تعمیرِ ملل

تخلیق کے روشن مقصد کی تصویر نظر آجائے گی
آدم کے پریشاں خوابوں کی تعبیر نظر آجائے گی
کھیتی پہ خدا کی برسے گا انساں کے عزائم کا بادل

اقبال کی فارسی شاعری کا ترجمہ

اصل نظم (فارسی) اقبال

محاورہ مابین خدا و انسان

خدا

جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

قطعہ

سحر می گفت بلبل باغباں را
درایں گِل جز نہالِ غم نہ گیرد
بہ پیری مے رسد خارِ بیاباں
ولے گُل چوں جواں گردد بمیرد

شعر

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

ترجمہ (ہندستانی) سردار جعفری

خدا اور انسان

خدا، انسان سے

میں نے بنایا اک مٹی اور پانی سے سنسار
تُو نے بنائے مصر اور ترکی، ایران اور تتار
میں نے دھرتی کے سینے سے لوہا کیا تھا پیدا
تُو نے ڈھالے تیر اور خنجر، نیزے اور تلوار
تو نے کاٹی شاخ ہری اور پھلتے پیڑ گرائے
گاتے پنچھی کے لئے، پنجرے تو نے بنائے

انسان خدا سے

تو نے رات بنائی مالک میں نے دیئے جلائے
تو نے مٹی پیدا کی اور میں نے پیالے بنائے
تو نے بخشے دھرتی کو جنگل، پربت، ویرانے
میں نے ہنستے باغ سجائے، رنگیں پھول کھلائے
زہر سے میں تریاق بناؤں پتھر سے آئینہ
(کون بڑا ہے تو یا میں! اے مالک سچ سچ کہنا)

قطعہ

بھور بھئے بلبل مالی کو اپنا گیت سنائے
تیرے باغ کی مٹی دُکھ کے پودے کو راس آئے
(کیسا ظلم ہے)، جنگل کا کانٹا تو بوڑھا ہوئے
پھول پہ جیسے آئے جوانی ویسے ہی کمہلائے

شعر

"میری دُنیا راس نہ آئی؟ (کیوں ہے گریباں چاک)"
"نا ہیں مالک" "اچھا اس کو کر دے مٹا کر خاک"

سی۔ بی میمونیہ

ہندوستان کا مسئلہ آبادی

کرۂ زمین پر انسانی وجود کے لئے مسئلہ آبادی ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ یہ انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہے خواہ وہ سماجی ہو خواہ ذاتی۔ خواہ وہ قومی ہو خواہ بین الاقوامی۔ مختلف خاندانوں کی صحت اور خوشی پر اور مختلف اقوام کی سماجی ترقی پر اس کا گہرا اثر ہے۔ دنیا کا امن بھی اس کے اثر سے مبرا نہیں ہے کیونکہ مسئلہ آبادی سے پیدا شدہ پیچیدگیاں جنگ کا باعث ہو سکتی ہیں۔ مسئلہ آبادی ہماری اقتصادی دقتوں کی جڑ ہے اتنی اہمیت کے باوجود بھی ہمارے انسانی ذرائع نظر انداز کر دئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے لئے لوگوں کی تعداد زمین کی وسعت، معدنیات اور جنگلات کی نسبت زیادہ اہم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔ یہ سوال قابل غور ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آبادی فی مربع میل کیا ہے۔ اور پھر زمین کی زرخیزی، آب و ہوا، صنعتی ترقی، معیار زندگی اور اقتصادی ذرائع پر بھی غور کرنا ہوگا۔ یہ چیز یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی بھی ملک ضرورت سے زیادہ آباد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قدرت نے آبادی فی مربع میل کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ اگر کسی ملک کے باشندے اس کے ذرائع پر بسر نہ کر سکیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔ جرمنی، فرانس اور جاپان کی صنعتی ترقی کو دیکھتے ہوئے ان ممالک کے لئے ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ سائنس کی نئی ایجادات و اختراعات کا استعمال کر کے ان ممالک نے اپنی زراعت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنی موجودہ آبادیوں سے بھی کہیں زیادہ آبادی کو رکھنے کے قابل ہیں۔ اگر یہ چیز ان ممالک کے لئے صحیح ہے تو ہندوستان کے لئے غلط نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندوستان بھی مختلف اقسام کے اناج، خام اشیا اور مختلف معدنیات پیدا کر سکتا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ہندوستان اپنی موجودہ پیداوار کا دس گنا پیدا کر سکتا ہے ضرورت صرف اس چیز کی ہے کہ نئے طریقوں کا استعمال کیا جائے۔ آرنلڈ لیپٹن نے لکھا ہے۔

یہ بڑا ملک جس میں اس قدر آبادی ہے صحیح راستہ پر چل کر موجودہ آبادی سے دوگنی آبادی کو نہایت اچھی طرح ضروریات زندگی مہیا کر سکتا ہے۔

اسی طرح سر دسوکیسوریا کے بموجب "اچھے حالات میں ایک باقاعدہ قومی پالیسی پر چل کر سائنس کی نئی ایجادات۔ نئی مشینوں اور تجارت کے نئے قوانین کا استعمال کر کے زراعتی اور صنعتی لحاظ سے ہندوستان کی پیداوار اگلے دس سال میں دوگنی اور پندرہ سال میں تین گنی ہو سکتی ہے"۔

اور بھی کئی حقائق اس امر کو ثابت کرتے ہیں کہ ہندوستان کی کم پیداوار کی وجہ قدرتی نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی غلطیوں میں پوشیدہ ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ملک کی آبادی مقابلتاً زیادہ ہے۔ اگر کسی ملک میں ایسی وجوہ کے باعث جن کو دور کیا جا سکے موجودہ آبادی کے لئے کافی دولت یا روزگاری کے ذرائع نہ ہوں تو اس کی آبادی مقابلتاً زیادہ کہی جا سکتی ہے۔ ایسی وجوہات ناخواندگی، بدانتظامی، باہمی تنازعات، صنعتی ترقی کی نظر اندازی، لازمی تعلیم کی غیر موجودگی، صنعتی، زراعتی اور تجارتی تربیت کی کمی اور پیداوار کے قدیم طریقوں کا استعمال وغیرہ ہیں۔ یہی مسائل ہندوستان کے درپیش ہیں۔ ہندوستان کے قدرتی ذرائع لامحدود ہیں۔ آبادی میں مختلف خوبیاں مخفی ہیں لیکن پھر بھی معیار زندگی نیچا ہے۔ اس لئے ہندوستان میں آبادی صرف مقابلتاً زیادہ ہے کیونکہ قدرتی اور انسانی ذرائع کا مکمل فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ یہ امر ہندوستان کے علاوہ کئی دیگر ممالک کے لئے بھی ٹھیک ہی ہے۔ جب تک ایسے کروڑوں انسان موجود ہیں جو کہ قابلیت، طاقت اور

مرضی کے باوجود بھی بے روزگار ہیں - جب تک کروڑوں انسانوں کو ٹھیک تنخواہیں نہیں ملتی اور جب تک کروڑوں انسانوں کو ضروریاتِ زندگی میسر نہیں ہیں وہ ملک مقابلتاً گنجان آباد کہلائے گا -

آبادی کا دباؤ

ہندوستان میں سنہ ۱۹۴۷ء میں فی مربع میل آبادی ۲۵۵ تھی جبکہ بلجیم میں ۷۰۸ (سنہ ۱۹۴۷ء) انگلینڈ اور ویلز میں ۷۰۳ (سنہ ۱۹۴۷ء) ہالینڈ میں ۶۳۹ جاپان میں ۲۵۰ (سنہ ۱۹۴۷ء) ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۴۳.۷ (سنہ ۱۹۴۷ء) جرمنی میں ۳۸۲ (سنہ ۱۹۳۹ء) اور پاکستان میں ۲۰۰ (سنہ ۱۹۴۷ء) تھی - فی مربع میل آبادی سے کسی ملک کی اقتصادی حالت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا - مثلاً بلجیم کی فی مربع میل آبادی ۷۰۸ یعنی مغربی بنگال کی فی مربع میل آبادی سے کچھ ہی کم ہے لیکن بلجیم کے عوام کا معیارِ زندگی مغربی بنگال کے معیار سے کہیں زیادہ ہے - اسی طرح انگلینڈ اور ویلز کی آبادی فی مربع میل ۷۰۳ ہے جبکہ امریکہ میں فی مربع میل آبادی صرف ۴۳.۷ ہے لیکن موخر الذکر بہت ہی خوشحال ہے -

ہندوستان میں مختلف جگہوں پر فی مربع میل آبادی مختلف ہے - یہ دریائے گنگا کی گھاٹی میں، مشرقی پنجاب اور جنوبی ہند (ساحل مالابار) میں سب سے زیادہ ہے اور بیرونی ریگستان اور پہاڑی خطوں میں سب سے کم - شمالی بنگال کے کچھ حصوں میں اوسط آبادی ۱۰۰۰ فی مربع میل سے بھی زیادہ ہے جبکہ آسام اور راجستھان میں ایسے علاقے ہیں جہاں آبادی ۲ کس فی مربع میل سے بھی کم ہے -

آبادی میں صنفی تناسب

صنفی لحاظ سے آبادی کی تقسیم کا اقتصادی حالات پر گہرا اثر ہے کیونکہ شادیوں اور بچوں کی پیدائش پر اثر انداز ہونے کے باعث یہ مزدوروں کی دستیابی پر گہرا اثر رکھتی ہے - ہندوستان میں صنفی تناسب ٹھیک نہیں ہے - مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی بہت کمی ہے - سنہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں عورتیں صرف ۹۴۷ ہیں جبکہ سنہ ۱۹۴۱ء میں ۹۳۴، سنہ ۱۹۳۱ء میں ۹۴۰، سنہ ۱۹۲۱ء میں ۹۴۵ سنہ ۱۹۱۱ء میں ۹۵۳، سنہ ۱۹۰۱ء میں ۹۶۳، سنہ ۱۸۹۱ء میں ۹۵۸ اور سنہ ۱۸۸۱ء میں ۹۵۴ تھیں - خاص بات یہ ہے کہ عورتوں کی تعداد کم ہی ہوتی جا رہی ہے - دوسری چیز یہ ہے کہ مختلف سماجی رتبوں کے لوگوں میں صنفی نسبت مختلف ہے - مثلاً ہندوستان کی بڑی اقوام میں عورتوں کی تعداد کم ترین ہے - سکھوں میں ۱۰۰۰ مردوں کے مقابلے میں صرف ۷۸۰ عورتیں ہیں جبکہ ہندوؤں اور عیسائیوں میں عورتوں کی تعداد ۱۰۰۰ مردوں کے مقابلے میں ۹۵۰، جینیوں اور پارسیوں میں ۹۴ اور مسلمانوں میں ۹۰ ہے - یہ کمی ہندوستان کے تمام بڑے صوبجات میں آشکارا ہے - ایسی ریاستیں جن میں مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ ہیں صرف مدراس (۱۰۰۴) اوڑیسہ (۱۰۲۳) اور ٹراونکور کوچین (۱۰۰۷، ۱۰۰۰) ہیں، عورتوں کی سب سے زیادہ کمی مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال میں ہے جہاں کہ ۱۰۰۰ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں بالترتیب ۸۶۳ اور ۸۶۱ ہیں - جیسے ہی ہم ہندوستان میں جنوب اور مشرق سے شمال اور مغرب کی طرف جاتے ہیں عورتوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے -

اکثر عورتوں میں اموات کی شرح مردوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے کیونکہ قدرت نے ان میں امراض کا مقابلہ کرنے کے ذرائع زیادہ بنائے ہیں - ہندوستان میں اگرچہ لڑکوں کی پیدائش کی شرح لڑکیوں کی پیدائش کی شرح کے مقابلے میں زیادہ ہے لیکن لڑکیاں پیدائشی لحاظ سے لڑکوں کی نسبت زیادہ مضبوط ہیں - انجمن بین الاقوامی کے اعداد و شمار کے بموجب تمام ممالک میں عمر کی ہر منزل پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ عورتوں کی زندگی کا بقیہ حصّہ مردوں کی زندگی کے بقیہ حصے کی نسبت زیادہ سمجھا جا سکتا ہے - لیکن یہ چیز ہندوستان پر عاید نہیں ہوتی کیونکہ یہاں پر ۴۰ سال کی عمر تک عورتوں میں بچے کی پیدائش کے دوران میں موت کی شرح خاص کر زیادہ ہے - ہندوستان میں بارہ سال کی عمر تک میں لڑکیوں کی اموات کی شرح لڑکوں کی اموات کی شرح سے کم ہے - لیکن ۱۲ سال سے لے کر ۴۰ سال کی عمر تک جبکہ بچے ہوتے ہیں عورتوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے - اور اس طرح عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد کے مقابلے میں کم رہ جاتی ہے - بچوں کی پیدائش کے دوران میں خاص کر ۲۵ سے ۳۵ سال تک عورتیں موت کا شکار ہو جاتی ہیں جو کہ پہلے بچوں کی پیدائش میں جسمانی گراوٹ کے باعث ہو جاتی ہے -

ہندوستان کے صنعتی شہروں میں مردوں کی تعداد عورتوں کی تعداد سے بہت ہی زیادہ ہے - سنہ ۱۹۴۱ء میں ۱۰۰۰ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کلکتہ میں صرف ۴۶۴، بمبئی میں ۵۸۱ اور ہوڑہ میں ۵۵۰ تھی - اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہندوستان مزدور اپنے کنبوں کو شہروں میں نہیں لاتے اور عورتوں کو شہری صنعتوں میں ملازمت کم ملتی ہے - یورپ میں اس کے برعکس شہروں میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے - دس اور بیس سال کی عمر

کے دوران میں لڑکیاں گھروں میں ملازمت کے لئے اور بطور کلرک وغیرہ بھرتی کے لئے شہروں میں آجاتی ہیں۔ ۵۰ سال کی عمر کے بعد وہ پھر دیہاتوں میں چلی جاتی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرد عورتوں کے مقابلے میں زیادہ جلدی کام کے ناقابل ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ملک میں کئی سماجی پابندیوں کے باعث اکثر گھروں کی عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد صرف گھریلو کاروبار میں اپنا وقت صرف کر دیتی ہے اور بہت ہی کم عورتیں دولت کی پیداوار میں حصہ دار بنتی ہیں۔ اس لئے تمام آبادی کا بار برسر روزگار ۳۰ فیصدی آبادی پر پڑتا ہے۔ اس کے مقابلے میں فرانس میں ۶۱ فیصدی (۱۹۴۶ء) اشخاص، انگلینڈ اور ویلز میں ۶۵ فیصدی (۱۹۳۱ء)، سویڈن میں ۶۶ فیصدی (۱۹۳۶ء)، کینیڈا میں ۶۳ فیصدی (۱۹۳۸ء)، اٹلی میں ۵۹ فیصدی (۱۹۳۶ء) اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۶۵ فیصدی اشخاص دولت کی پیداوار میں حصہ لیتے ہیں۔ اس چیز کا ملک کے معیارِ زندگی پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

آبادی کا شہری اور دیہاتی تناسب

شہری اور دیہاتی آبادیوں میں تناسب کی بہت اہمیت ہے۔ ہر ملک کی اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی شہری آبادی میں اضافہ دیکھا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں دیہاتی آبادی کی اس قدر زیادتی ملک کی اقتصادی بدحالی کی علامت ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ ہم تجارت، ٹرانسپورٹ اور صنعت کی ترقی میں دیگر تہذیب یافتہ ممالک سے بہت پیچھے ہیں۔ شہری اور دیہاتی آبادیوں کا تناسب ایک اور نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ یہ قومی اخلاق پر روشنی ڈالتا ہے۔ دیہاتی لوگ کاہل، دقیانوسی اور توہم پرست ہوتے ہیں یا یوں کہئے کہ ان کے خیالات ساکن ہوتے ہیں۔ دیہات ترقی کی مشین کو پیچھے کھینچتے ہیں۔ شہر ہی صنعتی اور تجارتی، ترقی، سائنس، علم و فنون کی خوشحالی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے شہری لوگ چست، محنتی اور متحرک ہوتے ہیں۔ شہروں سے ہی ترقی پسند خیالات اور تہذیب پھیلتی ہے۔ ہمارے ہاں شہروں کی کم تعداد ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے ہاں اقتصادی ترقی کے چشموں کی کمی ہے۔

یہ ٹھیک ہی ہے کہ ہندوستان دیہات میں آباد ہے۔ ہندوستان میں ۵ لاکھ دیہات ہیں اور ہر دیہات کی اوسط آبادی ۵۱۷ ہے۔ دیہاتوں میں گھرے ہوئے مکانات کی تعداد ۶۶۴۳۶۰۹۴ ہے یعنی فی گاؤں مکانات کی اوسط تعداد ۱۰۱ ہے اور ہر مکان میں ۵٫۱ کس رہتے ہیں۔ ۱۸۷۲ء میں ہندوستان کے ۸٫۷ فیصدی اشخاص شہروں میں آباد تھے۔ ۱۸۹۱ء میں تعداد ۹٫۴ فیصدی، ۱۹۱۱ء میں ۹٫۳ فیصدی، ۱۹۲۱ء میں ۱۰٫۳ فیصدی، ۱۹۳۱ء میں ۱۱ فیصدی اور ۱۹۴۱ء میں ۱۲٫۸ فیصدی تھی۔ یعنی ہندوستان کے اب بھی قریب ۸۷ فیصدی عوام دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ مغرب میں حالات اس کے برعکس ہیں۔ مغربی ممالک میں شہری آبادی بہت زیادہ ہے۔ یہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۵۶ فیصدی، سویڈن میں ۳۲ فیصدی، اٹلی میں ۱۷ فیصدی، جرمنی میں ۵۶ فیصدی، فرانس میں ۴۲ فیصدی، انگلینڈ اور ویلز میں ۷۷ فیصدی، آسٹریا میں ۵۴ فیصدی، کینیڈا میں ۴۱ فیصدی اور جاپان میں ۴۶ فیصدی ہے۔

پیشے کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم

پیشہ وار آبادی کی تقسیم سماجی حالات اور تبدیلیوں پر روشنی ڈالتی ہے اور اس سے ملک کی صنعتی ترقی کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ دیہاتوں میں اس قدر آبادی زراعتی پیشہ کی وسعت کا ثبوت ہے۔ صدیوں سے کاشتکاری ہی بہت بڑی آبادی کا واحد پیشہ رہا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں ۶۱ فیصدی لوگوں کا گزر کاشتکاری پر تھا۔ ۱۹۱۱ء میں ۷۲ فیصدی، ۱۹۲۱ء میں ۷۳ فیصدی، ۱۹۳۱ء میں ۷۰٫۵ فیصدی اور ۱۹۴۸-۴۹ء میں ۶۸ فیصدی اشخاص کاشتکاری پر گزر کر رہے تھے۔ صنعتیں بہت ہی کم ہیں۔ اور بڑے شہروں تک ہی محدود ہیں۔ ان میں آبادی کا بہت ہی کم حصہ کام کرتا ہے۔

نیشنل انکم کمیٹی نے ۱۹۴۸-۴۹ء میں مختلف پیشوں کے لوگوں کے بارے میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار اکٹھا کئے

پیشہ	ان پر اوقات گزر کرنے والوں کی تعداد ۱۹۴۸-۴۹ء میں	فیصدی تعداد	۱۹۳۱ء میں فیصدی تعداد
حیوانات اور نباتات سے متعلقہ پیشہ	۹۰٬۵۳۷ ہزار	۶۸٫۲	۶۵٫۸
معدنیات سے متعلقہ	۶۳۳ ہزار	۰٫۵	۰٫۲
صنعت	۱۸۰۱۹ ہزار	۱۳٫۶	۱۰٫۳
ٹرانسپورٹ	۹۴۴۸ ہزار	۱٫۸	۱٫۶
تجارت	۸۲۵۰ ہزار	۶٫۲	۵٫۵
نہروں وغیرہ پر	۱۹۰۹ ہزار	۱٫۴	۰٫۱

پیشہ	۱۹۴۸-۴۹ء میں	فیصدی تعداد	۱۹۳۱ء میں فیصدی تعداد
فنون	۵۰۴۴ ہزار	۳٫۸	۱٫۶
سرکاری انتظام	۱۶۹۷ ہزار	۱٫۳	۰٫۶
گھریلو نوکری	۴۱۹۴ ہزار	۳٫۲	۷٫۵
متفرق پیشہ	..	..	..
	۱۳۲۷۳۱ ہزار	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰

ان اعداد و شمار سے عیاں ہے کہ مختلف پیشوں کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم نہایت غیر موزوں ہے۔ ملکی انتظام میں اور فنون میں صرف ۳ فیصدی آبادی حصہ دار ہے۔ اس سے ناخواندگی کی زیادتی کا پتہ چلتا ہے۔ اس ملک کی اقتصادی حالت یقینی طور پر ہی خستہ حال ہوگی جہاں پر کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ ایک ایسے پیشہ میں مشغول ہے جو کہ پرانا اور بدحال ہو چکا ہے۔ ہمارے ملک میں قحطوں، غربت اور کمی کی وجہ بھی یہی ہے۔ جب تک اقتصادی حالت اسی طرح رہی ملک کی حالت خراب ہی رہے گی۔

شرحِ پیدائش اور شرحِ موت

شرح پیدائش فی سال فی ہزار اشخاص کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے۔ ۱۹۴۰ء تک ہندوستان میں شرح پیدائش ۳۲ پر ساکن تھی ۱۹۴۵ء میں یہ ۲۸ اور ۱۹۴۹ء میں ۲۶ رہ گئی۔ دوسرے ممالک کے اعداد و شمار اس طرح ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ ۲٫۱۷ (۱۹۳۹ء) یونائٹڈ کنگڈم ۱۶٫۳ (۱۹۳۹ء) مصر ۴۳٫۴ (۱۹۳۸ء) فرانس ۱۵٫۹ (۱۹۴۱ء) اٹلی ۲۰٫۵ (۱۹۴۱ء) بلجیم ۱۴٫۸ (۱۹۴۱ء) جرمنی ۱۶٫۲ (۱۹۴۱ء) سویڈن ۱۹٫۳ (۱۹۴۱ء) اور ڈنمارک ۲۱٫۴ (۱۹۴۱ء)

ان اعداد و شمار سے عیاں ہے کہ مصر کے علاوہ باقی تمام تہذیب یافتہ ممالک میں سے ہندوستان میں شرح پیدائش سب سے زیادہ ہے۔ اس کی اہم وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قریب ہر شخص جس کی عمر قابل شادی ہے شادی شدہ ہے۔ زیادہ تر لڑکیوں کی شادی ۲۰ سال سے کم کی عمر میں ہی ہو جاتی ہے اور ۳۰ سال کی عمر سے پہلے ہی وہ مائیں بن جاتی ہیں۔

(۲) شادیاں بہت ہی کم عمر میں ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے بموجب اگر بیوی کی عمر ۱۵ سے ۲۰ سال کے درمیان ہو تو اوسط گھرانے میں سات بچے ہوتے ہیں۔ ۲۰ سے ۲۵ سال تک عمر ہونے پر ۵٫۴ بچے اور ۲۵ سے ۳۰ سال کی عمر ہونے پر ۴٫۱ بچے ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بیوی کی عمر جتنی زیادہ ہوگی بچے اتنے ہی کم ہوں گے۔ ہندوستان میں ۱۵ سے ۲۰ سال تک کی عمر کی عورتوں کے بچے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ۲۰ اور ۳۰ سال کے درمیان بھی بچے زیادہ ہوتے ہیں لیکن اول الذکر عمر کی عورتوں سے کم۔ ۳۰ سال کی عمر سے زیادہ عورتوں کے بچے بہت ہی کم ہوتے ہیں اور ۴۵ سال کی عمر میں قریب بالکل نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں ایک عورت کے اوسط سات بچے ہوتے ہیں انگلینڈ میں ۳٫۴، جرمنی میں ۳٫۴، اٹلی میں ۴٫۹ اور پولینڈ میں ۲٫۶۔

(۳) ایڈیم سمتھ کے بموجب ہماری غریبی اور نیچا معیارِ زندگی بھی پیدائش کی اونچی شرح کا ذمہ دار ہے۔ غریب گھرانے کی عورتوں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں یہ امر بخوبی واضح ہے کہ بچوں کی زیادہ پیدائش کا جھکاؤ ان اشخاص میں زیادہ ہے جہاں کہ بچوں کے والدین یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا معیارِ زندگی ہمارے معیارِ زندگی سے زیادہ کم نہیں ہو سکتا۔

(۴) ناخواندگی بھی اونچی شرح پیدائش کی ذمہ دار ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ناخواندہ اقتصادی طور پر بدحال اور نیچے درجے کے گھرانوں میں بچے زیادہ ہوتے ہیں۔ دیہاتی شرح پیدائش شہری شرح پیدائش سے ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔

شرح موت

جہاں شرح پیدائش زیادہ ہے وہاں شرح موت بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ ۳۰ فی ہزار ہے۔ یعنی ہر سال ایک کروڑ اشخاص لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں ۱۹۴۱ء میں ہندوستان کی شرح موت ۲۲ فی ہزار اور ۱۹۴۹ء میں ۱۵٫۶ فی ہزار تھی۔ لیکن یہ تخمینے کم تھے۔ ہندوستان کی شرح موت یقیناً بہت ہی زیادہ ہے۔ اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔ ہندوستان کی شرح موت ۲۲ فی ہزار۔ کینیڈا ۹٫۶ جرمنی ۱۲٫۳، فرانس ۱۵٫۳، یونائٹڈ کنگڈم ۱۲٫۲، ریاستہائے متحدہ امریکہ ۱۰٫۶، جاپان ۱۴٫۰، آسٹریلیا ۱۰٫۹، نیوزی لینڈ 9.84 اور مصر کا ۲۷٫[illegible]۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ اموات ایک سال سے کم عمر کے بچوں کی۔ بچے کی پیدائش کے دوران میں ماؤں کی اور ایسی عورتوں کی ہوتی ہے جو بچہ پیدا کر سکتی ہیں۔ جتنے بچے ہوتے ہیں ان میں ایک چوتھائی پہلے ہی سال لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں۔ ان میں آدھی اموات پہلے ہی مہینے ہو جاتی ہیں اور ۶۰ فیصدی پہلے

ہی ہفتہ۔ کسی سال کی اموات کی تعداد میں سے ۱ سال سے کم عمر والوں کی تعداد قریب ۴۹ فیصدی ہوتی ہے۔

عورتیں زیادہ ۱۴ اور ۳۰ سال کے درمیان بچے کی پیدائش کے دوران میں لقمۂ اجل ہوتی ہیں۔ بھور کمیٹی کے بموجب بچے کی پیدائش کے دوران میں ہر سال قریب ۲ لاکھ عورتیں مرجاتی ہیں اور قریب ۴۰ لاکھ مختلف امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ عورتوں کی اس طرح اموات ہمارے ملک میں آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جرمنی اور جنوبی افریقہ کی نسبت پانچ گنی، ریاستہائے متحدہ امریکہ کی نسبت ۳ گنی، انگلینڈ، ویلز اور سوئٹزرلینڈ کی نسبت ۶،۸ گنی اور فرانس، سویڈن، جاپان، اٹلی، ناروے اور ڈنمارک کی نسبت ۱۲ گنی ہیں۔

ہندوستان میں اوسط عمر صرف ۲۷ سال ہے جبکہ یہ نیوزی لینڈ ۶۷ سال، سویڈن اور ناروے میں ۶۳ سال، یونائیٹڈ کنگڈم میں ۶۲ سال، کینیڈا میں ۶۰ سال، فرانس میں ۵۷ سال اور جاپان میں ۳۴ سال ہے۔ اوسط عمر اس قدر کم ہونے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور ایسے بچوں کی تعداد جن کی زندگی دوسروں پر منحصر ہو بڑھ جاتی ہے

ہندوستان میں دوسرے ممالک کی طرح بہت سے ایسے اشخاص ہیں جو کہ جسمانی یا دماغی کمیوں کے باعث سوسائٹی کے لئے ایک بار ہیں۔

ہندوستان میں پاگل اور اندھوں کی تعداد کے اعداد و شمار صحیح نہیں ملتے کیونکہ ایسے انسانوں کو جو کہ کمزور دماغ ہوتے ہیں پاگلوں میں اور جزوی طور پر اندھوں کو مکمل طور پر اندھوں میں شمار کر لیا جاتا ہے۔ اندھے پن کی کمیٹی کے بموجب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں اندھوں کی تعداد قریب ۲۰ لاکھ تھی اور جزوی طور پر اندھوں کی تعداد اس سے دگنی یعنی ہر ہزار اشخاص میں سے قریب ۳ اندھے۔ ایک بڑی تعداد بچپن میں ہی مکمل اندھی یا جزوی طور پر اندھی ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں کوڑھ کے مریضوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے جبکہ تمام دنیا میں ایسے مریضوں کی تعداد تیس لاکھ کے قریب ہے۔ صنفی امراض میں مبتلا اشخاص کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ راجکماری امرت کور کے بموجب "ہر ہزار اشخاص میں ۳۷ آتشک سوزاک وغیرہ صنفی امراض میں مبتلا ہیں۔ قریب ۱۵ لاکھ اشخاص ہر سال حادثات، سانپ کے کاٹنے اور دیگر وجوہات کے باعث مر جاتے ہیں۔ اس قدر مصیبت کی وجہ ہمارے ملک میں میڈیکل سائنس کی کم ترقی میں پوشیدہ ہے۔

ہندوستان میں ہر ۱۰۰ اشخاص میں سے ۲ ایسے دماغی امراض میں مبتلا ہیں جنہیں ہسپتال میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ تمام ملک میں ایسے اشخاص کی تعداد کم سے کم ۸ لاکھ ہے۔

ہندوستان ایک امیر ملک ہے جس کے باشندے غریب ہیں۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ معیارِ زندگی بلند کیا جائے۔

ضرورت صرف اس چیز کی نہیں ہے کہ زیادہ تعداد کو روکا جائے بلکہ اس چیز کی بھی ہے کہ درجہ بھی اعلےٰ بنایا جائے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایسے اشخاص میں پیدائش کو روکا جائے جو کہ یقینی طور پر نقص دار ہیں۔ پاگلوں، ملزموں اور دیگر امراض میں مبتلا اشخاص کو یا تو الگ اداروں میں رکھا جائے جہاں وہ صنفی تعلق سے الگ رہ سکیں یا ان کی قوت ولادت کو ختم کر دیا جائے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اعلےٰ درجہ کی اولاد کی پیدائش کے طریقے استعمال کئے جائیں۔

اس لئے آبادی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے چار باتیں کرنی چاہئیں۔

(۱) برتھ کنٹرول کے طریقوں کا زیادہ استعمال

(۲) بچوں کا معیار بلند کرنے کے لئے بالا الذکر دونوں طریقوں کا استعمال

(۳) اقتصادی ترقی جس سے معیارِ زندگی بلند ہو اور بیروزگاری دور ہو

(۴) پیشوں کی بہتر تقسیم جس سے اقتصادی حالت میں بہتری پیدا ہو۔

("ماڈرن ریویو" سے ماخوذ) مترجمہ بھگوت سروپ گوئل

زکی انور

سنگم

پنڈت بھولے ناتھ شاستری کی ناٹک منڈلی دھرم اور آرٹ کی خدمت کے لئے وقف تھی۔ دھرم کی خدمت کچھ زیادہ اور آرٹ کی اُس سے کچھ کم۔ کمانے کمانے کا سلسلہ وہاں نہ تھا۔ پنڈت بھولے ناتھ شاستری خود ایک مالدار زمین دار اور موسیقی کے ماہر تھے۔ اور اُن کی ناٹک منڈلی میں کام کرنے والے بھی منجھے ہوئے فن کار ہونے کے علاوہ گھر کے ایسے خوش حال تھے کہ وہ کھانے پینے اور دوسرے اخراجات کے لئے بھی گھر سے غلّہ اور پیسے لے آیا کرتے تھے۔ ناٹک منڈلی کے پردہ کھینچنے والوں۔ اسٹیج سجانے والے اور اس قسم کے دوسرے ملازموں کی تنخواہیں اور ناٹک کے اخراجات اُس رقم سے پورے ہو جاتے تھے جو رقم تماشہ ختم ہونے پر آرتی کی تھالی میں آتی تھی۔ کبھی کبھی پنڈت بھولے ناتھ شاستری کو اپنے ذاتی پیسے بھی ناٹک منڈلی میں لگا دینا پڑتے تھے۔ پر ایسا موقع کم ہی آتا تھا۔ پنڈت بھولے ناتھ شاستری اور اُن کی ناٹک منڈلی کا نام اتنا کھل گیا تھا کہ پنڈت جی جس گاؤں میں بھی جاتے، گاؤں کے لوگ بڑے چاؤ سے اُنھیں وہاں ناٹک کھیلنے کی دعوت دیتے اور جب پنڈت جی وہاں رام لیلا۔ راس لیلا اور دوسرے مذہبی ناٹک دکھلاتے تو گاؤں والے جی کھول کر آرتی کی تھالی میں بھینٹ دیتے۔

پنڈت ہری شنکر شاستری، پنڈت بھولے ناتھ شاستری کا اکلوتا بیٹا اور ناٹک منڈلی کا منیجر تھا۔ اُسے پنڈت جی نے ایف۔ اے تک کی تعلیم بھی دلوائی تھی۔ وہ بڑا ہی ذہین اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ اُس میں منیجری کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں اور پنڈت جی اُسے بہت پیار کرتے تھے۔

ناٹک منڈلی کا ماحول بالکل مذہبی اور فنّی تھا۔ وہاں یا تو شری رام چندر جی کی خدا ترسی اور قربانیوں کا چرچا ہوتا یا سیتا جی کی تقدیس کی باتیں ہوتیں۔ یا شری کرشن جی کی بانسری کی حد سے زیادہ روحانی تانوں کا تذکرہ ہوتا۔ یا پھر مہا دیو جی کی تپسیا اور رقص کی۔ لیکن ایسے ماحول میں بھی ہری شنکر باضابطہ طور پر اخبار پڑھتا، دوسری کتابیں پڑھتا، اور کبھی کبھی سیاسی جلسوں میں چلا جاتا، اور کبھی کبھی سنیما دیکھ آتا۔ یہ باتیں پنڈت جی کو ذرا سی ناگوار تو ضرور معلوم ہوتیں۔ لیکن ہری شنکر کے اتنے سارے گنوں کے نزدیک اُس کی یہ باتیں پنڈت جی کے نزدیک اتنی غیر اہم تھیں کہ اُنھوں نے ہمیشہ نظر انداز کر دیا۔

پنڈت بھولے ناتھ شاستری کی موت کے بعد اُن کی ساری جائداد کے علاوہ ناٹک منڈلی کا بھی ہری شنکر مالک ہوا۔

کچھ دنوں تک تو ناٹک منڈلی بدستور پنڈت جی کی قائم کی ہوئی ڈگر پر چلتی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ ہری شنکر نے اُس میں تبدیلیاں شروع کر دیں، اور ناٹک منڈلی کا اب نام دھر دیا گیا "شری شاستری ناٹک منڈلی"۔

اور پھر ہری شنکر شدت سے یہ محسوس کرنے لگا شری رام چندر جی میں بے پناہ خدا ترسی کا جذبہ کے علاوہ حکم رانی کی اعلیٰ قابلیتیں بھی تھیں۔ سیتا جی کی زندگی تقدیس کے علاوہ بہترین ازدواجی زندگی گزارنے کا راستہ بھی بتاتی ہے۔ شری کرشن جی کی حد سے زیادہ روحانی بانسری کی تانوں سے زیادہ اہم اُن کا جاگا ہوا سیاسی شعور تھا۔ اور مہا دیو جی کی تپسیا اور اُن کے اعلیٰ رقصوں سے زیادہ اہم اُن کی زندگی کی کہانی کا یہ پس منظر تھا کہ وہ ادھا کی شکل میں قدیم ہندوستانی تہذیب کو، وقت کے حکمراں کے قتل کر دینے کے باوجود اپنے کندھوں پر ڈھوئے ڈھوئے پھرے۔ ویسے تو مردہ تہذیب اُن کے کندھوں پر سلامت نہ رہ سکی اور سڑ گل کر گر گئی۔ لیکن ہندوستان کی تہذیب بے مثال اور امر تھی، اُسے اُس کے قدر دانوں نے پھر بھی زندہ رکھا۔ اور مہا دیو جی کو پھر اُن کی محبوب تہذیب رادھا ہی کی شکل میں ہمالیہ کی وادیوں میں مل گئی۔

ہری شنکر نے وقت کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کیں اور اُن سے اپنے مطالعوں کے انوسار نئے نئے ناٹک لکھوا کر کھیلے۔

مگر گاؤں میں اُس کے نئے ناٹک بُری طرح پٹنے لگے۔ آرتی کی تھالی میں محض چند آنے آتے اور کسی دن تو آرتی کی تھالی گھوم پھر کر خالی خولی واپس آجاتی۔ ایک تو ناٹک دیکھنے والے ہی اب بہت کم ہوتے تھے۔ جو تھے بھی وہ تماشہ ختم ہونے پر آرتی کی تھالی میں پیسے دینے کے بدلے مُنہ بنا کر اُٹھتے منہ بچکا کر چلے جاتے۔ جاتے وقت اُن کے دلوں میں پنڈت بھولے ناتھ شاستری کی یاد تازہ ہو جاتی اور وہ افسوس کرتے کہ اب وہ بات کہاں! اور وہ اتنے قابل باپ کے ایسے ناقابل بیٹے پر محض افسوس کر کے رہ جاتے۔ ممکن تھا اگر انھیں پنڈت بھولے ناتھ شاستری سے غیر معمولی عقیدت نہ ہوتی تو وہ اٹ پٹانگ تماشے دکھلانے پر ہری شنکر کو گالیاں بھی دے ڈالتے۔

یہ دیکھ کر کہ گاؤں میں لوگوں کا چاؤ بالکل ختم ہو چکا ہے ہری شنکر نے شہر میں ناٹک کھیلنے کا ارادہ کیا۔ لیکن شہر میں ناٹک کھیلنے کے لئے اُسے اچھے اچھے سازوں کی ضرورت تھی اور یہ سب کچھ اُس نے اپنی تھوڑی سی زمین بیچ کر پورا کر لیا۔

کافی بھاگ دوڑ اور انتظار کے بعد شری شاستری ناٹک منڈلی "شاستری تھیٹرس" کی شکل میں شہر پہنچا۔ چھ آنے سے لے کر تین روپے تک کی ٹکٹ پر شاستری تھیٹرس کا پہلا کھیل "ہماری امر سنسکرتی" دکھلایا گیا۔ اور وہ کچھ اس قدر مقبول ہُوا کہ دوسرے دن ہری شنکر کو اُن کی ہلکی پھلکی گالیاں سننا پڑیں۔ جنہیں ہال میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ٹکٹ نہیں مل سکی۔ لیکن گالیاں سن کر ہری شنکر کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہو گئی تھی جس میں روشن مستقبل اور کامیابی کے رنگ صاف نمایاں تھے۔

اب شاستری تھیٹرس کے فن کاروں کو معقول معاوضہ ملنے لگا تھا اور شاید معاوضہ ہی ملنے کے کارن اُن کا فن اور بھی نکھرنے لگا تھا۔

ہری شنکر جس شہر میں تھیٹر لے کر جاتا۔ اپنے بہت سارے مداح، دوست اور عقیدت مند پیدا کر لیتا۔ ایک شہر میں ہری شنکر کو کچھ ایسے مداح، دوست اور عقیدت مند ملے جنہوں نے اُسے بتایا کہ تھیٹر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اور کتنے ہی اچھے اداکاروں کے ساتھ کتنے ہی اچھے ناٹک کیوں نہ اسٹیج کئے جائیں پبلک کا ذوق اس طرف سے ہٹ چکا ہے اور وہ جلد ہی اُکتا جاتے ہیں۔ انھوں نے ہری شنکر کو رائے دی کہ زمانے کی ہوا کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ اپنے نایاب ڈراموں کی فلمیں بنائے کیوں کہ اُس کے پاس بہترین فن کار بھی تو موجود تھے۔

بات تو بہت ہی معقول تھی اور خود ہری شنکر نے بھی ایسی بات کئی بار سوچی تھی۔ لیکن اتنی رقم کہاں سے آسکتی تھی؟ یہ سوال ہمیشہ ہری شنکر کے ذہن میں اُٹھتا اور جواب نہ پا کر بیٹھ جاتا۔ لیکن اب اُس کے مدّاحوں، دوستوں اور عقیدت مندوں نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سب اُس کے شریکِ کار رہیں گے اور ہری شنکر نے بھی اپنی ساری جائیداد فروخت کر کے "دی شاستری فلمس لمیٹڈ" کی بنا ڈال دی۔

"دی شاستری فلمس لمیٹڈ" کی اوّلین فلم "کرشن اعظم" کی ساری کاغذی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ پھر فلموں سے متعلق کچے مال کی فراہمی بھی شروع ہو گئی۔ لیکن سب سے اہم مسئلہ تھا ہیروئن اور ہیرو کے چناؤ کا۔ یہ مسئلہ اتنا اہم نہ ہوتا اگر سارے فن کار ایک پر ایک نہ ہوتے یا اگر پنڈت بھولے ناتھ شاستری ہمیشہ اپنے بیٹے کو یہ ہدایت نہ کرتے ہوتے کہ وہ سارے فن کاروں کو ایک نظر سے دیکھے۔

اس میں شک نہیں کہ ہری شنکر ریکھا کو ذرا مختلف نظر سے دیکھا کرتا تھا لیکن یہ مختلف نظر نہ تو امتیازی تھی اور نہ ہی اُس کا یہ مطلب تھا کہ ریکھا کا فن سب سے اعلیٰ تھا۔ بلکہ وہ مختلف نظر تو محض پیار کی نظر تھی۔ ہری شنکر ریکھا کے علاوہ بھی سارے فن کاروں سے پیار کرتا تھا۔ لیکن دوسرے فن کاروں سے پیار اور ریکھا سے پیار میں کیا فرق تھا اس بات کو شروع میں ہری شنکر نے تو سمجھا ہی نہیں اور جب سمجھ گیا تو نظر انداز کر دیا اور جب نظر انداز بھی نہ کر سکا تو محض سوچا کرنے لگا۔

لیکن وہاں ریکھا سے اچھی اداکارائیں بھی تھیں اور ریکھا بھی بہتوں سے اچھی اداکارہ تھی۔ اور یہ فیصلہ کرنا حقیقتاً بہت محال تھا کہ کس کو کس پر اور کیوں ترجیح دی جائے۔ ریکھا کے بارے میں یہ سوچتے ہوئے ہری شنکر کو ہمیشہ اپنے باپ کی، فنکاروں کو ایک نظر سے دیکھنے والی بات یاد آجاتی۔ اور اُسے یہ خوف بھی ہوتا کہ اگر وہ ریکھا کی طرف داری کر بھی دے تو اُس کے دل کا چور پکڑا جائے گا۔

بہت سوچ بچار کے بعد "دی شاستری فلمس لمیٹڈ" کے سارے شرکاء نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ مقابلے کا ایک ہفتہ منائیں جس میں سارے فن کار ایک ہفتہ بس اداکاری ہی کرتے رہیں۔ اور اُن کی اداکاری پہ ایک منتخبہ بورڈ نظر رکھے اور جس کی اداکاری جیسی ہو اُسے ویسا ہی کردار دیا جائے۔

گو یہ فیصلہ ذرا مضحکہ خیز تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا۔ چنانچہ ایک دن سارے فن کاروں کو جمع کر کے دی شاستری فلمس لمیٹڈ کے دوسرے شرکاء کی رائے سے ہری شنکر نے یہ فیصلہ سنا دیا۔ سارے فن کاروں نے بھی اس فیصلے کو سراہا اور اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور یہ طے ہو گیا کہ کل صبح سے مقابلے کا ہفتہ

شروع ہو جائے گا۔

لیکن سامنے بیٹھی ہوئی ریکھا نے بڑی اداس آواز میں ہری شنکر سے پوچھا۔

"کیا مقابلے کا ہفتہ کچھ دنوں بعد شروع نہیں کیا جا سکتا؟"

"کیوں؟" ہری شنکر چونکا اور سارے لوگ ریکھا کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں ادھر تقریباً ایک مہینے سے کچھ بیمار سی ہوں" ریکھا کھانسی اور پھر کہنے لگی۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کیا ہے؟ دن میں کسی وقت تھوڑا بخار آ جاتا ہے اور طبیعت تو ہر وقت نڈھال رہتی ہے۔ ذہن تو خالی خالی سا رہتا ہے۔ جسم بھی ہر وقت تھکا تھکا اور پریشان سا رہتا ہے۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ میرا محبوب فن رقص ہے۔ اور میں رقص ہی کا سہارا لے کر مقابلے میں میدان مارنے کی اُمید کر سکتی تھی۔ لیکن مجھ سے ناچا تو بالکل نہیں جا سکتا۔" وہ پھر کھانسنے لگی۔ ہری شنکر اُسے بہت گھبرائی ہوئی نظر سے دیکھتے دیکھتے بولا۔

"تقریباً کتنے دنوں تک مقابلے کا ہفتہ روک دیا جائے؟"

"میں کیسے کہوں۔" ریکھا مسکرائی۔ "بلکہ اب تو میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ مقابلے کا ہفتہ رکوانا بھی درست نہیں۔ میرا جسم جس تیزی سے گر رہا ہے۔ میں تو ایسا سمجھتی ہوں کہ دو چار دنوں میں پلنگ سے لگ جاؤں گی۔"

"پر آپ نے آج تک کسی سے ذکر نہیں کیا؟" ہری شنکر نے کہا۔ "لیکن اس میں مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ ممکن ہوا تو مقابلے کا ہفتہ چند دنوں کے لئے روک دیا جائے گا۔"

"نہیں۔" ریکھا کچھ اور کہتی۔ مگر اُس پر کھانسی کا کچھ ایسا دورہ پڑا کہ وہ آگے نہ کہہ سکی۔

"آپ کیا کہہ رہی تھیں؟" ہری شنکر نے پوچھا۔

میں یہ عرض کر رہی تھی کہ۔" ریکھا کہنے لگی "میں نے بغیر سوچے سمجھے محض جذبات میں مقابلے کا ہفتہ رُکوانے کی اپیل کر دی تھی۔ لیکن میں نے جو سوچا تو محض میرے لئے انتظام میں گڑبڑی ہو جانا مجھے پسند نہیں اور یہ چیز ایک طرح سے میرے ساتھ رعایت ہو گی۔ اور رعایت کو میں اپنی توہین سمجھتی ہوں۔"

"رعایت نہیں ریکھا دیوی!" ہری شنکر نے کہا۔ "آپ کو فلم میں شامل کرنا تو سب کے لئے مفید ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ میں کب تک صحت مند ہو سکوں گی۔" ریکھا بولی۔

"نہیں۔" ہری شنکر نے ذرا زور دے کر کہا۔ "مقابلے کا ہفتہ کچھ دنوں کے لئے روک دینا ہی ٹھیک ہوگا۔"

"جی نہیں۔" ریکھا نے بھی زور سے کہا۔ "میں اپنے ساتھ کسی قسم کی بھی رعایت کو اپنی کمزوری سے منسوب کرتی ہوں۔ آپ لاکھ کہیں مقابلے کے ہفتے کی تاریخ بڑھانا میرے لئے رعایت ہی کہی جائے گی۔ فن کار کی سب سے بڑی طاقت اُس کا فن ہوتی ہے۔ اپنے فن کے علاوہ کسی اور چیز کا سہارا لینا فن کار کی موت ہے۔ میں اپنی اپیل بڑی ندامت کے ساتھ واپس لیتے ہوئے عرض کرتی ہوں کہ اگر مقابلے کے ہفتے کی تاریخ بڑھا بھی دی گئی تو میں اس بات کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے مقابلے میں شریک نہ ہوں گی — یہ میرا آخری اور قطعی فیصلہ ہے۔"

ریکھا اُٹھی اور کھانستی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اور دوسرے روز سے مقابلے کا ہفتہ شروع ہو گیا۔ مکان کا کونہ کونہ فن کے بہترین نمونے پیش کرنے لگا۔ کہیں سے دل گداز نغمے پھوٹ رہے ہیں تو کہیں سے تھاک تھئی تھئی۔ دل فریب رقص پیش کئے جا رہے ہیں۔ کسی طرف نزاع کا دلچسپ منظر نظر آ رہا ہے تو کہیں دو بھائیوں کے درمیان تخت و تاج کے لئے دوبدو جنگ ہو رہی ہے۔ کہیں پریم رس میں ڈوبی ہوئی باتیں ہو رہی ہیں۔ تو کوئی فراق کی آگ میں جل رہا ہے اور کوئی پریتم کے بچھڑ جانے سے پاگل ہو گیا ہے۔ پورنیما تو کچھ اس طرح پاگل ہو گئی کہ لوگوں کو کبھی کبھی یہ شک ہوتا کہ کہیں وہ سچ مچ تو پاگل نہیں ہو گئی؟ اور اُس کا بہترین پاگل پن سبھوں کو یہ مان لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ کہ وہ ضرور میدان مار لے گی۔ اور "دی شاستری فلمس لمیٹڈ" کی اولین فلم "کرشن اعظم" کی ہیروئن ہو گی۔

ہری شنکر مقابلے کے ہفتے سے کچھ بھی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ تو بس دن رات ریکھا کی پلنگ سے لگا، کرسی پر بیٹھا رہتا تھا۔ اور اب اُسے اس بات کی فکر بھی نہیں رہ گئی تھی کہ لوگ اُس کے دل کا چور پکڑ لیں گے کہ اُسے ریکھا سے پیار ہے۔

محض پانچ چھ دنوں ہی میں ریکھا سچ مچ پلنگ سے لگ کر رہ گئی تھی۔ علاج ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر بدلے جا رہے تھے۔ علاج بدلا جا رہا تھا۔ لیکن ریکھا کا مرض بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اب ہر لمحہ وہ کھانسی سے پریشان رہنے لگی تھی۔ دن میں کئی بار منہ سے خون آ جاتا۔ آنکھوں تلے سیاہ گہرا حلقہ بن گیا تھا۔ چہرے پر مردنی سی چھا گئی تھی۔ اور ریکھا کا گداز اور گدرایا ہوا جسم اگر سوکھ نہ سکا تھا تو اُس میں اب نمایاں

فرق مزید پیدا ہو چکا تھا۔ اور اب ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ گو اُس کے پھیپھڑے ابھی تندرست تھے۔ لیکن بیماری کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیئے اور ریکھا کو جلد ہی کسی سینی ٹوریم میں داخل کر دیا جائے تاکہ مناسب علاج ہو سکے۔ لیکن اب ریکھا اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اپنے ناخن کو دبا کر یہ دیکھنے کے لئے کہ اُس کے بدن میں کتنا خون ہے؟ اُسے اپنے ہاتھ بھی دوسروں سے اُٹھوا کر نظر کے سامنے لانا پڑتا۔ اور ایسی حالت میں اُسے کہیں اور لے جانا مناسب نہ تھا۔

ہری شنکر نے سوچا تھا کہ ریکھا کو تھوڑی بہت بھی طاقت آ جائے گی۔ اور تعاملے کا ہفتہ بھی جب تک ختم ہی ہو جائے۔ پھر اطمینان سے اُسے لے کر کسی پہاڑی پر چلا جائے گا۔

تعاملے کے ہفتے کا آخری دن آ گیا۔

پہلے ہری شنکر نے سوچا تھا کہ تعاملے کے ہفتے کا آخری دن خوب دھوم دھام سے منایا جائے گا۔ شام کے وقت شہر کے مشہور معزز لوگ اور فلمی ہستیوں اور دوسرے فن کاروں کو مدعو کیا جائے گا۔ ایک چھوٹا سا کنسرٹ ہوگا۔ ایک اچھی سی پارٹی ہوگی، پھر ہفتے بھر کی اداکاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے "دی شاستری فلمس لمیٹڈ" کی اولین فلم "کرشن اعظم" کے لئے ہیرو، ہیروئن اور دوسرے کرداروں کا انتخاب ہو جائے گا۔ اور پھر فلم کی مہورت بھی ہو جائے گی۔

لیکن پچھلی رات سے جو وہ ریکھا کی پلنگ کے پاس بیٹھا تھا تو ایک پل کے لئے بھی جدا نہ ہو سکا تھا۔ صبح وہیں بیٹھے بیٹھے اُس نے مُنہ ہاتھ دھوئے بغیر اُس نے چائے پی تھی اور بس! یہاں تک کہ ریکھا کے کمرے سے لگے ہوئے میک اپ کا کمرہ تھا مگر اُس نے اپنے بکھرے بال بھی نہیں سنوارے تھے۔

پچھلی رات سے ہی ریکھا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اُسے ایک پل کے لئے بھی چین نصیب نہیں تھا۔ کبھی اُسے اتنی گرمی لگتی کہ بجلی کا پنکھا اُس کی آخری رفتار سے کھول دیا جاتا اور سر پر برف کی تھیلی رکھی جانے لگتی۔ اور اب کبھی اُسے اتنی سردی لگتی کہ اُسے چادر اور پھر لحاف اُڑھا دیا جاتا۔ پھر جلد ہی وہ بوکھلا جاتی۔ لحاف کے اندر بڑی بے تابی سے کلبلانے لگتی۔ اُس کا چہرہ کھول دیا جاتا۔ تھوڑی دیر تک وہ حد سے زیادہ پریشان سی نظر آتی اور پھر خون کی ایک قے کر دیتی۔ پھر کچھ دیر کے لئے بے حس و حرکت سی پڑی رہتی۔

دن میں کئی بار ڈاکٹر آ چکے تھے۔ مگر ڈاکٹر مسیحائی تو جانتے نہیں تھے، آتے، سٹیتھسکوپ لگاتے۔ نبض دیکھتے اور پھر ہری شنکر کو تسلی دے کر چلے جاتے

دن میں محض ہری شنکر کی تسلی ہی کے لئے کیلشیم کی ایک سوئی لگائی گئی تھی۔ لیکن سوئی لگانے کے بعد ہی ریکھا کی حالت اتنی کرب ناک ہو گئی تھی کہ اب جو کبھی کبھی دل کی دھڑکن بند ہوتی ہوئی سی محسوس ہوتی اور ڈاکٹر بجھتی ہوئی شمع کو محض کچھ دیر کے لئے جلتی رکھنے کے لئے "کورامن" دینا چاہتے تو ریکھا بڑی گلوگیر آواز سے ساجت کرتی اور ایشور کا واسطہ دے کر ڈاکٹر کو سوئی لگانے سے روک دیتی ہری شنکر سے بھی ریکھا کی وہ بے چینی دیکھی نہ گئی تھی جو سوئی لگانے کے بعد ہو گئی تھی۔ اور اب وہ بھی سوئی لگانے سے ڈاکٹر کو منع کرتا تھا۔ کیونکہ اُسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ریکھا اگر چند گھنٹوں کی نہیں تو چند دنوں کی مہمان ہے۔ ایسی حالت میں اُس کی تکلیفوں میں مزید اضافہ کرنے سے کیا حاصل؟

شام ہونے کو آئی تھی۔ ابھی ابھی شہر کا ایک مشہور ڈاکٹر آیا تھا اور ریکھا کو دیکھنے کے بعد نرس کو کچھ ضروری ہدایتیں کر کے اور ہری شنکر کو تسلّی دے کر جا چکا تھا۔ ریکھا بے ہوش سی پڑی تھی۔ اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سارے لوگ اُس کے کمرے سے ہٹا دئے گئے تھے۔ البتہ ڈاکٹر کی ہدایت سے مجبور نرس اور اپنے دل کے تقاضوں سے مجبور ہری شنکر کمرے میں موجود تھے۔

نرس ایک کنارے کوچ پر پڑی اونگھ رہی تھی۔ اور ہری شنکر، ریکھا کی پلنگ کے سرہانے کرسی پر بیٹھا اٹ پٹانگ باتیں سوچ رہا تھا۔

ہری شنکر سوچ رہا تھا، انسان ترقی کی کتنی منزلیں ہی کیوں نہ طے کر لے وہ قدرت کے ہاتھوں کا ایک حقیر کھلونا ہی ہے۔ اُسے اپنے بارے میں خیال آیا کہ وہ کیا تھا؟ کیا سے کیا بنا اور پھر کیا سے کیا بننے والا تھا۔ لیکن قدرت کے ایک بالکل معمولی اور روزمرہ کے فعل کے بعد وہ کیا سے کیا ہو کر رہ جائے گا؟ اب وہ اپنے دل کو مزید جھوٹی تسلّی دینا نہیں چاہتا تھا۔ اور اُس نے اپنے آپ سے اعتراف کر لیا تھا کہ اُسے ریکھا سے پیار ہے ــــ بے پناہ پیار! پھر کیا ریکھا کی موت کے بعد اُس کے دل کے ولولے بدستور سلامت رہ سکیں گے؟ اور اس سوال کے جواب میں اُس کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس میں موت کی سی اُداسی تھی۔ اُس نے سوچا کہ ریکھا کی موت کے بعد بھی وہ ایسی ہی مسکراہٹ مسکرا سکے گا۔ لیکن مسکراہٹوں کی موت کی سی اُداسیاں اُس کے لبوں پر سے پھیل کر سارے ماحول میں چھا جائے گی اور وہ ساری زندگی انھیں اداسیوں میں گھٹتا رہے گا۔

ہری شنکر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کرسی کے تکئے سے سر ٹیک لیا۔

اور کافی دیر تک وہ ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا اور اُلجھتا رہا اور یہ سب کچھ سوچتے سوچتے اُس کے لبوں پر ایک بار پھر ویسی ہی اُداس مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب کے وہ مسکراہٹ اُداس بھی تھی، تلخ بھی اور اُس میں ایک گہرا طنز تھا۔ ہری شنکر کی آنکھیں کھل گئیں۔ سامنے پلنگ پر ریکھا اب تک آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ وہ ریکھا کی طرف خوب غور سے دیکھنے لگا۔ ریکھا کیا سے کیا ہو چکی تھی۔ قدرت کی فن کاری کا حسین اور شاہکار نمونہ ایک پژمردہ پھول سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ہری شنکر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے گھبرا کر نرس کی طرف دیکھا۔ وہ کُرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ ہری شنکر نے جلدی سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھ لئے۔

ریکھا کے جسم میں ذرا سی حرکت ہوئی اور ہری شنکر غور سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ریکھا نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے نکل کر اُس کے گالوں پر آ گئے۔ اور کچھ دیر تک ریشمی گالوں پر پھسلتے رہنے کے بعد تکیے پر گر کر جذب ہو گئے۔

"میرے پاس آؤ" ریکھا نے اتنی نحیف آواز میں کہا کہ نرس بھی نہیں سُن سکی۔ البتہ اور پاس آنے کے لئے جب ہری شنکر نے کُرسی کھسکائی تو نرس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ دوڑ کر ریکھا کے پاس آ گئی۔

"کیا بات ہے؟" نرس ریکھا پر جُھک گئی۔

"ذرا باہر چلی جاؤ۔" ریکھا نے بڑی تکلیف سے رُک رُک کر کہا۔

نرس باہر چلی گئی تو ریکھا نے ہری شنکر کی طرف بڑی حسرت سے دیکھ کر کہا۔ "میرے پاس آؤ شنکر۔"

شنکر نے کُرسی ذرا اور پاس کھسکا لی۔

"میرے ہی پلنگ پر بیٹھ جاؤ شنکر۔" ریکھا جیسے کراہی

شنکر کُرسی سے اُٹھ کر اُس کی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُسی وقت ریکھا پر پھر کھانسی کا دَورہ ہُوا اور کافی دیر تک کھانسی رہنے کے بعد وہ بے دم سی ہو گئی۔ اور جب اُسے ذرا سکون ہُوا۔ تو وہ بالکل رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی

"شنکر آج زندگی میں پہلی بار میں تمہارا نام لے کر اور تمہیں "تم" سے مخاطب کر رہی ہوں، تم بُرا تو نہیں مان رہے ہو؟"

شنکر اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ البتہ اُس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک کر ریکھا کے گالوں پر گر گئے۔ ریکھا نے بہت کسمسانے اور بڑی کوشش کرنے کے بعد اپنا ہاتھ ہلایا اور ہری شنکر کے آنسو اپنے انگوٹھے میں لگا کر ماتھے پر لگا لیا۔

ہری شنکر یہ دیکھ کر بالکل خوش نہیں ہُوا کہ ریکھا میں کم سے کم اب اتنی سکت مزور آ گئی ہے کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے معمولی سا کام لے لیا۔ بلکہ یہ دیکھ کر ہری شنکر اور بھی بوکھلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ شمع بجھنے سے پہلے ایک بار تیز جلنے لگتی ہے۔ ہری شنکر کا دل دھک دھک کرنے لگا کہ شاید اب اُس کی زندگی کی شمع بجھنے والی ہے۔ اور اب اُس کے دل کا کونا کونا اندھیرا ہو جائے گا۔ اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" اب کے ریکھا ذرا صاف آواز میں بولی۔ تو ہری شنکر کی گھبراہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ لیکن ریکھا اُس کی طرف بدستور جواب طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔

"ریکھا۔" ہری شنکر رُک رُک کر کہنے لگا۔ "دنیا میں کچھ سوالوں کا جواب زبان سے نہیں دیا جا سکتا۔"

"لیکن میں ایک بار تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں شنکر!" اُس کی آواز میں التجا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"ریکھا۔ مجھے تم سے پیار ہے۔" ہری شنکر نے بے ساختہ کہہ دیا۔

ریکھا اُس کی طرف حد سے زیادہ پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر وہ مسکرانے لگی اور اُس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"ریکھا۔" ہری شنکر نے کراہنے کے انداز میں دہرایا۔ "مجھے تم سے پیار ہے۔"

"شنکر۔" اب کے ریکھا نے شنکر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔ "اب میری آتما کو چین نصیب ہُوا۔"

"ریکھا۔" شنکر چیخا۔ لیکن یک لخت ریکھا کا ہاتھ بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ اور اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ جلدی جلدی سانس لینے لگی۔

"ریکھا۔" ہری شنکر نے اب کے اتنی زور سے پکارا کہ پہلے نرس اور پھر دوسرے لوگ دھڑا دھڑ ریکھا کے کمرے میں گھس آئے۔

ریکھا بڑی بے چینی سے ہچکیاں لے رہی تھی۔ اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ البتہ پورنیما کا پاگل پن یک لخت دُور ہو گیا۔ اور اُس نے جلدی سے ڈاکٹر کو فون کیا۔ لیکن وہ ریسیور رکھ کر لوٹی بھی نہ تھی کہ موت کی

معنو ایک حقیر ہچکی نے ساری گہما گہمی ختم کر دی۔

"ریکھا۔" ہری شنکر اور بھی زور سے چیخا۔ مگر اب وہاں محبت کی پکار کا جواب دینے والا ہی کون تھا۔ ہری شنکر کی پکار دیواروں سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی۔

ہری شنکر آہستہ سے ریکھا کے چہرے پر جھکا۔ اور اُس کے ماتھے کو چوم لیا۔

اور ایک بے پناہ اور حد سے زیادہ اُداس خاموشی سارے ماحول پر مسلّط ہو گئی اور پورنیما نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ریکھا کی چادر اُس کے سر تک تان دی۔ اور پھر ہری شنکر کا بازو تھام کر اُسے باہر لے چلنے لگی۔ اُن کے ساتھ ہی سارے لوگ کمرے سے باہر نکل گئے۔

شام ہو چکی تھی۔ مکان میں تمام تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کسی نے بجلی کے بٹن دبائے اور مکان کا کونا کونا اُجالا ہو گیا۔ لیکن شنکر کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے دل کی تاریکی میں اب کبھی ایک کرن بھی نہیں پھوٹے گی۔

ڈاکٹر جبلہ ہی آ گیا۔ مگر ماحول کی کرب ناک خاموشی دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ ریکھا کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اُس کے قدم ٹھٹھک گئے۔ اور وہ بھی وہیں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک طویل عرصے تک خاموشی چھائی رہی اور خاموشی کی طوالت یوں بڑھتی جا رہی تھی جیسے اب یہ خاموشی لامتناہی ہو کر رہ جائے گی اور جیسے ریکھا کی موت کے ساتھ ساتھ مکان کی ساری گہما گہمی مر جائے گی۔

اچانک ریکھا کے کمرے کی بغل کے میک اپ کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سب کی نظریں اُس طرف اُٹھ گئیں اور وہ اُس طرف یوں دیکھنے لگے جیسے وہ جادو کا کھیل دیکھ رہے ہوں۔

پھر سب کے لبوں پر حد سے زیادہ حسین مسکراہٹ پھیل گئی۔

سب کے سب یوں تحیّر ہو گئے تھے کہ اُن میں سے کسی کے مُنہ سے کوئی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ بس وہ مسکرائے جا رہے تھے۔

"میرا خیال ہے اب اداکاری کے مقابلے کا فیصلہ سُنا دینا چاہیئے" —— بنی سنوری اور دُلہن کی طرح سجی ہوئی ریکھا نے مسکرا کر کہا۔

اور جب اُس کی نظر مسکراتے ہوئے ہری شنکر پر پڑی جس کی پلکوں میں اب تک آنسو کے قطرے چھپتے ہوئے تڑپ رہے تھے تو ریکھا نے ٹھیک ایک نئی نویلی دُلہن کی طرح شرما کر گردن جھکا لی۔

ہری شنکر نے محسوس کیا کہ ریکھا کی بہترین اداکاری اداکاری اور حقیقت کا سنگم تھی۔

اِن مدّوں کی قیمت کبھی نہیں گرتی

نیشنل

سیونگز سرٹیفکیٹس

۱۰ سالہ

ٹریژری سیونگز ڈپازٹس

مزید براں اِن کے سُود کی رقم پر ٹیکس مُعاف ہے

اس سلسلہ میں رقوم جمع کرنے کے بارے میں مزید معلومات یا قواعد کیلئے براہِ مہربانی مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت فرمائیے۔ نیشنل سیونگز کمشنر، گارٹن کاسل، شملہ ۳

AC. 380

محوی صدیقی لکھنوی

نادرشاہ کی عمّان پر فوج کشی

آخری اہم تاریخی تحقیقات

یہ اہم تاریخی مضمون یورپ کے ایک فاضل مضمون نگار لارنس لوکھارٹ نے انگریزی زبان میں بڑی محنت سے لکھ کر چند سال پہلے لندن کے ایک رسالے میں شائع کیا تھا۔ فارسی زبان میں اس کا ترجمہ ایران کے ایک ادیب نے کیا۔ جنہوں نے اپنا نام "رنامور" لکھا ہے۔ اور یہ مقالہ تہران کے مشہور علمی ماہنامہ "مہر" جلد ۳ شمارہ ۱۱ میں شائع ہوا۔ اس خاص موضوع پر نئی تحقیق کا حامل ہے۔ اس لئے میں نے اسے اردو میں ترجمہ کیا۔ کیونکہ اس کا تعلق (لگاؤ) انگریزوں کی اس سیاست جو ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لئے انہوں نے اختیار کر رکھی تھی، اور آخرکار وہ کامیاب ہوئے۔ یہ مضمون کسی قدر خشک ضرور ہے۔ مگر امید ہے کہ اپنے افادی اور معلوماتی لحاظ سے خاص دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

ایران کے اس نامور بادشاہ نے جو نادر شاہ افشار کے نام سے تاریخی دنیا میں شہرت رکھتا ہے، جو جو لڑائیاں لڑیں، جہاں جہاں فوجی حملے کئے، اور جو فتوحات حاصل کیں۔ ہمارے ہاتھوں اور معلومات تک اُن کی تفصیلیں پہنچ چکی ہے ـــــ میرزا مہدی خاں ایسا زبردست واقعہ نگار ہمیشہ اس کی خدمت میں موجود رہتا تھا۔ وہ اسی کام پر مقرر تھا۔ کہ ہر واقعے کو لکھتا رہے۔ وہ ان حادثوں اور واقعات کے سلسلے میں چھوٹی چھوٹی باتوں تک کو تحریر میں لے آتا ہے۔ پھر بھی اس مشرقی ایرانی شاہنشاہ کی تاریخ حیات کے چند گوشے ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئے ہیں۔ جن پر اب نئی تحقیق روشنی ڈالتی ہے۔ اور ابہام کے تاریک پردوں کو ہٹا کر حقیقت کو اجاگر کرتی ہے۔ مسقط اور عمان کے شبہ جزیرہ[1] پر ایرانی لشکر کی حملہ آوری کا مسئلہ بھی ایک ایسا ہی مسئلہ ہے، جس کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات بہم پہنچی ہیں۔ اور جو کچھ پہنچی ہیں وہ بھی اکثر و بیشتر ناہموار اور ناراست ماخذوں سے لی گئی ہیں، اس وجہ سے یا تو ان میں مبالغہ ہے، یعنی بات کو بہت بڑھا کر بیان کیا ہے، یا فضول اور خرافات باتیں زیادہ شامل ہیں، جو اعتبار کے قابل نہیں، یا صحیح و اصل سرچشمہ (ماخذ) ناپید اور نایاب ہے۔ آخر آخر میں انگریز مستشرقین اور لندن کے (مدرسۃ السنۂ مشرقیہ) مشرقی زبانوں کے مدرسہ ارکان کی تلاش اور کوشش سے ماخذوں کا ایک ایسا ذخیرہ اور سلسلہ ہاتھ لگا ہے، جس کے وجود سے اب تک کوئی بھی آگاہ نہ تھا۔ یہ چند دستاویزیں اور اسناد ہیں۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی[2] (شرکت ہندوستان شرقی) کی تحریروں میں ہاتھ آئی ہیں۔ اور جو بغیر کسی درمیانی واسطے کے یہ بتاتی ہیں کہ انگریزوں کی سیاست کا عمان سے کیا لگاؤ تھا۔ یہ کاغذات انہیں کے بارے میں ہیں۔

اس کمپنی کا نمائندہ (ایجنٹ) بذاتِ خود مسقط میں رہتا تھا۔ یہ کمپنی ابتدا میں ایک تجارتی کمپنی کے عنوان سے ہندوستان میں قائم ہوئی۔ مگر کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مختلف ذریعوں، قسم قسم کے حیلوں اور طرح طرح کے ناموں سے ہندوستان کی حکومتوں کو ایک ایک کر کے ہڑپ کر کے پورے ملک

---

[1] شبہ جزیرہ یا جزیرہ نما فن جغرافیہ میں وہ زمین کا بڑا حصہ (ملک) جو تین طرف سے سمندروں سے گھرا ہو۔ [2] جدید عربی، فارسی زبانوں میں کمپنی کو شرکت کہتے ہیں

پر قبضہ کرلیا - اور اس نادر طریقے سے اس شرکت نے ہندوستان کو برطانیۂ عظمیٰ کی حکومت اور دولت کا مستقر (ٹھکانا) بنا دیا - برطانیہ کی سیاست کا دارومدار مشرق ہی پر تھا - اس وجہ سے نادرشاہ کا اس طرح نمایاں ہونا اور فتوحات کا حاصل کرنا کمپنی کے لئے پریشان خاطری کا سبب بن گیا تھا - وہ بڑے غور و فکر سے اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھتی تھی - خصوصاً اس کی نگاہ اس پر لگی ہوئی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو' ایرانی فوجیں عمان کے فتح کرنے میں کامیاب ہو جائیں' جو ہندوستان کا دروازہ شمار کیا جاتا ہے - اور نادرشاہ کی یہ کامیابی کمپنی کے فائدوں اور مصلحتوں کو خطرے میں نہ ڈال دے -

اسی سبب سے اور سچّے دلی لگاؤ کی بنا پر کمپنی کا جو نمائندہ مسقط میں رہتا تھا' وہ پوری فکر و غور سے نادرشاہ کی لشکرکشی کی رفتار کو اپنی رپورٹ میں درج کرتا ہے - اس نمایندے کی تحریریں بڑی توجہ کے ساتھ لندن کے مرکزی ادارے میں پڑھی اور محفوظ رکھی جاتی تھیں - اور اب تک موجود ہیں -

دوسری طرف نادرشاہ کا وقائع نگار میرزا مہدی خاں تھا - اس نے محض اس نظر سے کہ نادرشاہ بذاتِ خود میدان جنگ میں شریک اور موجود نہ تھا - اس سپاہ کشی کا حال اپنی کتاب "درّہ نادری" میں تفصیل کے ساتھ نہ لکھا' بلکہ صرف اشاروں پر اکتفا کی ہے - بعد کے دوسرے ایرانی تاریخ لکھنے والوں نے بھی کسی اور صحیح و لائق توجہ ماخذ تک دسترس نہ پائی - اس وجہ سے ایرانی لشکر کا حملہ عمان پر نادرشاہ کے زمانے میں پوری طور سے واضح اور روشن نہ ہوا - اور اب یہ جو نیا اور معتبر نادر و نایاب ماخذ یورپ کے مشرق شناس عالموں کی کوشش اور کاوش کی بدولت ہاتھ آیا ہے - اور اب شائع بھی ہو گیا ہے' اس موضوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے' اسی اہمیت کی بنا پر ذیل کا مقالہ (جو اس باب میں آخری تحقیقات پر مبنی اور حاوی ہے) تاریخ سے دلچسپی اور تحقیق و ریسرچ کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ہم پیش کرتے ہیں - یہ مقالہ صرف اسی بنا پر اہم نہیں کہ عمان اور ایران میں باہم جو لڑائیاں ہوئی ہیں' ان کا ایک صحیح اور اعتبار کے قابل ماخذ ہے اور جو خوش نصیبی سے ہمیں دستیاب ہو گیا ہے بلکہ بعض نہایت اہم اور جاذب توجہ نکتے اس میں نظر آتے ہیں - جو ہمارے لئے بہت زیادہ اور غیر معمولی طور پر بیش قیمت ہیں -

نادرشاہ کا واقعہ نگار میرزا مہدی خاں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے زمانے میں "عمان پر ایرانی لشکرکشی" کا حال اجمال اور اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس بارے میں وہ ہمارے ہاتھوں تک بہت کم معلومات پہنچاتا ہے - اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں - ایک یہ کہ نادرشاہ کی لڑائیوں کا اصلی مرکز اور میدان عمان نہ تھا - دوسرے یہ کہ خود نادرشاہ ان معرکوں میں شریک اور میدانِ جنگ میں حاضر نہ تھا - کیونکہ اس جنگ کے دوران میں اس کا سپہ سالار' فارس کا بیگلربیگی محمد تقی خاں شیرازی تھا - عمان کے معرکوں اور واقعات کا بڑا حصّہ اسی سے تعلق رکھتا ہے پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تنہا فانی ہی وہ مؤرخ ہے جو اپنے فارس نامے میں "عمان پر ایرانی لشکرکشی" کا ذکر کرتا ہے - مگر بہت تھوڑا ذکر کر کے ختم کر دیتا ہے -

دوسری طرف عربی اور یورپ کے ماخذ ہیں' جو اس بارے میں بہت زیادہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں - یورپ کے ان تاریخ نویسوں میں جو نادرشاہ کے زمانے میں تھے' اور جو اس جنگ کی رفتار قریب سے دیکھ رہے تھے - اس کمپنی کا وہ نمایندہ یا سفیر بھی ہے' جو اس وقت خلیج فارس میں رہا کرتا تھا - اس نامہ نگار نے جہاں تک اور جو کچھ اطلاعیں بہم پہنچائیں اور وہ لکھی ہوئی باقی رہ گئی ہیں - ہنوز کسی نے اُن سے فائدہ نہیں اٹھایا - نادرشاہ کے تاریخ نگار اور وہ اہل قلم جنہوں نے "عمان پر نادرشاہ کی فوج کشی" پر کچھ لکھا ہے' ان میں سے کوئی ایک بھی نہ اس ماخذ سے کچھ لیتا ہے اور نہ اس کا حوالہ دیتا ہے - "ج اوتر" جو اس زمانے میں بصرے میں مقیم تھا - اپنی کتاب "ایران و ترکی میں سیاحت" کے اندر مذکورہ واقعہ کی جانب اشارہ کرتا ہے' مگر جو واقعات پیش کرتا ہے - نہ تو وہ کامل ہیں' اور نہ بھروسے کے قابل - البتہ جو معلومات "کارستن نیبور" اپنی کتاب "عمان کی تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق" میں جو کچھ پیش کرتا ہے' وہ معتبر اور زیادہ گہری ہیں' مگر یہ مصنف نادرشاہ کا ہم عصر نہ تھا -

ایک کتاب (سنہ ۱۰۵۶ء تا سنہ ۱۲۳۷ء میں مشرقی افریقہ کی تاریخ و جغرافیہ اور تجارت سے متعلق اسناد اور معلومات) نامی نظر سے گزری ہے یہ شارل گیہان کی لکھی ہوئی ہے - اس کتاب کی ایک فصل ہے "(مشرقی افریقہ کے ساتھ عمان کے روابط)" اس میں اس موضوع سے متعلق بہت سی مفید معلومات درج ہیں - اور یہ سب معلومات عربی کی ایک قلمی کتاب سے لی گئی ہیں - جو ایک شیخ کی تصنیف ہے - اس شیخ کا نام ابوسلیمان بن محمد بن ابہر بن رشید ہے - یہ نادر کتاب (حکومت بمبئی کے منتخبات) کے

چوبیسویں نمبر میں شائع ہوئی ہے ۔ اس نمبر میں کئی مقالے ہیں، ان میں ایک مقالے کا عنوان ہے ۔

(۱) "حکومت عمان کے مختصر تاریخی حالات سے متعلق مختصر یادداشتوں کے اقتباس" مقالہ نگار کا نام رابرٹ مائلز ہے ۔ دوسرے مقالے کا عنوان ہے

(۲) "حکومت عمان سے متعلق مختصر یادداشتیں"

اس کا لکھنے والا فرانسس واڈن ہے ۔ مگر ان دونوں میں سے ایک شخص بھی (عمان پر نادر شاہ کی لشکر کشی) کے بارے میں کچھ نہیں لکھتا تاہم مائلز کی جغرافیائی اطلاعات میں بعض مفید معلومات ملتی ہیں ۔

(۳)۔ اس موضوع پر انگریزی زبان میں سب سے اہم اور بڑی کتاب جو موجود ہے ۔ اس کتاب کا نام ہے "عمان کے اماموں اور سادات کی تاریخ" یہ پوری کی پوری کتاب" عربی کی ایک کتاب کا انگریزی ترجمہ ہے ۔ جو "ج ، پ باجلر" نے کیا تھا اور سنہ ۱۸۷۱ء میں جمعیت ہاکلوٹ نے چھپوا کر شائع کیا ہے ۔ اس عربی کتاب کا مصنف سلیل بن رازق ہے، اس نے نہایت پھیلاؤ اور تفصیل کے ساتھ (عمان پر ایرانی فوجوں کے حملے) کا حال تحریر کیا ہے ۔ لیکن اس کے بیان کئے ہوئے معلومات کو بڑی احتیاط اور سوچ بچار کے بعد لینا چاہیئے ۔ اس لئے کہ یہ شخص عادتاً فضول گو تھا ۔ اس نے ہر موقع اور ہر مقام پر فضول بکواس کا رستہ اختیار کیا ہے ۔ اس وجہ سے یہ شخص جو واقعات اور حالات بیان کرتا ہے، وہ بھروسے اور سچ ماننے کے لائق نہیں ہیں ۔

جن ارباب قلم نے سب سے اخیر میں اس موضوع پر قلم اٹھایا اور کوئی کتاب تالیف کی ہے، ان میں ذیل کے اشخاص ذکر کے قابل ہیں ۔

(۴)۔ ا ۔ میجر (یا لفٹنٹ کرنل) آف راس ۔ اس نے سنہ ۱۸۸۲ء تا سنہ ۱۸۸۳ء کی اپنی رپورٹ کے دوران میں (خلیج فارس میں اسکاؤ کی تشکیل اور مسقط کی سیاسی حیثیت سنہ ۱۸۲۸ء سے لے کر سنہ ۱۸۸۲ء تک کا تاریخچہ) تحریر کیا ہے اس میں عمان کے حالات بھی بیان کرتا ہے، لیکن اس کا ماخذ بھی وہی سلیل بن عبدالرزاق کی کتاب ہے، جس کا اوپر ذکر گزر چکا ہے ۔

(۵)۔ کرنل س، ب، مائلز ۔ اس کی کتاب کا نام ہے (ممالک و طوائف خلیج فارس) یہ سنہ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی ہے ۔ اس مصنف نے بھی عمان پر ایران کی لشکر کشی کے بارے میں وہی باتیں لکھی ہیں ۔ جو راڈجر نے سلیل بن عبدالرزاق سے لی ہیں ۔ گویا راڈجر کا بیان ہی پورا پورا دہرا دیا ہے ۔

(۶) ۔ کلمان ہوور نے بھی اپنی کتاب میں جس کا نام ہے "تاریخچۂ اعراب" عمان پر ایرانی لشکر کشی کے بارے میں مختصر معلومات پیش کی ہیں، مگر یہ بھی تمام تر سلیل بن رازق کے بیانات کی نقل ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں ۔

(۷) ۔ گراہمان نے مسقط کے عنوان سے اسلامی دائرۃ المعارف (اسلامک انسائیکلوپیڈیا) کی تیسری جلد میں ایک مقالہ دیا ہے اس مقالے میں بھی اس واقعے سے متعلق مختصر اشارے دئے ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام تحریروں میں تنہا سلیل بن رازق پر اعتماد اور اسی پر استفادہ کیا ہے، اس وجہ سے اس مقالے پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے ۔

۸ ۔ ریسیڈروٹ ۔ اس کی تحقیقات کا بڑا حصہ ابوسعید سے تعلق رکھتا ہے، مگر اس سے پہلے زمانے کے واقعات کی نسبت بھی اہم اطلاعیں پیش کرتا ہے ۔ وہ احمد بن سعید کی پیشقدمی اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے اس نے جو کوششیں کیں ۔ ان کی کامیابی کے اسباب پورے پھیلاؤ کے ساتھ بیان کرتا ہے ۔ اس مصنف نے جن جن کتابی ماخذوں اور سرچشموں تک رسائی پائی ہے، ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے ۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی تحریروں کا نہ وہ کہیں حوالہ دیتا اور نہ کوئی ذکر کرتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے متعلق کچھ علم اور اطلاع ہی نہیں رکھتا ہے ۔

راقم یہ چاہتا ہے کہ اس مقالے کی تحریر میں "شرکت ہندوستان شرقی" کے نمایندوں کی تحریروں اور سلیل بن رازق، اڈورہ نیبور گیبان سب کے بیانوں کو سامنے رکھ کر اور ان سب کو ناپ تول کر جانچ پڑتال کر کے نادر شاہ کی عمان پر بحری فوج کشی کی نپی تلی حقیقت کا پتہ چلائے اور ان کو پیش کرے ۔

شاہ سلطان حسین کے زمانے میں جو بذات خود بہت شریف اور اچھا مگر اپنے سیاسی حالات کے لحاظ سے کمزور تھا، خلیج فارس میں حکومت ایران کی سیادت (سرداری) اور سیاسی اقتدار پر ایک کاری ضرب پڑی یہ وہ قبائلی عرب جو اس خلیج کے دونوں ساحلی حصوں میں رہتے تھے ۔ ان سے یہ سلطہ بھی مل گیا، اور ان کی اہمیت کچھ اور بڑھ گئی ۔

مسقط کے عرب امام سلطان بن سیف کے زیر احکام تھے یہ امام سنہ ۱۷۱۱ء سے سنہ ۱۷۱۸ء تک حکومت کرتا رہا ۔ یہ عرب زبردست اور

قابلِ توجہ جنگی جہازوں کے مالک تھے ۔ اور ان جہازوں کے ذریعے ۱۷۱۷ء میں ان عربوں نے بحرین کو اپنے فوجی حملوں اور تجارتی ونڈ دیموپ کا مرکز بنایا ۔ جزائرِ بحرین تقریباً سو سال کی طویل مدت تک ایران کی شاہنشاہی کا ایک حصہ اور اس کی ایک نوآبادی تھے ۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ عمان کے عرب زیادہ مدت تک بحرین میں نہ رہے ۔ ان کی واپسی کے بعد بحرین کا علاقہ شیخ جبارہ کے ہاتھ آگیا ۔ یہ شیخ عربوں کے قبیلہ ہوالا کا ایک مقتدر رئیس اور برائے نام حکومت ایران کا تابع تھا ۔ مگر حقیقت میں مستقل تھا ۔ اسے حکومتِ اصفہان کے ساتھ ذرا بھی لگاؤ نہ تھا ۔

جیسے ہی بادشاہ نے حکومت ایران کی باگ اپنے ہاتھ میں لی ۔ اس نے بھانپ لیا خلیج فارس کے حالات وہاں کے باشندوں کے اطوار اور امورِ سلطنت کے ذمہ دار برداشت اور درگذر کے قابل نہیں ۔ اس نے ساحل پر رہنے والے عربوں کو اپنا تابعِ فرمان بنانے کے لئے بہت زیادہ مؤثر تدبیریں اختیار کیں ضروری کارروائیاں عمل میں لایا ۔ مگر بہت جلد اس نے اندازہ کرلیا کہ جب تک بحری طاقت کا مالک نہ ہوگا اپنی پیش نظر تجویزوں کو چلانے اور آگے بڑھانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا ۔ اسی لئے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہالینڈ سے چند جہاز خریدنے پر آمادہ ہوگیا ۔

نادر شاہ کا سب سے پہلا حملہ ماہ مئی ۱۷۳۵ء میں بحری جہازات کے ذریعے بصرے پر قبضہ کرنے کے لئے ہوا مگر ناکام رہا ۔ دوسرے سال ایران کا لطیف خاں دریا بیگی (امیرالبحر) بحرین کو ہوالا عربوں کے قبضے سے نکال لینے میں کامیاب ہوگیا ۔ یہ حملہ اس موقع کے لگ بھگ ہوا جبکہ شیخ جبارہ مکہ معظمہ کی زیارت کے لئے گیا ہوا تھا ۔

نادر ہوالا عربوں پر غالب آنے کے بعد لطیف خاں دریا بیگی کے متواتر تجاویز کے نتیجے میں اور مزید فتوحات کی امید میں رہا ۔ یعنی اس نے عمان کو بھی تسخیر کرلینا چاہا' یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ نادر شاہ پورے طور پر سمجھ چکا تھا کہ جب تک مسقط اور عربستان کے تمام بندر اس کے ہاتھ میں نہ آجائیں وہ یہ امید نہیں رکھ سکتا تھا کہ خلیج فارس میں ایرانی سیاست کو مستقل اقتدار اور استقرار حاصل ہوسکے گا ۔

خوش نصیبی اور حسن اتفاق کہ ۱۷۳۶ء میں اچانک کچھ معاملات نادر کی خواہش کے موافق سرزمینِ عمان پر ظہور میں آئے ۔ سیف بن سلطان کے نامعقول سلوک نے اس کی پیروی کرنے والوں کے درمیان تنفر پیدا کردیا آخرکار ۱۷۳۶ء میں یہ باہمی نفرت ایک انقلاب پر ختم ہوئی ۔ سیف کمرانی لشکر کو جو آمادۂ انقلاب تھا' روکنے کی تیاری میں تھا' وہ اس کا سر کچل دینا چاہتا تھا ۔ مگر اُن کے اقدام کو ذرا بھی نہ روک سکا ۔ سیف اس ہنگامے میں مغلوب اور اقتدار سے محروم ہوگیا ۔ اب اس نے نادر شاہ کی جانب رُخ کیا اور اس سے مدد چاہی ۔

اِدھر نادر شاہ افغانستان کے قبائل کیک نئی پر حملے کی ابتدائی منزلیں طے کرچکا تھا ۔ تمام ضروری جنگ کا سامان تیار تھا' فوجیں روانگی کے لئے آمادہ اور شاہی حکم کے انتظار ہی میں تھیں ۔ اس نے سیف کا یہ پیام پاکر اس نادر موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ بلکہ نہایت عجلت کے ساتھ اس سے پورا فائدہ اُٹھایا ۔ محمد تقی خاں شیرازی' بیگلربیگی کے نام تاکیدی احکام صادر فرمائے کہ خلیج کے تمام جہازوں کو ضروری سامان سے تیار کرکے بظاہر امیر سیف کی امداد کے لئے اور دراصل عمان پر قبضہ کرنے کے لئے جلد روانہ ہو ۔

جنوری ۱۷۳۷ء میں شرکت ہند مشرقی کے نمایندے کو جو کامران میں رہتا تھا' خبر پہنچی کہ نادر شاہ عمان پر لشکر بھیجنا چاہتا ہے ۔ نمایندہ مذکور نے لندن کے مرکزی ادارے کو ان حالات کی اطلاع دے کر یہ بھی لکھا کہ "ممکن ہے نادر شاہ کا مقصد امام سیف کو بے وقوف بنانا اور اس کی سلطنت پر قبضہ کرنا نہ ہو" ۔ مگر کمپنی کے نمایندے نے جس انداز سے اظہار خیال کیا تھا' اس سے یہ اندیشہ ضرور پیدا ہوتا تھا کہ ایسا نہ ہو نادر شاہ کا یہ اقدام کامیابی پر ہو اور صرف امام کے دشمنوں سے اس کا انتقام لینا ہی نہ ہو ۔

دولتِ ایران کے جہاز مارچ ۱۷۳۷ء کی تیسری تاریخ سے لے کر چودھویں تک بوشہر سے کامران پہنچ گئے ۔

ان جہازوں کی کمان لطیف خاں کے ذمے تھی جو اپنا علم بلند کئے ہوئے تھا ۔ علم کی زمین سفید تھی اور اس پر ایرانیوں کی سُرخ رنگ کی تلوار کڑھی ہوئی تھی ۔ دولت ایران کے اس بیڑے میں چار بڑے جہاز تھے ۔ دو چھوٹے جہاز اور دو چھوٹی کشتیاں ۔ کپتان لطیف خاں کے جہاز کا نام فتح شاہ تھا ۔ یہ جہاز اس سے ایک سال پہلے دسمبر کے مہینے میں ایرانی حکومت نے شرکت ہند شرقی

سے خریدا تھا۔ پہلے اس کا نام "کوشن" تھا۔

ایران کے دوسرے بڑے جنگی جہاز کا نام "فورتا میرلا ندینز" تھا۔ یہ انگلستان کا بنا ہوا تھا۔ دولتِ ایران نے یہ جہاز اس جنگ سے پہلے جبراً اپنی قاہرانہ قوت کے بل پر کمپنی سے خرید لیا تھا۔ اس جہاز کے کپتان کا نام کوک تھا۔ یہ اور اس کا ایک اور ہم کار کافی سامانِ جنگ کے ساتھ ان دونوں انگریزی جہازوں پر مامور تھے۔ ان پر حکومتِ ایران کا قبضہ ہو جانے کے بعد کوک اور اس کا ساتھی دونوں دولتِ ایران کے ملازم ہو گئے۔ یہ دونوں اب الگ الگ ایک ایک ایرانی جہاز کے کپتان اور سردار مقرر ہوئے۔ ان جہازوں کے اور سارے ملّاح اور کام کرنے والے قبیلہ ہوالا اور دوسرے ساحلی قبائل کے عرب تھے۔

ایرانی بیڑے نے پانچ ہزار جانباز سپاہی اور پندرہ سو گھوڑے سوار کئے اور ۱۲ر اپریل کو کامران سے لنگر اٹھایا۔ چار روز بعد یہ سپاہ خورفکان میں لنگر انداز ہوا۔ یہ مقام راس موزندم کے جنوب میں چوہتر میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ لطیف خاں نے تھوڑی سی ایرانی فوج خورفکان میں اتار کر شمال کی جانب کوچ کیا۔ راس موزندم سے آگے بڑھ کر خلیج جلفار میں آ اترپڑا۔ یہاں لطیف خاں اور امام سیف بن سلطان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ یہ مشہور ہے کہ دو ہزار روپیہ (تقریباً ۴۲۰۰ لیرہ) امام سیف نے سردار ایرانی کو پیش کئے۔

قبیلہ ہوالا کا رئیس شیخ رما اپنی اطاعت کا اعلان پہلے ہی کر چکا تھا۔ لطیف خاں نے چند آدمی فوجی محافظ کے نام سے جلفار میں مقرر کئے اس کے بعد وہ اپنی سپاہ کو لے کر سیف اور اس کے ماننے والوں کے ساتھ ملک کے اندرونی حصے میں بڑھا۔ وہ اب بو العرب بن مبارالعرب کی جانب جا رہا تھا۔ یہ شخص اگرچہ امام سیف کا رشتہ دار تھا۔ مگر یہی امام کے مخالفوں کا سردار بھی تھا۔ بوالعرب بھی مقام یزداری سے پوری تیاری کے ساتھ شمال کی جانب روانہ ہوا۔ مقام فلج السمینی میں جو مقام بیرامی کے قریب واقع ہے دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ متحدہ فوجوں کو کامل جیت ہوئی اور بو العرب نے شکست کھائی۔ اب متحدہ لشکر اور مقامات الجوف وغیرہ کو اپنے قبضے اور تصرف میں لے آیا۔ لیکن یہ کامیابی اور پیش قدمی زیادہ دیرپا اور استوار نہ ثابت ہوئی۔ کیونکہ امام سیف اور لطیف خاں میں جھگڑا ہو گیا۔ لطیف خاں کا رویہ اور سلوک امام سیف کے ساتھ ایسا تھا جیسے ایک بڑے فاتح کا جو تمام ملک اور مملکت کو جیت کر اپنے قبضے میں لا چکا ہو۔ وہ سیف کا احترام اور لحاظ ذرا بھی ملحوظ نہ رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں اور امام سیف کے اتحاد اور دوستی کی بنیاد پاش پاش ہو گئی۔ اور ماہ جون میں لطیف خاں کو کامران واپس آنا پڑا۔ وہاں والے اس کی فاتحانہ آمد پر بہت مسرور ہوئے اس کے اعزاز میں تمام شہر میں چراغاں کیا گیا اور خوب جشن منائے گئے۔

تقی خاں بیگلر بیگی پہلے ہی کامراں پہنچ چکا تھا۔ اس نے پوری کمان لطیف خاں سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لیکن اس کی بخیلی اور بے جا کفایت شعاری نے کام کرنے والوں میں بہت زیادہ نفرت اور بد دلی پیدا کر دی۔ بحری فوجیں باقاعدہ تنخواہیں نہیں پا رہی تھیں۔ سخت تکلیف اور تنگی میں گرفتار تھیں ایرانی سپاہ نے لطیف خاں دریا بیگی کے حضور میں سخت اعتراض اور بیجا شکایت کی اور اس نے وعدہ کیا کہ بیگلر بیگی کے واپس جاتے ہی وہ تمام خسارے کو پورا اور نقصان کی تلافی کر دے گا۔

اس سال کے موسم گرما اور موسم خزاں میں جنگی کارروائیاں موقوف رہیں۔ کوئی پیش قدمی عمل میں نہ آئی۔ ماہ نومبر میں ایران کے بحریہ نے اپنی کمی اور خرابیوں کو دور کیا اور اپنے کو پوری طور پر طیار کر لیا۔ ظاہری حالات سے ایسا پایا جاتا ہے کہ تقریباً اسی زمانے میں نادر شاہ نے بیگلر بیگی کے نام تاکیدی فرمان صادر کیا کہ عمان میں لشکر کشی کو فوراً طیار کرے۔ اور اس کو سخت تنبیہ کی۔ کہ اپریل ہی میں جنگی کارروائیوں کا سلسلہ کیوں جاری نہ رکھا۔

یہ تھا پہلا حملہ نادر شاہ کا جو اس جزیرہ نما پر ہوا۔

کمیونٹی پراجیکٹ

اِن دنوں ہر طرف کمیونٹی پراجیکٹ کا ذکر سننے میں آرہا ہے آیئے ذرا دیکھیں کہ یہ پراجیکٹ کیا ہے اور ملک کی اقتصادی اور سماجی ترقی میں اسے کہاں تک دخل حاصل ہے۔

سرکار کے پنج سالہ پلان کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں حرکت پیدا ہو۔ پانی اور بجلی کی بہم رسانی کے لئے کثیر المقاصد اسکیمیں عمل میں لائی جائیں دریاؤں کی طغیانیوں پر قابو پا لیا جائے۔ کارخانے اوزار بنائیں، پیداوار کے ذرائع میں اضافہ کریں اور لوگوں کے استعمال کی چیزیں روز افزوں تعداد میں مہیا کریں۔ نقل و حمل کے ذرائع ایسے ہوں کہ وہ چیزوں کو بآسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاسکیں۔ مختلف طبقوں میں تبدیلیٔ خیالات ہو سکے اور کمیونٹی پراجیکٹ زیرِ عمل آسکے۔ یہ عوام کا ایک پراجیکٹ ہے جو عوام ہی کی خاطر عوام نے بنایا ہے آخر یہ کمیونٹی پراجیکٹ کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟

ہندوستان کی تازہ مردم شماری کے مطابق دیہات کی آبادی مجموعی آبادی کا ۸۲٫۷ فیصدی ہے۔ باقی شہری آبادی ہے۔ جمہوریت کی بنیاد اکثریت پر ہوتی ہے۔ ہندوستان ایک جمہوری ریپبلک بننے کا عہد کر چکا ہے اس لئے یہاں تعداد ایک وزن رکھتی ہے۔ اس اصول کے مطابق دیہاتی آبادی اس بات کی مستحق ہے کہ حکومت اس کی طرف خاص توجہ کرے اور اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرے۔

تقریباً گذشتہ دو سو برس سے ہمارے یہاں دیہات سے شہروں کی جانب آدمی اور سامان کی یکطرفہ درآمد رہی ہے۔ ان شہروں میں سے جنہیں غیر ملکی حاکموں نے بسایا اور جن میں عدالتوں، مجسٹریٹوں، وکیلوں، مہاجنوں، پولیس اور اس سے ملتے جلتے متعدد دوسرے کام کاج کے لوگوں کا اثر غالب رہا، دیہات کی طرف عملی طور پر کچھ نہیں کیا۔ ان شہروں نے عوام کی بہتری کے کام میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ اس کے برعکس یہ دیہاتی طبقوں کی بدولت پرورش پاتے رہے۔ کمیونٹی پراجیکٹ کو اگر واقعی سماج کے لئے پراجیکٹ بننا ہے تو اس کا حلقۂ اثر زیادہ تر دیہات میں رہنے والے لوگوں تک محدود رکھنا پڑے گا۔

اس وقت ملک میں بھوک، بیماری اور جہالت کا دور دورہ ہے۔ چونکہ دیہات والوں میں قوتِ خرید کم ہے اس لئے یہ تباہی زیادہ تر انھیں کے حصے میں آرہی ہے۔ اگر کمیونٹی پراجیکٹ کی بنیاد آزادی پر رکھنا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی تو ان بنیادی لعنتوں کو بالکل ختم کرنا ہوگا۔ دیہاتیوں پر بالعموم یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بے وقوف، جھگڑالو اور رجعت پسندی کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ایک بھوکے آدمی کے لئے جس کے پاس کوئی کام نہ ہو، وقت کاٹنا بھی مصیبت ہے محض خود حفاظتی کے لئے وہ اپنے اندر ایک مصنوعی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ اور باہر کی دنیا کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایک دیہاتی کے دل میں سماج کا صحیح احساس پیدا کریں تو یہ ضروری ہے کہ اس کی صحت اچھی ہو، اسے کافی خوراک ملے۔ کافی کپڑے ملیں اور رہنے کو موزوں مکان ملے۔ اس کے علاوہ اسے تفریحی لمحات میسر آنے چاہئیں تاکہ وہ دن بھر کے کام اور سماج کی زندگی کے لئے اپنے آپ کو تازہ دم کر سکے۔ یہ سب کچھ ممکن ہے بشرطیکہ دیہاتی اتنا زیادہ پیدا کر سکے کہ اچھی طرح سے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد اس کے پاس کچھ بچ بھی جائے۔ تاکہ وہ اس سے وہ سہولیات حاصل کر سکے جو اس کی باقی ضروریات کے لئے لازمی ہیں۔

جس کمیونٹی پراجیکٹ کا تصور حکومت ہند نے پیش کیا ہے۔ اس کی تشکیل میں پہلی شرط یہ قرار دی گئی ہے کہ پیداوار میں اضافہ کیا جائے تاکہ دیہاتی زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ یہاں حکومت ہند کے اس مسودے کا ایک حصہ پیش کرنا جو اس نے کمیونٹی پراجیکٹ کے متعلق طیار

کیا ہے بے محل نہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے:۔

"کمیونٹی پراجیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس انتظام میں جو زندہ رہنے کے حق کے تحت پراجیکٹ کے رقبے میں رہنے والے مردوں، بچوں اور عورتوں کے لئے ہے ایک رہنما یادحیثیت اختیار کرے۔ پروگرام کے ابتدائی مرحلوں میں خوراک ایک ایسا جزو ہے جسے اس مقصد کے حصول کے لئے اولین اہمیت دی جائے۔"

وہ سرگرمیاں جو اس مقصد کو حل کریں گی اور جنہیں سب پر ترجیح دی جائے گی یہ ہیں:۔

الف۔ زراعت اور اس سے ملحقہ کام:۔

۱۔ غیر استعمال شدہ اور بنجر زمین کی بازیابی
۲۔ زراعت کے لئے نہروں، ٹیوب ویلوں، کنوؤں، تالابوں دریاؤں، جھیلوں اور چشموں سے پانی بہم پہنچانا۔
۳۔ اچھے بیجوں کی فراہمی
۴۔ ترقی یافتہ زرعی تکنیک کا استعمال
۵۔ مویشیوں کے علاج کی امداد کی موجودگی
۶۔ ترقی یافتہ اوزاروں اور زرعی طریقوں کی فراہمی
۷۔ مال کی کھپت اور قرض کی آسانیوں کی فراہمی
۸۔ مویشی خانوں کے لئے نسلی مرکزوں کی فراہمی
۹۔ ملک میں مچھلی کے کاروبار کی ترقی
۱۰۔ خوراک کی از سر نو تنظیم
۱۱۔ پھلوں اور سبزیوں کی کاشت میں ترقی
۱۲۔ زمینی تحقیق اور کھاد کی فراہمی
۱۳۔ علم الاشجار کی فراہمی (جس میں جنگل لگانے کا کام بھی شامل ہے۔
۱۴۔ نتائج کے تخمینے کی فراہمی

ب۔ رسل و رسائل

۱۔ سڑکوں کی تعمیر
۲۔ سڑکوں پر مشینی رسل و رسائل کی حوصلہ افزائی
۳۔ مویشیوں کی نقل و حمل میں ترقی

ج۔ تعلیم

۱۔ ابتدائی جماعتوں میں جبری اور مفت تعلیم
۲۔ ہائی اور مڈل اسکولوں کا قیام
۳۔ سماجی تعلیم اور لائبریریوں کا قیام

د۔ صحت

۱۔ صفائی اور صحت عامہ کے اقدامات
۲۔ مریضوں کے لئے طبی امداد کی فراہمی
۳۔ حاملہ عورتوں کی، بچوں کی پیدائش سے پہلے اور بعد کی احتیاط
۴۔ نرسوں کی خدمات کی فراہمی

ہ۔ تربیت

۱۔ موجودہ کاریگروں کے معیار میں ترقی کے لئے ریفریشر کورس۔
۲۔ مزارعوں کی تربیت
۳۔ کام پھیلانے کے لئے معاونوں کی تربیت
۴۔ سپروائزروں کی تربیت
۵۔ کاریگروں کی تربیت
۶۔ انتظامیہ اسٹاف کی تربیت
۷۔ صحت کے کارکنوں کی تربیت
۸۔ پروجیکٹوں کے ایگزیکٹو افسروں کی تربیت

و۔ روزگار

۱۔ بڑے اور چھوٹے پیشوں کے طور پر گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں کی حوصلہ افزائی
۲۔ فالتو آدمیوں کو کام پر لگانے کے لئے متوسط یا چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی، تاکہ مقامی ضروریات پوری ہو سکیں یا پروجیکٹ کے علاقے سے باہر سامان بھیجا جا سکے۔
۳۔ طے شدہ تعمیر، تجارت، امدادی اور عوامی بہبود کی سروسز کے ذریعے سے روزگار بہم پہنچانے کے کام کی حوصلہ افزائی

ص ۔ مکانات کی فراہمی

۱۔ دیہات میں مکانات کی فراہمی کے لئے ترقی یافتہ تکنیک اور نقشوں کا استعمال۔

۲۔ شہری علاقوں میں مکانات کی فراہمی

ح ۔ سماجی بہبود

۱۔ مقامی جوہر اور تمدن پر مبنی سماجی تفریح کا انتظام

۲۔ تعلیم و تفریح کے لئے دید و شنید کی مدد کا انتظام

۳۔ مقامی اور کھیلوں کی دوسری سرگرمیوں کی تنظیم

۴۔ میلوں کا انتظام

۵ ۔ کوآپریٹو اور خود امدادی تحریکوں کی تنظیم

منتہائے مقصود

عوامی بہبود کا ملک تضاد ہے اس ملک کا، جہاں استبداد کی حکومت ہو۔ اس ملک میں فقط پالیسیوں کو مرکز سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ جہاں تک انھیں عملی جامہ پہنانے کا تعلق ہے۔ ان میں لامرکزیت اپنی انتہا کو پہنچائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ آخرکار ایک فرد بھی یہ ذمہ داری نبھانے میں پوری طرح شریک ہوتا ہے۔ ایک ایسے ملک میں فرد کو مکمل آزادی ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے۔ ہاں جب ایک فرد کی آزادی دوسرے فرد کی آزادی سے ٹکرائے گی یا اس کا قومی مفادات سے تصادم ہوگا تو حکومت اس وقت مداخلت کرے گی تاکہ یہ طے کر سکے کہ مجموعی انداز سے زندگی کی صورت کیا ہوگی۔ اس کے بعد اس اسے سانچے میں ڈھالنے کا کام لوگوں کے ہی سپرد کر دیا جائے گا۔ جہاں سطح کی طرف سے درمیانی کریڈٹ مہارت یافتہ تکنیک اور رہنمائی میسر نہ آسکیگی وہاں یہ حکومت کی طرف سے بہم پہنچائے گی۔ منظم مجرموں کے ساتھ موزوں سلوک کرنے کا کام بھی حکومت کے ذمے ہوگا۔ عوامی بہبود کا ملک اگر اس بلند سطح پر آسکے تو حکومت کنٹرول کرنے اور ایگزیکٹیو نوعیت کے بہت کم کام اپنے ذمے لے گی۔

اگر پراجیکٹ کو کامیابی حاصل ہو تو پھر عمل ہی کو اہمیت حاصل ہوگی۔ باتیں بے سود ہو کر رہ جائیں گی۔ آتش بیاں سیاست دانوں کو جو محض زبانی بیانوں کے سہارے ہی میدان مار لیا کرتے ہیں کسی اور دنیا کا رخ کرنا پڑے گا۔ اور یا اگر وہ یہاں رہیں گے تو انھیں اپنے آپ کو عمل کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ آج پاور پالٹیکس کے کھیل میں جس عام شخص کو استعمال کیا جا رہا ہے اس کے نقطۂ نگاہ سے یہ کام ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

کمیونٹی پراجیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس کام کی تکمیل کے معاملے میں ایک پیش رو کا کام کرے۔ تاکہ انسان کو خود مختاری حاصل ہو سکے اور سماج کا منظم رجحانِ طبع حکومت کی رگوں میں تازہ لہو دوڑا سکے۔

ہندوستان اور امریکہ کا تکنیکی تعاون

کمیونٹی پراجیکٹ کی اسکیم کو یہ تمام انسپریشن بڑودہ، مدراس، اٹاوہ گورکھپور کی اسکیموں اور نوآبادکاری کی شہری اور دیہاتی قسم کی مشترکہ ترقیوں کی آبادیوں مثلاً نیلوکھڑی اور شہری ترقیوں مثلاً فریدآباد اور دوسرے ان سے ملتے جلتے کئی تجربوں سے حاصل ہوا ہے۔

مندرجہ بالا اسکیموں میں سے کوئی بھی اپنی اپنی جگہ پوری طرح سے مکمل نہیں ہے۔ کمیونٹی پراجیکٹ بھارت اور دوسرے ملکوں میں کئے ہوئے وسیع تجربات کے امتزاج کی ایک کوشش ہے۔

ملک کے موجودہ اقتصادی مرحلے پر کمیونٹی پراجیکٹ اسکیم کی عملی صورت انڈو، یو۔ ایس ٹیکنیکل پراجیکٹ کا پریشن معاہدے کی بدولت ممکن ہوگئی ہے۔ اس معاہدے کے تحت ہندوستان کی تمام ریاستوں میں پچپن پراجیکٹ شروع کر دئے گئے ہیں۔ اس اسکیم میں سولہ ہزار پانچ سو گاؤں جن کی آبادی تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ہے، شامل ہیں۔ اس ضمن میں خصوصاً زرعی میدان میں امریکہ کے تجربات بہت وسیع ہیں۔ امریکی حکومت ہمیں مدد دینے پر آمادہ ہے۔ اس نے ہمارے ذرائع میں جن کی بدولت ہم نے متعدد پراجیکٹ شروع کر دئے ہیں وسعت دینے کے لئے ہمیں مالی، مادی اور تکنیکی امداد کی پیش کش کی ہے۔

ہمیں موجودہ پراجیکٹوں کو تین برس کی مدت میں مکمل کرنا ہے۔ لوگوں کی آمدنی میں جو یقینی طور پر اضافہ ہوگا۔ اس سے ریاستوں کے ذرائع بڑھیں گے جس کے نتیجے کے طور پر پراجیکٹس والے علاقوں میں مزید آسانیاں پیدا کی جائیں گی۔

عوام کے خادم

بھارت کے عوام نے یہ عزم کیا ہے کہ ہم اپنے دلیش کو اپنے اور اپنے بچّوں کے لئے ایک عوامی بہبود کا دلیش بنائیں گے۔ ایسے دیش میں ہم یہی توقع کرتے ہیں کہ یہاں کی حکومت عوام کی حکومت ہوگی۔ اور یہاں عوام کی ایسی ہی حکومت ہے جو عوام نے خود اپنے لئے چنی۔ حکومت کے ملازم موجود ہیں جنہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ عوام کی خدمت کریں۔ انھیں اب خادم ہی بننا ہے۔ وہ اب کسی غیر ملکی حکومت کے افسر نہیں ہیں

جو غیر ملکی حکمرانوں کے کارندوں کے طور پر کام کرتے ہوں اور اپنے گنبدوں میں بیٹھ کر ہدایات جاری کرتے ہوں۔ اب اُنھیں میدان میں آکر اور عوام کے ساتھ مل کر اُن کے کاموں کو مکمل کرنا ہے۔ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام محکموں میں اس طرح کام کریں بالخصوص کیمونٹی پراجیکٹ کے نظام میں جہاں حکومت کے خادم ہوں اور عوام کے سامنے اپنی نیک نیتی اور جذبۂ رفاقت کو امتحان میں ڈالنے کے لئے ایک نیا میدانِ عمل موجود ہے۔

اب گاؤں میں رہنے والے کسی شخص کو پولیس کے سپاہی یا مجسٹریٹ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اب اسے سرکاری فارموں سے بھی جو نمائشی مرکزوں کا کام دینے کے لئے بنائے گئے ہیں وحشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ پولیس، مجسٹریٹ اور نظام کے سپرنٹنڈنٹ کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ سپروائزروں اور درمیانی سٹاف کی مدد حاصل کر کے دیہات میں جائیں اور لوگوں کے خادموں کی طرح سے کام کریں۔ اب یہ گاؤں کے لوگوں ہی کا کام ہے کہ وہ ان سرکاری ایجنسیوں کو جو انھیں کے خرچ پر انھیں کی خدمت کے لئے قائم کی گئی ہیں۔ صحیح طور پر استعمال کریں۔

عوام سے سرکار کے توقعات

بھارت کے سب سے لمبے چوڑے دیش میں پچپن پراجیکٹوں کی حیثیت جو ساری آبادی کے تیسویں حصے پر اثر انداز ہو رہے ہیں بہت ہی کم ہے۔ اور اس کے باوجود اس اسکیم پر تقریباً چالیس کروڑ روپیہ خرچ آ رہا ہے۔ بنیادی سہولیات کے معیار کا سادگی کے باوجود تقاضا یہ ہے کہ اس کے لئے اسی کروڑ روپیہ اور خرچ کیا جائے اُمید نہیں کہ یہ روپیہ بھی کافی ثابت ہو۔ اگر اس اسکیم کو پھیلانے کے لئے اس میں تیس گنا اضافہ کیا جائے تو خرچ بھی تیس گنا بڑھ جائے گا۔ آخر یہ روپیہ کہاں سے آئے گا۔

نا سک سیکورٹی پریس سے تو چھپے ہوئے نوٹ آنے سے رہے۔ نہ ہی ہم امریکہ یا دنیا کے دوسرے ملکوں سے خواہ وہ کتنے ہی امیر اور فیاض کیوں نہ ہوں یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ مسلسل ہماری مدد کرتے چلے جائیں گے۔ اگر عوام کو اپنے ملک کی از سرِ نو تعمیر کرنا ہے اور اسکیم کا مطلب یہ ہے کہ سارے دیش میں پیداوار بڑھے اور یہ اسکیم محض ایک نمائشی چیز ہو کے نہ رہ جائے تو لوگوں کو اپنے پیروں پر خود کھڑا کرنا ہوگا۔

بھارت کی زمین آج جو کچھ پیدا کرتی ہے وہ دوسرے ملکوں کی زمین کی پیداوار کا ایک تہائی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری زمین کم زرخیز ہے یا ہمارے عوام کم محنتی یا کم ذہین ہیں۔ اگر ہمیں بھارت کی از سرِ نو تعمیر کے لئے روپیہ فراہم کرنا ہے تو ہمیں اپنی زمین سے زیادہ اُگانا چاہیئے۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ پراجیکٹ کے رقبوں میں کام کرنے والے کسان ان زرعی ذرائع کا پورا پورا فائدہ اُٹھائیں جن کی تشکیل کمیونٹی پراجیکٹ میں کی گئی ہے۔

عوام اس حالت میں زیادہ محنت کر سکتے ہیں جبکہ اُن کی صحت اچھی ہو۔ اچھی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان تمام مدافعتی اقدامات کو زیرِ عمل لائیں جو پراجیکٹ کے علاقے میں صحت کی ایجنسیوں نے مقرر کئے ہیں۔

پیداوار کو صحیح طور پر بڑھانے والی چیز تو مسرت ہے۔ روح کی یہ بالیدگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عوام تعلیم بالغاں اور تفریح کے متعلق ان تمام اقدامات کو زیرِ عمل لائیں جن کی پراجیکٹ کے علاقوں میں منافع بخش پیمانے پر تشکیل کی گئی ہے۔ اور اس طرح سے اپنے معیار کو اونچا کریں۔

بھارت کا ایک مزارع سال میں تقریباً چھ مہینے بالکل فارغ رہتا ہے۔ جن کے پاس زمین نہیں ہے وہ سال میں تقریباً آٹھ مہینے بیکار رہتے ہیں۔ اگر اس فرصت کے وقت کا چوتھا حصہ بھی سڑکیں اور اسکول بنانے۔ گاؤں کی نالیوں کی حالت سدھارنے، پارک، کھیل کے میدان اور چراگاہیں بنانے۔ کھاد کے لئے گڑھے کھودنے اور زندگی کی دوسری ہزاروں ضروریات کی طرف توجہ کرنے میں صرف کیا جائے تو پراجیکٹ کے رقبے کے لئے سرکار کے محدود مالی ذرائع خود بخود کئی گنا بڑھ جائیں گے۔

یہاں اس پُرانی کو نہ دُہرایا جائے۔ مشہور کہانی یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک بادشاہ نے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ گاؤں کے تالاب کو دودھ سے بھر دیں۔ ہر شخص کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ صبح کے وقت دودھ کا ایک گلاس تالاب میں ڈال جائے۔ جب تالاب بھر گیا تو یہ دیکھا گیا۔ کہ وہ تالاب سارا پانی سے بھرا ہوا ہے کیونکہ ہر شخص اس اُمید میں صرف پانی ہی کا ایک گلاس لے آیا تھا کہ باقی لوگ تو دودھ لائیں گے ہی۔

اب اس قسم کے پُرانے بادشاہ نہیں رہے۔ آج عوام اپنے بادشاہ آپ ہیں۔ وہ اپنا ذخیرہ بھی خود ہی ہیں۔ اب تو عوام کو خود ہی دودھ پیدا کرنا ہے اور اپنے تالاب کو اس سے بھرنا ہے۔ سرکار تو محض وہ طریق کار عوام کے سپرد کر سکتی ہے۔ جس سے دودھ پیدا کیا جا سکتا ہے اور تالاب کھودا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کی توقع نہیں کرنا چاہیئے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ توقع کی بھی

نہیں جا سکتی۔ اگرچہ ہمارے ذرائع حقیقتاً بے پایاں ہیں۔ لیکن ابھی تک انھیں ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ لوگوں کو اپنی مدد خود کرنا ہوگی۔ سرکار تو صرف یہ کر سکتی ہے کہ وہ ایک کام کو شروع کر دے۔

گاؤں — قطعی مالک

بھارت کے لئے کمیونٹی پراجیکٹوں کا پروگرام ایک اقتصادی حیثیت بھی رکھتا ہے اور نئی جمہوریت کا اظہار بھی ہے۔

بھارت آج کل ہر سال اپنی ضروریات کے مطابق اناج خریدنے کے لئے غیر ملکی تبادلے میں تین سو کروڑ روپیہ دیتا ہے۔ اب جو پچپن کمیونٹی پراجیکٹ جاری کئے گئے ہیں اُن کے سات گنا اخراجات سے یہ روپیہ زیادہ ہے۔ گندم یا چاول کا ہر فالتو من جو کمیونٹی ڈیولپمینٹ کے ذریعے سے پیدا ہوگا۔ اس بھاری دباؤ کو کم کرے گا۔ جو اس وقت دیش کے مالی ذرائع پر ہے۔

اس تین سو کروڑ روپے کی جو اناج خریدنے میں صرف ہوتا ہے، کلی یا اس کے کچھ حصے کی بچت کا مطلب یہ ہے کہ یہ روپیہ اس صنعت کی ترقی پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ جس کی آج دیش کو ضرورت ہے اور جو عوام کے استعمال کی زیادہ چیزیں پیدا کر سکتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ پنج سالہ پلان میں زیادہ اناج اُگاؤ کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اناج بنیادی چیز ہے۔ بھارت جتنے ایک بڑے ملک میں اقتصادی استحکام کی بنیادیں مضبوط زرعی پیداوار پر ہونا چاہئیں۔ اتفاقیہ طور پر یہ بات تمام ملکوں میں صحیح ہے جن میں امریکہ بھی شامل ہے اور جس کی بلند پایہ ترقی یافتہ زراعت اس بات کی ضامن ہے کہ وہ اناج اور خام مال بھی پیدا کرے اور صنعتی اشیاء کے لئے منڈی بھی۔

کمیونٹی پراجیکٹ کا پروگرام محض اقتصادی ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ اس کی حدود بہت دُور دُور تک جاتی ہیں اور لاکھوں لوگوں کو سماجی مواقع بہم پہنچانا اس پروگرام میں شامل ہے۔

جوں جوں اسکیم ترقی کرتی جائے گی، دیہات کے لوگ یہ سمجھتے جائیں گے کہ جمہوری حکومت سے دوستانہ تعاون مراد ہے نہ کہ کسی قسم کا جبر، جیسا کہ ماضی میں ہوتا تھا۔ وہ دیکھیں گے کہ ڈاکٹر، مویشیوں کا معالج، سینیٹری انسپکٹر، زرعی سپرنٹنڈنٹ اور پولیس کا سپاہی محض ان کی مدد کرنے کے لئے ہیں۔ دیہاتی کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کے مشوروں کو وزن دیا جاتا ہے۔ اور انجام کار اپنے مستقبل کو بنانے والا وہ خود ہی ہے۔

تو گویا قطعی تجزیہ یہ ہے کہ دیہاتی خود ہی سماجی ترقی کا ضامن ہے۔ اسے ایک بار اپنے مواقع کا علم ہونا چاہیئے۔ وہ اپنی زندگی کا قطعی ڈھانچہ خود بنائے گا۔ وہ اپنے مفاد کے لیے اپنا فالتو وقت، فالتو کمائی اور تمام دلچسپیاں وقف کر دے گا۔ یہ بات دنیا کے کئی ملکوں میں صحیح ثابت ہو چکی ہے اور ہندوستان کے ابتدائی پراجیکٹوں میں بھی اس کی صداقت کا ثبوت مل چکا ہے۔

وسیع تر اُفق

- مضبوط رگ پٹھے اس کی تکمیل کر سکتے ہیں۔
- اس کی تکمیل کے لئے مضبوط رگ پٹھوں کی تربیت کی جا سکتی ہے۔
- ایسے حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں جن سے اس کی تکمیل ہو سکے۔

یہ ہیں عقیدے کے تین اصول، جنہوں نے وہ عظیم کام کرنے پر اُبھارا جسے کمیونٹی پراجیکٹ کہتے ہیں۔ مختلف پہلوؤں اور رنگوں کے نظریات آسمان میں شگاف ڈال سکتے ہیں لیکن بھوک بیماری اور جہالت کا علاج منتروں، نالہ و فریاد اور الزامات تراشنے سے نہیں ہو سکتا۔ دنیا بہت اونچ نیچ اور خون خرابہ دیکھ چکی ہے۔ اور انسان آج پہلے کی نسبت کہیں زیادہ خوف زدہ ہو چکا ہے اس بنیادی خوف کو رفع کرنا ہی ہے۔ یہ خوف رفع ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آج جب کہ سائنس تک ہمیں دسترس حاصل ہے تو ہم جو چاہیں، حاصل کر سکتے ہیں۔

بھارت کے جن ذرائع کو ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے۔ وہ بے حد و بے شمار ہیں۔ یہ ذرائع زندگی کی حرکت میں آنے کے لئے بے تاب ہیں۔ لیکن الٰہ دین کا چراغ اس عقل و خرد کی دنیا میں جادو کے کارنامے نہیں دکھا سکتا صرف محنتِ شاقہ ہی یہ کارنامے دکھا سکتی ہے۔ اس ملک کے عظیم عوام کی نسلوں کی محنت ہی پر رام راج کی بنیاد قائم تھی۔

اگر ہمیں اپنی عظمت کو واپس لانا ہے تو کئی نسلوں کو سخت محنت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہیئے۔ پردھان منتری نے آج سے چند سال پہلے جب یہ کہا تھا کہ "یہ نسل سخت محنت کے لئے وقف ہو چکی ہے۔" تو ان کا یہی مطلب تھا۔

بھارت مشکلات کے کئی زمانوں میں یہ چراغِ راہ دکھاتا رہا۔ اگر اسے

ایک منظم طریقے سے از سرِ نو تعمیر کرنا ہے تو اسے دوسرے کئی ملکوں کے لئے مثال قائم کرنا ہوگی اور ممکن ہے اسے وہ چابی مل جائے جس سے عالمی حکومت کے دروازے کا تالا کھل سکے۔ عالمی حکومت سے مراد وہ "نئی دنیا" ہے جسے ابھی معرضِ وجود میں آنا ہے۔ اگر گوتم بدھ اور شنکر آچاریہ، نانک اور کبیر اور اشوک اور اکبر کی سرزمین اس کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرے گی تو وہ اپنے ساتھ بے وفائی کرے گی۔

کمیونٹی پراجیکٹ کا ماٹو ہے "انسان تک رسائی"۔ جس حد تک یہ پراجیکٹ اپنے اس منزل کے قریب آئے گی اس حد تک اسے کامیابی حاصل ہوگی۔ اور یہ اس حد تک ناکامیاب ہوگی جس حد تک یہ "آدمی" کو پیچھے چھوڑ دیگی اور اشیاء کو آگے لانے کی کوشش کرے گی۔

آدمی کی تخلیق مسرت اور محبت سے ہوتی ہے۔ وہ اپنے مضبوط رگ پٹھوں کی محنت سے اپنا قد بُت حاصل کرتا ہے اور معرفت کی بدولت اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس معرفت میں جسمانی، ذہنی اور روحانی معرفت شامل ہے۔ ہر شخص کو سڑک کے یہ تمام مراحل طے کرنا پڑتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی مختصر راستہ نہیں ہے۔ اس لمبی سڑک پر کمیونٹی پراجیکٹ کو پہلا قدم تصوّر کیا گیا ہے۔ اس سڑک کو عوام خود بنائیں گے، خود اس پر سفر کریں گے اور خود اُنہی کی کوششوں سے یہ سڑک بڑھتی چلی جائے گی۔

معلومات

۱۔ ۱۹۵۲ء کی پہلی چھ ماہی میں بھارت کی سپلائی کی ۲۵ ہزار سات سو انیس مشینیں طیار ہوئیں۔ گذشتہ سال ان مشینوں کی تعداد ۴۴ ہزار ۴ سو اکہتر تھی اور ۱۹۴۷ء میں سپلائی کی صرف چھ ہزار ایک سو بارہ مشینیں طیار ہوئی تھیں۔

۲۔ بھارت میں ۴۴-۱۹۴۳ء میں دو لاکھ اُناسی ہزار نو سو مویشی مہلک بیماریوں سے ہلاک ہوئے۔ لیکن ۵۲-۱۹۵۱ء میں یہ تعداد گھٹ کر ۹۵ ہزار ۱۸ رہ گئی ہے۔

۳۔ اس سال حصولِ گندم کے سلسلے میں سات لاکھ اٹھتر ہزار تین سو ٹن گندم وصول ہوتی ہے۔ جو مقررہ مقدار سے ایک لاکھ ٹن زیادہ ہے۔

۴۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں ترقی کی اسکیموں پر تین ارب سترہ کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ یہ رقم مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے کل محاصل نو ارب دس کروڑ اٹھتر لاکھ روپے کے ایک تہائی حصّے سے بھی زائد ہے۔

۵۔ بھارت میں تقریباً دو ارب پچھتر کروڑ ایکڑ فٹ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ اس میں سے تقریباً ایک ارب پینتیس کروڑ ایکڑ فٹ دریاؤں اور سمندروں میں بہہ جاتی ہے۔

۶۔ ۵۰-۱۹۴۹ء میں بھارتی ریلوں میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے مسافروں سے ایک کروڑ ۳۷ لاکھ روپیہ وصول کیا گیا تھا لیکن ۱۹۵۰-۵۱ء میں یہ رقم گھٹ کر ایک کروڑ اکہتر لاکھ روپے رہ گئی تھی۔

۷۔ گذشتہ سال بھارت کی ریلوں کے لئے اکیاسی کروڑ انسٹھ لاکھ روپے کا سامان خریدا گیا تھا۔ اس مقدار میں سے تریسٹھ کروڑ بائیس لاکھ روپے کا سامان بھارت ہی کا طیار کردہ تھا۔

۸۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے محاصل کی مجموعی رقم نو ارب دس کروڑ اٹھتر لاکھ روپے تھی۔ اور مجموعی اخراجات آٹھ ارب چوبیس کروڑ چھ لاکھ روپے تھے۔

۹۔ مدراس میں انڈوں کی سالانہ پیداوار چھبیس کروڑ پچاس لاکھ ہے اور ٹراونکور کوچین میں صرف کی سب سے زیادہ اوسط ۱۹ انڈے فی کس ہے لیکن مدھیہ پردیش میں صرف کی سب سے کم اوسط پانچ انڈے سالانہ ہے۔

نئی کتابیں اور رسالے

ہم لوگ

پبلشرز لاجپت رائے اینڈ سنز اُردو بازار دہلی۔
مصنف:۔ ہنس راج رہبر۔ ضخامت ۲۰۶ صفحات
تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ۔ کتابت، طباعت گوارا۔ جلد، جلد پوش عمدہ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ یہ کتاب ہنس راج رہبر کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ "اپنی بات" کے عنوان سے رہبر نے اس کتاب کا ایک مختصر پیش لفظ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے افسانوں کا پس منظر اور خود اپنے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ سماجی بربریت کا رفنا وہ ہر افسانے میں روتے ہیں لیکن اس کے لئے خود اُن کا قول ذمہ دار ہے۔ وہ فرماتے ہیں "تلخی مرے کردار کا اور میری تحریر کا حصہ بن چکی ہے" — رہبر کی زندگی تلخیوں کا ایک گمبھیر تجربہ ہے، انھیں تلخیوں کو اس نے اپنی تخلیقات میں کسی نہ کسی روپ سے اُجاگر کیا ہے۔ رہبر کے مزاج میں صلح پسندی کم ہے اور اپنی بات پر اڑنے کی عادت زیادہ۔ یہ عادت اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ اس میں خلوص ہے، دیانت ہے۔ یہی چیز آپ کو اُن کے بیشتر افسانوں میں ملے گی۔ کہیں کہیں سماج پر اِن کی تنقید توازن کی حدوں سے متجاوز ہو گئی ہے۔ لیکن ایسی باتیں تو ہر مصنف کے ہاں ملیں گی۔ رہبر سماجی اور سیاسی شعور سے بہت اچھی حد تک بہرہ ور ہے۔ اسی وجہ سے اس کے بیان میں خلوص کے سہارے ایک مٹھاس، ایک شیرینی اور اس کے ساتھ ساتھ ہلکی سی چبھن پائی جاتی ہے۔ اس کتاب میں 'ہم لوگ'، 'دو زخم' ہمارے پسندیدہ افسانے ہیں۔ یہ کتاب ہمارے افسانوی ادب میں ایک اچھا اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔

برق و باراں

مصنف۔ احسن احمد اشک۔ قرآن منزل ڈھاکہ۔
ضخامت ۱۰۲ صفحات۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے
کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش، اوسط۔ ضخامت کے لحاظ سے قیمت زیادہ ہے
کتاب کے آغاز میں رضا علی وحشت کا پیش لفظ اور عندلیب شادانی کا تعارف شامل ہے۔ دونوں سخنوروں نے مصنف کو دادِ سخن دی ہے۔ اشک کی نظموں کے اس مجموعے سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ خود اپنے اس شعر پر عمل پیرا ہیں

کوشش یہ ہے کہ ایک نیا راستہ بنے
چلتے ہیں ہٹ کے رہگذرِ کارواں سے ہم

لیکن نیا راستہ بنانا کوئی آسان کام نہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کہیں کہیں بھٹک بھی گئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

مگر افسوس فطرت نے مجھے شاعر بنا ڈالا
نہیں تو اشک اپنی آرزوؤں کا خدا ہوتا

گویا شاعر اپنی آرزوؤں کا خدا نہیں ہوتا۔ اگر یہ سعادت شاعر کو بھی حاصل نہیں تو پھر کس کو حاصل ہے۔ کلامِ اشک میں خوش کلامی کے نمونے اکثر و بیشتر ملنے کے باوجود فنی اغلاط اور خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ صفحہ ۲۷ پر نظم کے پہلے بند میں بستا، پھرتا اور رہتا اور صفحہ ۹۸ پر راہیں اور بلائیں ایطائے جلی کی جلی مثالیں ہیں۔ کچھ پسندیدہ شعر بھی ملاحظہ فرمایئے۔

نگاہِ ناز جھکی اور رہ گئی جھک کر
سوالِ شوق کا کوئی جواب ہو نہ سکا

مثلِ غبارِ راہ چل وقت کے قافلے کے ساتھ
تیرے لئے رُکے گی کیوں گردشِ چرخِ چنبری

مجھے نیند آ گئی تھی راہ کی ٹھنڈی ہواؤں میں
میں اک واماندہ ہوں پوچھو حدیثِ کارواں مجھ سے
مرے دل کی تمنا طرۂ دستارِ گلچیں ہو
اور اس پر یہ قیامت داد مانگے باغباں مجھ سے

آپ کا بچّہ۔ اُس کی صحت اور پرورش

مصنف۔ ڈاکٹر پی راج مونگا۔ ناشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی۔ قیمت تین روپے تقطیع ۲۰×۳۰ صفحات ۲۲۸۔ کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش اوسط۔

اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ ہندوستان میں لاکھوں بچے چھوٹی عمر میں موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ فاضل مصنف نے بڑی محنت سے بچے کی پرورش اور صحت کے باب میں مفید معلومات اور ہدایات ایک جگہ جمع کر کے رکھ دی ہیں۔ چنانچہ بچے کی ولادت اور ولادت سے پہلے جو احتیاط ضروری ہے اُسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بچے کے کپڑے، غسل، دانت نکلنا، عادات، بیماری میں دیکھ بھال، خاص غذاؤں کے طیّار کرنے کے طریقے وغیرہ مختلف عنوانات پر سیر حاصل تفاصیل مہیا کی گئی ہیں۔ طرزِ بیان نہایت سلیس اور سادہ ہے جس سے کتاب کی عوامی افادیت بڑھ گئی ہے۔

رسالے

نقوش۔ افسانہ نمبر

ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ کتابت، طباعت دیدہ زیب ہے۔ یہ حسین و جمیل نمبر ادارۂ نقوش کی خوش ذوقی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کا یہ شمارہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ترتیب پر نظر دوڑائیے۔ افسانوی ادب سے متعلق آپ کو سب کچھ ملے گا۔ طویل مختصر افسانے، مختصر افسانے، رپورتاژ، تراجم اور مقالات۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر اچھا لکھنے والے نقوش کی محفل میں موجود ہیں۔ نئے لکھنے والے بھی ہیں اور پرانے بھی۔ تین طویل مختصر افسانے احمد ندیم قاسمی، علی عبّاس حسینی، تسنیم سلیم چھتاری۔ تینوں نام معیار کی ضمانت ہیں۔ ان کے علاوہ افسانوں اور مقالات وغیرہ کی تعداد ۳۷ ہے۔ منٹو، حیات اللہ انصاری، عزیز احمد، ممتاز مفتی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، خواجہ احمد عبّاس، شفیق الرحمٰن، ممتاز شیریں، انتظار حسین، ل۔ احمد، گویا تقریباً ہر اچھا افسانہ نگار موجود ہے۔ وقار عظیم اور محمد حسن عسکری کے مقالے بھی شاملِ اشاعت ہیں۔

اُردو ادب کے تخلیقی حصّے میں افسانے کی عمر تو بہت چھوٹی ہے مگر مقبولیت کے لحاظ سے یہ دوسری اصناف سے دو قدم آگے ہی ہے پیچھے نہیں۔ آج کل ہمارا افسانہ، سماجی اور سیاسی شعور کی منزلوں میں ہے۔ ہمارے فن کار اب وقیانوسی باتوں کا رونا کم روتے ہیں۔ زندگی کے حقائق زیادہ بیان کرتے ہیں۔ ایسے ادب سے ہی زندگی سنورتی ہے۔ چنانچہ زیرِ تبصرہ شمارے کے اکثر و بیشتر افسانے ایسے افسانے ہیں جو ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک کڑی ثابت ہوں گے اور حیاتِ ابدی پائیں گے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے زندگی کی صداقت اور فن کی لطافت کو شیر و شکر کر دیا ہے اور ہم فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ادب پر جمود کا غلبہ نہیں۔ ہمارے ادیبوں کی تخلیقات اس مقام پر پہنچ گئی ہیں جہاں روایت سجدہ ریز اور جدّت حلقہ بگوش ہے۔ 'کوئی مسافر، کوئی منتظر'، 'بارہ برس بعد'، 'نیلا نشان' اور 'یہ حادثے' اچھے افسانے ہیں۔ محمد علی ردولوی کا اندازِ بیان اور نکھری ہوئی زبان 'دُور کے نشانے ہیں' اپنے پورے ٹھاٹھ پر ہے۔ 'شاہد لطیف کی شادی' اخلاق احمد صاحب نے خطوں سے اچھی خاصی کہانی مرتب کر لی ہے۔ کہانی کی کہانی اور رپورتاژ کا رپورتاژ۔ عصمت کے خطوط اس میں بھی اپنی فطری شوخی اور طرّاری لئے ہوئے ہیں۔ رسالے میں اچھی اچھی تصویریں بھی ہیں لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کی، جن میں سے اکثر پر نگاہ جم کے رہ جاتی ہے۔ محمد طفیل صاحب مدیر نقوش اس خاص نمبر کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ماہ نامہ۔ ناول

ملنے کا پتہ۔ ماہ نامہ ناول۔ ہال اسٹریٹ صدر کراچی ۳۔ اس ماہ نامے کے تین شمارے نمبر ۳، ۴ اور ۵ شائع ہوئے ہیں "سنہری خنجر" مترجم شفاعت محمود فاروقی۔ "خزانہ" ترجمہ از محمود فاروقی اور "آوارہ گرد" ترجمہ مسعود علی۔ ہر مہینے ایک پورے ناول کا شائع کرنا بڑی ہمّت کا کام ہے۔ سالانہ چندہ پندرہ روپے ہے۔ ایک کاپی کی قیمت ڈیڑھ روپے۔ گویا ایک سال میں بارہ ناول پندرہ روپے میں مل سکتے ہیں۔ ماہ ناموں میں یہ جدّت ابھی تک پہلے نہیں دیکھی گئی۔

رفتارِ زمانہ

اقوامِ متحدہ کا آزادی کا چارٹر

متحدہ اقوام کی اسمبلی کے طریقۂ کار سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ مختلف ممالک اسے اپنے ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن شخصی آزادی کے باب میں متحدہ اقوام کی اسمبلی نے جو چارٹر طلب کیا ہے اُس سے کسی قوم کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس چارٹر کی رُو سے دُنیا کے ہر بشر کو چاہے وہ گورا ہے یا کالا بوڑھا ہے یا جوان، عورت ہے یا مرد، ہندو ہے یا مسلمان، آریہ ہے یا منگولین بالکل یکساں شخصی حقوق حاصل ہیں اور امتیازی سلوک کو بالکل ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ یقیناً یہ چارٹر ترقی کی نئی راہیں کھول دیتا ہے اور اس کے عمل میں آجانے سے باہمی جھگڑے اور جنگ کے خطرات خود بخود اپنی موت مر جائیں گے۔ ۱۰ دسمبر کو دُنیا کے طول و عرض میں اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی ساتویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ بھارت چارٹر کے اصول کا پوری طرح پابند رہا ہے۔ اس لئے بھارت بھر میں یہ دن پورے جوش و خروش سے منایا جائے گا اور اس دن آزادی کے چارٹر کو دُہرایا جائے گا۔

پنڈت نہرو کا دورۂ حیدرآباد

حیدرآباد کے ایک بھاری پبلک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری پنڈت جواہرلال نہرو نے کہا کہ جب تک دیش کے کروڑوں باشندے ملک کی مجلسی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں فرداً فرداً اپنا حصہ ادا نہیں کریں گے تب تک ملک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ کمیونٹی پراجیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ اگرچہ اس کی بنیاد حکومت کی طرف سے رکھی گئی ہے لیکن اس کا پہلا مقصد جنتا کی طرف سے جاری کی جانے والی منصوبوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

کشمیر کی ترقی کے لئے پنج سالہ پلان

بھارت کے پلاننگ کمیشن نے کشمیر کی ترقی کے لئے ایک پانچ سال کی اسکیم منظور کی ہے۔ اس اسکیم کے مطابق کل دس کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا جس میں سے سات کروڑ روپیہ بھارت سرکار امداد کے طور پر دے گی۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت بانہال سرنگ بنانے میں بھی مدد دیگی۔ اس سرنگ کے تعمیر ہو جانے سے جموں اور سری نگر میں فاصلہ ۲۰ میل کم ہو جائے گا۔ اسکیم میں آبپاشی، بجلی سڑکوں کی تعمیر، زراعت، تعلیم اور صحت وغیرہ شامل ہیں۔ اسکیم کی تفصیل پر کشمیر سرکار کے نمائندوں نائب وزیرِاعظم بخشی غلام محمد، وزیر مالیات مسٹر گردھاری لال ڈوگرہ اور پلاننگ کمیشن کے ممبران میں بات چیت ہوئی۔ اسکیم کو عمل میں لانے کے لئے ایک باقاعدہ پروگرام مرتب کیا گیا۔ ابتدائی کام بہت جلد شروع کر دیا جائے گا۔

روسی مزدوروں کی طرف سے خوراک کا تحفہ

رُوس کی مزدور یونینوں کی مرکزی جماعت نے بھارتی ریڈ کراس سوسائٹی کی صدر شریمتی راجکماری امرت کور کو مدراس اور دوسرے قحط زدہ علاقوں کے لئے بہت سی چیزیں پیش کیں۔ ان اشیاء میں دس ہزار ٹن گندم، پانچ ہزار ٹن چاول، پانچ لاکھ جمے ہوئے دودھ کے ڈبے اور اڑھائی لاکھ روپے ہیں۔

مزدوروں کے سدھار کی طرف ایک اور قدم

مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لئے بھارت سرکار پوری کوشش کر رہی ہے۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ مزدوروں کو اچھے مکان میسر نہیں تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہند سرکار کے محکمہ تعمیرات نے ایک اسکیم تیار کی ہے جس کے مطابق سال ۵۳-۱۹۵۲ء میں سات کروڑ روپے کی لاگت سے ۲۸۵۰۰ مکان بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہر مکان میں ایک کمرہ، رسوئی، غسل خانہ اور برآمدہ ہوگا۔ اُمید کی جاتی ہے کہ حکومت کی ان کوششوں سے مزدوروں کی حالت سُدھر جائے گی۔

ایران کا مسئلہ

ایران اور برطانیہ کے مابین کشیدگی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ہر دو ممالک کے سفارتی تعلقات بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ اور لندن میں مقیم ایرانی سفارت خانہ کے نمائندے بہت جلد واپس آ جائیں گے۔ امریکہ نے ایک بار پھر دونوں ملکوں سے اپیل کی ہے کہ وہ تیل کے جھگڑے کو حل کرنے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

سُعالین
کھانسی، زکام اور گلے کی خرابی کو دُور کرتی ہے
قیمت فی شیشی بارہ آنے
SUALIN
FOR COUGH AND BRONCHITIS
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

بیٹس ڈنلپ خریدتے وقت

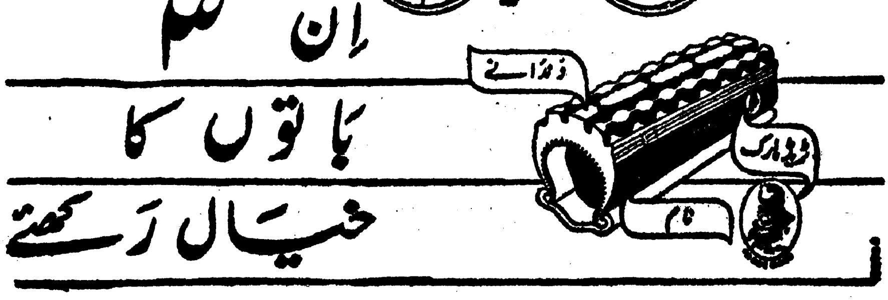
اِن ۳
باتوں کا
خیال رکھیے
ٹریڈ مارک
نام

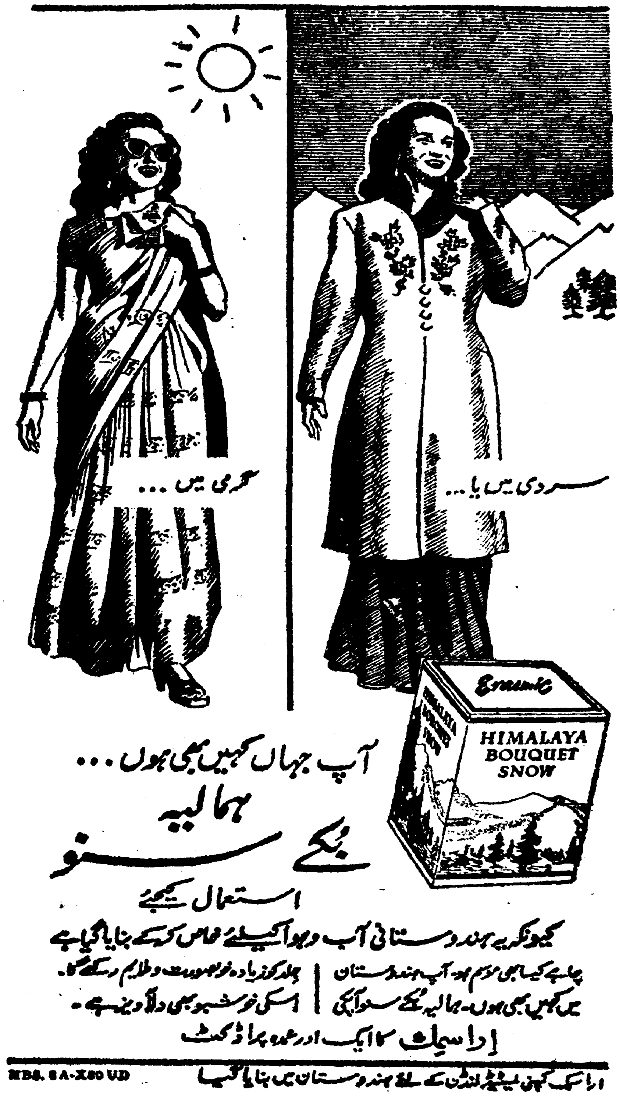

گرمی میں ...
سردی میں یا ...
Erasmic
HIMALAYA BOUQUET SNOW
آپ جہاں کہیں بھی ہوں ...
ہمالیہ
بُکے سنو
استعمال کیجیے
کیونکہ یہ ہندوستانی آب و ہوا کیلئے خاص کرکے بنایا گیا ہے
چاہے کیسا بھی موسم ہو۔ آپ ہندوستان میں کہیں بھی ہوں۔ ہمالیہ بُکے سنو آپکی
جلد کو زیادہ خوبصورت و ملائم رکھے گا۔ اسکی خوشبو بھی دلآویز ہے۔
اراسمک کا ایک اور عمدہ پراڈکٹ
MBS. 8A-X80 UD
اراسمک کمپنی لمیٹیڈ لنڈن کے لئے ہندوستان میں بنایا گیا

Regd. No. E P – 689

بچّوں کا آج کل

فیض لدھیانوی

احمقانہ کھیل کُود

مت کبھی اُونچے درختوں پر چڑھو کھیلنے میں عقل سے بھی کام لو
چوٹ کھا بیٹھو کہیں ایسا نہ ہو شاخ ٹوٹے پاؤں پھسلے گر پڑو
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو

چلتی گاڑی کا بھلا کیا اعتبار دوڑ کر ہوتا ہے جو اس پر سوار
یک بیک گرتا ہے وہ بے اختیار گر کے ہوتا ہے مصیبت کا شکار
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو

تیرنے کا شوق اچّھا ہے مگر گہرا پانی ہے نہایت پُر خطر
اس طرف جائے جو کوئی بے ہُنر زندگی اپنی گنوائے ڈوب کر
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو

جو اُڑاتا ہے منڈیروں پر پتنگ آپ اپنی جان سے کرتا ہے جنگ
بے وقوفی اُس کی لاتی ہے یہ رنگ صحن میں گرتا ہے ہو جاتا ہے لنگ
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو

بے دھڑک ہو کر چلانا سائیکل ہاتھ ہینڈل سے اُٹھانا بے محل
موڑ سے تانگا اگر آئے نکل کھاؤ گے ٹکّر گرو گے سر کے بل
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو

چھیڑنا بجلی کے تاروں کو فضول یاد رکھو سخت مہلک ہے یہ بھول
تم سمجھ سکتے نہیں برقی اصول کانپ اُٹھیگی بدن کی چُول چُول
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو (شاباش)

سعیدہ بانو

سانپ سے شہزادہ

ندی میں زوروں سے باڑھ آجانے کی وجہ سے بہت سے بسے بسائے گھر اُجڑ گئے تھے ۔ اچھے اچھے لوگ بے گھر ہو گئے تھے ۔ اور اسی حالت میں وہ اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے ۔

انہیں لوگوں میں ایک بوڑھا بھی تھا اور اس کی بڑھیا بھی اُس کے کوئی اولاد نہ تھی ۔ جو بوڑھاپے میں اُن کا سہارا بنتا ۔ انہیں اپنے گھر کے بہ جانے کا اتنا غم نہ تھا جتنا کہ اولاد نہ ہونے کا ۔

دونوں نے بہت بار خدا سے اولاد چاہی مگر نیلی چھتری والے نے اُسے اولاد سے محروم ہی رکھا ایک دن بڑھیا نے بوڑھے سے کہا ۔

دیکھو جی اب ہمارا آخری وقت ہے ۔ ہمارے ہاتھ پاؤں سب جواب دینے پر تلے ہوئے ہیں ۔ اور اس آخری وقت میں کون ہمیں سہارا دے گا ۔ اور کون ہماری خدمت کرے گا ۔ اس لئے تم کہیں سے ایک لڑکا تلاش کر کے گود لے لو ۔

دوسرے دن بوڑھا لڑکے کی تلاش میں گھر سے نکلا اور سارا دن اِدھر اُدھر خاک چھانتا رہا ۔ لیکن لڑکا اُسے کہیں بھی نہ ملا ۔

آخر تھک کر وہ ایک بڑے سے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا ۔

ابھی اسے بیٹھے چند ہی لمحے ہوئے تھے کہ ایک چھوٹا سا سانپ کا بچہ رینگتا ہوا بوڑھے کے قریب آیا ۔ بوڑھا پہلے تو اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوا لیکن جب اسے اطمینان ہو گیا کہ یہ کاٹے گا نہیں تب اس نے اٹھا کر اسے اپنی جیب میں رکھ لیا ۔ اور گھر کی راہ لی ۔

بڑھیا خوش تھی ۔ سانپ کا بچہ ہی سہی، گھر میں دو سے تین تو ہوئے ۔ دونوں نے بڑے لاڈ پیار سے اُسے پوسا پالا ۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا بڑھتا گیا اور ایک دن جب وہ جوان ہو گیا تو اس نے بوڑھے سے کہا ۔ ابا میں اب جوان ہو گیا ہوں ۔ میری شادی شہزادی سے کر دیجئے ۔"

بوڑھے کو اس کی نرالی باتیں سُن کر بڑی حیرت ہوئی ۔ اور چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد بولا "بیٹا بھلا تم کو کون اپنی لڑکی دے گا ۔ تم جو سانپ ٹھہرے" ۔

— "ابا آپ فکر نہ کیجئے" ۔ سانپ کہنے لگا ۔ میں راجہ ہی کی لڑکی سے شادی کروں گا ۔ آپ ایک بار جا کر بات چیت تو چلائیے ۔

بوڑھا اور گھبرایا ۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا

گدھے کے کان

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جبکہ جنگلی جانوروں کے نام وغیرہ نہیں تھے۔ سارے جنگل میں شیر حکمرانی کرتا تھا۔ وہی سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ سب جانور شیر بادشاہ سے بہت ڈرتے تھے۔

ایک بار بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ سب جانوروں کا کوئی نہ کوئی نام مقرر کر دینا چاہیئے۔ تاکہ انہیں بلانے وغیرہ میں آسانی ہو جائے۔

بس پھر کیا تھا۔ بادشاہ سلامت نے نام رکھنے کے لئے ایک بڑے جشن کا اعلان کر دیا۔ اور حکم دے دیا کہ جو درندہ چرندہ اس موقعے پر حاضر نہیں ہوگا۔ اُسے سب کے سامنے قتل کر دیا جائے گا۔

وقت مقرّرہ پر سب جانور ایک بڑے جنگل میں اکٹھے ہو گئے۔ سب سے پہلے جہاں پناہ نے اپنا نام "شیر" رکھا۔ اپنے وزیر کو "لومڑی" کے نام سے پکارا۔ اس کے بعد چیتا، ہاتھی۔ ریچھ۔ گیدڑ۔ خرگوش۔ بھیڑیا۔ گھوڑا۔ گدھا۔ بندر اور بیل وغیرہ نام مختلف جانوروں کے لیے تجویز کئے گئے۔ جب سب جانوروں کو اپنے اپنے نام بتا دئے گئے تو بادشاہ سلامت نے کہا۔ "آپ اپنے نام زبانی یاد کرلیں۔ کل اسی وقت سب کو اپنے اپنے نام بتانے پڑیں گے۔ اگر کسی کو اپنا نام بھول گیا تو وہ سزا دوں گا کہ ساری عمر یاد کرو گے"۔

اگلے دن سب نے اپنے اپنے نام سُنانے شروع کر دئے چیتا۔ ہاتھی۔ بندر۔ گورخر۔ کتّا۔ بلّی۔ بیل۔ گائے۔ گھوڑا اور خرگوش وغیرہ سب نے اپنے اپنے نام بتا دئے۔ جب گدھے کی باری آئی۔ تو وہ اپنا نام بھول گیا۔ بادشاہ سلامت کے دریافت کرنے پر بھی وہ خاموش کھڑا رہا۔ بادشاہ سلامت نے غصّے میں آکر گدھے کے کانوں کو کھینچنا شروع کر دیا۔ جب اس کے کان بالشت بھر لمبے ہو گئے۔ تو اُنہوں نے کہا۔" ارے میاں تمہارا نام گدھا ہے۔ تین بار اپنا نام لو"۔

گدھے نے کانوں کو ہاتھ لگا کر تین بار کہا۔ میں گدھا! مَیں گدھا!! میں گدھا!!! اور اُس دن کے بعد گدھے کو اپنا نام زبانی یاد ہے۔ وہ دن اور آج کا دن گدھے کے کان سب جانوروں سے لمبے ہیں۔ اور کم یادداشت والے شخص کو بھی گالی دیتے ہوئے گدھا کہہ دیا جاتا ہے۔

عادت

مالکہ:۔ (نئی خادمہ سے) میں بہت کم بولتی ہوں۔ جب ہاتھ کا اشارہ کروں تو سمجھ لو کہ میں تمہیں بُلا رہی ہوں۔

نئی خادمہ:۔ مجھے بھی کم بولنے کی عادت ہے۔ جب سر ہلا دوں تو سمجھ لیجئے کہ میں نہیں آنا چاہتی۔

رام لبھایا سوز

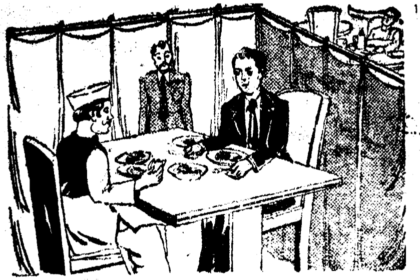

دو مُفت خورے

دو تھے مفت خورے ــــ دونوں بڑے چالاک اور چلتے پرزے تھے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے خرچ پر اپنا پیٹ پالا کرتے تھے ــــ اور تھے بھی اس فن میں بڑے ماہر۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ دونوں کو صبح سے کچھ بھی کھانے کو نہ ملا۔ وہ بُھوک سے نڈھال ہو رہے تھے۔ انتہائی کوشش کے باوجود بھی اس دن کوئی شکار نہ پھنسا۔ دونوں نے غور و خوض کرنا شروع کیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک مُفت خورے نے اُچھل کر کہا۔

"بس اب تو وارے نیارے ہیں"۔

اور پھر دونوں کچھ دیر تک کُھسر پُھسر کرتے رہے ــــ اور بعد ازاں ایک ہوٹل میں گُھس گئے۔

بَیرے کو آرڈر دیا گیا۔ الگ الگ میزوں پر طرح طرح کے کھانے چُنے گئے ــــ اور دونوں نے خُوب شکم سیر ہو کر کھایا۔

ایک مُفت خورہ دوسرے سے پہلے ہی اُٹھ کر چلا گیا۔ اور ہوٹل کے مالک کے پاس جا کر بولا۔ "لالہ جی! باقی پیسے دے دیجئے"۔

ہوٹل کا مالک حیرانی کے عالم میں بولا۔ "باقی پیسے کیسے؟ آپ نے تو ابھی تک کچھ بھی نہیں دیا"۔ مُفت خورے نے چیخ کر کہا۔ "ابھی تو آپ کو دو کا نوٹ دے کر گیا ہوں۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ میں نے کچھ بھی نہیں دیا۔ اگر مجھے پہلے ہی علم ہوتا کہ تم اس قسم کے بے ایمان آدمی ہو۔ تو میں ہرگز ہرگز اس جگہ نہ آتا"۔

ہوٹل کا مالک بولا۔ "بابو صاحب آپ بُھول رہے ہیں ــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ نے ابھی تک کچھ بھی نہیں دیا"۔

مفت خورہ کہہ رہا تھا کہ میں دو روپے کا نوٹ دے کر گیا۔ مگر ہوٹل کا مالک اس چیز سے صاف انکار کر رہا تھا۔ ہوٹل کے اندر جھگڑے کی آوازیں سُن کر بہت سے لوگ ہوٹل میں گھس آئے۔

مفت خورے نے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے صاحب ابھی اِن کو دو کا نوٹ دے کر گیا ہوں ــ مگر اب یہ اس چیز سے صاف مُکر رہے ہیں۔

ہوٹل کا مالک اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرا مفت خورہ بھی کمرے سے باہر نکل آیا اور ہوٹل کے مالک کے پاس جا کر بولا۔ "لالہ جی۔ دیکھنا کہیں اس شور و غل میں میرا پانچ کا نوٹ نہ بُھول جانا"۔

ہوٹل کا مالک بڑا حیران ہوا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس بار بھی کہہ دیا کہ یہ آدمی بھی مجھے نوٹ دے کر نہیں گیا ــــ تو لوگ مجھے ہی جُھوٹا کہیں گے۔ اس لئے وہ بولا۔

"آپ فکر مت کریں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے"۔

چند منٹ بعد دونوں مُفت خورے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر آپس میں روپے تقسیم کر رہے تھے۔

THE

FIFTH YEAR

Publication, 15th August, 1952

The 5th volume in the series of objective surveys of the achievements of the Indian Republic.

Price Rs. 1/8/- Postage extra

Available from leading booksellers or direct from:
THE PUBLICATIONS DIVISION
Ministry of Information and Broadcasting
OLD SECRETARIAT, DELHI-8

- भारतीय संस्कृति और प्रगति का प्रतीक
- हिन्दी का लोकप्रिय मासिक
- राष्ट्रभाषा का सफल माध्यम
- 'आजकल' को प्रथम कोटि के लेखकों का सहयोग प्राप्त है।

वार्षिक ६)
एक प्रति ।।)

PUBLICATIONS DIVISION
OLD SECRETARIAT, DELHI

Homage

THE MOST AUTHENTIC COMPILATION OF UNIVERSAL TRIBUTES OF SORROW, LOVE AND PRAISE TO THE IMMORTAL GREATNESS OF MAHATMA GANDHI EVOKED BY HIS SUPREME MARTYRDOM.

HOMAGE *CONTAINS POTRAITS BY FOREMOST INDIAN PAINTERS AND SOME RARE PHOTOGRAPHS.*

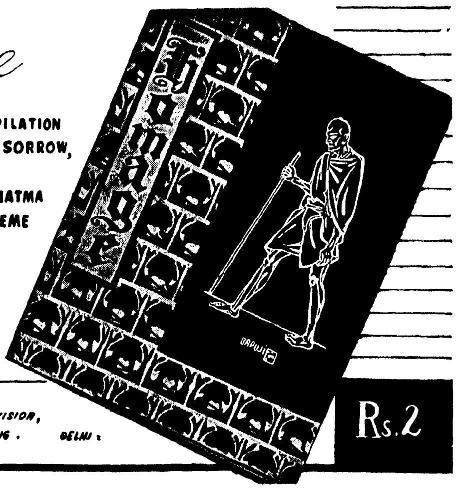

Rs. 2

PUBLISHED BY *THE PUBLICATIONS DIVISION, MINISTRY OF INFORMATION & BROADCASTING.* DELHI.

Printed at the United Press, Delhi and published by the Director, Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting, Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—21

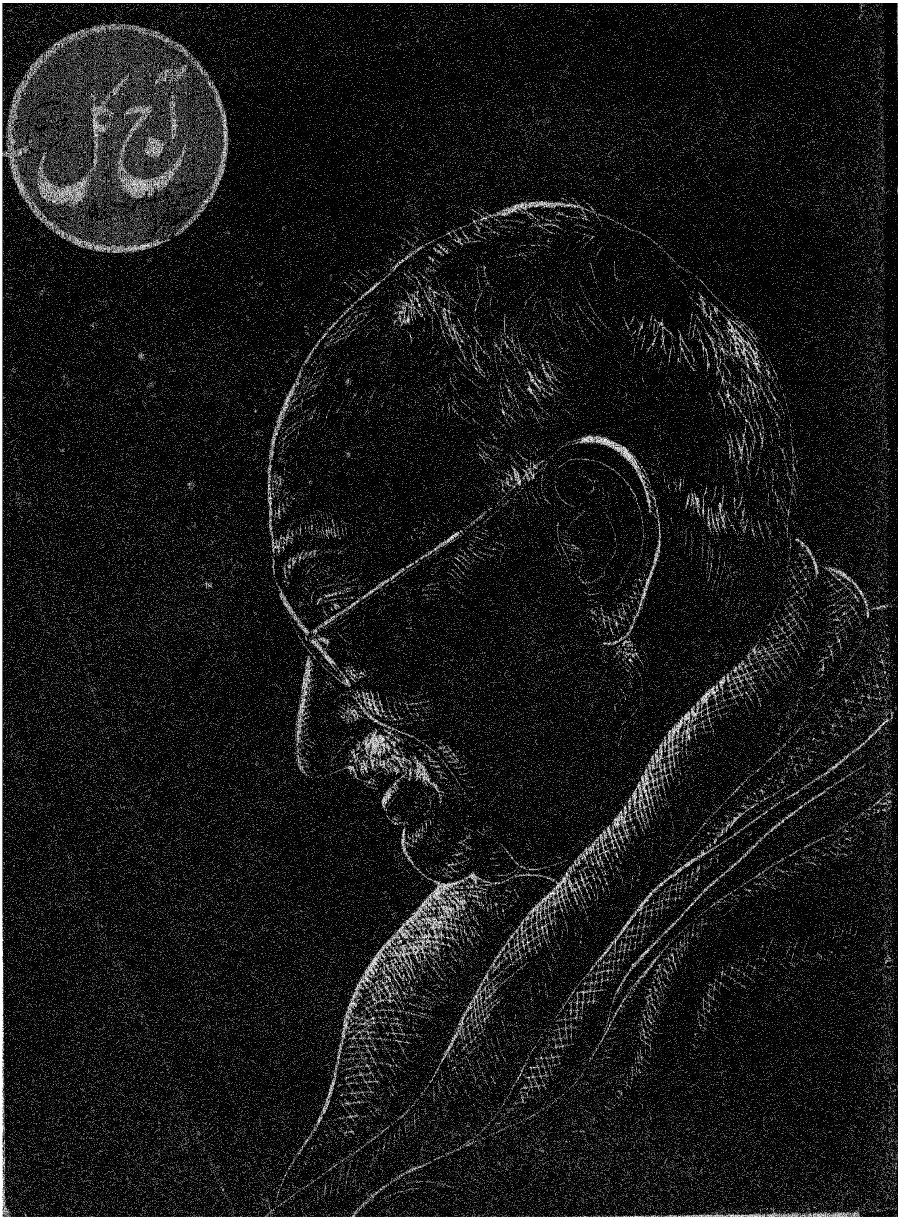

Regd.

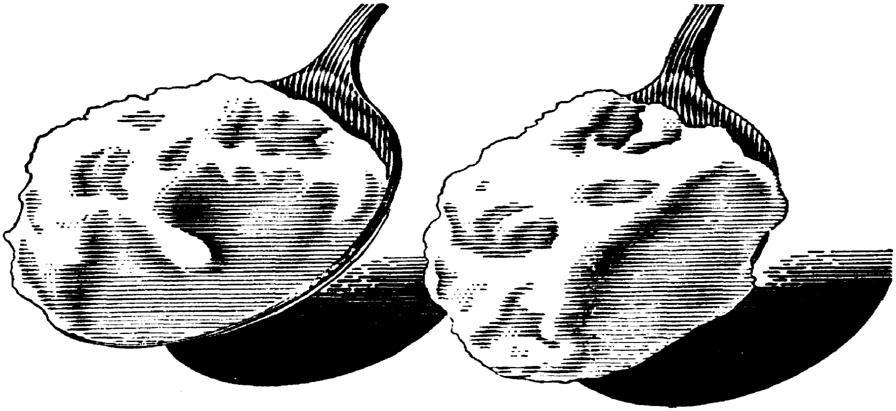

ہمیں ہر روز دو اونس چکنائی کی ضرورت ہے

ایک عام آدمی یا عورت کیلئے ہر روز دو اونس چکنائی کی ضرورت ہے ۔ ہمیں مکمل صحت اور طاقت پہنچانے کیلئے موزوں غذا کے پانچوں جزو لازمی ہیں، جن میں سے چکنائی ایک ہے ۔ یہ جزو اس ترتیب میں ہیں :۔ (وٹامن) پھل اور سبزیاں (کچی بہتر ہوں گی)، کلیجی (معدنیات) دودھ، انڈے، پنیر، مچھلی، گیہوں، پالک۔ (پروٹین) دودھ، انڈے، گوشت، کڑے چھلکے کے میوے، دالیں، مچھلی، گیہوں۔ (کاربوہائیڈریٹ) سبھی اناج معہ چاول، آلو، کیلے۔ (چکنائی) کڑے چھلکے کے میوے، پکانے کے تیل، چربی والا گوشت اور مچھلی۔ ڈالڈا پکانے کی بہترین خالص چکنائیوں میں سے ایک ہے اور سب قسم کے کھانے پکانے کیلئے موزوں ہے۔ یہ سیل بند ڈبوں میں بیچا جاتا ہے اور ہمیشہ صاف اور تازہ ہوتا ہے۔

اپنے راشن کے اناج کو زیادہ عرصہ کیسے چلایا جائے

مفت صلاح کے لئے آج ہی لکھئے — بوقت ضرورت

دی ڈالڈا ایڈوایزری سروس

پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱

HVM. 154-172 UD

آپ جہاں کہیں بھی ہوں...
ہمالیہ بُکے سنو
آپ کیلئے ایک بہتر کریم ہے
کیوں کہ یہ ہندوستانی آب وہوا کیلئے خاص کرکے بنایا گیا ہے
خواہ آپ میدانوں کی گرمی میں ہوں یا پہاڑوں کی سردی میں۔ خشک علاقوں میں یا بارشی مقاموں میں۔ غرضیکہ ہندوستان میں آپ کہیں بھی ہوں ہمالیہ بُکے سنو آپ کی جلد کو نہایت ملایم، صاف اور تازہ رکھے گا۔ اسکی خوشبو آپ کو نہایت پسند آئے گی۔
ایک اور عمدہ اداسملٹ پراڈکٹ

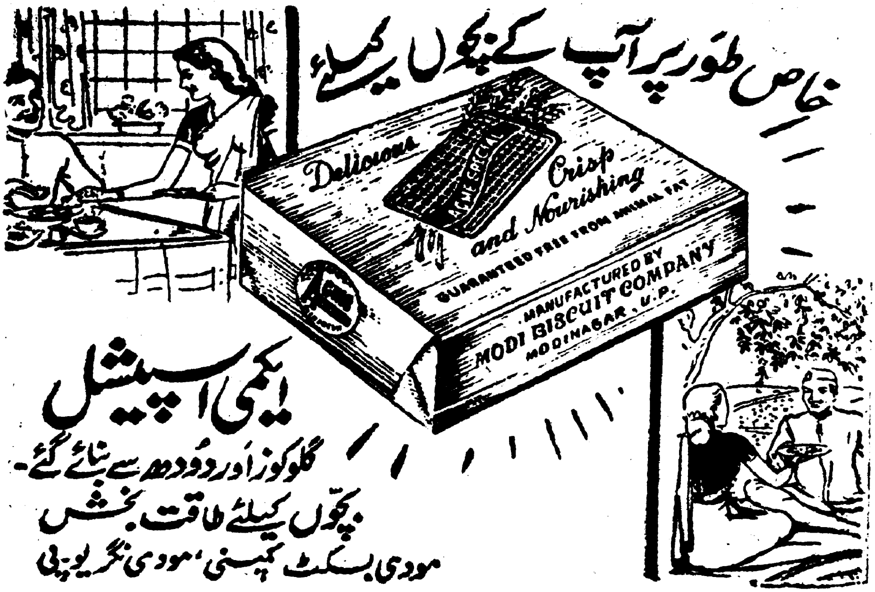
خاص طور پر آپ کے بچوں کیلئے
Delicious
Crisp
and Nourishing
GUARANTEED FREE FROM ANIMAL FAT
MANUFACTURED BY
MODI BISCUIT COMPANY
MODINAGAR, U.P.
ایکمی اسپیشل
گلوکوز اور دودھ سے بنائے گئے۔
بچوں کیلئے طاقت بخش
مودی بسکٹ کمپنی، مودی نگر یو۔پی

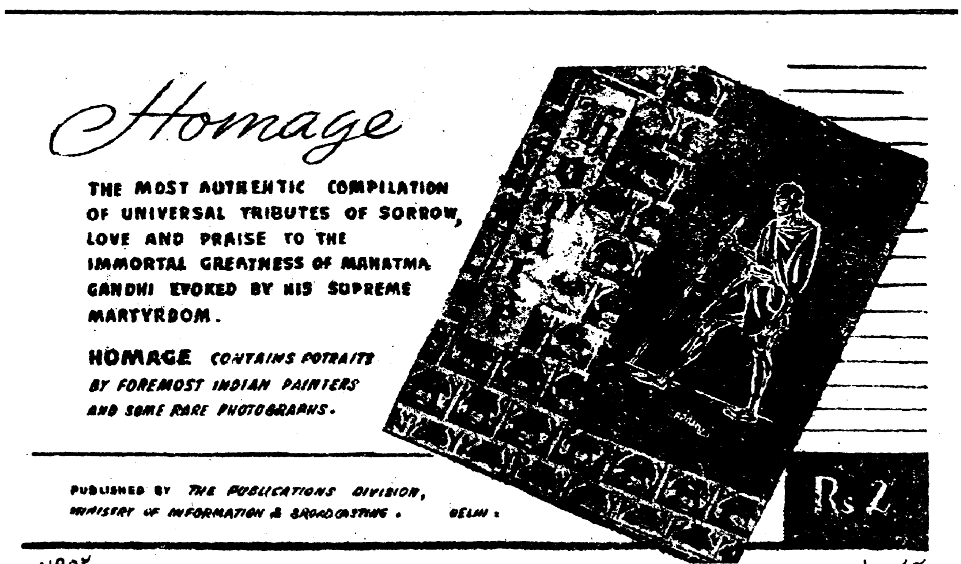
Homage
THE MOST AUTHENTIC COMPILATION OF UNIVERSAL TRIBUTES OF SORROW, LOVE AND PRAISE TO THE IMMORTAL GREATNESS OF MAHATMA GANDHI EVOKED BY HIS SUPREME MARTYRDOM.
HOMAGE CONTAINS POTRAITS BY FOREMOST INDIAN PAINTERS AND SOME RARE PHOTOGRAPHS.
PUBLISHED BY THE PUBLICATIONS DIVISION, MINISTRY OF INFORMATION & BROADCASTING. DELHI:
Rs 2

ترتیب

کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی	جوش ملسیانی	۴
مہاتما گاندھی اور معاشیات	جلیل احمد صدیقی	۵
گاندھی	جگن ناتھ آزاد	۹
نواب صدر یار جنگ کے خطوط	خواجہ احمد فاروقی	۱۰
۱۹۵۲ء	فضا ابن فیضی	۱۳
جارج فانتوم صاحب تخلص	محمد علی خاں اثر رامپوری	۱۴
رچلم	زکی انور	۱۷
نیا کشمیر	عرش ملسیانی	۲۳
ہاتھ کی لکیریں	مبارز الدین رفعت	۲۴
عبدالحلیم انصاری	عرش ملسیانی	۲۷
آرٹ اور آرٹسٹ	عبدالحلیم انصاری	۳۳
ذکر و فکر	رضا مظہری - شہاب جعفری اشرف ایرایانی - ساز مراد آبادی	۳۷
ہندوستان اور چین کے درمیان قدیم تعلقات	اطہر حسین جعفری	۳۸
ثالث بالخیر	انیس رضوی امروہی	۴۲
مجذوب فرنگی	محمد وسیم خاں شروانی	۴۵
کارٹون اور اس کے متعلقات	حبیب الرحمٰن غزنوی	۴۹
آزادی کے چار سال	ــــــــ	۵۳
متحدہ اقوام اور بھارت	ــــــــ	۵۵
نقد و نظر	ع - م	۵۶
رفتار زمانہ	ــــــــ	۵۸

بچوں کا آج کل

اچھی ماما	حامد اللہ افسر	۶۱
گورو مہاراج	خضر پرویز	۶۲
ننھا مصور	راشد حسن قادری	۶۴
پڑھو اور ہنسو	شکیل الدین احمد	۶۶
ہمارے بے زبان دوست	دیوکی نندن	۶۷
سب سے پہلی ریل	ایس - این - سادھو	۶۸

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد نمبر ۱۰ ـــــــــ نمبر ۶

سالانہ چندہ ـــــ { ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے }

غیر ممالک سے ـــــ نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ ـــــ { ہندوستان میں - آٹھ آنے
پاکستان میں - آٹھ آنے }

جنوری ۱۹۵۲ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس نمبر ۲۰۱۱ دہلی

جوش ملسیانی

کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی

اُمید کا سہارا کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی
دردِ نہاں کا چارا کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی

دل میں لحاظِ ساقی سر میں خیالِ توبہ
پینا مجھے گوارا کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی

اب التفات ان کا مشکوک ہو رہا ہے
وہ لُطف وہ مدارا کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی

مختاریوں میں شامل مجبوریاں بھی کر دیں
ہم پر کرم تمہارا کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی

پردہ ہے ایک جلوہ جلوہ ہے ایک پردہ
تو سب پر آشکارا کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی

یہ کیا دو رنگیاں ہیں اے گلشنِ محبّت
دل کش ترا نظارا کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی

کُنجِ عدم میں بھی ہے طوفانِ حشر سر پر
محفوظ یہ کنارا کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی

اُمید کی ضیا میں ہے یاس کی بھی ظُلمت
روشن مرا ستارا کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی

ضبطِ فغاں کا دعوےٰ اے جوشؔ کیا کروں مَیں
دل پر مرا اجارا کچھ ہے بھی کچھ نہیں بھی

جلیل احمد صدیقی

مہاتما گاندھی اور معاشیات

در حقیقت مہاتما گاندھی کوئی ماہر معاشیات نہ تھے اور نہ ہی علم معاشیات کے مطالعے کو اُن کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت حاصل تھی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک اور ایک صحیح الفکر صاحب فکر تھے۔ نہ صرف معاشیات اور انسانی ماحول کے لطیف تعلق کی بنا پر بلکہ یوں بھی ان کی عمیق فکر و نظر سے یہی توقع تھی کہ وہ انسانی زندگی کے گوناگوں مسائل کے متعلق سنجیدگی سے غور کر کے کوئی فلسفۂ معاشیات پیش کرتے۔ امریکہ کے مشہور معاشی دان جنرل واکر کا قول ہے کہ علم معاشیات کسی خاص انسان یا کسی خاص گروہ کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر عقل سلیم رکھنے والا انسان معاشی نکات کو سمجھنے اور اُن پر رائے زنی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ ان مسائل کی اہمیت دماغ ہی سے نہیں بلکہ دل سے بھی محسوس کرتا ہے۔ اس کی ساری زندگی معاشی محور کے گرد گھومتی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ وہ ان مسائل سے بیگانہ رہے۔

تنوع اور تضاد تو ہمہ گیر شخصیت میں ہوتا ہے تاہم گاندھی جی کے معاشی نظام میں جو ربط اور گہرائی ہے وہ قابل داد ہے۔ انہوں نے واقعات کو سمجھنے کی پُرخلوص کوشش کی ہے اور معاشیات کے متعلق اپنا انفرادی ردّعمل اور ایک مخصوص نظریہ پیش کیا ہے۔ معاشیات کے اس اچھوتے تصوّر میں عدم تشدد، سودیشی اور اہنسا کو خصوصی اہمیت حاصل ہے گاندھی جی کا نظام فکر Ruskin کی مشہور تصنیف (Unto This Last) سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ (Ruskin) ان فلسفیوں میں سے تھا جو معاشیات اور اخلاقیات میں کوئی بنیادی تضاد محسوس نہیں کرتے اور انسانی زندگی کو ہی تمام تر توجہ کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ ان کا قول تھا کہ "انسان سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہے"۔ اس سلسلہ میں گاندھی جی (Ruskin) کے سچے ہم خیال تھے۔ ان کی رائے میں انسانی مساوات اور معاشی برادری کے تصوّر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسی قسم کے با اخلاق اصولوں کی ضرورت ہے۔ وہ ان معاشی اصولوں کو روا نہ رکھ سکتے تھے جن کی بنیادیں محض حیوانی اور بہیمی جذبات اور احساسات پر قائم ہیں۔ وہ مادّی اقتدار کی خاطر فطرت انسانی کو مسخ کر دینے کے قائل نہ تھے۔

گاندھی جی نے ایک عالمگیر محبّت کا درس دیا ہے۔ ان کا نظام اس مغربی معاشی نظام سے جدا ہے جس میں صرف طاقتور ہی کو پروان چڑھنے کا حق حاصل ہے۔ ان کے یہاں کمزور سے کمزور کے لئے بھی جگہ ہے۔ وہ درماندہ ہم سفروں کو تیز رفتاری کے جنون میں چھوڑ دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مقولہ ہے کہ "زندگی دولت سے اہم ہے"۔ وہ معاشیات کی بنیاد سودیشی اور سوادھرم پر رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے سارے معاشی اصولوں میں اسی معصوم جذبے کی جھلک نظر آتی ہے۔ گاندھی جی کی روح پاکیزہ تھی۔ ان کے پاس محبت کرنے والا ایک پرخلوص دل ہے۔ ہمدردی اور دوستی کا بے پناہ جذبہ ان کا سرمایۂ حیات ہے اور وہ دوسروں کے خلوص کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک سچے وطن پرست کی ہے۔ ان کی رگ رگ میں دھان کے کھیتوں کی لہلہاہٹ ان کی نرمی اور سبزی اور ان گنت دریاؤں اور جھیلوں کی رنگینی بھری ہوئی ہے۔ انہیں اپنے ملک کی رعنائیوں کا ایک خاص احساس تھا۔ لیکن وہ حقیقت سے بھاگنا نہ جانتے تھے۔ انہیں اعتراف تھا کہ اس حسین پس منظر کے باوجود قومی زندگی کے حسین مرقعوں میں بالعموم رنگ اور شگفتگی کی کمی ہے۔ اس کھوئی ہوئی عظمت کو جو کبھی ہماری تھی دوبارہ حاصل کرنے کے لئے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ملک کے لاکھوں دیہات کو جو آج بےحسی کا شکار ہیں ایک نئی روح بخشی جائے۔ اس کا

یہ مطلب نہیں کہ ان کا دماغ رسم اور قدامت پسندانہ فرسودگی میں گرفتار تھا بلکہ وہ تنگ دائروں سے نکل کر تخلیق اور حقیقت کی فطری راہوں پر گامزن ہونا چاہتے تھے - وہ انسانی زندگی کو لالچ اور نفرت کی دلدل میں پھنسا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے - وہ شاداب وادیوں کی طرف بڑھنے کے لئے نئے راستوں کی تلاش کرتے ہیں - وہ معاشیات کو اخلاق کے فلک تک پہنچا دینا چاہتے تھے - گویا معاشیات اور اخلاقیات مترادف ہیں - ان کے نزدیک تمام معاشی رشتوں کی بنیاد محبت اور ہمدردی پر ہے - نفرت تو ایک تخریبی جذبہ ہے - اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا - ہمیں اپنے ملک کے لئے کسی تعمیری جذبے کی بنیاد ڈالنا ہے - ایسا جذبہ جس کے سہارے ہم، آپ اور سب ہنسی خوشی جی سکیں ـــ ان کی ساری معاشیات اسی قسم کا ایک تعمیری جذبہ ہے، گنگا کے پانی کی طرح حسین اور شفاف !

گاندھی جی کے معاشی نظام میں سودیشی کو وہی حیثیت حاصل ہے جو نظام شمسی میں سورج کو ہے - سودیشی کا یہ نظریہ از خود عدم تشدد کے تصور سے وابستہ ہے - سودیشی کیا ہے اور کیا نہیں؟ خود گاندھی جی بھی کبھی اس وسیع نظریے کی پوری تشریح نہ کر سکے - ان کا کہنا تھا کہ سودیشی خود اپنا مفہوم ہے - روحانی اعتبار سے سودیشی سے مراد یہ ہے کہ انسان مادیت سے نکل کر تخلیق کی صحیح منزل کی طرف گامزن ہو - عناصر خمسہ کی ترتیب ہی محض زندگی کا مقصد نہیں بلکہ اعلیٰ حواصل کے لئے تو اس کا وجود امتناعی حیثیت رکھتا ہے - زندگی کے ہیجان اور کشمکش کو، جو مادیت اور دولت پرستی کا نتیجہ ہیں، دور کرنے کے لئے سودیشی کے فطری تقاضوں کی طرف لوٹنا ضروری ہے - یہ تو تھا ان کا اخلاقی نظریہ لیکن آل انڈیا سودیشی لیگ کے کارکنوں کی رہنمائی کے لئے گاندھی جی نے سودیشی کے معاشی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے - سودیشی سے مراد وہ تمام صنعتیں ہیں جو گھریلو دور میں ہیں اور عوام کی ضرورتوں کے لئے کارآمد اشیا بناتی ہیں - ایسی تمام صنعتوں کو زندہ رکھنے کے لئے اور انہیں مالی اور فنی اعتبار سے مستحکم بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انہیں عوام اور حکومت کی سرپرستی حاصل ہو - اسی طرح یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کی بنائی ہوئی چیزوں کو بدیسی اشیا پر ترجیح دیں تاکہ قومی صنعتوں کو فائدہ ہو - لیکن چیزوں کی درآمد کو محض اس لئے بائیکاٹ کرنا کہ وہ بدیسی ہے سودیشی جذبے کے برعکس ہے - قومی سرمایہ اور ہنر کو ان چیزوں پر ضائع کرنا جن کی پیداوار کے لئے ملک کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے سراسر کم نظری ہے - ہاں ان چیزوں کا بائیکاٹ ضرور جائز ہے جن کی درآمد قومی دستکاریوں کو نقصان پہنچے - جس طرح کہ ہم اپنا ملک ایک خوشگوار آب وہوا والے ملک سے تبدیل کرنے کے لئے رضامند نہیں ہوتے اسی طرح ہمیں بدیسی اشیا کے مقابلے میں دیسی چیزوں کو ترجیح دینا چاہیئے - گاندھی جی کی رائے میں بیسویں صدی کی معاشیات کا بنیادی اصول کہ ہر شخص ہمیشہ ارزاں سے ارزاں بازار میں خریدتا ہے - حقیقت سے بعید ہے

گھریلو صنعتیں ہی کسی ملک کی اقتصادی ترقی کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہیں - گاندھی جی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے - ان کی نظر میں سودیشی کا صحیح مفہوم یہی تھا کہ طرح طرح کی گھریلو دستکاریوں کی حمایت کی جائے تاکہ یہ بھی ہندوستان کی صنعت سازی کے ڈرامے میں صحیح پارٹ ادا کر سکیں - تاریخ شاہد ہے کہ کسی زمانے میں ہماری یہ دستکاریاں تہذیب یافتہ ملکوں میں مشہور تھیں - لیکن مغربی اثرات کے غلبے کے ساتھ ان کی حالت زبوں ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ تمام دستکاریاں بے توجہی کا شکار ہو کر مٹ گئیں - ہم اس کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں اگر ہم صحیح تنظیم اور سدھار کے ذریعے گھریلو صنعتوں کو زندہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں - ان دستکاریوں کو پھر سے زندہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ گاندھی جی پیچھے کی طرف لوٹنا چاہتے تھے اور فرسودگی کی تلقین کرتے تھے - گھریلو صنعتیں قدیمی دور کی تخلیق سہی لیکن یہ خوبصورت دستکاریاں نہ تو بربریت کی نشانی ہیں اور نہ ہی عدم ترقی کا مظہر ہیں بلکہ ہر تہذیب یافتہ ملک میں ان کی جگہ سلامت ہے اور تمام ترقی یافتہ اسکولوں میں ان ہنروں کی تعلیم دی جاتی ہے - پچھلی جنگ عظیم سے قبل نازیوں نے جرمنی میں بیکاری دور کرنے کے لئے گلاس اور سگار بنانے کی گھریلو دستکاریاں شروع کی تھیں - لندن کے مشہور اخبار مانچسٹر گارڈین نے لکھا تھا کہ گاندھی جی کی گھریلو دستکاریوں کی اسکیم جرمنی جیسے صنعت یافتہ ملک میں بھی عمل درآمد کی جا رہی ہے -

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گاندھی جی بہر صورت مشینوں سے متنفر

تھے۔ لیکن ایسا کہنا سراسر زیادتی ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "میں ہر مشینری کے خلاف کیوں کر ہو سکتا ہوں۔ جبکہ میری نظر میں خود انسان ایک ایسی نفیس مشین ہے جس کی مثال نہیں"! لیکن وہ مشینری کے وسیع استعمال کو ضرور انسانی مفاد کے متضاد سمجھتے تھے۔ گاندھی جی نے مشینری کی تین خصوصیات بیان کی تھیں۔ اول یہ کہ مشین بجائے انسانی محنت کی معاونت کرنے کے اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں۔ یہ لاانتہا طور پر بڑھتی ہے۔ مشینری کی تیسری خصوصیت ہے یہ کہ اس کا استعمال انسانی مفاد کے برعکس ہے۔ گاندھی جی کی رائے میں مشینری کا استعمال صرف اسی وقت فائدہ بخش ہے جبکہ ہاتھ سے کام کرنے کی کمی ہو لیکن جہاں یہ شرط پوری نہیں ہوتی مشین خود گاندھی جی کے الفاظ میں "گناہ" ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان میں مشینری کے استعمال کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتے رہے۔ مشینی دور میں انسانی مساوات اور جمہوریت کا تخیل بہرکیف ناممکن ہے۔ اس دور کی حیرت انگیز فتوح کے باوجود عوام روز بروز کمی اور غربت کا شکار ہو رہے ہیں اور اس کے عظیم کارنامے انسان کی جذباتی اور روحانی قدروں کو روندے ڈال رہے ہیں۔ سماج اور تمدن کے تمام روشن پہلوؤں کو مشینری کے مالی مفاد کا غلام بنا دیا گیا ہے۔ اور وہ مفاد بھی کیا؟ صرف ایک مخصوص فرقے کے لئے۔

گاندھی جی کی نظر میں مشینری کا صحیح مقصد یہ تھا کہ ہر شخص کی ذاتی اور انفرادی محنت میں کمی کی جائے نہ یہ کہ اس کی وجہ سے انسانوں کی بڑی تعداد کو بے روزگاری کا منہ دیکھنا پڑے۔ یہ مقصد اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب مشینوں کی بنیاد محنت کی قدر و منزلت اور انسانی ہمدردی پر ہو۔ مثال کے طور پر کپڑا سینے کی سنگر مشین (Singer) ان چند مشینوں میں سے ہے جو بے حد مفید ہیں۔ اس کی تخلیق ہی بہت رومان انگیز طور پر ہوئی۔ یہی مشینری کا صحیح مقصد ہے۔ مشینری کے خلاف گاندھی جی کی صدا محض مجذوب کی بڑ نہ تھی۔ بلکہ ان مغربی ممالک میں جہاں مشینری انسانی زندگی کا ضروری عنصر ہو گئی ہے' یہی تلخ تجربہ ہوا ہے۔ آج ہی سے نہیں بلکہ ۱۹۰۸ء ہی میں جب مہاتما گاندھی جنوبی افریقہ میں تھے' مشینری کا بڑھتا ہوا طوفان انہیں متاثر نہ کر سکا۔ تاہم ان تمام تاثرات کے باوجود گاندھی جی کو اعتراف تھا کہ ہر ملک میں کچھ بنیادی صنعتوں کا ہونا لازمی ہے اور نہ ہی انہیں اس حقیقت سے انکار تھا کہ گھریلو صنعتیں بڑی صنعتوں کی معاون تو ہو سکتی ہیں لیکن اُن کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ مثلاً سنگر مشین بنانے کے لئے ہی بڑی بڑی مشینوں کی ضرورت ہوگی۔ لیکن ایسی سب صنعتوں کا واحد مقصد یہ ہونا چاہئے کہ قومی دولت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ حکومت ان صنعتوں پر نگرانی رکھے تاکہ مفاد عامہ کی حفاظت ہو سکے۔ مگر وہ تشدد سے تمام صنعتوں پر قبضہ جما لینے کے حامی نہ تھے۔ ان کے اصول میں تنگ نظری کا گزر نہ تھا۔ وہ جذبات کو مشتعل کرنا نہیں جانتے تھے بلکہ محبت اور خلوص کا سبق دیتے ہیں۔

گاندھی جی نے جہاں بھی معاشی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ان کی حیثیت ایک سچے وطن پرست کی سی ہے جو ہر قیمت پر اپنے دیس کی بھلائی خریدنے کو طیار رہے۔ انہوں نے ہر ایسے اصول کی حمایت کی جو قوموں کی آزادی اور حریت برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ انہوں نے قومی زندگی کا ایک ایسا تصور پیش کیا جس میں خارجی اثرات کو کوئی دخل نہ تھا۔ مضبوط صنعت یافتہ ملکوں کی جارحانہ پالیسی سے قومیت کے تصور کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی وسیع پیمانہ پر صنعت سازی کے مخالف تھے۔ ان کے خیال میں مشینی صنعت سازی کا یہ دور عالم ہستی کے فطری تقاضوں سے بے ربط ہی نہیں بلکہ برعکس بھی ہے۔ صنعت سازی کی خاطر خواہ ترقی کے لئے دو شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ غیر ملکی بازاروں پر قابو حاصل ہو تاکہ وہاں صنعتی پیداوار کھپائی جا سکے۔ اور دوسرے یہ کہ دیگر ملکوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے مقابلہ جس قدر بھی کم ہو اچھا ہے۔ ان دونوں شرطوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملکوں کی آزادی سے کھیلا جائے اور انہیں سیاسی غلامی کا طوق پہننے پر مجبور کیا جائے۔ گاندھی جی یہ سب کیسے روا رکھ سکتے تھے؟

گاندھی جی نے ثابت کر دیا کہ موجودہ پیداواری نظام میں عوام کا رہن سہن بہتر ہونا تو درکنار روز بروز گرتا ہی جاتا ہے۔ اگر پیداوار کا یہ طریقہ خرابیوں سے قطعاً پاک ہوتا تو یہ بلا تعین ترقی کرتا رہتا لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ خود اس کی ترقی ہی اس کی شکست کا باعث ہو جاتی ہے۔ اگر دنیا کے تمام ملکوں نے بیک وقت وسیع پیمانہ پر پیداوار شروع کر دی تو ظاہر ہے کہ دنیا میں اتنا بڑا بازار ہونا ناممکن ہے کہ کل سامان نفع بخش قیمتوں پر فروخت ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ نظام کاغذ کے گھروندے کی طرح ٹوٹ جائے گا۔ پیداوار سے کہیں

زیادہ اہم اس کی تعلیم (تقسیم) ہے - اگر چیزیں وہیں پیدا کر لی جائیں جہاں ان کی کھپت ہو تو تقسیم کا اہم مسئلہ جو صنعت یافتہ ملکوں کے لئے دردِ سر کا باعث ہے خود بخود حل ہو جاتا ہے - اور لاتناہی طور پر پیداوار بڑھاتے رہنے کی ہوس بھی ختم ہو جاتی ہے - دنیا کی غیر صنعت یافتہ قومیں بھی اگر اپنی ضرورت کا سامان پیدا کرنے لگیں تو فیکٹری کا یہ نشہ خود بخود ختم ہو جائے گا - اگر ہر شخص کی انفرادی پیداوار کو آبادی کے تعداد سے ضرب دے دیں تو مجموعی پیداوار کہیں زیادہ وسیع ہو جاتی ہے! سودیشی اور کھادی کا یہی پیغام ہے -

گاندھی جی کو مغربی معاشیات کے ناقص اور غیر انسانی اصول سے کوئی لگاؤ نہ تھا - مغربی معاشی سائنس دانوں نے سیاسی انسان اور سماجی انسان کی طرح معاشی انسان Economic Man کا بھی انکشاف کیا ہے - یہ انسان خود غرضی کی جیتی جاگتی تصویر ہے - اس کی خرید و فروخت لالچ پر مبنی ہے - اسے انسانی قدروں کی ذرہ برابر پروا نہیں اور نہ ہی اسے بنی نوعِ انسان سے کوئی ہمدردی ہے - گاندھی جی اس عجیب و غریب انسان کے وجود کے کبھی قائل نہ تھے اور نہ ہی ان اصول کو روا رکھ سکتے تھے جو اس تصوّر سے ہم آہنگ ہیں - ان کے خیال میں انسانی رشتوں میں اس قسم کے روکھے اصول کے لئے کوئی جگہ نہیں جس معاشی نظام میں جذباتی اور اخلاقی قدروں کا فقدان ہو وہ اس مکان کی طرح ہے جس کی بنیاد ہی نہ ہو - کوئی ہلکا سا جھونکا بھی اسے زمین پر گرا سکتا ہے - قوموں کی تاریخ میں ایسے مواقع کی کمی نہیں جب کہ اس قسم کے بے جان معاشی اصول واقعات کی تاب نہ لا کر شکستہ ہو گئے ہیں - اور قدرتی طور پر جن قوموں کی بنیاد ہی ان اصول پر ہو ان کا خاتمہ یقینی ہے - انہیں استحقاق اور اجارہ داری سے نفرت تھی - انہوں نے دولت کی ناہموار تقسیم کے خلاف صدا بلند کی - مشینری اور فیکٹری کے دَور سے انہیں صرف اس وجہ سے گھن آتی تھی کہ اس کا خطرناک رَدِ عمل سماجی قدر و قیمت کو کچلنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے - اس صورتِ حال میں مساوات اور جمہوریت کا صحیح تخیّل جس کے لئے وہ ہمیشہ جد و جہد کرتے رہے، ناممکن ہے - امریکہ اپنی صنعتی برتری اور لا انتہا دولت کے باوجود اپنی حدود سے غربت دُور نہ کر سکا - گاندھی جی ترقی کے اس مفہوم کے قائل نہ تھے جہاں پیداوار کی زیادتی کی وجہ سے غلّوں کے انبار کو آگ لگانے کی ضرورت پیش آئے یا لوگ ایک دوسرے پر انڈے پھینکنے لگیں کیونکہ بازار میں انڈوں کی قیمت کم ہو گئی ہے! اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غریبی کی پوجا کرتے تھے بلکہ وہ پیداوار کی تخلیق اور تقسیم میں مساوات کے حامی تھے - سادگی اور بلند خیالی کا یہ تصوّر صنعت سازی کے ہیجان میں ایک امیدِ موہوم کے سوا کچھ نہیں لیکن گاندھی جی کی رائے میں اس قسم کی دلکش زندگی اگر ہمارا آئیڈیل ہے تو اس کی جستجو نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں - وہ مادی اور روحانی قدروں میں ایک قریبی ربط پیدا کرنے پر مُصِر تھے - انہوں نے فکر اور عمل میں صدق و صفا کا درس دیا ہے - اگر دنیاوی دولت کی خاطر روحانی پاکیزگی قربان کرنی پڑے تو یہ سودا انہیں ہرگز منظور نہ تھا!

غالب نمبر

غالب نے ماہ فروری ۱۸۶۹ء میں وفات پائی - فروری کے مہینے میں ہندوستان و پاکستان میں اس کی یاد منائی جاتی ہے — ہم نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ "آج کل" کا ماہ فروری ۱۹۵۲ء کا شمارہ غالب نمبر ہو گا۔

اس شمارے میں غالب سے متعلق بہت دلچسپ اور معلوماتی مضامین شامل ہوں گے۔ نادر تصویریں اور خطوں کے عکس بھی شامل ہوں گے ۔ قدردانانِ ادب ابھی سے اسے حاصل کرنے کا انتظام فرمائیں۔

(ادارہ)

جگن ناتھ آزاد

گاندھی

آیا وہ خوابِ مست غلاموں کے دیس میں — بیداریٔ حیات کی دنیا لئے ہوئے
ہاتھوں میں لے کے پرچمِ آزادیٔ بشر — پھرتا رہا خلوص کا جذبہ لئے ہوئے
دنیائے قید و بند کا رتبہ بڑھا گیا — ہاتھوں میں حریت کا پھریرا لئے ہوئے
ہر گوشۂ حیات میں وہ گامزن رہا — حسنِ عمل کا جلوۂ زیبا لئے ہوئے
گرمِ ستیز سطوتِ افرنگ سے ہوا — آزادیٔ وطن کی تمنّا لئے ہوئے
ٹکرا کے سامراج کے سنگین دور سے — اہلِ وطن کے عشق کا سودا لئے ہوئے
اس نے طلسم توڑ دیا سامراج کا — انساں کی عظمتوں کا سہارا لئے ہوئے

وہ پیکرِ نحیف وہ اک ناتواں سا جسم — آدم کی قوتوں کا خزانہ لئے ہوئے
ہندوستاں کی خشک زمینوں پہ پھر گیا — سینے میں اپنے عزم کے دریا لئے ہوئے

پہنچا وطن جو منزلِ مقصود کے قریب — آزاد زندگی کی تمنّا لئے ہوئے
یہ پیکرِ نحیف گرا کارزار میں — سینے پہ زخم دردِ وطن کا لئے ہوئے

اور زندگی کے درد کا پالا ہوا بشر
"رخصت ہوا شہید کا رتبہ لئے ہوئے"

خواجہ احمد فاروقی

نواب صدر یار جنگ کے خطوط

"آج کل" کے سالنامہ ۱۹۵۱ء میں جناب مالک رام کا دلچسپ مضمون نواب صدر یار جنگ مرحوم کے متعلق دیکھا - اس میں غزل کا سا لطف ہے -

در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ

مجھے وہ صحبتیں یاد آگئیں جو تیرہ برس پہلے نواب صاحب کے ساتھ گزری تھیں - اب بھی یہ عالم ہے کہ "خیالش دیدۂ آئینہ جاں را صیقل" میرا تعارف سب سے پہلے ایک خط کے ذریعہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کرایا تھا - جون کا مہینہ اور عصر کا وقت تھا - میں وہ خط لے کر ان کے پاس پہنچا - ان کی مغلوں کی سی خوش مذاقی اور نفاست، چہرے کی کلاسیکل خوبصورتی اور ذہانت، لباس اور وضع قطع کی پاکیزگی اور متانت میں کبھی نہیں بھول سکتا - بڑی شفقت سے پیش آئے - پوچھا "آپ کیا کام کر رہے ہیں" - عرض کیا - خطوط پر کام کرنا چاہتا ہوں" - دریافت کیا "کچھ کیا ہے؟ میں نے رجب علی بیگ سرور کے خطوں پر ایک مضمون لکھا تھا - وہ پیش کیا[1] - اُس کا ایک ایک لفظ نہایت غور سے پڑھا اور میری رائے سے اتفاق کیا کہ سرور نے بے خبر اور غالب سے بھی پہلے اُردو میں خطوط لکھے ہیں - لیکن فرمایا - آپ نے یہ صحیح نہیں لکھا کہ سرور غالباً لکھنؤ کے پہلے مصنفِ نثر ہیں" - میں نے داستان تاریخ اردو[2] کے حوالہ سے یہ بات لکھی تھی - انہوں نے لکھنؤ کے کئی مصنفوں کا ذکر کیا جو سرور سے پہلے گزرے تھے - سرور کے سلسلہ میں نصیر الدین حیدر کا ذکر آیا نواب صاحب نے فرمایا کہ اس نے اردو میں خطوط لکھے ہیں آپ تلاش کریں گے تو شاید مل جائیں افسوس ہے کہ میرے پاس نہیں ہیں[3] -

اثنائے گفتگو میں بیدل کے رقعات اور اس کی شاعری کا ذکر آگیا - مجھ سے پوچھا - آپ نے اس کی شاعری کا بھی مطالعہ کیا ہے" عرض کیا "بہت سرسری اس کے متعلق میری معلومات بہت محدود ہیں" - فرمایا اس کا کوئی شعر سنایئے - میں نے یہ شعر پڑھا -

چوں شمع، سربلندیٔ عشاق مفت نیست آخر بقدرِ سوختن است آبروئے ما

بہت محظوظ ہوئے - فرمایا "کوئی اور یاد ہے؟ میں نے یہ شعر پیش کیا -

موجِ ماخشک ازیں بحرِ پرآشوب گزشت ہمچو نظارہ کہ از دیدۂ تر می گزرد

نواب صاحب مرحوم کی سماعت میں ثقل تھا - فرمایا "میں التفات دونا چاہتا ہوں - مکرر پڑھیئے" میں نے دوبارہ پڑھا - بڑی شاباشی دی - یہ دراصل میرا امتحان تھا - خدا نے پردہ رکھ لیا

موجِ ماخشک ازیں بحرِ پرآشوب گزشت

نواب صدر یار جنگ ہماری قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ تھے - شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی - میری اور ان کی عمر میں بہت بڑا بل تھا - اسی طرح علم و فضل میں وہ بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے - اور میں محض طفلِ مکتب تھا لیکن وہ گفتگو اس عجز اور خاکساری سے کرتے تھے جیسے انہیں مخاطب کا بڑا ادب اور احترام ملحوظ ہے -

فرمایا - "چائے پیجیئے گا یا آم کھائیے گا"؟ میں نے عرض کیا "آم" بھیگے ہوئے سرد آم منگوائے - ایک ایک آم کو اپنے ہاتھ سے کاٹا اور اسے چھیل کر مجھے دیا - میں جب ان شفقتوں کو یاد کرتا ہوں تو میری روح "دوزانو" ہو جاتی ہے -

---

[1] یہ مضمون نگار نومبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہو چکا ہے -

[2] داستان تاریخ اردو - سرور لکھنؤ کے سب سے پہلے مصنف نثر ہیں - ص ۱۶۹

[3] لیکن مجھے آج تک ان خطوں کا سراغ نہیں ملا - خواجہ احمد

اگلے روز وہ مجھے اپنے ساتھ موٹر میں حبیب گنج لے گئے۔ وہاں ایک لطیفہ پیش آیا جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میرا قاعدہ یہ ہے کہ چارپائی پر بیٹھ کر یا لیٹ کر کام کرتا ہوں۔ نواب صاحب کا معمول یہ تھا کہ وہ صبح کو ناشتہ کے بعد اور سہ پہر کو تین چار بجے میرے کمرے پر ضرور تشریف لاتے اور میں ان کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس پر انہیں بڑی ناگواری ہوئی۔ فرمایا "آپ کھڑے نہ ہوا کیجئے۔ مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے"۔ عرض کیا "میں بالعموم لیٹا ہوتا ہوں یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ تشریف لائیں اور میں کھڑا نہ ہوں"۔

فرمایا "یہ غلط طریقہ ہے۔ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا"۔ عرض کیا "آپ کا ادب میرے لئے سب سے بڑی سعادت ہے۔ اور "پھر گر حفظ مراتب نکنی زندیقی"

نواب صاحب کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ میں ان کے پاس چل کر جاؤں۔ میں مہمان تھا۔ اس لئے وہ خود میرے پاس آتے تھے۔ اس کے بعد میں نے یہ معمول کر لیا کہ نواب صاحب کے آنے سے چند منٹ قبل کرسی پر بیٹھ جاتا یا کھڑے ہو کر کتابیں درست کرنے لگتا۔

میں چار دن حبیب گنج رہا۔ انہوں نے ایک نسخہ علمائے سلف کا اپنا دستخطی مجھے مرحمت فرمایا۔ وہ افسوس کہ اُن کے بہت سے خطوں کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں ضائع ہو گیا۔ جو خط میرے پاس باقی رہ گئے ہیں ان کو قدر دانانِ ادب کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہ ان کے سب سے اچھے خطوط نہیں ہیں لیکن میری نیت یہ ہے کہ دیگراں آیندہ کارے ہم بکنند۔ یہ کام ان کے نیازمندوں اور معتقدوں کا ہے کہ وہ ان خوش آب موتیوں کو دنیا کے سامنے پیش کریں تاکہ دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہو۔

نواب صدریار جنگ مرحوم کا مرتبہ اردو ادب میں معمولی نہیں تھا۔ اہلِ علم ان کی وجاہت اور دولت کی وجہ سے نہیں، ان کے علم و فضل نیک دلی اور پاک مشربی کی وجہ سے ان کے حلقہ بگوش تھے۔ حالیؔ، شبلیؔ، امیر مینائیؔ، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر اقبال نے جو خطوط ان کے نام لکھے ہیں، وہ عقیدت اور ارادت کی بہترین دستاویزیں ہیں۔

خط نمبر ۱ - (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس جبلپور کی دعوت دیتے ہیں)

بنام حکیم سید شمس اللہ قادری

حکیم صاحب کرم فرما۔ السلام علیکم

آفتاب، پہاڑوں کو منوّر و تابناک کرتا ہے۔ کیا بلے چاہیے اگر اپنے مہربان حکیم شمس اللہ قادری صاحب سے یہ تحریک ہو کہ جبل پور کو شرکت سے منور کیجئے۔ آئیے اور ضرور آئیے۔

مخلص - صدریار جنگ

خط نمبر ۲ - بنام ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔

حبیب منزل، میرس روڈ۔ علی گڑھ - ۲۸ رجون ۱۹۴۳ء

مولوی صاحب مکرم و کرم فرما۔ السلام علیکم۔

گرامی قدر فاروقی صاحب ایک علمی و ادبی تلاش میں گامزن ہیں حبیب گنج بھی ہو آئے ہیں۔ اس نامۂ خلوص کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہو رہے ہیں۔ توجہ گرامی سے بامراد ہوں گے۔

نیازکیش - حبیب الرحمٰن خاں

خط نمبر ۳ - بنام مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی

مہتمم کتاب خانہ قلعہ معلی رام پور

حبیب منزل میرس روڈ - علی گڑھ - ۲۸ رجون ۱۹۴۳ء

لطف و کرم فرما زاد لطفہم السلام علیکم

ایک علمی مذاق کے نوجوان تلاش علم میں حاضر ہو رہے ہیں۔ حبیب گنج بھی دیکھ آئے ہیں۔ آپ کے لئے تعارف نامہ چاہتے ہیں۔ مجھ کو وثوق ہے کہ الطاف و توجہ سامی سے فیض یاب ہوں گے۔

نیازکیش - حبیب الرحمٰن

خط نمبر ۴ - بنام خواجہ احمد فاروقی

حبیب منزل، علی گڑھ

۱۵ رجولائی ۱۹۴۳ء

گرامی گوہر السلام علیکم

عنایت نامہ آیا۔ علالت کی خبر افسوس ہوا۔ عافیت باد۔ آموں کا پارسل محفوظ آ گیا۔ آپ کی یادآوری سے دل خوش ہوا۔ آم پال میں رکھ دئے گئے ہیں۔

دل چاہتا ہے کہ ایک بار اور آپ میری موجودگی حبیب گنج

کے زمانے میں وہاں آتے اور جو خط نہ دیکھ سکے تھے، وہ دیکھ لیتے۔
امید ہے کہ آپ اب بعافیت ہوں گے۔ بحمد اللہ یہاں خیریت و عافیت ہے۔ موسم خوشگوار ہے۔

حبیب الرحمٰن

خط نمبر ۵ ۔ بنام خواجہ احمد فاروقی

حبیب گنج، ضلع علی گڑھ

۸ ر اگست ۱۹۴۳ء

کرم فرما السلام علیکم

شکریہ یاد آوری۔ جواب میں دیر باہر آنے جانے اور قلتِ فرصت سے ہوئی۔ معاف ہو۔

مشاہیر اردو کے خطوط چھانٹنا اور آپ کو بھیجنا محنت اور تلاش چاہتا ہے۔ اس پر اب قادر نہیں ہوں۔ معہذا مشاہیر کا معیار آپ کے یہاں کیا ہے۔ اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ ایک بار آجائیے۔ جو کچھ ہے۔ حاضر ہو جائے گا۔ انتخاب کر لینا۔ مسرتِ دیدار بھی حاصل ہو جائے گی۔

حبیب الرحمٰن

خط نمبر ۶ ۔ بنام خواجہ احمد فاروقی

حبیب گنج، ضلع علی گڑھ

یکم اکتوبر ۱۹۴۳ء

کرم فرما السلام علیکم

کل ۳۰ ر کو خط ملا۔ میں عید کے تیسرے دن علی گڑھ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ اول آپ رام پور ہو آئیں اس کے بعد یہاں کا ارادہ کیجیے تاکہ میں یہاں آپ کو مل سکوں۔ یہاں آتے وقت میری علی گڑھ کی کوٹھی حبیب منزل میں میرے قیام کا حال دریافت کر لیجیے گا۔ ممکن ہے میں وہاں مل جاؤں اور آپ کو اپنے ساتھ یہاں لاؤں۔

حبیب الرحمٰن

خط نمبر ۷ ۔ بنام خواجہ احمد فاروقی

حبیب گنج ضلع علی گڑھ

۱۲ ر نومبر ۱۹۴۳ء

کرم فرما السلام علیکم

خط پہنچا۔ علالت کی زحمت کا افسوس ہے۔ صحت و قوت شافیٔ مطلق بخشے۔

"نگار" کے نقش و نگار سے میری نگاہ فیض یاب نہیں۔ آپ یہاں آئیں گے تو رجب علی بیگ سرور کے ہاتھ سے لکھا ہوا قرآن مجید کا نسخہ دیکھیں گے۔

"کچھ خطوط" کس طرح بھیجوں۔ انتخاب "کچھ" کا کون کرے آپ ہی خیریت سے آکر دیکھئے۔ ذخیرہ وافر ہے۔

نیازکیش۔ حبیب الرحمٰن

خط نمبر ۸ ۔ بنام خواجہ احمد فاروقی

(۲ ر مارچ ۱۹۴۴ء کو میں نے اُن سے حسرت موہانی پر مقابلہ کرنے کی فرمائش کی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ ان مضامین کو کتابی شکل میں چھاپا جائے۔ مولانا حسرت مرحوم نے نواب صدر یار جنگ کا ذکر "ارکان علم و فن" اور "محبانِ بے ریا" میں کیا ہے اس لئے میری خواہش تھی کہ اس مرقع میں ان کا بھی مضمون شامل ہو۔ اس گشتی اور مطبوعہ خط کے جواب میں تحریر فرمایا ہے)

مکرمی السلام علیکم ۔ آج کل میری صحت چند سطریں لکھنے کی بھی متحمل نہیں

حبیب الرحمٰن

۸ ر مارچ ۱۹۴۴ء

خط نمبر ۹ ۔ بنام خواجہ احمد فاروقی

حبیب گنج ۔ ۱۱ ر جنوری ۱۹۴۷ء

مہربان من السلام علیکم

شکریہ یاد آوری۔ آپ مجھ سے بے خبر تھے۔ میں بھی بے خبر رہا۔ کتاب کا شوق سے انتظار رہے گا۔ میں نے مِیرؔ کے دیوان پر ایک مقالہ لکھا تھا دوسرے مقالوں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

خط کل ملا ہے۔ اس لئے جواب دلّی بھیجا جاتا ہے۔ عربک کالج میں برخوردار محمد ہارون خان پرنسپل کے ساتھ مل کر کام کیجیے۔ علم و اخلاق دونوں کا لطف انشاء اللہ حاصل ہوگا۔

حبیب الرحمٰن

کبھی یہاں دوبارہ آئیے اور کتاب خانہ مکتبہ حبیبیہ دیکھئے ۔

خط نمبر ۱۰ ۔ بنام خواجہ احمد فاروقی

حبیب منزل ۔ علی گڑھ

۳۰ راگست ۱۹۴۷ء

میرے لطف و کرم فرما ۔ السلام علیکم

شکریہ الطاف نامہ و الطاف خاص متعلق مقالات شیروانی ۔ زندہ باش سلامت باش

"ہدایۃ الصالحین" کے متعلق انشاء اللہ حبیب گنج پہنچ کر اور کتاب خانے سے پتہ لگا کر آپ کو لکھ سکوں گا ۔

"تذکرہ خزینۃ الشعرا" اگر دیکھنے کو آپ میرے پاس بھیج سکیں تو اس کو دیکھ کر خیال قائم کیا جا سکتا ہے ۔ بعد مطالعہ و تجسس انشاء اللہ واپس کر دیا جائے گا ۔

برخوردار ہارون خاں کو آپ کی بابت خط لکھتا ہوں انشاء اللہ تعارف توجہ سے کریں گے ۔ الحمد للہ تعالیٰ بعافیت ہوں اور طالب عافیت ہوں ۔ آپ یہاں کب آئیں گے ؟

حبیب الرحمٰن

فضا ابن فیضی

سنہ ۱۹۵۲ء

بہار آئی زمانے میں زمانے کا چلن بدلا — جوانانِ چمن نے اپنا اپنا پیرہن بدلا
جہانِ ابنِ آدم کا جو تھا رنگِ کہن بدلا — نظر آتا ہے کچھ ہر ایک طرزِ انجمن بدلا
عقابِ وقت پھر اب مائلِ پرواز ہوتا ہے
مبارک ہو نئے اب سال کا آغاز ہوتا ہے

"بہت سے باندھ رکھے ہیں گریباں میں نے دامن میں" — بہت سی بجلیاں بے تاب ہیں میرے نشیمن میں
تجلّی کی کمی کیا ہے مری وادیٔ ایمن میں — مرے شعلوں سے ربطِ خاص ہے کچھ سنگ و آہن میں
کتابِ حال و ماضی سے بھی کچھ اسباق لے لوں گا
میں خود ابوابِ مستقبل کی اب ترتیب دے لوں گا

ابھی تک سینۂ ماضی میں ہیں جو رازِ مستقبل — وہی آخر بنیں گے پردہ ہائے سازِ مستقبل
ہر اک ذرے سے روشن ہے یہاں آغازِ مستقبل — مری ہر سانس ہے گویا پرِ پروازِ مستقبل
شعورِ مرگ ہی سے زندگی تعمیر ہوتی ہے
کہ ہر تخریب میں پنہاں کوئی تعمیر ہوتی ہے

زمانے ہاں زمانے کی یہ رَو، جو ساتھ دے میرا — یہ مہر و مہ کی تھراتی سی لَو، جو ساتھ دے میرا
یہ لالے کا لہو، شبنم کی ضو، جو ساتھ دے میرا — مجھے امید ہے یہ سالِ نو، جو ساتھ دے میرا
ابھی روحِ وفا اک پھونک دوں شیخ و برہمن میں
فضا! اک سرخوشی کی جان دوڑا دوں نئے سن میں

محمد علی خاں آثر رام پوری

جارج فانتوم صاحب تخلّص

اُردو کا ایک ممتاز شاعر

نام جارج فانتوم تخلص صاحب اور جرجیس۔ ابن کپتان برنارڈ فانتوم فرانسیسی۔ کپتان برنارڈ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۷ء تک نواب سید احمد علی خاں رند والیٔ رام پور کے عہد میں وزیر ریاست رہے۔ اسی زمانے میں جارج فانتوم نے رام پور کے علما رحافظ شبراتی طالب۔ مولوی محمد نور الاسلام اور مولوی محمد حفظ اللہ سے فارسی اور عربی پڑھی۔ میر نجف علی شفقت سے فن شعر سیکھا۔ بریلی میں فانتوم گنج اسی خاندان کے نام سے موسوم ہے۔ یہ جائداد اکبر شاہ ثانی شاہِ دہلی نے اپنی ہمشیر کے علاج کے صلے میں کپتان برنارڈ کو عطا کی تھی۔ جارج فانتوم ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۸۷۹ء میں ستر برس کی عمر میں بریلی میں انتقال کرگئے۔ انتقال سے کچھ پہلے وہ مرادآباد کے انگریزی دفتر کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ جارج فانتوم کی ماں شاہزادۂ دہلی فیروز شاہ کی بیٹی مغلیہ شاہی خاندان سے تھیں۔ انہی کے زیر تربیت جارج فانتوم مسلمان ہوئے اور ان کے خیالات اسلامی سانچے میں ڈھل گئے۔ بیوی کا نام صاحبہ بیگم تھا۔ جارج اور ان کی بیوی کی قبریں بریلی کالج کے احاطے میں ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں اور چار بیٹے تھے۔ جارج کے نواسوں میں اس وقت قاری عبدالعزیز صاحب منیجر مدرسہ اشاعت الاسلام بریلی بقید حیات ہیں۔ جو محلہ سرائے خام میں رہتے ہیں۔

جارج کے مفصل حالات رام بابو سکسینہ نے انگریزی و اردو کے تذکرۂ یورپین شعرا میں تحریر کئے ہیں اور اُن کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ اب میں اسی تذکرے کے مطبوعہ اشعار پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

دیکھنا یہ ہے کہ صاحب نے زبان و محاورات کے علاوہ تشبیہات۔ مضمون آفرینی اور تخیل میں اپنے ہمعصر اساتذہ کا محض تتبع ہی کیا ہے یا محاسن زبان کے علاوہ محاسن معنوی کے لحاظ سے کوئی جدّت بھی کی ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا ہے کہ اہلِ مغرب اور اہلِ مشرق کے تصوّرات (شاعرانہ پابندیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے) کہاں تک ہم آہنگ ہوسکتے ہیں۔

میں نے جہاں تک غور کیا صاحب کے کلام کو بلند اور ممتاز پایا جس میں مضامین کی ندرت۔ احساسات کی بلندی۔ خودداری و استغنا اور جذبات محبّت کی شائستگی سب کچھ موجود ہے۔

ایک شراب ہی کو لے لیجئے جو اہلِ مغرب کے خاص ذوق کی چیز ہے۔ جس پر دنیا کے شعرا نے اپنے اپنے رنگ میں طبع آزمائی کی ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ مے کشی کے لطف کو بارش زیادہ فروغ دیتی ہے۔ چنانچہ بارش اور شراب پر شاید ہی کوئی شاعر ایسا بچا ہو جس نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ میں فارسی اور اردو کے شعرا کے جتنے اشعار شراب اور بارش کے متعلق دیکھے اُس میں الفاظ اور مضامین کے اُلٹ پھیر کے ساتھ کچھ فرق تو پایا۔ لیکن کسی شاعر کا خیال اس طرف نہیں گیا کہ شراب کو بارش سے کیا خاص لگاؤ ہے۔

اب آپ صاحب کا شعر ملاحظہ فرمائیں جس میں بارش اور شراب کے باہمی تعلق کی معقول توجیہہ پیش کی گئی ہے۔

کیوں مے کشوں کو الفت بارش سے ہو نہ ساقی
بارش ہے صاف جس دم لفظِ شراب اُلٹا

شراب کا ایک شعر بھی ملاحظہ ہو جس میں لفظِ غبار نے شعر میں جان ڈال کر عجیب بلاغت پیدا کردی ہے۔

بڑھا نہ کشتیٔ مے کو ابھی سے اے ساقی   کہ دل میں ابر کے اب تک غبار باقی ہے

محبوب کی ابرو کو تیغ سے تشبیہہ دے کر شعرا نے مختلف مضمون پیدا کئے ہیں مثلاً

تلوار جو ہو جائے کماں خوب نہیں ہے   ابرو میں نہ دو تان کے خم اور زیادہ
(داغ دہلوی)

کیجئے عمرِ دو روزہ عشقِ ابرو میں بسر   قطع کرنا چاہیئے شمشیر سے اس راہ کا
(امیر مینائی)

صاحب نے بھی ابرو کو تیغ سے تشبیہہ دی ہے۔ لیکن اس تشبیہہ سے جو مضامین پیدا کئے ہیں وہ قابلِ ملاحظہ ہیں۔

میں بھی فرزندِ سپاہی ہوں نہیں ڈرنے کا   تیغِ ابرو نہ بہت لے بتِ رعنا چمکا

تلوار سے سپاہی کو جو نسبت ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر نے کپتان زادہ ہونے کے لحاظ سے اصلیت کو بھی ظاہر کیا اور عشق کا وقار بھی قائم رکھا۔ دوسرا شعر

کیوں نہ مجھ کو رہے اس ابروئے خمدار سے کام
جو سپاہی ہو اُسے رہتا ہے تلوار سے کام

پہلے شعر میں خود داری تھی، دوسرے میں الفاظ تو تقریباً وہی ہیں لیکن تعلق کی ایک مستحکم دلیل پیش کی ہے۔ دونوں شعروں میں تخیل کی جدّت ہے۔

نادر تشبیہات کے علاوہ خود داری اور اعتماد علی النفس کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

برنگِ بوئے گُلِ شگفتہ، نہیں گراتی شعار اپنا
نسیم آسا کبھی نہ ڈالا کسی کے کاندھے پہ بار اپنا

نسیم کی تمثیل بے نیازی تعریف ہے۔ بار ہے بھی اور نہیں بھی۔

ہے جہل اپنا ضلالت اپنی، نتیجہ اس کا ملالت اپنی
ہے عقل اپنی کفالت اپنی، شعور اپنا شعار اپنا
اگر وہ رہتا ہے ہم سے غافل، لگائیں کیوں اس سے اپنا ہم دل
کرے وہ کیوں کار، مردِ عاقل کہ جس سے کم ہو وقار اپنا
اگرچہ دشمن ہے چرخِ گرداں، نہیں ہوں صاحب مگر ہراساں
کرے گا مشکل کو میری آساں نفیس ہے پروردگار اپنا

نیاز مندِ درِ بے نیاز ہوں صاحب   کہ جس کسی کو دیا اُس نے بے نیاز دیا
تیری خوشی کا بندہ ہوں اے حضرتِ کریم   دوزخ سے یا بہشت سے رکھتا نہیں غرض

تصوّف

دل سے تو نہیں میرے پوشیدہ ہو گئے تم   سو پردوں میں تم جانا مستور ہوئے تو کیا

نسخۂ دل کی نہ تحصیل میں مصروف ہوا   عمر ضائع کری پڑھ کنز و قدوری[1] افسوس
پیرِ نفس رہا وادیٔ الفت میں یہ دل   معنوی چھوڑ، ہوا مائلِ صوری افسوس
پرتوِ نورِ تجلیٔ شمع ہے صاحب نہیں   شکلِ انگشتِ شہادت ہے یہ دودِ رُخِ شمع

شمع کے دھوئیں کو انگشتِ شہادت سے تشبیہہ دینا تخیل کی وسعت کا شائبہ ہے۔

تسبیح کی طرف ہوں نہ زنّار کی طرف   مذہب ہے عشق میرا میں ہوں یار کی طرف
دل خانۂ خدا ہے نہ اس کو کرو تباہ   اے کافرو! ذرا تمھیں خوفِ خدا نہیں

بقا کا اور فنا کا کچھ عجب عالم یہاں دیکھا
جو مرتے ہیں وہ جیتے ہیں جو جیتے ہیں وہ مرتے ہیں

شعرا کی عام عادت ہے کہ فلاکت اور تنگدستی کی شکایت جب حد سے گزر جاتی ہے اور قصیدوں کا کاسہ اور ہجو کا تیشہ بھی ناکارہ ثابت ہوتا ہے تو فلک کج رفتار پر طعن و تشنیع کی بوچھار کرتے ہیں۔ جب اس سے بھی دل کی بھڑاس نہیں نکلتی تو بارگاہِ خداوندی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کے بعد مایوسی کے آغوش میں سو جاتے ہیں۔ لیکن صاحب کے قدم ان منازل پر پہنچ کر نہیں ڈگمگاتے۔ وہ کسی کی شکایت نہیں کرتا بلکہ ناکامی پر اپنی ذات کو قصور دار ٹھہراتا ہے۔

مہرباں سب پہ ہے وہ تو ہاں مگر   تو ہی لائقِ مہربانی کے نہیں

صاحب کسی حالت میں مایوس نہیں ہوتا اور ہر حال میں اُمید کی شمع سے دل و دماغ کو روشن رکھتا ہے۔

لَا تَقْنَطُوْ کو جان کے مایوس کیوں ہو   برباد گو فلک نے کیا خانماں تلک
بارہ برس میں پھرتے ہیں گھورے کے بھی دن   میرے بھی دن پھریں گے نہ صاحب کہاں تلک

دنیا کی ناپائیداری

عبث ہے نقش و نگارِ دنیا پہ مثلِ اطفال دل لگانا
کہ جس کے ہر نقش کا لعدم کو برنگِ تحریرِ آب پایا
شمارِ عمرِ رواں جو دیکھا تو ہم رنگ کارواں ہے
جو زندگانی پہ آنکھیں کھولیں تو صاف مثلِ حباب پایا

آجا صنم! کہ جاتی ہے فصلِ بہارِ عمر   اس چلتی پھرتی چھاؤں کا کیا اعتبار ہے

عمرِ رفتہ

خواب و خیال ہو گئے پیری میں رنگ ہے   اے عمرِ رفتہ یاد جوانی کی مت دلا

---

[1] کنز اور قدوری فقہ کی کتابوں کے نام ہیں۔

بے مہری دنیا

آنکھ بھی صاحب نہیں مجھ سے ملاتے اب وہ لوگ
بات کہہ کے ہاتھ جو لیتے تھے ہنس ہنس کر کبھی

حُسن و عشق

نگاہِ پاک سے اس بُت کو دیکھا دل کیا راضی
ہے قولِ پاکبازاں دیدہ بازی اور خدا راضی

نگاہ کے ساتھ پاک کی قید نے نظارے کی معقول وجہ جواز پیدا کر دی اور ایک ضرب المثل نے تائید بھی کر دی۔

جس میں بُرائی ہی وہ تو نیک ہیں   پھر نیک ہو کے کہتے ہیں وہ کیوں بُرا مجھے

اس طرزِ تخاطب کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مقصود تو محبوب سے شکایت کرنا ہے لیکن خطاب اپنی ذات سے کر کے مضمون کو زیادہ مؤثر بنا دیا۔

پوچھا جو مجھ سے یا منے تیرا صنم ہے کون   دل آ کے اس کے روبرو آئینہ بن گیا

سوال کے جواب کا انداز نیا اور لطیف ہے۔

سو گئے پاؤں مرے جب کہ بُلایا اُس نے   بخت جاگا تو مجھے لغزشِ پا نے مارا

طور و کلیم

اس دور کے مدح گو شعراء کے لئے یہ بات لازمی ہو گئی تھی کہ وہ ممدوح کے اوصاف کے علاوہ اُس کے ہاتھی، تلوار اور گھوڑے کی بھی تعریف کریں تاکہ اُن کی مضمون آفرینی اور کمالِ مشق سخنی کا اندازہ ہو سکے۔ چنانچہ ہاتھی کی تعریف میں مختلف شعراء نے طبع آزمائیاں کی ہیں۔ اور ہاتھی کی تشبیہ بلحاظ جسامت و رنگ اکثر کوہِ طور سے دی ہے۔

شاہ نصیر دہلوی فرماتے ہیں۔

عماری کی کہوں کیا شان اس کوہِ تجمل پر   تجلی نور کی ہے طور پر، موسیٰ ہے لمعانی

میر یار علی جان صاحب ریختی گو فرماتے ہیں۔

عجب ہے نور کی صورت خدا کی قدرت ہے   کلیم کلب علی خاں ہیں، طور ہے ہاتھی

اب صاحب کا شعر ملاحظہ ہو جس کا تعلق کسی ممدوح سے نہیں ہے۔

دیکھ کر ہاتھی پہ مجھ کو ساتھ اُس کے بولے لوگ   یہ تجلی ہے، یہ موسیٰ ہے، یہ کوہِ طور ہے

میری رائے میں تشبیہ ہمہ جہت مکمل اور بالکل اچھوتی ہے جس کا جواب موجودہ شاعری میں کم ملے گا۔ یہ تشبیہ مغربی دماغ کی آزادی کا آئینہ اور قوتِ تخیلہ کا شاہکار ہے۔

اب میں چند غیر مطبوعہ اشعار پیش کرتا ہوں جو قلمی تذکرۂ شعرائے رام پور مصنفہ جارج فانتوم موجودہ کتاب خانہ سرکاری رام پور سے نقل کئے گئے ہیں۔

لب وا ہوئے نہ تھے کہ وہیں ایک بوسہ میں   مختوم و ختمِ گلۂ یک دگر ہوا

یوں تو اس دور میں کوئی شاعر ایسا نہ تھا جس نے بوسے پر طبع آزمائی نہ کی ہو۔ لیکن صاحب نے مصرعِ ثانی میں جس انداز سے بوسے کے نتیجے کو ظاہر کیا ہے وہ بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگر بوسے کو مغربی تہذیب کا ایک جزو قرار دیا جائے تو رکاکت کا پہلو بھی نظر انداز ہو جاتا ہے۔

ابروئے یار ہی کیا تیرا مقرر ہے لے دل
کیا یہیں تُو نے ہی لعل اپنا گرا دیکھ لیا

محاورے میں لفظ "نال" ہے۔ اس سے ابرو سے تشبیہ دیتے وقت صاحب کو دانستہ یا نادانستہ محاورے میں تغیّر کرنا پڑا ہے، جو درست نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ تشبیہ کے قصّے کو نہ چھیڑا جائے بلکہ محاورے کی معنوی حیثیت کو برقرار رکھا جائے۔

خامشی غنچے کی ہے اُس کے دہن کی تعریف
لال ہے گُل کی زباں، ہے یہ بدن کی تعریف

خاموشی کا لفظ بلاغت سے خالی نہیں۔ تعریف کی انتہا یہی ہے کہ تعریف نہ ہو سکے۔ لال کا لفظ بھی معنی خیز ہے۔

دل جب آتا ہے نہیں رہتی تمیزِ زشت و خوب
سچ ہے قولِ اہلِ بینش عشق "مُقری کور" ہے

مُقری کور (مادر زاد اندھا حافظِ قرآن) کی تشبیہ قدرتِ کلام اور وسعتِ معلومات کی شاہد ہے۔

چڑیوں کا وقتِ شام بسیرا ہے شاخ پر
دل ہائے پُرفغاں نہیں گیسوئے یار میں

نئی تشبیہ ہے۔ لفظ "پُرفغاں" نے چڑیوں کی چہچہاہٹ کا سماں دکھایا۔ گیسو کے ساتھ شام کا لفظ بھی رعایت سے خالی نہیں۔

عکسِ رُخ سے اک عجب عالم دوپٹے کا تھا رات
لہر لہر آبِ رواں کی بن گئی تھی جوئے شمع

لفظی مناسبات اور رعایتیں تو ظاہر ہی ہیں۔ شمع کی ردیف کے ساتھ "جوئے" کا قافیہ جتنے مستحکم ثبوت کے ساتھ لایا گیا ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔

زکی انور

چلم

اُس دن بھی پروفیسر صاحب بہت خوش خوش نظر آ رہے تھے۔

شادی کے فوراً ہی بعد سے اُن میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی تھی اور اب محض چھ مہینے میں وہ پہلے سے بہت بدل گئے تھے۔

شادی سے پہلے وہ اکثر اُداس اُداس اور کھوئے کھوئے سے نظر آتے تھے۔ اور ور آنحالیکہ وہ کیمیا کے پروفیسر تھے لیکن اکثر وہ لیکچر دیتے دیتے یا عملی کلاس میں کیمیا دی نسخے بناتے بناتے یک لخت زندگی، موت، محبت اور نفرت پر باتیں کرنے لگتے اور کبھی کبھی حد درجہ جذباتی انداز میں کہتے۔

"محبت ایک مقدس جذبہ ہے جو خدا کی طرف سے انسان کو ایک بے مثال عطیے کے طور پر ملتا ہے"

اُنھیں کھیل کود یا سیاست سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ البتہ ہندوستانی فلمیں دیکھتے تھے۔ سگریٹ پیتے تھے اور کبھی کبھی ایک آدھ غزل موزوں کر لیتے تھے۔ اور کالج کے تاڑنے والے طالب علموں نے یہ اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ وہ ضرور کسی سے محبت کرتے ہیں۔

مگر اب، شادی کے بعد وہ یک لخت بدل سے گئے تھے، اُن میں پتا نہیں کہاں سے زندہ دلی آگئی تھی۔ کبھی کبھی سیاسی باتیں بھی کر لیتے تھے۔ وہ کالج کے سارے کھیلوں سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ اور کرکٹ کے تو شیدائی بن گئے تھے اور محض چھ مہینے میں اُن کا فرسٹ کلاس باؤلر بن جانا بے شک ایک حیرت انگیز بات تھی۔ اُن کے شوق اور اُن کی دلچسپیاں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ساری چیزیں اُن میں پہلے ہی سے موجود تھیں، پر راکھ کے اندر دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح۔ طالب علموں سے وہ اس قدر گھل مل کر اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے تھے جیسے ایک دوست دوسرے دوست سے باتیں کرے۔

اور کالج کے پرنسپل سے لے کر طالب علموں تک بلکہ کالج میں جھاڑو دینے والا چپراسی بھی یہ بات جانتا تھا کہ پروفیسر صاحب نے عشقیہ شادی کی ہے۔

اور اُس دن بھی پروفیسر صاحب بہت خوش خوش نظر آ رہے تھے۔

گھنٹی بجی ——

اُنھوں نے سگریٹ، جو اب انگلیوں تک جل رہا تھا، ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ اپنی الماری کھول کر فورتھ ایر سائنس کے کیمیا کے طلّاب کا رجسٹر نکالا۔ میز کی دراز کھینچ کر ایک پتلی سی کاپی اور ایک موٹی سی کتاب لی۔ پھر اُنھوں نے پہلے میز کی دراز اور الماری بند کی اور پروفیسروں کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ مسکرا رہے تھے اور مسکرانے سے زیادہ کچھ سوچ رہے تھے، اور مسکرانے کے ساتھ کچھ سوچنے سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ ضرور بہت ہی مزے دار بات سوچ رہے ہیں۔

اور جب وہ کلاس میں داخل ہوئے تو سوچ نہیں رہے تھے۔ مگر مسکرا اب بھی رہے تھے اور اسی مسکراہٹ کے ساتھ اُنھوں نے رجسٹر، کتاب اور کاپی میز پر رکھ دی اور کھڑے مسکراتے رہے۔

کلاس کے سارے لڑکوں نے پہلے اپنی بغل والے لڑکے کا اور پھر اپنے آپ کا جائزہ لیا۔ کہیں اِس میں تو کوئی بات نہیں؟ کہیں مجھ میں تو کوئی بات نہیں؟ مگر کسی میں کوئی بات نہیں تھی۔ لڑکے مطمئن ہو گئے کہ پروفیسر صاحب تو اب اکثر مسکرایا کرتے ہیں۔

پیچھے ڈسک پر دو لڑکے بیٹھے تھے۔ ایک کی ناک پر ریم لس عینک تھی اُس کی مانگ سیدھی تھی اور وہ ہلکے سبز رنگ کی ہوائی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ دوسرے کے سر پر گاندھی ٹوپی تھی۔ وہ کھادی کا کُرتا پہنے تھا۔ ریم لس عینک والا لڑکا اپنا مُنہ گاندھی ٹوپی والے لڑکے کے کان کے پاس لے گیا۔ اور بہت آہستہ سے بولا۔

"آج بہت موڈ میں سرکار نظر آ رہے ہیں"

دونوں لڑکے مسکرانے لگے ۔

پروفیسر صاحب نہایت ہی شاندار انداز سے کرسی پر بیٹھ گئے ۔ اور ایک عجیب انداز سے رجسٹر کھول کر جیب سے فونٹین پن نکالا اور طالب علموں کی حاضری لینے لگے ۔ اور جب حاضری لے چکے تو وہ کسی جلسے کے صدر کی طرح بہت ہی تمکنت کے ساتھ کرسی سے اُٹھے اور کہنے لگے ۔

"کم سے کم پڑھانے کے موڈ میں آج میں بالکل نہیں ہوں ——"

وہ ذرا رُکے اور ریم لس عینک والے لڑکے نے گاندھی ٹوپی والے لڑکے کے کان میں پھر کچھ کہا جس پر وہ دونوں پھر مسکرانے لگے ۔ پروفیسر صاحب پھر کہنے لگے ۔

"ہمیشہ پڑھتے ہی رہنا کوئی بہت اچھی بات نہیں ۔ زندگی کی تعمیر میں گپ شپ کا بھی بہت حصّہ ہے ۔ آج کا موضوع دوسرے دن پر رکھتا ہوں اور آج میں ہی آپ لوگوں سے کچھ سننا چاہتا ہوں ۔"

ایک لڑکا جو صورت شکل سے شاعر سا معلوم ہوتا تھا ، گھبرانے لگا ۔

اُس کے پیچھے والے ، کالی عینک والے لڑکے نے آہستہ سے کہا ۔

"کوئی شان دار سی نظم فرما تو دو پٹھے ——"

صورت شکل سے شاعر معلوم ہونے والے لڑکے کا سینہ تقریباً غیر ارادی طور پر تن گیا ۔ وہ کچھ کہنے والا ہی تھا کہ پروفیسر صاحب پھر کہنے لگے ——

"ہماری روزمرّہ کی زندگی میں کبھی ایسا واقعہ بھی رونما ہوتا ہے جس کی یاد ہماری زندگی میں رچ بس جاتی ہے ۔ اور جس واقعے کو ہم کبھی نہیں بھُلا سکتے ۔ اُسے ہم زندگی کا اہم ترین واقعہ کہتے ہیں ۔ کبھی یہ واقعہ زندگی کا حسین ترین واقعہ ہوتا ہے ۔ اور کبھی اُس میں جمالیاتی پہلو نام کو بھی نہیں ہوا کرتا ۔ اوّل الذکر کو ہم یقیناً حد سے زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ اور تمنّا کرتے ہیں کہ ایسا واقعہ ہر روز ہوا کرے —— اور آج میری خواہش ہے کہ میں آپ لوگوں میں سے کچھ لوگوں کی زندگی کے حسین ترین واقعات سنوں ، کیا آپ سُنا سکتے ہیں ؟"

چند ہاتھ اُٹھ گئے اور پروفیسر صاحب کی آنکھوں کے اشارے سے ایک طالب علم کھڑا ہوا اور کہنے لگا ۔

"میری زندگی کا حسین ترین واقعہ میرا کلکتے کا سفر تھا ۔ کیونکہ میں اُس سفر میں ہوائی جہاز سے کلکتے گیا تھا ۔"

دوسرے نے کہا ۔

"پندرہ اگست سنہ ۴۷ء میری زندگی کا بہترین اور حسین ترین واقعہ ہے ۔ جس کی یاد میری نس نس اور میری روح میں زندگی بھر رچی رہے گی ۔"

پروفیسر صاحب ذرا اُکتائے سے نظر آئے اگر تیسرا لڑکا کھڑا نہ ہو جاتا تو وہ اُس وقت ضرور اپنا قول دوہراتے —— چاہے زندگی اور سیاست کا کتنا ہی گہرا تعلق کیوں نہ ہو ۔ پر سیاست زندگی میں گھُل مِل نہیں سکتی ۔ اور تیسرا لڑکا کہنے لگا ——

"مجھے اپنی زندگی کا حسین ترین واقعہ وہ لگتا ہے ، جب میں ایک نوجوان لڑکی کو چند غنڈوں کے ہاتھوں سے چھیننے میں کامیاب ہو گیا تھا ۔"

صورت شکل سے شاعر نظر آنے والا لڑکا کھڑا ہوا ۔

"میں اُس وقت کو اور اُس وقت کے حُسن اور اُس کی اہمیت کو کبھی نہیں بھُول سکتا جب مجھے کُل ہند مشاعرے میں بے انتہا پسند کیا گیا تھا ۔"

پروفیسر صاحب بے دلی سے ہو کر پانچویں ہاتھ کی طرف دیکھنے لگے ۔ اُس ہاتھ میں سونے کی ایک گھڑی چمک رہی تھی اور پروفیسر صاحب کا اشارہ پا کر ریم لس عینک والا لڑکا اُٹھا ——

"میری زندگی میں ہر روز ایک حسین ترین وقت آتا ہے ، اور میں محسوس کرتا ہوں ، میں شاید اُن گنے چنے خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جن کا محبوب ترین منظر روز اُن کے سامنے آتا ہے ۔" وہ رُک گیا ۔

"ذرا تفصیل سے کہئے ——" پروفیسر صاحب کرسی پر بیٹھ گئے ۔

"لیکن ——" وہ لڑکا کہنے لگا —— "میرے اس واقعے کا تعلق میری ایک مختصر سی کہانی سے ہے اور بغیر واقعہ بیان کئے میری زندگی کے اس خوبصورت واقعے کی کوئی قدر نہیں ۔ اس کی تفصیل میں کچھ بھی مزا نہیں ——" وہ اجازت طلب انداز میں رُک گیا ۔ پروفیسر صاحب نے اپنی گھڑی دیکھی ۔ پھر بولے ۔

"آپ اپنی کہانی سُنا سکتے ہیں ——"

لڑکے نے بھی اپنی گھڑی دیکھی ، پھر ذرا شرما کر بولا ——

"بات یہ ہے سر ، کہ میری کہانی قدرے ......" لڑکا رُک گیا ۔

پروفیسر صاحب ذرا مسکرائے ، پھر کہنے لگے ۔

"یہ بات میں اس طرح سمجھ رہا ہوں میرے دوست ! کہ ایک نوجوان کی ایک ایسی کہانی میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا ۔ جو کہانی اُس کی زندگی کا ایک حسین ترین واقعے کا منبع ہو ۔ لیکن سُنئے تہذیب اور تمیز کے دائرے میں

آپ مجھے وہ سب کچھ بتا دیجیے جو آپ اپنے ایک دوست کو بتا سکتے ہوں۔"

ریم لیس عینک والے لڑکے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بیشک اُس کے چہرے پر ذرا سی گھبراہٹ بھی تھی۔ مگر یہ گھبراہٹ جلد ہی دُور ہوتی نظر آئی، اور شاعر نما لڑکا حسرت بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ آگے کی سیٹوں پر دو تین لڑکوں نے موٹی موٹی کتابیں کھول رکھی تھیں اور ماحول سے بے خبر پڑھے جا رہے تھے۔ پروفیسر صاحب نے اُنھیں ایسی نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں "کیا بد ذوقی ہے؟"

اور ریم لیس عینک والے لڑکے نے کہنا شروع کیا —

"جناب کی اجازت پاکر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں نے آج سے تین سال پہلے ایک لڑکی سے عشق کیا تھا۔۔۔"

دوسرے لڑکے اُسے عجیب انداز سے تکنے لگے اور وہ کہتا رہا۔

"۔۔۔۔۔ عشق کے بارے میں میں تفصیل سے نہیں کہوں گا۔ البتہ یہ بتا دوں گا کہ میں نے اُس سے عشق شروع کیوں کیا؟ اِس کی کئی وجہیں تھیں، ایک تو یہ کہ گھر میں اُس کی ماں اور چھوٹے بھائی کے علاوہ اُس کا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ دوسری یہ کہ اُس کا گھر میرے گھر کے آمنے سامنے تھا ان دو سہولتوں کی وجہ سے عشق کرنے میں اور کئے جانے میں آسانیاں تھیں اور باقی وجہیں جمالیاتی اعتبار سے بہت ہی اہم تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ یہ کہ وہ عموماً سفید بلاؤز اور نیلی ساری پہنتی اور ٹھیک ایسی نظر آتی جیسے جھیل کے ہلکے نیلے پانی میں کنول کا صاف شفاف پھول۔ اور نہیں تو پھر نیلے آکاش میں پورنما کا چاند۔ ایک اور بات اُس کی مجھے بہت پسند تھی اور وہ بات یہ تھی کہ اُسے عوامی ادب سے دلچسپی تھی اور اُن دنوں میں بھی عوامی سرگرمیوں سے دلچسپی لیا کرتا تھا۔" وہ ذرا سا رکا اور کلاس کے زیادہ تر لڑکوں نے اُسے پیچھے مڑ مڑ کر عجیب انداز سے دیکھا لیکن پروفیسر صاحب کے چہرے پر اُکتاہٹ کے نقوش اُبھر آئے تھے۔ اور یہ صاف پتا لگتا تھا کہ وہ ایک شاگرد کو اپنی عشقیہ داستان سُنانے کی اجازت دے کر پچھتا رہے ہیں۔ لڑکا پھر کہنے لگا۔

"غرض یہ کہ میں اُس سے محبت کرتا رہا۔ اور اُس نے کچھ دن تک تو مجھ سے نفرت کی، پھر محبت کرنے لگی۔ لیکن یہاں میں محبت کی پُر پیچ وادیوں پیچیدہ پگڈنڈیوں اور قدم قدم کی رکاوٹوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔

انجام یہ ہوا کہ میں اپنے آپ کو دُنیا کے بہت کم خوش قسمتوں میں سے ایک گِننے لگا اور میری شادی اُس لڑکی سے ہو ہی گئی جس سے مجھے پیار تھا۔"

دو ایک لڑکے ہنس دئے اور کئی لڑکوں نے اور بھی متعجب نظروں سے اُسے دیکھا۔ کیونکہ اُن کے خیال میں یہ ہنسوڑ اور بے فکرا لڑکا چھپا رستم بھی نکلا۔ دوسرے شادی شدہ لڑکے اکثر اپنی بیوی کے حالات، اُس کے ذوق اور اس کی دلچسپیوں کے بارے میں بیان کیا کرتے تھے۔ مگر اُس نے تو آج تک یہ بھی نہیں بتایا تھا اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ تھی، کہ اُس نے اِس قول کو غلط ثابت کر دیا تھا کہ عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپ سکتے۔ کم سے کم عشق کو تو اُس نے تین سال تک چھپائے رکھا تھا لیکن پروفیسر صاحب بہرحال اُس کی کہانی سے کوئی خاص دلچسپی لیتے نظر نہیں آرہے تھے۔

وہ لڑکا پھر کہنے لگا۔

"مجھے اپنی بیوی سے بے انتہا محبت ہے اور وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں فسردہ کبھی نہیں رہتا۔ اور اب بھی جب کبھی وہ اپنی پسندیدہ ساری اور بلاؤز پہنے، کوچ پر آدھی لیٹی ہوئی کوئی کتاب پڑھتی ہے، تو وہ بڑی حسین معلوم ہوتی ہے، اور مجھے اپنی پُرانی شاعری یاد آجاتی ہے جھیل کے نیلے پانی میں کنول کا سفید صاف شفاف پھول نہیں تو پھر نیلے آکاش میں پورنما کا چاند —— پورنما کا چاند۔۔۔"

وہ لڑکا رومال سے اپنا پسینہ خشک کرنے لگا۔ اور بجلی کے پنکھے کے باوجود پروفیسر صاحب کو بھی پسینہ آگیا تھا۔ کوئی اُستاد خواہ کتنا ہی کم سن بلکہ اور دوست طبیعت ہو یہ بات ذرا مشکل ہی سے برداشت کر سکتا ہے کہ اُس کا شاگرد اُس کے سامنے اپنی پریم کتھا کہے۔ مگر خود پروفیسر صاحب ہی نے تو اُسے اجازت دے رکھی تھی۔ اور شاید اسی بات سے وہ پریشان سے تھے — آگے کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے پڑھاکو لڑکوں نے پٹاخ پٹاخ اپنی اپنی کتابیں بند کر دیں۔ جیسے اب وہ عاجز آگئے تھے اور شاعر نما لڑکا کوئی مصرع موزوں کر رہا تھا اور ریم لیس عینک والا لڑکا پھر کہنے لگا۔

"لیکن اب تک میں نے جو کچھ بھی کہا یہ تو صرف تمہیدی کہانی تھی جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ اپنی زندگی کا حسین ترین واقعہ بیان کرنے کے لئے مجھے تمہیدی کہانی کہنی ہوگی —" وہ ذرا رُکا۔ پھر کہنے لگا۔

"اب میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ شاید آپ لوگوں میں سے بہت کم کو یہ علم ہوگا کہ مجھے حقہ پینے کی عادت ہے۔"

زیادہ تر لڑکے ہنسنے لگے اور پروفیسر صاحب بہت غصّے نظر آئے۔ بات بھی غصّے کی تھی۔ اب وہ اپنی عادتیں بیان کرنے لگا تھا۔ اور عادتوں میں پتا نہیں وہ کیا کیا باتیں بیان کرے گا۔ لیکن وہ کچھ بولے نہیں اور اُس لڑکے نے اپنا بیان جاری رکھا۔

"یہ عادت مجھے سنہ ۱۹۱۲ء سے لگی ہے۔ اُس وقت میں اُنیس برس کا تھا۔ اور نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ لیکن غلط تربیت نے مجھے سگریٹ کا عادی بنا دیا تھا۔ حالانکہ اُس وقت مجھے سگریٹ کا اِملا بھی ٹھیک سے معلوم نہ تھا، اور میں سُوٹ بھی پہنا کرتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء میں میرے چند دوستوں نے قسمیں کھائیں کہ وہ انگریزی تہذیب اور اخبارات سے نفرت کریں گے۔ انہیں کے ساتھ میں نے بھی قسم کھالی اور خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہوگیا۔ کھدر کے پاجامے اور قمیصیں سلوائیں اور پہننے لگا۔ اور سوٹوں کو بڑے احتیاط سے بکس میں بند کر دیا۔ اور سگریٹ کے بدلے حقہ پینا شروع کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ جلد ہی خون کے دھبّے چھُوٹ گئے، اور میں انگریزی اخبار بھی پڑھنے لگا۔ سگریٹ بھی پینے لگا اور سوٹ بھی پہننے لگا۔ لیکن حقّے کی عادت لگی ہی رہ گئی، اور میں نے ہر روز رات کے وقت حقہ پینا جاری رکھا ——"

اب کے وہ بھی مسکرانے لگا۔ اور اُس کے بغل والے، گاندھی ٹوپی والے لڑکے نے کچھ دیر تک ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے ہنسی ضبط نہ ہوسکی اور وہ منہ پر رومال رکھ کر ہنسنے لگا۔ پروفیسر صاحب جلدی جلدی اپنی کلائی گھما گھما کر گھڑی دیکھتے رہے۔ جیسے اب وہ اس کہانی سے بہت اُکتا گئے تھے۔ اور چاہ رہے تھے کہ کب گھنٹی بجے اور وہ بھاگیں۔

ریم لس عینک والا لڑکا کہنے لگا ——

جب میری بیوی بیاہ کر آئی تو چند دن تک تو وہ چڑیا خانے کی کوئی جانور بنی رہی —— سمٹی سمٹائی کمرے میں بند۔ محلّے پڑوس کی عورتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ آتیں اور میری بیوی کی زیارت کر کے جانے لگتیں تو میری ماں سے کہتیں —— "بہن! بہو تو بس پُورنما کا چاند ہے ——" اور میں سورج کی طرح دمکنے لگتا —— آخر یہ سلسلہ کب تک قائم رہے گا!"

کچھ لڑکے عجیب انداز سے ہنس دیئے اور اب کے پروفیسر صاحب بھی مُسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"اور جب ساری عورتیں زیارت کر چکیں ——" وہ پھر کہنے لگا —— "تو مجھے اپنی بیوی سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ اُس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ گھر کے سارے لوگ سوئے پڑے تھے۔ صرف ہم دونوں بالائی منزل کے ایک کمرے میں جاگ رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے مجھے حقّے کی سُوجھی۔ مگر یہ بات بے شک بالکل عجیب سی ہے کہ میں حقّہ ضرور پیتا ہوں۔ لیکن مجھے چلم بھرنا نہیں آتا۔ یہ کام میرا چھوٹا بھائی انجام دیتا ہے یا پھر گھر کا کوئی اور چھوٹا لڑکا۔ مگر اُس وقت تو سب کے سب سو چکے تھے۔ اور میرا حقّہ پینے کا موڈ تھا کہ دائم و قائم تھا۔ اُس وقت میری بیوی اپنی ایک سہیلی کا تذکرہ کر رہی تھی، جو اُسے بہت پیاری تھی —— میں اچانک بول اُٹھا ——

"تمہاری فیملی میں کوئی حقّہ پیتا ہے؟" وہ بے تحاشہ ہنس پڑی ——"

ریم لس عینک والا لڑکا خود بھی مسکرانے لگا۔ اور دوسرے لڑکے بھی ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر تک پروفیسر صاحب اُسے بہت غور سے دیکھتے رہے۔ پھر جلدی سے بولے۔

"اچھا پھر کیا ہوا؟ ——"

اور ریم لس عینک والا لڑکا آگے کہنے لگا ——

"میری بیوی دیر تک ہنستی رہی، پھر بولی —— "آخر اس بے موقع سوال کا مطلب؟" میں نے کہا —— "کوئی بات نہیں، یوں ہی پوچھ رہا ہوں، کیوں؟ پیتا ہے کوئی؟" "کیوں میرے منہ سے حقّے کے تمباکو کی بُو تو نہیں آ رہی ہے؟" وہ ہنستی ہوئی بولی —— "دادا پیتے تھے، اور دادی اب تک پیتی ہیں، لیکن اب میرے موجودہ گھر میں تو کوئی بھی حقہ پینے والا نہیں" —— میں نے کہا —— "تم نے دادا اور دادی کے لئے چلمیں تو ضرور بھری ہوں گی؟" وہ بے تحاشہ ہنس پڑی ——"

کلاس کے لڑکے پھر ہنسنے لگے اور پروفیسر صاحب نے پھر رومال نکال کر پسینہ خشک کیا —— لڑکا پھر کہنے لگا۔

"میری بیوی بولی —— "ہاں چلم بھرنا آرٹ تو بے شک ہے۔ مگر مجھے یہ آرٹ معلوم ہے، کیوں بات کیا ہے؟" —— میری تو باچھیں ہی کھل گئیں۔ میں نے کہا —— "تو کیا مہربانی کر کے ایک چلم مجھے بھی اس وقت عنایت کر سکتی ہو؟" —— "اوہ جناب کو حقّے سے بھی شوق ہے؟" وہ جاپانی گڑیا کی طرح

چھن چھنا کر ہنسی اور پھر ہنستے ہنستے بولی —"اچھا ابھی لائی"— وہ نیچے چلی گئی اور میں کمرے سے باہر نکل کر چھت پر ٹہلنے لگا۔ پھر چھت ہی پر پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا — چاندنی ساری چھت پر ادھر اُدھر پھیلی ہوئی تھی۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی اور میری بیوی کے میکے میں گراموفون بج رہا تھا۔ نیچے میری بیوی گڑگڑا گڑگڑا کر کے حقے کے گُڑگُڑے میں ضرورت بھر پانی کا اندازہ کر رہی تھی۔ میں یوں ہی اوٹ پٹانگ گنگنانے لگا — چند منٹ کے بعد میں نے نیچے کی طرف نظر کی تو اب میری بیوی ٹکیہ سلگا کر چلم میں بھر چکی تھی اور اُسے پھونک مار مار کر دہکا رہی تھی — اور بس پھر کیا بتاؤں جناب — اُف — میں کیا عرض کروں ...."

داستان گو نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔ اور عجیب ڈرامائی انداز میں چند لمحوں تک گم سم کھڑا رہا۔ پروفیسر صاحب اب بہت زیادہ اُکتا گئے تھے اور حد سے زیادہ بوکھلائے ہوئے سے بھی لگ رہے تھے اور سارے لڑکے آگے سننے کے لئے بہت بے تاب نظر آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک لڑکے نے بڑی بے صبری سے حد درجہ جذباتی انداز میں پوچھا—

"پھر کیا ہوا؟"

ریم لس عینک والے لڑکے نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا اور پھر لڑکوں ہی کی طرف مخاطب ہوا۔

"پھر! آہا ہا —" وہ ذرا رُکا —" پھر کیا بتاؤں ساتھیو — ارے تم ناقدرو کیا جانو حُسن کیا شے ہے — اُف اپنی زندگی کا وہ حسین ترین واقعہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میری بیوی چلم کی آگ پر پھونک مارتے وقت کتنی حسین نظر آ رہی تھی — میں اندازہ ہی نہیں کر سکتا ہوں کہ دنیا میں کوئی چیز اتنی بھی حسین ہو سکتی ہے؟ جب وہ چلم پر پھونک مارتی تو آگ کے شعلوں کی لالی اُس کے مکھن کے سے صاف شفاف چہرے پر اتنا ناقابلِ بیان اور اتنا خوب صورت رنگ دوڑاتی کہ میں پریشان ہوں کہ اُس منظر کو کس طرح یہاں بیان کروں۔ شام کی سُرخ شفق کی مثال بھی ناکافی ہے اور طلوع ہوتے ہوئے سورج کی سُرخی سے بھی میں اُس سُرخی کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتا — میرا خیال ہے اور میرا خیال بالکل درست ہے کہ دنیا بھر میں کوئی ایسا ادب نہیں، کوئی ایسی شاعری نہیں جو میری بیوی کے اُس وقت کے حُسن کی صحیح ترجمانی کر سکے جب وہ چلم پر سُلگتی ہوئی ٹکیوں کو پھونک مار رہی تھی۔ کوئی تشبیہ نہیں ملتی میرے ساتھیو۔ کوئی استعارہ نہیں ملتا —"

"عارضِ گُلگوں —" صورت شکل سے شاعر نظر آنے والے لڑکے نے اپنی بغل کے لڑکے کے کان کے نزدیک بہت آہستہ سے کہا —" آہا عارضِ گلگوں"

"اٹھارویں صدی کا انسان —" اس کے بغل والے لڑکوں نے کہا اور شاعر نما لڑکا کھسیانا سا ہو کر چپ ہو گیا۔

"کہانی ہو گئی ختم؟ —" پروفیسر صاحب نے جلدی سے پوچھا، اور گاندھی ٹوپی والا لڑکا رومال سے منہ چھپا کر ہنسنے لگا۔

"ہاں جناب —" داستان گو نے کہا —" کہانی ختم ہو گئی، اور بس، میری زندگی کا وہ حسین ترین لمحہ جو میری رُوح میں، جو میری زندگی میں رچ بس گیا ہے، یہی ہے کہ ہر روز شام کے وقت ٹہل گھوم کر واپس آتا ہوں تو کھانے پینے کے بعد میری بیوی چلم بھرتی ہے، اور میں اُسے ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہوں۔ اور جب وہ چلم پر پھونک مارتی ہوئی میری طرف بڑھتی ہے تو جیسے مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو واقعتاً ایسا ہوا ہے کہ میں غش کھاتے کھاتے بچا ہوں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں دُنیا کے اُن چند اِنے گنے خوش نصیبوں میں سے ہوں جن کی زندگی کا حسین ترین واقعہ ہر روز پیش آیا کرتا ہے۔ اب میں جھیل کے نیلے پانی میں تیرتے ہوئے کنول کے سفید اور صاف شفاف پھول کو ایک حد تک بُھول چکا ہوں۔ پھر بھی کبھی کبھی اپنی محبت کے بیتے دن مجھے یاد آ ہی جاتے ہیں۔ اور میں اپنی بیوی کو پھر وہی مقدس پھول بن جانے کو کہتا ہوں۔ اگر وہ موڈ میں ہوتی ہے تو فوراً ہی نیلی ساری اور سفید بلاؤز پہن لیتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ چڑ کر انکار بھی کر دیتی ہے۔ پر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ جب میں کالج سے واپس جا کر دیکھتا ہوں تو وہ نیلی ساری اور سفید بلاؤز پہنے کوچ پر آدھی لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ اور میرے چلے آنے کے بعد یقیناً اُسے میری خواہش پوری نہ کرنے کا افسوس ہوتا ہے اور وہ نادم ہو کر کنول کا مقدس پھول بن جاتی ہے۔ کنول کا مقدس پھول یا نیلے آکاش میں پورنما کا چاند... مگر... اُف — وہ چلم پر کی آگ کو پھونک مارتے وقت سے زیادہ حسین کبھی نظر نہیں آ سکتی، اور نہ دنیا بھر میں ویسی حسین چیز میں نے دیکھی ہے — اُف — میں کیسے بتاؤں — اُف ...."

وہ حد سے زیادہ جذباتی ہوتا جا رہا تھا۔ اور پتہ نہیں وہ اور کیا کیا

بکتا رہتا۔ مگر اسی وقت گھنٹی بج گئی۔ پروفیسر صاحب بوکھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کلاس سے باہر نکلنے لگے۔ بوکھلاہٹ میں وہ رجسٹر، کتاب اور کاپی لینا تک بھول گئے تھے۔ دروازے کے پاس سے واپس آکر اُنھوں نے جلدی جلدی تینوں چیزیں بٹورنے کے انداز میں اُٹھائیں اور تیزی کے ساتھ کلاس سے باہر چلے گئے۔

سارے لڑکے کلاس سے نکل کر اِدھر اُدھر چلے گئے اور ریم لیس عینک والا لڑکا، گاندھی ٹوپی والے لڑکے کے ساتھ مل کر زور زور سے ہنسنے لگا۔

پروفیسر صاحب نے پروفیسروں کے کمرے میں جا کر رجسٹر، کاپی اور کتاب کو زور سے میز پر پٹک دیا، اور عجیب خالی الذہن سے، کرسی پر دھم سے گر کر تین روز کا باسی اخبار اُٹھا کر دیکھنے لگے۔ پھر جب اُنھیں یہ احساس ہوا کہ یہ تین روز کا باسی اخبار ہے تو اُنھوں نے اخبار کو میز پر رکھ دیا اور سگریٹ سلگا کر کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ اچانک اُنھیں کچھ یاد آیا، اور اُنھوں نے میز پر سے کوئی کاغذ اُٹھا کر پڑھا۔ اب اُن کا کوئی کلاس نہ تھا۔ اُنھوں نے اپنی سائیکل جو کمرے ہی میں ایک کنارے رکھی ہوئی تھی، تھامی اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ باہر دروازے پر آئے تو دیکھا کہ اُن کا چھوٹا بھائی جو چوتھے سال میں آرٹ پڑھتا تھا تیسرے سال کے ریم لیس عینک والے لڑکے کے ساتھ کہیں جا رہا ہے۔ پروفیسر صاحب کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔

سڑک پر آکر وہ اپنے مکان کی طرف چل پڑے۔ اُن کا سر جھکا ہوا تھا، اور یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ کوئی بہت ہی اہم بات سوچ رہے تھے۔ یا کسی حد سے زیادہ پیچیدہ گتھی کو سلجھا رہے تھے۔ وہ بالکل بے ہوش سے نظر آ رہے تھے۔ اور اسی بے خودی میں ایک مرتبہ تو وہ موٹر سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ اور دوسری مرتبہ بائیں طرف مُڑنے کے بدلے سیدھے ہی چلتے رہے، اور جب اُنھیں ہوش آیا تو بہت دُور سے واپس لوٹنا پڑا۔

گھر پہنچ کر پروفیسر صاحب سیدھے بڑے ہال یا اپنے اور اپنی بیوی کے مطالعے کے کمرے کی طرف گئے۔ اُنھیں بدحواس سا دیکھ کر اُن کی بیوی چیخنے کے انداز میں بولی۔

"کیا بات ہے۔ آخر اتنی وارفتگی کیوں؟ آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ بات کیا ہے؟"

مگر پروفیسر صاحب نے کیوں یا کیا کا جواب نہیں دیا، اور تیز تیز قدم بڑھاتے ہال کے اندر گھس گئے، اُن کی بیوی بھی داخل ہوئی اور گم سُم کھڑی رہی۔

پروفیسر صاحب نے باہر کی طرف کھلنے والی بڑی کھڑکی کو، جو باہر سے بہت ہی نیچے کی طرف تھی اور جس کے ذریعے سے باہر سے کھڑے ہو کر گھر کا بہت زیادہ حصہ دیکھا جا سکتا تھا ایک جھٹکے کے ساتھ کھٹاک سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

"لفنگے — بے ہودے —" اور بڑبڑائے اور پھر بیوی کی طرف متوجہ ہو کر بولے، "دیکھو یہ کھڑکی کبھی نہ کھولنا —"

افسانہ نمبر

ماہ مارچ ۱۹۵۳ء کا شمارہ افسانہ نمبر ہوگا۔ چنانچہ اس سلسلے میں بہترین افسانے حاصل کر لئے گئے ہیں۔ حال ہی میں دوسری ہندوستانی زبانوں اور اردو کی کہانیوں کا جو ملک گیر مقابلہ ہوا تھا اُس میں اردو کی جو کہانیاں بہترین قرار دی گئی تھیں وہ بھی اس شمارے میں شامل ہوں گی۔ افسانوی ادب کا ایسا معیاری مجموعہ بڑی محنت اور صرف کثیر سے شائع ہو رہا ہے۔

ایجنٹ حضرات ابھی سے اپنی زائد ضرورتوں کے باب میں مطلع فرمائیں۔ قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ شمارہ بھی آٹھ آنے میں مل سکے گا۔

ڈسٹری بیوشن آفیسر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

عرش ملسیانی

نیا کشمیر

(طویل نظم کے چند بند)

جس خاک کی ہے اَوج پہ تقدیر یہی ہے
جو ردِّ غلامی کی ہے اکسیر یہی ہے
بیداریٔ جمہور کی تصویر یہی ہے
آزادیٔ افراد کی تعمیر یہی ہے
اے عرش ترے خواب کی تعبیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنّتِ کشمیر یہی ہے

جس وادیٔ گُل پوش کا ہے ابرِ رواں شیخ
جس بیشۂ سرسبز کا ہے شیرِ ژیاں شیخ
جس محفلِ ارباب کا ہے رندِ جواں شیخ
جس میکدۂ خاص کا ہے پیرِ مغاں شیخ
وہ میکدۂ خاصِ جہاں گیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنّتِ کشمیر یہی ہے

شروانیٔ معصوم کی جاگیر نہ ڈھونڈو
شروانیٔ مخدوم کی جاگیر نہ ڈھونڈو
شروانیٔ مظلوم کی جاگیر نہ ڈھونڈو
شروانیٔ مرحوم کی جاگیر نہ ڈھونڈو
شروانیٔ مرحوم کی جاگیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنّتِ کشمیر یہی ہے

اِس سے نہیں اچّھا کوئی گلزار اسے دیکھ
اِس سے نہیں اُونچا کوئی دربار اسے دیکھ
اِس سے نہیں بہتر کوئی دیدار اسے دیکھ
اِس سے نہیں بڑھ کر کوئی شہکار اسے دیکھ
فطرت نے جو کھینچی ہے وہ تصویر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنّتِ کشمیر یہی ہے

جو رازِ محبّت ہے اُسے پا کے ہی چھوڑا
جو دَورِ مسرّت ہے اُسے لا کے ہی چھوڑا
جو حُسن تھا برہم اُسے اپنا کے ہی چھوڑا
عُشّاق نے آخر جسے سلجھا کے ہی چھوڑا
وہ کاکُلِ شب تاب و گرہ گیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنّتِ کشمیر یہی ہے

ملنے کو تو مل جائے گی سرسبز زمیں بھی
گُل پوش مکاں اور گُل اندام مکیں بھی
کم یاب نہیں حسن زمانے میں کہیں بھی
دُنیا میں بہت نقش ہیں دلکش بھی حسیں بھی
جو خامۂ قدرت کی ہے تحریر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنّتِ کشمیر یہی ہے

سرمایہ و محنت کا ہے جو مسئلۂ خاص
افلاس و امارت کا ہے جو مسئلۂ خاص
مزدور کی شوکت کا ہے جو مسئلۂ خاص
دہقان کی عظمت کا ہے جو مسئلۂ خاص
اُس مسئلۂ خاص کی تفسیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنّتِ کشمیر یہی ہے

سرمایے کے بیٹوں کی ہوئی خوب دکاں بند
جاگیر پرستوں پہ ہوئی راہِ اماں بند
محکومیٔ مجبور کی کب سے تھی زباں بند
صدیوں کی غلامی کے ہیں کس درجہ گراں بند
کاٹے گی جو یہ بند وہ شمشیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنّتِ کشمیر یہی ہے

؎ مقبول شروانی مرحوم

مبارز الدین رفعت

ہاتھ کی لکیریں

اپنے آنے والے دنوں کا حال معلوم کرنے کی لگن انسان کی فطری لگن ہے۔ آنے والے جیون کا حال چاہے اچھا ہو کہ بُرا، پہلے سے معلوم کر لینے کا شوق انسان کا بہت پُرانا شوق ہے۔ یہ شوق اِتنا پُرانا ہے جتنی پُرانی اس کی سُوجھ بُوجھ ہے۔ اِسی شوق نے نجوم، جفر، رمل اور جوتش جیسی چیزوں کو جنم دیا۔ سامدرک یا ہاتھ بانچنے اور ہاتھ کی ریکھائیں دیکھ کر قسمت کا حال بتانا بھی اسی شوق نے انسان کو سکھایا۔ بڑے بڑے رشیوں اور مہاتماؤں کا کہنا ہے کہ ایشور نے کوئی چیز انسان سے چھپا کر نہیں رکھی۔ ہاں سُوجھ بُوجھ کا کچھ تو انعام ہونا چاہیئے تھا۔ سو کچھ چیزوں کو ایسا رکھا کہ ذرا سُوجھ بُوجھ سے کام لیا تو سب کچھ اس پر کھُل گیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان پُرانی باتوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں ستاروں کے گھُومنے کا انسان کے جیون سے کیا واسطہ۔ ہاتھ کی ٹیڑھی میڑھی لکیروں کا انسان کی زندگی سے کیا جوڑ۔

یہ ٹھیک ہے کہ آج کے انسان نے بہت ترقی کر لی ہے۔ اور پچھلے زمانے کے آدمی سے وہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ پھر بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ابھی تک اُس کی سُوجھ بُوجھ سے باہر ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا کچھ اتا پتہ اُسے نہیں لگتا۔ وہ کھوج میں لگا ہے اور بہت سی باتیں اس پر کھُلتی جا رہی ہیں۔ ایسی ہی باتوں میں ایک ہاتھ کی لکیروں کا عِلم بھی ہے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی ایسے ہیں جو اس عِلم کو سچّا مانتے ہیں۔ کچھ اس لئے سچّا مانتے ہیں کہ بس یوں ہی اُن کے بڑوں اور بزرگوں نے اسے اسی طرح سچّا مانا تھا۔ کچھ اس لئے اُسے سچّا مانتے ہیں کہ اُن کی اپنی آنکھوں کے سامنے اس علم کے بَل پر معلوم کی ہوئی بہت سی باتیں سچّی ثابت ہوئیں۔ اس لئے اس سائنس کی زندگی کے ساتھ چھپا ہوا تعلق نہ معلوم ہونے پر بھی اس پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کو مانتے اور اس کی باتوں کو سچّا جانتے ہیں۔ انسان اور باتوں کی طرح اس کی بھی کھوج میں لگا ہوا ہے۔ کچھ عجب نہیں یہ بات بھی اس پر اسی طرح کھُل جائے جیسے سائنس کی بہت سی باتیں اس پر کھُل گئی ہیں۔ لیکن اگر یہ نہ بھی کھُلے تو اُس کا یہ شوق اتنا گہرا ہے کہ شاید جب تک انسان باقی رہے گا۔ اسی طرح اس کا شوق بھی باقی رہے۔

سمدرک یا ہاتھ بانچنے کا فن بہت پُرانا فن ہے۔ اتنا پُرانا کہ ابتک ٹھیک ٹھیک یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کب سے شروع ہوا۔ کہتے ہیں چین میں اس کا رواج حضرت مسیح سے تین ہزار سال پہلے بھی موجود تھا۔ اس طرح چین کے لوگ آج سے پانچ ہزار سال پہلے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر لوگوں کی قسمت کا حال بتا دیا کرتے تھے۔ یونانیوں کی پُرانی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اور تو اور یونان کے سب سے بڑے فلسفی ارسطو کی کتابوں میں بھی اس فن کا حال بہت تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ مصر والے بھی ایسی باتوں کے بڑے رسیا تھے۔ کہتے ہیں ارسطو نے یہ فن مصر کے بڑے بڑے پُجاریوں سے سیکھا تھا۔ یہاں ہرمس دیوتا کے مندر میں اس فن پر ایک کتاب سونے کے حرفوں میں لکھی رکھی تھی۔ ارسطو نے یہ کتاب یہاں سے لے کر سکندر کے حضور میں بطور نذر پیش کی تھی۔ قدیم رومیوں میں یہ اُن کے قومی مذہب کا ایک حصّہ تھا۔ بڑے بڑے مندروں کے پجاری یہ کام کرتے تھے، اور دوسرے طریقوں کے سوا اس کے ذریعے بھی قسمت کا حال بتاتے تھے۔ ہندوستان گویا ایسی باتوں کا گھر ہے۔ پچھلے زمانے میں یہ فن جوتش کا ایک اہم حصّہ سمجھا جاتا تھا اور اسے سمدرک کہتے تھے۔ برہمنوں نے اس فن کو یہاں خوب پروان چڑھایا، اور اب بھی جوشی برہمن اس فن کے بڑے جانکار سمجھے جاتے ہیں۔

دنیا کا اب کوئی ملک ایسا نہیں جہاں ہاتھ بانچنے والے نہ دکھائی دیتے ہوں۔ یورپ اور امریکہ میں تو اس کا شوق دن دُونا بڑھتا جاتا ہے۔ شام اور مصر میں ہاتھ بانچنے والے عام طور پر ہوٹلوں میں بیٹھے اپنا

کاروبار گرم رکھتے ہیں۔ عرب ملکوں میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے اور کاروبار کے موقعوں پر لوگ اس کے جان کاروں سے مشورہ لیتے ہیں۔ یورپ کے دیسوں میں یہ کام عام طور پر خانہ بدوش جپسی کرتے ہیں۔ یہ جپسی کسی ایک ملک میں نہیں ٹھہرتے۔ بس سال کے بارہ مہینے یورپ کے سارے دیسوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ ان لوگوں کی اخلاقی حالت اچھی نہیں ہوتی۔ چوری چکاری اور دھوکا بازی ان کا مشہور پیشہ ہے۔ پھر بھی یورپ کے دیسوں کے لوگ خوشی خوشی اُن کی عورتوں کو اپنا ہاتھ دکھاتے ہیں، اور شادی، محبت، کاروبار اور روزگار میں کامیابی یا ناکامی کے بارے میں بڑے شوق سے اُن کی باتیں سنتے ہیں اور اُنھیں چند ٹکے دے دیتے ہیں۔ کہتے ہیں جپسی اب بھی اسی پُرانے طریقے پر ہاتھ بانچتے ہیں جو کبھی قدیم ہندوستان میں رائج تھا۔

یورپ والوں نے اور دوسرے علوم کی طرح اس علم کو جہاں تک ہوسکا فن بنانے کی کوشش کی ہے، اور اس کے قاعدے اور قانون بنائے ہیں۔ اس کے ابتدائی اصول طے کئے ہیں۔ کہتے ہیں یورپ میں سب سے پہلے جس نے اس علم کو فن کی صورت دی اور اس کے قاعدے بنائے وہ پندرھویں صدی کا ایک فرانسیسی ہٹیلب نامی کوئی شخص تھا۔ اس کے بعد انیسویں صدی کی ابتدا میں ایک اور فرانسیسی ڈی، آرپنٹجنی نے اس علم کو اور زیادہ علمی طریقے پر لکھا۔ یورپ میں اب جتنی کتابیں پامسٹری پر نکلتی ہیں ان سب کی بنیاد اسی کے بنائے ہوئے قاعدوں پر رکھی جاتی ہے۔ یورپ کے دیسوں میں خاص کر فرانس میں اس علم کا بہت چرچا ہوا۔ اور وہاں اس کو بہت ترقی دی گئی۔ فرانس ہی نے پامسٹری کے بڑے بڑے جان کار پیدا کئے ہیں۔ ان میں پروفیسر شیرو کا نام سب سے اونچا اور ساری دنیا میں مانا ہوا ہے۔

ہاتھ دیکھنے کے کئی طریقے ہیں۔ ہر ملک کے لحاظ سے اس میں کچھ تھوڑا بہت ردوبدل پایا جاتا ہے۔ چین کے لوگ ہاتھ کے ساتھ پاؤں کی لکیریں بھی دیکھتے ہیں۔ کچھ داہنے ہاتھ کی لکیروں پر زور دیتے ہیں۔ کچھ بائیں ہاتھ کی۔ کچھ دونوں ہاتھوں کی لکیروں کو ملا کر دیکھنا اور اس سے نتیجہ نکالنا ٹھیک مانتے ہیں۔ لیکن اب عام طور پر جس طرح ہاتھ بانچے جاتے ہیں اُن میں دونوں ہاتھوں کی لکیریں دیکھی جاتی ہیں۔ انگلیاں، پوروں کے اُبھار دیکھے جاتے ہیں۔ ناخنوں کی نرمی سختی اور ان کی صورت شکل دیکھی جاتی ہے ہتھیلی کی حالت اور اس کے اُبھار دیکھے جاتے ہیں۔ اس طرح پورے ہاتھ کو دیکھ کر حکم لگایا جاتا ہے۔ اس طرح پامسٹری یا سمدرک کے علم کو دو حصّوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلا حصّہ انگلیوں، پوروں اور ناخنوں کی حالت پر ہوتا ہے۔ دوسرا حصّہ ہاتھ کی لکیروں اور اُن کے نشانوں پر ہوتا ہے۔ سمدرک کے جان کاروں کا کہنا ہے کہ دوسرا حصّہ پہلے حصّے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

سمدرک کے جان کاروں کا کہنا ہے کہ انسان کے ہاتھ سے دو طرح کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی انگلیوں، پوروں اور پورے ہاتھ کے ڈھانچے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ شاعر ہے، ادیب ہے، تصویر بنانے والا ہے، آرٹسٹ ہے، یا اُجڈ، اکھڑ ہے، عالم ہے، اَن پڑھ گنوار ہے۔ اس کے مزاج میں ملاپ ہے یا جھگڑا۔ نرمی ہے یا سختی۔ اپنے ارادوں کا پکّا ہے یا بودا۔ لڑاکا ہے یا پریمی۔ نئی نئی چیزیں گھڑنے اور نئی نئی باتوں کا کھوج لگانے کی اس میں اپج ہے یا نرا بدھو ہے۔ اس کی تندرستی ٹھیک ہے یا اس کو کوئی روگ ہے، یا اب کوئی روگ نہیں ہے تو کیا آگے چل کر کوئی روگ اس کے لگ جائے گا۔ آدمی سوجھ بوجھ رکھنے والا ہے یا اپنی دُھن میں مگن رہنے والا ہے۔ مثال کے طور پر اگر چوکور ہتھیلی کے ساتھ انگلیاں چپٹی یا مخروطی یا ملی جلی ہوں تو ایسا آدمی ہر چیز کو عملی حیثیت سے دیکھے گا۔ امریکہ کے لوگوں کی ہتھیلیاں اکثر چوکور اور انگلیاں چپٹی ہوا کرتی ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی روزانہ زندگی میں ہر چیز کو میکانکی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ چپٹا ہاتھ جس کی ہتھیلی چوڑی ہو، انگلیاں چپٹی ہوں۔ انگوٹھا بڑا ہو اور ہاتھ مضبوط ہو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں میں اُپج بہت ہوتی ہے۔ گھومنے پھرنے کی اُمنگ ہوتی ہے، اور وہ نت نئی چیزیں بناتے اور نت نئی باتیں معلوم کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اینگلو سیکسن قوم کے لوگوں کے ہاتھ کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ کسی کی تیسری انگلی کے پہلے جوڑ کا اُبھار زیادہ ہو تو کہتے ہیں ایسے آدمی کو آرٹ سے بہت لگاؤ ہوتا ہے۔ چھوٹی انگلیوں کے آدمی جلد ہی ایک فیصلہ کرکے کام شروع کر دیتے ہیں۔ بڑی بڑی اور خوبصورت انگلیاں والے سوچتے رہتے ہیں، اور اُن کے خیالوں میں بڑی نرمی اور بڑی نزاکت ہوتی ہے۔

چھوٹے ناخن دل کا کمزور ہونا بتاتے ہیں۔ ناخنوں پر سفید چتیاں کمزوری اور خراب صحت کی نشانی سمجھی جاتی ہیں۔ ناخنوں پر بڑے بڑے چاند جیسے نشان دل کی کمزور حرکت اور جسم میں خون کے بہاؤ کی تیزی اور کمی کو ظاہر کرتے ہیں۔

پامسٹری یا سمدرک کا دوسرا حصہ ہاتھ کی لکیروں اور اس کے ابھاروں کے بارے میں ہوتا ہے۔ ان لکیروں سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ عمر کتنی ہوگی۔ صحت کیسی رہے گی۔ شادی ہوگی یا نہیں۔ جس سے پریم ہے وہ اپنا ہو کر رہے گا کہ نہیں۔ شادی ہوگی تو کیا میاں بیوی ہنسی خوشی گزاریں گے یا لڑتے جھگڑتے عمر کٹے گی۔ بچے ہوں گے یا بچوں کے لئے ترستے یا بہت سے بچوں کے بوجھ سے لرزتے کٹے گی۔ آنکھیں اُن کی خوشیاں دیکھیں گی یا اُن کے دُکھوں پر خون بہاتی رہیں گی۔ کھانے کو روٹی ملے گی یا روٹی کے لئے ترستے اور روتے بلکتے جیون کے دن بیتیں گے۔ علم کے میدان میں قدم رکھا تو کیا نام اونچا ہوگا یا کچھ بھی پتے نہ پڑے گا۔ دنیا میں اپنے نام کا ڈنکا بجے گا یا یوں ہی گمنامی میں جیون بیت رہے گا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اُس میں کامیابی نصیب ہوگی یا وہ اُلٹ ہی پڑے گا۔ غرض اسی طرح کی وہ سب باتیں جن کی کھچڑی انسان کے دل میں پکتی رہتی ہے ان کا کچھ حال یہ لکیریں بتاتی ہیں۔ اُن کا کچھ اتا پتہ دیتی ہیں۔ اُن پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں۔ کبھی یہ باتیں صاف صاف سُوجھ جاتی ہیں کبھی یہ باتیں اتنی صاف نہیں سوجھتیں، یا صاف تو ہوتی ہیں پر اُس وقت انسان اُن کو صاف طور پر سمجھ نہیں پاتا۔

ہر انسان کے ہاتھ میں جتنے اُبھار ہیں وہ چھ سے زیادہ نہیں۔ انگوٹھے کو چھوڑ کر ہر انگلی کے نیچے ایک اُبھار اور ہتھیلی کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے اُبھار۔ اس طرح سب ملا کر کل چھ اُبھار ہوتے ہیں۔ ہتھیلی کے دائیں بائیں جو اُبھار ہیں اُن کو آسانی کے لئے دو اور حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ اس طرح ہر ہاتھ میں آٹھ اُبھار ہوتے ہیں۔ ان اُبھاروں کے نام مشہور ستاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ کہتے ہیں جس ستارے کا اُبھار دوسرے ستاروں کے اُبھاروں سے زیادہ بڑا ہوگا، اس آدمی کی قسمت پر اسی ستارے کے اثرات زیادہ کام کریں گے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کے ہاتھ میں مریخ کا اُبھار بڑا ہو تو ایسا شخص بڑا بہادر اور بڑا جیوٹ سپاہی ہوگا۔ کیونکہ مریخ لڑائی کا ستارہ ہے۔ مشتری کا اُبھار بڑا ہوگا تو ایسا آدمی حکومت کی بہت اونچی کرسی پر بیٹھے گا۔ کیونکہ مشتری حکومت کا ستارہ ہے۔

اب ہاتھ کی ریکھاؤں کو لیجئے۔ یوں تو ہاتھ میں بہت سی ریکھائیں ہوتی ہیں۔ پر جو سب سے بڑی اور نمایاں ہوتی ہیں۔ وہ عمر کی لکیر، دل کی لکیر، صحت کی لکیر، قسمت کی لکیر اور سورج کی لکیر ہوتی ہے۔ پھر ان بڑی لکیروں کے بیچ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی لکیریں ہوتی ہیں۔ کوئی سیدھی ہوتی ہے۔ کوئی ٹیڑھی ہوتی ہے۔ کوئی پھٹی پھٹی، کوئی لہریا، کوئی زنجیر جیسی، کوئی ستارہ، کوئی تکون۔ کوئی جلیبیا اور کوئی چوکور۔ ان سب لکیروں کا اثر پاس کی بڑی لکیروں پر پڑتا ہے اور ان کی وجہ سے قسمت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ دماغی لکیر سے دماغ کی اب حالت اور اس کے پچھلے ادل بدل معلوم ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ لکیر اگر گہری اور صاف ہو تو یہ اچھا شگون ہے اور ایسی لکیر اچھے اور قابل ذہن کا پتہ دیتی ہے۔ اور اگر یہ لکیر چھوٹی اور اوپر ہی اوپر ہو تو ایسے آدمی کا دماغ چھوٹا ہوتا ہے۔ چوڑی اور بھدی لکیریں جسمانی قوت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایسی لکیریں اکثر ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں جو جسمانی کام زیادہ کرتے ہیں۔ دماغی کام کرنے والوں کے ہاتھ میں تمام لکیریں اور خاص کر دماغی لکیر پتلی، گہری اور صاف ہوتی ہے۔

سمدرک یا پامسٹری میں کسی ایک لکیر پر حکم نہیں لگایا جاتا۔ پورے ہاتھ کو دیکھا جاتا ہے۔ ناخن، انگلیاں، پوریں، لکیروں کی بیچ کی دوسری چھوٹی لکیریں، غرض سب چیزوں کو سامنے رکھ کر ان سے معلوم ہونے والی باتوں کو ملا کر ایک نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ اس فن کا جتنا بڑا جانکار ہوگا وہ اتنی ہی احتیاط کے ساتھ ان سب باتوں کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد ہی حکم لگائے گا۔ غیب کی باتیں تو ایشور اللہ ہی جانے، پر اسی کی دی ہوئی روشنی میں انسان کبھی کبھی ایسی دُور کی کوڑی لے آتا ہے کہ اس پر آپ حیران ہوتا ہے اور اوروں کو بھی حیرانی میں ڈال دیتا ہے۔

عرش ملسیانی

عبدالحلیم انصاری

مُصوّر و مُفکّر

قریب قریب دو سال گزرے ہوں گے کہ میں نے ایک متین اور سنجیدہ صورت کو جوش صاحب کے کمرے سے نکلتے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا آشوبِ زمانہ کا کوئی شکار غریب الدیاری کی صعوبتیں اُٹھاتا ہوا اپنی خود داری کو قائم رکھنے کے لئے اپنے غیر ہمدرد ماحول سے جنگ آزمائی کر رہا ہو۔ لیکن زبان پر شکوہ اور شکایت کا ایک لفظ بھی نہ لائے۔

جب مجھے یہ علم ہوا کہ کمرے سے باہر جانے والا بھوپال کا عظیم فن کار عبدالحلیم انصاری ہے تو میں فوراً اُس کے پیچھے ہو لیا۔ رسمی تعارف کے بعد ایک طویل ملاقات مستقل رفاقت میں تبدیل ہو گئی۔

بھوپال کو قدرت نے اپنی فیاضیوں سے مالا مال کیا ہے — وندھیاچل کی پہاڑیوں سے گھرا ہوا یہ حسین علاقہ اپنی خوش منظر جھیلوں ندی نالوں اور سرسبز و شاداب وادیوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ صانعِ ازل نے اِس خطے کو اس قدر دل کشی اور خوش منظری عطا کر کے اس میں ایک حسین اضافہ یہ کیا کہ اُن کی خوش آئند عکاسی کے لئے انصاری کو اسی سرزمین میں جنم دیا۔

انصاری صاحب سِن کے لحاظ سے ابھی جوانی اور پیری کی درمیانی منزل میں ہیں۔ شدائدِ روزگار نے ظاہری صورت میں پیری کے آثار پیدا کر دئے ہیں لیکن اُن کا قلم اور مُوقلم ابھی اِس بات کی شہادت دیتا ہے کہ

ع دل ابھی تک جوان ہے پیارے

وہ دن میرے لئے کِس قدر مسرت افزا تھا۔ جب آپ اپنے قلم اور مُوقلم کے شاہکاروں کا پُشتارہ اُٹھائے ہوئے میرے پاس تشریف لائے۔ حالانکہ یہ میرا فرض تھا کہ اُن نوادر کو دیکھنے کے لئے میں خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا — میں نے دیکھا کہ انصاری صاحب نے فطرت تاریخ، ماحول، کردار، غرضیکہ اِس کائنات کا بڑی گہرائی میں ڈوب کر مطالعہ کیا ہے۔ انصاری صاحب قدرت کی خوبصورتیوں اور رنگینیوں کے عاشق ہیں اور انہی میں اُنھوں نے اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ آثارِ قدیمہ اور مطالعۂ فطرت اُن کا مضمون ہے۔ تاریخ کے کہنہ اوراق کو مصوّر کرنا اُنھوں نے اپنا مقصدِ حیات سمجھا اور اِس میں فطری صلاحیت کو کام میں لا کر اپنے مخفی جوہر کو اُجاگر کیا۔

پہلے تو اُن کا فن بھوپال کے قدرتی اور تاریخی مقامات تک محدود تھا، لیکن بعد میں حساس فن کار نے اس قید کو توڑ کر اور اِس تنگ دائرے سے نکل کر دور دور کے تاریخی مقامات کو اپنے قلم اور رنگوں میں اُتارا ہے۔ انھوں نے بھوپال اور سانچی کے علاوہ گوالیر۔ دتیا، اندور، دیواس، رتلام، جاورہ اور ٹونک وغیرہ کے قدیم اور تاریخی مقامات کو اپنے موقلم کے اعجاز سے زندہ اور جاوید کر دیا ہے۔

دہلی کے حالیہ قیام میں دہلی کی قدیم اور تاریخی عمارات اور یادگاروں کو اِن کے موقلم نے نئی زندگی بخشی ہے۔ یہ ان کے قلم کی تازہ تخلیق و کاوش کا ذخیرہ بھی میری نظر سے گزرا جو نادر اور دلچسپ مُرقّع کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی جذبات کو چہرے پر سے پڑھ لینے اور اُنھیں خطوط و اشکال کی صورت میں نمایاں کرنے کے فن میں بھی اِنھیں خاص کمال حاصل ہے۔

قدرت کے ترجمان اور فلسفی انصاری کے باب میں اٹلی کے پروفیسر مسٹر ایڈریانو جیلی کا قول ہے "انصاری صاحب کی رگوں میں ہندوستانی خون ہے۔ دل میں قدرت کی محبّت ہے۔ روح میں ٹیگور کی شاعری ہے"! میں تو یہ کہوں گا کہ تلسی داس۔ نظیر اکبر آبادی اور ٹیگور و اقبال کی روحیں اِس ایک فن کار میں جمع ہو گئی ہیں۔ اُن کے پاس چین، جاپان۔ انگلینڈ

فرانس، اٹلی، جرمن اور امریکہ کے بڑے بڑے فن کاروں کی اُن کے آرٹ سے متعلق رائیوں کا ایک بہت بڑا پُلندہ ہے۔ لیکن اُن کے آرٹ کو گہری نظر سے دیکھنے والوں کے لئے یہ رائیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں —— بھوپال تال۔ رانی کملاپتی کا محل۔ سانچی کے اسٹوپ۔ بھوپال میں موتی مسجد اور رائسین کا قلعہ۔ دہلی میں جامع مسجد۔ لال قلعہ۔ پُرانا قلعہ، قلعہ تغلق آباد، قطب مینار اور دیگر تاریخی آثار۔ نیز اجنٹا کی نقاشی اور مختلف قدرتی مناظر اور درختوں کی تصویریں زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں۔ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

مشہور اطالوی مصوّر سیر لو متزیتی نے اِن کے باب میں کس قدر درست فرمایا ہے: "اِس پُر امن مگر اندوہناک ماحول میں انصاری کے موقلم نے تاریخ اور ماضی کو زندہ کیا ہے۔ اس خوش اسلوبی سے کہ زندگی تاریخی پس منظر سے ہمیں پُکار رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ فن کار کی قابلیت اور حسّاس فطرت کا ثبوت ہے۔"

ذیل میں اُن لوگوں کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں جنھیں انصاری صاحب سے ملنے اور اُن کے فن کو دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔

ڈاکٹر سیّد عابد حسین جامعہ ملّیہ —— میں نے عبدالحلیم صاحب انصاری کے قلم اور موقلم کے حُسن آفرینی کے نمونے دیکھے۔ حیرت ہوئی کہ مبدا فیاض نے ایک ہی شخص کو وہ جوہر قابل عطا کیا جو آرٹ اور ادب میں یکساں چمکتا ہے۔ افسوس کہ میں خود بھوپال میں پیدا ہوا اور اب تک مجھے اِس "فخر بھوپال" آرٹسٹ کا علم نہ ہو سکا تھا۔

ڈاکٹر تاراچند —— میں نے انصاری صاحب کی مصوّری دیکھی ہے، اور اُن کے ادبی شہ پاروں کو بھی پڑھا ہے۔ فن کے ان دونوں اصناف میں ان کو معراجِ کمال حاصل ہے اور اچھا امتزاج۔ ایسا امتزاج شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ انصاری صاحب سے ملاقات میرے لئے باعثِ مسرّت ہے۔ وہ بذاتِ خود تہذیب اور شائستگی کا مجسمہ ہیں۔ گذشتہ زمانے میں یہی ہندوستانی زندگی کی خاص صفات تھیں۔

پنڈت سندرلال —— انصاری صاحب بہت وسیع الخیال ہیں اور اُن میں ہندوستانی معاشرت کے کچھ بہترین اوصاف ہیں۔ وہ ایک عمدہ اور مہذّب انسان ہیں۔ فن کی دونوں صنفوں میں یعنی ادب اور مصوّری میں وہ مساویانہ طور پر ماہر ہیں۔

ان کے علاوہ لارڈ ولنگڈن۔ لارڈ ویول (وائسرائے ہند) سر لیزلی وِلسن، سر فریڈرک سائکس (گورنر بمبئی) سر میلکم ہیلی (گورنر پنجاب) سر ولیم میرس (گورنر یو۔پی) سر بی، جے گلینسی (گورنر) سر رجینالڈ گلینسی۔ ای۔ ایچ۔ کے لی (اے۔جی جی) ڈاکٹر سر جان مارشل، ڈاکٹر موٹیمر وہیلر ڈاکٹر غلام یزدانی (ڈائرکٹر آثار قدیمہ) فیلڈ مارشل ولیم برڈوڈ، جنرل آکن لیک کلائیک (کمانڈر انچیف) ڈبلو۔جی بسیلنڈ، ایر وائس مارشل۔ لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹو فورڈ کرپس۔ جنرل الگزینڈر۔ پروفیسر ٹونسی دی براڈشا (پرنسپل لندن آرٹ اسکول) پروفیسر سی۔ یزاکی (پرنسپل جاپان امپیریل آرٹ اسکول) ڈبلو۔ ای۔ گلیڈسٹون سالومن۔ ڈائرکٹر بمبئی آرٹ اسکول اور راؤ بہادر ایم۔ وی۔ دھونڈھیر، اِن سب نے آپ کے کام کی تعریف کی ہے۔

حسین دل کش ماحول میں انصاری صاحب نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اُس ماحول کی عکاسی آپ نے اِس خلوص و جانکاہی سے کی ہے کہ جس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ بظاہر ہر دیکھنے والا اُن کی صناعی کی داد دے گا۔ لیکن فطرت کی خوبصورتی کو بنظرِ غائر دیکھنے والے اُن کے فن میں کچھ اور ہی بلندی اور نزاکت محسوس کریں گے۔ حُسن جس قدر بلند ہو اُتنے ہی گہرے تفکّر کا خالق ہوتا ہے۔ انصاری کا مرتبہ دُنیا کے فن کاروں میں اِس لحاظ سے بہت بلند ہے کہ اُن کا آرٹ صرف بُرش اور کینوس تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک بہترین مصوّر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے فلسفی اور بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ اُن کی نثر و انشا شاعرانہ ہے۔ اس لئے وہ شاعر بھی ہیں۔ اُن کے ادبی جواہر ریزے جن میں زندگی کے چھپے ہوئے رازوں کو آرٹ کی الہامی زبان میں نہایت پُر کیف و دل نشین انداز کے ساتھ وا شگاف کیا گیا ہے، اردو زبان کا بیش بہا سرمایہ ہیں —— بھوپال تال کے اس دُرِ شہوار کی آب و تاب دیکھنا ہو تو اِس شمارے میں اُن کی چند تصویروں کے عکس اور آرٹ اور آرٹسٹ کے عنوان سے اُن کے افکار کو ملاحظہ فرمائیں۔

عبدالحلیم انصاری

آرٹ اور آرٹسٹ

میرا تعارف

تال بھوپال کے غیر مُتقطّر پانی کا بھاری قطرہ
سنگلاخ زمین کا ناتراشیدہ پتھر
خاکِ وطن کا ایک حقیر ذرّہ
یعنی وطن کی سُرخ دُھول کا ایک ذرّۂ اَحمر ——— انقلاب خیز ذرّہ
تال کی رواں موجوں میں سے ایک متحرک لہر ——— ہیجان انگیز لہر

میں کون ہوں ؟

فطرت کا نمایندہ
تہذیب و تمدّن کی تصویر
ملک کا خادم
وطن کا نام
شریف روایات کا نشان
قدیم آثار کا ترجمان
ماضی کی تعبیر، حال کی تفسیر، مستقبل کا معمار
یہ ہے میری تشریح میری زبان میں
اٹلی نے مجھے "گوہرِ تال" کہا
امریکہ نے "فخرِ بھوپال"
یہ نہ معلوم کیوں ؟

میں کیا ہُوں ؟

مَیں قدرت کا قلم ہوں
اُوپر سے جو اِلہام ہوتا ہے وہی مجھ سے اِرقام ہوتا ہے
میں خامۂ خدا ہوں
خدا کا جو منشا ہے وہی میرا اِنشاء ہے
میں لفظِ کُن کی زندہ تعبیر ہوں
میں یدِ خالق کی ناطق تصویر ہوں
میں فرمانِ خدا کی زندہ نشانی ہوں
میں نطقِ اللہ کا نقشِ جاودانی ہوں
میں خزینۂ رموزِ قدرت ہوں
میں فلسفۂ علومِ فطرت ہوں
میں کاشفِ اسرار ہوں رمز ہائے قدرت کا
میں شارحِ معانی ہوں رنگ ہائے فطرت کا
میں مقدّمۃ الکتابِ حیات ہوں
یعنی ——— میں صحیفۂ کائنات کا افتتاحی باب ہوں
میں تمتّتِ کتاب ہوں
یعنی ——— میں خدا کا آخری پیغام ہوں
میں فطرت کی کھلی چھٹی ہوں ——— یعنی میں پرکرتی کا جری ایلچی ہوں
میں آکاش کا رہنے والا ہوں اگرچہ خاکی پُتلا ہوں
مجھ میں فطرت کی تصویر دیکھو
مجھ میں قدرت کی تشہیر دیکھو
میں فطرت کی ایک مسلسل فلم ہوں ——— ناطق فلم
میں قدرت کا ایک مکمّل ایلبم ہوں ——— رنگین ایلبم
میں نقاشِ فطرت ہوں اور ناظمِ فطرت
میں مصوّرِ فطرت ہوں اور مدبّرِ فطرت

آرٹسٹ کیا ہوتا ہے ؟

کتابِ فطرت کے اوراقِ پریشاں کا ناظم
صحیفۂ فطرت کا کاتب اور شارح
رُوح کا پیغام بر
مظاہرِ قدرت کا علمبردار
صاحبِ عرفان، حاملِ الہام
معارفِ قدرت کا واقف کار، خزائنِ فطرت کا کلید بردار
مُصلح، رہبر، اور ہیکلِ حیات میں سب سے اوّل
زندگی ساز اور زندگی آور
یعنی، قدرت کا وہ ایک اہم راز

یہ خالق کی عجیب و نادر تخلیق اور مصوّرِ فطرت !
یعنی — مصوّرِ حقیقی کا معتمد علیہ اور شعورِ معرفت کا شاہکار، خود تخلیقی قوت کا جدت طراز اور رازِ آفرینش کا واقف کار !

آرٹسٹ صانعِ حیات ہے لیکن خاموش !
آرٹسٹ ایک خود دار و بیدار ہستی ہے
لیکن فضائے عمل میں مستانہ موج !

کردار کا معمار

آرٹسٹ بہترین اور مضبوط کیرکٹر کی تعمیر کرتا ہے۔ آرٹسٹ نہ صرف پیکر ساز ہوتا ہے بلکہ وہ کردار کا معمار بھی ہے کیونکہ اُس کا کام مخلصانہ اور محققانہ ہوتا ہے۔ اسی لئے سچائی اور اخلاص کی اساس پر اُس کے کام کا آغاز ہوتا ہے اور محض اسی استواری کے سبب وہ نیک نام اور نام آور ہے اور مساعی اُس کی بار آور !

آرٹسٹ کیا چاہتا ہے ؟

آرٹسٹ اپنے عمل کا آپ موجد ہے۔ اپنے ماحول کا آپ سازگار، اپنے تصورات کا آپ خالق !

اسی لئے وہ بہر صورت تخلیقِ جدید چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے تخیل کے سانچے میں جدّت و نُدرت کے نئے نئے نمونے ڈھالے، نئے نئے پیکر تراشے، پھر اُن کی نمائش کرے اور ملل و اقوام کے مطالعے کے لئے کوئی خاص چیز تاریخ کے صفحات پر چھوڑ جائے۔

ہر نشان اُس کا ترجمان ہوتا ہے۔ ہر نقش اُس کا پیغام ! غیر فانی پیغام !

آرٹسٹ کا تعلق نیچر سے

آرٹسٹ فطرت کا مطالعہ کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اُس کو نیچر سے براہِ راست ربط و تعلق ہے۔ اسی لئے وہ اسرارِ فطرت کا انکشاف کرتا ہے۔ چونکہ وہ تمام قیود اور پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اس لئے جس رُخ اور زاویے سے چاہتا ہے کائنات کی ہر چیز دیکھتا ہے اور اُس پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ نیچر میں "لائف" اور اجزاء میں زندگی پیدا کرنے کے لئے کہاں "شیڈ" اور کہاں "لائٹ" کی ضرورت ہے

آرٹسٹ کا کام اور نام

بسیط کائنات کا چپّہ چپّہ آرٹسٹ کے لئے تختۂ مشق ہے اور ذرّہ ذرّہ اُس کے دلچسپ و معنی خیز مطالعے کا حاصل !

ہر ذرّے میں اُس کی دُنیا پنہاں ہے اور رگِ برگ میں اُس کا قلم کارفرما !
صفحے صفحے پر اُس کا رنگین نقش ہے — یعنی، گام گام پر اُس کا کام ہے اور ہر کام پہ اُس کا نام ہے۔

فن کار کے لمحات

آرٹسٹ کا شغف و انہماک قیمتی اور قابلِ اعتماد ہے
آرٹسٹ ہمہ وقت مصروفِ عمل ہے۔ اُس کا ہر لمحۂ فکر متوجہ بہ افکار ہے۔
افکار کیا ہیں ؟
خالقِ کار — اور حسین اعمال کے کارساز !

آرٹ اور آرٹسٹ

آرٹسٹ ایک مسافر ہے۔ سیّاح ہے اور جہاں گشت سیاح !

جو شہر شہر اور جنگل جنگل گھومتا پھرتا ہے۔ جو وادی وادی اور ساحل ساحل پھرتا رہتا ہے۔

جو قسم قسم کے لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ جو طرح طرح کے حالات سے گزرتا ہے۔
اور تلخ و شیریں تجربات سے۔

زمانے کی چال ڈھال سے وہ واقف
زندگی کے نشیب و فراز سے وہ آگاہ

سیّاح!
جہاں گشت سیاح!

جس کو کسی راہبر کی ضرورت نہیں وُہ آپ اپنی راہ تلاش کرتا ہے۔ اور آپ اپنا جادہ تراشتا ہے۔

جس کو کسی کتاب کی حاجت نہیں۔ وہ آپ اپنی کتاب لکھتا ہے اور آپ ہی اُس پر حاشیہ چڑھاتا ہے۔ لہٰذا وہ خود رہبرِ حیات ہے اور خود صاحبِ کتاب!

اُس کا ایک ایک حرف کتاب کا درجہ رکھتا ہے اور اُس کا ایک ایک نقش بمنزلۂ لغت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ نہ کسی کے حرف کا محتاج اور نہ کسی کے لغت کا۔

وہ اپنے قیمتی تجربات اور معلومات کا خزینہ رکھتا ہے۔ وہی اُس کی معروف زندگی کا حاصل ہوتا ہے اور وہی اُس کی جہد و کاوش کا سرمایہ!

اُس کا پیغام الہامی ہوتا ہے۔ اُس کا ارشاد عرفانی!

اُس کے پیغام و الہام کا مجموعہ، اُس کی زندگی کی نایاب کتاب ہے جس کا مصنّف خود وہ آرٹسٹ ہے۔ جس کی زبان الگ، بیان الگ، معانی الگ، اصطلاح الگ!

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آرٹ وہ غیر متناہی کتاب ہے جو زندگی کے لئے رہبر بھی ہے مشعل بھی۔ پیغامِ حیات بھی اور مجموعۂ واردات بھی!

✓ آرٹسٹ! بلند عزائم کا مالک ہوتا ہے اور حسین تصوّرات کا خالق!
وہ باریک نظر بھی ہوتا ہے اور عمیق فکر بھی!
وہ کوہ تراش بھی ہوتا ہے اور مُوشگاف بھی!

آرٹسٹ کی تعلیم اور تربیت

آرٹسٹ چونکہ حاملِ الہام ہوتا ہے اس لئے الہام سے وہ روشنی پاتا ہے اور اُس روشنی میں تعلیم!

تعلیم اُس کی الہامی ہوتی ہے اور تدریس ربّانی — یعنی اُس کی تعلیم و تربیت ازطرف قدرت ہوتی ہے اسی لئے وہ قدرت سے وہ سبق لیتا ہے اور دنیا کو وہ سبق دیتا ہے۔

فطرت کی رنگینیوں سے وہ بصیرت و معرفت حاصل کرتا ہے
الہام کی روشنیوں سے وہ فیضان و عرفان پاتا ہے
قدرت اُس کی تربیت کرتی ہے
نغمۂ فطرت سے اُس کی روح کو عرفانیات کی چاشنی ملتی ہے اور انبساط کا ذائقہ!

وہ فطرت کے رواں دواں چشموں سے امرت کے جام پیتا ہے اور صبح و شام پیتا ہے۔

وہ نغمے اور سمع نواز نغمے
وہ منظر اور فردوس نظر منظر
جن کے فیض و اثر سے وہ عقل و ادراک پاتا ہے
جن کے کیف و رنگ سے وہ طولِ حیات پاتا ہے
وُہ سب کے سب اُس کے لئے رومان انگیز لوازماتِ حیات ہیں — اور الہام ریز رشحاتِ پیغامات!

آرٹسٹ کا پیغام اور اصرار

افراد اور اقوام کے لئے اُس کا پیغام اور اصرار یہ ہے کہ:
چشم بینا پیدا کر، دیدۂ بصیرت کھول
فیض ہائے قدرت سمیٹ، گہر ہائے عرفانیت بٹول
جو دامانِ گلشنِ فطرت پر بکھرے پڑے ہیں اور صحنِ کائنات میں جن کا انبار ہے
بلاشک کائنات کے برگ و بار حتیٰ کہ ریگ زار اپنے "عارفِ صادق" کا انتظار کرتے ہیں اور "سالکِ منزلِ عارفان" کی راہ تکتے ہیں۔

معلوم ہے وہ عارف اور وہ سالک کون ہے؟

صاحبِ بصیرت آرٹسٹ!
الہام یافتہ فن کار!!

مخلص و صاحبِ بصیرت آرٹسٹ، الہام کا سرمایہ دار ہوتا ہے یعنی یہ کہ وُہ رُوحانی فن کار ہوتا ہے۔

آرٹسٹ کا کیسۂ فکر نقدِ تخیّل سے معمور ہوتا ہے اور ذاتِ اُو فیضِ الہام سے مملو!

میں کتاب کا غلام نہیں

میں کتاب کا غلام نہیں۔ میں لکیر کا فقیر نہیں۔ تقلید میرا کام نہیں —— میں خالقِ خیال ہوں۔ میں آفرینندۂ جمال ہوں۔ میں موجدِ حرف و معانی ہوں میں پیکرِ الہام ہوں۔ میں مرقعِ حیات ہوں۔ میں واقفِ نکات ہوں۔ میرا بیان ذاتی بیان ہے میرا کلام مسلم الکلام ہے۔

آرٹسٹ نہ کتابی آدمی ہوتا ہے نہ لفاظی انسان۔ وہ بات کم کرتا ہے اور کام زیادہ۔ وہ کام سے کام رکھتا ہے اور وقت کی قدر کرتا ہے۔ وہ اپنا نقش آپ بناتا ہے۔ اپنی لکیر آپ کھینچتا ہے اور آپ ہی اس میں رنگ بھرتا ہے نہ وہ کسی کتاب کا محتاج رہتا ہے۔ نہ کسی کے خیال کی چوری کرتا ہے۔ وہ چونکہ عملی انسان ہوتا ہے۔ اس لئے فطری صلاحیت کو کام میں لاتا ہے۔ وہ چونکہ جدّت آفریں ہوتا ہے۔ اس لئے تخلیقی قابلیت دکھلاتا ہے۔

وہ کتابی بندشوں سے آزاد ہوتا ہے اور درسی اسباق سے بے نیاز

وہ تمام قیود سے آزاد ہوتا ہے اور تمام حدود سے ماوراء

کتنا غلط ہے اُس کو اُس جگہ پر دیکھنا جہاں اُس کو دیکھا جاتا ہے یا جہاں اُس کو سمجھا جاتا ہے۔

نہ وہ اُس جگہ پر ہے نہ اُس سطح پر

تو پھر وہ کیا ہے اور کہاں ہے ؟

وُہ میدانِ عمل کا شہسوار ہے اور فضائے آزاد کا پیراک

وُہ بحرِ حیات کا ناخدا ہے اور منزلِ ارتقاء کا جادہ پیما

وُہ تہذیب کی تشکیل کرتا ہے اور کلچر کو زندہ رکھتا ہے

وُہ قدیم کائنات کو چاک کر کے جہانِ نو کی تخلیق کرتا ہے

وُہ فضائے خاموش سے بات کر کے اُس میں نطق و تکلّم بھرتا ہے۔

وہ مُردہ اجسام میں رُوح پھونک کر کارِ مسیحائی دکھاتا ہے۔

وُہ فسردہ اجزاء میں رنگ بھر کر معجزہ نمائی کرتا ہے

وہ فضائے ضعیف پر شباب کا رنگ چڑھاتا ہے

وہ عہدِ شباب پر انقلاب کی موجیں دوڑاتا ہے۔

وہ ارتقاء کا داعی ہے اور جہانِ نو کا بانی!

آرٹسٹ! تعمیری خاکوں کی داغ بیل ڈالتا ہے منتشر اجزاء کی تنظیم کرتا ہے۔ بدنمائیاں دُور کرتا ہے اور خوش نمائیاں فراہم! کاموں میں سلیقہ لاتا ہے۔ ذہنوں کو شعور دیتا ہے۔ تمیز عطا کرتا ہے۔ نظر کو روشنی بخشتا ہے اور فکر کو بلندی

وُہ مفکّر ہوتا ہے، مدبّر ہوتا ہے۔ منتظم ہوتا ہے اور جمال نگار

وُہ مصوّر ہوتا ہے، مورّخ ہوتا ہے اور انقلاب آشکار

وُہ ماحول ساز ہوتا ہے اور اطوار ساز

وہ کردار ساز ہوتا ہے اور انسان ساز —— یعنی وہ مُصلحِ حیات ہوتا ہے اور آزاد کار

وہ فطرت شناس ہوتا ہے اور حسن تراش

وہ غلامی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور آزادی کا پرچار کرتا ہے

وہ زمان و مکاں کی حدبندیاں توڑتا ہے اور خود زماں و مکاں کی تعمیر کرتا ہے۔ وہ مُخبرِ انقلاب ہوتا ہے اور کاشفِ حالات !

انقلاب سے وہ بات اور پردۂ سامراج چاک کرتا ہے۔

آرٹ کا تعلّق دل سے —— آرٹسٹ کا مجاہدانہ کردار

جب تک آرٹسٹ کی رُوح میں نزاکت کا احساس نہ ہو۔ احساس میں لطافت روح نہ ہو۔ جب تک وہ ذوقِ طلب نہ ہو۔ طلب میں اُس کے پختگی نہ ہو۔ خیالات میں شُستگی نہ ہو نظر اُس کی بالغ نہ ہو۔ فکر اُس کی بلند نہ ہو۔ روح اُس کی صحت مند ہو —— اور جب تک وہ نیک خُو اور عرفان جُو نہ ہو۔ ہمہ جُو اور ہمہ گیر نہ ہو۔ صاحبِ بصیرت نہ ہو۔ حاملِ سیرت نہ ہو۔ شکیب آزما اور بُردبار نہ ہو۔ متانت شعار اور مخلص کار نہ ہو۔ وہ قدرت کے شاہکارانہ کمال کو نہیں سمجھ سکتا۔ نہ اُس کے الہامانہ پیغام کو قبول کر سکتا۔

جامعۂ کائنات کا اسکالر

عام نظروں میں فطرت، نگارخانۂ قدرت ہے۔ لیکن میری نظر میں فطرت کتابِ علوم و معارف ہے۔ کتابِ ادب و سائنس ہے۔ کتابِ فلسفہ و منطق ہے اور اکیڈیمی آف آرٹس !

صحیفۂ الہام و عرفان ہے۔ مرقعِ نقوش و الوان ہے۔ اسی لئے علم و حکمت اور ادب و سائنس کا سارا سرمایہ میں نے اسی جامعۂ قدرت سے حاصل کیا ہے اور اسی ایوانِ درس و عرفان میں برسوں رہ کر علوم و معارف کا مطالعہ کیا ہے اور فنون و سیاست کا تجربہ!

لہٰذا میں جامعۂ کائنات کا ایک قدیم اور ادنیٰ اسکالر ہوں۔

ذکر و فکر

غمِ ہستی

رضا مظہری

غمِ ہستی کی نہ کر اتنی شکایت اے دوست
زندگی میں نہیں آرام کی صورت اے دوست
نہ سمجھ اس کو تمناؤں کی جنت اے دوست
ایک دھوکا ہے تخیّل کا مسرّت اے دوست
یہ وہ بے برگ گلستاں ہے جہاں چھاؤں نہیں
زندگی ایک بیاباں ہے جہاں چھاؤں نہیں

ہم نے مانا کہ بڑا جورِ سفر کرنا ہے
تو مسافر ہے بہر طور سفر کرنا ہے
رستے چھالوں پہ نہ کر غور سفر کرنا ہے
دور منزل ہے ابھی اور سفر کرنا ہے
روح اس دشت میں نالاں ہو جہاں چھاؤں نہیں
زندگی ایک بیاباں ہے جہاں چھاؤں نہیں

راہ میں راحتِ منزل کے نشاں ڈھونڈھ نہ تو
نقشِ پائے قدمِ راہبراں ڈھونڈھ نہ تو
آ کے ویرانے میں اے دوست مکاں ڈھونڈھ نہ تو
روشنیٔ شمع کی، چولہوں کا دھواں ڈھونڈھ نہ تو
یہ تو وہ قریۂ ویراں ہے جہاں چھاؤں نہیں
زندگی ایک بیاباں ہے جہاں چھاؤں نہیں

رات اندھیری ہے تو کر اس کو فروزاں اے دوست
دل کے داغوں سے بھی ممکن ہے چراغاں اے دوست
زندگی کیوں رہے اک وادیٔ ویراں اے دوست
اپنے خوابوں سے بنا اس کو خیاباں اے دوست
گرچہ دنیا وہ خیاباں ہے جہاں چھاؤں نہیں
زندگی ایک بیاباں ہے جہاں چھاؤں نہیں

غزل

شہاب جعفری

غم کی پُر شور ہواؤں میں سرِ منزلِ شوق
ہائے وہ دل جو چراغِ تہِ داماں ہو جائے
اب تو اک مرحلۂ شوق یہی باقی ہے
آدمی اتنا بدل جائے کہ انساں ہو جائے
اتنی آسان نہیں موجِ حوادث سے نجات
کاش ساحل کو بھی اندازۂ طوفاں ہو جائے
پھر تو ہر دل میں محبت ہی محبت ہوگی
عیب اے دل کہ علاجِ غمِ انساں ہو جائے
مجھ اکیلے کے تو بس میں نہیں تجدیدِ وفا
تم شریکِ غمِ دنیا ہو تو آساں ہو جائے

غزل

اشرف ایرایانی

کاش آ جائے یوں ہی راہ پہ سمجھانے سے
بات کرکے تو ذرا دیکھئے دیوانے سے
واعظِ شہر کا جو روز اُڑاتے تھے مذاق
آج اُن کو بھی تعلق نہیں میخانے سے
لطف دیتی ہے کسی وقت پریشانی بھی
حسن کچھ اور بڑھا زلف بکھر جانے سے
دیکھتے دیکھتے کترا کے نکل جاتی ہے
برق کو لاگ ہے شاید مرے کاشانے سے
مختصر طور پر اتنا ہی سمجھ لے اے دوست
زیست آزاد ہوئی تیرے بچھڑ جانے سے

غزل

ساز مرادآبادی

برق نے آکے ہر اک سمت جلائے ہیں چراغ
بخت چمکا ہے بہت دن میں سیہ خانے کا
کل بنے گا یہی تاریخِ محبت کا ورق
مضحکہ آج اُڑا لو مرے افسانے کا
مجھ کو عرفاں ہے کہ تخریب ہے وجہِ تعمیر
غم کرے میری بلا گھر کے اُجڑ جانے کا
ایک سے ایک زیادہ ہے مٹانے کے لئے
شکوہ اپنے کا کروں ساز کہ بیگانے کا

سیّد اطہر حسین جعفری

ہندوستان اور چین کے درمیان قدیم تعلقات

ہندوستان سے چین کا سفر دو راہوں سے ممکن ہے۔ ایک دریا کی راہ، دوسری خشکی کی راہ۔ لیکن قرونِ اولیٰ ومتوسطہ میں دریائی سفر انتہا درجہ خوفناک سمجھا جاتا تھا، اور اسی وجہ سے لوگ بہت کم دریائی سفر کرتے تھے۔ مگر خشکی کی راہ سے بھی چین کا سفر کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لئے کہ بے آب وگیاہ بیابان۔ جھلسا دینے والی ریگستانی زمین اور سر بفلک کشیدہ پہاڑ ان دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں اور مسافر کی راہ میں طرح طرح کی مشکلیں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یہ قدرتی موانع آدمیوں کے دو گروہوں کے درمیان سدِّ راہ نہیں ہو سکتے، اور نہ انھیں اُن کے ارادے سے باز رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک گروہ تو اُن ہندی مبلغوں کا تھا جنھوں نے بُدھ دھرم کے پرچار کی غرض سے کئی بار ایسے دور دراز کے سفر اختیار کئے اور ہمالیہ۔ پامیر اور ہندوکش ایسے دشوار گزار پہاڑوں سے ہو کر چین پہنچے۔ اور دوسرا چین کے اُن جہاں گرد وحادثہ جو سیاحوں کا جنھوں نے ان مشکلات کی ذرا بھی پروانہ کر کے دھامک کتابیں حاصل کرنے۔ سنسکرت زبان سیکھنے اور مقدس مقامات کی زیارت کی غرض سے وقتاً فوقتاً ہندوستان آکر اپنی سرگذشت ومشاہدات لکھے اور ہمارے لئے یادگار کے طور پر چھوڑ گئے۔ یہ سفر نامے تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اس حصۂ دنیا کے اُس زمانے کے حالات سیاسی وجغرافیائی معلوم ہو سکتے ہیں۔

تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بُدھ مت کے مبلغین کب اور کس طرح چین ایسے وسیع ملک میں داخل ہوئے، اور کس حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہ واقعہ تیسری صدی قبل مسیح اشوکِ اعظم کے عہدِ سلطنت میں پہلی بار صورت پذیر ہوا۔

سنہ ۱۲۰ (ق۔م) میں ایک چینی جنرل صحرائے گوبی کے چند بادیہ نشین قبائل کی سرکوبی کے بعد جو مالِ غنیمت اپنے ساتھ لایا تھا اُس میں بدھ کا ایک طلائی بُت بھی تھا۔ اسی بات سے بآسانی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اُس زمانے میں بدھ مت کا کتنا پرچار تھا۔ لیکن خاندان "ہان شرقی" کے ایک بادشاہ منگتی کے جلوس سے پہلے کے ہند وچین کے تعلقات کے متعلق ہمارے معلومات بالکل ناقص اور سطحی ہیں۔ اور اسی وجہ سے چنداں در خورِ اعتنا نہیں۔ چین کی مستند تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی مرتبہ منگتی ہی نے ملک چین میں "بدھ مت" رسمی طور پر قبول کیا اور اس کے پرچار میں بلیغ کوشش کی۔ یہاں تک کہ اہلِ علم ومعرفت اور صاحب منصبانِ بزرگ کی ایک مخصوص جماعت مُرتب کر کے بدھ مت کے مطالعہ کی غرض سے ہندوستان کا قصد بھی کیا تھا۔ اس کے بعد سے ہند وچین کے درمیان مذہبی اور سماجی تعلقات اور دوستانہ روابط استوار ہو گئے۔

منجملہ اُن اشخاص کے جنھوں نے خاص اسی غرض سے ہندوستان کا سفر اختیار کیا، ایک شخص فاہین بھی تھا، جو ۳۹۹ئہ میں چانگ اُن سے چلا اور دو سال کی مسافرت کے بعد ختن۔ یارقند وافغانستان کی راہ سے ہندوستان پہنچا۔

یہ مشہور سیاح جیسا کہ خود اُس نے سیاحت نامے میں لکھا ہے اس سفر میں طرح طرح کی زحمتوں اور مصیبتوں سے دوچار ہوا تھا۔ تین سال شہر پاٹلی پُتر (موجودہ پٹنہ) میں گزارے، اور اس عرصہ میں زبانِ سنسکرت سیکھنے اور بُدھ کی کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہا۔ اس کے حالاتِ سرگزشت سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے جلد زبان سنسکرت میں عبور حاصل کر لیا اور اس حد تک کہ اس زبان میں آزادانہ گفتگو کرتا اور اُس کی مدد سے راہبوں سے علمی مباحثے کیا کرتا تھا۔ فاہین کے رفقاء خستگی وتکلیفِ سفر کی وجہ سے اُس کا ساتھ نہ دے سکے۔ اُن میں سے صرف تین پشاور تک

ساتھ رہے۔ اُن میں سے ایک تو بدھ مت کا اتنا شیدا ہوگیا کہ اُس نے اپنے اصلی وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا، اور ہندوستان کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا، اور اپنی بقیہ زندگی مطالعہ و تجسّس علمی و دینی میں گزار دی۔ خود فاہین ہندوستان کے مختلف مقامات کو دیکھتا ہوا دریائے ہگلی کے کنارے شہر ترالی پتی میں قیام پذیر ہوا، اس کے بعد سیلون گیا۔

واپسیٔ وطن میں فاہین کے تین سال صرف ہوئے۔ بے چارہ اس موقع پر بھی انواع مصائب و آلام سے دوچار ہوا۔ سیلون سے کشتی میں سوار ہو کر جاوا کی جانب سے گزرتا ہوا چین کے جنوبی ساحل پر آنکلا۔ لیکن بادِ مخالف کشتی کو سیدھے راستے سے ہٹا کر شمال کی طرف لے چلی۔ آخر میں فاہین ساحل پر اترا تو معلوم ہوا کہ لاؤشان (صوبۂ شانتنگ) میں ہے۔ اور اپنے مقامِ مطلوب سے پندرہ سو میل کے فاصلے سے دور آپڑا ہے۔

اِس کے بعد سے بدھ دھرم سرزمینِ چین میں تیزی سے پھیلا اور نتیجے کے طور پر چین و ہند کے تعلقات بھی بڑھتے گئے۔ چنانچہ سنہ ۶ء کی ابتدا میں اُن ہندیوں کی تعداد جو چین میں آکر آباد ہو گئے تھے تین ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اور باوجود اس کے کہ عموماً اہلِ چین نئے عقائد کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے، صرف شمالی چین میں بدھ مت کے عبادت خانوں اور مندروں کی تعداد تیرہ ہزار کے قریب تھی۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بدھ مذہب نے ابتدائی خطرناک مراحل سے گزر کر رفتہ رفتہ محبوبیت حاصل کر لی تھی۔ حاکمِ وتے نے بھی بُدھ دھرم کو قبول کر لیا تھا، اور اس کے علانیہ پرچار سے جھجکتا نہ تھا، اور بربار بُدھ کے عقائد و آئین کے متعلق بڑے بڑے عہدہ داروں سے بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا۔ اُسی زمانے میں ایک زبردست ہندی پنڈت بودی درما دریا کے راستے سے بمقام کانٹن آیا۔ (سنہ ۵۲۰ء) اگرچہ ہندی کتابوں میں اس شخص کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ تاہم اُس کی مسافرت اور عالی شخصیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اُس کا دربارِ نانکن میں ورود تاریخ کے اہم وقائع میں شمار ہوتا ہے۔ اس سے پہلے چینیوں کا خیال تھا کہ رستگاری و نجات کا تنہا وسیلہ اخلاقِ حمیدہ و رفتارِ نیک ہے۔ لیکن اس کے بعد تصوّف کا جدید اسکول بنام "دھان" وجود میں آیا جو چین میں "چان اسکول" کے نام سے مشہور ہے۔ اس اسکول کے طرفدار بیشتر تصوف و ریاضت کی جانب میل رکھتے ہیں۔

۵۱ء میں ملکۂ وتے نے دو زبردست عالم سنگ یُن و ہُوائی سنگ بدھ کی مذہبی کتابوں کی جستجو میں ہندوستان روانہ کئے۔ یہ دونوں عالم شہر لویانگ واقع صوبہ ہونان سے چلے اور وہی راہ اختیار کی جس سے اُن سے پہلے فاہین ہندوستان آیا تھا۔ چند سال کے بعد یہ جماعت ہندوستان سے واپس آئی اور اپنے ساتھ ۱۷۰ مذہبی کتابیں لیتی آئی۔

ایک اور مشہور چینی سیّاح جس نے اسی غرض سے ہندوستان کا سفر اختیار کیا شُوان چوان یا ہیون سانگ ہے۔ جو ہر لحاظ سے برجستہ ترین و بزرگ ترین چینی سیّاح مانا گیا ہے۔ یہ مشہور جہاں گرد ۶۰۵ء میں اُس زمانے کے ایک بزرگ علمی مرکز گوہانگ میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم ایک بُدھی صومعہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد کئی سال تک خود بدھ کی کتابوں کے مطالعے میں مشغول رہا۔ لیکن اس پر قناعت نہ کرکے اس سرزمین کی مسافرت کا عزم کر لیا جس نے خود اس آئین کے بانی کو اپنی آغوش میں پالا تھا۔ لیکن اُسے اس امر میں بڑی مشکلات کا سامنا رہا۔ اور شاہ تائی سنگ نے بھی اُسے اس قصد سے روکا۔ لیکن سُوان چان ایسا شخص نہ تھا کہ آسانی سے اپنے ارادے سے دستکش ہو جاتا۔ چنانچہ اس راہ میں انواع مشکلات کے مقابلے کے لئے تیار ہو کر سرحدی نگراں ملازموں کو دھوکا دے کر فاہین کی طرح ریگستان گوبی میں مردانہ وار قدم رکھا۔ راہ میں کئی مرتبہ غیر متوقع حوادث سے دوچار ہوا۔ اور قریب تھا کہ اس کی شمعِ حیات گُل ہو جائے۔ لیکن اس کے عزمِ راسخ میں ذرا بھی خلل واقع نہ ہوا۔ ایک مرتبہ ایک گرم ریگستان سے گزرتے ہوئے پانی کی مشک پھٹ گئی اور سارا پانی بہہ گیا۔ بیچارہ چار شبانہ روز بغیر ایک قطرۂ آب کے اسی وسیع میدان میں سرگرداں و پریشان گھومتا گیا۔ اثنائے راہ میں ایک خانِ تاتاری سے ملاقات ہوئی جو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اور اس کے فضل و دانش سے متاثر ہو کر اُسے ترغیب دلائی کہ اپنے ارادہ سے باز آکر وہیں رہ جائے اور مقامی لوگوں کو بُدھ دھرم کی تعلیم دے۔ لیکن سوان چان اپنے اصلی نصب العین کے ترک پر راضی نہ ہوا۔ زد و رد تہدید و سرزنش نے اُس پر کوئی اثر نہ کیا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ دیکھ کر اس ظالم خان نے

کے پنجے سے رہائی دشوار ہے۔ مشروبات و ماکولات کے استعمال سے یک لخت ہاتھ کھینچ لیا۔ اور کئی دن تک متواتر بھوک اور پیاس کی کڑیاں جھیلتا رہا۔ اور قریب تھا کہ اس کا رشتۂ حیات منقطع ہو جائے۔ جب خان نے سمجھ لیا کہ وہ کسی صورت سے اپنے ارادے سے باز نہیں آسکتا تو مجبوراً اُسے اُس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

الغرض سُوان چانگ نے پھر اُسی حالِ زار سے ہند کی جانب رُخ کیا۔ اثنائے راہ میں کوہ ہندوکش کے بلند اور برف پوش دروں سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ خود اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے: "حقیقت میں ایسے مقام کا سفر جہاں برف اُس زمانے سے جمع ہو رہی ہو جب خدا نے دُنیا کو پیدا کیا تھا آسان کام نہیں ہے۔ اور اُسے خطروں سے خالی نہ سمجھنا چاہیئے۔ سات شبانہ روز کی بے سُود کوشش کے بعد جب اُس نے پلٹ جانے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ اُس کے ہمراہیوں سے چودہ نفر ہلاک ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہمت کے دھنی سُوان چُوان ہندوکش کو عبور کرکے بامیان و کابلستان کے راستے سے ہندستان کی سرزمین میں وارد ہوا مفصّل شرح پشاور سے لکھی ہے۔ اس کے بعد دو سال تک کشمیر میں رہ کر بدھ کی کتابوں کے مطالعے اور جستجو میں مشغول رہا۔ اس کے بعد مگدھ آیا جو بدھ دھرم کا مرکز تھا۔ اور پانچ سال تک یہاں مقیم رہا۔ اپنا سارا وقت مذہبی کتابوں کے پڑھنے اور زبانِ سنسکرت حاصل کرنے میں صرف کرتا تھا۔ پھر بنگالہ کی راہ سے جنوبی ہند کے لئے روانہ ہوا۔ اور سیلون جانا چاہتا تھا۔ لیکن اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوا۔ اور ساحل ملابار پہونچ کر جانبِ شمال دریائے سندھ کی جانب رُخ کیا۔ اور دوبارہ ہند شمال غربی کی سیاحت کی اور پھر وہاں سے مگدھ آکر کئی سال وہاں رہا۔ اس کے بعد پنجاب، کابلستان اور بکتریا (باختر) کے راستہ سے اپنے وطن مالوف کو واپس گیا۔ اثنائے راہ میں ترکستان کے چند شہروں میں بھی قیام کرکے اپنے موجودہ معلومات میں اضافہ کیا۔ آخرکار ۱۶ سال کی طولانی مدّت کی مسافرت کے بعد اپنے وطن پہنچ گیا۔

اس مسافر کو جو اپنی سیاحت سے پہلے گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کر رہا تھا اور بادشاہِ وقت اور مامورین دولت کے ڈر سے علانیہ اس سفر کی مبادرت نہ کرسکتا تھا۔ یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ خود بادشاہ اس کے استقبال کے لئے حاضر ہے۔ اور جملہ صاحب منصبان ملکی و نظامی بکمالِ گرمجوشی اس کے خیر مقدم کے لئے بازاروں اور سڑکوں پر جمع ہیں۔ اور شارعِ عام کے دونوں جانب فوجیں اس کی ورود کی منتظر ہیں۔ بادشاہ نے اپنی گذشتہ رفتار پر اظہارِ ندامت و پشیمانی کرکے معذرت چاہی اور ہر نہج سے اس کی دلجوئی میں کوشش کی۔ یہاں تک کہ اسے ایک عہدۂ جلیلہ عطا کرنا چاہا، لیکن یہ تشنۂ بادیۂ معرفت اس پر راضی نہ ہوا اور مودّبانہ اس کی قبولیت سے انکار کردیا اور بقیّہ اپنا سیاحت نامہ لکھنے اور مطالعۂ علمی میں صرف کی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ شخص ہندوستان سے واپس ہوتے ہوئے اعلیٰ قسم کے گھوڑے۔ کتابیں متعدد گراں بہا تاریخی معلومات بدھ کے کئی بُت جنہیں سے ایک طلائی تھا اور نادر چیزیں اپنے ساتھ لے آیا جنہیں دیکھ کر اس کے اہلِ وطن حیران رہ گئے

چلا سیاح جن کی مسافرت کا ذکر اوپر آچکا ہے ہندوستان خشکی کی راہ سے آئے تھے۔ لیکن "آئی تسنگ" پہلا چینی سیّاح ہے جس نے دریائی راستہ بجائے خشکی کے راستے کے اختیار کیا تھا۔ مشارالیہ نے ۶۵۳ء میں جب اس کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ سفرِ ہند کے لئے کمر ہمت باندھی۔ لیکن سوءِ اتفاق سے ۱۷ سال تک شاہدِ مقصود کی صورت دیکھی۔ لیکن ساری طویل مدّت میں ایک دقیقہ بھی اپنے نصب العین سے غافل نہ رہا۔ اور برابر تدبیر میں مشغول رہ کر زبان سنسکرت سیکھنے اور بدھ کی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ اس کے بیشتر رفقاء راہ نے جو ابتدائے ہمسفر تھے زیادہ انتظار سے دل سرد ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور اپنے اپنے گھر واپس گئے۔ ان میں سے صرف ایک نے اس کی ہمراہی کی۔ لیکن بیمار ہو کر وہ بھی اس سے جُدا ہو گیا۔

آئی تسنگ چھ ماہ تک بمقام بھوگا (موجودہ پولم بنگ) مقیم رہ کر زبان سنسکرت پڑھتا رہا اسی ضمن میں اسے جزائر نکوبار کی مختصر کیفیت لکھنے کا بھی موقع مل گیا۔ اس نے وہاں کے باشندوں کو برہنہ بتایا ہے۔ اور لکھا ہے:۔ یہاں کے لوگ طرح طرح کے میوے اور دوسری مقامی پیداوار مثلاً ناریل، کیلا، گنّا وغیرہ لاتے تھے اور ان کے عوض میں لوہا طلب کرتے تھے۔ انکار کی صورت میں مسافر پر زہر آلودہ تیر چلاتے تھے۔ ۶۷۳ء میں یہ مشہور چینی سیّاح ساحلِ ہند پر

پہنچ کر دریائے ہگلی کے کنارے مقام تمرالی پتی پر کشتی سے اُترا اور تھوڑے ہی عرصے کے توقف کے بعد سرزمین ہند میں داخل ہوا اور ایک بڑے قافلے کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔ راستے میں بیمار ہوجانے کی وجہ سے قافلے سے پیچھے رہ گیا۔ چوروں اور ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ جنہوں نے اس کا سارا سامان چھین چھان لیا۔ بیچارہ بڑی مصیبت کے بعد کسی نہ کسی طرح نالندا پہنچا جو ہند قدیم کا ایک بڑا علمی و عرفانی مرکز تھا۔ اس سے پہلے سوان چان نے بھی اس شہر کو دیکھا اور یہاں کے بناہائے عالی و موسسات بزرگ عرفانی سے بہت متأثر ہوا تھا۔

ان میں سے ایک مندر میں اسّی بڑے کمرے (ہال) اور تین سَو چھوٹے کمرے تھے۔ آئی تسنگ یہاں چودہ سال تک رہا اور اسی سلسلہ میں گرد و نواح کی بھی سیاحت کی واپسی کے موقع پر کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ ساتھ لئے اسی راستے سے بھوگا آیا۔ یہاں آکر ان کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ اور ان میں سے کئی ایک کا ترجمہ چینی زبان میں کر ڈالا۔ ترجمہ کی کتابیں مسافروں کے ذریعہ سے اپنے وطن بھی روانہ کیں۔ ایک دفعہ اسی غرض سے کشتی کے عرشہ پر چڑھا اتفاق سے تند ہوا چلنے لگی جو کشتی کو بندرگاہ سے باہر ہٹا لے گئی۔ اور آئی تسنگ کو لیجا کر چین پہنچا دیا۔

آئی تسنگ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سماترا واپس آیا اس مرتبہ یہاں اس کا قیام چار سال تک رہا ۶۹۵ء میں پھر چین واپس گیا مقامی ملکہ اس کے استقبال کے لئے خود آئی۔

اس کے سفرنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی مسافرت کا زمانہ پچیس سال کے قریب ہے تیس ملکوں کی سیاحت کی اور دو سو تیس کتابیں اپنے ساتھ وطن لے آیا اس کی عمر کا بقیہ حصہ انھیں کتابوں کے ترجمہ میں صرف ہوا

گزشتہ جنگ عظیم اور مشترک خطرے نے ان دو دوست اور ہمسایہ سلطنتوں کے جو کچھ عرصہ تک دوچار مشکلات رہیں فرہنگی و تجارتی روابط کو ازسرِنو تازہ کردیا۔ ہند و چین دونوں نے بیک وقت خود کو جاہ طلب اور خون آشام دشمن کے مواجہہ میں پاکر چار سال تک دوش بدوش حفظ وطن و ناموس شرف ملّی کی راہ میں فداکاری کرکے قربانیاں پیش کیں اور آخرکار اسی شرکت مساعی و اتحاد و یگانگی کی بدولت دشمن کو شکست دے کر شاہد فتح و فیروزی سے ہم آغوش ہوئیں۔ امید ہے کہ اب پہلے سے بھی زیادہ دونوں حکومتوں کے دوستانہ تعلقات مستحکم و استوار ہوجائیں گے۔ اور ان دو ملکوں کے باشندوں کو بہتر و بیشتر ایسے وسائل بہم پہنچیں گے کہ ان کی بدولت ایک دوسرے کے آداب و مراسم گوناگوں قابل ستائش۔ فلسفہ و ادبیاتِ لطیفہ سے مستفید ہوسکیں گے اور مل جل کر دنیا میں خدمت انجام دیں گے۔

حفاظتِ خوراک کیلئے سائینسی تدابیر

گائے بھینس اور بکری کا دُودھ تو پیا ہی جاتا ہے۔ لیکن اب مونگ پھلی سے بھی دُودھ اور دہی تیار ہونے لگا ہے۔ میسور کی سنٹرل فوڈ ٹیکنولاجیکل ریسیرچ انسٹی ٹیوٹ میں جن لوگوں نے یہ دودھ اور دہی دیکھا ہے۔ وہ اصلی اور مصنوعی میں کوئی امتیاز نہیں کر سکے۔

مذکورہ انسٹی ٹیوٹ ان گیارہ قومی تجربہ گاہوں کے سلسلے میں چھٹا ادارہ ہے جو بھارت سرکار نے ملکی ترقی کے لئے شروع کیا ہے۔ اس کا افتتاح پچھلے سال شری راج گوپال آچاری نے کیا تھا۔ اس ادارے کو مخفف طور پر 'کیفٹری' کا نام دیا جاتا ہے۔

کیفٹری کا مقصد خوراک کی صنعت و حرفت کے ذریعے سے خوراک کے بہتر تحفّظ اور ان غذائی اجناس کو زیادہ مفید طور پر استعمال کرنا ہے جو ملک میں دستیاب ہوتی ہیں۔ اس ادارے کے کام کا اندازہ ان اقدام سے ہوگا۔ جو یہ ہم وطنوں کے غذائی مسائل حل کرنے کے سلسلے میں سرانجام ہوگا +

انیس رضوی امروہی

ثالث بالخیر

(۱)

مہندر بھون کا ہیرا اپنی بیوی کے ساتھ نیچے کی منزل میں سامنے والے کوارٹر میں رہتا تھا۔ کوارٹر کی پچھلی کھڑکی سے بھون سے باہر والی دنیا کا ایک محدود نظارہ دونوں میاں بیوی کی دلچسپی کا باعث ہوتا، اور کبھی کبھی گفتگو کا موضوع بن جاتا —— ہاں کبھی کبھی، یعنی جب انہیں اپنے اوپر رہنے والوں کے حالات و معاملات کے متعلق کچھ کہنے سننے کو نہ ہوتا۔ نچلی منزل پر رہتے کے باوجود انہیں اس پنج منزلہ عمارت کے سب سے اوپر والی منزل میں رہنے والوں سے بھی وہی لگاؤ تھا، جو برابر رہنے والے کرایہ داروں سے۔ تاہم اس وسیع اور عالی شان عمارت میں ان دونوں کی حیثیت کسی تھیٹر کے ادنٰے ملازمین سے زیادہ نہ تھی۔ جو اسٹیج پر ایکٹروں کو آتے جاتے، اپنا پارٹ ادا کرتے۔ منظروں کو تبدیل ہوتے دیکھتے رہتے ہیں، لیکن اس کھیل کے مسرت انگیز یا الم ناک انجام سے بے خبر رہتے ہیں، جس میں وہ ایکٹر مصروف ہوں۔

بھون کے تیس کرایہ داروں میں سے ہیرا اور اس کی بیوی پرکاش صاحب اور شریمتی پرکاش —— فلیٹ نمبر ۲۵، پانچویں منزل —— کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ دونوں اس نوجوان جوڑے کی عام خوش اخلاقی اور نیک مزاجی کے بارے میں متفق تھے، تاہم دونوں اپنی اپنی پسند کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ نظریہ رکھتے تھے —— ہیرا بہت سی باتوں کی وجہ سے پرکاش صاحب کو زیادہ چاہتا تھا اور جو بخشش اس محبوب کرایہ دار سے وقتاً فوقتاً ملتی رہتی تھی وہ اس کی توقعات سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ اس کی بیوی شریمتی جی کو ترجیح دیتی تھی، کیوں کہ یہ "پیاری پیاری چھوٹی سی دلہن" اپنی استعمال شدہ پوشاکوں اور دوسری گھریلو اشیاء کے بارے میں بہت فیاض طبع معلوم ہوتی تھی۔ ان دونوں کے نزدیک جنت کا تصور بھی ایک ایسے ہی مکان سے ہم کنار نظر آتا تھا، جس میں پرکاش اور ان کی بیوی جیسے خاموش، نیک مزاج اور کسی کو تکلیف نہ دینے والے جوڑے رہتے ہوں۔

مہندر بھون میں ایک برقی لفٹ بھی لگا ہوا تھا، مگر تھا پرانے ٹائپ کا، جو چکردار زینہ کے بیچ میں سے ہوتا ہوا پانچویں منزل تک جاتا تھا اور جس کا خول جالی دار لوہے کا تھا۔ جالی دار خول ہونے کی وجہ سے لفٹ میں چڑھنے اترنے والوں کو ہر منزل کا صحن اچھی طرح نظر آجاتا تھا۔ گو صحن سے دیکھنے والوں کی نظر میں ان لوگوں کے لئے پنجرے اور جانور کا تصور ہی کیوں نہ کھنچ جاتا ہو۔ کبھی کبھی —— لیکن بہت کم —— اس لفٹ کی مشینری میں جو زینہ کے نیچے ایک کوٹھڑی میں واقع تھی، کوئی خرابی پیدا ہو جاتی، اور جب کبھی ایسا حادثہ پیش آتا، تو لفٹ جہاں پر بھی ہوتا وہیں رک جاتا۔ چنانچہ بھون کے اکثر کرایہ دار مختلف اوقات میں اس کا تجربہ کر چکے تھے کہ طوطے کو پنجرے میں بند کر کے معلق ٹانگ دیا جائے تو اس کے خیالات و احساسات کیا ہوتے ہوں گے۔

لیکن ہیرا مشینری کے کل پرزوں سے اچھی طرح واقف تھا، لہٰذا ایسی خرابیاں بہت کم واقع ہوتی تھیں، اور بہت مدت میں جا کر کبھی ایسا اتفاق پیش آجاتا تھا۔ ان خرابیوں سے پہلی اور دوسری منزل کے رہنے والوں کو تو کوئی خاص دشواری نہ ہوتی، البتہ تیسری چوتھی اور پانچویں منزل والوں کو اترنے چڑھنے کے لئے کچھ غیر پسندیدہ قسم کی ورزش کرنا پڑ جاتی تھی —— تاہم بیچ میں ہی معلق لٹک کر رہ جانے سے پانوؤں کو ذرا سی تکلیف دے لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا تھا۔

ایک دن اگست کے مہینہ میں ہیرا بغل میں دو اخبار دبائے، جنہیں

ایک کمرہ صاف کرتے ہوئے اس نے ہوا میں اُڑتے پھرنے سے بچا لیا تھا، کوارٹر میں داخل ہوا اور کھانے کے لئے سیدھا رسوئی گھر پہنچ گیا۔ نالی پر ہاتھ دھوتے ہوئے وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا۔

"بڑی خاموشی سی ہے ہر طرف۔ اتنے صاحب لوگ پہاڑ پر چلے گئے" ۔ پھر انگوچھے سے منہ پونچھتے ہوئے بولا "آج صبح پرکاش صاحب اور شریمتی جی میں بہت جھگڑا ہو گیا"۔

"نہیں جی! ..... پرکاش صاحب اور شریمتی جی میں؟" اس کی بیوی نے اپنا سرخ چہرہ چولھے سے پھیرتے ہوئے بوکھلا کر پوچھا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے کیسے معلوم ہوا .... ! میں نے خود سنا۔ ترپن نمبر میں نالی صاف کر رہا تھا۔ سب کچھ سننا ہی پڑا"۔

"روپیہ پیسہ کا معاملہ ہوگا، میرے خیال میں"۔ وہ افسوس ناک لہجے میں بولی اور ہنڈیا کو دیکھنے لگی۔ عام طور پر میاں بیوی میں اسی کے جھگڑے رہتے ہیں"۔

"نہیں .... روپیہ پیسہ کا معاملہ نہیں تھا .... صاحب کو کچھ شک ہو گیا ہے ––– اور وہ تو اتنا تک کہہ رہے تھے کہ تم مجھے فریب دے رہی ہو"۔

"کون! شریمتی جی فریب دے رہی ہیں؟ وہ تو پاگل ہو گئے ہیں۔ یہاں کسی اور عورت کے لئے ایسا کہا جاتا .... مگر وہ .... ہونہہ! وہ تو پاگل ہو گئے ہیں"۔

"یقیناً صاحب غلطی پر ہیں، مجھے سب معلوم ہے۔ سنو، بات یہ ہے کہ رات جب میں برآمدے کی بجلی بند کر رہا تھا، تو شریمتی جی کہیں باہر سے آئیں۔ ٹھیک اسی وقت وہ لڑکا اس کمرے سے نکلا، وہی لڑکا جو بہانہ لئے ہوئے چوبیس نمبر والی مس لیلا سے ملنے کے لئے آیا کرتا ہے۔ قسمت کی بات کہ شریمتی جی کے پیچھے ہی پرکاش صاحب بھی باہر سے آئے اور وہ لڑکا انہیں برآمدے کے دروازے میں واپس جاتا ہوا ملا۔ اُدھر شریمتی جی برآمدے سے اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ بس صاحب نے سمجھ لیا کہ یہ دونوں ملاقات کر کے ابھی الگ ہوئے ہیں۔ سمجھ گئیں؟"

تھوڑی دیر ٹھہر کر بیرا پھر کہنے لگا۔

"بس آج صبح تو دونوں میں خوب چل رہی تھی، اور تعجب نہیں جو رات سے ہی چل رہی ہو۔ شریمتی جی کہہ رہی تھیں۔ آپ میری توہین کر رہے ہیں، میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ کو ایسے غلط الزام لگانے پر معافی مانگنا پڑے گی'۔ اور اس پر صاحب کہنے لگے۔ میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ میرا الزام غلط نکلے۔ لیکن اس بات نے میرے دل میں قوی شبہ پیدا کر دیا ہے پھر کہتے لگے۔ اب میں بتاؤں کہ میں کیا کروں گا۔ اگر وہ بدمعاش پھر مجھے یہاں نظر آیا تو اس کی ناک پر ایسا مکا رسید کروں گا کہ میاں جی کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ میں نے اسے خوب اچھی طرح دیکھ لیا ہے، صورت بھول نہیں سکتا .... میں یہ سب کچھ سن رہا تھا، ایک دیوار ہی تو بیچ میں تھی۔ پھر انہوں نے دروازہ بند کیا تو اتنے زور سے کہ کیواڑ پھٹ گئے ہوں گے ....؛"

پھر جو اصل بات ہے وہ ان سے تم کہہ کیوں نہیں دیتے؟

"کون، میں؟ ہرگز نہیں۔ دوسروں کے نجی معاملات میں ٹانگ اڑانا ایک ایسی بات ہے جس کی مجھے تنخواہ نہیں دی جاتی۔ البتہ اگر انہوں نے مجھ سے پوچھا تو خیر .... انہوں نے رات مجھے بھی برآمدے میں دیکھ لیا تھا"۔

"مگر وہ تم سے ہرگز نہیں پوچھیں گے۔ بس تم نہیں کہو گے تو میں کہہ دوں گی"۔

"کیا؟ .... یہ ظاہر کر دو گی کہ میں نے سب کچھ سُن لیا ہے؟ .... وہ مجھے نہ معلوم کتنا ذلیل سمجھیں گے؟

اچھا خیر! جانے دو۔ مگر یہ بات ہوئی بہت بُری۔ کتنی اچھی ہیں ہماری شریمتی جی۔ اور پرکاش صاحب اگر میرے شوہر ہوتے تو میں انہیں ٹھیک بنا دیتی"۔

اس کا خاوند مسکرانے لگا۔

"تم ضرور ٹھیک بنا دیتیں"!

لیکن کھانا کھاتے ہوئے وہ کسی سوچ میں غرق تھا۔

(۲)

اس رات وہ اپنے کوارٹر پر واپس آیا تو اس کی بیوی اطمینان و مسرت کے لہجے میں کہنے لگی۔

"میں نے پرکاش صاحب اور شریمتی جی کو جاتے دیکھا۔ شریمتی جی

مگر کی کھال کے جوتے پہنے ہوئے تھیں۔ میرے خیال میں ان میں صلح ہو گئی آپس میں . . . . ایسے ملے جُلے اور ہنستے ہوئے جا رہے تھے دونوں"۔

"ہاں اب سب معاملہ ٹھیک ہو گیا"۔

بیرہ دار تیکھی نظروں سے خاوند کو دیکھنے لگی۔

"کیا تم پھر ترپین نمبر میں گئے تھے؟"

"نہیں۔ وہاں سے تو میں صبح ہی نمٹ لیا تھا۔ پانچویں منزل میں اب ہے ہی کون؟ سب چلے گئے سوائے ان دونوں کے"۔

"پھر؟ . . . . بولو' کیا تم نے صاحب سے کچھ کہا سُنا؟"

"میں کیسے کہتا؟ مجھے تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی"۔

"جی ہاں!" عورت طنزیہ لہجے میں کہنے لگی۔ "تو وہ خود آئے ہوں گے تمہارے پاس اور سارا معاملہ تم سے بیان کیا ہو گا!"

"نہیں ــــ نہیں!" بیرا اپنی بیوی کی بے چینی سے لطف اٹھا رہا تھا۔ "صورت یہ ہوئی کہ میں بجلی کی کوٹھڑی میں تھا کہ لفٹ کا بٹن دبا اور مشین کی سوئی پانچ نمبر کی طرف پھر گئی' گویا لفٹ پانچویں منزل پر درکار تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ پرکاش صاحب اور شریمتی جی کہیں جاتے ہوں گے کیوں کہ اس منزل میں آج کل ان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ بس کوئی دو منٹ کے بعد میں زینہ پر چڑھا تو لفٹ اُترتے اُترتے دوسری منزل کے سامنے خود بخود رُک گیا' اور اس میں وہی دونوں تھے"۔

ایک لمحہ توقف کے بعد وہ پھر کہنے لگا۔

"پرکاش صاحب سخت جھنجھلا رہے تھے۔ مجھ سے چیخ کر کہنے لگے کہ ایک جگہ ٹھیک وقت پر پہنچنا ضروری ہے' لفٹ کو جلدی سے ٹھیک کر دو تاکہ ہم باہر آسکیں۔ شریمتی جی خاموش تھیں اور افسردہ ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ خیر میں پھر نیچے اُتر کر آیا' لیکن مشین میں مجھے کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ کوئی دس منٹ کے بعد میں پھر دوسری منزل پر گیا اور پرکاش صاحب سے کہہ دیا کہ مشین میں تو کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی' البتہ میں ہر منزل کے دروازوں کو دیکھ لوں۔ شاید کہیں کوئی کنکشن لفٹ کے اترنے میں ٹوٹ گیا ہو۔ اس وقت تم انہیں دیکھتیں' ایسے بوکھلا رہے تھے' جیسے اب عمر بھر اسی میں قید رہیں گے"۔

وہ پھر ٹھہر گیا اور بیوی کے پریشان چہرے پر نظر ڈالی۔

"کوئی پونے آٹھ بجے ــــ اسی وقت روزانہ وہ لڑکا آیا کرتا ہے ــ میں اوپر سے دروازوں کو دیکھتا ہوا دوسری منزل پر آیا اور وہاں کے دروازے کو کھٹ پٹ کر کے درست کر ہی رہا تھا کہ وہ لڑکا مس بیلا سے ملنے کے لئے آ گیا۔ وہ کبھی لفٹ کی پروا نہیں کرتا۔ اس نے چوبیس نمبر کا دروازہ کھٹکھٹایا' پرکاش صاحب بڑے غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ مس بیلا نے دروازہ کھول کر کہا۔ "ہیلو ڈارلنگ" اور بڑے محبّت بھرے لہجے میں۔ میں نیچے اتر کر پھر بجلی کی کوٹھڑی میں گیا اور ایک منٹ میں لفٹ ٹھیک کام کرنے لگا۔ اس کے بعد جب میں کوٹھڑی سے نکل کر دوبارہ زینے کے پاس آیا' تو وہ لفٹ کے دروازے سے نکل رہے تھے اور پرکاش صاحب بڑے زور زور سے باتیں کرتے جا رہے تھے"۔

"قسمت اچھی تھی شریمتی جی کی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی"۔

"ہاں۔ مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی"۔

بیرے نے دلی مسرّت کے اظہار میں مسکرا کر دانت نکال دیئے اور اپنی چلم بھرنے لگا۔

"تو اس دفعہ لفٹ میں خرابی کیا ہو گئی تھی؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"خرابی؟ . . . . کچھ بھی نہیں۔ جب پرکاش صاحب اس لڑکے کو چوبیس نمبر میں جاتے اور مس بیلا سے ملتے ہوئے اچھی طرح دیکھ چکے' تو میں نے نیچے جا کر بٹن دبا دیا اور . . . . اور بجلی کھول دی"۔

محمد وسیم خاں شروانی

"مجذوبِ فرنگی"

فلسفیٔ مشرق نے نطشے کو مجذوبِ فرنگی کے نام سے یاد کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کو اس سے بہتر کسی اور نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔ لیکن یہ ایشیائی مجذوب نہ تھا جس کی آواز "بڑ" بن کر رہ جاتی۔ بلکہ یہ وہ مجذوب تھا جس کی جبروتی آواز کبھی قیصر کی شکل میں گونجی اور اس کے بھیانک گیت کبھی ہٹلر کی شکل میں برسے۔ وہ دیوانہ سہی لیکن عالمِ دیوانگی میں ایسی ہوش کی باتیں کر گیا ہے کہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنی بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ ابلیس نے تو صرف آدم کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا تھا، لیکن اس رندِ بےباک کا سر خدائے قہار و جبار کے سامنے بھی نہ جھک سکا۔ اس نے خدا کی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے انسان کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اور اس طرح اپنے "افکارِ نو" سے ایک نئی دنیا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ عیسائیت کا سب سے بڑا دشمن تھا، اور عمر بھر اس کے خلاف جنگ کرتا رہا۔ اس کا ہاتھ "خونِ چلیپا" سے رنگین ہے۔ کیونکہ کلیسائی تعلیم نے زندگی کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔ اس نے سسکتی ہوئی انسانیت کو مسیحیت کے خونی پنجوں سے آزاد کرا کے اس کی سرد اور سست نبضوں میں گرمی پہنچائی۔ اس کی نظر میں عیسائی مبلغ اور واعظ زندہ تابوت ہیں جو انسان کو موت کے غار میں دھکیلنے کے لئے دعوت دیتے رہتے ہیں۔ انجیلِ مقدس کو وہ دستاویز غلامی سے تعبیر کرتا ہے۔ کیونکہ وہ نفیٔ حیات کی تعلیم دیتی ہے۔ اور غلامانہ ذہنیت کی پشت پناہ ہے۔

اس مجاہد کا بچپن اس کی ماں کے لئے ایک حسین خواب بن کر آیا۔ لیکن بدنصیب عورت کو یہ خبر نہ تھی کہ اس کے نونہال کی جوانی اسی خواب کی بھیانک تعبیر ہے۔ اس کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا کا درد سمٹ کر ان میں سما گیا ہے لیکن کون جانتا تھا کہ ایک دن انھیں امرت پیالوں سے شعلے برسیں گے۔ اس کی ماں کی دلی تمنا یہ تھی کہ وہ مرحوم باپ کے نقشِ قدم پر چلے۔ منبر پر چڑھ کر آسمانی باپ کی عظمت و جلال کا وعظ دے، اور اس کے مقدس بیٹے کی حیات پُر رہبانیت کی تعلیم دے کر جنت میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لے۔ لیکن اسے پتہ نہ تھا کہ اس کا سپوت ایک دن آسمانی باپ کو بے تاج کر دے گا، اور اس کی حکومت چھین کر خود ہی حاکم بن بیٹھے گا۔

نطشے کو پدری ورثے میں کمزور اور کھوکھلا جسم ملا تھا۔ ذہنی امراض نے بچپن کا فطری جوش و ولولہ اس سے چھین رکھا تھا۔ اور اسی وجہ سے اسے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس پر احساس کمتری کا اس قدر غلبہ تھا کہ اسکول میں وہ اپنے ہم جماعتوں کے سائے سے بھی بھاگتا تھا۔ شریر لڑکے اسے ننھا پادری کا خطاب دے کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ یہی ننھا پادری جوان ہو کر تمام دنیا کو تختۂ مشق بنا ڈالے گا۔ نطشے کو قدرت سے یہ شکایت تھی کہ اُسے اتنا لاغر و نحیف جسم کیوں دیا گیا۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیا وہ بھی گوئٹے کی طرح لازوال انسان بن سکتا ہے۔ کیا اس کا دماغ بھی فاؤسٹ سا شاہکار پیدا کر سکتا ہے؟ لیکن جب وہ خود کو دیکھتا تو اس کے آرزوؤں کے چراغ خود بخود بجھتے نظر آتے تھے۔ آہ! اس راکھ کے ڈھیر سے کبھی چنگاری نہیں نکل سکتی۔ اس ناتواں جسم میں کبھی توانا روح نہیں آ سکتی! اس خیال سے اس کا دل لرز جاتا تھا اور سر چکرا اٹھتا تھا۔

بچپن میں نطشے کو جن چنگاریوں کی تلاش تھی جوانی میں وہ اُسے یونانی حکایتوں میں مل گئیں۔ یونانی دیوتاؤں اور انسانوں کے تعلق نے اس کے دماغ میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس کی زندگی میں

ایک نئی شان پیدا کر دی۔ یہ حکایتیں کیا ہیں؟ غیر فانی دیوتاؤں کے خلاف انسانوں کی فتح مندیوں کے کارنامے۔ آدم نے انتہائی صعوبتوں اور اذیتوں کے باوجود انسان ہی رہنا پسند کیا۔ وہ کانٹوں میں گھسیٹا گیا زنجیروں میں جکڑا گیا۔ صرف اس لئے کہ وہ اپنے ارادوں کا خود ہی مالک ہونا چاہتا تھا۔ دیوتا یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ یہ خاکی پتلا اپنی تقدیر کا خود ہی مالک و مختار بن جائے۔ وہ انسان کو ہر چیز بخشنے کو طیار تھے۔ لیکن اس کی قسمت کو اپنی گرفت میں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن انسان اپنی بات پر اڑا ہی رہا، اور آخر میں کامیابی اسی کو ہوئی۔ دیوتاؤں کو شکست ماننی ہی پڑی۔ نطشے بھی یونانی ہیرو بننا چاہتا تھا۔ وہ بھی دنیا کے سمندر میں تلاطم خیز موجوں سے لڑنے کی خواہش رکھتا تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ پیر بُری طرح ساحل سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس کا کمزور دل اس کے اس عزم پر ہنستا تھا۔ اور صاف صاف کہہ رہا تھا کہ وہ بُزدل ہے۔ پست ہمت ہے۔ جب اُس کے ملک کو آسٹریا کے خلاف لڑنا پڑا تو اس کو بھی جنگی خدمت کی دعوت دی گئی۔ لیکن ہلاکو اور چنگیز خاں کا وارث بننے والا اس جنگ کی دعوت سے تھرّا اٹھا۔ اس کی جوانی کانپ اُٹھی۔ وہ امن و سکون کی گھنی چھاؤں میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اپنے آپ کو آگ کے دھارے میں ڈال دے۔ بیوہ ماں کے گھر کا اکیلا چراغ کیسے اپنے آپ کو آندھیوں کے سپرد کر دے۔ حکومت اس کی بےکسی کی آواز کو نہ سن سکی۔ اس کے عذر کو نہ مانا۔ لیکن قدرت کو اس کی تھرتھراہٹ پر رحم آ گیا۔ فوجی ٹریننگ کے دوران میں ایک دن گھوڑے پر سے گر پڑا۔ جس سے اُس کے سینے میں سخت چوٹ آئی اور اس طرح جنگی خدمات سے اس کو نجات مل گئی۔ واقعی وہ گر پڑا۔ یا دانستہ اُس نے اپنے کو گرا لیا۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ کچھ بھی ہو سکون تو مل گیا۔ اس کی دھنسی ہوئی بے نور آنکھوں میں پندار و عظمت کی نہیں بلکہ اطمینان و مسرت کی جھلک دوڑ گئی۔

اگرچہ اس کی پست ہمتی بہت دنوں تک اس کے منصوبوں میں حائل ہوتی رہی۔ لیکن آخر کار اس نے اس پر قابو پا ہی لیا۔ جب اس کو مکمل فتح حاصل ہو گئی تو اُس نے دنیا کو پیغام دیا۔ صلح و آشتی کا نہیں جنگ و خونریزی کا۔ زندگی کی قوتِ پنہاں کو دبانے کا نہیں اُبھارنے کا۔ اس کا کہنا ہے کہ تخلیقی قوتوں کے مالک ہی دنیا پر حکومت کر سکتے ہیں۔ ارادے کی پختگی اور سخت کوشی ہی انسان کو اعلیٰ مقام پر پہنچا سکتی ہے۔ انسان کو جنگجو، سنگدل اور خوں ریز ہونا چاہئے۔ اس میں وہ قہّاریت ہو جس کو دیکھ کر پہاڑ لرز اُٹھیں۔ اور دریاؤں کے دل دہل جائیں۔ اس کو ایسا سیلِ تُند رَو ہونا چاہئے جو بے دردی سے باغ و راغ کو بہا لے جائے۔ اُس کے مذہب میں صلح و آشتی کفر ہے۔ اور جنگ ایک مقدّس چیز۔ لوگوں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا کوئی دلیل ایسی ہو سکتی ہے جو جنگ کی سی ہولناک چیز کو تقدّس کا جامہ پہنا سکے۔ اس کا جواب یہ تھا کہ جنگ ایسی شے ہے جو ہر چیز کو پاک بنا سکتی ہے۔ وہ پارس پتھر ہے جو ہر شے کو سونا بنا سکتی ہے۔ مصیبت زدہ مسافروں کو کس نے وادیٔ پُر خار سے نکالا ہے۔ یتیم بیواؤں کو کس نے سہارا دیا ہے؟ مظلوم اور ناتوانوں کی کس نے حفاظت کی ہے؟ کیا یہ رحم کا دیوتا کر سکتا ہے؟ نہیں۔ یہ جنگ کا دیوتا ہے جس نے کمزوروں کو زبردستوں سے بچایا ہے۔ اس کے رحم ایک مہلک بیماری ہے جو انسان کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اس کے مقصدِ حیات میں بڑی رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ رحم کے دامن میں تباہی اور بربادی کے کانٹے ہیں۔ جو انسانیت کو برسوں سے مجروح کرتے آئے ہیں۔ دنیا میں رحم کے پجاریوں سے بھی زیادہ کوئی نادان ہو سکتا ہے؟ دوسروں کی ہمدردی میں خود کو بھی غم و الم کی آگ میں جلانا اس کی تعلیم نہیں۔ کیونکہ اس رویے سے تمام دنیا میں سوائے مریض و تیماردار کوئی اور نظر نہ آئے گا۔ اور گوئٹے کے قول کے مطابق دنیا دواخانہ بن جائے گی۔ عوام سے ہمدردی کرنا اُن کی مصیبت کے برداشت کرنے کی قوت کو زائل کرنا ہے۔ اس لئے اس نے فوق البشر کو اس جذبۂ رحم و ہمدردی سے خبردار رہنے کو کہا ہے۔

نطشے کہتا تھا کہ دہشت پسندی، سخت کوشی اور عملِ پیہم سے انسان فوق البشر ہو سکتا ہے۔ زندگی آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہر شے میں ارتقا جاری ہے۔ بندر ارتقائی مدارج طے کر کے انسان کے رتبے کو پہنچا ہے۔ اور اب انسان کو انسان سے بالاتر ہونا ہے۔ وہ مذہب کے فریب میں آ کر یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ یہی اس کی آخری منزل ہے۔ اس کو تیز گامی سے فوق البشر کی منزل کی طرف بڑھنا ہے۔ اگر اس کے ارادے میں پختگی ہے تو پہاڑ اس کے آگے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، اور دریا اس کے راستے سے ہٹ جائیں گے۔ انسان بھی اگر اس کی راہ میں حائل ہوا تو وہ بھی

کیڑے مکوڑے کی طرح پس جائے گا۔

نطشے کے نزدیک انسان اسی وقت اعلیٰ مقاصد حاصل کرسکتا ہے جبکہ وہ اخلاقی بندشوں سے آزاد ہوجائے۔ اس کے یہاں خوفِ گناہ اور ضمیر کی آواز بے معنی چیزیں ہیں۔ یہ مذہب کی پیدا کردہ رکاوٹیں ہیں جو انسان کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ یہ خیر و عدل کی عمارت جو مذہبی پیشواؤں نے بنا رکھی ہے ڈھا دینے کے قابل ہے۔ اور ہوا و ہوس کے صنم کدوں کو پھر سے آباد کرنے کی ضرورت ہے۔ جن کو مذہب نے اُجاڑ کر رکھا ہے۔ یہ زنگ آلود نیکیوں کی زنجیریں جو صدیوں سے انسان کو جکڑے ہوئے ہیں توڑ دینے کے لائق ہیں۔ مذہب کا بنایا ہوا اخلاق غلامانہ اخلاق ہے۔ جس نے انسانی وجود کو گناہ اور عذابِ آخرت کے تصوّرات سے خائف کر دیا ہے۔ قدیم زمانے میں مردانِ صالح انھیں کو سمجھا جاتا تھا جو طاقتور تھے، جن کے بازوؤں میں زور تھا۔ وہی صاحبِ اقتدار مانے جاتے تھے جنکو ہمت کی بنیاد قوت پر تھی۔ قوت کا دوسرا نام خیر تھا۔ اس کے برخلاف غیر صالح حقیر اور قابلِ نفرت وہ لوگ تھے جو کمزور ناتواں اور بزدل تھے۔ بزدلی اور پست ہمتی کا دوسرا نام شر تھا۔ لیکن زمانے کی رفتار نے اس خیر و شر کے نظریے ہی کو بدل ڈالا۔ کمزوروں نے برسوں کی غلامی کا جوا اُتار کر بڑی صفائی سے بہادروں کی گردن پر رکھدیا۔ ان ناکارہ اور پست ہمت پادریوں نے جب دیکھا کہ اہلِ ہمت کے سامنے اُن کا چراغ نہیں جل سکتا۔ تو مذہب کے کارخانے کی ڈھلی ہوئی اخلاقیات کی بیڑیاں مجاہدوں کے پیروں میں ڈال دیں۔ تاکہ وہ ان کو رحمت سمجھ کر پہنے رہیں۔ اور اُن کے خلاف سر نہ اُٹھا سکیں۔ جسمانی قوت کو قابو میں رکھنے کے لئے روحانی قوت کا حربہ استعمال کیا گیا۔ اور مکر و فریب سے کبوتر نے شاہین کو بے دست و پا کر دیا۔ ان بزدلوں نے مذہب کے پلیٹ فارم سے پست ہمتی اور بزدلی کی خوبیاں ایسے دلکش انداز میں بیان کرنا شروع کیں کہ صاحبِ قوت کو اپنی رفعت اور عظمت پر شرم آنے لگی۔ اُنھوں نے دنیا کو بتلایا کہ یہ مفلس و نادار ہی تو خدا کے نیک بندے ہیں۔ انھیں اپاہجوں اور کمزوروں کے لئے جنّت بنی ہے۔ جہاں فرشتے اُن کا خیر مقدم کرنے کے لئے کھڑے ہیں اور حوریں اُن کے انتظار میں بیتاب ہیں۔ اور ان اقتدار والوں اور عالی ہمتوں کے لئے دوزخ کے انگارے ہیں۔ جو انھیں قیامت تک جلاتے رہیں گے۔ "دنیا پرست کتوں" کے لئے "رحم دل" خدا نے بڑی سزائیں تجویز کر رکھی ہیں۔ رسوائی و ذلّت انھیں کے لئے اُتری ہے، اور ابدی طوقِ لعنت انھیں کی گردنوں کے لئے ہے۔ نطشے کے نزدیک دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ مقدّس فریب کی مثال پیش نہیں کرسکتی ہے۔ کس ہوشیاری سے قوّت کو اہرمن بنا دیا گیا اور پست ہمتی خدا بن بیٹھی۔ یہ ہے انتقام غلاموں کا اپنے آقاؤں کے خلاف۔ کیا اس سے بھی زیادہ دہشت انگیز کوئی اور انتقام ہوسکتا ہے؟

نطشے، شوپنہار کی طرح دنیا سے بھاگ کر موت کی آغوش میں پناہ لینے کو جُرم سمجھتا ہے۔ وہ اپنے دوش پر زندگی کا جنازہ لئے ہوئے ماتم نہیں کرتا۔ وہ دنیا کی رنگینیوں کو ٹھکرا کر "روحانی نٹ" بننے کا قائل نہ تھا۔ وہ جینا چاہتا تھا خواہ جینے میں کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اُس نے شوپنہار کے عزمِ حیات کو تو تسلیم کرلیا، لیکن اس کے قنوطی پہلو کو ٹھکرا دیا۔ اس قنوطیت کے امام کو وہ اس وقت تک رہبر بناتے رہا، جب تک وہ صحیح راستے پر نظر آیا۔ لیکن جہاں اس کے قدم غلط راستے پر پڑنے لگے وہیں سے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ شوپنہار کہتا ہے کہ دنیا کی ہر شے میں قوتِ ارادی کام کر رہی ہے۔ ہمارے افعال و کردار کی محرک یہی ہے۔ حیوانات و نباتات کا انحصار اسی پر ہے۔ لیکن یہ قوّت بے ضابطہ و بے اصول ہے۔ اس کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہی انسان کے دل میں آرزوؤں کے محل طیّار کرتی ہے، اور اس کے سینے میں تمنّا کے چراغ جلاتی ہے لیکن تمنّائیں بہت کم پوری ہوتی ہیں۔ بالفرض ایک خواہش پوری ہوگئی تو اس کی جگہ کتنی اور خواہشیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ خواہشوں کا یہ لامتناہی سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔ جہاں تمنّاؤں کے پھول کھلیں گے، وہاں حسرت و یاس کے کانٹے بھی ضرور رہوں گے۔ اس لئے شوپن ہار نے ان کانٹوں سے بچنے کے لئے عیسائیت کے دامن میں پناہ لی، اور انسانیت کی فلاح نفس کُشی اور رہبانیت میں تبلائی۔ یہیں سے نطشے شوپن ہار کو خیرباد کہتا ہے، اور اپنا ایک نیا امّید افزا فلسفۂ زندگی مُرتّب کرتا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ عزمِ حیات دراصل عزمِ جنگ ہے، جو ہمیں طوفانوں میں پہاڑ کی چٹانوں کی طرح کھڑا رہنا سکھاتی ہے۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک کے باوجود زندگی کے سفر

قدم بڑھائے جانا مجاہدانہ شان ہے۔ کانٹوں میں آبلہ پا دوڑنا اس کی چبھن میں لذت محسوس کرنا ہی تو جینے کا نام ہے۔ دنیا کی تسخیر صرف ہمتوں کی بلندی اور ارادوں کی پختگی ہی سے ہوسکتی ہے۔ اس کے آگے سپر ڈال دینا انسانیت کی توہین ہے۔ زندگی کو اثباتی اقدار ہی سے فروغِ جاودانی حاصل ہوسکتا ہے۔ انسان کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ اپنے افعال و کردار کا خود ہی مالک ہے۔ خود ہی مقنن اور خود ہی منصف۔ اس کی خودی ہی اس کا خدا ہے۔

نطشے دنیا میں ایک مفکر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اگرچہ بعض اس کو فلسفیوں کی صف میں جگہ نہیں دیتے۔ لیکن ایک فن کار کی حیثیت سے بہت کم لوگ اسے جانتے ہیں۔ اس کے فلسفے سے انکار کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی اعلیٰ انشا پردازی سے انکار ممکن نہیں۔ اس نے اپنے چراغِ فکر سے جو ادبی سیارے تراشے ہیں اُن کی چمک لازوال ہے۔ اس نے اپنی کتاب "خطباتِ زردشت" میں اپنی تعلیمات کو ایسے شاعرانہ اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے کہ اگر اس کو "بہارِ نظر" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ ایک ایسا ادبی شاہکار ہے جس کو زمانہ لاکھ مٹانا چاہے لیکن نہیں مٹا سکتا۔ اور بقول ڈاکٹر ابوالحسن منصور اگر جرمن ادب کی معدودے چند کتابیں انتخاب کی جائیں جو فلک رفعت پر نورانی ستارے بن کر لوگوں کی آنکھوں کو چکاچوند کرتی ہیں تو ان میں سے ایک یہ بھی ہوگی۔

ٹالسٹائی جو ہر لحاظ سے اس کا ضد تھا، اس کی جادونگاری کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ لکھتا ہے۔

"نطشے صحیح معنوں میں دیوانہ تھا۔ لیکن بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ جب میں نے اس کے کلام کا مطالعہ کیا تو مجھے اُس کے زورِ بیان اور قدرتِ کلام کا قائل ہونا پڑا۔"

آجکل

یہ فارم بھر کر ڈاک کے ذریعے سے بھیج دیجئے۔

براہِ کرم مجھے ماہ نامہ "آج کل" اردو کا سالانہ خریدار بنا لیا جائے اور ——— مہینے سے "آج کل" بھیجنا شروع کردیں۔

(۱) میں سالانہ چندہ مبلغ چھ روپے بذریعہ ~~منی آرڈر~~ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج رہا ہوں۔

(۲) "آج کل" کا پہلا شمارہ بذریعہ وی، پی بھیج کر سال بھر کا چندہ وصول کیجئے۔

(نوٹ) ۱ یا ۲ جس کی ضرورت نہ ہو اُسے کاٹ دیجئے۔

دستخط ....

نام ....

پورا پتہ ....

پوسٹ بکس نمبر ۲۵۱۱ دہلی

حبیب الرحمٰن غزنوی

کارٹون اور اس کے متعلّقات

لفظ "کارٹون" کے جو وسیع اور ہمہ گیر اصطلاحی معنی آج لئے جاتے ہیں۔ حقیقتاً یہ لفظ اس معنی کے لئے وضع نہیں ہوا تھا۔ دراصل "کارٹون" کے لغوی اور اصطلاحی معنی ہیں "رف ڈیزائن" — یا سلیس اردو میں کہیں تو "کچا خاکہ" کہہ سکتے ہیں۔ ۱۸۴۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ کی اندرونی دیواروں پر چند معنی خیز تصاویر بنانے کے لئے کارٹونس یا رف ڈیزائنس کی ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری سجائی گئی تھی۔ اس نمائش میں برطانیہ کے شہرۂ آفاق مزاحیہ اخبار "پنچ" کے مشہور کارٹونسٹ "پنچ" نے بھی چند تیکھے نقوش والے "کیری کیچرس" (احتجاجی چہرے) طنّیا رکئے تھے۔ پنچ نے انہیں شائع کردیا۔ اور وہ اس قدر مقبول ثابت ہوئے کہ "کیری کیچرس" ایک مستقل فن بن گیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ اسی چیز نے "کارٹون" کا نام پاکر شہرت عام اور بقائے دوام کا درجہ حاصل کرلیا۔

قدیم فن

تصاویر کے ذریعہ دل خوش کرنے کا طریقہ عہد قدیم میں رائج تھا۔ مصر، یونان، چین اور بھارت میں ایسے قدیم فن پارے دستیاب ہو چکے ہیں جو اس امر کی بدیہی شہادت دے رہے ہیں۔ البتہ یہ طے کرنا سردست بہت مشکل ہے کہ اس فن میں اولیت اور ایجاد کا سہرا کس کے سر باندھا جا سکتا ہے۔ مصر میں اس قسم کے قدیمی آرٹ کے جو نمونے پائے جاتے ہیں ان میں انسان نما جانور یا جانور نما انسانوں کے ایسے خاکے ہوتے ہیں جو اپنی غیر المعقول ہئیت اجتماعی کے باعث کافی مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ ان خاکوں اور تصاویر کو دیکھ کر ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ چین کی قدیم نقّاشی اور فنِ تصویر سازی ہمیشہ ایک ایسی عجیب و غریب ہئیت کے محور پر گھومتا رہا ہے جس کی توند بہت موٹی، آنکھیں نہایت چھوٹی اور مونچھیں لمبی ہوتی ہیں۔ یہ خاکہ قدیم چینی سرمایہ دار یا رئیس کا ہوتا تھا۔ اور اولین نظر میں حد درجہ مضحکہ خیز دکھائی دیتا تھا۔ ان ملکی خصوصیات کے برعکس یونانی برتنوں پر جو تصاویر ملتی ہیں ان میں اس وحشت اور بربریّت کا مرقع پیش کیا جاتا ہے جو قدیم یونان میں غلاموں پر روا رکھی جاتی تھیں یہ مرقع طنز و مزاح کے نمونے قدیم یونان کی وحشیانہ ذہنیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

تفریح اور مسرّت پیدا کرنے والی تصاویر کے بہت سے نایاب نمونے اجنتا کے غاروں میں آج بھی موجود ہیں۔ جو آج سے کم و بیش ۲۰۰۰ سال قبل بنائے گئے تھے۔ یہاں دیواروں پر چند ایسی تصاویر بھی کندہ کی گئی ہیں جنہیں دیکھتے ہی ہنسی آجاتی ہے۔ مثلاً چند افراد کو ایک وسیع اور بھاری بھرکم عمارت کے نیچے اس طرح ایستادہ دکھایا گیا ہے جو اس عظیم الشان عمارت کے لئے ستونوں کا کام دے رہے ہیں۔ ناقابل برداشت بوجھ اٹھانے کے باعث ان کے جسم اور چہروں پر ردِ عمل کے جو آثار پیدا ہونے چاہئیں انہیں ایسی نفسیاتی خوبی کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہاں تصویر کشی اور کندہ کاری دونوں کے اعلیٰ نمونے اب تک محفوظ ہیں۔ اور یہ ایسے جیتے جاگتے نقوش ہیں جن کی نظیر ازمنۂ وسطیٰ کے مناور اور مخطوطات میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

احتجاجی مرقع

تصاویر کے ذریعے سے غم و غصّہ کا اظہار اور احتجاج کرنے کا پہلا تجربہ سترھویں صدی میں اٹلی میں کیا گیا۔ یہ احتجاج رومن اکاڈیمی کے صدر اینی بال نے پوپ اعظم کے خلاف کیا تھا۔ اطالوی زبان میں ایسے احتجاجی مرقعوں کو اس زمانہ میں "کیری کیچورا" کہا جاتا تھا۔ اس لفظ کے اصطلاحی معنی ہیں "مخالف کو نیچا دکھانے اور اسے حقیر و ذلیل کرنے والی اس کی تصویر بناکر اس کا مذاق اُڑانا۔" اٹلی میں جب یہ فن ترقی کر گیا تو فرانس کو اس کی جانب کشش ہوئی۔ اور فرانسیسیوں نے اطالویوں سے یہ فن حاصل کرکے اس کا نام "کیری کیچر"

رکھا۔ پھر یہ فن فرانس سے انگلینڈ پہنچا۔ انگریزوں نے اس میں قدرے ترمیم و اضافہ کرکے اس کا نام "کارٹون" رکھا۔ کیری کیچر اپنی ترمیم شدہ نئی حیثیت میں جب تک نمودار نہیں ہوا تھا سنجیدہ تصاویر کے ماسوا ہر قسم کی تصاویر کو کیری کیچر ہی کہا جاتا تھا۔ لیکن آج کارٹون اور کیری کیچر دونوں علیحدہ علیحدہ اور مستقل فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سیاسی حالات و واقعات کو طنز و مزاح کا معنی خیز جامہ پہنا کر پیش کرنا کارٹونسٹ کا کام ہے۔ اور اسی عمل کو کارٹون کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کسی مخصوص شخصیت کی کوئی ایسی مضحکہ خیز تصویر بنانا جو اس کی ذہنی خصوصیات اور طبعی میلانات کی آئینہ دار ہو اسے کیری کیچر کہتے ہیں۔ دراصل ان دونوں قسم کے خاکوں میں آرٹسٹ کے فن کا کمال، اس کی بالغ نظری، نفسیات سے اس کی گہری واقفیت اور اپنا مافی الضمیر ناظرین کو نہایت آسانی سے سمجھا دینے والے طریقۂ اظہار کا پتہ فوراً ہی چل جاتا ہے۔ یہ فن کار اپنے تخیلات اور نظریے اس قدر خوبی اور چابک دستی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ دیکھنے والے بے اختیار صدائے تحسین بلند کرتے ہیں۔

برطانوی فن کار

انگلستان میں جب چارلس اول کے سامنے چند ایسے طنزیہ مرقعے پیش کئے گئے تو اس نے انہیں "میتھوڈیزاین" کے نام سے منسوب کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ برطانیہ میں ایسے احتجاجی اور مزاحیہ خاکے بنانے کی انفرادی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں مشہور برطانوی آرٹسٹ ولیم ہوگارتھ کا نام سب سے پیش پیش نظر آتا ہے۔ اس نے ابتداً چند ایسے سبق آموز طنزیہ خاکے بنائے جو عوام و خواص میں بے حد مقبول ہوئے۔ اور اسی مقبولیت نے ہوگارتھ کو ان تصاویر کا موجد اور بابا آدم قرار پایا۔ اس طرح کم و بیش پچاس سال کا عرصہ ان انفرادی کوششوں کی نذر ہو گیا۔ اس طویل عرصہ میں ہوگارتھ کے بعد گلرے، بروم ہل، ڈومیٹر اور رولینڈسن نے بھی اس فن کو کافی ترقی دی۔ مگر کسی اجتماعی اور ہمہ گیر تحریک کے فقدان کے باعث کارٹون کی دنیا زیادہ ترقی اور وسعت اختیار نہ کر سکی۔

دنیا میں سب سے پہلا مزاحیہ اخبار "چاری واری" فرانس سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس اخبار کی کامیابی کو دیکھ کر ۱۸۴۱ء میں برطانیہ کا شہرۂ آفاق مزاحیہ جریدہ "پنچ" جاری ہوا۔ جو اب تک ۱۱۰ سال گزرنے کے بعد بدستور جاری ہے۔ پنچ کے جاری ہوتے ہی بے شمار انگریز فن کار میدان میں آگئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا گویا یہ سب "پنچ" کی راہ تک رہے تھے۔ پنچ کے ذریعے جن کارٹونسٹوں کو اپنے اپنے فن کے مظاہرے کے مواقع ملے ان سب میں ٹینیل کا مقام سب سے اعلیٰ و ارفع نظر آتا ہے۔ اس کے فن کی قدر کرتے ہوئے برطانوی دارالامرا نے تازیست اس کے نام وظیفہ جاری کر دیا تھا۔

برطانوی فن کاروں میں یوں تو بہت سے آرٹسٹ اب تک اپنے اپنے فنی کمالات دکھاتے آئے ہیں۔ مگر شہرت عام کا شرف و اعزاز جن فن کاروں کو اب تک مل سکا ان میں ڈیوڈ لا، فروگاس، شیفرڈ، ڈیوڈ لینگڈن، سلینس، فرینک رینالڈز، سٹروب اور سیتھ روبینس کو صف اول کے آرٹسٹ ہم کہہ سکتے ہیں۔ فروگاس آج پنچ کا آرٹسٹ مدیر اعلیٰ ہے۔ اس لئے دیگر آرٹسٹوں سے قدرے ممتاز ہے۔ مگر ڈیوڈ لا کا کمال فن اور ہر دل عزیزی بھی اپنی جگہ امتیازی خصوصیت کی حامل ہے۔

خود برطانوی آرٹسٹوں اور نقادوں کی نگاہ میں جان ڈینیل ایک بہترین اور کامیاب آرٹسٹ ہے۔ جس نے اب تک سیاسی واقعات اور مہتم بالشان حادثات کو طنز و مزاح کا جامہ پہنا کر کارٹونس کی شکل میں کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ بڑے سیاسی رہنما، جنگی لیڈر اور خشک مزاج فلاسفر بھی پھڑک اٹھتے ہیں۔ جان کے علاوہ برطانوی فن کاروں کی نظر میں سپائٹے بھی ایک مخصوص مقام رکھتا ہے۔ سپائٹے ہمیشہ یورپ و ایشیا کی مشہور شخصیتوں سے متعلق تازہ ترین واقعات کو شخصی اور انفرادی خاکوں میں کچھ اس طرح مضحکہ خیز انداز میں پیش کرتا ہے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ یہ شخص انسانی نفسیات کا زبردست ماہر ہے۔ اس کے خاکے انسانی عادات و خصائل کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اور بہت سی بھولی ہوئی باتیں ناظرین کے ذہن میں تازہ کر دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ شیفرڈ بھی اپنے فن کا امام مانا جاتا ہے۔ اس کے طنزیہ خاکے اور مزاحیہ اسکیچ بالکل جداگانہ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی حیوانی صفات کو ہمیشہ نمایاں کر کے پیش کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ انگلینڈ میں عام طور پر حیوانی ذہنیت کے محیر العقول آرٹ کی بنا پر شیفرڈ کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

پنچ کی تقلید

برطانیہ کے پنچ کے تقلید میں دنیا کے مختلف ممالک نے مصوّر مزاحیہ اخبارات جاری کئے۔ بھارت میں اس ٹائپ کا سب سے پہلا اخبار "ہندی پنچ" شروع ہوا۔ اور پھر تو اس کے بعد "اودھ پنچ" اور "گجراتی پنچ" اور کئی ایک دوسرے اخبارات مختلف زبانوں میں شائع ہوئے۔ کینیڈا نے "گرہیپ" جاری کیا۔ اور آسٹریلیا میں "سڈنی پنچ" شائع ہونا شروع ہوا۔

سیاسی طنزیہ کارٹونس یا مضحکہ خیز شخصی خاکے بنانے میں امریکہ کی جد و جہد بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اس میدان میں امریکہ ہمیشہ برطانیہ سے پیچھے ہی رہا ہے۔ امریکہ نے طنزیہ تصاویر، مزاحیہ خاکے (جیسے کہ ایک پٹی کی صورت میں تین چار چھوٹے چھوٹے خاکے عام طور پر روزانہ انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ اور یہ خاکے کسی ایک مربوط و مسلسل واقعہ کو مزاحیہ پیرایہ میں ظاہر کرتے ہیں) اور مصوّر کہانیاں پھیلانے اور رواج دینے میں بے انتہا کوشش کی ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ مزاحیہ خاکوں کی پٹیاں شائع کرنے میں (جیسی کہ ٹائمز آف انڈیا میں روزانہ شائع ہوتے ہیں اور پوپ اس کا مشہور و معروف کریکٹر ہوتا ہے) امریکہ سب سے پیش پیش رہا ہے۔ ان مزاحیہ پٹیوں کا امریکہ اور یورپ میں عام رواج ہے۔ ہر اخبار نے اپنا ایک مخصوص مزاحیہ کردار منتخب کر لیا ہے۔ اور روزانہ اسی کردار کو مختلف مزاحیہ انداز میں پیش کر کے لاکھوں ناظرین سے خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ یہ پٹیاں آج کل بے حد مقبول و ہر دل عزیز ثابت ہو رہی ہیں۔

یلو کِڈ یا مزاحیہ پٹی

اس قسم کی زرد پٹی ـــ جس پر مزاحیہ اسکیچ بنائے جاتے ہیں ـــ سب سے قبل امریکہ کے مشہور مزاحیہ اخبار "نیویارک سنڈے ورلڈ" نے شائع کی تھی۔ یہ واقعہ ۱۸۹۶ء کا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ زرد مزاحیہ پٹی ایک مستقل فن گئی، اور صحافتی دنیا میں "یلو کِڈ" کے نام سے موسوم ہوئی۔ "نیویارک سنڈے ورلڈ" میں اس زرد پٹی یا "یلو کِڈ" کو رواج دینے کا سہرا مشہور امریکن کارٹونسٹ آوٹ کالٹ کے سر ہے۔ یہ فن خود اسی کی ایجاد ہے۔ "یلو کِڈ" نے اپنی ابتدائی عمر ہی میں اس قدر مقبولیت اور ہر دلعزیزی پیدا کر لی کہ مشہور سائنس داں ایڈیسن نے آوٹ کالٹ کو اپنی طرف سے گرانقدر وظیفہ دے کر اس فن کی اعلےٰ تعلیم اور مہارت حاصل کرنے کی غرض سے فرانس بھیج دیا تھا۔

آوٹ کالٹ کے اس فن کی مقبولیت دیکھ کر سینکڑوں آرٹسٹوں نے اسی "یلو کِڈ" کو اپنا مقصد حیات بنا لیا۔ وہ اخبارات و رسائل جو مصوّر کہانیاں اور یلو کِڈ شائع کرتے ہیں یا اس کے لئے وقف ہو گئے ہیں ان کی تعداد سینکڑوں سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ ان میں کی ایک یلو کِڈ تو ایسی ہیں جو مسلسل کئی سال سے کسی ایک ہی واقعہ کو بالاقساط پیش کر رہی ہیں۔ اس قسم کے اخبارات جو مصوّر کہانیاں اور مزاحیہ پٹیوں کے باعث زیادہ مشہور ہیں ان میں سے "مٹ اینڈ جیف" "ٹل ایلز" "ٹارزن" "برنگنگ اپ فادر" "رائے راجرس" "بلانڈی" "لاپ فیملی" وغیرہ وغیرہ بھارت میں بھی آتے ہیں۔ ان کے مزاحیہ اسکیچ، مصوّر کہانیاں اور یلو کِڈ وغیرہ بمبئی کے اکثر انگریزی اخبارات نقل کرتے رہتے ہیں۔ مگر امریکہ کی اس قسم کی ہزار ہا یلو کِڈ یا مزاحیہ پٹیوں کے مقابل برطانیہ کی صرف ایک ہی یلو کِڈ اس قدر مقبول و ہر دلعزیز ثابت ہوئی ہے کہ آج تک اس فن میں سینکڑوں حوادث و انقلابات رونما ہونے کے باوجود وہ آج بھی جوں کی توں شائع ہو رہی ہے اور دنیا سے خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔ یہ یلو کِڈ "پاپ" کے نام سے مشہور ہے۔ پاپ ایک مزاحیہ کیرکٹر ہے جس کے نت نئے کارنامے روزانہ مزاحیہ پیرایہ میں شائع ہوتے ہیں اور ناظرین کی تفنن طبع کا باعث بنتے ہیں۔ یہ پٹی صرف انگلینڈ ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں مقبول و متعارف ہو چکی ہے۔ اس سلسلہ میں "پاپ" کا خالق یا موجد "ملر واٹ" بجا طور پر اپنے فن کا امام کہا جا سکتا ہے۔ البتہ پچھلے چند برسوں میں "والٹ ڈزنی" نے رنگین کارٹونس کے فلم بنا کر اس فن میں ایک نئی اور کامیاب راہ پیدا کر دی ہے

بھارت میں کارٹون کی ترویج

بھارت میں انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے اوائل میں طنزیہ خاکوں اور مزاحیہ اسکیچز کا آغاز ہوا۔ جس طرح بھارت میں بہت سی چیزوں کی ایجاد اور انہیں ملک میں رواج دینے کا سہرا اب تک پارسی حضرات کے سر باندھا جا چکا ہے، اسی طرح بھارت میں ان طنزیہ خاکوں کی ایجاد اور ترویج کا سہرا بھی ایک پارسی اخبار نویس کے سر باندھا جائے گا۔ بمبئی سے "ہندی پنچ" نامی جو مزاحیہ اخبار جاری ہوا تھا اس کے ایڈیٹر مسٹر برجورجی ـــ (بزرجمہر جی) ـــ ہی نے یلو کِڈ اور دوسرے طنزیہ مرقعوں کو یہاں رواج

دیا تھا۔ ان مزاحیہ خاکوں کے باعث نہ صرف بھارت میں بلکہ ممالک غیر میں بھی "ہندی پنچ" کافی مقبول ثابت ہوا تھا۔ سیاسی لیڈروں اور حکمران طبقے سے متعلق جو معنی خیز مزاحیہ اسکیچ "ہندی پنچ" میں شائع ہوتے تھے وہ صرف اسی کا حصہ تھا۔ "ہندی پنچ" کے تمام خاکے عام طور پر انگلش ٹینی یلزم کے نمونے کے ہوتے تھے۔ کردار کو ہمیشہ شاہانہ لباس اور رئیسانہ وضع قطع میں پیش کیا جاتا تھا۔ "ہندی پنچ" کے ان خاکوں پر چونکہ آرٹسٹوں کے نام درج نہ ہوتے تھے اس لئے اب تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ ان فن پاروں کے خالق کون کون آرٹسٹ تھے ـــــ خدا جانے ایسے کتنے ہی فن کار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قعرِ گمنامی میں ختم ہو گئے ہونگے ـــــ!

"ہندی پنچ" کا مشہور مزاحیہ کردار "شری پنچ جی" انگریزی "پنچ" کے مسٹر پنچ کا کامیاب جواب تھا۔ شری پنچ جی کا لباس شاہانہ لباس اور رئیسانہ وضع قطع میں پیش ہوتا اور پھر عقل کے سر پر لٹھ گھماتے ہوئے بیوقوفی اور حماقت کے کارنامے انجام دینا واقعی دلچسپ اور مسرت انگیز ثابت ہوتے تھے۔ شری پنچ جی کے مختلف پوز اور خاکے اس قدر مقبول تھے کہ لوگ ان کے کٹنگ فریم میں لگوا کر اپنے مکانوں، آفسوں اور دوکانوں میں آویزاں کرتے تھے۔ اور یہ کٹنگز عموماً ہر ایک شخص کی توجہ اور کشش کا باعث بنتے تھے۔

"ہندی پنچ" بند ہونے کے بعد سے ۱۹۳۰-۳۲ء کی کانگریسی تحریک تک بھارت میں اس قسم کے کارٹونس کا کوئی خاص سلسلہ قائم نہیں رہا۔ اور نہ ہی اس عرصہ میں اس فن سے متعلق کوئی قابل ذکر کارنامہ ظہور پذیر ہوا۔ ۳۰-۳۲ء میں کارٹونس کی خوابیدہ دنیا نے ایک ہلکی سی انگڑائی ضرور لی۔ اور چند مخصوص خاکے ملک کے سامنے پیش کئے۔ مگر ان میں زیادہ تر صرف شتیبہ گرہ اور کانگریس کی تحریک ہی سے متعلق تھے۔

ہندوستانی فنکار

۱۹۳۲ء کے بعد سے اس فن کی طرف لوگوں کا رجحان آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوا تھا آج جبکہ ملک تقسیم ہو چکا ہے بہت سے آرٹسٹ اور فن کار بھی بھارت اور پاکستان میں بٹ گئے ہیں۔ کارٹون اور کیری کیچر کو بھارت میں ترویج دینے کا سہرا جن فن کاروں کے سر باندھا جا سکتا ہے افسوس ہے کہ آج ہم ان کے ناموں سے واقف نہیں ہیں۔ تاہم اب تک بھارت کی سرزمین نے جس قدر کارٹونسٹ پیدا کئے ہیں ان میں شنکر کا مقام سب سے بلند و بالا ہے سب سے قبل ۱۹۳۵ء میں شنکر کا آرٹ نمودار ہوا۔ ابتداً ایک دو اخبارات نے ان کے فنی کمالات سے فائدہ اٹھایا، مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ شنکر کا فن بھی ترقی کے مدارج طے کرتا گیا۔ حتیٰ کہ آج یہ عالم ہے کہ شنکر بھارت میں اپنے وقت کا سب سے قابل، کامیاب اور بہترین کارٹونسٹ ہے۔ اس کا انگریزی اخبار "شنکرز ویکلی" اپنی امتیازی خصوصیات کے باعث ملک کا بہترین مزاحیہ اخبار تسلیم کیا جاتا ہے۔

شنکر کے ساتھ ساتھ بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس، احمد آباد اور پونا کے متعدد انگریزی، اردو، گجراتی، مرہٹی اخبارات اور کارٹونسٹوں کے باہمی تعاون و اشتراک نے اس فن کو ملک میں کافی ترقی دی ہے کسل، آر۔ ایس نائیڈو، منی، ہنرو، احمد، وانس، شنی، برلیشور، لکشمن، بنسی ورما، تھاہ، دلال، جادھو، کدی خاں، بال ٹھاکرے، شکنتلا رتھی، پرتھم، شنبیل اور سسر دے کی کوششیں اور جدوجہد لائق مبارک باد ہیں۔ ان کے ماسوا جن غیر ملکی فنکاروں نے بھارت میں رہ کر اس فن کو پروان چڑھانے میں مدد کی ہے اور بھارتی فن کاروں کے دوش بدوش کام کیا ہے ان میں ہنو برگ اور ڈیمیلی سب سے پیش پیش ہیں۔

کارٹونس کے البم شائع کرنے کا بھارت میں اب تک زیادہ رواج نہیں ہوا۔ البتہ شنکر، منو، ہنرو، دلال، کرلوسکر، شنی اور چکور کے البم اب تک شائع ہو کر اہل ذوق سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ تاہم آرٹ کا یہ دلچسپ شعبہ ہنوز زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔

آزادی کے چار سال

(۳)

امنِ عامہ کے لئے حکومت کے اقدامات

جب حکومت کی باگ ڈور نئے ہاتھوں میں آتی ہے تو ایسے ناموافق حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کا سامنا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں تو یہ حالات اور بھی نازک صورت اختیار کر گئے۔ جنگ کے بعد ملک کی مالی اور اخلاقی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ روپے پیسے کے غیر معمولی پھیلاؤ اور قیمتوں کے بہت تیزی سے بڑھنے کی وجہ سے ملک بہت مشکل میں گرفتار تھا اور ملک کا ایک حصہ قحط سے ہراساں ہو رہا تھا۔ نفع خوروں کے لالچ نے سرمایے کو بند رکھنے اور بلیک مارکیٹ کو تقویت دی نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔ ادھر کچھ علاقوں میں کمیونسٹوں نے ذاتی مفاد کی خاطر دہشت پھیلا دی۔ شاید یہی پہلی خفیہ تحریک تھی جس نے ملک بھر میں ہڑتالوں مظاہروں اور لاقانونی کو جنم دیا۔ کلکتہ اور بمبئی ایسے بڑے شہروں میں تشدد دانہ مظاہرے ہونے لگے۔ قانون کے دشمنوں نے مختلف ریاستوں میں بھی اپنے پیرو بھیجے۔ جو طلبا کی مدد سے شر انگیز لٹریچر تقسیم کرنے لگے۔ مزدوروں کو مشتعل کرنے کے علاوہ اُن لوگوں کو بھی دھمکیاں دی گئیں جو امن قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے۔

اگست ۱۹۴۶ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن نے جو شعلے پیدا کئے وہ بعض علاقوں میں تقسیمِ وطن کے بعد بھی بھڑکتے رہے۔ لیکن حکومت نے تمام فسادات پر قابو پا لیا اور وہ بھی بہت خوش اسلوبی سے۔ کئی حالات میں پولیس کی طاقت کو مضبوط کرنے کے لئے فوجوں کو بھی بلایا گیا۔ کیونکہ مسلمان افسروں کے پاکستان چلے جانے سے کچھ حد تک پولیس کی طاقت کم ہو گئی تھی۔

یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ سرحد کے پار ایک اسلامی ملک میں جو کچھ ہوا۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ عناصر میں اس کا ردِّ عمل غضب ناک صورت میں ہوا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ، اکالی دل اور مسلم لیگ نے مذہب کی آڑ لے کر تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں۔ مثال کے طور پر راشٹریہ سیوک سنگھ نے فرقہ وارانہ ذہنیت کے ہندوؤں کے ساتھ کام کیا اور ملٹری کی مانند بہت سے لوگوں کو والنٹیر کے طور پر تیار کیا۔ کئی لوگوں کو رائفل مشین گن اور دوسرے ہتھیاروں کے استعمال کی باقاعدہ تربیت دی۔ اس چیز نے صریحاً مذہبی نفرت کو تقویت دی اور مہاتما گاندھی کی اُن کوششوں کو ناکام بنایا جو اُنھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے کیں اور ساتھ ہی اس جماعت نے مہاتما جی کو مسلم نواز کہا۔ یہ بات بھی تعجب انگیز نہیں کہ راشٹریہ سنگھ کے ایک متعصب سر پھرے نے مہاتما گاندھی کو قتل کیا۔

یہی جرم جس نے ایک عالمگیر تہلکہ بپا کر دیا، راشٹریہ سیوک سنگھ پر پابندی لگ جانے کی وجہ بنا۔ اگرچہ یہ پابندیاں اُٹھانے کے لئے کئی خفیہ اور پس پردہ سازشیں کی گئیں۔ لیکن حکومت کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ آخر جب مارچ ۱۹۴۹ء میں راشٹریہ سیوک سنگھ نے حکومت کا وفادار ہو کر چند شرائط پر کار بند رہنے کا وعدہ کیا تو یہ پابندی ہٹالی گئی۔

اس کے علاوہ فرقہ وارانہ طور پر حکومت کی مخالفت کرنے والی جماعت اکالی دل تھی دہلی آتے ہوئے اُس کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کو مذہبی مقامات کو سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور چند ماہ کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔

علاوہ ازیں اس امر کا بھی پتہ لگایا گیا۔ کہ ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے اصول پر عمل کر کے اُسے فروغ دے رہے ہیں۔ وہ خفیہ طور پر اجلاس کرتے ہوئے پاکستان کے حق میں پراپگنڈا اور آزاد کشمیر کے نام پر چندے اکٹھے کر رہے ہیں۔ اکثر لوگ حیدرآباد کے رضاکاروں کے جاسوس بن کر قابلِ اعتراض سرگرمیوں میں مصروف ہیں آخر چند ایک کاغذات اور دستاویزات پر قبضہ کیا گیا جس نے اس سنسنی خیز حقیقت

کا انکشاف کیا کہ اکثر مقامات پر مسلمانوں کو کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر حکومت کا تختہ اُلٹنے کی بھی ترغیب دی گئی تھی۔ اور چند ایک ایسی اطلاعات بھی موجود ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم لیگیوں نے صنعتی علاقوں میں بھی گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

اندرونی امن کو نقصان پہنچانے کی سب سے مہلک کوشش کمیونسٹوں کی طرف سے کی گئی۔ اُن کی سرگرمیوں کو وزیر اعظم نے "قتل عام" سے منسوب کیا۔ اور اس میں شک بھی نہیں ہے کہ کمیونسٹوں کے پروگرام میں قتل و غارت، آتشزدگی، لوٹ مار اور دوسرے باغیانہ طریقے شامل تھے۔ اور کچھ مدت سے کلکتہ میں کمیونسٹوں اور پولیس کا تصادم ہر روز ہوتا رہا۔ ان لوگوں نے کھلے بندوں بموں، اشک آور گیسوں اور دوسرے خطرناک ہتھیاروں کا استعمال کرتے ہوئے بسوں اور ٹراموں کو جلا دیا۔

۱۹۴۸ء کے اختتام پر اُنھوں نے ریلوے ملازمین کو ایک خطرناک ہڑتال پر مجبور کیا۔ باوجودیکہ ریلوے ملازمین کی اکثریت اس کے خلاف تھی۔ اس سازش کا واحد مقصد یہ تھا کہ رسل و رسائل کے ذرائع بند کر کے قحط پیدا کر دیا جائے اور حکومت کے انتظام میں روڑا اٹکا کر خود طاقت حاصل کی جائے۔ لیکن حکومت نے دانشمندانہ قدم اُٹھا کر سرغنوں کو گرفتار کر لیا۔ اور جن لوگوں نے ان سرگرمیوں میں خوب حصہ لیا تھا اُنھیں بھی حراست میں لے لیا۔

حیدرآباد میں اُن کی سرگرمیاں غیر معمولی طور پر خطرناک صورت اختیار کر گئیں۔ اُنھوں نے کسانوں کو گوریلا فوجوں کی طرح منظم کیا۔ اور غلے کے ذخیروں، پولیس کی چوکیوں، ڈاک خانوں اور لوگوں کے مکانوں کو جلانا شروع کر دیا۔ اور تلنگانہ میں تو اُنھوں نے اندھیر گردی ہی مچا دی۔

حکومت نے اس [illegible] وقت میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ اور پہاڑی علاقوں میں ان لوگوں کی خونی آنکھ مچولی روکنے کے لئے ملٹری اور فوجی طاقتوں کو اس کام پر لگا دیا۔ ذرائع آمد و رفت پھر سے استوار کئے گئے اور خوف زدہ لوگوں کی تعلیم و تربیت اور طبی امداد کے لئے پورے انتظامات کر دئے گئے۔ آخر حالات پر بہت خوش اسلوبی سے قابو پا لیا گیا۔

جنگ سے پہلے ملک کے مختلف حصوں میں ایک ہزار سے زائد آئی سی ایس آفیسر موجود تھے۔ لیکن تقسیم وطن کے بعد یہ تعداد کم ہو کر ۵۰۰ سے بھی کم رہ گئی۔

حکومت اِن حالات سے بے خبر نہ تھی۔ آزادی سے پیشتر ہی مرحوم سردار ولبھ بھائی پٹیل آئی سی ایس اور آئی پی سروسوں کو ایسی سروسوں میں تبدیل کرنے کے متمنی تھے۔ جو کلی طور پر ہندوستانیوں کے دائرہ اختیارات میں ہوں۔ اور اکتوبر ۱۹۴۶ء میں اُنھوں نے تمام صوبوں سے اجازت حاصل کر کے دو کل ہند سروسوں کا آغاز کیا۔ اوّل انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس اور دوم انڈین پولیس سروس انہی دو سروسوں پر آزاد ہندوستان کے اسلوبی ڈھانچے کا مدار تھا۔

لیکن آزادی اور نظم و نسق چلانے والے افسروں کی کمی نے دو نئے مسئلے پیدا کر دئے۔

۱۔ مسلمان اور انگریز تجربہ کار افسروں کی خالی جگہوں کو پُر کرنا۔

۲۔ نئی حکومت کو چلانے کے لئے حکومت کی مشینری اور سول سروسوں کو نئے سرے سے تنظیم اور تشکیل کرنا۔

پہلے مسئلے کو مرحوم سردار ولبھ پٹیل نے ۱۹۴۸ء میں ایک سپیشل ریکروٹمنٹ بورڈ کو قائم کر کے حل کیا۔ اس بورڈ نے اب تک ۹۵ افسر آئی، اے، ایس کے لئے اور ۷۹ آفیسر آئی، پی کے لئے منتخب کئے۔ مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب ہونے والوں کی تعداد ان کے علاوہ ہے۔

ان دو اہم سروسوں کے علاوہ حکومت نے سیکریٹریٹ سروسوں کی بھی دوبارہ تنظیم کی اور ملازمین میں تحفظ کا احساس پیدا کرنے کے لئے قابل عارضی ملازموں کو "نیم مستقل ملازم" شمار کرنے کے قوانین نافذ کئے۔

وزارتی محکموں کو از سرِ نو بنانے کے لئے مختلف وزارتوں کے فرائض کی نئی درجہ بندی کی گئی۔ اور اس سلسلے میں جو نئی وزارتیں مدغم کی گئی ہیں وہ خوراک اور زراعت، صنعت و حرفت، قدرتی ذرائع اور کیمیائی کھوج اور ورکس پروڈکشن اور سپلائی کی وزارتیں ہیں۔

سرکاری پالیسی اور اسکیمیں بنانے کے لئے اور انہیں خوش اسلوبی سے چلانے کے لئے حکومت نے کیبنٹ کی ایک سٹینڈنگ کمیٹی بنائی جس کا مقصد دفاعی، اقتصادی پارلیمنٹری، قانونی امور کی دیکھ بھال اور اسامیوں کا تقرر تھا۔ اس کے علاوہ تعمیر نو اور بحالی کے لئے بھی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ایک اکونامک ونگ سے کیبنٹ سیکریٹیریٹ کو مضبوط کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سیکریٹریوں کی ایک کمیٹی کیبنٹ کی اقتصادی کمیٹیوں کی مدد کرتی اور پلاننگ کمیشن کے ساتھ رابطہ قائم رکھتی ہے۔

نئی حکومت نے ملک میں امن اور ضبط قائم کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ دانشمندانہ قدم اُٹھائے اور اس طرح ایک غیر مذہبی جمہوری حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا۔

متحدہ اقوام اور بھارت

آل انڈیا ریڈیو سے یومِ اقوامِ متحدہ اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی چھٹی سال گرہ پر تقریر کرتے ہوئے وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری مسٹر آر کے نہرو نے کہا کہ اگرچہ پچھلے چند سال میں اقوامِ متحدہ نے جس ڈھنگ سے کام کیا ہے، اس سے بھارت کو کچھ مایوسی ہوئی ہے۔ پھر بھی بھارت اس ادارہ کی اہمیت اور افادیت کا قائل ہے۔ اس کی مایوسی نے تو اقوامِ متحدہ کے ذریعے سے امن کے لئے عالمی رائے کو مضبوط بنانے کی نئی ترغیب دی ہے۔

مسٹر نہرو نے کہا کہ بھارت اپنے مقصد کے لئے ہر مسئلے پر اس کی اپنی نوعیت اور چارٹر کے اصول کے تقاضے کے مطابق غور کرتا ہے۔ اس کا یقین ہے کہ وہ ایک صحیح راستے پر چل رہا ہے اور اس راستہ پر چلنے سے اختلاف دور ہوں گے۔ تناؤ ختم ہوگا۔ اشتراکِ عمل میں اضافہ ہوگا اور ادارہ بتدریج مضبوط ہو جائے گا۔

پردھان منتری نے حال ہی میں دہلی کے ایک عام جلسہ میں کہا تھا کہ بھارت نے اقوامِ متحدہ کی پختہ طور پر حمایت کی ہے اور وہ چارٹر کے اصول کا پوری طرح پابند رہا ہے۔

اس ادارے کا چارٹر ایک ایسے وقت پر مرتّب کیا گیا جب کہ دوسری عالم گیر جنگ کی وجہ سے بے پناہ بربادی ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس کو ترتیب دینے والوں نے آنے والی نسلوں کو جنگ کی لعنت سے بچانا اس کا مقصد قرار دیا اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ملکوں کو مل کر کام کرنے کی مفید راہ سُجھائی۔

اقوامِ متحدہ کے اغراض و مقاصد تین مربوط حصّوں میں بٹے ہوئے ہیں (۱) عالمی امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کے لئے مل کر کام کرنا (۲) مساوات اور حقِ خود اختیاری کے اصول پر مختلف قوموں میں دوستانہ تعلقات کو ترقی دینا اور (۳) مختلف نظریے رکھنے والے رکن ملکوں کے مجلسی اور معاشی مقاصد کی کامیابی کے لئے ذریعۂ امداد بننا۔ اگرچہ قومی رسم و رواج کے پس منظر کی وجہ سے مختلف ممالک کے ارکان کے مطمحِ نظر اور اندازِ فکر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن جہاں جمہوری اصول پر عمل کیا جاتا ہے وہاں ان اختلافات میں یگانگت پیدا کرنے کی جد و جہد کی جاتی ہے

چنانچہ اقوامِ متحدہ کا چارٹر مرتّب کرنے والوں کا بھی یہی منشا ہے کہ اس تنظیم کی زیرِ سرپرستی مختلف ممالک کے ارکان کے مطمحِ نظر اور اندازِ فکر میں تعاون پیدا کیا جائے۔

اقوامِ متحدہ کو بھارت کا بھی پورا پورا تعاون حاصل ہے۔ کیونکہ بھارت کو اس کے اغراض و مقاصد سے اتفاق ہے اور اس کی راہنمائی بھی تسلیم کرتا ہے۔ اس ادارے کی اقتصادی اور سماجی سرگرمیوں کو بھی سراہا گیا ہے چنانچہ پسماندہ ممالک کی بہبود کے لئے ٹیکنیکل امداد کا پروگرام بھی وضع کر لیا گیا ہے۔ حقوقِ انسانی کے میثاق کو قبول کر لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ایک معاہدے کا مسودہ زیرِ ترتیب ہے۔ ادارے کے متعدد شعبے بچّوں کی امداد عورتوں کی حیثیت بلند کرنے اور ٹرسٹ کے علاقوں میں نظم و نسق قائم کرنے کے کاموں میں مشغول ہیں۔

مذکورہ بالا ٹھوس کامیابیوں کے باوجود کچھ امور ایسے بھی ہیں جو اس ادارے کے کام میں رکاوٹ ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان امور میں ایک نسلی امتیاز کا قضیہ ہے، جو چارٹر کے اصول کے خلاف ہونے کے ساتھ ہی امنِ عالم کیلئے بہت زیادہ ضرر رساں ثابت ہو رہا ہے۔

ادارۂ اقوامِ متحدہ کے کام میں دوسری رکاوٹ بڑی بڑی حکومتوں کے مابین کشیدگی کا وجود ہے۔ اگرچہ بھارت اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اقوامِ متحدہ نے امنِ عالم کو بچانے کے لئے بعض بہت مؤثر اقدامات کئے ہیں۔

اس ادارے سے بھارت کو جو مایوسی ہوئی ہے میں اس کے متعلق بھی کچھ کہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ مختلف ممالک کی ایک آزاد تنظیم ہے۔ جہاں سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ اس میں عالمی نقطۂ خیال کی بنیادوں پر اخلاق کی طاقت حکمرانی کرتی ہے۔ بھارت بھی ان امور کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اقوامِ متحدہ کے ادارے کے متعلق اس کا اعتماد متزلزل نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ بھارت کی خواہش ہے کہ ہر مسئلہ چارٹر کے اصول کے مطابق طے ہونا چاہیئے، اور اسے اس پر بھی بھروسہ ہے کہ جو راہ اس نے اختیار کی ہے اس کی بدولت اختلافات اور کشیدگی دُور ہو کر ادارے کو طاقت اور تعاون حاصل ہوگا۔

ع۔م

کتابیں، رسالے اور اخبار

بہترین ادب ۱۹۵۰ء

ناشر۔ مکتبۂ اُردو لاہور ـــ مرتب چوہدری برکت علی اور مرزا ادیب ـــ

قیمت چھ روپے، ضخامت ۵۱۲ صفحات۔ تقطیع ۲۲×۳۶/۱۶ کاغذ، کتابت، طباعت جلد، جلد پوش عمدہ۔

ادارہ "ادبِ لطیف" سال بھر کے منتخب ادب کو ہر سال ایک جلد میں شائع کر دیتا ہے۔ زیرِ تبصرہ جلد اسی سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔ ناشر کا یہ خیال قطعی درست ہے کہ اس انتخاب کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ ایک سال کی مدت میں جتنی اعلےٰ درجے کی چیزیں شائع ہوں اُنھیں کتابی صورت میں محفوظ کر دیا جائے۔ تاکہ پڑھنے والے آسانی سے سال بھر کے چیدہ نثر پاروں اور نظموں کا مطالعہ کر سکیں اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایک سال کی رفتارِ ادب کا جائزہ لیتے وقت یہ ادبی سرمایہ مشعلِ راہ کا کام دے سکے۔ یہ انتخاب زیادہ تر ہندوستان اور پاکستان کے ماہ ناموں سے کیا گیا ہے۔ لیکن اس فہرست میں ایک روزنامہ، دو ہفت روزہ اخبار، ایک نیم ماہی جریدہ اور پانچ سہ ماہی رسالے بھی شامل ہیں۔ انتخاب مقالہ، نظم، افسانہ، ڈراما، غزل، انشائے لطیف اور طنز و مزاح کے عنوانات کے تحت کیا گیا ہے۔ مقالات کے انتخاب میں جو توجہ کی گئی ہے نظموں کے انتخاب میں نظر نہیں آتی۔ پھر بھی یہ مجموعہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ اُردو کی کوئی لائبریری اس سے خالی نہیں رہنی چاہیئے۔

سیاسی معلومات جلد اوّل

ناشر:ـــ مکتبہ برہان دہلی۔ مرتب۔ اسرار احمد آزاد۔

قیمت آٹھ روپے۔ ضخامت ۸۰۰ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش اوسط۔

اسرار احمد آزاد اُردو کے مشاق اور سنجیدہ جرنلسٹ اور ادیب ہیں۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف اور مرتب بھی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب بین الاقوامی سیاسی معلومات کے نام سے سنہ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تھی لیکن وہ بہت مختصر تھی اور صرف چار ابواب پر مشتمل تھی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات پندرہ ابواب پر مشتمل ہے اور پہلی جلد صرف تین مزید ابواب کی حامل ہے۔ پہلا باب افراد دوسرا اقوام اور قبائل اور تیسرا ممالک اور مقالات سے متعلق ہے۔ جیسا کہ اعلان کیا گیا ہے دوسری جلد ادارات، تحریکات، معاہدات، اعلانات، منصوبے، الفاظ و اصطلاحات، محاربات، مسائل، واقعات، مختصرات ادارۂ اقوام متحدہ اور متفرقات ایسے بارہ ابواب پر مشتمل ہوگی۔ زیرِ تبصرہ جلد بڑے سلیقے سے مرتب کی گئی ہے۔ اُردو میں اس موضوع پر آج تک کوئی قابلِ ذکر کتاب شائع نہیں ہوئی۔ بین الاقوامی سیاست پر فرہنگ وار معلومات حاصل کرنے میں یہ کتاب بڑی معاون ثابت ہوگی۔ سیاست کے ہر طالب علم اور جرنلسٹ کے پاس اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ مرتب نے خود فرمایا ہے اس قسم کی کتابوں کی تدوین بڑی محنت کا کام ہے اور فی الحقیقت یہ ایک آدمی کا کام بھی نہیں۔ اس کے لئے تو خاص ادارہ چاہیئے۔ پھر بھی اس دَور میں بڑی جاں فشانی سے ان معلومات کا جمع اور شائع کرنا تحسین کے قابل ہے۔ دُنیا کی سیاست تیز رفتاری سے تبدیل ہو رہی ہے۔ اس لئے مرتب کی یہ تجویز بھی مستحسن ہے کہ ہر چھ مہینے کے بعد اس کتاب کا ضمیمہ بھی چھپتا رہے گا جو اس مدت میں رونما ہونے والے اہم تغیرات نیز نئی معلومات پر مشتمل ہوگا۔ اور اس طرح یہ کتاب مکمل رہ سکیگی۔ اُمید ہے کہ اُردو کے حلقوں میں اس کتاب کو خاص مقبولیت حاصل ہوگی۔

نوائے بیدل

پروفیسر عبدالمنّان بیدل عظیم آبادی کے کلام کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

ناشر۔ اقبال بک ڈپو مقابل پٹنہ کالج ڈاک خانہ مہندرو۔ پٹنہ ۶۔ قیمت چار روپے ضخامت ۲۰۸ صفحات، تقطیع ۱۷×۲۷/۸، کاغذ، کتابت، طباعت عُمدہ۔

بیدل صاحب قدیم رنگِ سخن سے متاثر ہیں۔ نظموں میں تغزل نمایاں ہے۔ آپ کا ذوقِ سخن پاکیزہ ہے۔ سادہ اور سہل زبان سے معنی آفرینی کے

جوہر نمایاں کرنے میں آپ کا قلم مشاقی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

عمر نہیں مرا تنکوں کا ایک جا کرنا ۔۔۔ ہے بجلیوں کے لئے یا کہ آشیاں کے لئے

قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے لذتِ کوشش تو ملتی ہے

ٹپکنے دے سر کو بال و پر سے کھیل لینے دو

جناب اختر اورینوی نے بیدل کی نظموں کے باب میں تحریر فرمایا ہے۔

"حضرت بیدل اپنی نظم میں بھی تغزل کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ ان کی قماش بھی وہی ہے فضا بھی وہی، رموز و علامتیں بھی وہی، زبان و بیان وہی، بیدل کی نظموں میں انقلاب سب سے بہتر نظم ہے۔ صنفِ نظم کے معیار تعمیر و ارتقا پر یہ نظمیں پوری تو نہیں اترتیں لیکن ان میں بعض اخلاصِ تجربہ اور رواتی بیان کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں۔"

لسان العصر

مرتب اختر انصاری اکبرآبادی۔ ناشر بزمِ اکبر کراچی قیمت تین روپے، ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ ۔ کتابت طباعت، کاغذ، جلد، عمدہ

حضرت اکبر آبادی سے متعلق شعراء کی نظموں کا یہ مجموعہ ظاہری صورت میں بہت دیدہ زیب ہے لیکن معنوی اعتبار سے چنداں درخورِ اعتنا نہیں۔ یوں تو اسی سے زیادہ شعراء کا اظہارِ عقیدت اس کتاب میں شامل ہے لیکن جیسا کہ کتاب کے سرورق پر لکھا گیا ہے۔ یہ طولانی فہرست مشاہیر شعراء کی فہرست نہیں کہی جا سکتی۔ اکبر اردو ادب کے ایک باوقار بزرگ ہیں۔ کاش کہ یہ خراجِ عقیدت نثر میں پیش کیا جاتا تاکہ اکبر کی شاعری اور اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل اور پُرمعنی تبصرہ اس کتاب میں مل سکتا۔ منظوم قصیدہ خوانی موضوع سے انصاف نہیں کر سکتی۔ بہرحال غنیمت ہے کہ اکبر کا نام تو اس زمانے میں لیا جا رہا ہے۔

نالہ پابندِ نَے

اختر انصاری اکبرآبادی کے کلام کا یہ مجموعہ حلقہ اربابِ فکر نمبر ۳ کاشانہ حمید رتن تلاؤ کراچی نے شائع کیا ہے کتاب حسنِ ظاہر سے آراستہ ہے۔ قیمت دو روپے۔

نیاز فتحپوری، علی اختر، شاعر لکھنوی نے اختر انصاری کی شاعری کے باب میں اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ غزلوں میں اکثر اشعار اچھے ہیں۔ مثلاً

جو فسانے لبِ گفتار تک آئے بھی نہیں

رنگ بن کر ترے رخسار تک آ پہنچے ہیں

سننے والے سن سکے ہیں یا نہیں ۔۔۔ کہنے والے تو فسانے کہہ گئے

جوشِ طوفاں کا وہی انداز ہے ۔۔۔ کیا خبر کتنے سفینے بہہ گئے

بیاضِ عابدیہ

سید ہاشم رضا عابدی سیکرٹری انجمن عابدیہ الہ آباد نے شہادتِ حسینؑ سے متعلق نظموں کا یہ مجموعہ الہ آباد سے شائع کیا ہے۔ بارگاہِ حسینی میں ان کا یہ نذرانہ قابلِ وقعت ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ عابدی صاحب بقولِ خود اور فی الحقیقت ابھی بہت کم عمر ہیں۔ بیاض کے شروع میں حضرت مولانا سید کلب حسین صاحب مجتہد العصر کی تقریظ بھی شامل ہے۔ اسی تقریظ کا آخری فقرہ ملاحظہ فرمائیے۔

"امید یہی ہے کہ موصوف (عابدی صاحب) کی یہ تالیف مومن و مسلم، اپنے اور پرائے ہر شخص کو حسینیت کی طرف مائل کر دے گی۔ جس سے بڑھ کر شاہ راہِ عمل اس وقت تک دنیا کا کوئی بشر پیش نہ کر سکا اور نہ آیندہ پیش کر سکے گا۔"

سرفراز محرم نمبر

اخبار سرفراز لکھنؤ کا محرم نمبر اس سال بھی اپنی روائتی شان سے شائع ہوا ہے۔ ضخامت ۸۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ

شہادتِ حسینؑ اور متعلقہ موضوعات پر مشاہیر ادب اکابر کے نوحے اور مضامین بڑے سلیقے سے جمع کئے گئے ہیں۔ آرٹ پیپر پر بہت سی نادر تصویریں بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ چنانچہ دبیر لکھنوی کی نایاب تصویر بھی اس میں شائع ہوئی ہے۔ مدیر سرفراز اسد اللہ صاحب اسد لکھنوی اس نمبر کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

جمہور صدریار جنگ نمبر

علی گڑھ کے اس دو روزہ کا یہ خاص نمبر بھی اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت دو روپے

نواب صدریار جنگ مرحوم سے متعلق خاندانی، ادبی اور مجالسی معلومات کا یہ انسائیکلوپیڈیا ادبی اور تاریخی اعتبار سے ایک قابلِ قدر چیز ہے۔ اس میں مرحوم کا عکسِ تحریر، تصویر، خاندانی حالات، کلام، ادبی اور مجلسی سرگرمیاں غرضیکہ علم و ادب کا ذوق رکھنے والوں کو بہت کچھ ملے گا۔

پیامِ تعلیم (کشمیر نمبر)

مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دلّی سے بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید رسالہ 'پیامِ تعلیم' شائع ہوتا ہے۔ اس کا یہ نمبر کشمیر سے متعلق ہے۔ ہمیں امید ہے کہ علمی اور معلوماتی حیثیت سے یہ نمبر بچوں کے لئے بہت مفید اور ان کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔

رفتارِ زمانہ

جمہوری دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑے انتخابات کا آغاز ہندوستان میں ماہ نومبر سے ہماچل پردیش میں ہوگیا ہے۔ ان انتخابات میں ۱۷ کروڑ ووٹر حصہ لے رہے ہیں۔ اور یہ نومبر سے لے کر فروری کے آخر تک جاری رہیں گے۔ ان انتخابات میں ایک درجن سے زیادہ سیاسی پارٹیاں حصہ لے رہی ہیں۔ ان انتخابات میں تمام پارٹیوں کو اپنا پروپیگنڈہ کرنے کی پوری آزادی ہے اور بھارت سرکار اس سلسلے میں قطعاً غیر جانبداری سے کام لے رہی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو بھی کسی پارٹی کا پروپیگنڈہ نہیں کرے گا۔ لہٰذا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ بھارت سرکار کے حسنِ انتظام اور غیر جانبدارانہ پالیسی کے تحت یہ انتخابات بخوبی اختتام پذیر ہوں گے۔

نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کو ریاست کشمیر کے بھارت میں شامل ہونے کے سوال کا فیصلہ کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ لیکن وہ حفاظتی کونسل کے کام میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالے گی۔ شری نہرو نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ کشمیر میں استصواب رائے جتنا جلد ہو سکے اُتنا ہی اچھا ہے، تاکہ لوگوں کے شبہات کو دُور کیا جا سکے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے استصواب رائے کے نتائج کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ ایک سوال کے جواب میں شری نہرو نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ پاکستان کے ساتھ ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کے عہدنامے پر دستخط کرنے کے لئے طیار ہیں، لیکن اس عہدنامے کے دائرے میں ریاست جموں و کشمیر بھی شامل ہونی چاہیئے۔

برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر انیتھونی ایڈن نے ہاؤس آف کامنز میں بتایا کہ برطانیہ کسی وقت بھی ایرانی تیل کے سوال پر دوبارہ گفت و شنید شروع کرنے پر آمادہ ہے۔ مصر کے ساتھ برطانیہ کے جھگڑے کے بارے میں مسٹر ایڈن نے کہا کہ برطانیہ مصر کے ساتھ ۱۹۳۶ء کے عہدنامے میں ترمیم کرنے اور نہر سویز کی حفاظت کے لئے دوسرے ممالک کے ساتھ مل کر باہمی سمجھوتہ کرنے کو طیار ہے۔ مصر کے متعلق جو تازہ خبریں موصول ہوئی ہیں اُن میں ایک پُر اہمیت خبر روس کی مصر کو امداد دینے کے متعلق ہے۔ روس نے حکومت مصر کو مالی امداد دینے کے لئے اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں مصری نمائندے محمود فیغفی اور روسی نمائندے سیمیٹون جاکن میں ابتدائی بات چیت شروع ہوگئی ہے اور اُن کی ایک ہفتے میں دوبارہ ملاقات ہو چکی ہے۔

امریکہ میں بھارت کی سفیر شریمتی وجے لکشمی اپنے عہدے کو چھوڑ کر انتخابات میں حصہ لینے کے لئے بھارت میں آرہی ہیں۔ اُن کی جگہ پر اٹلی میں بھارت کے سفیر شری ونے رنجن سین کو امریکہ میں بھارت کا سفیر مقرر کیا گیا ہے۔ اس تقرر کو پریذیڈنٹ ٹرومین نے منظور کر لیا ہے۔

بھارت کی تعمیری ترقی کے کام میں مہاتما گاندھی کے خیالات پر صحیح طور پر عمل کرنے والے آچاریہ ونوبا بھاوے آج کل بڑے بڑے زمینداروں سے زمین لے کر اُسے کسانوں میں بانٹنے کے کام میں حصہ لے رہے ہیں۔ اس وقت تک پینتیس ہزار ایکڑ زمین اُنہیں عطیے کے طور پر مل چکی ہے۔ اُن کے اس بے لوث کام کی ملک بھر میں تعریف ہو رہی ہے۔

متحدہ اقوام کی اسمبلی نے مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں ڈاکٹر گراہم کو مزید چھ ہفتوں کی مہلت دی ہے تاکہ وہ بھارت اور پاکستان کے نمائندوں سے مل کر سمجھوتے کی کوئی راہ نکالیں۔ ڈاکٹر گراہم اب سر بی۔ این راؤ اور سر ظفر اللہ سے مل کر کشمیر کے مسئلے کا حل نکالنے کی تجاویز پر بات چیت کر رہے ہیں۔ اُن کی اس کوشش کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ لیکن وہ پُر امید ہیں اور اُن کو یقین ہے کہ اُن کی کوششیں ضرور بار آور ہوں گی۔

سال رواں کے پہلے چھ مہینوں یعنی اپریل سے ستمبر تک بھارت کی جو آمدنی ہوئی ہے وہ پچھلے سال سے زیادہ ہے۔ سرحدوں پر چنگی کی آمدنی میں پچاس کروڑ روپے اور پیداوار ٹیکس میں ۱۰ کروڑ روپے کی زیادہ آمدنی ہوئی ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسی سال کے آخر تک آمدنی کی رقم خرچ سے کافی زیادہ رہے گی اور اس سے دیش کی مالی پوزیشن بہت مستحکم ہو جائے گی۔

آپکی بچت کیلئے آجکل کی سب سے سُود مند مد!

بھارت سرکار کے

دس سالہ

ٹریژری سیونگز ڈپازٹ

اِس پر آپ کو ۳½ فیصدی سالانہ سُود ملے گا

جس پر کوئی انکم ٹیکس، سُپر ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس نہیں لگے گا

یاد رکھیئے کہ ٹریژری ڈپازٹ کی اِس اسکیم میں شامل ہونے سے آپ کو اپنی رقم پر دس سال تک ۳½ فیصدی سالانہ سُود ملتا ہے جس پر کوئی ٹیکس نہیں لگتا اور آپ کا زرِ اصل محفوظ رہتا ہے۔

آپ پر کوئی ٹیکس عائد نہیں ہوگا؛ سُود پر کوئی ٹیکس نہیں لگتا، اور آپ کی کُل آمدنی پر انکم ٹیکس کی شرح مُقرّر کرتے وقت اِس منافع کو آمدنی میں شمار نہیں کیا جاتا ہے۔

آپ اپنی رقم آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں؛ ڈپازٹ کی پوری رقم دس سال کے بعد، یا اِس سے پیشتر ضرورت پڑنے کی صورت میں معمولی سی کٹوتی پر (جو کہ حاصل کردہ سُود کا حصّہ ہے) واپس کی جاتی ہے۔ اِس طرح ہر سال بڑھتا ہوا منافع ملتا رہتا ہے اور زرِ اصل ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

اب آپکے لئے مندرجۂ ذیل مزید سہولتیں مہیّا کردی گئی ہیں

ریزرو بنک کے کلکتہ، بمبئی، مدراس اور دہلی کے دفتروں اور امپیریل بنک کی سرکاری خزانے کا کام کرنیوالی برانچوں کے علاوہ ٹریژری سیونگز ڈپازٹ لے کلاس صوبوں کے ہر ضلع کے خزانے میں جہاں امپیریل بنک آف انڈیا خزانے کا کام نہیں کرتا، اور بھوج (کچھ) اِمپھل (منی پور) اور کورگ مرکارا (کورگ) کے خزانوں میں بھی ڈپازٹ قبول کئے جاتے ہیں۔

یہ ڈپازٹ کسی بھی سرکاری گزیٹڈ افسر یا مقامی سرکاری ایگزیکٹو افسر جیسا کہ جنرل کلازز ایکٹ ۱۸۹۷ء میں واضح کیا گیا ہے، کو اُس کی سرکاری حیثیت میں یا ریزرو بنک آف انڈیا میں ضمانت کے مخصوص مطلب کے لئے منتقل کئے جا سکتے ہیں۔

والدین نابالغ بچے کے حق میں سرپرستی کے سرٹیفکٹ کے بغیر ڈپازٹ رکھ سکتے ہیں۔ بچے کی نابالغی کے دوران میں سُود اور ڈپازٹ سرٹیفکٹ کی ادائیگی کی قیمت اُس کے ماں یا باپ کو جس نے درخواست پر دستخط کئے تھے کی جائے گی۔

آج ہی جمع کرائیے

یہ ڈپازٹ ایک ایک سو کی رقموں میں رکھے جا سکتے ہیں لیکن نیچے کی رقموں سے زیادہ کا کوئی ڈپازٹ نہیں لیا جائے گا۔
فردِ واحد سے ۲۵،۰۰۰ روپے۔ مشترکہ طور پر دو اشخاص یا اداروں سے ۵۰،۰۰۰ روپے۔ خیراتی اداروں سے ۱۰۰،۰۰۰ روپے۔
اپنی درخواست میں درج ذیل باتیں لکھیئے۔
اپنا پورا نام و پتہ۔ رقم آیا یہ ذاتی طور پر جمع کرائی جارہی ہے یا کسی دوسرے کے ساتھ مشترکہ طور پر۔ اُس خزانہ کا نام جہاں سے آپ سُود لینا چاہتے ہیں۔ اور اگر آپ ریزرو بنک آف انڈیا سے اپنے سُود کی رقم اپنے گھر منگوانا چاہتے ہیں تو آپ کے گھر کا پتہ۔ ایسی صورت میں اُن لوگوں کو زرِ اصل کی ادائیگی کے بارے میں بھی بتانا چاہیئے جنھوں نے مشترکہ روپیہ جمع کرایا ہو۔
یا آپ درخواست کے فارم کے لئے ریزرو بنک آف انڈیا یا امپیریل بنک آف انڈیا کی نزدیکی برانچ کو لکھیئے۔

نیشنل سیونگز کمشنر برائے بھارت، وزارتِ مالیات، گارٹن کاسل شملہ نے جاری کیا

AG289

عالمِ پیئرس کے خوبصورت بچے

ایک خوبصورت خاتون بننے کی تیاری میں

کملا کی بے داغ جِلد دیکھنے سے دل خوش ہوتا ہے۔ سمجھدار ماں اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ کسی بھی طرح اسکی بچی کی جِلد خراب نہ ہونے پائے۔ مثلاً وہ جانتی ہے کہ صاف وشفاف پیئرس صابن کا عملِ تقویت بچے کی جِلد کو آنے والے برسوں میں نرم ونازک رکھے گا، اور یہ بھی کہ پیئرس صابن کے رازِ حُسن کو دُنیا بھر کے خاندانوں میں ماں اپنی بیٹی کو سونپتی آئی ہے۔

پیئرس صابن

پُشتوں سے حَسین عورتوں کا سِنگار

TG. 61-X30 UD

Regd No F.P-689

"بچّوں کا آج کل"

اچھّی ماما

حامداللہ افسر

اچھّی ماما ! اچھّی ماما !
سارے گاما ، سارے گاما
یوں تو ہے تو اتنی موٹی   پر ہیں آنکھیں تیری چھوٹی
چوہیا جیسی تیری چوٹی   دیکھے تو ڈر جائے گاما
اچھّی ماما ! اچھّی ماما !
سارے گاما ، سارے گاما
چپٹی ناک سے بہتا پانی   صورت تیری اب پہچانی
جاپانی گڑیا کی نانی   یوکو ہاما ، یوکو ہاما
اچھّی ماما ! اچھّی ماما !

خضر پرویز

گرو مہاراج

کردار:- انجم اور اصغر ——— دو شریر لڑکے
ایک حلوائی

پہلا منظر (اصغر اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے کہ انجم آتا ہے)

انجم پھر وہی شاعری (منہ کو بناتے ہوئے کہا) کسی نے سچ کہا ہے۔ کہ
شاعروں کا دماغ خراب ہوتا ہے
مجھے یقین ہے کہ تم بھی پاگل ہو جاؤ گے
(وقفہ) میاں شاعری واعری چھوڑو
اور.....

اصغر (غصے سے) شاعری چھوڑو، پاگل ہو جاؤ گے۔ "تمہیں اس کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ کیوں کوئی نئی شرارت سوجھی ہے۔ باقی رہا شاعری کا معاملہ۔ شاعری خدا کی نعمت ہے۔ جو دل پر نازل ہوتی ہے

انجم (ہنستے ہوئے) جس طرح سر پر مصیبت نازل ہو جاتی ہے۔

اصغر اُستاد چھچھوندر جاؤ۔ مجھے مُعاف کرو (ہاتھ جوڑتے ہوئے) میں تمہاری واہیات بکواس سے تنگ آ گیا ہوں۔

انجم تم نے پھر مجھے اُستاد چھچھوندر کہا۔ اچھا یوں ہی سہی۔ اب میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا جب تک تم میرے ساتھ نہیں چلو گے (کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُونچی آواز سے) سارے گا ما پا، سارے گا ما پا۔

اصغر (عاجزی سے) چلوں گا اور ضرور چلوں گا۔ اُستاد ذرا میری لکھی ہوئی نظم تو سُن لو۔

انجم سُنا لو بھائی۔

اصغر۔ حضور۔ مطلع عرض ہے۔

انجم۔ ارشاد — ارشاد

(سُناتا ہے)

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

انجم (تالی بجاتے ہوئے) چہ خوب اُستاد نقل مارا۔ کمال کر دیا تم نے۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ یہ نظم تمہاری ہے اور غلطی سے بانگ درا میں چھپ گئی ہے۔

اصغر (ہنستے ہوئے) یہ نظم ہے تو علامہ اقبال کی۔ مگر میں نے اپنے ہاتھوں سے لکھی ہے۔ اس لئے یہ نظم میری ہوئی۔

انجم - ہونہہ۔ خوب رہی اُستاد۔ اس طرح نظمیں لکھ کر شاعر بن گئے ہو۔

(دونوں قہقہہ لگاتے ہیں)

(وقفہ)

انجم ہاں بھئی اصغر۔ میں اصل بات تو بھول گیا

اصغر کہو۔

(انجم اپنی کرسی سے اُٹھ کر اصغر کے کان میں کچھ کہتا ہے اور دونوں خوشی سے ناچنے لگتے ہیں۔ پھر انجم اپنی جیب سے ایک نقلی ڈاڑھی اور مونچھیں نکالتا ہے اور اپنے چہرے پر لگا لیتا ہے)

انجم کہو۔ اصغر بہروپ کیسا ہے؟

اصغر۔ (تعریف کرتے ہوئے) واہ اُستاد بالکل گرو دکھائی دیتے ہو۔

(انجم اور اصغر دونوں مسکراتے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

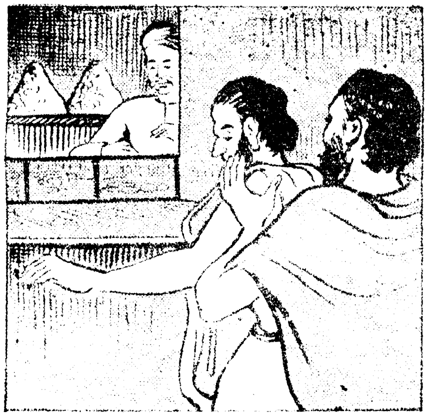

دوسرا منظر:

(ایک حلوائی اپنی دکان پر بیٹھا برفی تیار کر رہا ہے اور اُس کے آس پاس کافی مٹھائی پڑی ہے کہ اتنے میں گرو اور اُس کا چیلا "الکھ نرنجن" کی صدا لگا کر اندر آتے ہیں۔ حلوائی انہیں دیکھ کر ادب سے کھڑا ہو جاتا ہے)

حلوائی مہاراج۔ مہاراج۔ تشریف رکھئے۔ میرے بھاگ جاگے، جو آپ آئے۔

گرو (رعب دار آواز سے) اے بچّہ۔ تمہارا کلیان ہو۔ یہ سادھو اس بستی میں آئے ہیں۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔

حلوائی۔ مہاراج! لکشمی دیوی۔ اس طرف دھیان کرے۔

گرو (آنکھیں بند کر کے) بھگوان بڑا دیالو ہے۔

(ایک دم آنکھیں کھول کر گھورتا ہے) بچّہ تمہاری تقدیر کے چاند کو گرہن لگ رہا ہے۔

حلوائی (گھبرا کر) گرہن لگ رہا ہے۔ مہاراج شما کیجئے۔ آپ بڑے دیالو ہیں۔ میں تاعمر آپ کی سیوا کروں گا۔

گرو الکھ نرنجن کی صدا لگاتے ہوئے) یہ گرہن بڑا سخت ہے۔ اس کا اُپائے کرو۔ دس تولے سونا۔ دس سیر دالیں۔ دس سیر گھی۔ ہم ہون کریں گے۔

حلوائی۔ جو آگیا، مہاراج

(حلوائی اُٹھ کر اپنی تجوری کھولتا ہے۔ اور کچھ ڈھونڈھتا ہے)

گرو (پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے) الکھ نرنجن، الکھ نرنجن۔

(حلوائی کو تجوری کی طرف مصروف پا کر چیلا اپنی جیبوں میں مٹھائی بھرنے لگتا ہے اور گرو جی بھی اپنی جیبوں میں مٹھائی ڈالنے لگتے ہیں۔ اتنے میں حلوائی مڑتا ہے۔ اور دونوں رک جاتے ہیں۔ اس پریشانی میں گرو جی کی مونچھیں اور داڑھی نیچے گر پڑتی ہیں)

حلوائی۔ (زور سے) چور، چور۔ میں لٹ گیا۔ پکڑو، پکڑو،

دونوں مونچھیں اور داڑھی چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

(طبعزاد)

راشد حسن قادری

ننّھا مُصوّر

سر جان میلے (Sir John Milais) ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں انگلستان کا بہت بڑا مُصوّر تھا۔ جو شہرت اور کمال اس نے حاصل کیا وہ صرف اپنی ماں کی بدولت۔ اس کی ماں نے دوسرے بچّوں کی طرح جان میلے کو اسکول نہیں بھیجا بلکہ خود ہی تعلیم دیتی تھی جب پنسل پکڑنی آئی تو جتنی خوشی اس کو لکیریں اور نقشے کھینچنے میں ہوتی تھی اتنی کسی

دوسرے کام میں نہ ہوتی جب جان چار برس کا ہوا تو یہ حال تھا کہ گھنٹوں کاغذ اور پنسل لے کر فرش پر لیٹا ہر چیز کی جو اس کے سامنے آتی تصویر کھینچتا اور اتنی اچھی تصویریں کھینچتا اور نقشے اتارتا کہ دیکھنے والے تعجّب کرتے اور حیرت میں رہ جاتے تھے چنانچہ اس کے چچا نے ایک موقع پر کسی سے کہا کہ "دیکھو میرے الفاظ یاد رکھو یہ لڑکا ایک دن بہت بڑا آدمی ہوگا"۔

ہر شخص ان نقشوں اور تصویروں کی تعریف کرتا اور کوئی عیب نہ نکالتا لیکن جان جانتا تھا کہ ابھی یہ ہنر اس کو اچھی طرح نہیں آیا۔ ایک مرتبہ اپنے چچا سے کہنے لگا۔ "چچا ہر شخص میری نقشہ کشی کی تعریف کرتا ہے لیکن آپ ہمیشہ غلطی اور عیب نکالتے ہیں"۔ جان اپنے چچا کی اس بات سے بہت خوش تھا اس لئے کہ اسی بات نے اسے مشہور مصوّر بننے میں مدد دی۔

جب جان ساتویں برس میں تھا تو اسے اپنے ماں باپ کے ساتھ فرانس جانے کا اتفاق ہوا اس سفر سے وہ بہت خوش تھا اس لئے کہ وہاں بہت سی نئی چیزیں دیکھنے میں آئیں وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ سڑکوں پر نکل جاتا اور تماشا دیکھا کرتا خاص کر جب سپاہی ادھر سے گزرتے تو بہت لطف آتا۔ ایک دن ایک بینڈ ماسٹر اکڑتا ہوا اپنے سپاہیوں کے آگے آگے چلا آرہا تھا شان یہ تھی کہ ریچھ کی کھال کی ٹوپی خوب اونچی اور لمبی اوڑھے ہوئے اور سُنہری موٹھ کا بید اِدھر اُدھر گھماتا بینڈ سے آگے آگے چل رہا تھا یہ سین دیکھ کر جان سے نہ رہا گیا پنسل اور کاغذ نکال کر فوراً اس بینڈ ماسٹر کی تصویر کھینچ لی۔ جب آخری لکیریں کھینچ رہا تھا تو افسر اس کے قریب آئے اور دیکھا کہ یہ کیا بنا رہا ہے جب انہوں نے اتنی عمدہ اور صحیح

تصویر سات برس کے بچے کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی دیکھی تو بہت پسند کی جان کو شاباشی دی اور انعام میں کچھ روپے بھی دئے۔ جان نے وہ تصویر ان کو دے دی۔ افسروں نے وہ تصویر اپنے دوستوں کو دکھائی ہر ایک نے نہایت تعریف کی اور تعجب کیا کہ اتنی چھوٹی عمر کے بچے نے جو ابھی سات برس کا بھی نہیں ہے ایسی صحیح اور اچھی تصویریں کھینچی ہیں چنانچہ ان افسروں نے ننھے مصوّر کو بلایا اور اس سے تصویر کھینچنے کی درخواست کی جان نے فوراً ان میں سے ایک کی سگار پینے کی حالت کی تصویر کھینچ کر پیش کر دی۔ تصویر کو دیکھ کر سب بے انتہا خوش ہوئے۔

جان فرانس میں زیادہ نہیں رہا۔ اس کے والدین پھر

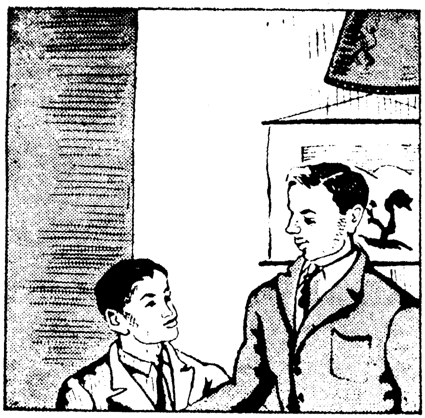

انگلستان واپس آگئے اور مصوّری اور نقاشی سکھانے کی غرض سے جان کو انگلستان کے سب سے اچھے مصوّر کے پاس لے گئے اور ارادہ کیا کہ اس سے مشورہ لے کر جان کو اس کے پاس چھوڑ دیں۔ مصوّر نے کہا کہ "اس بچے کو مصوّر بنانے سے بہتر ہے کہ مزدور بنا دیا جائے" لیکن جب اس نے جان کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھیں تو اس نے اپنے سامنے بٹھا کر ایک نئی تصویر بنوائی اور اس کو دیکھ کر اپنی رائے بدل دی اور ننھے مصوّر کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ جان نے اس کی نگرانی میں خوب محنت کر کے نقاشی اور مصوّری کی تعلیم حاصل کی اور نو برس کی عمر میں بہت سے انعام اور تمغے حاصل کئے۔

ایک مرتبہ جب کہ ایک بڑے جلسے میں اسے انعام دیا جانے والا تھا اس کی کم عمری اور چھوٹے قد نے بڑا لطف پیدا کیا۔ اس جلسے میں ملکہ وکٹوریہ کے چچا ڈیوک آف سیسکس انعام تقسیم کر رہے تھے جب جان کا نام پکارا گیا تو یہ ننھا مصوّر اپنی جگہ سے اٹھا اور میز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ڈیوک کی نگاہ کمزور تھی اس لئے اس چھوٹے مصوّر کو نہ دیکھ سکے۔ تھوڑی دیر انتظار کر کے انہوں نے کہا کہ "انعام لینے والا نہیں آیا" کسی شخص نے کہا "حضور بڑی دیر سے حاضر ہے"۔ جان اتنا چھوٹا تھا کہ جب اس کو اسٹول پر کھڑا کیا گیا تو صرف اس کے سر کے سنہرے بال میز کے اوپر نکلے ہوئے تھے ڈیوک کھڑے ہوئے اور انعام دیا۔ انعام دیتے وقت اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے کام کی تعریف کی اور فرمایا "جب کبھی تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہنا"۔

جان میلے اور اس کا بھائی شاہی باغ میں مچھلی کا شکار کھیلا کرتے تھے ایک مرتبہ وہاں شکار کھیلنے کی ممانعت ہو گئی تو جان نے ڈیوک کو لکھا اور ان سے شاہی باغ میں شکار کھیلنے کی اجازت مانگی چنانچہ صرف اسے اور اس کے بھائی کو اس تالاب میں شکار کھیلنے کی اجازت دے دی گئی

جان میلے کو جو عزت حاصل ہوئی اس کا مختصر حال یہ ہے کہ انگلستان کے بہترین مصوّروں میں اس کا شمار تھا۔ رائل اکیڈمی کی نمائش میں اس کی تصویریں نہایت فخر کے ساتھ رکھی جاتی تھیں۔ ٹرالوپ مشہور ناول نویس اور ٹینی سن مشہور شاعر کی تصنیفوں کے متعلق بہت سی اعلیٰ تصویریں بنائیں جنہوں نے اس کو اور بھی زیادہ ہردلعزیز اور مشہور کر دیا۔ ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں رائل اکیڈمی کا ممبر بنایا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں سر کا خطاب ملا مرنے سے چند مہینے پہلے رائل اکیڈمی کا صدر مقرر ہوا۔ ۱۸۹۶ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ڈاک کے ٹکٹ کیسے بنتے ہیں

زیادہ تر ٹکٹ ایسے ہوتے ہیں جن کے ڈیزائن ایک دھات کی پلیٹ پر اتار لیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد رنگ لگا کر ان کو کاغذ پر چھاپ دیا جاتا ہے۔ ایک پلیٹ پر ایک ہی قسم کے ۴۰۰ ٹکٹ ہوتے ہیں۔ یہ پلیٹ بیلن کی طرح گول ہوتی ہے۔

ٹکٹ چھاپنے کا کاغذ بھی ایک ریل پر لپٹا رہتا ہے۔ یہ ریل اکثر ایک ایک میل لمبی ہوتی ہے۔ اسے دوسری مشین پر چڑھایا جاتا ہے۔ اس کی پشت پر گوند لگایا جاتا ہے گوند کو سکھانے کے بعد وہی مشین اس کو دوسری مشین کی ایک خالی ریل پر لپیٹ دیتی ہے ٹکٹوں پر لگانے کا گوند بھی ایک خاص گوند ہوتا ہے جو عرب ممالک سے آتا ہے۔

کاٹنے کے لیے پنچنگ مشین کی سوئیوں کے ذریعے سے ہر ٹکٹ کی حدوں پر سوراخ کئے جاتے ہیں۔ سوراخ ہونے کے بعد ٹکٹ ڈاک خانوں میں بھیجے جاتے ہیں جہاں سے آپ ان کو خرید لیتے ہیں۔

پڑھو اور ہنسو

تشکیل الدین احمد

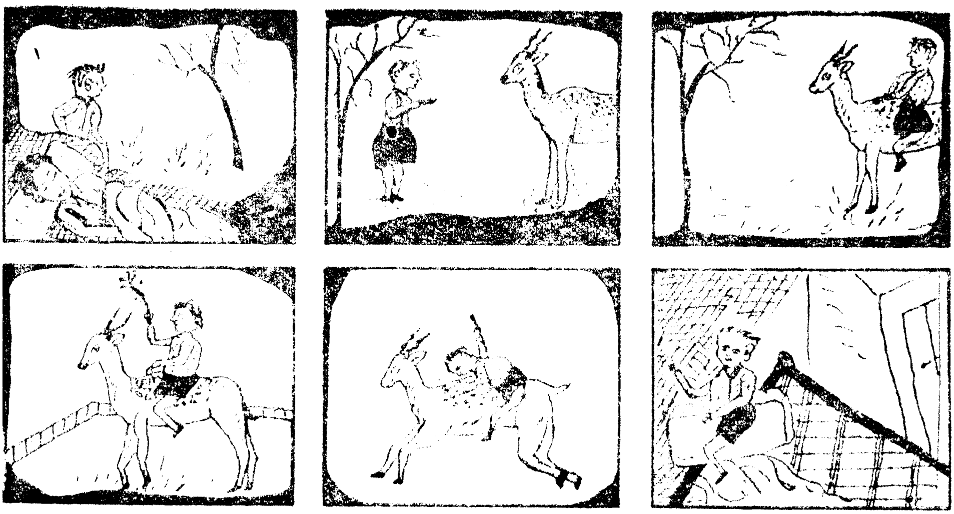

۱۔ ٹِک ٹِک۔ سلیم نے خواب دیکھا کہ وہ جنگل میں جا رہا ہے۔
۲۔ راستے میں سلیم کو ایک ہرن مل گیا۔
۳۔ سلیم فوراً ہرن کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔
۴۔ سلیم نے ہرن کو پیٹنا شروع کیا۔
۵۔ ہرن سلیم کو لے کر بھاگا۔ سلیم ہرن کی پیٹھ سے چپٹ گیا۔
۶۔ سلیم کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا بجائے ہرن کے تکیے پر سواری ہو رہی ہے۔

دیوکی نندن

ہمارے بے زبان دوست

چُنّو مُنّو، موہن اور حمید تمہارے ساتھ اسکول جاتے ہیں، تمہارے پاس ہی بیٹھتے ہیں، شام کو تمہارے ساتھ گیند بلّا اور کبڈّی کھیلتے ہیں، کبھی کبھی چھٹی کے دن تمہارے ساتھ باغوں سے پھل توڑنے یا ندی میں کاغذ کی کشتیاں تیرانے جاتے ہیں۔ ہے نا یہی بات؟ سو یہ سب تمہارے دوست ہیں، ان کے لئے تمہارے دل میں محبّت اور ہمدردی ہے، جب ان میں سے کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو تمہارے دل کو بے چینی ہوتی ہے، جب ان دوستوں میں سے کوئی چند دنوں کے لئے باہر چلا جاتا ہے تو تم کھوئے کھوئے سے رہتے ہو، یہ سب اس لئے ہے کہ خدا نے انسان کے دل میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا کئے ہیں۔ پر کبھی تم نے اپنے بے شمار بے زبان دوستوں کے لئے بھی کچھ کیا ہے۔ یہ گائے جو تمہیں صبح شام میٹھا اور صحت بخش دودھ دیتی ہے، اور جس کے دودھ سے تمہیں مکھّن، بالائی، دہی اور کھوئے جیسی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، یہ چھوٹے چھوٹے بے شمار پرندے جو صبح سویرے اپنے میٹھے گیت سنا کر تمہیں بیدار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اٹھو پیارے دوست مشرق میں ایک نیا دن جگمگا رہا ہے، اٹھو اور اپنا کام شروع کرو، یہ پیاری پیاری رنگ برنگی تتلیاں جو اسکول کے باغیچے میں پھولوں سے کھیلتی نظر آتی ہیں۔ تمہارا وفادار کتّا جیک جو تمہارے قدموں کی چاپ سنتے ہی دوڑا دوڑا آتا ہے اور دُم ہلا ہلا کر اپنی محبّت کا اظہار کرتا ہے، تمہارے تانگے کا گھوڑا موتی جو تمہیں ہر روز اسکول لے جاتا ہے اور کبھی کبھی بازار اور شہر کی سیر بھی کرا لاتا ہے، پیارے بچّے یہ سب تمہارے دوست ہیں تمہارے دل میں ان کے لئے بھی ہمدردی ہونی چاہئے،

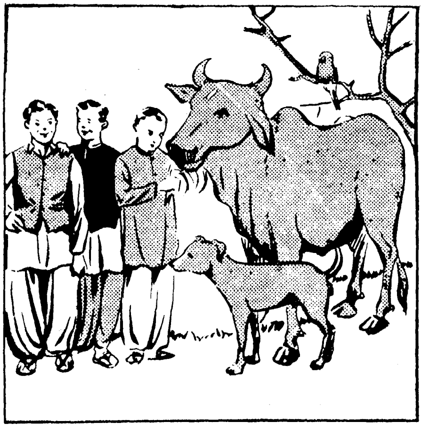

یہ بیچارے بے زبان ہیں اس لئے منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن یقین جانو کہ اگر تم انہیں پیار اور ان سے ہمدردی کروگے تو یہ ضرور تمہاری خدمت کریں گے۔ کیا تم نے وہ کہانی نہیں سُنی جس میں ایک عرب کا وفادار گھوڑا اپنے مالک کو دشمن کے کیمپ سے اُٹھا لایا اور خود تھک کر مر گیا،

Publications that keep you well informed

March of India

An English bi-monthly. Per copy Rs. 2/8/-. 3 Shs. 6 d. or 55 Cents. Annual Rs. 15/-. Shs. 21 or $ 3.

KASHMIR

English fortnightly projecting Kashmir, its people, their arts and crafts. Per copy As. -/8/-. 9 d. or 10 Cents. Annual Rs. 10/-. Shs. 18 or $ 2.

Ajkal Hindi

Short stories, poems, pictorial features. Per copy As. -/8/-. 9 d. or 10 Cents. Annual Rs. 6/-. Shs. 9, or $ 1.

Ajkal Urdu

Cultural monthly. Edited by Hazrat Josh Malahebadi. Per copy As. -/8/-. 9 d. or 10 Cents. Annual Rs. 6/-. Shs. 9 or $ 1.

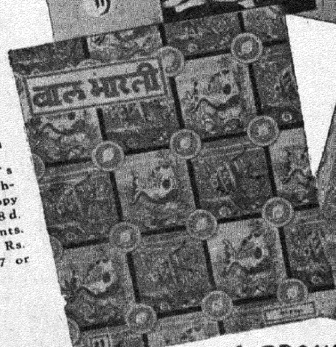

Bal Bharati

Children's Hindi Monthly. Per copy As. -/6/-. 8 d. or 10 Cents. Annual Rs. 4/-. Shs. 7 or $ 1.

Vishwa Darshan

Hindi Monthly presenting the world to India. Per copy As. -/8/- 9 d. or 10 Cents. Annual Rs. 6/-. Shs. 9 or $ 1.

A GROUP OF MEDIA WITH ALL INDIA CIRCULATION

Available everywhere or direct from:

THE PUBLICATIONS DIVISION,

Old Secretariat, DELHI.

No. D.—21

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.